الفاظ
افسانہ نمبر
۱۹۸۱ء

افسانہ نمبر (جلد اول)
الفاظ
جلد ۶
جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۱ء
شمارہ ۱، ۲
مجلس ادارت
نور الحسن نقوی
اطہر پرویز
اسد یار خاں
مینجنگ ایڈیٹر
احمد سعید خاں
سرورق پر : پریتم چند
زر سالانہ Rs 16.00
قیمت افسانہ نمبر — چھ روپے
پرنٹر پبلشر — اسد یار خاں
مطبوعہ — اسرار کریمی پریس، الہ آباد
کتابت — ز۔ رشید، الہ آباد
مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
پتہ : دوماہی الفاظ
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۲۷۶۸

مقالات

افسانے

○

اداریہ

اردو افسانے کا کارواں آسمان کی پہنائیوں کی طویل مسافت طے کرکے پھر دھرتی پر اتر آیا ہے۔ مگر اس مقام پر نہیں جہاں سے اس نے یہ سفر شروع کیا تھا بلکہ اس سے دور، کوسوں دور!

پچھلی دو دہائیوں میں اردو افسانے نے کئی کروٹیں لی ہیں اور ایسی تبدیلیوں سے روشناس ہوا ہے کہ اس کی شکل پہچاننی دشوار ہوگئی ہے۔ افسانے کی شناخت کے جتنے اصول مقرر ہوئے تھے آج سب باطل ہو چکے ہیں۔ اور اس کی جتنی تعریفیں کی جاتی رہیں سب معنی ہوکر رہ گئی ہیں۔ پریم چند سے شروع ہونے والی اردو افسانے کی روایت کچھ دنوں خطِ مستقیم پر چلتی رہی لیکن کرشن چندر، منٹو اور بیدی تک پہنچتے پہنچتے اس روایت کے سارے امکانات تمام ہو گئے اور وہ اپنی منتہا کو پہنچ گئی۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو بالکل فطری لابدی ہے یعنی روایت سے انحراف!

پرانی لیکھ پر چلنے سے انکار اور نئی راہوں کی تلاش ایک فطری بات اور ایک نفسیاتی معاملہ بھی ہے۔ کشیدہ قامت بھلا اپنے قد کی نمائش کیوں نہ کرے گا۔ سچا فنکار جو اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ وہ اپنے فن کو پرانے سانچوں میں قید رکھنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ بھیڑ میں کھو جانا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے دور سے پہچان لیا جائے اس لئے وہ روشِ عام سے ہٹ کر چلتا ہے۔ عصری حسیت اور اس کے تقاضے بھی فنکار کو روایت سے بغاوت پر اکساتے ہیں اور یہ دستور اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود ادب۔ ہمارے ادب میں بھی یہ صورت برابر پیش آتی رہی ہے۔ کبھی نمایاں طریقے سے اور کبھی غیر محسوس طور پر لیکن ہمارے افسانے کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اسے پچھلی چند دہائیوں میں بڑی شکست و ریخت اور پے در پے زبردست تبدیلیوں سے گزرنا پڑا۔ اس کا سبب کچھ تو حالات کا تقاضا تھا، کچھ فن کار کی انفرادیت اور کچھ محض قاری کو چونکانے کی خواہش۔

تقسیم ملک کے بعد سے اردو افسانے میں جو تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں، انھیں ہمارے افسانے کے ناقد نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اسے یورپ کی بے معنی نقل ٹھہرایا۔ اس کا خیال تھا کہ یورپ کا فن کار جس ذہنی کرب میں گرفتار ہے وہ اصلی ہے۔ یورپ کی مخصوص شہری زندگی، صنعتی دور کے لازمی تقاضے، وہاں کی نفسانفسی اور ایک دوسرے سے بے تعلقی، ان سب چیزوں نے مل کر وہاں کے شاعر و افسانہ نگار کو مایوسی، تنہائی اور لاحاصلی کے احساس میں مبتلا کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کرب کے عالم میں اس نے جو کچھ کہا اس میں بے ربطی اور ژولیدہ بیانی قابلِ فہم ہے مگر اپنے فن کار کے بارے میں اس نقاد کی رائے یہ تھی کہ اس کے یہاں ان باتوں کا ذکر بے سوچے سمجھے محض نقالی کے طور پر ہوا ہے مگر ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ہمارے فن کار کو جن حالات کا سامنا تھا وہ مغرب کے حالات سے زیادہ اذیت ناک اور روح فرسا تھے۔ اسے خونیں فسادات کے جو ہولناک منظر دیکھنے پڑے ان سے وہ دہشت زدہ ہوگیا اور اس پر نہ ختم ہونے والے تحیر کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ساتھ ہی اسے ایک اور اذیت سے گزرنا پڑا۔ اردو کے مستقبل کے ساتھ اسے اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اب کوئی اس کی بات سننے والا نہ رہ گیا ہو اور وہ بھری محفل میں تنہا ہو۔ یہ صورت حال عارضی نہ تھی بلکہ ایسا لگتا تھا کہ اردو کی "ریڈرشپ" قطعاً معدوم ہوگئی۔ اب اگر وہ خود کو بے مصرف خیال کرنے لگا اور اسے بے چارگی کا احساس ستانے لگا تو یہ بالکل فطری بات تھی۔ یورپ سے کہیں زیادہ اصلی اور فطری!

انسان مایوس ہو جانے اور یہ باور کر لینے کے بعد کہ اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں اپنی ذات کے خول میں قلعہ بند ہو کر خود کو محفوظ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہمارے فن کار پر یہی گزری اور اس کی توجہ اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات سے ہٹ کر خود اس کی ذات پر مرکوز ہوگئی۔ وہ بھول گیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کا کوئی سننے والا بھی

موجود ہے اور اس لیے اسے قابلِ فہم ہونا چاہیے۔ ہمارے افسانے کے نقاد کے لیے یہ ایک انوکھی سی بات تھی۔ اس کے پیشِ نظر پریم چند اور ان کے عہد کا افسانہ تھا ـــــ جذبۂ اصلاح سے سرشار اور براہ راست یا پھر ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر وجود میں آنے والا افسانہ تھا ـــــ بامقصد اور واضح! نئے افسانہ نگار کی ٹیڑھی میڑھی چال اس کے لیے ناقابلِ فہم اور اس لیے ناپسندیدہ تھی۔

بات شاید زیادہ نہ بگڑتی اور فن کار و ناقد یا فن کار و باشعور قاری کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نکل آتی مگر جعلی فن کاروں نے بیچ میں کود کر معاملے کو بگاڑ دیا۔ ان کے پاس نہ کہنے کو کوئی بات تھی، نہ بات کہنے کا سلیقہ۔ یہ ہیئت کے پیچیدہ اور غیر ضروری تجربے کرتے تھے اور انھیں فن کا معجزہ ٹھہراتے تھے، اقلیدس کی شکلیں بناتے تھے اور اسے جدید افسانہ کہتے تھے، ریاضیاتی علامتیں بے ترتیبی سے پیش کرتے تھے اور اسے نئی کہانی کا نام دیتے تھے۔ ان کے افسانوں میں جو ابہام اور الجھاؤ تھا وہ فطری نہ تھا، کوشش کر کے پیدا کیا گیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں جمالیاتی تسکین کا کوئی پہلو نہ نکل آئے۔ افسانے کے قاری سے اسی طرح غور و فکر کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے جس طرح شعر کے قاری سے مگر افسانہ ایسا تو ہو جو قاری کو اپنی گرفت میں لے سکے اور اسے ایک ایک کر کے گرہیں کھولنے پر مجبور کر دے۔ بہرحال ہوا یہ کہ ان جھوٹے فن کاروں کی بھیڑ میں سچے فن کار بھی کھو گئے۔ ایسے میں نئے افسانے کے نقاد کا فرض تھا کہ پرکھے اور کھرے کھوٹے کو الگ کر دے۔ مگر ہوا یہ کہ ہمارے تنقید نگار دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ کو نئے افسانے کا سارا سرمایہ ہذیان نظر آیا۔ دوسرے گروہ کو بے سر و پا افسانے بھی وحی معلوم ہوئے۔ اور جہاں تک معنی کی تلاش کا معاملہ ہے لوگوں نے اس شعر میں بھی مفہوم ڈھونڈ نکالا ہے کہ :

ٹوٹی دریا کی کلائی، زلف الجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا، آدمی بادام میں

لیکن ندی نالے رفتہ رفتہ اترنے لگے۔ افسانہ نگار کو یہ احساس ہونے لگا کہ دھرتی سے بہت دور جا کے اور قاری کے لیے چیستاں بن کے نہ وہ زندہ رہ سکتا ہے نہ اس کا فن۔ ایسے ادب کا تصور ممکن ہی نہیں جو جمالیاتی حظ سے عاری ہو اور بصیرت سے محروم۔ افسانے میں چاہے کچھ نہ ہو مگر اتنا تو ہو کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جائے۔

چنانچہ آج کا افسانہ گزرے ہوئے کل کی بہ نسبت زیادہ ارضی، زیادہ قابلِ فہم اور نتیجتاً زیادہ دلچسپ ہے۔ کل کے افسانہ نگار نے قاری کو مرعوب کرنے کے لیے جو ژولیدہ بیانی اختیار کی تھی، اس کے صبر کا امتحان لینے کے لیے جو الجھے الجھے تجربے کیے تھے آج کا افسانہ ان سے نجات پا چکا ہے لیکن کسی کو یہ انتظار ہو کہ اردو افسانہ لوٹ کر ایک دن پھر پریم چند یا ترقی پسند تحریک کے دور میں داخل ہو جائے گا اور پہلے کی طرح سیدھے سادے طریقے سے مسائل سے نبرد آزما ہوگا، راست گفتاری سے کام لے گا، واشگاف اندازِ بیان کو اپنائے گا یا پہلے کی طرح سریع الفہم ہو جائے گا تو شاید اسے مایوسی ہوگی۔ نئے افسانے میں ممکن ہے کہ پیچیدہ بیانی کو بھی دخل ہو۔ اس میں نئی نئی علامتیں بھی داخل ہوتی رہیں گی۔ باشعور قاری کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ مستقبل کا افسانہ اس سے غور و فکر کا مطالبہ کرے گا، آج سے بھی زیادہ غور و فکر کا!

نئے افسانے نے جن جہتوں میں قدم اٹھایا ہے **الفاظ** کا یہ **افسانہ نمبر** ان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ اس شمارے میں معتبر افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شامل ہیں اور افسانے کے مستند نقادوں کے مضامین بھی۔ اس کے مطالعے سے شاید افسانے کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اندازہ ہوگا کہ افسانہ کتنا لمبا سفر طے کر کے اس منزل تک پہنچا ہے اور آیندہ اس کے امکانات کیا ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ ضخامت بڑھ جانے کے سبب موصول ہونے والے تمام افسانے اور مضامین اس شمارے میں شامل نہ کیے جا سکے۔ انھیں افسانہ نمبر کی دوسری جلد میں پیش کیا جائے گا جس کے لیے قارئین کو کچھ دنوں انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔

ـــــ مجلسِ ادارت

(ڈاکٹر) قمر رئیس

پریم چند کی روایت

پریم چند نے اردو زبان و ادب اور اس کے سرمایۂ فکر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ انھوں نے زندگی اور کائنات کو فکر و نظر کے مروجہ زاویوں سے ہٹ کر ایک نئی سطح سے دیکھا۔ ایک ایسی بلند سطح سے جہاں سے زندگی اور انسانیت کا سمندر کروٹیں لیتا۔ اور ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔ وہ پہلے ادیب ہیں جن کی نظر حیات انسانی کے اس انبوہ میں ان مجبور اور مقہور انسانوں تک پہنچی۔ جو قدرت کے دوسرے بے زبان مظاہر کی طرح صدیوں سے گونگے اور بے زبان تھے۔ پریم چند نے انھیں زبان دی۔ ازلی پسپائی اور پسماندگی کے شکار یہ ہندوستان کے دبے کچلے کروڑوں انسان تھے۔ جو ملک کی غالب اکثریت اور اس کی دولت، تہذیب و شان و شوکت کے خالق تھے۔

پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ہندوستانی گاؤں کے کسانوں، کھیت، مزدوروں اور ہریجنوں کی عظمت اور انسانی وقار کو سمجھا۔ ان کے لئے ادب کے کشادہ دروازے کھولے۔ اور انھیں ہیرو بنا کر، ان کے دکھ سکھ کی گاتھا سنا کر اردو کے افسانوی ادب کو نئی وسعتوں اور ایک نئے احساسِ جمال سے آشنا کیا۔ اس طرح اردو ادب جو اب تک شہر کے اعلیٰ اور متوسط طبقے کی ترجمانی کرتا تھا۔ سارے ملک کی متحرک زندگی، عوامی تحریکوں، سماجی آویزشوں اور عام انسانوں کے مشغلوں اور معرکوں کا جاندار مرقع بن گیا۔

عام طور پر شہر کے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کو گاؤں کے کروڑوں مفلوک الحال کسانوں کی زندگی کی طرف متوجہ کرنے اور ان سے جوڑنے کا کارنامہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جیسے سیاسی رہنماؤں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن پریم چند نے ہندوستانی سیاست میں ان کے طلوع ہونے سے پہلے (۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۶ء) تک بے غرض محسن، صرف ایک آواز، کیفر کردار، اور خونِ سفید جیسی کہانیاں لکھیں۔ جن کے ہیرو کسان اور وہی مزدور ہیں۔ اور جن میں پریم چند نے پولیس، مہاجنوں، مہنتوں اور زمین داروں کے ہاتھوں کسانوں کی تباہی کے قصے سنائے اور بتائے کہ اس نوآبادیاتی نظام میں دیہی معیشت اور کسان کی بربادی کی جڑیں کہاں تک پہنچی ہیں۔ ہندوستانی عوام کی زندگی اور ان کے مقدر سے پریم چند کا یہ رشتہ ایک نمو پذیر اور متحرک رشتہ تھا۔

جو آزادی اور انصاف کے لئے عوام کی بڑھتی ہوئی جد و جہد اور بیدار ہوتے شعور کے ساتھ زیادہ گہرا، زیادہ معنی خیز، زیادہ تہہ دار اور حساس ہوتا گیا۔ اور اس کے ساتھ ان کا فنی شعور بھی ارتقا اور تکمیل کے مرحلے طے کرتا گیا۔ پریم چند کے بعض معاصرین مثلاً اعظم کریوی اور سدرشن نے بھی گاؤں کی زندگی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا لیکن ان کے یہاں گاؤں کا جو تصور ابھرتا ہے اس کی ترکیب میں جذباتی اور تخیلی عناصر کا زیادہ دخل ہے۔ جیسے شہر کے ہنگاموں، خود غرضیوں اور شور و شر کے مقابلے میں، گاؤں زیادہ پُرسکون، پُر عافیت اور راحت بخش ہو، پریم چند ٹالسٹائی کی طرح غریب اور مجبور کسانوں کی سادگی اور اعلیٰ اخلاقی ظرف پر زور دینے کے باوجود ان کی روحانی اذیتوں، محرومیوں اور سماجی رشتوں کی تصویریں مشاہدہ کی ایسی باریکی اور تازگی کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ جیسے وہ ان میں سے ہوں۔ ان کے دکھوں میں شریک رہے ہوں۔ ان کی جھونپڑیوں سے نکل کر آئے ہوں اس جذبۂ اتحاد نے ان کے افسانوں اور ناولوں میں دردمندانہ واقفیت کا جو اچھوتا رنگ بھرا ہے وہ اردو افسانے کی سب سے زیادہ تابناک، پائیدار اور جاندار روایت ہے۔ 'سوا سیر گیہوں'، 'بوڑھی کاکی'، 'پنچ پرمیشور'، 'نجات'، 'دو بیل'، 'دودھ کی قیمت'، 'پوس کی رات'، 'نئی بیوی'، اور 'کفن'، جیسی کہانیاں اسی مقدس روایت کے روشن ستون ہیں۔ ناولوں میں گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، میدان عمل، اور گئو دان سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کردار بظاہر سیدھے سادے ہونے کے باوجود یک رخے اور اکہرے نہیں ہیں۔ الگو، جمن، دکھی، منگل، ہلکو، گھیسو، بلراج، سورداس، ہوری۔ یہ سب اپنے داخلی اور خارجی رشتوں کے اعتبار سے پہلو دار اور پیچیدہ کردار ہیں۔ وہ اپنی ذات کے آشوب اور اپنے ماحول کے جبر اور عتاب کی ایسی علامت بن جاتے ہیں۔ جس سے نہ صرف اس زمانے کا بلکہ آج کا قاری، ہر زبان، ہر ملک کا قاری ایک احساس یگانگت اور مماثلت محسوس کرتا ہے۔ یہ کردار مقامی عصری اور آفاقی تینوں اوصاف کے حامل ہیں۔ خارجی ماحول کی جزئیات مقامی اثرات کی حد بندی کرتی ہیں، سماجی رشتوں کی کشمکش عصری حقائق کی نشاندہی کرتی ہے اور ذہنی تلازمات یا کرداروں کی علامتی تہہ داری آفاقی جہات کا اشاریہ ہوتی ہے۔ یہ کردار اپنی روح کی تنہائی اور اپنے دکھوں کی فصل سمیٹنے کی کوشش میں اس طرح بکھر جاتے ہیں کہ ساری انسانیت اپنا سمجھ کر ان کی شناخت کرتی ہے۔ گیورگی لوکاچ نے ایک مضمون میں کہا ہے۔

"ہر بڑی تخلیقی تصنیف میں کردار اس پُر اثر انداز سے پیش کئے جاتے ہیں کہ وہ نہ صرف مختلف طریقے سے آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ سماج اور سماج کے عظیم مسائل پر بھی ان کی چھاپ پڑتی ہے۔ ان کا باہمی ربط اور تعلق جس قدر گہرائی کے ساتھ ذہن نشین ہوگا اور اس کا تانا بانا جس قدر گھنا ہوگا، اسی قدر

اس تصنیف کی امکانی اہمیت زیادہ ہوگی۔"

گوشۂ عافیت، میدان عمل اور گئودان جیسے ناولوں کے علاوہ گاؤں کی زندگی کی ترجمانی کرنے والے، پریم چند کے بے شمار افسانوں میں انسانی رشتوں کی یہی تہہ داری گہرائی اور گھناپن، انھیں بے مثل فنی بلندیوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ ان کے تار و پود میں اس عہد کی اجتماعی زندگی کے بنیادی مسائل اس باریکی سے بُنے ہوئے ہیں کہ ان کو افسانوں اور ناولوں کی تخلیقی وحدت اور کرداروں کی انفرادیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ غلامی کی لعنتوں سے برہمی یا بے زاری ہو یا بڑھتی ہوئی طبقاتی پیکار سے وابستگی، مجہول رسم ورواج میں جکڑی ہوئی ہندوستانی عورت کی مظلومی اور محکومی ہو یا فرقہ وارانہ کشیدگی، سماج میں اپنے انسانی حقوق اور انسانی وقار کی بحالی کے لئے ہریجنوں کی جدوجہد ہو یا ایک غیر ملکی نظام تعلیم سے فیض یافتہ نوجوانوں کی اپنے عوام کی حالت سے بے رحمانہ علیٰحدگی اور بے اعتنائی۔

یہ اور دوسرے قومی مسائل، پریم چند کے افسانوں میں اس عہد کی بنیادی سچائیوں کو پیش کرتے ہیں۔ اجتماعی عوامل اور استحصالی طاقتوں کے تناظر میں، گاؤں کے دبے کچلے انسانوں کی زندگی کی تصویر کشی پریم چند کی ایسی روایت ہے جس نے جدید اردو افسانوی ادب میں اپنی بقا کے وسیع امکانات تلاش کئے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقت نگاری کے جس رجحان نے فروغ پایا، اس میں بھی اس توانا روایت کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، بلونت سنگھ اور آزادی کے بعد قاضی عبدالستار، عبداللہ حسین، انور عظیم اور جمیلہ ہاشمی کی ان گنت کہانیوں میں یہ روایت سانس لیتی نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلی چوتھائی صدی میں مغرب کے بعض فنی رجحانات اور افکار کے نفوذ و اثر سے اردو میں اس روایت کو نقصان پہنچا ہے۔ لیکن اس دور میں بھی رتن سنگھ کی بعض کہانیوں کے علاوہ سریندر پرکاش نے "بجوکا" لکھ کر شعور فن کی ایک نئی سطح پر اس روایت کی بازیافت کی ہے۔

پریم چند نے افسانے میں حقیقت پسندی کے جس تصور کو رواج دیا وہ زندگی کے مادی مظاہر کو معروضی انداز سے دیکھنے اور سمجھنے پر اعتراض کرتا ہے۔ اپنے وجود اور اپنے شعور سے باہر زندگی کے خارجی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ پریم چند بعض دوسرے حقیقت پسند ادیبوں کی طرح ظاہری حقیقت اور اصل حقیقت میں فرق کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اصل حقائق وہ تاریخی قوتیں ہیں جو اپنی آویزش اور اثر سے معاشرہ کو متحرک رکھتی ہیں۔ اور انسان کے داخلی رویوں اور خارجی رشتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کہانی میں زندگی کا شائبہ پیش کرنے والی جو ایک آزاد دنیا خلق کی جاتی ہے وہ خارجی دنیا کا عکس ہونے کے باوجود اس سے زیادہ حقیقی، زیادہ جاندار، زیادہ دلچسپ اور زیادہ معنی خیز اس لئے ہوتی ہے کہ فنکار اپنے شعور اور تخیل کی مدد سے اس میں ظاہری حقیقتوں

اور ان کے پیچھے، بروئے کار اصل حقیقتوں کے درمیان رشتہ تلاش کر لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حقیقتوں کے اس پیچیدہ عمل اور ردِ عمل کے افہام و تفہیم میں وہ کبھی کبھی فریب اور مغالطوں کا شکار بھی ہوتا ہے۔ اور یہ ہم چند بھی ہوئے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اس تصور کی معروضیت، فنکار کو زندگی کی انحطاط پذیر اور ترقی پسند قوتوں کے ادراک میں مدد دیتی ہے، پریم چند کی بیشتر کہانیوں میں اسی حقیقت پسندانہ رویّے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے متوازی پریم چند کے دور میں ایک رومانی یا انفرادیت پسندانہ نقطۂ نگاہ بھی پرورش پا رہا تھا۔ جو معاشرہ کے بجائے فرد کی داخلی دنیا اس کے جذبہ اور وجدان کو اہمیت دیتا تھا۔ اور انسانی تجربات کو اکثر ایک ماورائی اور تجریدی سطح پر پیش کرتا تھا۔ وہ کائنات اور حیاتِ انسانی کے چند خاص مظاہر مثلاً حُسن و عشق، آزادی، خوش ذوقی، آرزومندی، آراستگی پر زور دیتا تھا۔ فکر و نظر کا یہ اسلوب سجّاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور ایک حد تک مجنوں گورکھپوری کے ناولوں اور افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اردو افسانہ کے ارتقا میں اس روایت نے بھی اہم حصہ لیا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عبّاس اور اختر انصاری کی تخلیقات میں بھی رومانی احساس و فکر کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس دور میں بھی، پریم چند کی حقیقت پسندی کی روایت کو غلبہ حاصل رہا۔ رومانی رجحان بتدریج روبہ زوال ہو کر تحلیل ہوتا گیا۔ راجندر سنگھ بیدی، اوپیندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، شوکت صدیقی، اور بعض دوسرے ادیبوں کے افسانوں میں سماجی حقیقتوں کے اسی معروضی ادراک و اظہار کا اثر غالب رہا جو پریم چند کی روایت کا جزوِ خاص تھا۔

بیدی کے افسانوں میں روزمرّہ کی زندگی کی حقیقتیں اور انسان کی داخلی واردات جس طرح ان کی تخلیقی ذہانت اور شعور سے مس ہو کر ہیئت اجتماعی اور انسانیت کے وسیع تر حقائق اور مسائل کا علامیہ بن جاتی ہیں۔ وہ پریم چند کی روایت کی نمو پذیر اور ارتقا یافتہ صورت ہے۔ پریم چند اور بیدی کے بہت سے المیہ کرداروں، خاص کر نسوانی کرداروں کے مطالعہ میں بھی یہی شعور اور دردمندانہ احساس مشترک ہے جو قاری کے دل میں اس ماحول کے خلاف جن میں وہ سانس لیتے ہیں ایک خاموش احتجاجی چیخ بن کر جاگ اٹھتا ہے۔ سعادت حسن منٹو، احمد علی، انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے ان گنت افسانوں میں بھی انسانی تجربات اور دکھ درد کے سماجی تناظر کا احساس پریم چند کی یاد دلاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آزادی کے بعد صنعتی اور سائنسی ترقیوں، زمین داری کے خاتمہ اور بڑے شہروں میں مشینوں کے تسلّط نے سماجی رشتوں اور انسانی رویّوں پر دوررس اثرات ڈالے ہیں۔ گاؤں بھی اب شہروں کے قریب آ رہے ہیں۔ اخلاق اور انسانیت کے پرانے معیار اور قدیم ساجی عہد کی اقدار

کا طلسم تیزی سے ٹوٹ رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کی راحتیں اور لعنتیں اپنا مکمل جما رہی ہیں۔ اور بقول کارل مارکس اس نظام میں علیحدگی یا بیگانگی کا اذیت ناک احساس انسان کا مقدر ہے وہ لکھتا ہے۔

"صاحب جائداد و املاک طبقے اور پرولتاری طبقے دونوں ہی سرمایہ دارانہ نظام میں اجنبیت اور بیگانگی کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن اوّل الذکر طبقہ اس اجنبیت پر مطمئن ہے اور اسے روا رکھنا چاہتا ہے۔ جب کہ موخر الذکر طبقہ اس اجنبیت کو اپنے لئے سم قاتل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ اجنبیت نہ صرف اس کی کمزوری اور بے بسی کا سبب ہے بلکہ اس کے غیر انسانی وجود کا باعث بھی یہی ہے۔"

ظاہر ہے کہ محنت کش انسانوں کی بیگانگی کا یہ مسئلہ پریم چند کے عہد میں ابھر کر نہیں آیا تھا۔ یہ اسی دور سے مخصوص ہے اور اس عہد کے افسانوی ادب میں نمایاں ہے۔ ان میں سے زمانے کے جن ادیبوں نے صورتِ حال کو مادی حقائق کے تناظر میں عقلی اور حقیقت پسند نقطۂ نگاہ سے سمجھا ہے وہ پریم چند کی روایت سے قریب رہ کر اسے اظہار کے نئے امکانات سے ہمکنار کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں بیگانگی کے داخلی اور خارجی مظاہر اور دوسرے عصری حقائق ٹھوس، مانوس اور متحرک پیکروں یا استعاروں میں نظر آتے ہیں۔ اور اس لئے ان کا تاثر، ان کی ترسیل، خیال انگیز اشاریت سے معمور ہوتی ہے۔ وہ پریم چند کی طرح عصری زندگی کی پیچیدگیوں کی آگہی اور بصیرت میں قاری کو شریک کر لیتے ہیں۔ جیلانی بانو، جوگندر پال، اقبال متین، رام لعل، کلام حیدری، واجدہ تبسم، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، رتن سنگھ، آمنہ ابوالحسن کنور سین، عابد سہیل اور نوجوان ادیبوں میں سلام بن رزاق، الیاس احمد گدی، انور قمر، سید محمد اشرف اور عبدالصمد ایسے فنکار ہیں جنھوں نے اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ پریم چند کی عظیم روایت کی توسیع و تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ انور سجاد، سریندر پرکاش اور بلراج مینرا کی بعض کہانیوں میں بھی اجتماعی آشوبِ حیات کی بڑی تیکھی جاندار اور سہ پہلو تصویریں ملتی ہیں۔

پریم چند کی روایت سے وابستہ عصرِ حاضر کے ادیبوں کی تخلیقات میں زندگی اپنی پہنائی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ زیادہ کثیر الجہت، تہ دار اور معنی خیز نظر آتی ہے۔ اس کے متوازی اس دور میں ایسے فنکار بھی ہیں جنھوں نے پریم چند کی روایت سے شعوری طور پر گریز کیا ہے۔ اور افسانہ کو شاعری اور تخص سے قریب تر لانے کی کوشش میں انفرادیت پسندی اور ماورائیت کی اس روایت سے اپنا رشتہ جوڑا ہے جسے اردو یا عالمی افسانہ میں روحانی احساس و فکر کی روایت کہا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ میرے موضوع سے خارج ہے۔

پریم چند کی تخلیقات میں بیگانگی اور تنہائی کا وہ احساس تو نہیں ہے جو آج اس مشینی اور صنعتی عہد کی

دین ہے لیکن فرد کی تنہائی کا وہ عذاب جو طبقاتی استحصال اور ظلم و استبداد کی آہنی مشین میں پس کر اسے حیوانوں
کی سطح پر جینے پر مجبور کر دیتا ہے، پریم چند کی بہت سی کہانیوں اور ناولوں میں ڈرامائی شدت کے ساتھ نمایاں نظر
آتا ہے۔ پریم چند کے آرٹ میں ڈرامائیت، حیرت زا واقعات عمل کی تیزی یا اس کی تلافی کے لئے داستانی اور اسطوری
عناصر کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ کرداروں کی انفرادی حیثیت، ان کے باہمی روابط اور اشخاص کی ذہنی اور جذباتی
کشمکش اور تناؤ کے بیان میں ایسی حیرت خیز کیفیات پیدا کر دیتے ہیں جو ڈرامائی حسن سے معمور ہو کر قاری کے لئے
ایک انکشاف بن جائے۔ "دودھ کی قیمت" میں منگل کی اذیت ناک تنہائی اس کی ایک مثال ہے جس کی ماں گاؤں کے
ایک امیر برہمن کے بچے کو دودھ پلا کر پالتی اور مر جاتی ہے اور منگل جو ماں کے دودھ سے محروم رہتا ہے۔ اسی بچہ
کے جھوٹے پتل چاٹ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں۔ "سخت جان منگل جھلستی ہوئی لو، کڑاکے کے
جاڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ اور تندرست تھا۔ بس اس کا ایک دوست تھا۔ گاؤں کا کتا جو اپنے
ساتھیوں کے ظلم سے عاجز آکر، منگل کی پناہ میں آگیا تھا۔ دونوں ایک ہی کھانا کھاتے۔ ایک ہی ٹاٹ پر سوتے.....
ٹامی کوں کوں کرتا دُم ہلاتا..... اور پر چڑھ جاتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔" پوس کی رات میں ہلکو کی دکھ بھری زندگی
اور تنہائی کا رفیق بھی ایک کتا جبرا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں۔

> "پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو
> اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کی پتیوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی
> گاڑھے کی چادر اوڑھے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی 'جبرا' پیٹ میں منھ
> ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا۔ دونوں میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی.....
> جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے 'جبرا' کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے
> اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی۔ پر اُسے اپنی گود سے چپٹائے
> ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔"

بھوک افلاس، بے چارگی اور بے حسی کی یہی وہ اذیت ناک تنہائی ہے جو 'سوا سیر گیہوں' کا شنکر اور 'نجات'
کا دکھی چمار محسوس کرتا ہے۔ اور اس کا نقطۂ عروج 'کفن' کے گھیسو اور مادھو کی بے لاگ تصویروں میں نظر آتا
ہے۔ گاؤں کا ہر آدمی ان سے نفرت کرتا ہے۔ انھیں کتے کی طرح دھتکارتا ہے اور وہ بھی اخلاق، انسانیت اور
عزتِ نفس کے ہر وصف سے آزاد حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں بھی کسانوں، کھیت مزدوروں اور ہریجنوں کی غریبی، تنہائی اور بے بسی کے
ایسے ہی مرقع ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ظلم و جبر کی طاقتوں کے خلاف جنگ بھی کرتے ہیں جیسے منوہر اور بلراج،

(گوشۂ عافیت) سورداس اور وینا پال سنگھ (چوگان ہستی) منی اور آتمانند (میدان عمل) اور کچھ ایسے ہیں جو خاموشی سے جبر و استبداد کی چکی میں پس جاتے ہیں۔ جیسے گئودان کا ہوری۔

پریم چند کی یہ شاہکار تخلیقات اور ان کے جاندار کردار اس جبر و استبداد اور ان وحشیانہ بے انصافیوں کے خلاف بھرپور احتجاج ہیں جو طبقاتی سماج میں انسان کو مجبور، مجہول اور بے حس بنا کر تنہائی کے اندھیروں میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ احتجاجی فکر کی یہ زندہ روایت بھی عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور شوکت صدیقی سے ہو کر عصر حاضر کے بہت سے افسانہ نگاروں تک پہنچی ہے۔

پریم چند نے اپنے بعض مکاتیب اور مضامین میں اپنے نظریۂ فن کی وضاحت بھی کی ہے۔ وہ افسانوی ادب میں ٹالسٹائی کی طرح بشری عناصر اور اخلاقی تصادم کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پہلو پر بھی بڑا زور دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

> "میرے اکثر قصے کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا۔ تا وقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔"
>
> "موجودہ کہانی یا ناول کی بنیاد ہی نفسیات ہے۔ واقعات اور کردار تو اسی نفسیاتی حقیقت کو قایم کرنے کے لئے جاتے ہیں۔"
>
> افسانہ تحلیل نفسی اور زندگی کے حقائق کی تصویرکشی کو ہی اپنا مقصود سمجھتا ہے اس میں تخیلی باتیں کم اور تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی نہیں تجربات تخلیقی تخیل سے دلچسپ ہو کر کہانی بن جاتے ہیں۔"

انسانی تجربات، تحلیل نفسی اور تخلیقی عمل کے ذریعہ انھیں دلچسپ اور ڈرامائی بنانا۔ افسانہ کے یہ ایسے ترکیبی اجزا ہیں جو پریم چند نے دنیا کے باکمال افسانہ نگاروں موپساں، ٹالسٹائی، چیخوف اور ٹیگور سے سیکھے ہیں جن کا ذکر انھوں نے عقیدت سے کیا ہے۔ پریم چند کے ڈھائی سو سے زائد افسانوں میں کم و بیش ایک تہائی افسانے ایسے ضرور ہیں جن میں ان عناصر کی متناسب ترکیب سے تاثر کی وحدت اور معنویت پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے کشمیر کے سیب، اور شکوہ شکایت، جیسے افسانے بھی لکھے جو کسی طرح کے پلاٹ اور کردار سے تقریباً عاری ہیں۔ اس کے باوجود یہ دلچسپ اور تاثر آفریں اس لئے ہیں کہ ان میں کسی بشری صورت حال کا انکشاف کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت اور جذبات کی گرہیں کھول گئی ہیں۔ پریم چند نے 'ٹامی' اور 'دو بیل' جیسے علامتی افسانے بھی لکھے جن کے کردار انسان نہیں حیوان ہیں۔ جو اپنے ایسے مسائل پر سوچتے، خود کلامی اور گفتگو کرتے ہیں جو ان کے اور انسانوں

کے درمیان مشترک ہیں۔ جیسے خیر و شر کی شناخت یا غلامی اور استحصال کا مسئلہ ـــــ الغرض پریم چند کے افسانوں کا جوہر وہ بشری عناصر ہیں جنھیں وہ اپنے تخیل کی تازہ کاری اور بیانیہ کی قوت اور سادگی سے شفاف اور جاندار روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کے قاری افسانہ کی تکنیک اور فارم یا انداز بیان کے حسن کو الگ سے محسوس ہی نہیں کر پاتا۔ وہ سب عضویاتی طور پر ایک دوسرے میں پیوست یا شیر و شکر ہو کر نمو پاتے ہیں۔ قاری یہ سمجھنے یا تمیز کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ کہاں واحد متکلم کی آواز ہے۔ کہاں بیانیہ، کہاں مکالمہ ہے کہاں خود کلامی۔ وہ تو انسان کی ذہنی پیکار، سماجی آویزش اور اخلاقی کشمکش میں اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ پھر اسے کسی اور شے کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ایک خط میں پریم چند نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے افسانوں میں تکنیک کے کم و بیش وہ تمام تجربے ملتے ہیں جو یوروپ کے باکمال افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ نہ صرف عام قاری بلکہ بعض نقادوں کو بھی پریم چند کے افسانوں میں تکنیک کے اس تنوع کا احساس نہیں ہوتا۔ اور بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ محض بیانیہ تکنیک کے افسانہ نگار ہیں۔

اگر ناشروں اور کتب خانوں کے ریکارڈ صحیح ہیں تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پچھلی نصف صدی میں، پریم چند ہی وہ ہندوستانی ادیب ہیں جن کی مقبولیت میں سال بہ سال اضافہ ہوا ہے۔ اور جو آج بھی سب سے زیادہ پڑھے جانے والے افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کی اس ہمہ گیر مقبولیت کا راز یہی ہے کہ وہ کسی ماورائی، ہیجان انگیز اور پراسرار دنیا کی ترجمانی نہیں کرتے۔ بلکہ افسانے میں عام انسان کی روز مرہ کی زندگی کے ایسے حقائق دریافت کرتے ہیں جو دوسرے فنکاروں کی نظر سے اوجھل رہے۔ اور ان کو فن کا ایسا لباس دیتے ہیں جو ان کے اچھوتے حسن اور معنویت کو ابھارتا ہے۔ مثال کے طور پر 'زیور کا ڈبہ'، 'جج اکبر'، 'قلی ڈرا'، 'روشنی' اور 'مالکن'، جیسے افسانوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں وہ انسان کو تنہائی کے ایسے لمحوں میں اور زندگی کے ایسے دھندلکوں میں دیکھتے ہیں جہاں کسی اور کی نظر نہیں پہنچی۔ انسان اپنے آپ میں کتنا پر اسرار ہے؟ وہ ماحول کی آسیبی طاقتوں کے شکنجے میں کیسی گھٹن محسوس کرتا ہے؟ اس کی خود پرستی اور انا کا طلسمی حصار اسے اپنے ہم جنسوں سے کتنا دور کر دیتا ہے؟ اس کے ظاہر اور باطن میں کیسا تضاد ہے؟

بیگانگی، ریاکاری اور اخلاقی کشمکش اس کے لئے کیسی روحانی اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار نفسیاتی واردات ہیں ان کے افسانوں میں، قاری کو انسانیت کی روح سے قریب تر کرتیں اور اسے اعتماد اور عمل کی راہیں دکھاتی ہیں۔ یہی انسانی عناصر پریم چند کے فن کی اساس ہیں۔ پریم چند جانتے تھے کہ انسان کی توجہ اور تشویش کا سب سے بڑا مرکز خود انسان کی ذات ہے۔ اس کے معمولات، مشغلے اور مسائل ہیں، آفاقی سچائیوں کی تلاش، فلسفہ طرازی یا ایسی تجرید جو زندگی کی حقیقتوں کو روشن کرنے کے بجائے روپوش کر دے۔ کم از کم

افسانے میں ان انسانی وظائف و عناصر کا نعم البدل نہیں ہو سکتی جو اس کی شعریات کا جزو لازم رہے ہیں۔

اصغر علی انجینیر نے ایک مقالے میں پریم چند کے فن کی جمالیاتی کردار پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"برطانوی حکومت نے صدیوں پرانے ہندوستانی سماج میں نئے پیداواری رشتے اور ایک حد تک نئی پیداواری طاقتوں کو جنم دے کر حرکت پیدا کر دی تھی۔ یہ ماضی کی طرح حکمرانوں کی تبدیلی ہی نہیں تھی۔ برطانوی حکومت نے ایک نئے سماجی نظام کو بھی جنم دیا تھا۔ پریم چند نے اپنی دوربین نگاہوں سے اس فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ ان کی آنکھیں کبھی خارجی چمک ودمک پر مرکوز نہیں رہیں۔ ان کی تیز بین نگاہیں اس (چمک ودمک) کے پیچھے دیہاتی ہندوستان میں پائے جانے والے تضادات اور یہاں کے مفلس عوام کی داخلی زندگی میں خام مواد تلاش کرتی ہیں۔ اور وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے امکانی اور حقیقی کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی اصل طاقت کا سرچشمہ ان ہی دیہات کے ان مفلس عوام میں نظر آیا جو اپنی زندگی میں معمولی سی خوشگواری پیدا کرنے کے لئے سخت سے سخت مشقتوں کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ پریم چند نے اپنے فن کے ذریعے نہ صرف ہندوستان کی بنیادی سچائیوں تک رسائی حاصل کی بلکہ ہندوستانی ادب کو ایک ایسے جمالیاتی مذاق سے روشناس کرایا جو فن کی اعلیٰ ترین قدروں سے ہم آہنگ ہے۔ □

وحید اختر

سخن گسترانہ بات

[ہمیں خوشی ہے کہ اس شمارے سے اردو کے ممتاز شاعر اور نقاد وحید اختر "سخن گسترانہ بات" کے عنوان کے تحت موجودہ ادبی مسائل پر لکھنا شروع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی قسط پیش ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی جابجا درمیان میں کوئی ایسی بات آپڑے جس سے ہم اختلاف کر سکیں، لیکن اس سے کسی کی دلآزاری مقصود نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح کچھ لکھنے والوں کو تحریک ہو۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ متنازعہ فیہ امور پر بحثیں چھڑتی رہیں لیکن اسے ادارہ کی پالیسی یا اس کا نقطۂ نظر نہ سمجھا جائے۔ ہم پروفیسر وحید اختر کے قلم پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگانا چاہتے کیوں کہ ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ وہ خود ایک ذمہ دار نقاد ہیں اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں۔ (ادارہ)]

---

(۱)

۱۹۵۸ء کی بات ہے، مرحوم "صبا" حیدرآباد اس وقت ایک سمت نما، فعال اور توانا ادبی رسالہ تھا۔ اس سال میرا نام مجلس ادارت میں شامل کیا گیا۔ ایک ڈیڑھ برس یا کچھ زائد عرصے تک سلیمان اریب کے ساتھ تخلیقات کے انتخاب سے لے کر رسالے کو فکر انگیز و بحث انگیز رکھنے کے لئے میں نے کئی نئے چہرے جریدے میں روشناس کئے۔ ان ہی میں "سخن گسترانہ بات" کا مستقل عنوان بھی تھا جو "صبا" کا حرفِ آغاز ہوا کرتا تھا۔ ہوا یہ کہ مقطع کی نوبت نہ آئی اور مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات آپڑی۔ اس وقت جدیدیت کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ترقی پسند رسائل کے صفحات جمود کا مسئلہ چھیڑ کر سرد ہو چلے تھے۔ نئی نسل کا مسئلہ سر اٹھا چکا تھا۔ غالباً سخن گسترانہ بات کے دوسرے یا تیسرے عنوان سے میں نے نئی نسل کے ذہنی رویے اور ادبی مزاج کی بات چھیڑ دی۔ اس ضمن میں ترقی پسند ادب کے مروجہ ادبی رویے اور اس پر مبنی تنقید

کے خلاف چند تنقیدی کلمات لکھ دیئے۔ یہ بات وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ سب نثر پارہ ایک ہنگامہ خیز ادبی مناظرے کا نقطۂ آغاز بن جائے گا۔ مرحوم سجاد ظہیر اس وقت راولپنڈی سازش کیس کے بعد تازہ وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ انھوں نے ترقی پسندی کی تائید اور اس پر نئی نسل کی تنقید کے بارے میں اپنے ٹھنڈے مزاج اور مرنجاں مرنج طبیعت کے برخلاف بہت گرم باتیں لکھ دیں۔ ان کا مضمون "ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے" کے ذیلی عنوان "سخن گسترانہ بات" کے ذیل میں شایع ہوا، آیندہ شمارے میں "سخن گسترانہ بات" کو میں نے جواب الجواب کے لئے عنوان دیا "تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے"۔ جواب اور جواب الجواب کی اشاعت کے بعد گذشتہ ربع صدی کا ایک اہم ادبی معرکہ چھڑ گیا۔ خود ترقی پسند ناقدین وادبا میں سے کچھ نے میرے رویّے کی تائید کی مگر بیشتر بڑے ناموں نے اپنا نام پردۂ خفا میں رکھنا پسند کیا البتہ جنھوں نے بنّے بھائی کی تائید میں اشہب قلم کو مہمیز کیا وہ اپنے نام کے پورے طمطراق اور شہرت کے ساتھ میدان میں آئے۔ ہمارے دوست عالم خوندمیری نے اس مناظرے کو نماز میں "رفع یدین" کے فقہی اختلاف کے مماثل ٹھیرایا ــــ لیکن اور حضرات نے اسے اتنا فروعی یا ضمنی اختلاف نہ سمجھا ــــ ہندوستان اور پاکستان کے کئی ادبی جرائد نے اس مناظرے کی سلجھتی ہوئی ڈور کو اپنے صفحات پر اور الجھایا یا اپنے تئیں سلجھانے کی کوشش کی۔ سرور صاحب نے پہلی بار بغیر کسی شناسائی یا تعارف کے مجھے مبارکباد کا خط لکھتے ہوئے توازن برقرار رکھنے کے ساتھ آداب دلداری کو ملحوظ رکھنے کا بزرگانہ مشورہ دیا۔ پاکستان سے ابن انشا نے لکھا "بھائی یہ بحثیں اچھی ہیں، مگر آپ لوگوں کو اندازہ نہیں کہ ترقی پسندوں پر پاکستان میں کیا بیت رہی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ اس بحث کو آگے نہ بڑھایا جائے اور ترقی پسندوں کے ادبی کارناموں پر ایسی تنقید نہ ہو"۔ ابن انشا نے جو کچھ لکھا اس کا لُبّ لباب یہی تھا۔ سنہ ۶۶ء میں سردار جعفری نے جن کی کتاب "ترقی پسند ادب" کا دوسرا ایڈیشن بھی میری تنقید کی زد میں آچکا تھا، میرے پہلے شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے "سخن گسترانہ بات" والے مناظرے میں میرے نقطۂ نگاہ کو وقت کے تقاضے کے مطابق اور جدلیاتی شعور کے معیار سے حق بجانب قرار دیا ــــ خود مرحوم سجاد ظہیر کے ادبی تنقیدی رویّے میں آگے چل کر تبدیلی آگئی۔ انھوں نے میری شاعری کو صحیح معنی میں انقلابی قرار دیا۔

ادبی جرائد کے مستقل فیچر یا کالم (یہاں صفحات کہنا بہتر ہوگا) مستقل تنقیدی اہمیت حاصل کر سکیں یا نہیں لیکن اگر وہ ادیب کے حالیہ مسائل پر لکھنے اور سنجیدہ پڑھنے والوں کی توجہ مرکوز کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں تو یہی ان کے وجود کا کافی جواز ہے۔

سنہ ۵۸ء سے سنہ ۶۲ء تک رسالوں کے صفحات پر سرحد کے دونوں طرف بہت روشنائی بہائی جا چکی

ہے ۔ اس وقت کی نئی نسل اب پرانی نہیں تو ادھیڑ یا پختہ کار ہو چکی ہے ۔ بحثوں کی نوعیتیں بدل گئی ہیں تنقید
کا لہجہ یا تو پہلے سے کہیں زیادہ تلخ و تند و گرم و تیز ہو چکا ہے یا مصلحتوں کا شکار ہو کر بے معنی لفاظی اور مدلل
مداحی بلکہ بیشتر صورتوں میں غیر مدلل جانبداری و تعصب کی شکل اختیار کر گیا ہے یا تو 'آداب دلداری' کا
سرے سے پاس نہیں یا سراسر 'آداب دلداری' ہی تنقید کی جگہ لے چکے ہیں ۔ گذشتہ ۲۲ برسوں میں کئی
نئی اصطلاحیں، فارمولے، کلیشے بنے، بگڑے اور ٹوٹے ۔ ادب کا مزاج بدلا ۔ نئی شاعری نے نظم و غزل
میں اپنے کو مستحکم کیا ۔ نئی تنقید کو اعتبار کا درجہ ملا ۔ کئی نئے معتبر نام ابھرے ۔ ترقی پسند شاعروں کے لہجے
میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں اور ترقی پسند تنقید نے بھی جدیدیت کے کم از کم چند میلانات کی معنویت کو تسلیم
کیا ۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جدیدیت اور ترقی پسندی کی مناظرانہ بحث اب اپنے معنی کو کھو چکی ہے ۔ دونوں ہی
اصطلاحیں ادبی سے زیادہ غیر ادبی مقاصد کی تابع بن کر آج کے تخلیق کار کے لئے وقعت کھو چکی ہیں
یہ مسئلہ یا اختلاف اب شاعروں یا افسانہ نگاروں کا نہیں رہا بلکہ چند ناقدوں ، امامانِ ادب اور ان کے
گنے چنے مقتدیوں کا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے اور یہ شعور عام ہو چلا ہے کہ ادب کو سب سے پہلے ادب ہونا
چاہئے محض ترقی پسند یا جدید کا شناس نامہ سینے پر لٹکا کر کوئی تحریر ادب کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی ترسیل
کی ناکامی یا ابلاغ کی کمی کا مسئلہ بھی اب جدید ادب کی شناخت کا وسیلہ نہیں رہا شعر کے علامتی اظہار کو اب
ترقی پسند بھی قبول کر چکے ہیں ۔ سماجی شعور اور سیاسی مسائل کو بھی جدیدیت کے انتہا پسند دور کے برخلاف
اب شجرِ ممنوع نہیں سمجھا جاتا یعنی اردو کا تخلیقی شعور مناظرانہ انتہا پسندیوں اور مبتدیانہ خام کاریوں سے بلند
ہو چکا ہے ۔

ان تمام خوش آیند تبدیلیوں کے ساتھ ایک اور تبدیلی بھی محسوس ہوتی ہے جو کوئی فال نیک نہیں سمجھی
جا سکتی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر ، شہرت ، مطالعے ، پختگیِ نظر اور منصب میں اضافے کے ساتھ تنقید کے قلم
کی دھار کچھ کند ہو جاتی ہے جسے ہم ادبی رواداری سمجھتے ہیں ، اسے کچھ بیباک زبانیں مصلحت اندیشی کا نام
دیتی ہیں ، اسی طرح نئے یا پرانے لکھنے والوں کی تعارف نگاری حقِ دوستی یا مروّت کہلاتی ہے ۔ تبصرے کو تعصب
کہا جاتا ہے ۔ تنقید کے سخت لہجے کو غصہ اور ہزیمت خوردگی ، تجزیے کو مفروضات کے بیان کا وسیلہ ، مسائل
کے وسیع تر احاطے کو علم کی نمائشِ بے جا اور حوالوں کی کثرت کو پریشان خیالی اور طالب علمانہ انداز کہا جاتا
ہے ۔ ان میں سے بیشتر اعتراضات درست ہیں لیکن کچھ اعتراضات ادبی مزاج کی جلد بازی و جذباتیت
اور کبھی کبھی ناپختگی و مقلدانہ روش کے نتیجے میں صادر ہوتے ہیں ۔ راقم الحروف بھی ممکن ہے بعض اعتراضات
کی زد میں آتا ہو ۔ ۲۵ برس کے قریب ادبی مناظروں اور بحثوں کے دھاروں میں نبرد آزما رہنے کے بعد ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ ان ہنگاموں سے کنارہ کشی ہی میں عافیت ہے۔ اب ہر شخص وارث علوی کی طرح عمر کے ہر مرحلے پر جذبی کے لفظوں میں نا آموزدہ کار کی جرأت کہاں سے لائے کہ ادھر کوئی کتاب سامنے آئی یا کسی کی شاعری اور تنقیدی نظریات مزاج سے ناآہنگ محسوس ہوئے اور ادھر قلم کی لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے اور دوڑا لیا ـــــ لیکن یہ ماننے میں بخل نہیں کرنا چاہئے کہ موجودہ تنقید کی گرمی اور رستخیز ایسے ہی نقادانِ قلم بکف و نظریہ بر دوش کی مرہونِ قلم ہے جو اپنی ذاتی رائے کو یدِ بیضا بھی سمجھتے ہیں اور دمِ عیسیٰ بھی۔

اطہر پرویز صاحب کے حکم کی تعمیل میں 'الفاظ' کے لئے مستقل فیچر لکھنے کا وعدہ کرتے ہوئے میں قارئین سے لازمی طور پر اس گرما گرمی اور فکری اشتعال انگیزی کا وعدہ نہیں کر سکتا جو زبان و ذہن کو چٹ پٹا مصالحہ دے سکتی ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ اتفاق میں اختلاف کے پہلوؤں کا لحاظ اور اختلاف کے حق سے اتفاق کرنے کے امکان کو نہ بھلانا چاہئے ـــــ 'صبا' کی سخن گسترانہ بات میں اختلاف کی لے کو 'نعرۂ بزن' بنتے دیکھ کر میں نے یاد دلایا تھا کہ والٹیر، روسو سے سخت اختلاف رکھتے ہوئے بھی اس پر بندش کے خلاف تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اختلاف کی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ روسو کو والٹیر سے بھی اختلاف کا حق ملنا چاہئے ـــــ آج ہم میں کوئی والٹیر ہے نہ روسو۔ لیکن پھر بھی اگر ہم ایک دوسرے کو خود اپنے سے اختلاف کا حق دیں تو یہ ہمارے ادب و فکر کی نشوونما کے لئے فالِ نیک ہوگا۔

(۲)

افسانہ نمبر کی مناسبت سے اس بار فکشن ہی کے کچھ مسائل اٹھائے جائیں تو مناسب ہوگا۔

کوئی ۲۰ برس قبل 'صبا' ہی میں جیلانی بانو کے ایک خط سے یہ بحث چھڑی تھی کہ ناولٹ اور طویل مختصر کہانی اور پھر مختصر افسانے اور طویل مختصر افسانے اور اسی کے ساتھ ناول اور ناولٹ میں حد امتیاز کیا ہے ـــــ یہ بحث نیا دور کراچی کے ایک ناولٹ نمبر پر میرے تبصرے کا شاخسانہ تھی ـــــ بحث میں کئی افسانہ نگاروں نے حصہ لیا، لیکن ناول اور افسانے پر کئی انگریزی مستند کتابوں اور نقادوں کی آرا کے حوالوں کے باوجود مسئلہ لاینحل رہا۔ چند ماہ قبل اس مسئلہ پر قرۃ العین حیدر سے گفتگو کا موقعہ ملا کہ وہ خود اپنے افسانوں اور ناولٹوں یا طویل مختصر کہانیوں میں کس طرح امتیاز کرتی ہیں۔ بات شاید اس نقطے پر آکر رکی کہ ناولٹ ناول کا MINIATURE ہے اور طویل مختصر کہانی افسانے کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی ناولٹ کو ناول کے اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے اور طویل مختصر کہانی کو افسانے کے معیاروں پر پورا اترنا چاہئے ـــــ اسی ضمن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ 'ناول کیا ہے'؟ ایک نقاد نے اپنے مطالعۂ ادبِ مغرب کی رو میں لکھ دیا کہ "کارِ جہاں

دراز ہے" ناول ہی نہیں ــــ قرۃ العین اس پر برافروختہ تھیں۔ کوئی دوسرا ناقد یہ کہہ سکتا ہے کہ "کارِ جہاں دراز ہے" خود نوشت بھی نہیں۔ خود نوشت میں وسط ایشیا کی تاریخ، اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کی داستان اور فلسفہ و تصوف کے نظریات کی تفصیل کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے؟ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ "کارِ جہاں دراز ہے" تاریخ بھی نہیں، ROMANCE بھی نہیں ــــ ناول کو عہد جدید کا رزمیہ (EPIC) کہا گیا ہے لیکن یہ کیسا ناول ہے کہ کئی عہدوں کے رزمیوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ قرۃ العین کی اس تصنیف کو ہر پہلو سے دیکھنے کے بعد یہ سوال پھر سامنے آگیا کہ آخر ناول کی تعریف کیا ہے۔ شاید ناول کی کوئی تعریف نہیں۔ ناول سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ناول زندگی کی طرح ہمہ جہت اور متنوع ہے۔ اس میں فلسفے کی بھی گنجائش ہے، تاریخ کی بھی، نفسیاتی تجزیے کی بھی، اسطور سازی کی بھی، سفرنامے کی بھی، فینٹیسی (طلسم آفرینی) کی بھی، خود نوشت کی بھی حتیٰ کہ فنونِ حرب کی انتہائی تکنیکی بحث کی بھی۔ اگر ایسا نہیں تو ٹالسٹائی کی جنگ و امن کے ان مسلسل ابواب کو ناول کے دائرے سے خارج کرنا ہوگا جن میں اس نے جنگ کی نقشہ بندی (STRATEGY) سے بحث کی ہے۔ والٹیر کی کاندید لائبنز کے فلسفے پر طنز ہے۔ سولفٹ بنیادی طور پر طنز نگار ہے بلکہ ہجو نگار۔ گوگول کی "مردہ روحیں" حقیقت اور متخیلہ کی آمیزش ہے۔ تاریخی ناول تو ماضی پرستی کے قلم نے اردو میں بھی بہت لکھے، ہر معیار اور سطح کے ــــ مارسل پروست کی "ماضی کی یادوں" کے سلسلے کے ناولوں کے حدود کیا ہیں؟ ناول کے حدود کے تعین میں "آگ کا دریا" کا پہلا حصہ بھی معرضِ بحث میں آچکا ہے۔ ناقدین ان حدود کا تعین کرتے رہیں، ان کا جو فرض ہے اربابِ تنقید جانیں۔ قرۃ العین کا کام ناول لکھنا ہے اور جس تخلیق کو ناول کہیں ہمیں اس وقت تک ناول ماننا پڑے گا جب تک ہم اس پر اعتراض کے لئے کوئی قوی دلیل نہ لائیں اور قوی ترین دلیل یہی ہو سکتی ہے کہ قرۃ العین سے بہتر ناول کوئی لکھے جو شاید موجودہ نسل کے لئے ناممکن ہے۔

پریم چند کے ناولوں کو چھوڑ کر آگے بڑھتے تو اردو میں ناول کے سفر میں چند ہی روشن نشانات ملتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی"، "آگ"، "ہوس"، "مرمر اور خون"، "گریز"، کرشن چندر کا "شکست" اور "جب کھیت جاگے" (دوسرے ناول قابلِ ذکر نہیں) عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر"، "معصومہ" اور اب کربلا پر ان کا ناول۔ خواجہ احمد عباس کا "انقلاب"، غلام عباس کا "گوندنی والا تکیہ"، حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول"، شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی"۔ ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی"، خدیجہ مستور کا "آنگن" جیلانی بانو کا "ایوانِ غزل" بیدی کا ناولٹ (یا ناول؟) "ایک چادر میلی سی"، جمیلہ ہاشمی کا "تلاشِ بہاراں" عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں"، حال میں انتظار حسین کا ناول "بستی" شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ احسن فاروقی،

رضیہ فصیح احمد، قاضی عبدالستار اور احمد ندیم قاسمی کے بھی ناول ہیں۔ ان میں سے کچھ میری نظر سے نہیں گزرے۔ میں اس فہرست میں ایم اسلم، قیسی رام پوری، اے آر خاتون اور ان کی امت کی خواتین ناول نگاروں کو اس فہرست سے ادب و احترام کے ساتھ خارج کر رہا ہوں۔ البتہ ناول کی تعریف اور حدود کے جویا معترض نہ ہوں تو میں مشتاق احمد یوسفی کی "زرگزشت" کو بھی ناول کی صف میں شامل کرنے پر آمادہ ہوں اگرچہ کہ خود یوسفی نے اسے ناول نہیں کہا ہے صرف گنتی مقصود ہو تو ناول نگاروں اور ناولوں کی بڑی طویل فہرست بن سکتی ہے۔ پریم چند سے پہلے شرر ہیں جن کا ناول "فردوس بریں" بہرحال ایک اچھا ناول ہے۔ رسوا کا ناول امراؤ جان ادا اردو میں کلاسیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادبی پایے کے اچھے ناول چند ہی ہیں۔

اردو کے چند اعلیٰ ناولوں میں جسے بری طرح نظر انداز کیا گیا وہ "علی پور کا ایلی" ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان میں ممتاز مفتی کے اس ناول کے مقابلے میں آدم جی انعام جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاشِ بہاراں" کو ملا۔ خیر ادبی انعامات، وہ کسی تجارتی ادارے کے ہوں یا حکومت کے یا اکیڈمیوں کے، ان کی سیاست ہی اور ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں تو تخلیقی ادب کے مقابلے میں خشک تحقیق و تنقید کو بڑے سے بڑے ادبی انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے تو پھر بھی ناول لکھا تھا۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے ابتدائی چند افسانوں اور طویل مختصر کہانیوں سے پڑھنے والوں کو فوری طور پر متوجہ کر لیا تھا۔ ان میں بڑے امکانات نظر آئے۔ شاید اسی بنا پر "تلاشِ بہاراں" کے حجم سے پاکستانی انعام نواز دھوکا کھا گئے۔ "تلاشِ بہاراں" کی ناکامی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر اچھا افسانہ نگار اچھا ناول نگار نہیں بن سکتا۔ اسی طرح جیسے ہر غزل گو اچھی نظم یا طویل نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ناول کے لئے زندگی کا گہرا اور وسیع مشاہدہ، کرداروں اور پلاٹ کی پیچیدگیوں کو دیر اور دور تک سنبھالے رکھنے کی صلاحیت اور دیرپا تخلیقی جذبہ چاہئے ۔۔۔ قرۃ العین کی تقلید میں کسی پورے دور کو ناول کا موضوع بنالینا تو آسان ہے لیکن اس کے ساتھ انصاف کرنا بہت مشکل جب تک اس کی سی دقتِ نظر وسعتِ مطالعہ اور تخلیقی صلاحیت نہ ہو۔ خدیجہ مستور کا آنگن اس لئے کامیاب ہے کہ انھوں نے کوئی بڑا مطالعہ طلب موضوع چننے کے بجائے اپنے تجربات کی محدود دنیا ہی کو موضوع بنایا اور اس لحاظ سے "آنگن" اردو کے کامیاب ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ یہی بات ان سے پہلے عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" کے لئے کہی جا سکتی ہے۔ "علی پور کا ایلی" بھی موضوع کے محدود ہونے کے باوجود نفسیاتی تحلیل کے تقاضوں اور زندگی میں جنس کے اظہارات اور ان کے صریح اور علامتی بیان کے تمام پہلوؤں کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا کامیاب ترین ناول ہے لیکن اس پر ہندوستان یا پاکستان کے نقادوں نے کوئی توجہ ہی نہیں کی ۔۔۔ اسے تجاہلِ عارفانہ کہا جائے یا ادبی بددیانتی یا تعصب؟

اس جملۂ معترضہ سے قطع نظر کہنا یہ ہے کہ قرۃ العین نے پے در پے ایسے موضوعات چنے جو زندگی کو (افلاطون کے لفظوں میں) تمام زمان و مکان کے تناظر میں دیکھنے سے عبارت ہیں۔ 'کارِ جہاں دراز ہے' سے پہلے "سفینۂ غمِ دل" اور "میرے بھی صنم خانے" میں وہ خود نوشت کو افسانوی اظہار بنا چکی تھیں۔ یہی نہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کی بیشتر کامیاب کہانیوں میں بھی خود نوشت کا عنصر غالب ہے۔ "آگ کا دریا" کا دوسرا حصہ ان کی اپنی مہاجرت، جلاوطنی اور جڑوں کی تلاش کا قصہ ہے ــــ "کارِ جہاں دراز ہے" میں خود نوشت کو زمان و مکاں کے کلی تناظر میں پھیلا دیا گیا ہے۔ اس میں تاریخ ہی نہیں اسطور سازی بھی ہے، علامتی پیرایۂ بیان بھی اور یہی اس نامکمل ناول کی انفرادیت کا راز ہے ــــ وہ اس طرح کے تجربے افسانوں میں "ملفوظات" اور "یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے" میں کامیابی سے کر چکی تھیں ــــ کارِ جہاں ... انہی کی ہر لحاظ سے توسیع ہے جس میں زندگی اور تجربے ہی کے نہیں فکر و مذہب اور عدم و مرگ کے ابعاد بھی شامل ہو گئے ہیں ــــ قرۃ العین، یہ ماننا پڑے گا، کہ اب تک اردو کی سب سے بڑی ناول نگار ہیں۔ "آخرِ شب کے ہم سفر" لکھ کر انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ محض اس "شعری اسلوب" کی پابند نہیں جس کی بنا پر کچھ ناقدین ان کی نثر کو ناول کے لئے ناموزوں قرار دیتے ہیں۔ بنگال کی زندگی اور سماج پر لکھنے کے لئے انھوں نے اپنے اسلوب میں بنگالی ناولوں کی حقیقت نگاری اور سادہ بیانی سے پورا کام لیا ہے اور وہ اس تجربے میں بھی کامیاب رہی ہیں ــــ یہ ان کا اپنے مخصوص اسلوب سے انحراف ہے مگر تخلیقی۔ اس طرح قرۃ العین نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ شعری رزمیہ اسلوب کے ساتھ سادہ بیانیہ اسلوب کا بھی حق ادا کر سکتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو تہ داری، گہرائی اور جامعیت ان کے رزمیہ اسلوب میں ہے، وہ سادہ بیانیہ میں نہیں ــــ قرۃ العین کی کامیابی ایک اور بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ علامتی طرزِ اظہار میں نیاپن سہی، معنویت کا امکان سہی لیکن شاید ناول اور افسانے کے لئے وہ بیانیہ اسلوب ہی زیادہ سازگار ہے جس میں علامتی اور رمزیہ اظہار سے کام تو لیا جائے مگر اس کو مقصود بالذات نہ مان لیا جائے۔ شعر کی صنعتیں اظہار کے وسائل میں ممد ہوتی ہیں۔ شعری اظہار کا منتہی نہیں اور اچھا شاعر ان کا استعمال بھی عموماً غیر شعوری طور پر ہی کرتا ہے۔

علامتی طرزِ اظہار میں دو ناولیں چند مہینوں میں سامنے آئی ہیں۔ ایک بڑے طمطراق اور آن بان سے چھپی ہے "نرتا"، جو بجا... خود طباعت اور صوری حسن کا اعجاز ہے دوسری "لہو آستیں کا" جو بہت معمولی انداز میں عام سے گرد پوش، عام سے کاغذ اور اوسط سے بھی خراب کتابت کے ساتھ چھپی ہے۔ "نرتا" کے مصنف ہیں صلاح الدین پرویز اور "لہو آستیں کا" محسن علی کی تصنیف ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ دونوں کا

موضوع ایک ہی ہے عورت مرد کا رشتہ ، دونوں کا اسلوب علامتی ہے اور دونوں پر اسطوری فضا چھائی
ہوئی ہے ۔ فرق یہ ہے کہ صلاح الدین پرویز کی زبان شعری ہے اور محسن علی کی رومانی نثر کی زبان ہے صلاح الدین
پرویز اپنی کہانی میں پراسراریت اور رمزیت کو شعری اسلوب کے سہارے آخر تک برقرار رکھ سکے ہیں جب کہ
محسن علی کا نثری اسلوب کہیں کہیں رمزیت کا ساتھ نہیں دے سکا ہے اور سپاٹ بیان بن گیا ہے ۔ یہ دونوں
ناولیں اردو کی عام ناولوں کی ڈگر سے ہٹی ہوئی ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ عام قاری انھیں کس حد تک قبول کرتا
ہے اور ناول و افسانے کے ناقدین انھیں کس روشنی میں دیکھتے ہیں ۔

اردو میں ناول کی تہی دامنی کو ہر طرح کے تجربوں کی ضرورت ہے ۔

(۳)

علامتی اظہار کا ذکر آگیا ہے تو مقطع میں کچھ باتیں اس کے متعلق بھی کہنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔

گذشتہ چند برسوں میں ہمارے ادبی جرائد تجریدی اور علامتی کہانیاں کثرت سے شایع کر رہے ہیں بلکہ
اب تو افسانوں میں کہانی شاذ ہی ہوتی ہے ۔ علامت اور علامتی اظہار ہی سب کچھ ہونے لگا ہے ۔ میں اب تک
تجریدی کہانی کی کسی تعریف سے دوچار نہیں ہوا مصوری میں تجریدیت قابل فہم ہے کہ رنگ اور خطوط کی زبان
اشاراتی ہوتی ہے لیکن لفظوں کی زبان ہمیشہ کسی مرئی مقرون حقیقت کا اشاریہ ہوتی ہے ۔ الفاظ مجرد سے
مجرد تصور کو بھی ٹھوس پیکر ہی میں سامنے لاتے ہیں ۔ تجرید اور علامت یا اشارے میں فرق ہے ۔ الفاظ
اشارہ بھی ہوتے ہیں ، علامت بھی ، رمز بھی اور استعارہ بھی ۔ ادب مجرد تصورات کو بھی مرئی پیکروں میں ڈھالنے
کا فن ہے ـــــ ادب میں افسانہ اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے بھی کسی حقیقی یا فرضی واقعے کا بیان ہے ۔ یہ واقعہ
تاریخی بھی ہو سکتا ہے ، زمانی بھی ، نفسیاتی واردات بھی ، تاثر کا زائیدہ بھی ـــــ لیکن کہانی میں واقعہ کو ہمیشہ
اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ کہانی واقعے کا بیان ہے ـــــ اسی لئے کہانی کا اسلوب ہمیشہ سے بیانیہ رہا ہے
حتیٰ کہ طلسمات آفرینی بھی بیان ہی کے سہارے بڑھتی ہے ، یہ اور بات ہے کہ آج ہم پرانی داستانوں اور
قصوں ، حکایات اور اساطیر میں رمز و استعارہ تلاش کر کے انھیں نئے معانی پہنائیں لیکن ان کی مقبولیت
کا راز "کہانی پن" میں ہے ۔ جس چیز کو تجریدی کہانی کہا جاتا ہے اور جسے کبھی کبھی اقلیدسی شکلوں نقطوں
اور ریاضیاتی یا کیمیائی علامتوں میں لکھا جاتا ہے ۔ وہ زبان کے استعمال کی نادر مشق سہی ، کہانی کا حق ادا
نہیں کرتی ۔ اسی لئے قارئین میں دلچسپی پیدا نہیں کرتی ۔ اب تجریدی کی اصطلاح تو مفقود الخبر ہو
جارہی ہے لیکن علامتی کہانی کی اصطلاح روز افزوں فروغ پارہی ہے ۔ کرداروں کی جگہ علامتیں ـــ

رہی ہیں، ٹھیک ہے۔ لیکن واقعہ کی جگہ علامتوں کا تانا بانا لے لے تو کہانی اس میں گم ہو جاتی ہے۔ کافکا کی ناولیں بھی علامتی ہیں لیکن اس کے یہاں کردار علامتیں بنتے ہیں نہ کہ علامتیں کردار۔ اس کے ساتھ واقعہ کا بیان بھی ہوتا ہے اور کہانی کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔ ہمارے یہاں آج کل جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں ان میں سے اکثریت ایسی ہے جنھیں چند سطروں کے بعد پڑھنا بھی محال ہوتا ہے۔ ہر فن کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، افسانے کا تقاضا خود افسانہ ہے ــــ کسی اور وسیلے کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو مقصود ہاتھ سے گم ہو جاتا ہے۔ دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ عام طور سے تقلیدی روش کی جدید شاعری کی طرح اس نئے افسانے کی علامتیں بھی آتنی طے شدہ، گھسی پٹی اور یکساں ہوتی ہیں کہ ان میں معنی کی تہیں تلاش ہی نہیں کی جا سکتیں ــــ پھر یہ علامتیں چند مخصوص داخلی واردا توں تک محدود ہوتی ہیں ــــ اکثر کہانیوں میں "میں" یا "وہ" مرکزی کردار ہوتا ہے جو اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنے سے اور دوسروں سے الجھتا ہے۔ اپنی تلاش کا مسئلہ یا اپنی شناخت کا بحران آج کا اہم مسئلہ سہی لیکن کیا اس کا اظہار محض اسی سادہ سہل انگار طریقے ہی سے ممکن ہے۔ یہ تخلیق کی طرفہ کاری نہیں اس کے عجز کا اظہار ہے۔ اردو میں علامتی کہانیاں انتظار حسین نے لکھیں، جیسے کچھی یا زرد کتا اور آخری آدمی لیکن ان میں کہانی کی دلچسپی ہے اور واقعہ کے بیان کی روایتی دلچسپی کی جگہ پر اسرار فضا نے لے لی ہے۔ انور سجاد نے دوسرے انداز میں علامتی کہانی لکھی، ان کا اسلوب کم دلچسپ اور تقلید کاروں کے لئے زیادہ مشکل تھا لیکن انور سجاد کی کہانی میں کہانی پن کی کمی اور علامتوں کے استعمال کو تو ہمارے جدید علامتی کہانی کاروں نے اپنا لیا۔ اس کے معانی کی تہہ تک غوطہ نہ لگا سکے۔ آج جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں ان میں بیشتر انتظار حسین اور انور سجاد کے تجربوں اور اسلوبوں کا آمیزہ ہوتی ہیں۔ اکثر نہ تو اساطیر و قصص سے کوئی معنی خیز کام لے سکتی ہیں نہ خود اپنے آپ میں کوئی اسطوری فضا تخلیق کر سکتی ہیں ــــ زندگی بہت وسیع، رنگا رنگ، متنوع، پہلو دار اور تہہ دار ہے۔ اس کا بیان بھی تنوع، رنگا رنگی، پہلو داری اور تہہ داری کا متقاضی ہے محض علامت اور اس کے تخلیقی استعمال کے نام پر زندگی اور اس کے تجربات و مظاہر کو چند بندھی ٹکی مفروضہ علامتوں میں قید نہیں کیا جا سکتا ــــ اسی لئے اس قبیل کے نسبتاً بہتر تجربوں میں بھی کہانی پن کی کمی ہوتی ہے ــــ جس طرح وہ شاعری ناکام ہے جو پڑھی ہی نہ جا سکے، وہ کہانی بھی ناکام ہے جسے مکمل کئے بغیر ادھورا یا چوتھائی چھوڑ دیا جائے ــــ کہانی پڑھنے والے پر اگر اپنے کو مسلط نہیں کرتی اور اس کے تخیل کو اپنی گرفت میں نہیں لیتی تو وہ خام ہے۔ کہانی قاری کو اپنے ہاؤ میں شامل کر لیتی ہے نہ کہ اٹھا کر دور پھینک دیتی ہے۔

ہمارے یہاں فن کار اور مدیر حضرات سب ہی تقلید پرستی اور فیشن کے گزیدہ ہیں۔ حیرت تو اس

پر ہوتی ہے کہ وہ ادبی رسائل بھی جو ترقی پسندی اور اس عنوان سے ابلاغ اور سماجی آگہی کے معترف ہیں ایسی کہانیاں کثرت سے اور نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں ـــ کہانیوں کے انتخاب میں "کتاب" کی روش شب خون سے مختلف نہ تھی مشہور ناموں کے لحاظ سے فرق ہو تو ہو کہانیوں کی اکثر ناقابلِ ترسیل فضا کے لحاظ سے آہنگ، سطور، شعور، جواز اور خود الفاظ میں کوئی وجہ امتیاز تلاش کرنا مشکل ہے ۔

اردو میں انتظار حسین اور انور سجاد کے بعد کامیاب ترین کہانیاں جن میں علامتی طرزِ اظہار سے کہانی کی فضا پیدا کی گئی ہے ۔ سریندر پرکاش، بلراج مینرا، احمد ہمیش اور خالدہ اصغر نے لکھی ہیں ۔ ان میں خالدہ اصغر کی کہانی بیانیہ کہانی سے یکسر منقطع نہیں ہوتی ۔ سریندر پرکاش بیانیہ کہانی کی روایت سے منقطع ہو کر بھی کہانی سے دست بردار نہیں ہوتے ۔ کردار کتنے ہی غیر حقیقی کیوں نہ معلوم ہوں لیکن وہ جس تانے بانے میں پڑے ہوتے ہیں وہ کسی غیر حقیقی ہی سہی لیکن واقعہ کے بیان کا وسیلہ بنتے ہیں ۔" دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" نئے تجربے کے باوجود کہانی کے بنیادی تصور کے معیار پر پورا اترتا ہے ۔ ان کے ایک افسانے "جنّی زاں" کا تجزیہ میں نے شب خون کے لئے کیا تھا ۔ ممکن ہے میں اپنے تجزیے میں "بطنِ افسانہ نگار" تک نہ پہنچ سکا ہوں لیکن اس میں معنویت اور کہانی دونوں کا امکان بہر حال تھا ۔ آج کی تقلیدی علامتی کہانیوں میں اکثر یہ امکان مفقود ہوتا ہے ۔ بلراج مین را کا طرز مختلف ہے ۔ ان کے یہاں زیادہ ابہام ہے ۔ کہیں کہیں کہانی پن بھی غائب ہو جاتا ہے لیکن ان کے علامتی اظہار کے سماجی، سیاسی مضمرات بہت وسیع ہوتے ہیں یہی ان کی انفرادیت ہے ۔ فکشن کے ایک سیمنار میں میں نے مین را سے سوال کیا تھا کہ جب آپ سیاسی، سماجی طور پر بائیں بازو کے نظریات کو قبول کرتے ہیں تو کہانی میں اس قدر ابہام کیوں برتتے ہیں کہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کہانی ویت نام پر ہے عام قاری اس کے معنی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ؟ واضح سیاسی عقائد نسبتاً واضح تر ابلاغ کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ مین را اور سریندر پرکاش دونوں کو زبان کے تخلیقی استعمال پر بڑی قدرت ہے ۔ ان کی کہانی کو ان کی زبان غیر دلچسپ ہونے سے بچا لیتی ہے ۔ احمد ہمیش زبان کا استعمال لسانی قواعد اور ادبی محاورے کو توڑنے کے وسیلے سے کرتے ہیں، جہاں ان کا یہ تجربہ کامیاب ہے ۔ ان کی اچھی شاعری کی طرح ان کے افسانوں میں بھی تازہ کاری و فضا آفرینی ہے ۔ جہاں وہ ناکام ہوئے ہیں وہاں زبان نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے ۔ اگر ان کی کہانیوں میں سے غلاظت کے بیان کا عنصر کم ہو جائے تو وہ حواس کی سطح پر بھی متاثر کر سکتے ہیں اس لئے کہ ان کے یہاں جذبے کی توانائی ملتی ہے ۔

بلراج کومل اور کمار پاشی دونوں بنیادی طور پر شاعر ہیں ۔ ان کی کہانیوں میں نظموں کا در و بست اور ایجاز ملتا ہے یہ شعر نے انھیں علامتوں سے کام لینے کا گر دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں بہتر طور پر

سکھا دیا ہے۔ بعض نسبتاً پرانے اور بیانیہ کہانی کے رمز شناسوں نے بھی علامتی اسلوب کو برتنے کی کوشش کی ہے ان میں اقبال متین (گریو یارڈ) اور غیاث احمد گدی قابلِ ذکر ہیں۔ عوض سعید کے افسانوں کا مجموعہ بیشتر علامتی کہانیوں پر ہی مشتمل ہے حالانکہ ابتدا میں انھوں نے کرداروں پر مبنی اچھی کہانیاں لکھی تھیں شاید انھی "کردار مرکوز" کہانیوں نے انھیں علامتی اسلوب میں بھی کردار سازی اور واقعہ نگاری کو برتنے کا راستہ سجھایا ہے۔ اس طرح کے بعض تجربے حیدر آباد کے قدیر الزماں نے بھی کئے ہیں ــــ اقبال مجید، رتن سنگھ، عابد سہیل نے علامتی طرز کو وسیلے کے طور پر برتا ہے، اپنے آپ کو بالکلیہ اس کے سپرد نہیں کیا۔ علامتی اسلوب کی مقبولیت (افسانہ نگاروں میں) کا ثبوت یہ بھی ہے کہ رام لعل اور جیلانی بانو کے بعض افسانوں میں بھی اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جیلانی بانو بیانیہ کی بہت کامیاب کہانی کار ہیں، واقعیت کا سادگی سے بیان ان کی خصوصیت ہے لیکن یہ سادگی اپنے اندر گہرائی بھی رکھتی ہے۔ ان کے ناول "ایوانِ غزل" کی فضا میں جو رمزیت ہے وہ واقعات کے اکہرے بیان سے بہت آگے کی چیز ہے۔

افسانہ نگاروں میں جوگندر پال اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انھوں نے بیانیہ اور علامتی اسلوب کے درمیان دونوں کی معنی خیز آمیزش سے وہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں واقعات کا بیان آفاقی سچائیوں اور کہیں کہیں مابعد الطبیعیاتی مسائل کے حل کی تلاش بن جاتا ہے۔ انھوں نے علامتی اظہار سے معنی آفرینی کا کام لیا ہے لیکن اسے ہی کُل نہیں سمجھا۔ علامتی طرزِ اظہار کو اپنانے کی کوشش میں فنی ناکامی سے دوچار ہونے کی سب سے عبرت ناک مثال انور عظیم ہیں جن کا ترقی پسندی کا پروردہ مزاج باوجود شعوری کوشش کے اس تخلیقی اظہار سے کام نہ لے سکا۔ وہ اپنی چال بھی بھول گئے۔

علامتی اظہار اور رمزیہ اسلوب محض آج کی مروجہ علامتی کہانی سے مخصوص نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے جیسا کام منٹو نے لیا ہے، اب تک کوئی اور نہ لے سکا۔ بیدی کی بہترین کہانیوں میں بھی اس اسلوب کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ ایک افسانہ نگار جس کی اہمیت اور اپنے دور پر اثر اندازی کی اہمیت کو بہت کم کرکے دیکھا گیا ہے احمد ندیم قاسمی ہیں ــــ ان کے افسانے "کفن دفن" اور "الحمدللہ" بظاہر بیانیہ انداز کی روایتی کہانیاں ہیں لیکن ان کی فضا میں بڑی گہری رمزیت ہے۔ میں ان کہانیوں کو جو جدید کہانی کے فروغ پانے سے قبل لکھی گئی ہیں سادہ حقیقت نگاری اور علامتی اظہار کے درمیان کی اہم ترین کڑیاں سمجھتا ہوں۔ اسی ذیل کی ایک کہانی حیات اللہ انصاری کی "آخری کوشش" ہے جسے بلاشک و شبہ اردو کی بہترین کہانیوں میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس کہانی میں فقیرا، اس کا بھائی اور بڑھی ماں جو وسیلۂ گداگری بنالی جاتی ہے سب علامتی معنویت کے حامل ہیں۔ یہی نہیں اس کا مخصوص انداز میں ہاتھ چلانا اور کھانے کی رٹ لگانا بھی علامتی اہمیت رکھتے ہیں

"کفن" کے بعد شاید موجودہ معاشرے کی بے رحمی و بے معنویت پر یہ سب سے بے رحم طنز ہے ـــــ اپنی علامتیت کے باوجود آخری کوشش اول و آخر کہانی ہے۔

گزشتہ چند دنوں میں دو نئے افسانہ نگاروں کے مجموعے پڑھنے کا موقع ملا۔ دونوں علامتی کہانی کے اچھے نمائندے ہیں۔ قمر احسن اور احمد یوسف۔ قمر احسن کے مجموعے کی کئی کہانیاں علامتی ہوتے ہوئے بھی سماجی اور سیاسی معنویت رکھتی ہیں جیسے پہلی ہی کہانی "تعاقب" ـــــ انھوں نے اساطیر سے بھی کام لیا ہے اور اسلامی روایت سے بھی۔ جہاں ان کی کہانیاں ناقابلِ فہم نہیں ہوئیں بہت کامیاب ہیں۔ سنا حال میں اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے ان کے مجموعے "آگ الاؤ صحرا" کو اس لئے کوئی انعام نہیں دیا کہ کچھ ارکان کو ان کے یہاں جنس کے بیان میں عریانیت کا شائبہ نظر آیا۔ اسی طرح کا حادثہ چند برس قبل آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی مجلس تقسیم انعامات میں اقبال متین کے ایک ناول کے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں ادب میں عریانیت یا جنس کے بیان کے حدود کی بحث میں پڑے بغیر (کہ یہ بحث خود دفتر طلب ہے) انعام نواز کمیٹیوں کی توجہ اس نکتہ پر مرکوز کرنا چاہوں گا کہ ادب کے اپنے آداب، اپنی اخلاقیات اور اپنی شریعت ہوتی ہے جو جامد اور بستہ اخلاقیات سے زیادہ گہری اور دور رس ہوتی ہے۔ ادبی فیصلوں کی بنیاد ادبی ہونی چاہئے نہ کہ سیاسی، مذہبی یا نظریاتی۔

دوسرا مجموعہ احمد یوسف کا "آگ کے ہمسایے" ہے۔ احمد یوسف نے علامتی اظہار کو بیانیہ سے الگ نہیں کیا۔ اسی لئے ان کے یہاں کہانی پن ہے اور چونکہ کہانی پن ہے۔ اس لئے دلچسپی ہے۔ غزل کے شعر کی طرح تو نہیں لیکن مختصر نظم کی طرح ان کے یہاں ایجاز و رمزیت ہے اور اس لحاظ سے میں ان کے اس مجموعے کو اردو میں جدید طرز کی کہانیوں کی کامیاب مثالوں میں شمار کرتا ہوں۔ اس ذیل میں کلام حیدری کی بھی چند کہانیاں آتی ہیں۔

علامتی کہانی اور علامتی اظہار اور اس کے امکانات کے اس سرسری اور شاید تشنہ جائزے کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علامتی کہانیاں وہی کامیاب ہوتی ہیں جو کہانی کے مطالبوں کو پورا کریں اور جن میں علامت مقصود بالذات نہ ہو بلکہ کسی واقعے، کسی خارجی یا داخلی واردات، کسی تاثر، کسی کیفیت، کسی یاد یا کسی تصور کے افسانوی اظہار کا وسیلہ ہو ـــــ ابھی اردو کہانی کو اس اسلوب کے امکانات کو بہت کھنگالنا اور برتنا ہے۔ ـــــ آج بھی ہمارے بہترین کہانی نگار وہ ہیں جن کو مروجہ اصطلاح میں بیانیہ کہانی کار کہا جا سکتا ہے جیسے عصمت، بیدی، قرۃ العین ـــــ صرف ایک تجربہ پسند (علامتی) افسانہ نویس ان کی سطح کو چھو سکا ہے اور وہ انتظار حسین ہیں ـــــ لیکن یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اب ناقدین و قارئین کے ایک حلقے کو یہ شکایت ہو چلی ہے کہ انتظار حسین اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں ـــــ اگر یہ بات غلط نہیں تو سوچنا چاہئے کہ کیا انتظار حسین جیسا خلاق ذہن

بھی اپنے اسلوب کے حصار میں قید ہو سکتا ہے ؟ یا پھر کہیں یہ بات تو نہیں کہ علامتی اساطیری اسلوب خود اپنے آپ اپنے مسائل و موضوعات اور اپنے کرداروں کو محدود کر لیتا ہے ؟

اردو کہانی کے سفر میں علامتی اظہار اور اس کے امکانات کو برتنے کے تجربات نامعلوم راہوں کے نئے سنگ میل تو ہیں منزل مقصود نہیں

یہ کہنا یا منوانا کہ علامتی کہانی ہی جدید کہانی ہے ویسا ہی مغالطہ ہے جیسے یہ ماننا کہ

جدید شاعری آزاد نظم ہے

آزاد نظم رمزیہ ہے

∴ جدید شاعری رمزیہ ہے

جب تک پہلے اور دوسرے دعووں کی صداقت مسلّم نہ ہو استنباط منطقی مغالطہ کہلاتا ہے۔ جدید شعر و افسانہ دونوں کے لئے یہ دعویٰ کہ وہ کسی مخصوص اسلوب یا طرز اظہار میں محدود ہیں ادب کے ساتھ ناانصافی ہے۔ شعر ہو یا افسانہ اس میں ہمیشہ ہر طرح کے اسلوب اور ہر طرح کے تجربے کی گنجائش رہتی ہے اور رہے گی۔ جب کسی خاص صنف یا طرز کو اچھے تخلیقی ذہن میسر آجاتے ہیں وہ اپنے امکانات کو افشا کرتی ہے۔ ادبی اصناف تخلیقی صلاحیت سے آگے بڑھتی ہیں۔ اسالیب اور تکنیک یا دیتی فیشن اور مخصوص لفظیات اپنا کام پورا کرکے پیچھے چھوٹتی جاتی ہیں۔ □

شہزاد منظر

اردو افسانہ ــــ پاکستان میں

جیسا کہ ہر دور کے ادب کا دستور ہے پاکستان کا اردو افسانہ ہر دور میں اپنے عہد کی عکاسی کرتا رہا ہے خواہ یہ ترقی پسند ادب کا دور ہو یا جدید ادب کا دور۔ اردو افسانے نے کبھی بھی اپنے عہد کے تقاضوں سے منہ نہیں موڑا اور نہ عصری حالات اور رجحانات کی عکاسی سے روگردانی کی اس کا اندازہ قیام پاکستان کے بعد سے آج تک، عہد بہ عہد لکھے جانے والے افسانوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو افسانے کا سب سے بڑا اور اہم موضوع فرقہ وارانہ فساد تھا جس نے اردو کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں کو گہرے طور پر متاثر کیا خصوصاً ایک ملک سے دوسرے ملک کی ہجرت، مغویہ عورتوں کی بازیابی، عزیز واقارب کی جدائی اور گمشدگی اور نئے وطن میں ازسرِ نو زندگی کا آغاز اور پھر چھوڑی ہوئی سرزمین کی یادیں اور اس کے نتیجہ میں تخلیق کیا جانے والا نوسٹیلجیا کا ادب۔ یہ ہیں وہ موضوعات جس نے افسانہ نگاروں کو گہرے طور پر متاثر کیا اور ایسا محسوس ہوا جیسے افسانہ نگاروں کے سامنے ان موضوعات کے سوا لکھنے کے لئے اور کوئی موضوع نہیں رہا دراصل ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت فرقہ وارانہ جنون اس انتہا کو پہنچ چکا تھا اور فسادات نے معاشرے کو اس بری طرح متاثر کیا تھا کہ لکھنے کے لئے ادیب کو اور کوئی موضوع نظر نہیں آرہا تھا چنانچہ اس دور میں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ نگار ہوگا جس نے فسادات اور اس کے اثرات کے بارے میں افسانے نہ لکھے ہوں لیکن فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں میں بہت کم ایسے افسانے ہیں جو آج بھی اپنا تاثر قایم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں اس کی وجہ جذباتی ابال، رقت پسندی اور فنی ناپختگی ہے۔

قیام پاکستان کے ابتدائی چند سال فسادات پر مسلسل افسانے لکھنے کے باعث یہ موضوع بھی فرسودہ ہوگیا اور اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہی اور افسانہ نگار نئے موضوعات تلاش کرنے لگے۔ اس دوران افسانہ نگاروں نے نئے وطن پاکستان کی معاشرت کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ پاکستان نہ صرف ایک نیا ملک ہے بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کا نیا وطن ہے چنانچہ نئی مملکت کے قیام کے بعد نت نئے مسائل نے سر اٹھانے شروع کئے۔ ہندو تارکین وطن کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں کے ہندوستان سے آئے

ہوئے مسلمان تارکین وطن میں جائز اور ناجائز الاٹ منٹوں کے نتیجہ میں ملک میں راتوں رات ایک نودولتیہ طبقہ پیدا ہوگیا جس نے پاکستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ ہندو تارکین وطن کی ہندوستان، ہجرت کے باعث اقتصادی میدان میں جو زبردست خلا پیدا ہوا اس نے اس نودولتیہ طبقہ کو معاشی ترقی کے مواقع فراہم کئے۔ اس نے پاکستان کے متوسط طبقہ اور تجارت پیشہ طبقہ میں حرص و طمع پیدا کر دیا اور حصول دولت کے لئے پورے پاکستانی معاشرے کو اسٹیٹس کریزی یعنی سماجی مرتبہ بنانے کے جنون میں مبتلا کر دیا۔ ان تمام باتوں کو افسانہ نگاروں نے گہرے طور پر محسوس کیا اور اسے اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا۔ اس ضمن میں جن افسانہ نگاروں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں قرۃ العین حیدر اور شوکت صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خصوصًا قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولٹ "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں پاکستان کے نودولتیہ طبقہ کے کھوکھلے پن کو نہایت بے رحمی کے ساتھ پیش کیا۔

قیام پاکستان کے بعد اردو ادب میں جو نئے رجحانات ابھرے ان میں ادب کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے یا اسلامی ادب تخلیق کرنے [illegible] نمایاں کرتے۔ اسلامی ادب کی تخلیق کے نعرے کے پیچھے اصل جذبہ یہ تھا کہ پاکستان چونکہ مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اس لئے اس کی تہذیب اور ادب کو بھی اسلامی ہونا چاہیئے۔ اس رجحان کو پروان چڑھانے کی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی ادیب اور دانشور اپنا علٰحدہ قومی تشخص دریافت کرنا چاہتے تھے۔ اس دور کے دانشوروں کے سامنے یہ سوال تھا کہ پاکستان کے اردو افسانے کو اور بھارت کے اردو افسانے سے کن معنوں میں مختلف اور منفرد قرار دیا جا سکتا ہے؟

اسی دور میں پاکستان کے افسانوں میں ایک اور رجحان نمایاں ہوا اور وہ ہے نوسٹلیجیا کا رجحان یعنی چھوڑی ہوئی سرزمین اور ماضی کو دریافت بلکہ بازیافت کرنے کا رجحان۔ اس رجحان کی وجہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے ادیبوں کے لئے فسادات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی جتنی ہجرت کے کرب کی۔ نئے لکھنے والوں کے لئے ہجرت ہی عہد کا سب سے بڑا تجربہ تھا۔ نقل وطن تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ہجرت ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ نقل وطن ایک غیر مذہبی عمل ہوتا ہے جب کہ ہجرت مذہبی اور نیم مذہبی عمل۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ افسانوں اور ناولوں میں کرب کا اظہار ان ادیبوں نے کیا جو ہجرت کر کے نئے ملک آئے۔ وہ اپنے شاندار ماضی کی یادوں کے ساتھ ناقابل فراموش روایتوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ ان ادیبوں نے ہجرت تو کی لیکن اپنی یادوں میں آبائی سرزمین کو بسائے رکھا۔ یہ بات خاص طور پر ہندوستان سے آنے والے ادیبوں کی تحریروں

میں پائی گئی۔ یہ رجحان ان ادیبوں کی تحریروں میں تو ملتا ہے جو پہلے سے پاکستان میں آباد تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں آباد ادیبوں کی تحریروں میں ہجرت کا کرب نہیں ملتا کیونکہ یہ کبھی ان کا مسئلہ نہیں رہا۔

قیام پاکستان کے دس سال سے بھی کم عرصے میں یعنی ۱۹۵۵ء کے فوراً بعد اردو افسانے میں نئے رجحانات نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور رجحانات میں غیر محسوس طور پر تبدیلیاں شروع ہو گئیں۔ اس سے قبل اردو افسانے پر ترقی پسند ادب کے اثرات نمایاں تھے لیکن اس صدی کی پانچویں دہائی میں ترقی پسندوں میں زبردست فکری بحران پیدا ہوا جس کے باعث ترقی پسند ادب کے اثرات کم ہونے لگے اور افسانہ نگار بھی زندگی کے نئے معانی کی تلاش میں نکل پڑے ترقی پسند تحریک کا ردِ عمل خالص ادب اور رومانیت کی صورت میں ظاہر ہوا اور اے حمید۔ اشفاق احمد اور خلیل احمد وغیرہ کے رومانی افسانے اور ناول بہت مقبول ہوئے لیکن یہ رجحان زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا اس لئے کہ رومانی ادب کا دور ختم ہو چکا تھا اور ترقی پسند تحریک کے زوال کے باوجود رومانیت کا احیا ممکن نہ تھا البتہ ادیبوں کے ایک طبقہ نے "خالص ادب" اور "ادب میں نان کمٹ منٹ" کا نعرہ بلند کیا اور زندگی اور ادب کے بارے میں ہر قسم کے نظریئے کو ماننے سے انکار کر دیا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء اور اس کے تین چار سال تک اردو افسانہ اپنی مقررہ ڈگر پر چلتا رہا لیکن ۱۹۶۰ء کے عشرے میں اس نے اپنی ڈگر بدلنی شروع کر دی۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے کی ابتدا میں ہی یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اردو افسانہ سطحیت اور یکسانیت کا شکار ہو چکا ہے اور اس میں اعلیٰ اور معیاری افسانے تخلیق نہیں ہو رہے ہیں لیکن اس دور کے کسی ادیب و نقاد کو اس کا علم نہیں تھا۔ ۱۹۵۹ء تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ترقی پسند ادب کی کوکھ سے جدیدیت یا جدید ادب کے رجحان نے جنم لینا شروع کر دیا ہے جو اس صدی کی چھٹی دہائی میں منظر عام پر آنے والی افسانہ نگاروں کی نئی نسل نے کچھ اس انداز سے بغاوت کی کہ افسانے کی مروجہ روایات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور ۱۹۶۰ء کے عشرے میں اردو افسانہ میں طرزِ اظہار کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں بھی کافی تبدیلیاں نظر آئیں اور اردو کا جدید افسانہ علامتی اسلوب کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس دور میں جدیدیت کی لہر نے اردو افسانے کو گہرے طور پر متاثر کیا اور افسانے میں علامت نگاری نے مقبولیت حاصل کرنی شروع کی۔ معروضی حالات کے تحت ادیبوں نے علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کر لیا اس دور میں اگرچہ بعض افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں شانہ بہ شانہ روایتی اور وضاحتی طرزِ اظہار کو بھی جاری رکھا اور روایتی اور کنونشنلی انداز میں بعض بہت عمدہ افسانے پیش کئے لیکن افسانوی ادب میں علامت اور تجرید نگاری غالب رجحان رہا۔

اگر اردو افسانے کا موضوعات کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو ۱۹۶۵ء اردو افسانے کے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بڑے پیمانے پر جنگ ہوئی اور ادیبوں نے حب الوطنی کے جذبے کے تحت ادب تخلیق کئے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا المیہ اور اس کا کرب اردو افسانے کا دوسرا اہم موضوع بنا اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے افسانہ نگاروں نے کئی انتہائی درد ناک افسانے تخلیق کئے۔ جدید اردو افسانہ اپنی ساخت کے اعتبار سے توڑ پھوڑ کے عمل سے گذر کر بہت حد تک شاعری تجریدی مصوری کے قریب پہنچ گیا ہے۔ افسانے میں اینٹی اسٹوری کے رجحان نے افسانے سے افسانویت ختم کر دی ہے اور اسے بے ہیئت یعنی فارم لیس بنا دیا ہے اس لئے جدید افسانے سے کلاسیکی طرز کے افسانے کی طرح یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ اس میں عام دلچسپی ہوگی اور اسے پڑھ کر عام قاری حیرت زدہ رہ جائے گا۔ □

شمیم حنفی

شعبۂ اردو

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

"جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ڈبلنرز کی یہ کہانیاں کیسی ہیں، یہ ناول (یولیسس) کس تماشے کا ہے تو میں نے جوائس کو بیچ میں چھوڑا اور کتھا سرت ساگر کے دفتر لے کر بیٹھ گیا۔ سوچا کہ سر پھوڑنا ہی ٹھہرا ہے تو جوائس صاحب ہی کا سنگ آستاں کیوں ہو۔ اپنے یہاں پتھر موجود ہیں۔ مگر کتھا سرت ساگر تو علم دریاؤ نکلی۔ تھاہ ہی نہیں ملتی۔ کہانی کو کہاں سے پکڑیں اور کہاں ختم کریں۔ ایک سمندر ہے کہ امنڈ رہا ہے۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔"

انتظار حسین

اور سمندر کو دیکھیں تو یہ خیال کب آتا ہے کہ اس بے حساب آبی کائنات میں چھوٹی چھوٹی ہزاروں کائناتیں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن اب سے لگ بھگ نو سو برس اُدھر ایک کشمیری برہمن سوم دیو بھٹ نے جب پاک پربت ہمالیہ کی دھند میں لپٹی برفیلی چوٹیوں پر نگاہ کی تو اس کے من میں ترنت ایک بات آئی ـــ اس نے سوچا۔ ان اونچی چوٹیوں سے اترتی ہوئی نہریں اور ندیاں ان گنت دیومالاؤں کے بھید چھپائے اندھیرے جنگلوں اور ناہموار گھاٹیوں اور ہرے بھرے میدانوں کا لمبا تھکا دینے والا راستہ طے کرنے کے بعد جب اپنی جاترا تمام کرتی ہیں تو انت میں ایک ساگر کو پرنام کرتی ہیں۔ سارے ندی نالے بالآخر ایک وشال ساگر میں جا ملتے ہیں۔ کثرتوں کی رنگا رنگی ایک اکائی میں حل ہو جاتی ہے اور ہزاروں عالموں کے سنجوگ سے ایک بہت بڑا عالم ترتیب پاتا ہے۔

تو ہوا یوں کہ اس برہمن سوم دیو نے دریا دریا بکھرے ہوئے اسی سمندر کی مثال کو سامنے رکھ کر ہزاروں کہانیوں کی ایک وشال کہانی بنائی اور اس کہانی نے کتھا سرت ساگر کا نام پایا۔ کہانیوں کا یہ سمندر ذرا غور کیجیے تو ہمیں مشرقی تخیل کے اس رمز کی خبر بھی دیتا ہے کہ اس کی گرفت میں آنے والی ہر سچائی ایک بہت بڑی سچائی کا ہی حصہ ہے۔ اس سچائی کا نہ ایک رنگ ہے نہ ایک روپ۔ نیکی اور بدی، اندھیرا اور

جالا، ثواب اور گناہ، یہ ساری ضدیں باہم مل کر اس اکائی کی تعمیر کرتی ہیں جس سے انسانی تجربوں کی کائنات
عبارت ہے۔ اس طرح، کتھا سرت ساگر ایک قوم کی پوری سائکی اور ایک تہذیب کے مرکزی تصور کا آئینہ
خانہ ہے۔ حیرانی ہوتی ہے تو یہ دیکھ کر اس آئینہ خانے میں حقیقت کیسی ہزار شیوہ، پر پیچ، سیال نظر آتی
تھی، اس کے برعکس بعد کی دنیا حقیقت کے اتنے ہی محدود، متعین اور جکڑ بند تصورات کی شیدائی ہوئی۔ اس
ترقیٔ معکوس کا کچھ اندازہ۔ دور کیوں جائیے، اپنی ۱۹۳۶ء کی نسل کے افسانہ نگاروں کی محبوب و مطبوع حقیقت
کے واسطے سے بھی ہو جاتا ہے۔ شکر ہے کہ ایسے بہت سے سبق اب دھیرے دھیرے حافظے کی گرد بنتے جا رہے
ہیں مگر وہ سبق جو کتھا سرت ساگر کی حقیقت نے ترتیب دیا تھا، ایک نظر اس پر کبھی ڈال لی جائے تو کیا برا
ہے؟ رہے سماجی حقیقت پسندی کے عشاق تو وہ اپنا بھلا آپ چاہتے ہیں۔ جدید ترقی پسندوں نے ترک
ذات کا جو نسخہ عرصہ ہوا، یاد کیا تھا اس کے ہاتھوں شعر اور افسانے کا حال بھی خراب ہوا اور سب سے زیادہ یہ
کہ معمولی ادب اور ادبی تصورات کی سرپرستی اخلاق کا تقاضہ بن گئی۔

میں کمٹ منٹ کا عاشق نہ سہی، اس کا دشمن بھی نہیں ہوں بشرطیکہ اس کا حوالہ اپنے ہی تجربے اور
اپنے ہی حواس کا ماحصل ہو اور اپنی اجتماعی کائنات تک جانے کے لئے افراد کو گلا دبانے کی ضرورت یا ان سب
کو ایک سے تصنع عطا کرنے کی سخاوت ناگزیر نہ ٹھہرے — کتھا سرت ساگر کا ایک اور سیدھا سادا سبق یہ چائی
ہے۔ اب سے نو سو برس ادھر کی ہندی تہذیب ادنیٰ سے ادنیٰ اور مبتذل سے مبتذل سچائی کو کس طرح ایک
مرکزی اور بسیط سچائی، مقدس اور عظیم اور مہیب سچائی کا پرتو جانتی تھی۔ یہ سمجھنے کے لئے نہ صوفی و صافی بننے
کی شرط، نہ ہنری جیمس کے افکار کے تجزیے کی ضرورت۔ ترکے نے یہ بھید عربوں کے جاہلی دور کی شاعری میں پایا
تھا۔ یہ سفر بہت لمبا دکھائی دیتا ہو تو کتھا سرت ساگر تک جانا بھی کافی ہوگا کہ اس کے آئینے میں ہم گاہے طربناک،
گاہے المناک رزمیے کا عکس ڈھونڈ سکتے ہیں جو دنیا میں آنے والے پہلے آدمی کے ساتھ شروع ہوا تھا اور جس
کا سلسلہ آخری آدمی تک جائے گا۔ ہزاروں کہانیوں کی یہ ایک کہانی دلچسپ بھی ہے اور تمام پرانی کہانیوں کی
طرح ہم پر کسی نہ کسی ایسے بھید کا دروازہ کھولتی ہیں جس سے گذر کر ایک کلی اور ہمہ گیر حقیقت کے حصول تک
پہنچا جا سکتا ہے عسکری صاحب نے مغرب پر مشرق کی فکری برتری کا سب سے بڑا سبب یہ بتایا تھا کہ اہلِ
مشرق کا بنیادی سروکار نہ تو اخلاق سے تھا، نہ بد اخلاقی سے، وہ خوگر تھے تو اس حقیقت کے جو اس کے
تمام اندرونی اور بیرونی تضادات پر محیط ہو، گیتا میں کرشن کے بھاری اہم یا النفس کی صورت۔ سوم دیو بھٹ
کی تلاش کے سفر کی سمت بھی یہی تھی۔ سو، اپنے تخیل کی سیر کے لئے اس نے دوزخ کو کبھی جنت میں ملانا ضروری
سمجھا۔ فضا کی درجہ بندی کا آشوب روشن خیالی اور عقلیت کی مغرور صدیوں کا عطیہ ہے۔

بائیس ہزار اشلوکوں اور ایک سو چوبیس ابواب پر مشتمل یہ دفتر مجموعی طور پر ہومر کی الیڈ اور اوڈیسی کی دوگنی ضخامت رکھتا ہے۔ سوم دیو نے ہر باب کو سمندر کی رعایت سے ایک ترنگ یا لہر کا نام دیا ہے۔ اس کہانی کی کہانی یوں بیان ہوئی ہے کہ سوم دیو کا زمانہ بھی ہر زمانے کی مثال بہت سخت تھا۔ ان دنوں کشمیر پر راجہ اننت کی حکمرانی تھی۔ دربار میں سازشیں ہوتی تھیں اور رعایا پریشان تھی۔ اس دور میں بھی انسانوں کا بہت خون بہا، بہت جانیں تلف ہوئیں اور لوگ بہت دل گرفتہ اور مایوس ہوئے۔ راجہ اننت کے دونوں بیٹوں کلس اور ہرش میں کلس چھوٹا ہوا بدمعاش تھا۔ ہرش ذہین تھا مگر بڑا جابر۔ حالات کی خرابی سے دل تنگ ہو کر اننت نے حکومت کی باگ ڈور بڑے بیٹے کلس کے حوالے کر دی۔ کچھ برس بعد جب ذرا امن چین کے دن آئے تو اننت کا جی پھر للچایا اور اس نے دوبارہ راج تخت پر براجمان ہونے کی ٹھانی۔ راجہ اننت کی رانی سوریہ وتی کا دل یہ سب دیکھ کر بہت دکھتا تھا۔ پس اس کے لائق درباری شاعر سوم دیو برہمن نے محض اس کے من بہلاون کے کتھا سرت ساگر ترتیب دی، ایسی کہانیاں جو رانی سوریہ وتی کے دل سے دکھوں کا بوجھ اتار سکیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے زندگی کے ناگزیر المیوں، اس کے شعور میں شامل کڑوا ہٹوں اور نامرادیوں اور مایوسیوں کی حقیقت کا گیان بھی دے سکیں۔ دکھ کی حقیقت سمجھ لی جائے تو دکھ اور سکھ میں زیادہ فاصلہ نہیں رہ جاتا۔

مگر سب کہانیوں سے بڑی کہانی خود انسان کی اپنی زندگی ہے۔ اَن ہونے، غیر متوقع اور انتہائی انوکھے واقعات کا مخزن۔ راجہ اننت کے بیٹے کلس کو اقتدار کی چاٹ لگ چکی تھی، عادتوں میں سب سے بری، سب سے پائدار اور سب سے زیادہ پسندیدہ عادت۔ سو اس نے جب دیکھا کہ اس کا باپ دوبارہ راج کاج پر قابض ہونا چاہتا ہے تو پلٹ کر باپ پر حملہ کر دیا۔ اس کی ساری دولت ہتھیالی۔ راجہ اننت نے مایوس ہو کر اپنے ہاتھوں اپنی جان لی کہ جب ہر اختیار چھن جائے اس وقت کم سے کم ایک اختیار اپنے ہونے کا پتہ دیتا ہے، اپنی مرضی سے اپنی موت کا اور رانی سوریہ وتی جو سوم دیو کھبٹ کی بنی ہوئی کہانیوں میں زندگی کرتی تھی خود اس کی کہانی کا انجام یہ ہوا کہ جیتے جی اس نے اپنے آپ کو شوہر کی چتا کے حوالے کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۰۸۱ء کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتھا سرت ساگر کی ترتیب ۱۰۷۰ء کے آس پاس ہوئی جب راج محل کی شورشیں شباب پر تھیں اور رانی سوریہ وتی کا دل بہت دکھی تھا۔

شاید اسی لئے کتھا سرت ساگر میں مغرور عورتوں اور جیالے مردوں اور جگمگاتے شہروں کے ساتھ ساتھ راج دربار میں پلنے والی سازشوں، باہمی مناقشوں نے غداریوں، جنگ اور قتل اور غارت گری اور عیاری اور مکاری کے قصے بھی بہت ہیں۔ کرداروں میں اچھے اور نیک راجاؤں اور راہبوں کے ساتھ ساتھ

اوباش مردوں اور حیوانی عورتوں اور انسانی خون سے پیاس بجھانے والی بد روحوں، چڑیلوں اور دیتیوں (دیوتاؤں) کی بھیڑ بھی دکھائی دیتی ہے۔ کتھا کیا ہے، بھانت بھانت کے آدم زادوں کا چڑیا گھر ہے۔ ایک طرف عبادت اور ریاضت میں مگن رہنے والے نیک طبع بھگت اور پجاری ہیں تو دوسری طرف شرابیوں، جواریوں، رنڈیوں اور بھڑووں کا گروہ ہے۔ اس بصری اور ذہنی مساوات کا دروازہ کہانی لکھنے والے پر بند ہو جائے تو گویا انسانی تجربے کی ایک کائنات کا دروازہ اس پر بند ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ تعمیری اور مفید کہانیاں بنانے والوں نے تخلیقی تجربے کی اس کائنات سے بگاڑ کیوں مول لیا۔ سوم دیو بھٹ دل گرفتہ رانی سوریہ وتی کو اس طرح یہ بتانا چاہتا تھا کہ جو کچھ اس کی اپنی دنیا میں ہو رہا ہے وہی اس دنیا کے باہر بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعاتی جبر ہے جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ وہ کچھ جو ہم جھیل رہے ہیں، ہم سے آگے بھی لوگ جھیلتے آرہے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے ایک سندی تیر ایکا میں فراق صاحب کا ایک انٹرویو چھپا تھا۔ اس سوال کے جواب میں کہ ان کے بنیادی تجربے کیا ہیں فراق صاحب نے کیا عمدہ بات کہی کہ وہی جو ان سے پہلے کے انسانوں سے وابستہ رہے ہیں ـــــ اور یہ کہ تجربوں کا بس ایک دنیا ہے جو گھوم پھر کر اپنے آپ کو ہر زمانے میں دوہراتی رہتی ہے۔ اس نکتے کی وضاحت فراق صاحب نے یوں کی (اور یہ اُن ہی کے بس کی بات تھی) کہ "مثال کے طور پر انسانی معاشرے کا ایک عام تجربہ ایک کی بی بی کا دوسرے کے ساتھ بھاگ جانا ہے یا کسی غیر کے ذریعہ کسی عورت کا بھگایا جانا، لیکن مہا کوی تلسی داس نے اسی تجربے کی بنیاد پر راماین لکھ ڈالی۔" نہ راون نے سیتا کو اغوا کیا ہوتا نہ لنکا جلتی اور ایودھیا نگری میں دیوالی کی رات آتی۔ اصل میں خیر اور شر کے یکساں ادراک ہی سے فکر میں وہ ٹھہراؤ اور مزاج میں وہ نظم اور تحمل پیدا ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی لمبی کہانی سنانا کٹھن ہے۔ پھر سوم دیو بھٹ تو شاعر تھا جس کے تخیل کو بیرونی انتشار اور شورش کی فضا میں ایک اندرونی آسودگی کی ڈور بہرحال تلاش کرنی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو کتھا سرت ساگر میں بس زہر ہی زہر ہوتا اور یہ زہر امرت کبھی نہ بنتا۔ یہ طے ہے کہ سوم دیو بھٹ نے ارسطو کی بوطیقا نہیں پڑھی تھی، مگر کیتھارسس تو ایک خود رو پودا ہے جو ہر سچے المیے کی زمین سے آپ ہی آپ نمودار ہوتا ہے۔

ادب کے علما اور مورخین نے کتھا سرت ساگر کو ایک زمانے کی تاریخ، اس تاریخ سے وابستہ سماجی کوائف اور معاملات کا ترجمان بھی بتایا ہے کہ اس کی مدد سے ہم اپنے ریت رواج، موسموں اور منظروں، عقیدوں اور واہموں کی تفصیل بیان کر سکتے ہیں۔ بعضے کہتے ہیں کہ ہمارے عوامی ادب کے دھندلے گوشوں پر بھی اس سے بہت روشنی پڑتی ہے۔ اس قسم کے رویوں کی رفاقت میں کتھا سرت ساگر کا تہذیبی، تاریخی، سماجی اقتصادی اور عمرانیاتی مطالعہ یقیناً مفید اور معلومات افزا ہوگا۔ لیکن یہ کام یارانِ مدرسہ پر چھوڑ دیجئے کہ

اس کا حق دراصل ان ہی کو پہنچتا ہے۔ ہم جیسوں کے لئے تو کتھا سرت ساگر بس ایک کتھا ہے جس سے راتیں روشن ہیں۔ وہ راتیں بھی جو دنوں کی صورت سامنے آتی ہیں، اور ایک سمندر ہے جسے اوپر سے عبور کرنے کے بجائے اس میں ڈوبنے کا بھی اپنا مزہ ہے۔ جو بات اس بے مثال کارنامے کو ہمارے لئے آج بھی بامعنی بناتی ہے ایک تو اس کا خارجی اسلوب اور فارم ہے کہ ایک گرہ کھلتی ہے تو سوئی گرہیں سامنے آموجود ہوتی ہیں چنانچہ اسے ختم کرنے کے بعد بھی ہمارا تعلق اس سے برقرار رہتا ہے۔ اور کہانی اصل میں وہی ہے جو مسائل کو حل کرنے کے بجائے خود حل طلب رہ جائے۔ دوسرے یہ کہ خیر اور شر کا یکساں ادراک یا انسانی سرشت کی کلیت کا شعور اس کتھا میں ایک مستقل عقبی پردے کی حیثیت رکھتا ہے۔ تناظر کی یہ پیچیدگی شر کو ہماری مجبوری یا محض اتفاق کے بجائے ہماری ضرورت اور انتخاب ٹھہراتی ہے۔ اور تجربوں کے وہ بھید جن پر حجابات کے پردے پڑے ہوئے تھے انھیں اوپر سے مسلط کی ہوئی قید سے چھٹکارا دلاتی ہے۔ یہ صرف تخیل کی جستجو یا مہم پسندی نہیں بلکہ وہ جذباتی اور ذہنی بے خوفی ہے جس نے اخلاق گزیدہ معاشروں میں انسان کی ہیئت و حیثیت میں تخفیف کر دی۔ شیطان کی تخلیق ایک اخلاقی احتیاج کے بغیر وجود میں نہ آتی۔ ہر موسیٰ را فرعونے تاکہ نیکیوں کے ظہور کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر بڑی کہانی کے لئے اس نوع کا عقبی پردہ ایک لازمہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد سے فتح محمد ملک کی چشمک برحق مگر یہ تو واقعہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد بھی اس لازمے کی حقیقت سے آگاہ تھے۔ یہ اور بات کہ آدمی سب کچھ جانے لیکن پھر بھی نہ مانے۔ بوکیشیو نے سوم دیو کے تین سو برس بعد CENTO NOVELLE کا جو قصہ گڑھا اس کے عقبی پردے پر فلورنس کے ہلاکت آفریں طاعون کی تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں۔ سوم دیو بھٹ کی کتھا سرت ساگر کا عقبی پردہ انسانی تجربات سے چمٹی ہوئی ازلی اور ابدی بیماریوں کے اجاڑ رنگوں سے داغ دار ہے۔ لیکن اس کی اوپری سطح بظاہر سمندر کے سینے پر پھیلی ہوئی آبی چادر کی طرح پرسکون اور خاموش ہے۔ طوفان اس سطح کے نیچے ہیں۔ اس سے سوم دیو کے تخیل کی وسعت، جذبے کی صلابت، اس کے ادراک کے توازن اور اس کے شعری طریق کار کی تنظیم اور تناسب، ان سب پر روشنی پڑتی ہے۔

سوم دیو نے یہ اعتراف کیا ہے کہ کتھا سرت ساگر کا مواد یا کہانیوں کا یہ سمندر اصلاً اس کی ایجاد و اختراع نہیں اور یہ کہانیاں اس سے آگے بھی سنی سنائی جاتی تھیں۔ یوں بھی ہمارے دیس کی تاریخ و تہذیب میں حقیقت اور افسانے کی دوستی کا سفر ساتھ ساتھ شروع ہوا کہ دنیا کی سب سے پرانی کہانیوں میں ہمارے معاکی موج بھی شامل ہے۔ تہذ ۔ ۔ پہلے موڑ پر عام انسانوں کے ساتھ ایک دیو مالا کا منڈپ بھی سجا تھا سوم دیو کا کہنا ہے کہ اس سے بہت پہلے گنڑادھیہ (गुणाढ्य) نے ایک ورہت کتھا (बृहत कथा)

ترتیب دی تھی اور یہ کہ کتھا سرت ساگر کی بہت سی کہانیاں اسی ورہت کتھا یا عظیم افسانے سے ماخوذ ہیں۔ ورہت کتھا اب نایاب ہے۔ ادبی مورخ بتاتا ہے کہ یہ کتھا چھٹیں صدی عیسوی میں رچی گئی، یعنی سوم دیو بھٹ سے کوئی چار پانچ سو برس پہلے۔ سوم دیو نے لکھا ہے کہ ورہت کتھا سب سے پہلے شیوجی نے سنائی، اپنی بی بی پاروتی کو، پھر پُشپا ندت نے، پھر کنترّ بھوتی نے، پھر گنترّا دھیہ نے اور اس کے بعد سات واہن نے۔ سات واہن نے اوّل اوّل اسے مسترد کر دیا تھا جس سے دل برداشتہ ہو کر گُنترّا دھیہ نے اسے ورق ورق نذر آتش کرنا چاہا چھے لاکھ ورق آگ میں بھسم کر دیئے۔ عین اس وقت سات واہن نے ظہور کیا، اس کے ایک لاکھ ورق بچا لئے اور اسے ورہت کتھا کا نام دیا۔ پھر اس میں کچھ اضافہ اپنی طرف سے کیا کہ نقصان کی کچھ تو تلافی ہو جائے اور اس اضافے میں اس کتھا کی عظیم الشان تاریخ بیان کی۔ سوم دیو نے کتھا سرت ساگر میں اس پورے سرمائے کو منتقل کر لیا ہے اور یہ اس کی کتاب کے تقریباً نصف پر محیط ہے۔ ورہت کتھا کے علاوہ ایک اور کتاب جس کا اجالا کتھا سرت ساگر تک پہنچا، شیمیندر ( ) کی ورہت کتھا منجری (वृहत कथा मंजरी) ہے جو کتھا سرت ساگر سے پچیس تیس برس پہلے وجود میں آئی۔ مگر سوم دیو کے کارنامے کا اس سے کیا مقابلہ۔ کتھا سرت ساگر حد درجہ مختصر ہونے کے علاوہ شیمیندر کی ورہت کتھا منجری کی زبان، بیان اور اسلوب بھی بہت معمولی ہے۔ اس میں نہ تو کتھا سرت ساگر جیسی تنظیم ملتی ہے، نہ قصہ گوئی کا وہ ہنر جو اس ساگر کو بعض کڑوی، ڈراؤنی اور ظلمت آثار کہانیوں کے باوجود پرکشش اور دلچسپ بناتا ہے۔ نالہ جب تک پابند نے نہ ہو اور فریاد کسی لے میں نہ ڈھل جائے شعر اور فن نہیں بنتی کہ فنکار وہی ہے جو آنسوؤں کی برکھا برسانے کے بجائے انھیں پی جانے پر قادر ہو۔

تعجب کی بات ہے تو یہ کہ اہل مغرب نے خود آگے بڑھ کر یہ مینا ہاتھ میں اٹھا لیا اور ہمارے لکھنے والے کیا ہندی کے اور کیا اردو کے، ایک عرصے تک اپنے ذوقِ عمل کی کوتاہی کو اپنی تجدد پرستی کا بہانہ سمجھتے رہے۔ دلی اور دلی کے اطراف میں جعلی مشینیں اور گھڑیاں بنتی ہیں اور ان پر جرمنی یا جاپان یا انگلستان کا مارک ہوتا ہے تو لوگ شوق سے انھیں خریدتے ہیں اور گلے لگاتے ہیں۔ اپنی روایت کے معاملے میں بھی ہم بہت دنوں تک اسی فیشن پرستی اور خام خیالی کا شکار رہے۔ عمر خیام اور کالی داس کی بات الگ، ٹیگور بھی ہم تک مغرب ہی کے راستے سے پہنچے اور وہ بھی اس وقت جب انھیں فٹزجیرالڈ، گیٹے اور ڈبلیو۔ بی۔ یےٹس کی طرف سے سند مل گئی۔ ذہنی غلامی اور فکری پسماندگی کا طلسم بڑی مشکل سے ٹوٹتا ہے۔ کہیں اب جا کر ہم نے یہ حقیقت پہچانی کہ داستانوی اور قصص کے عالمی سرمائے میں ایک لمبی اور بڑی گونج کتھا سرت ساگر کی بھی شامل ہے۔ ویسے یہ سراغ بھی ہماری ہجرت کے لئے سب سے پہلے مغربی مستشرقین ہی نے لگایا کہ اس ساگر کی لہروں نے مشرق بعید

اور مغرب دونوں سمتوں میں سفر کیا تھا۔ فارس اور عرب سے ہوتی ہوئی یہ کہانیاں قسطنطنیہ اور وینس پہنچیں۔ بوکیشیو، چاسر اور لافونیتن نے بھی اس چراغ سے کچھ اجالا مستعار لیا اور اس طرح عالمی فکشن کے معاشرے میں کتھا سرت ساگر کو عزت اور اعتبار میسر آیا۔ ہماری علاقائی زبانوں میں کہانیاں ایک بار پھر اب بیانیہ کا کھویا ہوا سرا تلاش کر رہی ہے اور کہانی کی بنیادی روایت یعنی اس کی حکائی (ORAL) توانائیوں نے ادھر فارمولہ بازی کے اسالیب کے لئے ایک پرانی سچائی کے واسطے سے کچھ نئے خطرے پیدا کر دیئے ہیں۔ ادب سے قطع نظر اب تو مصوّری کے نقاد بھی، جنھیں گمراہ ہونے میں دیر نہیں لگتی، اب تصویر کے بیانیہ عنصر (NARRATIVE ELEMENT) کی اہمیت پر زور دینے لگے ہیں۔ یہ رمز غریب کتنے جتنوں کے بعد ہاتھ آیا ہے کہ ایک تو تجرید بھی کسی نہ کسی سطح پر شہود (CONCRETE) ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ تجرید کے بے سمت و بے دیوار صحراؤں میں ان ہی حوصلہ مندوں کا بھٹکنا بھلا لگتا ہے جو شہود کے تقاضوں کی تکمیل پر بھی قادر ہوں۔ ذرا یاد کیجئے کہ پایانِ کار (ACTION PAINTERS) اور دادا ازم کے حامیوں کا کیا حشر ہوا اور اب تو OP ART کے ابتدائی کارناموں پر بھی ٹھنڈے دل و دماغ سے لوگ ایک نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ محض گرد اڑانے سے شہسواری کا ثبوت تو بہم نہیں پہنچتا۔

پھر پرانے اور نئے کی بحث اگر صرف کلیشیز کی نذر ہو جائے یا لبِ گرمئ گفتار کا بہانہ تو معنی کھو دیتی ہے۔ اور اب تو تاریخ کے سلسلے میں بھی ہمارے رویّے وہ نہیں رہے جو اب سے چالیس برس پہلے تھے اور یادش بخیر، جنھیں ہمارے ترقی پسندوں نے بساط بھر خوب ہوا دی تھی۔ قرۃ العین حیدر بھی HISTORY کے دائرے سے نکل کر META-HISTORY کی پر اسرار دھند تک جا پہنچیں۔ ہم اپنے سماجی اور ثقافتی المیوں کی سزا بھلا کب تک اپنے تخلیقی تقاضوں اور میلانات کو دیتے رہیں گے سونے اور جاگنے کے آداب اگر بدل گئے اور کہانی کا رشتہ رات سے پہلے جیسا نہ رہا تو قصور کس کا؟ نہ سوم دیو بھٹ کا نہ انتظار حسین کا۔ خیر، یہ سوال ایک الگ بحث کا طلبگار ہے اور اگر اسی میں الجھنا ہے تو پھر سماجی علوم اور عمرانیات کے ماہرین سے رجوع کیجئے۔ میرا مسئلہ تو وہ سمندر ہے جس میں چھپے ہوئے آبِ حیوان کی تلاش کا ذوق ابھی کند نہیں ہوا۔ یہ سمندر سوم دیو بھٹ کی دریافت نہیں بلکہ ان حیران آنکھوں کی جستجو کا حاصل ہے جنھوں نے پربت کی چوٹی پر جلتی ہوئی آگ اور جنگلوں میں بھٹکتی ہوئی پرچھائیاں دیکھیں پھر ان کے تعاقب میں نکل گئیں۔ اور جب واپس اپنے حاضر تک آئیں تو ان کا دامن دیو مالا کے انمول خزانوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سفر اسپینی جہاز رانوں کے سفر سے زیادہ پر اسرار رہا ہوگا کہ اس کے بھید ابھی بھی جوں کے توں قایم ہیں۔ آپ کہیں گے یہ سب انسانی شعور کے بچپن کا نوسٹلجیا ہے۔ مجھے تو خیر

اس لفظ سے کوئی خوف نہیں آتا مگر ڈر ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ اپنے قائل ہو گئے تو پھر پال کلی (PAUL KLEE) اور شاگل اور الف لیلیٰ کی شہرزاد اور سوم دیو بھٹ کے ہاتھوں آپ کا کیا حشر ہوگا۔ ان ہاتھوں کا سایہ تو دنوں کے ساتھ برابر لمبا ہوتا جاتا ہے۔

کتھا سرت ساگر میں پنچ تنتر اور مہابھارت سے لے کر رگ وید کے دنوں تک کی کہانیاں اور دیومالائیں کسی نہ کسی شکل میں ہمارے سامنے آموجود ہوتی ہیں اور ہمیں بتاتی ہیں کہ جو کہانیاں ہمیں سوم دیو بھٹ نے سنائیں ان سے ہمارا رشتہ سوم دیو بھٹ سے زیادہ پرانا ہے۔ حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال پہلے جب زمانے کی آنکھ نے دراوڑی اور آریائی تہذیبوں کو شیر و شکر ہوتے ہوئے دیکھا تھا یہ کہانیاں اپنی ابتدائی شکلوں میں ظہور پا چکی تھیں۔ اس مسئلے کے نکات ڈاکٹر وزیر آغا بتائیں گے مگر اتنا طے ہے کہ راوی یا کتھا واچک کو ہماری تہذیب کے ایک مستقل نشان کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور وہ ہمارے معاشرے کا ایک لازمی کردار بن چکا تھا۔ مغرب کا تعارف اس کردار سے بہت دیر میں ہوا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہوگا (ایک غیر سورتے کے پاس تو اس ہی کی قوت ہوتی ہے) کہ مشرق کی راتیں ٹھنڈے اور یخ بستہ مغرب سے زیادہ مہربان تھیں اور لوگ مغربیوں کے برعکس بند کمروں میں اہلِ خاندان کے ساتھ آتش دان کے گرد بیٹھنے کے بجائے بازاروں اور چوپالوں میں مل جل کر راتوں کی تاریکی میں کہانی کے دیئے جلاتے تھے۔ پھر جتنے منہ اتنی کہانیاں۔ کوئی پاکباز عورتوں کا قصہ چھیڑتا تو کوئی اس بے وفا بیوی کی کہانی شروع کر دیتا جو جنگلوں بیابانوں کے سفر میں اپنے نیک دل شوہر کے لہو اور گوشت کی غذا پر زندہ رہی مگر اپنی طبیعت کے ٹیڑھ کی وجہ سے انجام کار اسی غریب کو تباہ کر بیٹھی۔ کوئی بہادری اور شجاعت کے کارنامے ہانکتا، کوئی بزدلی اور نکھٹو پن کی کہانیوں پر لعن طعن کرتا۔ انسان کی شرافت اور خباثت کے رنگ ساتھ ساتھ پھیلتے اور اپنی باہمی آمیزش سے ایک ایسی طلسمی کائنات کا نقشہ جماتے جو بیک وقت افسانہ بھی نظر آتی اور حقیقت بھی۔ اس ملی جلی کائنات میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے کی بدعت ہمارے عہد میں شروع ہوئی۔

سوم دت نے سچائی کے یہ دونوں روپ سامنے رکھے ہیں۔ اس طرح کے ان کے بیچ کی لکیر مٹ گئی ہے۔ چندر مہا سینا، شکتی دیو، سرنگ بھجا جیسے من گھڑت کرداروں کے ساتھ اس کے تخیل کی کمند بعض ایسی گردنوں میں بھی جا پڑتی ہے جو تاریخ کی روشنی میں نہائی ہوئی ہیں۔ سوم دت نے ایسے موقعوں پر تاریخ سے مغلوب ہونے کے بجائے اپنے تخیل کی شاعرانہ اور خلاقانہ جست کے ذریعہ کرداروں کی ماہیت اور مناسبات میں من مانی تبدیلیوں کا آزادانہ عمل بھی اختیار کیا ہے اور جانی بوجھی سچائیوں

میں ایک انجانی اور ان دیکھی جہت کی جستجو کی ہے۔ مثال کے طور پر کتھا سرت ساگر کی نویں کتاب یا ذیلی حصے میں اس نے رام اور سیتا کی کہانی یوں بیان کی ہے کہ سیتا اپنی پاک دامنی کے ثبوت کے لئے ایک جھیل کے پاس جاتی ہیں، کہتی ہیں ــــ " اے دھرتی ماں! اگر میرا من، سپنے میں بھی کبھی اپنے پتی کے علاوہ کسی اور پُرش کی اُور نہیں گیا تو اس کی گواہی دے اور مجھے جھیل کے اس پار پہنچا دے۔" اتنا کہہ کر جھیل میں اترتی ہیں۔ پھر ایک دیوی کا ظہور ہوتا ہے ــــ دھرتی، جو سب کی ماں ہے اور سارے انسانی تجربوں کا گنجینہ، تمام انسانی افکار و اعمال و احساسات کی رزم گاہ۔ دیوی سیتا کو اپنی گود میں بھرتی ہے اور جھیل کے اس پار پہنچا دیتی ہے۔

کتھا سرت ساگر سمندر کی طرح بے کنار ہے، مگر دھرتی کی گود تو اس سے بھی بڑی ہے، جو اسیم بھی ہے اور اپار بھی ــــ اور جو ہر اَنت کا انت ہے۔ اور جس کے تجربے الگ الگ سمتوں سے آنے والی لکیروں کی صورت ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں اور ایک ایسی سچائی کا رنگ پھیلاتے ہیں جو نہ سیاہ ہے نہ سفید جو ایک ساتھ ان تمام رسوں پر محیط ہے جس کی دریافت بھرت منی نے کی تھی اور شاکیہ منی نے جنھیں نیکی اور بدی کی تفریق اور درجہ بندی سے بلند ہو کر ایک پرتیچ اور ہمہ جہت سچائی کے روپ میں دیکھا تھا۔ سوم دیو بھٹ کے بے حساب تخیل نے بھی اسی بے حساب سچائی کو شبدوں کے ساگر میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ جبھی تو اس کا فیضان ختم نہیں ہوتا اور کتھا سے نئی کہانی تک، سلسلہ در سلسلہ ہمیں اس سچائی کی پکار سنائی دیتی ہے، ایک ایسی پکار جس کی تاریخ تو ہے مگر جغرافیہ کوئی نہیں۔

خاتمۂ کلام پر کوآل مباحث (ذہن) سے ایک مکالمہ:

چیلا: بُدھ کون ہے؟

گرو نے اپنی زبان نکال کر چیلے کو دکھا دی۔

چیلا جھک گیا۔

گرو: اسے بند کرو۔ تم جھکے کیوں؟

چیلا: تم کتنے مہربان تھے کہ تم نے اپنی زبان سے مجھے بدھ کا درشن کرایا۔

گرو: میری زبان کی نوک پر ایک گھاؤ ہے!

کہانی کا سفر ایک زخم سے دوسرے زخم تک کا سفر ہے۔ کتھا سرت ساگر اسی سفر کا علامیہ ہے۔ ہم نے اس سے آنکھیں پھیر لیں تو گھاٹا اپنا ہی ہوگا کہ زخم تو جب بھی باقی رہیں گے، ہاں ان کی پہچان کا ایک دروازہ ہم پر بند ہو جائے گا۔ □

ابن فرید
حفیظ منزل، میرس روڈ
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

افسانہ کیا ــــ؟

اب جب کہ اردو افسانہ کی تاریخ تقریباً ایک صدی پر محیط ہو چکی ہے، وہ بہت سے سوالات جو اس کی ابتدا کے وقت اٹھائے گئے تھے دوبارہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ پہلے ان سوالات کی نوعیت یہ کچھ ایسی تھی کہ جیسے کسی نو عمر سے سوئے ادب پر جواب طلبی کی جارہی ہو، یا جیسے کسی بات پر اعتبار نہ آئے اور پھر بھی اعتبار کرنے کی سعی لاحاصل کی جائے۔ سوالات کی یہ نوعیت اچھے بھلے اعتماد کو متزلزل کر دیتی تھی۔ چنانچہ افسانہ کی تعریف کے سلسلہ میں بعض ایسی ہلکی باتیں بھی کہی گئیں جن سے خاصی بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ مثلاً بیچ کروفٹ (BEACHCROFT) کا یہ کہنا کہ کہانی کہنا انسان کا قدیم ترین فن ہے، لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ نثری کہانی یا نثری افسانہ جدید ترین صنف ادب ہے۔ گویا وہ بیج جس سے افسانہ کا تناور درخت عالم وجود میں آیا، روز ازل سے ہی اپنا وجود رکھتا تھا۔ تاریخ نویسی کے لئے یہ نکتہ بے حد پُر کشش ہے، لیکن افسانہ کے مطالعہ کے لئے ہم اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح کی خاصی دلچسپ تعریفیں وہ ہیں جو افسانہ کا تعین تعدادِ الفاظ یا مدتِ مطالعہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مگر شاید ہی کوئی افسانہ ہو جو اپنے تخلیقی عمل کے دوران ان امور کو پیش نظر رکھ کر لکھا جاتا ہو۔

گذشتہ چند برسوں میں نصابی کتابوں اور نصابی ذہنوں نے افسانہ کی ہیئت کو ناول کی ہیئت کے ساتھ اس حد تک گڈمڈ (CONFUSE) کر دیا ہے کہ بار بار یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ جب دونوں اصناف میں اس قدر قریبی مماثلت ہے تو پھر انھیں الگ الگ اصناف قرار دینے سے کیا فائدہ؟۔ اس کے باوجود جب بھی افسانہ کی تکنیک یا اس کی تفاصیل کے بارے میں لکھا جاتا ہے تو غیر ارادی طور پر نہ صرف افسانہ کے قطرہ میں ناول کا دجلہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ مثالیں بھی (دو چار ہی سہی) ناول سے فراہم کی جاتی ہیں اور خود اپنے ذکر میں افسانہ بیگانہ (OUTSIDER) ہی بنا رہتا ہے۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ لاکھ امتیاز کے باوجود ایک آزاد نثری صنف ادب کی حیثیت سے افسانہ کا تصور محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ چیخوف یا پو کی طرح افسانہ کی ایسی معذوری سی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ سوائے لفظوں اور لمحوں کے ناول و افسانہ

میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

بات کو زیادہ الجھانے کے لئے عام طور سے یہ تاویل کی جاتی ہے کہ ناول و افسانہ میں ہمیں بہت زیادہ فرق اس وجہ سے نظر نہیں آتا کہ تقریباً تمام ہی بڑے افسانہ نگار بڑے ناول نگار بھی رہے ہیں۔ چنانچہ دونوں اصناف کی سرحدیں "خالقِ واحد" کی وجہ سے ایک دوسرے سے اس قدر قریب آجاتی ہیں کہ ان میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ دلیل بھی کچھ عذرِ لنگ ہی معلوم ہوتی ہے۔ آخر قصیدہ اور غزل میں یہ خلط مبحث کیوں نہیں ہوتا جب کہ ان میں بھی بہت سی صفات مشترک ہیں۔ مثلاً مصرعۂ ثانی کا ہم ردیف و ہم قافیہ ہونا عموماً ایک شعر میں ہی مضمون کا مکمل ہو جانا، شروع میں مطلع اور آخر میں مقطع کا اہتمام کرنا، وغیرہ۔ گویا تکنیک میں بہت زیادہ مماثلت دونوں کو ایک ہی صنف کا صغریٰ و کبریٰ نہیں بنا سکتی۔ اس لئے میں ایک بار پھر وہی سوال اٹھاتا ہوں کہ آخر افسانہ ہے کیا؟

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں افسانہ پر ایک آزاد صنفِ ادب کی حیثیت سے غور کرنا ہوگا بجائے اس کے کہ ہم کسی اور صنف کے سیاق میں اس پر بحث کریں۔ اگر افسانہ اپنی اس حیثیت کو استوار نہیں کر سکتا، تو وہ ادب میں قایم بالذات بھی نہیں ہو سکتا۔ اور جب اس کی کوئی آزاد حیثیت نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ ہم اسے منفرد فسانوی صنف تصوّر ہی نہ کریں اور جب بھی ذکر کریں تو محض ضمناً ہی کریں۔ اتنے بڑے اقدام کے لئے بھی تو ہم تیار نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس کی اپنی انفرادی حیثیت اپنا اعتراف کرانے کے لئے ہمیں مجبور کر دیتی ہے۔

افسانہ میں وحدتِ تاثر کو اس کی بنیادی صفت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ وحدت تاثر کس چیز کا یا کس چیز کے بارے میں ہوتا ہے؟ کیا اس میں کسی واقعہ کو بیان کرنے کو اہمیت دی جاتی ہے؟ کیا چند افراد یا کرداروں کی پیش کش کو اساسی اہمیت حاصل ہوتی ہے؟ یا یہ سب اُس کُل کے عوامل ہیں جن کی حیثیت محض ضمنی ہے؟۔ ان سوالات کے جوابات ہمارے لئے بہت سے مسائل کھڑے کر دیتے ہیں۔ اگر ہم ان عوامل پر الگ الگ غور کریں تو ہم اس نکتہ تک نہیں پہنچ سکتے جو افسانہ کی اصل روح کو ہم سے متعارف کراتا ہے۔ چنانچہ افسانہ کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ اس مرکزی خیال کو گرفت میں لینے کی کوشش کریں جس کی خاطر یہ ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے۔

افسانہ کے تار و پود اس امر کو پیش کرنے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں جس کو پیش کرنے کے لئے افسانہ نگار اپنے اندر تخلیقی تحریک محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک مختصر محدود سے قرطاس پر صرف اس تجربہ، تاثر یا نکتہ کو پیش کرنا چاہتا ہے جو بہت سی تفصیلات سے عاری ہونے کے باوجود قاری کے ذہن پر اپنے نقوش ثبت کر جائے۔

اس کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ جزئیات نگاری کرے، یا کرداروں کے محاسن و معائب بیان کرے، وہ تو ان سے صرف وسیلہ کا سا کام لیتا ہے، اور افسانہ میں انھیں اسی حد تک نمایاں رہنے کی اجازت دیتا ہے جب تک وہ اس کے مرکزی خیال کو سنوارنے اور اسے پیش کرنے میں ممد و معاون ہوں۔ اس طرح کردار یا واقعات و حادثات صرف اسی حد تک نمایاں ہو پاتے ہیں جس حد تک کہ ان کی ضمناً ضرورت ہوتی ہے۔

افسانہ مکمل ہونے پر کسی خیال، فکر، تجربہ یا جذباتی ردِّ عمل کو ابھار دیتا ہے، یہی اس کا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ بھی ضرور ہوگا کہ ہر خیال، فکر، تجربہ یا ردِّ عمل کے ساتھ کچھ ذیلی افکار و خیالات یا تجربات و ردِّ ہائے عمل ہوتے ہیں جو صرف جزوی ہی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سب کو اگر مرتب کیا جائے تو ایک محور کے گرد ایک رنگا رنگ محیط کبھی آراستہ ہو جائے گا۔ اور ان سب کو جب یک جائی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ تاثر عالم وجود میں آئے گا جو افسانہ کا مقصود ہوتا ہے۔ یہ نوعیت ان افسانوں کی بھی ہوتی ہے جنھیں ہم علامتی افسانہ کہتے ہیں۔ ہر علامتی افسانہ میں ایک کلیدی علامت ہوتی ہے، جس کے ساتھ ذیلی علامتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ کلیدی علامت ہمیں اس انجام تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے جس کے لئے افسانہ تخلیق کیا گیا ہے۔ افسانہ اگر کسی کلیدی علامت کو پیش کرنے میں ناکام ہو جائے تو افسانہ بکھر جاتا ہے، چھوٹے چھوٹے غیر متعلق اجزاء میں تقسیم ہو جاتا ہے اور اس میں داخلی تنظیم پیدا نہیں ہو پاتی۔

جدید ترین اردو افسانہ میں تجرید کو بھی ایک منفرد تجربہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ اس تصور کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے کہ سیاق و سباق، گرد و پیش، مقامیت یا پہچان افسانہ کو غیر معمولی طور پر مختص نہ کر دے۔ یہ لواحق ایسے ہیں جو قاری کی دلچسپی کے دائرے کو بہت زیادہ محدود کر دیتے ہیں۔ اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ اسے امکانی حد تک لطیف یا اثیری (ETHERIAL) بنا دیا جائے۔ اور قاری کو اس کا موقع فراہم کیا جائے کہ قاری خود اپنی ذات کے حوالہ سے اس کو مختص معنویت فراہم کرے افسانہ کے تاثر کو وسیع تر قرطاس عطا کرنے کے لئے یہ تجربہ لائقِ تحسین ہے، کیوں کہ اس طرح قاری فنکار کی انگلی پکڑ کر چلنے کے لئے مجبور نہیں ہوتا۔

تجریدی افسانہ نے خود افسانہ کی تعریف کے لئے نئے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ افسانہ کے لئے پلاٹ، کردار، وحدتِ تاثر، وغیرہ لازمی تقاضے ہیں، کیوں کہ کردار عام طور سے محو ہو جاتے ہیں، پلاٹ اس حد تک مبہم ہوتا ہے کہ اس کے سروں کی تلاش کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ جب مسلّمہ اصول ٹوٹ جائیں، ہیئت تبدیل ہو جائے تو روایتی تعریف از کار رفتہ ہو جاتی ہے، اور نئی تعریف کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔

ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ فن پہلے عالمِ وجود میں آتا ہے۔ اور اس کے اصول و قواعد بعد میں ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ فن کار کا ذہن ہمیشہ نقاد کے ذہن پر برتری رکھتا ہے۔ فن کار اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر اعتماد رکھتا ہے اور تخلیقی عمل کے دوران اُن پابندیوں کو اہمیت نہیں دیتا جو اُس پر خارج سے عائد کی جاتی ہیں۔ وہ تو صرف تنویر کو ہیئت عطا کرنے میں منہمک ہوتا ہے جو اس کے باطن میں جلوہ سامانی پیدا کئے ہوتی ہے۔ اس تخلیقی ماحصل یا فن پارہ سے کون سے قواعد و ضوابط مجروح ہوتے ہیں اس کی فکر اسے نہیں ہوتی۔ اس کے فن کو پرکھنے والے کس انتشار کا شکار ہوتے ہیں، یہ اس کا دردِ سر نہیں ہوتا۔ ابتداءً روایت سے اس کی بغاوت برافروختگی کا ایک طوفان کھڑا کر دیتی ہے، لیکن بالآخر نقاد کو اس کے ساتھ مفاہمت کرنی ہی پڑتی ہے، اور مسلّمہ اصولوں پر نظرِ ثانی لازمی تقاضہ قرار پاتی ہے۔

افسانہ کے فن میں مسلسل تجربات نے بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیدا کر دی ہے اور اب جب کہ اردو میں افسانہ نے اپنی تاریخ کی تقریباً ایک صدی مکمل کر لی ہے، ہمیں اپنے مسلّمہ تصورات پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ہمارا جدید افسانہ اس چوکھٹے میں صحیح نہیں بیٹھ رہا ہے جو اس کو پرکھنے کے لئے ہمیں اب تک فراہم کیا گیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ افسانہ کے لئے وہ بہت سی شرائط جو اب تک عائد کی جاتی رہی ہیں وہ تشفی بخش ثابت نہیں ہو رہی ہیں۔ اِس امر کی طرف میں سطورِ بالا میں مجملاً اشارہ کر چکا ہوں۔

افسانہ کے بارے میں ایک فرسودہ تصوّر یہ بھی عام رہا ہے کہ وہ واقعہ یا حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں نے (جن میں پریم چند بھی شامل تھے) اکثر اس بات پر اصرار کیا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں "سچی کہانی" ہے لیکن قارئین نے اس تصدیق کو کسی نوعیت سے بھی اہمیت نہ دی اور یہ روش متروک ہوگئی۔ افسانہ نگار لکھتا رہا، تجربہ کرتا رہا، اور واقعہ یا حقیقت کا مقام افسانہ میں باقی رہا۔ ترقی پسند افسانہ کے پیشِ نظر ایک مقصد تھا چنانچہ اس نے راست بیانی کو غیر معمولی اہمیت دی اور واقعہ یا حقیقت افسانہ کا اصل محور بنا رہا۔ لیکن یہ ہیئت بھی جب کثرتِ استعمال سے فرسودہ ہوگئی تو واقعہ یا حقیقت کو پیش کرنے کا انداز بدل گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا افسانہ و فادارانہ انداز میں واقعہ یا حقیقت کو پیش کرنے کے لئے پابند ہوتا ہے؟ یا اِس سوال کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ افسانوی واقعیت یا حقیقت کیا ہے؟ افسانہ کی تعریف کے لئے ان سوالوں کے جوابات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ یہ ناقہمی کا مسئلہ اٹھایا ہی اس

لئے جاتا ہے کہ افسانہ بذاتِ خود معرضِ بحث میں آجائے۔

فن افسانہ کے وہ نقاد جو اس صنف کا تجربہ نہیں رکھتے ہیں یا جو اس کی نزاکتوں سے آشنا نہیں ہیں وہ تاریخی حقیقت اور معاشرتی حقیقت میں امتیاز نہیں کر پاتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ واقعہ یا حقیقت صرف وہ ہے جس کی تصدیق کی جا سکے۔ اصولاً یہ بات درست ہے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسی تصدیق؟ کیا صرف دن، تاریخ، مقام، افراد کے تعین کی مادی تصدیق ہی کفایت کرے گی؟ یا وہ واقعہ/حقیقت جو بہ تکرار ہوتی رہتی ہے اور جو وقت، مقام اور فرد کے برابر تبدیل ہوتے رہنے کی وجہ سے عمومیت اختیار کر لیتی ہے؟ میں پورے یقین کے ساتھ اس امر کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ افسانہ تاریخی حقیقت نہیں ہوتا۔ افسانہ تخلیقی صنف ہے اور تاریخ معاشرتی علم (SOCIAL SCIENCE)! دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس لئے دونوں کی حقیقت یا واقعیت کو ایک پیمانہ سے نہیں ناپا جا سکتا۔

تاریخی حقیقت کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے جب کہ افسانہ کی حقیقت استقبالی ہوتی ہے۔ تاریخ اس واقعہ کو اہمیت دیتی ہے جس کا عملاً صدور ہو چکا ہے، اس کے برخلاف افسانہ کے لئے ہر وہ واقعہ اپنی اہمیت رکھتا ہے جس کے صدور کا امکان ہو۔ تاریخی واقعہ مختص ہوتا ہے لیکن افسانہ کا واقعہ عمومیت کا حامل ہوتا ہے۔ تاریخ کے ذریعہ چند افراد (وہ بھی ملوکی، سیاسی، اقتصادی اہمیت کے حامل اشخاص) کے حالات اور کارناموں کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ تاریخ نام ہی اہم واقعات کا ہے۔ اس کے ذریعہ کبھی بھی کسی معاشرہ یا قوم کی مکمل تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ صرف چند جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، وہ بھی جنگوں کی یا استحصال کی!

افسانہ افراد کو منظر نامہ سے غائب کر دیتا ہے، مقام و وقت کو مبہم کر دیتا ہے، لیکن گرد و پیش اور اس کے احوال کو اپنی گرفت سے جانے نہیں دیتا۔ وہ اپنے دور کے ذہن اپنے وقت کے تقاضوں اور ماحول کی خصوصی صفات کو اپنی فنی بافت میں پیوست کر لیتا ہے، چنانچہ ہر دور کا افسانہ اپنے موضوع (THEME) کے علاوہ اپنی تکنیک کے ذریعہ بھی اپنے عصر کی فنکارانہ نمائندگی کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ افسانہ تاریخ نہیں ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ افسانہ کے ذریعہ زیادہ جامع اور ہمہ پہلو تاریخ کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ معاشرتی علوم کے ذریعہ اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں کیسرلر اور سوسن لینگر کے نام تو لئے جاتے ہی رہے ہیں۔ اب لیوس کوزر اور آئن ویٹ وغیرہ کو بھی حوالہ کی فہرست میں شامل کر لیا جائے۔

افسانہ کی حقیقت یا واقعیت کو زیرِ بحث لانے کے بعد اس کی تعریف کے لئے ایک مسئلہ اور اہمیت

اختیار کر گیا ہے کہ کیا افسانہ بیان واقعہ ہے یا حقیقت کی عکاسی ؟ میری نظر میں اس استفسار کا جواب محض اثبات یا نفی میں نہیں دیا جا سکتا، اور جو اصحاب رائے راست بیانی کی مدافعت میں اس طرح کی حرکت کرتے رہے ہیں وہ نہ صرف اپنے قارئین کو بہکاتے رہے ہیں بلکہ اپنے استدلال کی سطحیت کو بھی رسوا کرتے رہے ہیں۔ افسانہ واقعہ یا حقیقت کو صرف اپنی اساس بناتا ہے، اور انھیں صرف اسی حد تک استعمال کرتا ہے جتنا افسانوی تقاضوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

افسانہ کی معروف و مستند تعریف سے ہٹ کر ہمیں اسے ایسا تجربہ (EXPERIENCE) قرار دینا ہوگا جو افسانہ نگار اپنے گرد و پیش کے سیاق میں ذہنی، فکری اور فنی سطح پر کرتا ہے۔ ہمارے دور میں یہ نثری صنف ہے، حالاں کہ اپنے ابتدائی دور میں اسے شعری قالب عطا کیا گیا تھا۔ اس کی ہیئت ماضی میں خاصی واضح اور متعین تھی لیکن بیسویں صدی کے تجربات (EXPERIMENTS) نے اِس پابندی کو ختم کیا اور اِسے ہیئتی لحاظ سے یک سطحی سے کثیر سطحی تکنیکی تجربہ میں تبدیل کر دیا۔

افسانہ کے لئے واقعہ، کردار، حادثات، مسائل، عروج، حل سب ضروری ہیں لیکن اس حد تک نہیں کہ یہ افسانہ کے ہاتھوں کے ہتھکڑیاں اور پیروں کی بیڑیاں بن جائیں۔ افسانہ نگار انھیں استعمال بھی کر سکتا ہے، فنی تجربہ یا ندرت کے لئے ان سے صرفِ نظر بھی کر سکتا ہے۔

افسانہ وحدتِ تاثر کا بھی حامل ہو سکتا ہے اور کثرتِ تاثر کا بھی! لیکن اس تجربہ (EXPERIENCE) سے عاری نہیں ہو سکتا جس کی افسانہ نگار فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ قاری تک ترسیل کرنا چاہتا ہے اس ترسیل کی ہمہ گیری اور دیرپائی کے لئے وہ افسانہ کو کوئی بھی صورت عطا کر سکتا ہے۔ اِس آزادی کے باوجود افسانہ اپنے سیاق سے وابستہ رہتا ہے۔ یہی اس کا کمال ہے۔ ◻

(زیرِ تصنیف کتاب "افسانہ کا فن" کے چند ابتدائی اوراق)

ڈاکٹر عتیق اللہ

۱/۲ سی، راجوری گارڈن
نئی دہلی

افسانے کی داخلی گہری ساخت

میں اردو افسانے کی ارتقاءات مایوس نہیں ہوں۔ اور اگر انفرادی سطح پر میرا ردِ عمل مایوس کن ہو تو بھی مجموعی طور پر افسانے کی صحت بلکہ افسانہ نگاروں کی صحت پر کوئی آنچ نہ آئے گی میں اور میرے علاوہ بہتوں کو ایک ایسی صورت حال کا سامنا ضرور ہے جو کبھی طمانیت بخش لگتی ہے اور کبھی مایوس کن۔ تشکیک کی یہ کیفیت محض افسانہ ہی سے وابستہ نہیں ہے اردو کی جملہ اصناف ادب اس نوع کا ردِ عمل پیش کر رہی ہیں اور ایک لحاظ سے یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔

نئے افسانہ نگاروں نے اس تخلیقی خلا کو پر کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ ان میں کبھی تشکیک ہے لیکن وہ حوصلے سے عاری نہیں ہیں۔ دراصل افسانے کا فن بڑا CHALLENGING ہے شاعری کی روایات کا ایک واضح اور صدیوں پر محیط نظام ہے۔ شاعری تجرید کا حوالہ ہے۔ شاعر زیادہ سے زیادہ زبان کے تخلیقی امکانات کو بروئے کار لاتا ہے اور لا سکتا ہے۔ اس کی کائنات ایک ایسی تخلیق کا استعارہ ہے جس میں وہ الفاظ کے نئے قرائن خلق کرنے میں خود کار ذہنی جدلیت سے بھی کام لے سکتا ہے۔ شعر کی اکائی لفظ ہے اور افسانے کی واقعہ۔ افسانہ نگار حقیقت سے یک گونہ معاملت کے بغیر کہانی کو اپنی فہم سے آشنا نہیں کر سکتا کہ اس کی تجرید بھی حقیقت ہی کا حوالہ ہوتی ہے۔

میں ان نقادوں میں اعتماد کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ جن کی نظر میں افسانے کی تخلیقی بساط محدود ہے غزل کی بساط بھی تنگ تھی لیکن ہمارے عہد ہی میں ان شعرا کی کمی نہیں جن کی تمام تر تخلیقی زندگی اور تخلیقی وقعت کا مدار یہی بدنام زمانہ صنف بن گئی۔ اصل میں ایک کانشس فنکار کے لئے روایت اور اس سے پیش رو روایت ایک بڑا سوال بن جاتی ہے۔ روایت کا ایک زیریں اور خود رد عمل ہوتا ہے۔ جو زبان اور ادب کی تاریخ کے پہلو بہ پہلو جاری رہتا ہے۔ ایلیٹ نے روایت کو کسب کرنے پر اصرار تو کیا ہے لیکن وہ روایت کی اسی جدلی توفیق کے راز کو نہیں سمجھ سکا۔ فنکار اگر باخبر ہے کانشس ہے تو وہ روایت سے کبھی فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کے لائف فورس کو ایک قرینہ عطا کرتا ہے۔ روایت کا ایک عمل تخویف کا عمل ہے۔ خصوصاً قریبی پیش رو

روایت اس قسم کا آسیبی تاثر دیا کرتی ہے۔ وہ للچاتی ہے، دھوکا دیتی ہے، اپنا اسیر کرنا چاہتی ہے اور یہ تانیہ ایک جینوئن فن کار کے تئیں بڑا آزمائشی ہوتا ہے۔ وہ انکار و اقرار کے مجادلے میں اپنی توفیق کو داؤ پر نہیں لگاتا۔ بلکہ روایت سے زور آزمائی کرتا ہے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ روایت کے پہلے عمل کا وہ منکر نہیں لیکن روایت کا دوسرا عمل اس کے لئے چیلنج کا ایک نیا باب وا کر دیتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کے سامنے بھی چیلنج کی اس صورت نے نمو پائی ہے۔

گڑبڑ وہاں ہوئی جہاں نئے افسانہ نگاروں نے نہایت سرعت کے ساتھ عظمتوں کے ہفت خواں سر کرنے میں ساری قوت جھونک دی۔ ایک دوڑ تھی کہ ہر ایک جلد سے جلد اپنی انفرادیت کی مہم سر کرنے کے درپے تھا۔ خالی خولی تجربے کی بن آئی اور بیشتر کو اس بے مہرنے اپنا نوالہ بنالیا۔ انھوں نے اپنے عہد کے حقیقی آشوب سے صرف نظر کی اور مغرب کی تکنیکی تجربہ پسندی کو اپنا مرکز ثقل بنایا اور ہوائی کرتب دکھاتے رہے چھوٹی چھوٹی حیرتوں اور کامرانیوں نے انھیں لمحاتی خوش وقتی کا اسیر بنائے رکھا۔ نتیجہ سامنے ہے۔ افسانہ گھپلے میں پڑ گیا اور خود افسانہ نگار چارخانے چت۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے روایت سے کس قدر سیکھا ہے کس قدر اسے اپنی فہم کا حصہ بنایا ہے۔ کس قدر اسے راہ دی ہے۔ کتنی مدافعت کی ہے، کتنا سپرد کیا ہے، اور کتنا اضافہ۔ پریم چند، کرشن چندر، بیدی یا منٹو کو بے جوڑ قرار دینے یا ان پر تبرّہ بھیجنے سے نیا افسانہ جنم نہیں لیتا اور نہ ہی ان سے قطعی مفاہمت کرنے سے تموّل کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ روایت کا دوزخ پار کرنے کے بعد ہی تخلیقی انحراف کی راہ روشن ہو سکتی ہے۔ ہمارے اکثر افسانہ نگاروں نے اس نقطے کو سمجھنے کی یا تو کوشش ہی نہیں کی یا انھیں نقادوں کے عمومی فیصلوں کے پیش نظر اپنی ترجیحات کو بیع کرنے میں زیادہ سہولت دکھائی دی۔ تنقید نے تنقید سے اپنا سکہ کھرا اور بڑی چالاکی سے تخلیق کو اپنا تابع مہمل بنالیا۔

افسانہ زندگی کا ایک جز ایک کیفیت ہے۔ اس کا اصل حسن اس کے اجمال ہی میں کھلتا اور پروان چڑھتا ہے۔ ارتکاز کی بے پناہ شاعرانہ صلاحیت کے بغیر افسانے کے جوڑ جہاں تہاں سے کھل جاتے ہیں۔ تاثر کی وحدت مجروح ہو جاتی ہے اور تجربے کی سالمیت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اس نواح میں پلاٹ کے معنی وہ نہیں رہ جاتے جنھیں ہم اپنی درس گاہوں سے رٹ کر آتے ہیں۔ افسانے کے ضمن میں پلاٹ سب سے بڑا مغالطہ ہے۔ خصوصاً پلاٹ کے مروّجہ تصوّر کی روشنی میں افسانے کی بساط تنگ ہے۔ پلاٹ اپنی مناسب تعریف میں عمل، کردار اور خیال کی ترکیب ہے۔ افسانے کو ابتدا اور انتہا کی ایک ایسی مخصوص فریم میں چست کبھی نہیں کیا جا سکتا جس میں کہانی کی رفتار بہ تدریج اور واقعات کا ارتقا رزمان

کے ایک خاص نظم کے تحت ہوتا ہے۔ ڈرامہ میں بہ ہر صورت پلاٹ کی اِس منطق کو بہ روئے کار لایا جا سکتا ہے اور لایا جا رہا ہے لیکن افسانے کے خصوص میں تجربہ اور حقیقت وقت کی ایک مسلسل تنظیم کے تحت نشو ونما نہیں پاتے۔ بلکہ افسانہ نگار کی ذہنی اور تخلیقی رو کی مناسبت کے ساتھ ایک واقعی ہیئت میں نظم ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے افسانے کے ذیل میں پلاٹ یا تو محض ابتدا کا نام ہے یا ایک ایسے داخلی نظم کی تعبیر کا نام جسے دوسری طرف قاری خود اپنے ذہن میں تشکیل دیتا اور قایم رکھتا ہے۔ حقیقت سے ربط اور حقیقت کے ادراک کی ایک سطح خود فنکار کی اپنی ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی صدمہ اس کے لئے ایک اہم تخلیقی معنی بن جاتا ہے اور وہ اسے ایک نئی حقیقت کے طور پر فنی بالیدگی سے گذارتا ہے۔ یہاں پہنچ کر کیا ہم پلاٹ کے بندھے ٹکے تصور کا اطلاق افسانہ کے فن پر کریں گے؛ جب کہ ہر افسانے کے ساتھ پلاٹ کے معنی اور پلاٹ کا تصور بدل جاتا ہے ذرا ایک نظر بالکنی (کرشن چندر) ممی (منٹو) چائے کی پیالی (حسن عسکری) سایہ (غلام عبّاس) جلا وطن (عبداللہ حسین) بے محاورہ (جوگندر پال) لا (کلام حیدری) آخری کمپوزیشن (مین را) رونے کی آواز (سریندر پرکاش) آگ کے ہم سائے (احمد یوسف) یا ہوکی نئی تعبیر (رشید امجد) پانی میں گھرا پانی (محمد منشا یاد) گرتے آسمان کا قصہ (احمد داؤد) دھند اور دھول (کنور سین) زنجیر ہلانے والے (سلام بن رزّاق) سونے کی مہر (مرزا حامد بیگ) اور بانگ (شوکت حیات) وغیرہ افسانوں کی داخلی ساخت بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں پلاٹ کا عمل ایک دوسرے سے مختلف اور داخلی خود رو کردار کا حامل ہے۔ اس کا میکانیکی تماش افسانے کو محض ایک فارمولے میں بدل دیتا ہے۔ جب وہ اپنی حرکت کی اکائی میں از خود نمو وکشود پاتا ہے تو ابتدا اس کی ابتدا بھی ہو سکتی ہے، اس کی انتہا بھی اور اس کا وسط بھی۔ اپنی انتہا میں وہ منطق کے مطابق بھی ہو سکتا ہے اور غیر متوقع اور اتفاقی بھی۔ اس کی نمایاں اور ذیلی تبدیلیاں اور وقوعے رسمی بھی ہو سکتے ہیں اور غیر رسمی بھی۔ مگر اپنی ہر صورت میں وہ موضوع وقت اور عمل کی ایک محدود بساط سے متجاوز نہیں ہوتا کہ افسانوی پلاٹ میں خارجی صورتِ حال و واقعات اور داخلی ذہنی کیفیات و وقوعات کا باہمی تعامل بر سر کار رہتا ہے۔ وہ کسی جامد لمحے پہ استوار نہیں ہوتا بلکہ بہ ذاتِ خود ایک متواتر حرکت ہے جو افسانے کے مختلف اجزا کو ایک معنی عطا کرتی ہے۔ زمان کو کتنا بھی الٹ پلٹ دیا جائے افسانہ نگار کی ذہنی اقلیم میں وہ ایک داخلی اور نامیاتی رو کے تحت ہی اپنی آخری سطر تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح قاری کی اپنی ذہنی رو افسانے کے ظاہرا CHAOS میں ایک الگ نظم کا سراغ لگا لیتی ہے۔ لیکن یہ سب حقیقت سے پہلے اور بنیادی اقرار کے بعد کا عمل ہے۔ افسانہ نگار اگر بے صبرا ہے، اس پر آن کی آن میں منزل کو جا لینے کی دھن سوار ہے۔ زبان و بیان پر اس کی گرفت ڈھیلی ہے۔ اس کا تجربہ کوتاہ و کم عیار ہے۔ مغالطہ سازی اسے عزیز ہے تو اس کی ذہنی پراگندگی افسانے میں بھی آشکار ہوگی۔ اس کی کوئی بافت ہوگی

نہ کوئی ساخت۔

مقصود یہ کہ افسانہ کے ضمن میں ارسطوئی MYTHOS پر مبنی پلاٹ کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا
افسانے نے ہمیشہ پلاٹ کے معینہ تصور کو بے دریغی سے رد کیا ہے۔ پریم چند کا سارا کا سارا فن آئیڈیا کی تعمیر
و ترسیل کو مختص ہے۔ زبان۔ کردار اور واقعہ کی تشکیل بھی وہ آئیڈیا کے تحت کرتے ہیں۔ وقت کے معاملے میں
ان کے ضبط اور خارجی واقعات پر اصرار کی وجوہ بھی ان کے اسی رویے میں مضمر ہیں۔ انسانی شعور کی مختلف
جہتوں کو دریافت کرنے میں ان کی دلچسپی کم سے کم ہے۔ لیکن پریم چند ایسے منضبط ذہن رکھنے والے کہانی
کار کی کہانیاں بھی بسا اوقات ان کی عاید کردہ لکشمن ریکھاؤں کو چھلانگ جاتی ہیں۔ 'شکوہ و شکایت' کا تسلسل
داخلی ہے نہ کہ خارجی۔ وقت کے مقررہ نظام میں یہاں بھی جگہ جگہ سے شکن پڑ جاتی ہیں۔ ایک رو دوسری رو
کو کاٹ دیتی ہے۔ سارے لاحقے سابقے گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ محض ایک کردار کی داخلی کلامی افسانے کے دروبست
میں سُوت کا کام کرتی ہے۔ کم و بیش یہی شکل کرشن چندر کے کالو بھنگی میں عیاں و نہاں ہے۔ کہیں کوئی کردار
اور کہیں افسانوی واحد متکلم درمیانی وقفوں اور درزوں کو پُر کرنے کا کام کرتا ہے۔ کبھی بظاہر واقعاتی عدم
مماثلتوں کے پس پشت مکان اور مقام افسانے کی گہری ساخت کی تعمیر کرتے ہیں اور یہی ایشن افسانے کی
اس بیرونی ساخت کی تعبیر بن جاتی ہے جس کے جوڑ جہاں تہاں سے کھلے ہوئے اور علٰیحدہ علٰیحدہ سے محسوس
ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ افسانہ نگار افسانے کی گہری ساخت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ چوں کہ اس کا معاملہ
زمان کے ایک محدود ترین عرصے سے ہوتا ہے اس لئے بیرونی ساخت کی باقاعدگی اس کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج بنی
رہتی ہے اور اُسے اس باقاعدگی کو تہس نہس کر کے گہری ساخت کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ احمد علی کی ہماری
گلی، قرۃ العین حیدر کی ڈالن والا، غلام عباس کی آنندی، جوگندر پال کی عمود اور بازیافت، ——— اور ———
انور عظیم کی سات منزلہ بھوت میں موقعیت افسانے کی گہری ساخت کی تعمیر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہانی جب آپ اپنی
راہ لیتی ہے اور اپنی فطرت کی تلاش آزادانہ سطح پر خود کرنے کے درپے ہوتی ہے تب ہی پلاٹ کو ہزار طرح کے
صدمے اٹھانا پڑتے ہیں۔ ایک کیفیت، ایک صدمہ یا ایک تاثر کے اظہار کے لئے دو چار سطریں کافی ہوتی ہیں لیکن
افسانہ نگار اِس کیفیت، صدمے یا تاثر کو شدید، متعلق، غیر معمولی اور بے چینیوں سے معمور کرنے کی غرض سے
متوازی تلازموں، خیالوں اور جذبوں کی دھنک کھینچ دیتا ہے۔ جہاں غیر متوازی اور غیر یکساں واقعات، جذبات
اور تاثرات سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں افسانے کی گہری ساخت مختلف جوڑوں کو مربوط
کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔ افسانہ نگار جب افسانے کو بیرونی ساخت کے حوالے کر کے ایک ایک قدم پھونک پھونک
کر چلتا ہے اور تنظیم کے حق میں باریک سے باریک درز اور معمولی سے معمولی صدمہ بھی گوارا نہیں کرتا تو الٹا افسانہ

ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ہر موڑ نپا تلا، ہر کردار ڈھلا ڈھلایا، ہر تاثر مرتب اور ہر منظر تواتر کے مطابق ـــــــ گویا افسانہ نگار کوئی افسانہ نہیں تاج محل کھڑا کرنے جا رہا ہے۔

کرشن چندر پر بار بار یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کے افسانے کی بُنت چست نہیں ہوتی کیوں کہ افسانہ اپنے مرکز سے منقطع ہو کر بے اختیار جذبے اور شاعرانہ تخیل کی معیت میں گم ہو جاتا ہے۔ افسانے میں کئی ناگریز LINKS محو ہو جاتی ہیں اور کئی غیر ضروری اور غیر متعلق تلازمے در آتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ہمہ اوست بھی ہیں اور ہمہ دان بھی۔ مستزاد یہ کہ بچی کھچی کسر تجزیہ پسندی نکال دیتی ہے۔ کردار اپنے ملبوس میں ننگے، فطرت ہزار رنگوں میں آر پار، واقعہ اپنے وقوع سے قبل معلوم۔ گویا کرشن چندر واقعے کی اصل حرکت کو اپنے طور پر پروان نہیں چڑھنے دیتے۔ کبھی ان کا اپنا رویہ اور نظریہ افسانے کے فطری ٹون پر اثر انداز ہوتا ہے تو کبھی ان کی ہمدردانہ طرف داریاں افسانہ کی خود رو ہیئت پذیری کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ درست، ایک نظر منٹو انتظار حسین اور قرۃ العین پر بھی ڈال دیکھئے۔ جن کے افسانوی کمالات کے بیانوں سے ہماری زبان نہیں تھکتی ٹوبہ ٹیک سنگھ کو آپ کیا نام دیں گے۔ کیا افسانہ نگار کی واضح تر ذہنی جانب داری یہاں نمایاں نہیں ہے۔ قاری کو پوری قوت کے ساتھ اپنے انتخاب کی راہ پر لانے کی یہ ایک ایسی کوشش نہیں ہے جس میں قاری کو افسانے کی بنیادی واقعی حرکت کے رونما ہونے سے قبل بہت سی غیر متعلق آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ گو کہ پورا افسانہ سارکازم کی بنیاد پر قایم ہے۔ لیکن کیا افسانے کا ابتدائی مرحلہ اپنے تمام تر معنوی رابطوں کے باوجود بالآخر افسانہ نگار کی پیش بند توضیح ثابت نہیں ہوتا؟ ہتک جیسے معرکۃ الآرا افسانے کا ابتدائی طویل حصہ سوگندھی کی اس صورت حال سے مربوط ضرور ہے جس سے واقعیت نمو پاتی ہے۔ لیکن منٹو اسے قلیل ترین لفظوں میں بھی پیش کر سکتا تھا سیٹھ کی اونہہ کے بعد کے ردِ عمل کو جس قدر طویل بیان کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اسے مختصر سے مختصر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن نہ تو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس طرح کی قطع و برید کی ضرورت ہے اور نہ ہتک میں کیوں کہ افسانہ نگار کو یک بات پیش کرنے کے لئے اسے کئی حوالوں سے بامعنی اور شدید بنانا پڑتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ فوری اشاروں سے کام لیتا ہے اور ان اشارات کو پیش کرنے کا ذریعہ محض بیان ہوتا ہے۔ البتہ "سڑک کے کنارے" کا آخری طلاقی نوٹ مختصر ہونے کے باوجود غیر ضروری اور زائد ہے۔ جس کا مقصود سنسنی خیزی ہے اور بس۔ قرۃ العین نے 'یاد کی ایک دھنک جلے' کے آخری صفحوں میں اس سے کہیں زیادہ بے صبری کا ثبوت دیا ہے۔ کارمن اور پت جھڑ کی آواز ایسی مثالیں ان کے یہاں کم یاب ہیں۔

انتظار حسین کے یہاں اخلاقی بحران اور ماضی سے علٰحدگیوں کے کرب اور گذشت کے آسیبی خوابوں کی تکرار ہے۔ ان موضوعات کی باز آفرینی اس کے بیشتر افسانوں میں جابجا کارفرما ہے کہیں یہ مسائل بنیادی ہیں، کہیں

فروعی اور ذیلی طور پر آپ ہی آپ سرایت کر گئے ہیں۔ "آخری آدمی" "ٹانگیں" اور زرد کتا میں انسان کی بدی ایک کابوس بن کر افسانہ نگار کے ذہنی گراف پر محیط ہوگئی ہے۔ انتظار حسین ذہنی توہمات اور مفروضات کو پوری قوت کے ساتھ افسانے میں رچانے بسانے کا ہنر جانتا ہے لیکن افسانے کا فن شیشہ گری کا فن ہے۔ اس کی نازک اور کومل بافت پر داخلی تجزیوں کی مسلسل دخل اندازی خود افسانہ نگار کی کم اعتمادی کی غماز ہے۔ آخری آدمی میں فرسودات ارشادات اور جابجا اسمار کے حوالے افسانے میں کئی جگہ درزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ ٹانگیں' میں آخری تین چار صفحات میں پیش رو تفصیلات کی بازآفرینی ـــــ انتہائی غیر ضروری اور حشو معلوم ہوتی ہے۔ انتظار حسین کے افسانوی اسلوب کو عموماً داستانوی قرار دیا جاتا ہے اور خود انتظار حسین کو اپنے افسانے کی مشرقیت پر اصرار ہے۔ جب کہ داستان نگار کی استعاراتی زبان، نثر کی بے بضاعتی اور کم کوشی کا نتیجہ تھی نہ کہ اس کی ضرورت تاہم فکر کی سطح پر داستان کا سیاقی کردار ژولیدہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے تھیم کے اخلاقی پہلو سے مربوط ہوتا ہے۔ اور پھر یہ کہ وہ داستان ہوتی ہے ضخیم جسیم، تفصیل اندر تفصیل کی حامل عینیت کی زائیدہ، تقدیر کی محکوم، اس بیسویں صدی میں انتظار حسین اگر داستان بھی لکھنا چاہیں گے تو داستان کو اپنی پہلی سطح پر دلچسپ اور مربوط بنانا ہوگا FABLE اور PARABLE یا اسطور کی بنیاد پر چند کہانیاں تو برداشت کی جا سکتی ہیں لیکن متواتر ان تکنیکوں کو دہرانا اپنی اوقات کو مٹی میں ملانا ہے۔ اپنی تخلیقی کوتاہ دستیوں کی پردہ داری کرنا ہے۔ آج کا قاری وعظ نہیں اپنی شرکت چاہتا ہے۔ ترقی پسند کہانیاں بھی تھیم کی کہانیاں ہیں اور خود انتظار حسین کی کہانیاں بھی تھیم کی کہانیاں ہیں پروپگنڈہ دونوں جگہ ہے۔ انتظار حسین کو شکایت ہے کہ ترقی پسند نقادوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ترقی پسندوں کو یہ شکایت ہے کہ بھائی یہ تو ہمارا ہی ہم زاد ہے فرق اتنا ہے کہ اس نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال رکھی ہے۔ ابھی وہ نقاب میں سے دیکھنے کے عذاب ہی سے گزر رہا ہے۔ برتنے کی تعذیب سے دوچار ہوگا تو ساری عینیت دفع ہو جائے گی کہ عزیز من زندگی کا اصل جہنم تو یہ ہے یہ دیکھو تمہاری رگ جاں کے نزدیک تمہارے بازوؤں میں اس کے ایک نہیں کئی دہانے ہیں اور دہانہ شرر شرر گز منہ پھاڑے ہوئے یہ نعرہ بلند کر رہا ہے ہل من مزید، ہل من مزید، دکھ کتاب میں نہیں ارد گرد ہے۔ تمہارے باہر ہی نہیں تمہارے بطن میں بھی ہے۔ لیکن تم جانتے بوجھتے انکاری ہو۔ انتظار حسین کا المیہ ہے کہ اس نے حقیقت کو ایک مخصوص و محدود چیز سمجھ رکھا ہے اس کی جدلیاتی فطرت کے ابلاغ سے ابھی وہ چنداں دور ہے۔ انتظار حسین کی خطابت کا آہنگ اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ ترقی پسند افسانے کی کمزور مثالوں میں پایا جاتا ہے۔ پھر بھی ترقی پسند افسانہ حقیقت کی کسی نہ کسی سطح کا حوالہ ہے۔ وہ ہماری فہم اور تجربے سے دور نہیں جاتا۔ انتظار حسین افسانے کی حدود میں بالواسطہ طور پر انسانیت اور اخلاقیات کی دہائی دیتا ہے۔ روحانی اور اخلاقی زوال کی نوحہ خوانی کرتا ہے۔ حال کو کوستا ہے اور حال ہی کے قبول کردہ نئے تناظر

میں اپنی تہذیبی شخصیت کی تلاش کرتا ہے۔ اور تلاش نہیں کرتا کہ اس ساری پراگندگی اور ابتری کی بادی وجوہ
کیا ہیں۔ انسان کو محض بد کہتے رہنے سے نیک انسان پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی انتظار حسین اپنی فطرت میں
نیک ہے اور تہہِ دل سے اس کا زور نیک قدروں کے احیا پر ہے تو اسے اپنی وضع کردہ افسانوی تکنیک کو
خیرباد کہہ کر جس ماحول میں وہ سانس لیتا ہے۔ جن لوگوں کے لمس سے شبانہ روز دوچار ہوتا ہے جس زبان میں
سوچتا بات کرتا ہے" اس کا عمل و ردِ عمل ایک ایسی تکنیک میں پیش کرے جو تخلیقی توانائیوں سے متصف ہونے
کے باوصف حقیقت و موقعیت کے تجربے سے منقطع دکھائی نہ دے۔ ایسا نہیں ہے کہ فکشن کی اصل اور واقعی زبان
حکائی یا داستانوی ہی ہے یا موجودہ زبان فنکار کے احوال و تجربات کے تئیں ناکافی ہے۔ آج کی زبان پہلے کے
نسبت ـــــ زیادہ قوی، زیادہ مجرد و محسوس زیادہ گستاخ، زیادہ قدرت کی حامل ہے۔ انتظار حسین ڈر ڈر کے
اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ اپنے تعینات، تعصبات، اور ترجیحات سے باہر نکل کر اپنے آپ کو چاروں دھام
بکھیرنے کی سعی نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ اس کا افسانوی فن چند مخصوص مسائل و موضوعات تک محدود ہو کر رہ
گیا ہے: افسانہ چوں کہ داستاں یا داستان کی قاش بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے اس کے افسانے کی
گہری ساخت بھی مربوط نہیں ہو پاتی۔ انیس ناگی نے ایک جگہ لکھا ہے:

> "انتظار حسین قصہ گوئی کے فن سے واقف ہیں، لفظوں کے تلازماتی ہیر پھیر سے بھی آشنا ہیں
> لیکن تصوراتی سطح پر ان کے یہاں "فردوس گم گشتہ" ایک واحد تجربہ ہے اور اس کا ناسٹلجیا
> ان کا واحد احساس ہے، چنانچہ تجربہ اور وسعت، جو نئے افسانے کی ایک اہم ضرورت
> ہے، وہ ان کے یہاں دستیاب نہیں ہے اس طرح انتظار حسین کا فن انسانی صورتِ حال
> کی علامت بننے کے بجائے ایک محدود "اقلیت" کا نوحہ بن جاتا ہے، ان کے افسانوں میں
> نئے افسانے کی تمام تکنیکیں دستیاب ہیں۔ لیکن وہ اپنے مواد سے جدا ہوتی ہوئی نظر آتی
> ہیں۔
> (تصوراتِ لاہور صفحہ ۵۴ ۱۹۷۸)

افسانہ تو TELEGRAPHIC TERSNNESS کا وظیفہ ہے۔ جس میں مختلف معنوی جہتیں ایک
خودکار وضع میں ڈھل جاتی ہیں اور اس طور پر افسانے کے داخلی سیاق کو ایک ایسے لسانی اسلوب سے مالا مال
کر دیتی ہیں جس میں تجربہ اور زبان مل کر ایک وحدے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرح افسانے کا مواد، مواد
نہیں رہ جاتا بلکہ افسانے کا خمیر افسانے کا اسلوب، افسانے کا قرینہ افسانے کی زبان بن جاتا ہے۔ اور جو افسانے
کے ہر درجے میں یکساں طور پر اپنی شرکت اور اپنی شمولیت کو قایم رکھتا ہے۔ اس معنی میں انیس ناگی کا یہ خیال
کہ "انتظار حسین کے افسانوں میں نئے افسانے کی تمام تکنیکیں دستیاب ہیں۔ لیکن وہ اپنے مواد سے جدا ہوتی ہوئی

نظر آتی ہیں بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن انیس ناگی نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کا ایک سبب تو خود انتظار حسین کی اپنی ادعائیت اور ہٹ دھرمی ہے۔ وہ ایک ایسا نامراد عاشق ہے جسے کسی سبز پوش سوار نے ہنوز لائق اعتنا نہیں سمجھا کہ کیوں مفت میں اپنی جان کھپاتا ہے۔ جا ملک روم میں تجھے آزاد بخت ملے گا اور وہیں تیری مراد پوری ہوگی۔ انتظار حسین کو یہ سوجھتا ہی نہیں کہ افسانے میں اگر اسلوبیاتی قطعیت کی مثال قایم کرنا ہے تو پیارے بھائی اپنی کالم نویسانہ تبلیغی و تنبیہی رویوں کو تج کر افسانے کے اس تماش پر توجہ کیجئے جس میں اپنے عہد کی حسیت اور واردات بھی نظر آئے اور پلاٹ کی گہری ساخت کی حرمت بھی قایم رہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ہماری تنقید نے کرشن چندر کے داخلی تجزیوں کی بنیاد پر اس کے افسانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ گو کرشن چندر اور انتظار حسین کے رویوں میں بعد القطبین ہے۔ لیکن اپنے اپنے تصورات کے اطلاق میں دونوں کے یہاں بے صبراپن جھلک مارتا ہے۔ کرشن چندر پھر بھی ایسی گنجائش فراہم کر دیتا ہے کہ قاری، بلکہ صاحب بصیرت قاری حشو و زوائد کا احساس کئے بغیر افسانے کی واقعی حرکت کو اپنے شعور کی رو سے متوازی جاری خیال کرتا ہے۔ انتظار حسین نے اپنی تخلیقی قوتوں کے اظہار کا میڈیم ادب کی جس صنف کو بنایا ہے وہ اس کی نفسیات اور نزاکتوں سے کم واقف ہے۔ انیس ناگی "قصیدہ گوئی کے فن" کی حد تک انتظار حسین کی واقفیت کو مسلم گردانتا ہے لیکن افسانے کے ساتھ "نئے" کا سابقہ نتھی کر کے انتظار حسین کو دوسرے ہی لمحے غیر متعلق بھی قرار دیتا ہے کہ اس کے یہاں تجربہ اور وسعت دستیاب نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ میں اپنی حاکمانہ قدرت نہیں رکھتا کہ کب اور کہاں اسے اپنے آپ کو ظالمانہ بے دلی کے ساتھ علیٰحدہ کر لینا چاہئے اور کہاں پھر یک گونہ فن کاری کے ساتھ جوڑ لینا چاہئے۔ افسانہ خود ضبطی کا حوالہ ہے۔ پلاٹ کی داخلی گہری ساخت اس قسم کے متواتر داخلی تجزیوں اور حوالوں کی بھرمار سے بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

افسانہ کی ایک ہمہ محتوی کیفیت، ایک جذباتی صورتِ حال ہوتی ہے۔ فن کار کا اپنا ایک رویہ ہوتا ہوتا ہے۔ کہیں داخلی تجرید اسے جذبوں کی ترسیم کے لئے اکساتی ہے۔ کہیں ترسیل کے معنی کے ضمن میں علامت اور استعارہ اس کے تخلیقی ضمائر ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی زندگی کی نارسائیاں، پیچیدگیاں، ضدیں اور مغائرتیں ——— اس کے لئے ہیو مراور آئرنی کا ایک وسیع میدان فراہم کر دیتی ہیں۔ یہ فن کاری تخلیقی کارکردگی پر منحصر ہے کہ وہ کس طور پر ٹون کے نامیاتی وا حدے کا وقار محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ انتظار حسین کو اپنی نام نہاد علم دانی کے مظاہرے سے سروکار ہے خواہ اس کا وسیلہ کچھ ہو انجام کچھ ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ پے بہ پے ناموں، حوالوں اور فرمودات سے افسانہ اس قدر گنجان اس قدر حاملہ ہو جاتا ہے اور کیفیتیں مرتّبو

اتنی سرعت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں کہ ذہن میں کوئی پیکر کوئی موڑ قایم نہیں رہتا۔ قاری کو افسانے کے ساتھ اتنے کانشس ہو کر چلنا پڑتا ہے کہ اس کی آزاد ذہنی تخلیقی وابستگی ـــــ متوازی طور پر قایم نہیں رہتی اصلاً انتظار حسین کو VERBOSITY کا عارضہ ہے وہ اسلوبیاتی قطعیت کی دُھن میں کہانی کو اپنے فیصلے پر چھوڑنا گوارہ نہیں کرتا کہ کہانی کی بے بال دپری ہی اس کی منطق کو راس ہے۔

کالو بھنگی ہو یا کبرا بابا یا مہالکشمی کا پل ـــــ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہو کہ ہتک، کہانی باہر ہی باہر اپنا سفر طے نہیں کرتی بلکہ داخلی جوڑوں کے باہمی رابطے اس کی گہری ساخت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں راجندر سنگھ بیدی، جوگندر پال، انور سجاد، مین را، غیاث احمد گدی اور سریندر پرکاش نے بڑی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کے یہاں حقیقت کا خود کار تقلیبی عمل بھی ہے اور افسانے کی داخلی چستی بھی۔

ہمارے افسانہ نگاروں کا مشاہدہ جس قدر وسیع ہوگا۔ حقائق پر جتنی گہری نظر ہوگی، ادراک جس قدر شدید ہوگا۔ ان کی ترجیحات میں از خود امتیاز کی سطحیں رونما ہوں گی۔ وہ چیزوں اور چیزوں کے مابین فرق کو محسوس کریں گے۔ انسانی زندگی اور فطرت کی پیچیدگیاں، انفس و آفاق کی رمزیت، علم و بصیرت کی تعذیب، وقوعات و واقعات کا غیر متوقع پن، سیاق عدم مطابقتیں بے وقوفیاں، گمانیاں بدگمانیاں، حوصلگی و بے حوصلگی، انا و ضمیر کی کشاکشیں اور کش مکش، چھوٹی بڑی حیرتیں، کامرانیاں، پسپائیاں معنویتیں، عدم معنویتیں، تشکیک یقین، خواب اور ماضی کا سلسلہ جب تک قایم ہے۔ افسانہ میں تازہ دمی اور تازہ کاری قایم رہے گی۔ یہ ساری قلمرو افسانہ نگار کا تخلیقی سرچشمہ ہے۔ حیات و کائنات کی یہ رنگا رنگی افسانہ نگار کے حقیقی فنی اسالیب ہیں۔ زندگی کا فن افسانے کا فن ہے استعاروں اور علامتوں کا نمو و کشود، نئے سے نئے تخلیقی تلازموں کی جستجو، داستانوی توسیعی و تشکیلی عمل یا اسطور رسازی بُنت، شاعرانہ پیکروں کے جُھرمٹ پیدا کرنا، یا لسانی محاورے سے انحراف اور لفظ کی داخلی صوتی حرکات پر اصرار ـــــ اپنی جگہ درست، ہزار بار درست۔ لیکن یہ ساری تکنیکیں افسانے کے تحت میں داخلی تجرید اور معانی کی توسیع کا کام کرتی ہیں کہ اب افسانہ سننے اور سنانے کی چیز نہیں بلکہ لکھنے اور پڑھنے سے عبارت ہے۔ تاہم گوئی، اس کے خمیر میں شامل ہے۔ اب قاری کہانی پڑھتا ہے اور یوں پڑھتا ہے گویا خود کو سنا رہا ہو۔ اسے سامنے دیکھ رہا ہو۔ جن تکنیکوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ تکنیکیں تخلیق کی ضرورت کے تحت از خود نمو پاتی ہیں اور حقیقت کی واردات کو ایک نئی حقیقت، ایک نئے جمالیاتی واحدے میں منتقل کر دیتی ہیں۔ اسی لئے میرے نزدیک یہ تمام کی تمام تکنیکیں معانی کی توسیع، تجرید اور ترسیل کے وسیلے ہیں اور لفظ کی معنوی تقلیل سے گریز کے ذرایع بھی۔ ایک اچھا افسانہ تخیل و بصیرت کا کرشمہ، تجربے کی تجسیم اور انسانی باہمی حرکتوں کا ماجرا ہوتا ہے۔ اس میں اگر کوئی داخلی ضبط نہیں ہے اور اس ضبط کو قایم رکھنے یا نہ رہنے کا یہ جواز اور عذر پیش کیا جائے کہ زندگی بذاتہ ایک غیر منظم چیز ہے

تو پھر ہماری ساری تہذیبی جستجوئیں غلط، سارے فنون بے مصرف، سارے تناظرات و مظاہرات کے تحت میں جدلی سرگرمیاں بے معنی ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار نے اپنے لئے جو حدود قایم کرلی ہیں اور جن تعصبات کو اس نے جزو ایمان بنالیا ہے۔ انھیں اگر بے دردی سے تہس نہس کر دیا تو یقیناً افسانہ تجربات کا ایک بہترین سرچشمہ ثابت ہوگا۔ وہ بے لچک ہے تو محض شعبدہ بازوں کے لئے، زندگی کے امکانات و تجربات پر یقین رکھنے والوں کے لئے اس کے مضمرات لامحدود اس کی رسائیاں بے کنار ہیں۔ □

اوپندر ناتھ اشک
۵۔خسرو باغ، الہ آباد

ٹیرس پر بیٹھی شام

"اوہ، ہیلو!"

دھک! پروفیسر کانیتکر (KANETKAR) کا دل لمحہ بھر کو جیسے رکا، پھر دگنی رفتار سے دھڑک اٹھا اور خون کا دباؤ ان کے چہرے پر غیر مرئی سرخی دوڑا گیا ــــ وہ آگئی تھی!

جسے ہیلو کہہ کر پکارا گیا تھا، اس نے کیا جواب دیا اور کیا باتیں ہونے لگیں، پروفیسر کانیتکر نے وہ سب نہیں سنا۔ ان کی تمام قوتیں اس کی موجودگی کے اثر سے گویا سلب ہو گئی تھیں۔ کانونٹ زدہ لہجے میں اس کے بات کرنے کا، ان کی مترنم ہنسی کا، اس کے لہجے کی شہد جیسی مٹھاس کا احساس گویا ان کے سارے وجود پر چھا گیا تھا۔

پیڈ پر رواں ان کا قلم اچانک رک گیا تھا۔ اور کاغذ سے ذرا اوپر ان کے آدھے مڑے ہاتھ میں بیجان سا لٹکا تھا۔

لمحہ بھر کانیتکر اسی طرح آواز پر کان لگائے بیٹھے رہے، پھر انھوں نے آہستہ سے آنکھیں اٹھائیں، اس کی آواز بالکل سامنے سے آرہی تھی لیکن کھڑکی کے باہر سیمنٹ کا جنگلہ، جسے ان کا دوست ٹیرس (TERRACE) کہہ کر پکارتا تھا، خالی تھا۔ پروفیسر کانیتکر کی نگاہیں ٹیرس کے پار دادر کے ساحل کی ریت، اس پر سیر کو آنے والے لوگوں، نالے کی پلیا کے قریب جمناسٹک کے کھیل دکھانے کو تیار بے فکرے نوجوانوں، سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں یا افق پر ڈوبتے ہوئے آفتاب ــــ کہیں پر نہیں ٹکیں۔ قلم میز پر رکھ کر وہ اٹھے۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے کھڑکی کے باہر دیکھا ــــ وہ ٹیرس پر ہی بیٹھی تھی۔ کھڑکی کے سامنے نہیں۔ ذرا سی بائیں طرف ترچھے کو! کھڑکی کا پٹ ساحل سمندر سے آنے والی ہوا کے دباؤ سے تھوڑا بند ہو گیا تھا۔ پورا کھل جاتا تو اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی، ذرا سا دائیں طرف کو جھک کر وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔

پروفیسر صاحب نے چاہا، کھڑکی پوری کھول دیں۔ تبھی ایک غلط انداز سی نگاہ اس نے ان کی طرف پھینکی۔ ان کا سارا خون جیسے ان کے چہرے کی طرف امنڈ آیا۔ دل بڑے زور سے دھڑکنے لگا۔ انھیں کھڑکی کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور نگاہیں انھوں نے دائیں طرف ٹیرس سے ہٹا کر نالے کی پلیا

کے ادھر اکٹھے ہونے والے لڑکوں پر جمادیں، جنھوں نے اپنے کپڑے اتار کر ٹیریس کے پاس رکھ دیئے اور لنگوٹ لگا کر یا نیکریں پہن کر کودنے پھاندنے کو تیار تھے۔

نہ جانے شہر میں کوئی سرکس آیا تھا یا کوئی سکاوٹس ریلی ہو رہی تھی۔ لڑکے روز شام کو شاید مِل یا کارخانے بند ہونے پر یہاں ساحل سمندر پر آکر اکٹھا ہوتے اور نہایت پھوہڑ تو آمیزی سے پرامڈ (PYRAMID) بناتے، رکاوٹیں رکھ کر لمبی چھلانگیں لگاتے اور دوسرے کھیل کھیلتے۔ پروفیسر کانیتکر نوعمری میں خود اپنے کالج کے جمناسٹک ٹیم کے چیمپین تھے۔ پیرالل بارز (PARALLE BARS) یا ہوریزنٹل بارز (HORI - ZONTAL BARS) پر یوں قلابازیاں کھاتے، جیسے انھوں نے کڑی مشق سے وہ سب نہ سیکھا ہو، بلکہ پیدائش سے ہی ویسا کرتے آئے ہوں۔ رومن رِنگز (ROMAN RINGS) پر جھولتے ہوئے قلابازیاں لگا کر وہ رنگز پکڑ لیتے تھے۔ وہ ہارس ورک (HORSE WORK) میں ماہر تھے۔ لمبی چھلانگ میں ان کا ریکارڈ تھا۔ جب وہ اس کمرے میں آئے تھے تو چند دنوں تک روز شام کو کچھ لمحے دروازہ کھول کر وہیں کھڑے کھڑے ان نوجوانوں کا کھیل دیکھا کرتے۔

لیکن اس وقت ان کی نظر زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکی۔ ساحل سمندر پر لڑکوں کے عین اوپر تصور ہی میں انھیں اس کی شبیہہ ٹیریس پر بیٹھی دکھائی دی۔ انھوں نے آنکھیں وہاں سے ہٹالیں، قلم اٹھا لیا اور ذہن کو سب طرف سے ہٹا کر بظاہر نہایت یکسوئی سے پہلے کی طرح لکھنے لگے۔

لیکن اتنے انہماک سے وہ کیا لکھ رہے ہیں، انھیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے کان لگاتار باہر ٹیریس پر ہونے والی باتوں کی طرف لگے رہے۔ باتوں پر نہیں، صرف اس شہدیلی آواز اور بار بار اس کے گلے میں اٹھ کر مٹ جانے والی شیریں ہنسی کی طرف! کسی نازک سے فوارے میں سے رک رک کر آنے والی باریک سی پھوہار جیسی وہ ہنسی بار بار ان کے وجود کو جیسے سرتاپا شرابور کر جاتی تھی..... جس لمحے اس نے ان کی طرف وہ غلط انداز نگاہ ڈالی تھی، پروفیسر کانیتکر نے دیکھا تھا کہ آج اس نے سکرٹ نہیں پہنی، بلکہ گہرے نیلے رنگ کی ریشمی قمیص اور سفید کیمرک کی شلوار پہن رکھی ہے اور ہمیشہ اس کے کندھوں پر لہرانے والے وہ اس کے کٹے بال بوفے ہیر سٹائل، میں اس سر پر ڈمرو جیسے سجے ہیں۔ اس کا فی اونچے اٹھے ہوئے جوڑے کی وجہ سے اس کی گوری گردن اور بھی لمبی لگتی تھی پروفیسر کانیتکر کو لمحہ بھر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ مصر کی کوئی شہزادی پرانے زمانے کی تصویروں سے نکل کر ٹیریس پر آبیٹھی ہے..... انھوں نے دائیں ہاتھ سے برابر قلم چلاتے ہوئے بائیں ہاتھ سے کھڑکی کا پٹ پورا کھول دیا اور میز پر سے شیشے کا پیپر ویٹ اٹھا کر کواڑ اور چوکھٹے کے درمیان رکھ دیا..... ایسا کرتے ہوئے انھوں نے آنکھ نہیں اٹھائی اور پورے

انہماک سے لکھتے رہے۔

وہ برابر قلم چلاتے رہے۔ لیکن انھیں یہ احساس بنا رہا کہ وہ سامنے باہر ٹیرس پر بیٹھی ہے۔ جیسے کوئی آنکھ بھر کر بجلی کے بلب کو دیکھے اور پھر آنکھیں بند کرنے پر بھی اس کا خاکہ اسے دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح نگاہیں اٹھائے بغیر بھی اس کی شبیہہ برابر انھیں دکھائی دے رہی تھی۔

سر کو زور سے جھٹکا دے کر انھوں نے لکھی ہوئی سطریں پڑھیں، کاٹ دیں اور پھر دوبارہ انہماک سے لکھنے لگے۔

لیکن اتنے انہماک کے باوجود وہ کیا لکھ گئے۔ انھیں کچھ نہیں معلوم ہوا ان کے کان اسی آواز اور اسی ہنسی پر لگے تھے اور اس کی موجودگی گویا ان کے سارے احساس پر چھائی تھی۔

ہار کر انھوں نے ادھر نگاہ اٹھائی۔ کھڑکی کی چوکھٹ نے اسے عین درمیان سے کاٹ دیا تھا۔ اس کے جسم کا صرف آدھا حصہ انھیں دکھائی دے رہا تھا۔ جبھی ذرا سی بائیں طرف جھک کر اس نے دہی غلط انداز نگاہ ان پر ڈالی۔ پروفیسر کا نیتکر نے اچکا کر آنکھیں جھکالیں۔ اور مصروف ہوتے ہوئے میز سے اٹھے۔

پہلے ان کے دل میں آیا کہ دروازہ کھول کر کچھ لمحہ چوکھٹ میں جا کھڑے ہوں۔ ان کے دوست نے انھیں دروازہ کھول کر بیٹھنے سے منع کیا تھا کیوں کہ سمندر سے آنے والی سیلی نمکین ہوا کا زور بائیں دیوار پر پڑتا تھا جس سے دیوار کے اس حصے کا ڈسٹمپر اندر پڑ رہا تھا۔ لیکن شام اس قدر حسین اور رنگین ہوتی تھی کہ کھڑکیوں سے سمندر کا پورا نظارہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے خواہ وہ دن بھر دروازہ بند رکھیں، لیکن شام کو عموماً اسے کھول دیتے تھے اور کام کرتے کرتے کچھ لمحے چوکھٹ میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ مگر اس وقت یہ احساس کہ سامنے وہ ٹیرس پر بیٹھی ہے ان کے راستے کی رکاوٹ بن گیا۔

انھیں یوں بے باکی سے اس کے سامنے جا کھڑے ہونے میں جھجک محسوس ہوئی وہ کچھ لمحہ کمرے میں ہی باہر کے دروازہ سے اندر کے دروازہ تک، چکر لگاتے رہے۔ بار بار ان کا دل دروازہ کھولنے کو ہوتا لیکن پھر دروازہ کھولنے کے بجائے وہ واپس چل پڑتے۔

آخر کار، گویا نہایت مجبور ہو کر، انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ان کے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا کر گیا۔ لیکن باہر کی طرف ذرا بھی دیکھے بغیر وہ پلٹ آئے اور آ کر کوچ میں دھنس گئے۔ ٹانگیں انھوں نے پھیلا لیں۔ اور دونوں باہیں سر کے اوپر سے لے جا کر ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنساتے اور کھینچتے ہوئے زور کی انگڑائی لی۔

لیکن وہ بیٹھے نہیں رہ سکے۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر اچھل کر اٹھے۔

اتنی عمر میں بھی ایک ہی جست میں وہ اٹھ سکتے ہیں، اس احساس سے ان کا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ ان کی یہی چستی پھرتی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے پچاس سال کی عمر گذر جانے پر بھی 'ڈی فِل' کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کا کالج یونیورسٹی میں تبدیل ہونے جا رہا تھا اور ان کے پرنسپل نے انھیں رائے دی تھی کہ اگر وہ اس دوران میں کسی طرح ڈاکٹریٹ کر لیتے ہیں تو وہ ہی اپنے شعبہ کے صدر بن جائیں گے۔ ورنہ کوئی جونیر ان کے اوپر آ بیٹھے گا..... پروفیسر کانیتکر نے کبھی برسوں پہلے 'ڈی۔ فِل' کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تھیسس کا مضمون بھی منظور کرا لیا تھا۔ لیکن ملازمت، بیوی بچوں، نصاب کے بورڈ کی ممبری اور میٹنگوں نے انھیں وہ سب بھلا دیا تھا اب انھوں نے پرانے کاغذوں سے تھیسس کا خاکہ نکالا تھا اور ایک نوجوان کی سی تندہی کے ساتھ کمر کس اسے مکمل کرنے میں جٹ گئے تھے..... کولہاپور میں ضروری کتابیں اور دوسرے مسالے کی فراہمی مشکل تھی ان کے دوست نے ان کی یہ مشکل پوری کر دی تھی۔ جب وہ پچھلی بار کولہاپور گیا تھا اور پروفیسر کانیتکر نے اس کے سامنے اپنی مشکل رکھی تھی۔ تب اس نے دادر بیچ (DADAR BEACH) کے اپنے اس پرسکون اور تنہائی بھرے کمرے کا ذکر کیا تھا، جہاں وہ اپنے فلیٹ کے شور شرابے سے دور سمندر کی ٹھنڈی ہوا کا لطف لیتا ہوا کام کیا کرتا تھا۔ اس کی فلم کمپنی دو مہینے کے لئے کشمیر کی شوٹنگ پر جا رہی تھی اور اس نے پروفیسر کانیتکر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ دو مہینے اس کے ہاں بمبئی میں قیام کریں کار اور ڈرائیور وہ ان کے لئے چھوڑ جائے گا وہ جس لائبریری میں جانا چاہیں گے ڈرائیور انھیں لے جائے گا۔ وہ کتابیں اکٹھی کر لیں اور کمرے میں چپ چاپ بیٹھ کر اپنا تھیسس مکمل کریں۔ کھانا انھیں ڈرائیور پہنچا دے گا اور چائے شام کو وہیں کمرے میں بنا دیا کرے گا۔ انھیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ وہ بغیر کسی پریشانی کے پوری یکسوئی سے کام کر سکیں گے..... اور پروفیسر کانیتکر چلے آئے تھے۔

●

پروفیسر کانیتکر پردے کے پیچھے گئے۔ وہاں چھوٹی الماری پر رکھے آئینے میں انھوں نے ایک نظر ڈالی صبح سے کام کرتے کرتے ان کے چہرے پر ہلکی سی تھکان کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ قلم کو اس الماری پر رکھا صابن دانی اور تولیہ اٹھا کر عقب کا دروازہ کھول، وہ باتھ روم گئے۔ واش بیسن میں منہ میں دھوتے ہوئے پروفیسر کانیتکر کی آنکھوں میں اپنے ساتھی پروفیسروں کی صورتیں گھوم گئیں۔ اور ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ان کے کتنے ہی ساتھی پچاس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے موٹے مٹنی، تھُل تھُل پِل پِل ہو گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنا چھریرا پن برقرار رکھا تھا۔ فربہ تو وہ ضرور پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہو گئے تھے لیکن اب بھی وہ موٹے نہیں چھریرے ہی لگتے تھے اس کی اصل وجہ وہ ورزش تھی جو وہ برسوں سے باقاعدہ کرتے

آرہے تھے۔ ادھر کچھ عرصے سے ان کی وہ عادت چھوٹ گئی تھی۔ ان کا جسم کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن ان کی چستی بدستور برقرار تھی، اور کام کرنے میں وہ نوجوانوں کو مات دیتے تھے۔

اچھی طرح رگڑ کر تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے وہ کمرے میں واپس آئے۔ الماری پر رکھی شیشی میں سے ذرا سی وینشنگ کریم لے کر انھوں نے منہ پر ملی اور آئینے کے سامنے بال سنوارے ـــــ گول چہرہ، گھنگھرالے کھچڑی بال، گہری احساس بھری آنکھیں، موٹے مردانہ ہونٹ ـــــ اس چہرے پر ابھی کافی کشش باقی تھی ـــــ اس کمرے میں کام کرتے ہوئے انھیں مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ اس لڑکی نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ یہ اس کی آواز کی مٹھاس تھی یا ہنسی کا شہد، جس نے پہلی بار ان کا من موہ لیا تھا۔ اس کا تجزیہ انھوں نے نہیں کیا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ ایک شام وہ بہت مگن ہو کر اپنا کام کر رہے تھے کہ ان کی کھڑکی کے نیچے دو لڑکیاں آکھڑی ہوئیں اور باتیں کرنے لگیں۔ ان میں سے ایک نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کام کرنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ دونوں لڑکیاں ٹیرس کے چکر لگاتی ہوئی بار بار کھڑکی کے پاس رک جاتی تھیں اور ہر بار ان کا دھیان بٹ جاتا تھا۔

یہ بلڈنگ، جس میں ان کے دوست نے وہ چھوٹا سا کمرہ لے رکھا تھا "سمندر ترنگ" کے نام سے مشہور تھی۔ پانچ منزلہ عمارت تھی۔ کیڈل روڈ پر اسپتال کے بالکل سامنے۔ سڑک سے داخل ہوں تو بمبئی کی ہزاروں عمارتوں ہی کی طرح دکھائی دیتی تھی ـــــ سامنے احاطے میں نہ سڑک پکی تھی نہ فرش ـــــ لیکن بلڈنگ کے اردگرد اور عقب میں بیس ایک فٹ چوڑی کشادہ جگہ تھی۔ جس میں کنکریٹ کی سلوں سے فرش بندھا تھا۔ بلڈنگ کی پچھلی طرف اس کی پوری لمبائی تک ساحل کے برابر سیمنٹ کا جنگلہ تھا جس کا اوپری حصہ چوڑا اور چمکیلا تھا۔ یہ ٹیرس یوں تو بلڈنگ کی طرف سے چار فٹ اونچی تھی لیکن سمندر کی طرف سے اس کی بلندی دس بارہ فٹ تھی۔ اس کے وسط میں ایک چھوٹا سا گیٹ تھا، جس سے ساحل پر اترا جا سکتا تھا۔ پروفیسر کانیتکر کے دوست کا کمرہ بلڈنگ کی بائیں طرف کے فلیٹ میں کونے کا کمرہ تھا جس کے دونوں طرف کھڑکیاں تھیں۔ چوں کہ کاریں وہاں نہیں آتی تھیں اس لیے شام کو بلڈنگ کے لڑکے لڑکیاں اور کبھی عورتیں وہاں ٹیرس کے ساتھ سیر کیا کرتی تھیں، کبھی اتر کر ساحل پر چلی جاتی تھیں اور کبھی ٹیرس پر آکر بیٹھ جایا کرتی تھیں.... وہ لڑکی جب گھوم کر بائیں طرف سے آتی تو پروفیسر کانیتکر کے کان کھڑے ہو جاتے، پھر جتنی دیر تک اس کی باتوں یا ہنسی کی آواز آتی وہ اور کچھ نہ کر پاتے۔ اس کی ہنسی نہایت چھوٹی نہایت تیوری، نہایت دھیمی اور نہایت پرکشش تھی۔ ایک بار جو اس ہنسی نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ اسی کے ہو رہے۔ جتنی دیر وہ ان کی کھڑکی کے قریب کھڑی باتیں کرتی۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ان کی سماعت میں سما جاتیں۔ جب وہ چل دیتی تو کچھ لمحے انھیں اپنے شعور کو اپنے راستے میں لانے میں صرف

کرنے پڑتے۔ اپنے حواس کو درست کر، بڑی کوشش سے یکسو ہو کر وہ قلم چلانے لگتے۔ کبھی بائیں طرف سے وہی شہد بھری ہنسی پھر سنائی دیتی اور ان کا قلم وہیں رک جاتا... جب وہ ان کی کھڑکی کے پاس آکر رکی تھی ان کے دل میں آیا تھا کہ باہر دروازہ کھول کر اسے ایک نظر دیکھ لیں لیکن انھیں جرأت نہیں ہوئی.....

جب باہر شام کافی گہری ہو گئی تو وہ اٹھے تھے۔ انھوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا تھا۔ ہوا کے زور سے وہ کھٹاک سے جا کر بائیں طرف دیوار سے لگنے لگے اس لئے ہاتھ سے اسے تھامے تھامے انھوں نے بڑی احتیاط سے اسے بائیں دیوار سے لگا دیا تھا۔ پھر انھوں نے اس طرف نظر دوڑائی تھی، جہاں ان کی کھڑکی کے پاس دیوار کے سہارے دونوں لڑکیاں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ نیم تاریکی میں انھوں نے صرف یہی دیکھا کہ دونوں نے سکرٹ پہن رکھی ہے۔ ایک سترہ، اٹھارہ سال کی معلوم ہوتی تھی دوسری بارہ تیرہ سال کی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہیں جان سکے۔ نہ وہ ان کے چہرے پہچان سکے اور نہ وہ ان کے بلاؤزوں یا سکرٹوں کے رنگ۔ لمحہ بھر ان کی طرف نظر ڈال کر وہ سیڑھیاں اتر گئے اور ٹیریس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ لڑکیاں ان کے باہر آتے ہی کھسک گئیں۔ پل بھر پروفیسر کانیتکر جیسے سمندر کی تاریکی کو ناپتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے لمبی سانس لی اور خراماں خراماں ٹیریس کے ساتھ گھومنے لگے۔ سامنے افق پر ابھی تک روشنی کی دو ایک دھندلی لکیریں پھیلی تھیں۔ جس کے نیچے دور سمندر میں کسی جہاز یا کشتی کی روشنی رہ رہ کر جھلملا جاتی تھی۔

ٹیریس کے ساتھ گھومتے ہوئے پروفیسر کانیتکر کبھی دکھن کی طرف دور درلی پوائنٹ تک نیم دائرے میں چمکتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتے، کبھی مڑ کر شمال میں باندرہ کے ریلوے پل کی چمکتی بتیوں پر نظر جماتے۔ لیکن ان روشنیوں سے ہٹ کر ان کی نگاہیں بار بار بائیں طرف "سمندر ترنگ" کی سبھی کھڑکیوں کا جائزہ لے لیتیں کہ نہ جانے کس کھڑکی میں وہ آواز یا وہ ہنسی سنائی دے جائے۔

وہ دیر تک ٹیریس کے ساتھ گھومتے رہے تھے۔ ایک مرتبہ بغل کے فلیٹ میں، جس کے ڈرائنگ روم کا دروازہ پیچھے کو کھلتا تھا، سکرٹ والی ایک لڑکی کو دیکھا انھیں لگا تھا کہ وہی لڑکی ہے۔ وہ کئی بار اس فلیٹ کے سامنے سے گزرے تھے، اس لڑکی سے ان کی نگاہیں بھی چار ہوئیں اگرچہ وہ خوبصورت بھی تھی، انھیں لگا کہ وہ نہیں ہے، کیوں کہ ایک بار بھی تو وہ اس طرح سے نہیں ہنسی..... مایوس ہونے کے باوجود وہ دیر تک وہیں چکر لگاتے رہے تھے۔

لیکن ان دس پندرہ دنوں میں اگرچہ انھوں نے اس سے اچھی طرح آنکھیں نہیں ملائی تھیں، مگر وہ اسے پہچان گئے تھے۔ وہ اسی فلیٹ کے سندھی کرائے دار کی لڑکی تھی، جن سے ان کے دوست نے وہ کمرہ لے رکھا تھا۔ اس فلیٹ کا سمندر کی طرف کھلنے والا کمرہ تو ان کے دوست ہی کے پاس تھا۔ وہ سندھی

ادھر کے حصے میں رہتے تھے جس کا دروازہ عمارت کے سامنے کی طرف تھا۔ وہ لڑکی شاید گھوم کر عقب میں آیا کرتی۔ تو کبھی ایک دو مرتبہ باتھ روم جاتے یا وہاں سے آتے ہوئے انھوں نے اسے اپنی ممی یا پاپا سے باتیں کرتے سنا تھا۔ وہ ہنسی بھی انھیں سنائی دی تھی اور ایک دو مرتبہ تو انھوں نے اسے، انھیں دنوں میٹر و میں لگی فلم کے گانے کے بول گنگناتے سنا تھا۔ وہ باتھ روم سے ہاتھ منہ دھو کر آئے تھے، دروازہ ذرا کھلا تھا کہ اس کی تان سنائی دی ــــ "آواز میں نہ دوں گی!" ــــ لوچ اور سوز بھری کھنکھناتی تان! کمبخت نے "دوں گا" کی جگہ "دوں گی" کر دیا تھا۔ گیلری میں یا ادھر کے کمرے میں اندر باہر جاتے ہوئے وہ ایک ہی لائن بار بار گائے جا رہی تھی ــــ "آواز میں نہ دوں گی" ــــ "آواز میں نہ دوں گی" ــــ پروفیسر کا نیتکر کو لگا جیسے وہ انھیں سنا کر وہ مصرع دہرا رہی تھی کبھی کبھی وہ عین کھڑکی کے سامنے ٹیرس سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور کسی نہ کسی سے باتیں کرتی ہوئی اپنی غلط انداز نگاہوں سے انھیں پریشان کیا کرتی۔

اور آج وہ شلوار قمیص پہن کر، ایسی لمبی گوری گردن تیکھے نکیلے چہرے اور اس ڈمرو ایسے جوڑے کے ساتھ مصر کی شہزادی بنی ان کے سامنے ٹیرس پر آکر بیٹھ گئی تھی.....

●

آئینے میں اپنے چہرے کی کشش کا جائزہ لیتے ہوئے اس سُریلی تان کا خیال آجانے سے انھوں نے دل ہی دل میں کہا "ہانک میچ دینار لاڑ کے" ــــ "ہانک میچ دینار" ــــ یعنی آواز میں ہی دوں گا میری جان، آواز میں ہی دوں گا۔

اپنی اس شوخی سے دل ہی دل میں ندامت محسوس کرنے کے باوجود، وہی مصرع امنگ سے گنگناتے ہوئے انھوں نے کنگھی رکھ کر بالوں پر ہاتھ پھیرا..... ان کے سامنے اپنی جوانی کے دن گھوم گئے۔ ان کی شخصیت میں کیسی کشش تھی۔ کیسے نوجوان لڑکیاں ان کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں..... ایک کے بعد ایک متعدد چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ پھر ایک چہرہ ان کے ذہن میں نقش ہو گیا ــــ چہرہ جو ان کے گھر میں ان کی بیوی کی شکل میں آکر بس گیا تھا..... جس نے ان کے دل پر اپنی شخصیت کی ایسی چھاپ چھوڑی کہ دوسرے تمام چہروں کے نقش بھی وہاں باقی نہ رہے..... لیکن دوسرے لمحہ وہ چہرہ بھی ماند پڑ گیا اور ٹیرس پر بیٹھی اسی شہزادی نے اس کی جگہ لے لی۔

اس لڑکی نے، اس کی شہد بھری آواز نے، اس کی ہنسی نے انھیں ایک بار پھر نوجوان بنا دیا تھا۔ اس کی اس غلط انداز نگاہ نے نہ جانے ان کی رگوں کو کیسی چستی و توانائی عطا کر دی تھی کہ گذشتہ کئی دنوں سے وہ اپنے آپ کو یکسر بدلا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھیں یہ لگا کہ ان کے بال اب اتنے گھنے نہیں رہے، لیکن ان کے سر پر گنجے پن کو اپنا قبضہ جمانے میں ابھی برسوں درکار تھے۔ اطمینان سے مسکرا کر اپنی ٹائی کی ڈھیلی گرہ انھوں نے کسی قلم اٹھایا اور پھر کمرے میں گھومنے لگے۔

●

"ہانک میچ دینار لاڑکے، مانک میچ دینار!"

قلم ان کے دائیں ہاتھ میں تھا اس ہاتھ کی کلائی کو انھوں نے بائیں ہاتھ سے باندھ رکھا تھا اور دونوں ہاتھ ان کی کمر پر تھے کچھ جھکے ہوئے عجیب سی مسرت میں وہ کمرے میں گھومے اور دل ہی دل میں گنگنائے جا رہے تھے" ہانک میچ دینار لاڑکے، مانک میچ دینار.....!"

یہ جذبہ ان کے رن میں کچھ عجیب سی امنگ بھر رہا تھا کہ پچاسواں سال پورا کرنے پر بھی وہ ایک بالکل انجان خوبصورت لڑکی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں.... کالج میں ان کی طالبات کبھی ان سے قریب آجاتی تھیں تو وہ بانہوں میں لے کر پیار بھی کر لیتے تھے، چوں کہ ادھر ان کی عمر بڑھ گئی تھی، وہ انھیں بڑے بھائی یا باپ جیسا سمجھتی تھیں، کچھ اور قریب آجاتی تھیں، تو ان کی اپنی لڑکی کی طرح انھیں "آواجی" "بھاؤجی" کہہ کر پکارنے لگتی تھیں اور وہ اپنے بڑھاپے سے تقریباً سمجھوتا کر چکے تھے۔ کبھی جب ان کی سانس پھولنے لگتی، کمر میں، انگلیوں کے پوروں میں گھٹنوں کے جوڑوں میں درد ہونے لگتا تو وہ ہنس کر اپنے بڑھاپے کو کوسا بھی کرتے.... لیکن اس لڑکی نے، اس کی ان نگاہوں نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ ان کی کشش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ آئینے میں انھوں نے دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک بھی جھری نہ تھی گلے پر گوشت ضرور کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور دو ایک جھریاں بن رہی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ٹائی کی گرہ کچھ زیادہ کس جانے کی وجہ سے وہ جھریاں بن گئی ہیں۔ پھر انھیں اپنے چہرے پر کچھ ایسی چمک دکھائی دی، جو کو لہاپور کے گھٹے گھٹے بند ماحول میں کبھی دکھائی نہ دی تھی.....

اسی طرح دونوں ہاتھ کمر پر رکھے وہ کمرے میں چکر لگاتے رہے، وہ دروازے تک جاتے، لیکن بغیر نظر اٹھائے جیسے گہری فکر میں غلطان وہاں سے واپس پلٹ آتے۔ ہر بار ان کے دل میں آتا کہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ لیکن وہ نگاہ نہ اٹھاتے۔ جب وہ تین چار چکر اسی طرح لگا چکے تو انھیں یقین ہو گیا کہ اب دروازے میں جا کر کچھ لمحہ کھڑے ہونا نظری معلوم ہوگا تو وہ دروازے میں جا کر مڑے نہیں اور چوکھٹ کے سہارے کھڑے ہو گئے اور فضا میں دیکھتے ہوئے قلم کے پچھلے سرے سے کنپٹی کو یوں سہلانے لگے جیسے کسی فکر میں محو ہوں۔

وہ اسی طرح پاؤں پر پاؤں رکھے انھیں ہلاتی ہوئی ٹیرس پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ بات کرنے والا شاید

نیچے ساحل پر آرکگیا تھا۔ پروفیسر صاحب کی نظریں فضا میں کھٹکتی ہوئی اس کے پیروں پر جا ٹکیں۔ اس نے نائلن کی سفید چپل پہن رکھی تھی اس کی سفید جالی تو انھیں اتنی دور سے دکھائی نہ دے رہی تھی۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ چپل کا تلا ان گورے نازک پیروں سے جڑا ہوا ہے۔

کچھ لمحہ وہ اپنی نظر وہیں جمائے رہے تاکہ لگے وہ اس کے پیروں کو نہیں دیکھ رہے، اپنی سوچ میں غلطاں یوں ہی فضا میں نظر جمائے ہیں پھر کچھ جھجک کر ان کی نظر کیمرک کی سفید دودھیا شلوار اور گہری نیلی ریشمی قمیص پر سرکتی ہوئی اس کے چہرے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہاں رکی نہیں۔ وہ انھیں کی طرف گھور رہی تھی۔ ان کی نظریں اس کے ڈمرو جیسے جوڑے سے پھسلتی ہوئی مغرب کے افق پر جا ٹکیں۔

غروب ہوتے ہوئے آفتاب نے اپنی کرنیں سمیٹ لی تھیں افق پر جہاں سمندر اور آسمان ہم آغوش ہو رہے تھے، ہلکی سی دھند چھائی تھی، اور سورج کی بڑی سی سندوری تھالی اس کے اوپر معلق دکھائی دیتی تھی۔ لیکن وہ لمحہ بہ لمحہ غیر مرئی طور پر نیچے اتر رہی تھی۔ پروفیسر کانیٹکر کے دیکھتے دیکھتے وہ سنہری تھالی اس دھند میں اتری اور پچک کر بڑی سی نارنگی جیسی ہو گئی۔ اس نارنگی کا نچلا حصہ سمندر کی سطح کو چھوڑ رہا تھا۔ وہیں سے اس کا عکس ایک سنہرے مینار سا جوار پر آئے سمندر کی لہروں پر لرزتا ہوا کنارے تک آگیا تھا۔ پروفیسر کانیٹکر کی نگاہ ایک بار افق سے کنارے تک اور کنارے سے افق تک اسی کانپتے سنہرے مینار پر پھسلتی آئی اور لوٹ گئی۔ سورج کے ڈوبنے کے ساتھ ساتھ اس مینار کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔ اور لہروں کی سیاہی بڑھ رہی تھی....دور افق پر پہلے ایک کشتی کے بادبان دکھائی دیئے، پھر دوسری کے پھر تیسری کے..... ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ بادبان پروفیسر کانیٹکر کو یادوں کے آسمان میں چمک اٹھنے والے مسرت آگیں خاکوں سے لگے..... دور جہاں باندرہ کی پہاڑی سمندر میں کافی آگے بڑھ آئی تھی، سمندر کی تہہ پایاب تھی۔ جوار کے پہلے ریلوں میں لگاتار وہاں جھاگ کی لکیریں بن مٹ رہی تھیں اور یہ جھاگ سمندر کی سطح پر کئی جگہ بگلوں کی قطاروں سی بڑھتی کنارے پر آکر سفید سفید لکیر بناتی ہوئی مٹ جاتی تھی..... جوار ابھی ابھی شروع ہو رہا تھا۔ ہر لہر کے ریلے کے ساتھ ساحل کا کچھ اور زیادہ حصہ بھیگ جاتا، پروفیسر کانیٹکر کچھ لمحے تک جوار کو بڑھتے دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے کنکھیوں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

اس کا دھیان ان کی طرف نہیں تھا۔ ادھر کو پیٹھ کئے وہ کنارے پر نگاہیں جمائے تھی۔ پہلے انھیں محسوس ہوا کہ شاید وہ شام کے وقت ساحل پر اکٹھا ہونے والوں میں سے کسی شناسا کو ڈھونڈ رہی ہے۔ مگر یہاں ساحل پر اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ دو فرلانگ آگے کیڈل کورٹ کے ساحل پر خوب رونق تھی۔ لیکن "سمندر ترنگ" کے سامنے ساحل پر بہت کم لوگ تھے، جو تھے وہ بھی آجا رہے تھے۔ بھیل پوڑی والی

ایک ہتھ گاڑی کھڑی تھی، جہاں چار چھ لوگ بھیل پوڑی کھا رہے تھے۔ پروفیسر صاحب کو ساحل پر کوئی بھی ایسا چہرہ دکھائی نہیں دیا جو اس کی توجہ کا مرکز ہو سکے۔ آہستہ آہستہ وہ کمرے کی سیڑھی سے اترے اور اس لڑکی سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے ٹیریس پر جا کھڑے ہوئے۔ ان کے قدموں کی آواز کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ اسی طرح اپنے خیال میں محو بیٹھی رہی۔ تب انھوں نے اس کی نگاہوں کا پیچھا کیا۔ انھیں پتہ چل گیا۔ وہ نہایت انہماک سے منز در نوجوانوں کا کھیل دیکھ رہی تھی۔

لمحہ بھر وہ بھی ان لڑکوں کا کھیل دیکھنے لگے۔ ان لوگوں نے ایک نیا کھیل شروع کیا تھا۔ دو لڑکے نم ساحل سے کچھ ہی ادھر ریت پر چت لیٹ گئے۔ ایک جو لمبے قد کا تھا، ٹیریس کے پاس آکر وہاں سے بھاگتا ہوا لیٹے ہوئے لڑکے کے پاس آکر اور ایسے اچک کر کہ اس کے ہاتھ بمشکل تمام زمین کو چھو پائے، اس نے قلابازی لگائی اور ان لیٹے ہوئے لڑکوں کے پار دھم سے گیلی ریت پر جا گرا۔

'غلط!' پروفیسر صاحب نے دل ہی دل میں کہا 'اسے قلابازی لگا کر یکدم سیدھے کھڑا رہنا چاہئے یوں دھم سے نہیں گرنا چاہئے'؛ اور انھیں خواہش ہوئی جا کر اسے ٹھیک سے قلابازی لگانا سکھائیں....
دوسری بار اس نوجوان نے تین لڑکوں کو لیٹنے کو کہا، تیسری بار چار کو.....

پروفیسر صاحب ذرا سا کھانسے لیکن ان کے وجود سے بالکل بے خبر وہ لڑکی نہایت غور سے ان لڑکوں کا کھیل دیکھ رہی تھی..... تب جانے انھیں کیا ہوا! وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے اور کچھ آگے جا کر انھوں نے بائیں ہاتھ کو ذرا سا ٹیریس پر رکھا، کسی نوجوان جمناسٹ کی طرح اس کے اوپر سے صاف کود گئے اور بارہ فٹ نیچے ریت پر سیدھے پاؤں کے بل جا کھڑے ہو گئے۔ اتنی بلندی سے کودنے پر ان کے گھٹنے ذرا جھکے، انھیں لگا کہ لڑکھڑا کر گر جائیں گے، لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ سنبھل کر سیدھے کھڑے ہو گئے اس طرح دوڑنے اور اتنی بلندی سے کودنے کی وجہ سے ان کی سانس پھول گئی تھی۔ خون کا دوران ان کے سر کی طرف بڑھا اور لمحہ بھر انھیں لگا کہ وہ چکر کھا کر گر جائیں گے۔ لیکن اپنی پوری قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے وہ کچھ لمحہ اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔ ان کی سانس درست ہوئی تو ان کے جی میں آیا اوپر نگاہیں دوڑائیں۔ مگر اپنی خواہش کو انھوں نے قابو میں رکھا اور آہستہ آہستہ ان لڑکوں کی جانب بڑھ چلے۔

وہ لڑکے اپنا کھیل چھوڑ کر انھیں کی طرف دیکھ رہے تھے جس صفائی سے پروفیسر کا ئیکر کود گئے تھے، ظاہر ہے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ اسی لئے جب وہاں پہنچ کر پروفیسر صاحب نے کہا کہ وہ انھیں ٹھیک سے قلابازی لگانا سکھاتے ہیں تو وہ تیار ہو گئے۔

قلم ابھی تک پروفیسر صاحب کے ہاتھ ہی میں تھا اسے انھوں نے بڑے لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا،

ان چار لڑکوں کو اسی طرح لیٹنے کو کہا، جوتے اور موزے اتارے، پتلون کی موہری کو موڑ کر کچھ چڑھا لیا اور آرام سے نیچے کو نظر جھکائے ٹیرس تک گئے۔ وہاں سے مڑ کر وہ بھاگتے ہوئے آئے اور دوسرے لمحہ قلا بازی لگا کر چاروں لڑکوں کے پار، ریت پر پیروں کے بل جا کھڑے ہوئے۔ لمحہ بھر کو انھیں محسوس ہوا کہ پیچھے گر جائیں گے مگر دوسرے پل وہ سنبھل گئے۔

وہ مزدور لڑکا قلا بازی لگاتا تھا تو دھم سے پنجوں کے بل ریت پر جا گرتا تھا لیکن پروفیسر صاحب کے گھٹنے بھی نہیں جھکے۔ وہ ایک دم سیدھے کھڑے رہے۔ ہلکا سا چکر انھیں ضرور آیا، کمر میں بھی انھیں اکڑاؤ محسوس ہوا لیکن اس عمر میں اپنی اس کامیابی پر انھیں فخر بھی کم نہیں ہوا۔ اسی لمحہ انھوں نے مڑ کر ٹیرس کی طرف دیکھا۔ انھیں لگا کہ لڑکی ایک ٹک انھیں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کی نظروں کے لمس سے ہی ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور انتہائی مسرت کی وجہ سے ان کے جسم کا لہو ان کے دماغ کی طرف دوڑ چلا۔ لگ بھگ نشے میں، وہ لیٹے ہوئے لڑکوں کے اوپر سے گھوم کر واپس آئے اور انھوں نے باقی دو لڑکوں کو بھی وہاں جا کر لیٹنے کا حکم دیا۔

دونوں لڑکے (وہ بھی جو خود قلا بازی لگا رہا تھا) وہاں اوروں کے ساتھ جا کر لیٹ گئے۔

تب پروفیسر کا نیتکر بڑے غرور سے چلتے، ریت پر ایڑیوں کا دباؤ دیتے، لگ بھگ جھومتے ہوئے ٹیرس تک آئے۔ بجلی کی سی رفتار سے مڑے اور گولی کی طرح بھاگتے آئے اور لیٹے ہوئے لڑکوں کے پاس آکر کودے..... لیکن تبھی نہ جانے کیا ہوا، قلا بازی ان سے نہیں لگی۔ وہ سیدھے لڑکوں کے پار جا کر سر کے بل گرے۔ ان کی گردن ٹیڑھی ہو گئی اور ان کے جسم کا نصف حصہ بے جان سا چت لڑکوں پر جا گرا۔

نارنگی سمندر میں یکسر ڈوب گئی تھی۔ افق میں سمندر کی سطح پر ایک ذرا سا سنہرا تل دکھائی دے رہا تھا۔

"سمندر ترنگ" کی کسی اوپری منزل سے کوئی لڑکا سمندر کے ساحل پر بھیڑ جمع ہوتی دیکھ کر بھاگتا آیا اور عقب میں آکر اس نے ٹیرس پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے پوچھا "وہاٹ ہیپنڈ؟[1]" (WHAT HAPPENED)

"دیٹ سلی اولڈ مین" لڑکی نے پروفیسر کانیتکر کے گرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہیز بروکن ہز نیک اوور دیر۔[2]" (THAT SILLY OLD MAN HAS BROKEN HIS NECK OVER THERE)

---

[1] کیا ہوا؟

[2] وہ بے وقوف بڈھا۔ اس نے وہاں اپنی گردن تڑوا لی ہے۔

لڑکا بھاگتا ہوا ساحل پر آ گیا۔ لڑکی نہایت بے نیازی سے وہیں ٹیرس پر بیٹھی ہوئی پاؤں جھلاتی رہی افق میں گہرا سندوری الاؤ جل اٹھا۔ جس کی لپٹیں آہستہ آہستہ مغربی سمت پر چھاگئیں۔

اچانک سمندر کی سطح پر لہریں روپہلی ہو گئیں اور جو کشتیاں پہلے دکھائی نہیں دیتی تھیں ان کے خاکے نظر آنے لگے۔ لڑکی نے بھیڑ سے نگاہیں ہٹا لیں اور سمندر کے بیچ ایک کشتی پر کھڑے ملاحوں کے سلہوٹ دیکھنے لگی، جو سمندر کی روپہلی لہروں پر گویا منقوش دکھائی دے رہے تھے۔ ٹیرس پر بیٹھی ہوئی وہ لڑکی بھی شام کے وسیع کینوس پر انھیں کی طرح تصویری نقش دکھائی دے رہی تھی ــــــ اسی شام ہی کی طرح بے نیاز اور بے پروا۔ ☐

دیویندر ستیارتھی

رفوگر

(۱)

آسمان جیسے پھٹے پشمینے کا شامیانہ۔

نیل گگن پہ دودھیا میگھ، جیسے مدھوبن میں مست ہاتھی۔ ہندوستان کی قسم۔ کارواں سرائے سلامت

یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل!

ترہی والا سفید گھوڑے پہ کالا شہسوار۔

ترہی بجی — پہلے دیوگیری بلاؤں پھر مالکوس۔

دوکان کی اونچی سیڑھیاں چڑھ کے آئی آئینہ خانم اور رفوگر سے بولی:

"پہلے میری شال رفو کیجئے۔ پیشگی مزدوری۔"

پانچ کا نوٹ دے کر وہ چلی گئی۔

جس کی چاہو سوگند لے لو۔ کوئی رائے قائم کرنی مشکل۔

دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔

برگد کی آنکھ میں ابابیل کا گھونسلا، جہاں سورج کی پہلی کرن داخل ہوتی۔

برگد تلے لنگڑی بھکارن بڑبڑاتی:

"کچھ نہ کہو لوگو: میرے علی کو کچھ نہ کہو۔"

کارواں سرائے اپنی خبر رکھتی ہے۔ محبوب کی سرگوشی ہو یا ماں کی لوری۔

جن کے قدموں کے نشان مٹ گئے، ہم ان کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔

رفوگر علی جو امام کی گنبد والی دوکان۔ اونچی سیڑھیاں، تین کھڑکیاں۔

دوستانہ جذبے سے چمکتی آنکھیں۔ جگ درشن کا میلہ۔ کون گرو کون چیلا:

ترہی والا اپنی دھن الاپتا رہا۔

وہی کارواں سرائے، وہی بیگم بازار، وہی دوڑتی نظریں۔ اور وہی گم ہوتی پرچھائیاں۔ سب کی توجہ کا مرکز

علی لجو امام۔

یہ علی جو تو ہوا، یہ علی لجو امام کیا ہوا؟

پیر باورچی بھشتی خر:

ہر فن مولا۔

کوئی اسے علی کہتا، کوئی امام۔ کوئی استاد۔

اس کے ہاتھ دعا کے لئے اوپر اٹھ گئے۔

یا پیر دستگیر، روشن ضمیرا

سامنے دیوار پر کالا ریشم، سنہرے حروف، فاختئی چوکھٹے میں جوڑا شاعر کا کلام

رسم الخط کو سلام:

ڈھوتے ڈھوتے پربت غم کا، پاؤں میں پڑ گئے چھالے
بین کرے دیوانی بچھڑا، رو دیئے ماتم والے
انھوں نی کا چاک گریباں، کون رفو کر پائے
بول سپیرے! تم نے اب کے، کتنے پھنئیر پالے

بغل والی دیوار پر لال صوفی کے ساتھ رفوگر کی تصویر۔ دونوں کی ہنسی ہم آغوش۔ بیس برسوں پہلے کی یادگار۔

لال صوفی ہوتا تو یہیں سے شروع کرتا اپنا سفرنامہ:

میخانوں کا عام رویہ، دھینگا مشتی تا تا تھیا:

سدھی کا چمتکار

من کے آر پار

مزار گل شہید پر قوالی کی رات۔

آتے جاتے لوگ۔ کارواں سرائے خوش: محفل میں چہل پہل:

کہانی کا کیا کمال: سپنا نہیں آگیا بیتال۔

رفوگر کی ننھی منی نواسی جگنی اپنی گڑیا سے کھیلتے ہوئے گیت کا بول اچھالتی:

جاگ اری جنت کی گڑیا   جاگ اری جنت کی چڑیا
کھالے یہ بیج سیل مٹھائی   اوری گڑیا! اوری چڑیا

لال صوفی ہوتا تو جگنی کے ساتھ سر میں سر ملا کر گاتا۔
پنا لال کی تان یہیں ٹوٹتی کہ سب کہتے کاشی گئے تو ہنڈیا کس نے چاٹی!
لال صوفی کو اولاد احمد اور وارث معصوم کا سلام۔ اس کا ایک اور نام گل شہید۔
خلیل اور رحمان نے یہ کہہ کر دم لیا کہ لال صوفی تو جوانی میں بڑھاپے کا مزہ لیتا رہا۔
"اللہ میگھ دے رسے اللہ میگھ دے!" گنگناتے ہوئے اولاد احمد رفوگر کی دوکان میں آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔
چنچل سنگھ اور پنا لال کا وہی مذاق کہ آرہی ہے چائے دار جلنگ سے:
آچاریہ مہادیو" دس آئے دس گئے!" کہتے ہوئے کتاب محل کی طرف چل دیئے۔
گل آئینہ نمائم کی موڑ پر بوڑھا برگد، رفوگر کا پڑوسی۔ امیر خسرو کی کہہ مکرنی۔
استاد سے پوچھا" آپ کی عمر؟"
بولے" برگد سے پوچھ لو۔"
برگد کی داڑھی ہنسنے لگی۔ جیسے ہوا کہہ رہی ہو کہ بوڑھا برگد سب جانتا ہے۔
جگنی سے پوچھا" تمھاری عمر؟"
"میری گڑیا سے پوچھ لو۔" وہ ہنس پڑی۔
آگے چلتے ہیں، پیچھے کی خبر نہیں... کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسہ میرے آگے...
جو سب سے پیچھے رہنا چاہتا ہے، اسی کو سب سے آگے بڑھاتی ہے کارواں سرائے۔ ایک ہی داؤ میں پاسہ پلٹ سکتا ہو۔
وہ خود ستائی کبھی نہ کرتا۔ گاہک سے یہی کہتا" شاید میرا کام آپ کو پسند نہ آسکے!"
اگر کسی کو اس کا کام پسند نہ آتا تو وہ جھگڑے میں پڑنے کی بجائے صاف صاف کہہ دیتا" آپ کچھ بھی نہ دیجئے اور رفو کی ہوئی اپنی اچکن لیتے جائیے۔"
پنا لال جگنی کو چڑیا کہہ کر چھیڑتا تو وہ کہتی:
"وہ چڑیا جاپان گئی!"
رفوگر کے ابا دست گیر کی موت پر چنچل سنگھ افسوس کرتے ہوئے کہتا:
"آگے مرنا پیچھے مرنا، پھر مرنے سے کیا ڈرنا!"
کسی کے ہاتھ میں کئی تہوں میں لپٹا ہوا کاغذ۔

کسی کی بات چاکلیٹ اور بسکٹ کے بیچ۔
کسی کی نظر ایک کونے میں پڑی جگنی کی لٹکنے والی گڑیا پر۔
پتھر کی دیوار پر رنگ برنگے پوسٹر:
"سچ کو سولی.."
"آنکھ کا پانی مر گیا.."
"ڈھائی دن کی بادشاہی.."
"پاؤں میں سنیچر.."
"سفر نامہ ابنِ بطوطہ.."
"چوڑیاں پہن لو.."
"سفید گھوڑے پر کالا شہسوار.."
امرت گیسٹ ہاؤس کے آگے مغل اعظم ہوٹل۔ اور بیگم پل سے آگے ترکمان دروازہ۔
بھول بھلیاں اور بارہ دری کے بیچ کتاب محل۔
بک لینڈ پریس کی بغل میں لبرٹی کینٹین۔
کہیں اوپر کورٹ، کہیں نیچا نگر۔
کہیں اَشاڈی لکس ہوٹل، کہیں مٹیا محل۔
کارواں سرائے کا نام بدل کر پانڈولپی رکھ دیا۔
یہ اور بات ہے کہ لوگوں کی زبان سے کارواں سرائے نہیں اترتی۔
واہ ری کارواں سرائے:
ندیا میں مچھلی جال
بھکارن پھٹے حال
نام بن پھول بائی۔
اس کی ہتھیلی پر پانچ پیسے کا سکہ رکھنا نہ بھولنا علی لوا امام۔ اور ہتھیلی میں گدگدی ہونے لگتی۔
کل کی نرتکی آج کی بھکارن۔ سونے چاندی کے سکوں کی کھنک اس کے پاؤں چومتی تھی۔
پانچ پیسے کا سکہ لیتے وقت آج اس کی آنکھیں پاؤں کی طرف جھک جاتیں۔
کون سی داستان سنو گے؟ کچھ سنائیں گے، ذرا اور قریب آجاؤ۔

دو نینوں کی ایک کہانی
ماں کی لوری ایک نشانی
جو گزروگے ادھر سے میرا اجڑا گاؤں دیکھوگے
شکستہ ایک مسجد ہے، پرانا ایک مندر ہے
"عمر بھر کون محوِ رقص رہا؟" رفوگر نے رفو کرتے ہوئے پوچھا۔
نئے کی سوغات۔ قوالی کی رات۔ صحیح گئے، سلامت آئے۔
شِلالیکھ کے روپ میں کس یگ کی رچنا آگے آئی؟
ننھی منّی جگنی اور اس کی بڑی بہن نسیم۔
"تو نسیم کی بہن ہے جگنی؟" پنالال نے پوچھا۔
"نہیں نسیم میری بہن ہے۔" وہ ہنس پڑی۔
کہاں تک چپ رہیں، جب سر سے اوپر ہو گیا پانی!
آچاریہ تھادیو یہ کہتے ہوئے محل میں آئے کہ سو سنار کی، ایک لوہار کی:
"سونے سے مہنگی گھڑائی!" وارث معصوم نے تھاپ لگائی۔
"رام دہائی! رام دہائی!" سب کی ملی جلی آواز۔
"وہ اپنا دامن چھڑا کر چلی گئی۔ کام روپ کے پاس جا کر رکیں گے اس کے قدم۔" اولاد احمد نے کہا۔ اشارہ من پھول بائی کی طرف۔
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو — ہرن کے سینگ پر عاشقوں کی برات۔
کچھ اور پوچھئے، یہ حقیقت نہ پوچھئے!
پھولوں جیسے بازو، تھکن سے چور!
اپنی گڑیا کا بیاہ رچائے جگنی گاتی رہی:

دھوئیں دھوئیں! تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

من پھول کو دیکھ کر رفوگر بادشاہ بن جاتا۔ گویا اس کے ہاتھوں میں اشرفیاں کھنکنے لگتیں۔

تیس دن، چالیس میلے
میلے میں سب لوگ اکیلے
ہم کہاں سب سے الگ؟

آج پردئیا چلی کچھوا کے بعد!
مرنے والے کی نہیں جینے والے کی موت ہے!
اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی!
"میں تو بن پھول کو جتنا لیکھا سے کم نہیں مانتا۔" پنا لال کا اعلان۔
وہ سوچتا ایک دن بن پھول سڑک پر چلتے چلتے ڈھیر ہو جائے گی۔ اور اس کی ارتھی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بھیڑ کندھے بدلتی رہے گی۔
کارواں سرائے کا یہی احساس کہ علی جو امام جس کا بھی کام کرتا ہے، بڑی ایمانداری سے اور دن رات ایک کرکے۔
وہ تو گاہک کو اَن داتا مانتا تھا۔
اس کی نظر پرندوں کے اسپتال پہ، جس کا سنگِ بنیاد لال صوفی نے رکھا تھا۔
چنچل سنگھ بات کو گھیر گھار کر لاہور تک لے آیا:
"لاہور شہر،
گرہانی کا شبد ——— جانے کون سا اشارہ۔
"یہیں رہنا ہے، جب تک سوئی دھاگے کا ساتھ ہے۔" رفوگر کا اپنا انداز۔
"تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا!" اولاد احمد نے اپنی کتاب کا حوالہ دیا۔
"سو سال جئیں، سو سال دیکھیں!" آچاریہ مہادیو کی تان یہیں ٹوٹتی کہ مندر میں دیوتا جاگے۔
چنچل سنگھ یہ کہہ کر دم لیتا کہ وہ پانی ملتان رہ گیا!
اولاد احمد کے زورِ قلم کا نتیجہ "ادھورا آدمی، آدھی کتاب۔"
پنا لال کا قد ——— سوا تین فٹ مگر اس کا یہی دعویٰ:
"میں لنکا سے آیا!"
جیسے وہ اپنے آپ کو باون گزا مانتا ہو۔
گلی آئینہ خانم کی شان ——— نوگزے کی زیارت، سب پہ مہربان۔
گڑیا سے باتیں کرتے کرتے جگنی بول اٹھی:
"اللہ اللہ لوریاں، دودھ بھری کٹوریاں!"
راگ راگنی ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔

"پاؤں تلے پرکھوں کی ہڈیاں۔" آچاریا مہادیو گیان بگھارتے۔
سرکٹے دھڑ کو دفنا کر مزار گل شہید کا نام دیا گیا۔
لال صوفی کا ایک اور نام ــــ گل شہید۔
اولاد احمد کی کتاب کا انتساب ــــ گل شہید کے نام۔
"لوگوں کے دماغ بھی رفو ہونے چاہئیں!" رفوگر مسکرایا۔
آنکھ کی پتلی ــــ پتلی بائی!.. کار جہاں دراز ہے!
مرتی جھیل غائب ــــ اب وہاں چترلیکھا کالونی کی چہل پہل۔
گاندھی گارڈن ــــ کمپنی باغ کا نیا نام۔
کبھی آواز کا چہرہ، کبھی پہچان چہرے کی!
خوشبو سے کہو یہ کہ ہماری طرف آئے!
بھُس میں آگ لگا کے جمالو دور کھڑی!
"کہیں بھی آگ لگے، بیچاری جمالو بدنام۔
آسام سے آیا کام روپ، جسے بن پھول نے الکھ نرنجن مان لیا۔
پیروں میں گھنگھرو باندھے، وہ اس کے آگے ناچتی رہتی۔
پاگل بھکارن کی اور بات، جو سڑک پر کھڑی آنے جانے والوں کو دعائیں دیتی رہتی۔
کام روپ کو دیکھ کر آسام سامنے آجاتا۔
اوپر کوٹ ــــ سرگوشیاں ہی سرگوشیاں۔
بن پھول کے جوڑے پر گجرے کی خوشبو۔
گفتگو ــــ گل شہید کے مزار تک۔
علی جو امام یہ بتانا نہ بھولتا کہ وہ سورج اُگنے سے پہلے ہی پیدا ہوا اور اسی روز اس کوٹھری میں ابابیل کا بچہ انڈے سے باہر نکلا۔
آچاریہ مہادیو جب کبھی "کشمیری بے پیری!" کہہ کر چھیڑتے تو رفوگر کہتا:
"مہاراج! میں تو آپ کو بھی بے پیر مانتا ہوں۔"
وقت کا احساس جیسے جنگلی کبوتر کی اُڑان۔ اُڑتا ہی جائے بس اُڑتا ہی جائے!
دنگے فساد شروع ہو گئے تو کام روپ مارا جائے گا۔ اور اسے الکھ نرنجن مان کر پیروں میں

گھنگھرو باندھے اس کے آگے ناچنے والی بن پھول کی جھنکار بھی ختم ہو جائے گی۔
کبھی میوزک کانفرنس، کبھی کتابوں کی نمائش، کبھی آل انڈیا مشاعرہ۔
ہیرا لال کا بیٹا موتی لال اور موتی لال کا بیٹا پنّا لال۔ تینوں بونے۔ مگر نفرت کے خلاف جہاد، ان کا ایمان: جیسے بسم اللہ خاں کی شہنائی یا پنّا لال کا بانسری وادن۔
پٹھان کا پوت —— کبھی اولیا، کبھی بھوت۔
مغل کی اور بات۔
اب کیا شاہانہ آن بان!
تاتاری کا قصہ ختم!
لال صوفی —— تاتاری سوداگر کے خاندان کی آخری کڑی۔
"برف کے پھول سے اٹھتا ہے دھواں دیر تلک!
"رفو گر رفو کرتے کرتے گنگناتا رہا۔
اتہاس گوسوامی کا نام آتے ہی مس نوک لر اور گل ہما کا نام آئے بغیر نہ رہتا۔
گل ہما یعنی برف کا پھول۔
اتہاس گوسوامی کی "نیل کنٹھی" میں لال صوفی کو شردھانجلی دی گئی۔
بہار آئی ہے جوبن پہ ابھار آیا۔
پیچھے رہ گیا بھٹیاری کا رنگ محل۔
ناک کے سیدھ چلے جاؤ تو کتاب محل کا ریڈنگ روم۔
کبھی گرمی کا رونا کہ چیل انڈا چھوڑے!
کبھی کڑاکے کی ٹھنڈ کہ بلبلیں مر گئیں اکڑ کے تمام!

(۲)

ایک روز اچاریہ مہادیو بس پر سوار ہونے سے پہلے نیند کی چودہ گولیاں کھا گئے اور بس سے اتر کر کارواں سرائے کے بارہ ٹوٹی چوک میں نیلا گنبد کے فٹ پاتھ پر گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔
کسی نے میگو ہسپتال کو فون کر دیا۔ اسپتال کی وین آئی اور اچاریہ مہادیو کو لے گئی۔
وہاں انھیں مردہ سمجھ کر مردہ گھر میں بھیج دیا گیا۔
اگلے روز ان کا پوسٹ مارٹم ہونا تھا۔

صبح چار بجے آچاریہ مہادیو کو ہوش آیا تو اس کے ساتھ کئی مردے۔
اپنے آپ کو مردہ گھر میں پا کر ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا سکے۔
دروازہ کھلا تھا۔
وہ سرکتے سرکتے باہر اندھیرے میں جا پہنچے اور پہرے داروں سے بچتے بچاتے اسپتال کے احاطے سے
باہر۔
کئی گھنٹے تک یہی احساس رہا کہ موت دبے پاؤں ان کا پیچھا کر رہی ہے۔
یہی خدشہ لگا رہا کہ کہیں سرکار اقدام خودکشی کے الزام میں نہ دھر پکڑے۔
پرانے دوستوں میں سے، جس سے بھی ملے، وہی انھیں بھوت سمجھ کر سہم گیا۔
علی جواِمام نے اولاد احمد اور وارث معصوم کو ساتھ لے کر میگور اسپتال سے پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا
کہ بارہ ٹوٹی چوک کے فٹ پاتھ سے لائی گئی لاوارث لاش کو سرکاری خرچ پر جلا دیا گیا۔
جب آچاریہ مہادیو اچانک بک لینڈ پریس کے پروف ریڈر پنّالال کے سامنے آئے تو وہ انھیں بھوت
سمجھ کر اتنا خوفزدہ ہوا کہ تین دن تک اسپتال میں رہنا پڑا۔
"میں بیراگی بھیا انوراگی۔۔" جانے کس کس بات پر زور دیتے رہے آچاریہ مہادیو۔
چاند تاروں کے تلے، کون سا قصّہ چلے!
ہماری پہچان —— رفوگر کی دوکان۔
بھاری ڈیل ڈول، لمبی داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں پر چشمہ۔ ہاتھ میں سوئی دھاگا۔
سگریٹ جلانے کے لئے ماچس نہیں، لائٹر —— گل ہما کی سوغات۔
"لونگ لو مِس نوک لور اور گل ہما زندہ باد!"
اولاد احمد نے قہقہہ لگائی:
کبھی تو ہنسائے، کبھی یہ رلائے —— زندگی کیسی ہے پہیلی ہائے۔۔"
"ہم تو ہر آدمی کو اپنے سے آگے مانتے ہیں۔ اس کا پیار ہمیں ملے نہ ملے۔ وارث معصوم نے جیسے اندھیرے
اور روشنی کی پگڈنڈی پر اتہاس گوسوامی کو چلتے دیکھا۔ دائیں مس نوک لور، بائیں گل ہما۔
اب کیا ہوگا، کیسے خبر! لوک۔یان کے لئے جینا اور مرنا اتہاس گوسوامی کا دھرم ایمان۔
"پیار کر کے بھلانا نہ آیا ہمیں۔۔" رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔
کتاب محل بڑھیا لائبریری ہے جیسے کسی مفلس نے پرانے خزانے کا پتہ بتلایا۔

"یہ کون سی پستک تھی، جو تم پڑھ رہے تھے۔" پنالال نے چنچل سنگھ سے پوچھا۔
جتنی پرچھائیاں، اتنی سیڑھیاں ـــــ ساتھ صدیوں پرانا ہے اپنا!
"دکھیا کیوں اتنا سنسار!" نظم بن پھول کا۔
اٹ پٹا سا بول" پگلا کہیں کا!"
اپنے دھاگے، سدا آگے۔ کہیں خیر مقدم، کہیں الوداع۔
سونی ڈگر ہو یا ہو میلہ۔ تشریف لائیے حضور!
"رفوگر کے لئے ضروری ہے کہ کپڑے میں جان ہو۔" رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔
"اب تو اپنے آپ پر آئے نہ وشواس۔" چنچل سنگھ بول اٹھا۔
بال بچے دار پنالال نئی دلہن بیاہ لایا۔
دلہن نے اسے نیا خطاب دے ڈالا:
"چیونٹیوں بھرا کباب!"
گفتگو ہوتی رہی گھنٹوں۔
چنچل سنگھ کو یہی بات ناگوار گزرتی کہ کوئی اسے ہوٹل مہاراجہ سمجھ کر ہی اس کا احترام کرے۔
ہم کتنا لڑتے کے روئے جب لال صوفی کا دھڑ ملا، سر غائب۔
وارث معصوم گنگناتا رہا:

تصیدے سے نہ چلتا ہے، نہ یہ دوہے سے چلتا ہے،
حکومت کا ہے جتنا کام، سب لوہے سے چلتا ہے،
وہ کون تھا، جو مسکرا کے پاس سے گزر گیا؟
آچاریہ مہادیو نے جوگی بننے کا سپنا دیکھا۔
یوگ آشرم سے لگاؤ۔
شادی سے دور۔
اس ہپی کا ناش ہو، جس کی دوستی کے کارن انھیں مینڈرکس کی لت پڑ گئی۔ مٹی میں مل گیا یوگ کا سپنا۔
ہاتھ میں اخبار کا سنڈے ایڈیشن۔
چرنجی نے پیش کیشن کہہ دیا اظہار میں
قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

اب کس بات کا پردہ، جب نغمہ گونج اٹھا؟
"بارہ دری" نے سدھارتھ سینما میں گولڈن جوبلی منائی۔
رفوگر کو کیا چاہیئے؛ چاک گریباں یا پھٹا ہوا دامن۔
بلبلیں مرتی ہیں اپنی بات پر!
لال صوفی کے مزار پر پھول چڑھا کر چنچل سنگھ نے دعا مانگی۔
دولت خاں کی دولت کا کرشمہ کہئے یا جادو، جو سر چڑھ کے بولا۔
وہ تین بار لوک سبھا کا ممبر چنا گیا۔
یہ تہذیب کس نے سکھائی ہمیں؟
کون سے رسم الخط میں لکھتا رہا وارث معصوم؟
کالج کی کتاب پر بگنی کا اتنا ہی اعتماد، جتنا کہ گڑیا کے کھیل پر۔
دھک دھک دھک دل کی دھڑکن
ڈم ڈم ڈم ڈم ڈمرو بلجے!
واہ رے اگیا بیتال!
سامنے اس موڑ پر پرندوں کا اسپتال۔
محرابوں سے چھن کر آتی دھوپ۔
سو کے قریب پرندے ہر ہفتے علاج کے لئے آتے۔ آشیاں سے دور، بڑھیا علاج۔

(۳)

کارواں سرائے گل ہما کی طرح اپنی ہی باہنوں میں سمٹ جاتی اور کبھی نفرت کی آندھی پر جھنجھلائی سی لگتی۔
پنالال استاد کے لئے چلم بھر لاتا۔
سوالوں کی راتیں، جوابوں کے دن۔
جب آچاریہ مہادیو اخبار پڑھ کر سناتے تو پنالال اور ساولا داحمد انھیں مذاق کا نشانہ بنانا نہ بھولتے۔ ٹیگور اسپتال میں ایک بار انھیں لاوارث لاش مان لیا تھا۔
دنگے فساد کی خبریں سنتے سنتے کبھی رفوگر کی سوئی سے دھاگا نکل جاتا، کبھی سوئی ہاتھ میں چبھ جاتی اور خون کی بوند چھلک جاتی۔
بادلو! او بادلو! او بادلو

مرگیا طوطا ہمارا مرگیا!
علی جو امام کو پسند کرنے والوں کے ڈھیر سارے نام۔
"دیکھ مجھے جھوم گیا ندیا کا درپن!" بن پھول کا نغمہ۔
جانے کون کون سی یاد محفل کا دامن تھامتی رہی۔
چائے آئی اولاد احمد نے تھاپ لگائی:

چائے آئی چائے آئی
دگنے بھاؤ کی چائے آئی

(۴)

آچاریہ مہادیو نے لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور کش لے کر گنگناتے رہے:
"دوری نہ رہے کوئی، آج اتنے قریب آجاؤ!"
"چاندنی جب مل گئی، ہم چاندنی سو لئے..." اولاد احمد کی تھاپ۔
ہم نے تو ہر طرح کے پھول ہار میں پرو لئے..۔ وارث معصوم کی تان۔
قصہ پنا لال کا۔
رفو کرتے کرتے علی جو امام کو جانے کیا خیال آیا کہ اٹھ کر چلے گئے۔
جانے سے پہلے جیب سے نکال کر پچاس کا نوٹ چوکی پر رکھ دیا۔ شیشے کے پیپر ویٹ کے نیچے۔
اتنے میں پنا لال آیا اور چپکے سے نوٹ اٹھا کر نو دو گیارہ۔
اولاد احمد نے اسے نوٹ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔
رفوگر واپس آیا تو اولاد احمد نے پنا لال کی شکایت کی۔
"وہ نوٹ تو اسی کے لئے تھا۔" رفوگر مسکرایا۔
رحمان یہ خبر لایا کہ دولت خان نے کام روپ اور بن پھول کے لئے دونوں وقت کھانے کا انتظام کر دیا سماوا تورا ان میں۔
ووٹ حاصل کرنے کا نیا ہتھکنڈا۔" وارث معصوم ہنس پڑا۔
"آن قصے کو پھپھوندی لگ گئی!....." اولاد احمد گنگناتے رہے۔

(۵)

قاتل بڑا بے رحم تھا، جو لال صوفی کا سر کاٹ کرلے گیا اور دھڑ جھاڑیوں میں چھپا گیا۔

سوال پوچھو، جواب دیں گے۔
"قتل ناحق صوفی معصوم کا!" اولاد احمد کی تھاپ۔
ذرا سی بھول یہ رنگ لائی۔
اب کہاں وہ کتھا گھاٹ!
پرندوں کا اسپتال ——— کارواں سرائے کی شان۔
اسپتال کی نئی عمارت پر دولت خاں نے دولت نچھاور کی۔
سدھارتھ سنیما کا مالک ——— دولت خاں۔ بک لینڈ پریس کا بھی وہی پروپرائٹر۔
سنیما ——— بیوی کے نام
پریس ——— چھوٹے بھائی کے نام
اصل بنیاد تو عقیدت ہے.. یہی ایمان کی حقیقت ہے۔
سدھارتھ سنیما میں نئی فلم "لوگ کہتے ہیں۔"
مر گئے، کھو گئے، جاتے رہے..
اللہ اللہ لوریاں ——— دودھ بھری کٹوریاں..
رشوت کا ایک نام ——— چاندی کی لگام۔
کارواں سرائے پر علی جرا امام کی چھاپ۔ اس کی دوکان کارواں سرائے کی پہچان

(۶)

بگلی بھکارن سوکھے پیڑ کے تنے پر پانی ڈالتی رہی۔
پیڑ پر نئے پتے آگئے۔
خواب میں ہم اپنے ہی جنازے کے ساتھ چلتے رہے۔
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!
پنالال کے دماغ پر سوار ——— بن پھول۔
وہ مدھومتی کے کنارے موجود رہتا، جب بن پھول مدھومتی سے نہا کر نکلتی۔

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

"میں نے پیروں میں گھنگھرو باندھے، جتنے کہو اتنے گھنگھرو بولیں" ناچنا شروع کرنے سے پہلے بن

پھول کا اپنے الکھ نرنجن سے یہی نویدن۔
دولت خاں، جو تھی بار لوک سبھا کا انتخاب جیت گیا۔
علی جو امام کی اور بات۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کا احترام
ہو مبارک او علی جو او امام

سکھ دکھ رہتے جس میں مل کر، جھلمل بستی اس کا نام۔
لال صوفی کا سر کاٹ کر لے گیا ہتیارا
آج تک اس کا پتہ نہ چل پایا۔
پرندوں کا اسپتال ——— اس کی سچی یادگار۔ وہ جب تک زندہ رہا، پرندوں پر جان چھڑکتا رہا۔
مارا گیا لال صوفی ——— جو نفرت کو اپنے خون سے تولتا رہا۔
مزار میں دفن ——— سر کٹا لال صوفی۔
لوگوں کا کل شہید، جو زندگی بھر نفرت کے خلاف لڑتا رہا۔
لال صوفی کا مرثیہ ——— اولاد احمد کی کتاب کا حرف آخر:

بانس کے پتے پر یہ شبنم ماتم والے بوسے کم کم
آنکھوں سے پلکوں کی باتیں پھر ڈھو ڈھو روتے رہے ہم

آنسو کی کیا آب و تاب کیسے پڑھتے رہے کتاب
یہ زندہ اور مردہ لوگ آنسو میں موتی کی آب

کیسا پلٹا ہے یہ موسم دم توڑے پتوں پر شبنم
وہی سوال اور وہی جواب کہاں گیا وہ اپنا ہمدم

کھنڈر کے پیچھے چاندنی رات میں چمپلی کے منڈوے تلے سو رہی تھی بن پھول۔
اسے ناگ نے ڈس لیا۔
اس کی ارتھی کے ساتھ علی جو امام دوکان سے شمشان تک چونیاں اور اٹھنیاں نچھاور کرتا رہا۔
اب کہاں بن پھول کی جھنکار!

اولاد احمد کی زبان پر جاپان کا ایک ہائیکو:

بس ایک تتلی ——— ننھی جان
مندر کے گھڑیال پر
بے خبر سوتی رہی!

کارواں سرائے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
بن پھول کے الکھ نرنجن کام روپ کی آتما بھی پنچھی اُڑا گئی۔
کارواں سرائے ارتھی کے ساتھ ساتھ۔
چھتیس گڑھ کے چودھری بھی شامل ہوئے
"رام رام ست ہے" کے ساتھ "اللہ ہو" کی آواز بھی بلند ہوتی رہی۔
چنچل سنگھ نے چندن کی چتا سجائی۔
آچاریہ مہادیو نے چتا کو آگ دکھائی
تیرہ دن تک کارواں سرائے کام روپ کا سوگ مناتی رہی ——— چولہے آگ نہ گھڑے پانی۔

بچوں کا شور: دھوئیں دھوئیں تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

(۷)

آج مزار گل شہید پر قوالی کی رات۔
اپنا لال صوفی ——— کارواں سرائے کا گل شہید۔
یاد رہے گا اس کا نغمہ:

وہ ہندو ہوں کہ مسلم ایک ہی مٹی کے برتن ہیں
کوئی ہیں شیخ جی ان میں، کوئی ان میں برہمن ہیں

دائیں رحمان اور خلیل، بائیں اولاد احمد اور وارث معصوم۔
بیچ میں آچاریہ مہادیو۔
چپ کیوں ہو گئے؟ جواب دو۔
علی جو امام کیوں نہ آیا ہمارے ساتھ؟
رفوگر کی دوکان سے چل کر وہ بیگم پل سے گزرے۔ دائیں کھجڑی پورہ، بائیں چترلیکھا کالونی۔

بارہ دری سے ہوکر عیدگاہ مارگ پر چلتے چلتے کتاب محل کو پیچھے چھوڑا۔
جھلمل لبتی سے آگے مزار گل شہید۔
شیطان طوفان، اللہ نگہبان۔ ہم قربان!
ان کا یہی احساس کہ یہاں نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ نہ راجہ نہ بھکاری، نہ دانی اور داسی کے بیچ کوئی دیوار!

جہاں ڈر، وہیں ہمارا گھر!
اب وہ زمانہ کہاں کہ سونا اچھالتے جاؤ۔
اولاد احمد کی یہی شکایت کہ اتہاس گوسوامی تشریف نہ لائے۔
جھوٹی قسم کون کھائے:
وارث معصوم کہہ رہا تھا کہ گل ہما اور مس فوک لور ہی چلی آتیں۔
آچاریہ مہادیو بولے:
"اگر مس فوک لور کو بھی فرصت نہ تھی تو گل ہما ہی چلی آتی۔"
ہر طرف جنگل نظر آنے لگا
وصل ہو یا وصال ہو یا رب!
ہم قربان!
سات قرآن درمیان!
سب نے نہا کر کپڑے بدلے!
قوالی کی رات!
سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی پہلی منزل ہے۔
اس وقت کی گردش یاد کرو، جب ساز ملائے جاتے ہیں!
وارث معصوم اور اولاد احمد یہ دیکھ کر جھوم اٹھے کہ اتہاس گوسوامی پہلے سے محفل میں موجود ہیں۔
مٹی میں گلاب کی سگندھ۔
آچاریہ مہادیو نے ہاتھ جوڑ کر اتہاس گوسوامی کو پرنام کیا۔
جانے کون سی ان بوجھی پہیلی بوجھی جا رہی تھی۔
اپنے تو ہیں سَو سَو یار   دھنئے، جُنکر اور منہار

دل کی دنیا بہت اندھیری　　　اندھیارے میں کاروبار

اچانک درگاہ کے اندر ایک آدمی آکر چلایا:

"فساد شروع ہو گیا!"

بکھرے بال، کندھے گھائل، سر لہو لہان۔

چیختے چلاتے وہ گر پڑا۔

قوالی کی محفل درہم برہم۔

اب کیا ہوگا؟

خلیل اور رحمان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اولاد احمد اور وارث معصوم بولے:

"چلو آپا رے مہادیو! اب بھاگ چلیں۔"

وہ چلتے رہے، گرتے پڑتے چلتے رہے۔

افراتفری، وحشت غم کا پہاڑ۔

بلند عمارتیں آگ کی نذر۔

گلیاں لہو لہان۔

کالی سڑکیں سرخ ہو گئیں۔

راہیں لاشوں سے پٹ گئیں۔

اپنی ہی دوکان کی سیڑھیوں پہ مارا گیا علی جو امام۔

سفید گھوڑے کا کالا شہسوار

اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے ـــــ گھوڑے کی ایال پر!

آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے، گرتے رہے!

مارا گیا علی جو امام:

ایک ہاتھ میں سوئی، دوسرے میں دھاگا! .. .. .. □

قرۃ العین حیدر

دریں گرد سوارے باشد

۱۔ جو رہی سو بے خبری رہی

"۔۔۔۔ عالم جلیل و فاضل بے عدیل تھے۔ اپنے تمام بھائیوں میں افضل۔ گلاب کے پھول کی طرح حسین ۔۔۔۔"

نیم تاریک غلیظ گلیوں میں سے گذرتے ہوئے اچانک کسی ڈیوڑھی کے اندر رکھے تیز سرخ گلاب کی جھلک نظر آجاتی ہے، بہت عجیب لگتا ہے۔

"یہ قدیم دانشکدہ، یہ جزیرہ سخنوراں اتنا گندا ۔۔۔۔ کیوں؟" سائیکل رکشا پہ وسیع جھیل کے کنارے سے نکل کر بھول بھلیاں میڈیول گلیاں طے کرتے ہوئے میں نے اپنے کزن سے پوچھا جو اس شہر رو معروف قصبے کے ہر چوتھے شخص کی طرح اچھے خاصے شعر کہتا تھا۔

"ان گلیوں کی نالیوں کی نکاس ۔۔۔۔" اس نے سائیکل پر ساتھ ساتھ آتے ہوئے جواب دیا ۔۔۔۔ "جن کھیتوں میں ہوتی تھی وہاں کارخانے بن گئے۔ پانی رک گیا۔ اب نکاس کا کوئی راستہ نہیں۔"

"راستہ بنایا نہیں جا سکتا ۔۔۔۔؟"

"کسی کو پرواہ نہیں۔ اور آبادی بڑھتی جا رہی ہے بے تحاشا۔"

کیا یوروپ کے شہروں میں آل موسٰی کے GHETTO اسی طرح بنے تھے؟

ایک تاریکی پھاٹک کے سامنے ایک خستہ حال بوڑھا میلی چادر پہ مونگ پھلیاں اور سستے بسکٹ چنے سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ موڑ پر پہنچ کر اچانک ماموں میاں کی سفید ڈیوڑھی اس کے اندر سے سرو شمشاد کی جھلک گویا سمرقند یا طوس یا دسویں صدی عیسوی کے قرطبہ یا اٹھارویں صدی عیسوی کے مرشد آباد یا دلّی کا چھپیٹا۔ صدر دروازے پر غریب برقعہ پوش عورتیں اور ان کی گرد ھان۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹی۔ وی۔ فلم۔" شاعر کزن نے جواب دیا۔
اندر زنانے صحن میں ہینڈ پمپ پر ممانی جگر جگر کرتے جھازی لوٹے میں وضو کے لئے پانی بھر رہی تھیں
گلاب کی کیاری کے نزدیک ریٹائرڈ ماہر تعلیم ماموں میاں آرام کرسی پر نیم دراز پیچوان کے کش لگانے میں مصروف
ان کے ایک پروفیسر شاگرد جو ان سے ملنے کسی دوسرے شہر سے آئے تھے ایک مونڈھے پر مودب بیٹھے تھے۔
"اے بیٹا تم نے اپنے جد اعلیٰ زید شہید کی شمشیر کی زیارت اب تک نہ کی؟" ممانی نے دریافت کیا۔
"جناب زید شہید کی شمشیر یہاں کیسے پہنچی؟"
"لوگ اور ان کی چیزیں کہاں کہاں کیسے پہنچ جاتی ہیں۔" ماموں نے کہا۔
"اے بی سرو بیگم کی بھی کچھ خیر خبر ملتی ہے؟" ایک پڑوسن نے بلبل چشم کے تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے
سوال کیا۔ وہ بھی فلم دیکھنے آئی تھیں۔
"سرو باجی کا تو بیاہ ہو گیا کراچی میں کب کا۔"
"اے لو ——— کس سے؟"
"میر حسن لندنی کے پڑپوتے سے۔" میرے بجائے ماموں نے جواب دیا۔
میں نے کان کھڑے کئے۔
"اور نعمت خاں عالی کا اصل نام کیا تھا ——— ؟" میں نے فوراً پوچھا۔
"مرزا محمد ——— سنبھل کے رہنے والے تھے۔" انھوں نے جواب دیا۔ میں نے فوراً پرس سے نوٹ
بک نکالی۔" ان کے پڑپوتے سے سرو بیگم کی پھوپھی ممتاز بیگم بیاہی تھیں۔" ماموں نے اضافہ کیا۔ بطور فٹ نوٹ۔
"ایک آل انڈیا پڑپوتا ایسوسی ایشن بنایا جائے۔" شاعر کزن نے کہا۔
"مجھے ان دنوں میر قاسم کی بہت ٹوہ ہے۔" میں نے کہا۔
"فخر النساء بیگم ———" ماموں پیچوان گڑگڑاتے ہوئے بولے۔" بنت سعادت علی خاں ———
غازی الدین حیدر کی سگی بہن ——— میر قاسم کے بیٹے نواب میر کلو سے بیاہی تھیں۔"
"اے ذرا کلو کو آواز دیجیو ——— چلتی ہو شمشیر کی زیارت کرنے؟" ممانی نے نماز کے لئے تخت پر بیٹھے
ہوئے دہرایا ——— "شبو ——— کلو سے کہنا کشا لے آوے کل سویرے ———"
"ہسٹری محض فاتح قوم کا پروپگنڈہ ہے ———" ماموں نے اچانک کہا۔" بقول شخصے خود عہد نامہ
قدیم میں یہودیوں کا پروپگنڈہ ہے۔ کسی نے آج تک اشوریہ والوں کا پوائنٹ آف ویو معلوم نہ کیا۔"
"مجھے مظفر نامے کی بہت تلاش ہے تاکہ پلاسی اور بکسر کے متعلق اپنا پوائنٹ آف ویو معلوم ہو ———"

کرم علی کون صاحب تھے؟ مظفر جنگ کے ملازم تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

" سراج الدولہ کے عتاب سے بچنے کے لئے پٹنہ چلا گیا تھا۔ جہاں مظفر نے اسے ملازم رکھا۔ انگریزوں نے جب مظفر جنگ کو نائب نظامت سے معزول کیا، کرم علی نے اپنے آقا کا غم غلط کرنے کے لئے مظفر نامہ لکھا۔"

" ہم ذرا غم غلط کرنے کے لئے ٹیلی ویژن اون کر آویں۔" شاعر کزن نے کہا اور اٹھ کر دیوان خانے کی سمت چلے گئے۔

" سید محمد رضا خاں مظفر جنگ مرشد قلی خاں کے زمانے میں دلی سے بنگال پہنچے تھے۔" ماموں نے پھر اچانک بات کی۔ دور دھونیں بے سُری آواز میں مسلسل گائے جا رہی تھیں۔ چھت پر کبوتر کابکوں میں واپس آرہے تھے۔ سرو شمشاد شام کی ہوا میں سرسرائے۔ ہرجائی ہوا جنگل جنگل منڈلاتی پھری۔ چاٹگام کے جنگل دار محمد رضا خاں۔ سمندر کنارے مدھو کا کھلی ہے۔

" محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا۔" دور سے ماموں کی آواز آئی۔

محمد شاہ پیا سدا رنگیلے۔ موسیقی کی پریاں گوڑ ملہار کے بادل بکھیر رہی تھیں۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں کی چلمن کے عقب سے وہ بانکے لوگ نکلے مرشد آباد جانے کے لئے کہار اسپ تیار ہے اور چوڈولہ۔

" ابھی میں نے کہار کشا ابھی لے آؤں ــــــ ؟" درمیانی ڈیوڑھی میں سے آواز آئی۔ چار خانہ تہمد، چگی داڑھی، سیاہ مخملیں ٹوپی، چھینٹ قمیص ایک بزرگ کانپتے کھانستے دروازے میں نمودار ہوئے۔

" کہئے نواب میر کلو ــــــ" شاعر کزن نے کہا جو دیوان خانے سے واپس آچکے تھے۔" مزاج عالی؟"

" اللہ کا شکر ہے۔ میاں۔"

" شکر ہے تو کھانس کیوں رہے ہو۔ علاج کرواؤ۔"

" علاج ــــــ" وہ ہنسے۔" میاں کی باتیں! بارہ آدمیوں کا ٹبر۔ آٹھ بچے۔ چار بیوہ لڑکی کے ــــــ"

" ہاں۔ ہاں۔ روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ ــــــ" شاعر کزن نے جمائی لے کر مجھے مخاطب کیا۔" کلو خاں مرشد آباد کی باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ کیوں حضرت؟ ذرا اپنا مظفر نامہ بٹیا کو سنائیے۔"

" بٹیا ہمارے پرکھے مرشد آباد والوں کے خانہ زاد غلام تھے۔ ہم اب رکشا چلاتے ہیں۔"

" بچپن میں یہاں آگئے تھے۔ لب و لہجہ بھی یہیں کا ہو گیا ہے۔" شاعر کزن نے کہا۔" اور اپنی ہسٹری بتاؤ۔"

" ابھی ہماری کیا ہسٹری۔ وہ تو آپ لوگوں کی ہوتی ہے۔"

" تاریخ خدا کا VISION ہے۔" پروفیسر شاگرد نے غالباً کسی اور خیال میں محو اچانک ایک اسٹیٹمنٹ دیا۔

"یہ خوب!" اگنوسٹک شاعر کزن نے تبسم کیا۔ کلو خاں آرام کرسی کے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

"خدا تاریخ کے ذریعے اپنا پلان ورک آوٹ کرتا ہے ـــــــ" پروفیسر شاگرد نے کہا۔

"اچھا پلان ہے۔" شاعر کزن بولے۔

"یہ مابعد التواریخ ہے۔" پروفیسر شاگرد نے کہا۔

"سبحان اللہ! لفٹ ونگ شاعر کزن دبی زبان سے بولے۔

میں دوسرے صحن میں چکر لگا کر آئی۔ دیوان خانے میں ٹیلی ویژن اسکرین پر ہندوستانی ہیرو ہیروئن الفل ور کے اوپر کودنے، اچھلنے اور ڈوئیٹ گانے میں مصروف تھے اور آس پاس کے فرانسیسی بھونچکے سے ان کو تک رہے

"جو لاکھوں برس پہلے ڈینوسار تھے اب چھپکلی ہیں۔" ماموں نے کہا۔

"ارتقا اب جاری کیوں نہیں کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے کم از کم خچر گھوڑا بن جائے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی ہو رہا ہے۔" شاعر کزن بولے۔

"اب منظفر جنگ کر لو ــــــ" ماموں نے بات شروع کی۔" ارتقا کا الٹ ــــــ عروج سے زوال ــ ــ

"جی ہاں، منظفر جنگ کو لیجئے ــــــ" میں نے کہا۔

ممانی نماز اور وظائف ختم کر کے نماز کے تخت سے اتریں۔

"اب آپ تھوڑی باشی بن جائیے اور ہمارے لئے کافی بنائیے۔" ماموں نے فرمائش کی۔ اس وقت وہ تانبول کے جھینٹے میں تھے۔ پھر گویا ہوئے "پلاسی کے بعد فرنگیوں کو حکومت مل گئی تھی مگر ملک کے انتظام سے ناواقف تھے مد رضا خاں کے تجربے کو دیکھتے ہوئے میر جعفر کے انتقال کے بعد بنگال کونسل نے ان کو نائب دیوان بنگال، بہار، یسہ مقرر کیا۔ پچھتر ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ۔ اب وہ کمپنی کی طرف سے نائب دیوان اور نابالغ نواب نجم الدولہ کی طرف ، نائب ناظم تھے۔ مغل شہنشاہ نے ان کو بہار میں علاقہ ترہٹ کے اندر جاگیر دی تھی جو منظفر پور کہلائی۔ نواب منظفر جنگ طاب ملا تھا۔ اٹھارہ لاکھ روپیہ جو کمپنی نظامت کے اخراجات کے لئے میر جعفر کو دیتی تھی۔ محمد رضا خاں کو دیے ،۔ راجہ شتاب رائے ان کے نائب تھے۔

"لیکن جب عین نصف النہار پر گھپ اندھیرا چھا جائے ایسا محمد رضا خاں کے ساتھ ہوا۔ وارن ہیسٹنگز نے مراری بندوبست شروع کر کے ایڈمنسٹریشن اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ منظفر پور پر قبضہ کیا۔ سید محمد رضا خاں کی پنشن رر کر دی۔"

"کل بی بی کی صحنک ہے۔ بلاوا دینے آئی تھی۔" ایک محلے والی نے قریب آ کر ممانی کے کان میں کہا۔

ماموں نے سن لیا۔ بولے ''نور جہاں بیگم نے اپنی سوت کو طعنہ دیا تھا۔ موئی بن کی بکڑی مارواڑن۔ اسے بھی دن لگے ـــــ اس مارواڑن نے بی بی کی صحنک شروع کر کے بدلہ لیا۔''

''انھی امپریل رویوں کے نتائج ـــــ'' شاعر کزن نے بات ادھوری چھوڑی اور آسمان پر سے اترتے ہوئے کبوتروں کو دیکھنے لگے۔

''مظفر جنگ کی جیت پور والی چار ہزار بیگھہ زمین کی وجہ سے فورٹ ولیم کالج کے کاغذات میں اُن کو محض ''نواب جیت پور'' لکھا گیا۔ بعد میں اس کے باقی ماندہ حصّے پر کسی مارواڑی نے جوٹ مل بنائی۔'' ماموں نے کہا۔

''موئے بن کے بکڑے مارواڑی نے ـــــ'' شاعر کزن نے اضافہ کیا۔

''مظفر جنگ نے انگریز کو معزول کیا اور ان کی زمین پر مارواڑی نے قبضہ کر کے جوٹ مل بنائی ـــــ یہ واقعہ بذاتِ خود ایک اہم علامت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انڈین سول سروس کے جان بیم نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ جنگ پلاسی محض ایک ہندوستانی صوبے پر ایک یوروپین تاجر کمپنی کی فتح نہیں تھی بلکہ ایک FOREIGN MOHAMME-DAN POWER پر ہندو نیٹو تاجر اور برٹش فنانشل طبقات کی مشترکہ فتح تھی۔ محمڈن حکومت کے زوال کا باعث اس کا اندرونی نفاق تھا۔ اور انگریز، ہندو مرچنٹ کلاس سے گہرا رابطہ رکھتے تھے۔ کارل مارکس نے یہی بات اس طرح کہی کہ فیوڈل نظام پر نئی مرچنٹ سرمایہ داری کی فتح ہوئی۔''

''لیکن انگریز جو اپنی کتابوں میں مسلمانوں کو FOREIG POWER لکھ گیا اس بے ایمانی اور شرارت کا نتیجہ ہم آج تک یہاں بھگت رہے ہیں ـــــ'' شاعر کزن بولے۔

مرزا ابوطالب اصفہانی ـــــ مجھے یاد آیا ـــــ مظفر جنگ کے وارڈ تھے۔ اسی خاندان کی ایک لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۷۹۹ء میں مرزا صاحب لندن پہنچے وہاں ایک انگریز کے گھر میں انھوں نے نواب شیر جنگ کے لٹے ہوئے نوادرات اور کتب خانہ دیکھا ـــــ سنہ ۱۷۹۹ء ـــــ اسی سال کاویری کے کنارے ٹیپو گرا تھا۔ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن میں ٹیپو کا خود رکھا ہے۔ اس پر فارسی میں کندہ ہے: ''یہ خود آب زمزم سے دھویا گیا ہے اس پر دشمن کا کوئی ہتھیار اثر نہ کرے گا۔''

ٹیلی وژن پر فلم میں ہندوستانی ہیرو ہیروئن اب ہائیڈ پارک لندن کے اندر دوڑتے بھاگتے ڈوئیٹ گا رہے تھے۔

''مرشد آباد پہنچ کر سراج الدولہ نے التجا کی تھی۔ مجھے گزارہ دے دو اور تھوڑی سی زمین پناہ کے لئے

اس کی لاش کو ہاتھی پہ رکھ گشت کروایا گیا۔" میں نے آواز بلند کہا۔" جب ہاتھی اس کے محل کے سامنے سے گذرا اس کی والدہ روتی ہوئی محل سے نکلیں اور ہاتھی کے پاؤں سے لپٹ گئیں ـــــــ"

"سراج الدولہ کی بڑی خالہ بڑی سیاست داں عورت تھیں۔ گھسیٹی بیگم ــــ اپنے لڑکے شوکت جنگ کی جانشین کے لیے کیا کیا جوڑ توڑ کئے ـــــ" ماموں نے اظہارِ خیال کیا۔

"جوڑ توڑ، سازشیں، تشدد۔" شاعر کزن بولے۔" بڑا تشدد تھا اس زمانے میں۔"

"آج نہیں ہے ـــــ ؟" ماموں نے دریافت کیا۔

"پیچے کروڑں کیڑے کوڑے اور اوپر چند ہزار گدھ ــــــ" شاعر کزن نے آسمان پر نظر ڈالی۔

"لیکن محمد رضا خاں سے ہمدردی کیوں؟ نہ ان کے پاس جدید سائنس تھا نہ ٹیکنولوجی نہ عقلیت پندی جس سے کلائیو اور وارن ہیسٹنگز لیس ہو کر آئے تھے۔ جب مظفر جنگ، کلائیو اور وارن ہیسٹنگز سے مصافحہ کرتے ہوں گے لگتا ہوگا عہدِ وسطیٰ نئے سائنسی دور کو سلام کر رہا ہے ـــــ" میں نے کہا اور ان جدید مغربیوں کا بسایا ہوا کلکتہ جسے دیکھ کر مرزا غالب ششدر رہ گئے تھے۔"

"سارے مفتوحین کلکتہ میں بسائے گئے ـــــ" ماموں نے کہا۔

"مظفر جنگ کی اولاد ـــــ ٹیپو کی اولاد ـــــ مرشد آباد والے میر جعفری اولاد ـــــ اور ان سب کے بعد جان عالم ـــــ اور سب وہاں عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ آپس میں یہ مفتوحین ایک دوسرے سے رشتے ناتے کرتے اور راضی میں خوش رہتے۔" ماموں نے کہا۔" ٹیپو کے پوتے پرنس غلام محمد کی لڑکی سے مظفر جنگ کے پوتے دلدار جنگ نے اپنے لڑکے کا بیاہ کیا۔ ـــــ"

"وہ مرحومہ ہمارے ابا کی تائی تھیں۔ سید اصغر علی دلیر جنگ کی بیوی ـــــ" ممانی بولیں۔

کلو خاں سر آگے بڑھائے غور سے سن رہے تھے ـــ اچانک بولے ـــــ" ہمارے پردادا مرشد آباد والوں کے ہاں سے آکر دلیر منزل میں ملازم ہو گئے تھے اور ان کے بڑے بھائی سابرٹ صاحب کے ہاں خدمت گار تھے۔ رابرٹ صاحب اس وقت کپتان تھے ـــــ"

"کمپنی کے متعلق عوام ایک گیت گاتے تھے ـــــ کمپنی نشان ـــــ بی بی مرگیا دمدمہ ـــــ اُڑائے ہے نشان ـــــ بڑا صاحب، چھوٹا صاحب۔ بانکا کپتان۔ دیکھ میری جان۔ لیا ہے نشان۔ کسی بانکے کپتان کے دستے نے شاید سراج الدولہ کے کسی نشانچی سے اس کا پھریرا چھینا ہو جب یہ گیت بنا۔ جس کے بعد انھوں نے دمدمہ جا کر بڑا کھانا اڑایا ہوگا۔" ماموں نے کہا۔

"دمدمہ انھوں نے ڈم ڈم بنایا۔ محرم میں حسین یا حسین کی صدائیں ان کو HOBSON JOBSON

سنائی دیتی تھیں۔ ٹیپو کا لباس اور پگڑی فتح کی نشانی کے طور پر انھوں نے اپنے چپراسیوں کو پہنائی۔ آزاد برصغیر کی حکومتوں کے چپراسی آج تک یہی لباس پہن رہے ہیں ـــــ" میں نے کہا۔

" ع رہے گا کوئی تو تیغِ ستم کی یادگاروں میں۔" شاعر گزن گنگنائے۔

" کلکتہ شہر میں کتنے گاڑیاں چل رہی تھیں۔ صبح کو صاحب لوگ میدان میں شہسواری کرتے۔ شام کو لیڈی لوگ گاڑیوں میں ہوا خوری۔ امریکہ سے برف امپورٹ کی جاتی تھی۔ بنگال کلب۔ ریس کورس۔ کرکٹ پولو فاتح انگریزوں کے مشاغل تھے۔ مسلم مفتوحین کی اولاد کے پاس سوائے تفریح کے کوئی کام نہ تھا۔ سب کو وافر پنشنیں ملتی تھی۔ بڑی بڑی کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ ٹیپو کے پوتے اور مرشد آباد کے عالی جاہ سوشل سرگرمیوں میں نمایاں تھے۔ جے۔ پی۔ بنا دیئے گئے تھے۔ مظفر جنگ کے پڑپوتے اصغر علی دلیر جنگ لندن سے بیرسٹری پڑھ آئے تھے ان کے چھوٹے بھائی سید احمد علی بیحد صاحب آدمی تھے۔ شاید ہندوستان کے پہلے براؤننگ صاحب۔ اپنی کوٹھی بھوولا میں بالکل انگریزوں کی طرح رہتے تھے کیپٹن فریڈرک رابرٹ سے بہت دوستی تھی۔ اکٹھے پولو کھیلتے تھے۔ فتح کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور انگریز مسلم مفتوحین کی اولاد سے برابری سے ملتا تھا۔ غدر سن ستاون میں لکھنؤ کی خورشید منزل جو بعد لا رامینئر گرلز اسکول بن گئی اس پر فتح کا پرچم کیپٹن فریڈرک رابرٹ نے نصب کیا تھا۔

" رابرٹ صاحب کی ایک بہت حسین بہن تھی مارگریٹ۔ سید احمد علی خوبصورت لکھ پتی نوجوان تھے۔ سید محمد رضا مظفر جنگ کے نوادرات اور ہیرے جواہرات کے وارث۔ اس سے زیادہ افسانوی" انڈین پرنس چارمنگ" اس وقت طامس مور کی "لالہ رخ" ہی میں مل سکتا تھا۔ مارگریٹ اور سید احمد علی کی شادی ہوگئی۔ اسلامی نام اشرف النسا بیگم رکھا گیا۔ تین بچے پیدا ہوئے۔ سید یوسف علی، فاطمہ بیگم، احمدی بیگم۔ چودہ برس تک یہ خاندان ریجنٹ اسٹریٹ لندن میں مقیم رہا جہاں نواب احمد علی نے ایک عالی شان مکان کرائے پر لے رکھا تھا اور لندن کی اعلیٰ ترین سوسائٹی میں شامل تھے۔ اسی سوسائٹی میں بے چارہ مہاراجہ دلیپ سنگھ بھی مصنوعی انگریز بن کر وکٹوریہ کے " بیٹے" کی حیثیت سے زیست کر رہا تھا" ماموں نے بات ختم کی۔

"ہماری دادی کی دادا جان سے نا چاقی رہنے لگی۔ کلکتہ واپس آکر کچھ عرصے بعد لندن واپس چلی گئیں۔ پھوپھی احمدی کو ساتھ لیتی گئیں۔ پھوپھی احمدی سایہ پہنتی تھیں پردے کا کیا سوال۔ وہیں لندن میں ایک مصری پاشا سے بیاہ کرلیا۔" ممانی نے کافی بناتے ہوئے کہا۔

" مارگریٹ اشرف النسا کے بھائی نے بہت ترقی کی۔ فیلڈ مارشل بنے۔ لارڈ کا خطاب اور ارل کارینک حاصل کیا۔ اینگلو افغان وار میں مشہور عالم مارچ ٹو قندھار کی جنرل رابرٹ نے قیادت کی تھی۔" ماموں کافی

پیتے ہوئے بولے: "لارڈ ڈفرن وائسرائے کے عہد میں انڈین آرمی کے کمانڈر ان چیف تھے۔ انھوں نے صوبہ سرحد اور افغانستان کے دروں کی قلعہ بندیاں مستحکم کیں اور رؤسائے ہند کو فوج میں ہنر عہدے دیئے۔ ان کے بھانجے بھائی یوسف علی اور فاطمہ کی پرورش ان بچوں کی لاولد تائی بیگم دلیر جنگ نے کی ـــــ وہی جو ٹیپو سلطان کی پڑپوتی تھیں ـــــ"

"اصغر علی دلیر جنگ کی دوسری بیوی سے دو لڑکے تھے۔ نادر جنگ اور بابر جنگ۔ دو لڑکیاں روشن آرا اور گیتی آرا۔ روشن آرا پھوپھی کا لڑکا کلکتے میں کسی سپری کے عالم میں زندہ ہے۔ ایک سینما گھر میں ٹکٹ بیچتا ہے ـــــ کیوں کہ تعلیم کا شوق اس نسل کے بعد سے اٹھ گیا تھا۔

ممانی نے کہا۔" دادی مارگریٹ کے لندن واپس جانے کے بعد ہمارے دادا جان نے ایک سجادہ نشین کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ وہ ہماری پھوپھی فاطمہ بیگم سے ملنے ممبو ولا آیا کرتی تھیں۔ دھرم تلہ میں مولا علی کی درگاہ تھی۔ شیخ گلاب اس کے تکیہ دار فقیر تھے۔ نسیمن ان کی بیٹی تھیں۔ خانم صاحب کہلاتی تھیں۔ سونے کی کنجیوں کا گچھا ڈھکی ململ کی ساری کے آنچل میں باندھے رہتی تھیں۔ ناک نقشے کی اچھی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ محمد حسین سید احمد علی نے ان کا بیاہ واجد علی شاہ کی پو[illegible] آرا بیگم سے کیا۔ فرخ مرزا کی لڑکی سے۔

"سید یوسف علی ہمارے ابا کی شادی کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ ان کے والد سید احمد علی نے ان کا بیاہ واجد علی شاہ کی ایک بیٹی سطوت آرا حلیمہ بیگم سے کیا۔ وہ گل اندام محل کے بطن سے تھیں۔"

سہ" یہ اختر جو ہے خاکپائے جہاں یہ شاہِ اودھ تھا کبھی لے جواں "

شاعر کرن گنگنائے۔

"سید یوسف علی بھی دس مہینے کے تھے جب ماں باپ کے ساتھ لندن گئے تھے۔ پورے چودہ برس بعد واپس آئے۔ شکلاً اور مزاجاً بالکل انگریز۔ شاید مٹیابرج میں شادی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نکاح کے دوسرے روز ہی [illegible] چلے گئے جہاں ان کی پھوپھی زاد بہن رہتی تھیں جن کے میاں وہاں تاجر تھے۔ چند روز بعد یوسف علی نے برما میں کہیں پر یاقوت کی کان پر پہریدار کی نوکری کر لی ـــــ برما پولس میں بھرتی ہو گئے۔"

"یہ تھم جو وکٹورین امپیریلسٹ انگریز جنرل لارڈ رابرٹ کے خون کے ورثے کا اثر تھا۔ ورنہ اس وقت کے ہندوستانی مسلمان کی مہم جوئی مشاعروں اور مجروں تک محدود تھی۔" پروفیسر شاگرد نے اظہار خیال کیا۔

"ایک چور نے بندوق چلا دی۔ گولی کان کے پاس سے گذر گئی۔ اخبار میں چھپا۔ باپ نے گھبرا کر واپس بلا لیا۔ رخصتی کے لئے بارات لے کر مٹیابرج گئے۔ واجد علی شاہ کے سارے بیٹے تقریب میں جمع تھے۔ پرنس بابر مرزا وغیرہ۔

انھوں نے دولھا سے تین سو روپے ماہوار پاندان کا خرچ باندھنے کے لئے کہا۔ انھوں نے جواب دیا میں اس پر قادر نہیں ہوں۔ باپ کا دست نگر ہوں۔ باپ کو بہت غصہ آیا۔ بہر حال دلہن رخصت ہو کر بمبو ولا آئیں۔ بعارضہ تپ دق تین سال بعد انتقال کیا:

"نواب احمد علی خود بےحد انگریز تھے۔ پانچ بجے شام کو سگار پیتے ہوئے بمبو ولا کے برآمدے میں ٹہلتے تو لوگ اس وقت گھڑیاں ملاتے۔ نواب صاحب سگار پی رہے ہیں۔ پانچ بج گئے۔ دو کڑی برساتی میں سیڑھیوں سے لگتی۔ ایک پاؤں سیڑھی پر، دوسرا پائیدان پر بیرا گاڑی کے اندر۔ نواب یوسف بہت خود سر تھے۔ ان کا کہا نہیں مانتے تھے۔ ایک دن انھوں نے سگار پیا۔ باپ نے دوسرے دن کہا ـــــ سید نواب میری گاڑی میں سگار نہیں پیا جاتا۔ ـــ یوسف علی کلکتہ سے چلے آئے۔ لکھنؤ آکر ریلوے میں نوکری کرلی۔ ۱۹۰۲ء میں نواب احمد علی بیمار پڑے لکھنؤ تار دیا۔ جب تک یوسف علی بمبو ولا کلکتہ پہنچیں بات کا انتقال ہو چکا تھا ـــــ ابا نے دوسری شادی لکھنؤ کی ایک رئیس زادی سے کی۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔

"۳۲ء میں میں مٹیا برج گئی تھی۔ اس وقت تک سلطان خانے کے حوض میں ایک مچھلی سونے کی نتھ پہنے میں نے بھی دیکھی تھی ـــــ" ممانی خاموش ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد بولیں ـــــ "ابا کے تایا دلیر جنگ سات زبانیں جانتے تھے۔ گوہر جان مجرے کے لئے دلیر منزل آیا کرتی تھیں اور ان کی ماں ملکہ جان کا نا سننے بمبو ولا بلائی جاتی تھیں۔ ٹیپو سلطان کے ایک پڑپوتے نے ملکہ جان کے لئے قصیدہ لکھا تھا ـــــ"

"یہ ہے اصل بات ٹیپو کا پڑپوتا ملکہ جان کے لئے قصیدہ لکھتا ہے۔ طاؤس و رباب آخر ـــــ" شاعر کزن نے اظہار خیال کیا۔

"میں نے کتاب میں اس طرح پایا ہے کہ لوگ صورت مثال کو اصل سمجھ بیٹھے ـــــ" ماموں اپنی دھن میں کچھ کہے جا رہے تھے۔

دفعتاً میں نے کہا۔ "ماموں نے کہیں پڑھا تھا کہ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کے روز یوم پنجشنبہ صبح سویرے بطور صدقہ ایک ـــ بورد ساہ تل، ایک سیاہ بیل، تانبے کے ننانوے پیسے ٹیپو کے لئے خیرات کئے گئے تھے۔ درمیان عصر و مغرب شہید ہوا۔"

خاموشی چھاگئی۔

"وہ کس لئے ہار اکیوں کہ ہم لوگ مچھلیوں کو سونے کی نتھ پہنا رہے تھے۔" ماموں نے چند لمحوں بعد کہا۔

فرانس کے انقلابیوں نے ٹیپو کا نام ... [illegible]

CITIZEN TIPU, MEMBER, REPUBLICAN CLUB میں نے یاد کیا۔

"ابی کس کس بات کا غم کرو،" شاعر کزن نے موضوع تبدیل کیا" پچھلے سال ہمارے ہاں کا شاندار محرم دیکھنے دلی سے کئی روسی اور امریکن آئے تھے۔"

"کچھ روپے سے اگر آپ ان گلیوں کی صفائی ــــــ" میں نے کہنا شروع کیا۔ شاعر کزن اٹھ کر دیوان خانے کی طرف چلے گئے جہاں ٹی۔وی۔ پر ہندوستانی ہیرو ہیروئن اب سوئٹزرلینڈ میں ڈوئیٹ گا رہے تھے۔

"مٹیا برج ایک غلیظ SLUMS ہے جس میں واجد علی شاہ کے نام لیوا بستے ہیں۔ سولہ سولہ آدمی کے کنبے میں پاؤ بھر دال پکتی ہے۔ وہی حال ہے جو لکھنؤ کے وثیقے داروں کا ہے۔ اسی غربت میں پیسہ پیسہ جوڑ کر ہر سال دھوم کا محرم کرتے ہیں۔ بہت سی شہزادیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں۔ بڑھیا ہو گئیں۔ مگر مطالبہ دس لاکھ کا مہر باندھنے کا قائم ہے۔ اب بتاؤ اتنا بڑا مہر کون باندھے گا۔ پچاس روپیہ مہینہ وثیقہ۔ صبح کو چا، اور رات کی باسی روٹی سے ناشتہ کرتی ہیں۔ عبرت۔" پروفیسر شاگرد نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا۔ ان کی بیوی بھی مٹیا برج سے تعلق رکھتی تھیں۔

"حضرت زید شہید کی شمشیر میں یہ کرامت ہے کہ جب کوئی بھاری مصیبت آنے والی ہو اس کی سطح پر ایک دھبہ سا پڑ جاتا ہے۔ غدر سے پہلے بھی سنا ہے پڑا تھا اور اس کے بعد بھی کئی مرتبہ۔" کلو خاں بولے۔

"پرچھائیں سی پڑ جاتی ہے۔"

"تو اب تک اس کی سطح پر پرچھائیاں ہی پرچھائیاں ہوں گی۔" میں نے کہا۔

دوسری صبح جب میں اور ممانی کلو خاں کی رکشا پر سوار ہو کر گلی میں سے نکلے اور مزید پیچدار گلیوں میں سے گذرے دونوں طرف گندے سیاہ پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ اچانک مجھے شدت کا ردعمل ہوا۔ پرانی تاریخ اور میڈیول قصبوں اور تاریکی بستیوں اور افسانوی کھنڈروں کے لئے میرا فیسی نیشن بالکل غلط، بیکار، احمقانہ اور لایعنی ہے۔ یہ بالکل ٹھہرا ہوا پانی ہے۔ سیاہ۔ کائی آلود، منجمد، غلیظ تو کیا اس تہذیب یا اس کے آثار کو اب محض لائبریری اور میوزیم میں بند کر دینا چاہئے ؟ شاعر کزن جو سائیکل پر ساتھ ساتھ آرہے تھے انھوں نے غالباً میرے خیالات پڑھ لئے بولے۔" یہیں کے پلے بڑھے ہمارے عزیز کراچی سے چند روز کے لئے آکر اس اپنے اور احساس برتری سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے پہلے زمانے میں بددماغ انگریز نیٹوز کو دیکھتا تھا۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے قصبوں کا موازنہ کراچی سے کرتے ہیں تینتیس، چونتیس سال اور چلی یہ تہذیب۔ اب اسے ہم اپنے ہاتھوں سے ختم کر رہے ہیں۔"

"کیوں کہ آپ کی ترجیحات PRIORITIES بالکل غلط ہیں۔ جب انگریزی پریس آپ کو بحیثیت "بیک ورڈ

کلاسں،" تیڈ ولڈ کاٹس کے ساتھ بریکٹ کرتا ہے تو آپ خوش ہوتے ہیں کہ آپ کو بھی مراعات ملنی چاہئیں۔" میں نے پوچھا" سینما، مشاعرے، قوالی اور محرم۔ اس کے علاوہ امّت مرحومہ کی دلچسپیاں کیا ہیں؟ سارے ہندوستان کے سینما گھروں میں فلمیں آپ کی سرپرستی کی وجہ سے جوبلی مناتی ہیں ــــ"

"بٹیا ــــ" کلو خاں کے رکشا چلاتے چلاتے اشارہ کیا ــــ" ادھر نکٹی نورُن کا امام باڑہ ہے۔ لال قلعہ دلی سے یہاں آئی تھیں۔"

"ایک امپریل ماضی کسی قوم کے لئے بڑا نقصان دہ اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے شاعر کزن سے کہا۔ سید محمد رضا خاں مظفر جنگ کی اس POST-MUGHAL دنیا میں آخری وارث ممانی جان برقعے میں لپٹی رکشا میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھیں۔

"بٹیا" ــــ کیا کہئے ــــ کلو خاں کو کیا یاد آیا ــــ برطانوی امپریل کلکتے کے سہانے دن ــــ اچانک بولے ــــ" گوہر جان نے دلیر منزل میں بھیم پلاسی کی ایک چیز سنائی تھی ــــ ہم دس بارہ سال کے تھے خوب یاد ہے خدا بخشے ہمارے باپ بھی نادر جنگ کے خواص تھے ــــ شاگرد پیشے سے آکر ہم برآمدے میں بیٹھ جاں تھے اور سنا کریں تھے۔ یہ نرگس کی ماں جدّن بائی بھی آیا کرے تھی اور گوہر جان نے اس روز گایا تھا ــــ سماں بندھ گیا تھا ــــ بھیم پلاسی میں گایا تھا۔ جاؤ سدھارو میری جان تم پہ خدا کی ہو اماں ــــ"

وہ خاموش ہو کر رکشا چلاتے رہے۔

شمشیر بکف ٹیپو خود پہن کر ۴ مئی کو دوپہر میدان جنگ میں جانے کے لئے گھر سے نکل رہا ہے ــــ

ایک اور خیال: جعفر علی خاں مرشد آباد سے آن کر کلکتے میں جہاں رہے تھے اور اپنے لواحقین کے لئے کوٹھیاں بنوائی تھیں وہ جگہ علی پور کہلاتی ہے کہ جعفر علی خاں نے اسے بسایا تھا۔ اور وہاں پتیوں کا بڑا سناٹا ہے اور ڈوئل لڑنے والے فرنگیوں کی آہٹ جو درختوں کے سائے میں چل رہے ہیں اور سراج کی پسپائی کی آوازیں۔ نیچے نگاہ کی، کلو خاں کے شکستہ، گرد آلود چپلوں میں اٹکے پاؤں یکسانیت سے رکشا کے پیڈل چلائے جا رہے تھے۔

ایک گلی کے سرے پر ایک شکستہ پھاٹک نظر آیا جس کی اینٹوں میں گھاس اور پیپل کے پودے اگ آئے تھے پھاٹک سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اور ڈیوڑھی تھی جس کی سیڑھیوں کے نیچے سیاہ پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ ایک مہترانی گھونگھٹ کاڑھے جھاڑو ٹوکرا لئے سامنے سے گذری۔ ہم لوگ رکشا سے اتر کر ڈیوڑھی کے اندر گئے۔ عین سامنے صحن میں لپی پتی دیوار کے کنارے گلاب کا ایک پھول کھلا ہوا تھا۔ ہرے ڈنٹھل پر ہری پتیوں سے گھرا تیز سرخ گلاب کا صرف ایک پھول جیسا پہلے زمانے میں اٹراف روزنر کی شیشی پر بنا ہوتا تھا۔

اندر دالان میں ایک لڑکی مشین پر سلائی کر رہی تھی۔ طاق میں رکھا ریڈیو وودھ بھارتی کے فلمی گانے سنا

رہا تھا۔ میں اور ممانی جاکر لڑکی کے پاس دوسرے کھرے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ لڑکی نے سلام کیا۔ ریڈیو بند کر کے پان بنانے لگی۔ انگنائی کی دیوار کے ادھر سے ایک ضعیف اونچی آواز میں کسی سے مخاطب تھیں ـــــ "تیرہ تیزی، بارہ وفات، میرانجی، شاہ مدار، خواجہ جی، مریم روزہ ـــــ اے لو پورا سال گذر جاتا ہے پر بٹو نہ آئیں پاکستان سے۔ کیا میرا چالیسواں کرنے آئیں گی۔"

ایک اور ضعیف دوہری کمر، کمانی جیسی ٹانگیں کمرے سے برآمد ہوئیں۔ ہاتھ میں بڑا سا کنجوں کا گچھا۔ دعا سلام کے بعد ان کے ہمراہ ہم لوگ انگنائی پار کر کے ڈیوڑھی میں پہنچے۔ گلی میں اترے۔ کیچڑ سے بچتے اس قدیم پھاٹک میں داخل ہوئے جو گلی کے سرے پر استادہ تھا۔ اندر اینٹوں کے وسیع صحن میں زرد خود رو پھول اُگے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ایک عالی شان حویلی کے کھنڈر سامنے ایک اجاڑ برآمدے میں دیوار کے نزدیک ایک طویل چوبی صندوق رکھا تھا۔ فرش پر چٹائی۔ ایک کونے میں کسی کتاب کے بوسیدہ پیلے اوراق کسی نے چٹائی کے نیچے سرکا کر اوپر اینٹ رکھ دی تھی۔ زرد کاغذوں پر لکھی دھندلی عبارات چٹائی کے ایک بڑے سوراخ میں سے جھانک رہی تھیں ـــــ جب حلیمہ بیگی آغا ولایت شیروان سے تشریف لے گئیں ـــــ قول آنجناب اکثر چنیں بود کہ، و تنیکہ در گوش من آواز دوں دوں از نقارہ بہ می آید خیال میکنم کہ اگر نادر شاہ ـــــ

ان کی مادر گرامی کا نام لوراد تھا۔ مختار بن ابو عبیدہ ثقفی نے چھ سو دینار میں خرید کر مع چھ سو اشرفی خدمت میں امام عالی مقام کے گزرانا تھا۔ کنیت ابوالحسین اور بسبب کثرت تلاوت کلام اللہ حلیف القرآن بھی مشہور رہے۔ عالم جلیل و فاضل بے عدیل تھے۔ اپنے تمام بھائیوں میں افضل ـــــ گلاب کے پھول کی طرح حسین

"اے باجی بیگم میں بھی آجاؤں زیارت کرنے؟" دیوار کے ادھر سے آواز آئی۔

"جم جم آؤ بہار آرا بیگم"، ہماری میزبان ضعیفہ نے جواب دیا۔

چند لمحوں بعد ایک اور بڑی بی جھکی جھکی دوسرے صحن سے دالان میں داخل ہوئیں ـــــ بوڑھی پوپلی دھندلی آنکھیں ـــــ لیکن کراری آواز ـــــ شاید کچھ دیر قبل یہی پاکستان سے بٹو کے نہ آنے کا شکوہ کر رہی تھیں۔ اور ان خزاں رسیدہ بی بی کا نام بہار آرا بیگم تھا۔ وہ بھی آن کر چٹائی پر اکڑوں بیٹھ گئیں۔ میری نظر پھر اس سوراخ سے جھانکتی عبارت پر پڑی۔ "جب حلیمہ بیگی آغا ولایت شیروان سے تشریف لے گئیں"

ایک خاتون کا نام حلیمہ بیگی آغا بھی کیا بانکا ترک تازی والا نام تھا۔

بہار آرا بیگم بڑھیا انگلش کارڈیگن پہنے ہل ہل دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ یہ کارڈیگن یقیناً ان کے کسی پوتے نواسے نے گلف سے یا انگلستان سے بھیجا ہوگا۔ محلے محلے قصبے قصبے غریب مسلمانوں کے گھروں سے افلاس کے آثار مٹتے جا رہے تھے۔ کماؤ بیٹوں کے سمندر پار سے بھیجے روپے اور خود اپنے دیس میں نئے کاروبار اور گھریلو صنعتوں

کی بیرونی دنیا میں بڑھتی ہوئی مانگ نے ان لاکھوں کاریگر مسلمانوں کے دن پھیر دیئے جن کے بے مثال آبائی ہنر یہ گھریلو صنعتیں تھیں۔ قالین بافی کے مرکز ایک چھوٹے سے قصبے میں مغرب کے تمام بنکوں کی شاخیں کھل چکی تھیں۔ ہر طرف نئے مکان بن رہے تھے۔ دینی مدرسے، مساجد۔

"ہمارے ملک کے ہر فرقے میں مذہب کا غلبہ شدت سے بڑھتا جارہا ہے۔" کل شاعر کزن نے کہا تھا اور اس کے بعد خود فخریہ اپنے ہاں کے محرم کی تصاویر دکھائی تھیں۔

میزبان ضعیفہ نے کنجیوں کا گچھا چھنکا کر طویل صندوق کا قفل کھولا۔

رات ماموں میاں نے تفصیل سے سمجھایا تھا۔ اکبری منصبدار سید ابوالحسن یہاں آتے ہوئے گڑھ مکتیشر میں کنار دریا سرائے میں ٹکے۔ وہاں ان کی ملاقات ان کے مرشد میاں اللہ بخش گنج بخش سے ہوئی جنھوں نے یہ مقدس تلوار اور نیزہ انھیں عطا کیا۔ ان کو ان کے مرشد شیخ مبارک بالادست جھنجھانوی نے اور ان کو ان کے مرشد میر علی عاشقاںؒ خطاری جونپوری سرائے میر والے عارف باللہ نے کہ زید شہیدؓ کی اولاد میں سے تھے۔

"تم کو معلوم ہے ــــ" ماموں میاں نے پیچوان کی نے رکھ کر اچانک پوچھا۔ "پہلے زمانے میں صوفی لوگ فقرا، اور درویش ایک دوسرے کو سلام کس طرح کرتے تھے؟ ایک کہتا یا علیؑ ــــ دوسرا جواب دیتا مولا علیؑ گویا وعلیکم السلام ــــ اچھا تو میاں اللہ بخش درویش نے یہ شمشیر اور نیزہ سید ابوالحسن منصبدار کو عطا فرمایا اور بولے یاد رکھو کرامت اس شمشیر کی یہ ہے کہ جب کوئی بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہو اس پر داغ پڑ جائیں گے

" سابق میں یہ تبرکات جن صاحب کے پاس تھیں ان کے ورثا میں سے ایک کی زوجہ ثانی ہمشیر حکیم غلام حسین خاں کی تھیں۔ حکیم صاحب نے یہ تبرکات نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کو دے دیں۔ نواب کے ایک اہلکار کو ان کی حقیقت معلوم نہ تھی۔ اس نے تلوار اور نیزہ اسلحہ خانے میں جمع کر دیا۔ اسلحہ خانے میں آگ لگ گئی۔ ایک بزرگ نے خواب میں آکر نواب سے کہا کہ تبرکات فوراً واپس کر دو۔ چنانچہ نواب نے ہاتھی پر طلائی ہودہ کسوا، اس میں تبرکات رکھ بصد عزت و تکریم انھیں واپس کیا۔ یہاں لاکر زیارت کے لئے نکالا گیا تو شمشیر پر چتے نظر آئے بعد چند روز کے غدر پڑا۔ انگریز سرکار نے رعایا کو نہتا کیا۔ یہ مقدس تلوار بھی کلکٹر ضلع نے اپنے قبضے میں کرلی۔ بعد کچھ عرصے کے اسے واپس کیا۔"

جو رہی سو بے خبری رہی۔

فرنگی کلکٹر بھی بے خبر تھا۔

ممانی جان واقف ہیں۔ صندوق کے سرہانے بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہیں۔ ان کی انگریز دادی کے بڑے بھائی فیلڈ مارشل ارل رابرٹ نے اپنی ولایتی تلوار سے افغانستان میں اہلِ ایمان کی کشتوں کے پشتے لگا

دیسے ہے۔ر ۔ ۔ تھا ـــــ لیکن ہم جو واقف ہیں۔

سن بیتالیس میں بھی اس شمشیر پر دھبّے پڑ گئے تھے۔" ضعیفہ نے کہا۔

اس مکان میں کوئی نہیں رہتا؟" میں نے دریافت کیا۔

"سن سینتالیس میں یہاں شرنارتھی آباد کر دیئے گئے تھے۔ وہ چند روز بعد کہیں اور چلے گئے۔"

"ان تبرکات کو کسی کمرے میں مقفل کیوں نہیں رکھتیں؟" میں نے پوچھا۔

"بالی جب بھی اس صندوق کو کمرے میں رکھ کر تالا لگاؤ تالا آپ سے آپ کھل جاتا ہے۔ حکم نہیں ہے۔"

انھوں نے صندوق کا پٹ کھولا۔ احتیاط سے پہلے حضرت شرف الدین شاہ ولایت کے تبرکات نکالے تراشیدہ کہربا کی ایک انگشتری، ایک بڑا کڑا جس پر آیات قرآنی کے اعداد نقش تھے۔ ایک عصا۔ ان کو واپس رکھنے کے بعد قدیم بوسیدہ کپڑے میں لپٹی ایک تلوار نکالی۔ کپڑے کی پٹیاں کھولیں۔ تلوار نیام سے برآمد کی۔ تلوار کا دستہ چوبی تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ سطح پر جگہ جگہ چتیاں سی پڑی تھیں۔ تلوار کی قدامت جن کی سائنٹفک توجیہہ ہو سکتی تھی۔ بھالا بھی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ دو منٹ بعد ضعیفہ نے دونوں چیزیں صندوق میں واپس رکھیں۔ جدِّ اعلیٰ حضرت زید شہید ابن امام زین العابدینؑ کی تلوار اور نیزہ ـــــ کمال ہے۔

صحن میں بڑا سناٹا تھا۔ ممانی دعائیں پڑھنے میں منہمک تھیں۔ تیز دھوپ میں خودرو زرد پھول لہلہا رہے تھے۔ چند کوّے فرش پر ٹہلتے پھر رہے تھے۔

سُر باندی کِنارے مدھو کا کھِل ہے۔ ہرجائی ہوا جنگل جنگل ـــــ

میزبان ضعیفہ اور بہار آرا بیگم کو خدا حافظ کہہ کر ہم لوگ باہر آئے۔ کلّو خاں رکشہ کے پاس اس طرح مستعد کھڑے تھے گویا سید محمد رضا خاں مظفر جنگ کے چوبدار مغرق ہاتھی یا چوڈولے کی نگہبانی کرتے ہوں۔

اسی وقت مہترانی ٹوکرا اٹھائے گلی کی سیاہ کیچڑ میں چھپ چھپ کرتی دوبارہ پاس سے گزری۔ کیچڑ کی چند چھینٹیں اڑیں۔ کلّو خاں توبہ تلا کرتے اُچک کر ایک طرف کو ہو گئے۔ "لاحول ولا قوۃ ـــــ صُبو صُبو ـــــ نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ لے کے کمبخت نے نجس کر دیئے ـــــ ہمارے پاس اتنے کپڑے بھی تو ناں ہیں کہ بار بار بدلتے پھریں۔ توبہ توبہ۔" اپنے شکستہ لباس پر نظر ڈال کر انھوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ اور ہم لوگوں کو سوار کرا کے گلی سے نکلے۔

۲۔ قائم کی بیریاں

شہر ہماری طرف بڑھتے رہے اور ہم میں شامل رہے اور ہمارے پاس سے اور ہمارے اندر سے

ہو کر نکل گئے ۔ ہم نے بہتے دریا کے کنارے خیمہ کیا تھا۔

۱۸۵۴ء میں وہ کوٹھی خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای۔ نے لکھنؤ سے آکر پنجاب جانے سے قبل بنوائی تھی۔ پوری URBUN ESTATE تھی۔ وسیع احاطہ۔ متصل فیض گنج۔ ایک طرف دوکانوں کی قطار۔ احاطے کا پھاٹک اور اونچی دیوار اب بھی باقی ہے۔ احاطہ، میر قائم علی کی ایک پڑپوتی ثروت آرا بیگم کو ورثے میں ملا تھا۔ کوٹھی ثروت آرا کی بہن ندر سجاد حیدر کو۔ دوکانیں ایک پڑپوتے میر حسنین کو مل گئیں۔ سڑک کے اس پار عین مقابل میں قلعے کی سفید مسجد آم کے گھنے درختوں میں پوشیدہ۔ کچھ فاصلے پر قلعے کی شکستہ فصیل۔ اس کے احاطے میں گورنمنٹ کالج کوٹھی کے عین سامنے چوراہے کے ادھر میر قائم علی کے ایک بڑے جاگیردار کزن کا شہری مکان۔ اس مکان کے بالاخانے کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازے میں گرمیوں کی بھری دوپہروں میں سامنے کا پر فضا منظر بیحد سہانا معلوم ہوتا تھا۔ کبھی اودا، کبھی نیلا، کبھی ہرا، کبھی نارنجی، مینا منظر سب سے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میر قائم علی کہیں پر بیریوں کے درخت بھی لگائے تھے۔ وہ محلہ اب تک قائم کی بیریاں کہلاتا ہے۔ صاف ستھری گلیاں، صاف ستھرے محلے۔ اس شہر آئینہ کے اس رنگ برنگے شیشوں والے مکان میں صبح شام بھشتی زینے کے دروازے پر آواز لگاتا ——— پردہ کر لیجئے۔ کبھی تیسرے پہر بھونا آتی اس کا آدمی یہی ہانک لگاتا ——— اس وقت آنگن میں نیم تلے بھائی مہدی اپنی انگلوٹنگی گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑ دیتے۔ یہ نظام کس طرح بدلے گا۔ وہ جوش سے کہتے۔ تین ہزار سال سے ایک پوری آبادی کو NIGHT SOIL اٹھانے کے کام پر لگا رکھا ہے۔ اور خود کو مہذب کہتے ہیں۔ خود ہمارے تہذیب کے بھائی علی مہدی ہمیشہ NIGHT SOIL ہی کہتے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد بھائی علی مہدی خود تو امریکہ جا بسے وہ آبادی اس طرح NIGHT SOIL اٹھایا کی۔

آزادی کے پندرہ بیس سال بعد تک قائم کی بیریوں پر خاصی بے رونقی اور اداسی چھائی رہی ۔ پچھلے چند سال سے اس پورے شہر پر ایکدم زردروں کی بہار آگئی تھی۔ تین سال ادھر میں وہاں گئی تو ایک نواب زادہ کزن مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے۔ اجی اب تو میں بھی سماوار ایکسپورٹ کر رہا ہوں۔ منجھلے بھیا کراچی سے آکر بتا جایا کرتے تھے کہ ان کے ہر لڑکے لڑکی کے پاس الگ الگ TOYOTA موٹریں ہیں۔ ہم دم بخود سر جھکائے سنا کرتے تھے۔ تو بھنو ہم بھی اس کاروبار میں لگ گئے۔ پرانی نکال کر نئی ایمبیسڈر خریدلی۔ اب انشاء اللہ سامنے والی زمین جو خالی پڑی ہے اس پر شوروم بنواؤں گا اور جو باہر سے ——— ابجی مڈل ایسٹ، یوروپ، امریکہ سے برتنوں کے خریدار آویں گے ان کے ٹھہرنے کے لئے گیسٹ ہاؤس...."

مصر قدیم میں موت کا تصور یوں تھا کہ موت کا ملاح نیل کی موجوں پر اپنی کشتی کھیتا شمال کی طرف ہے اور جنوب کی سمت منہ کئے رہتا ہے۔ روحوں سے لدی کشتی الٹی سمت کو بہتی رہتی ہے۔ سامنے جو دریا بہہ رہا ہے

، پر ایسی کشتیوں کی ایک قطار گذرتی جا رہی ہے۔ جب کشتیاں آگے جا کر موت کے دھندلکے میں کھو جاتی ہیں ایک
قطار نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ مردے آدھی رات کو قبروں سے اٹھ کر
SYNOGOG میں جا کر عبادت کرتے ہیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ پرسوں جلے ہوئے کارخانوں میں رات بھر کھٹ
ٹ ہوائی۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ جیسے جلد از جلد سارا مال تیار کر کے نقش و نگار سے مکمل پیک کر کے دریا پر پہنچا
جائے جہاں خالی بجرے منتظر تھے اور ان کے ملاح خاموشی سے جنوب کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کوٹھی میر قایم علی کی جگہ اب دو منزلہ عمارت کھڑی ہے جس میں متعدد ڈاکٹر رہتے ہیں۔" ابھی ہم نے تو
ی سنا ہے کہ دو مریض عورتیں اندر گئیں زندہ واپس نہ آسکیں۔ کسی نے کہا۔ سفید مسجد آم کے گھنے درخت،
رت خالہ مرحومہ کے احاطے کا پھاٹک۔ سامنے رنگ برنگے شیشوں والا مکان، دور قلعے کی فصیل، بہتا دریا، سب
یں اسی طرح موجود تھیں۔ شاعر کزن جو قصبہ دانشمنداں سے آئے ہوئے تھے حسبِ عادت آسماں کو دیکھ کر
لے ابھی ابھی کس کس بات کا غم کرو۔

ہم لوگ کالج کے احاطے میں داخل کر فصیل کی سمت چلے۔ شاعر کزن بولے ——— HOLOCAUST
فوراً بعد کلکتے کے اس بے حد اہم مشہور انگریزی اخبار کا مسلمان ایڈیٹر یہاں آیا تھا۔ مجھ سے پوچھا کیا آپ لوگ
ں سے چلے جائیں گے؟ میں نے جواب دیا اندلس سے جب لوگ نکلے مراقش پہنچ کر اپنے اندلسی مکانوں کی
یاں دیواروں پر ٹانگ دی تھیں کہ ایک روز واپس جائیں گے، کبھی نہ جا سکے۔"

"یہ اندلس والی سچویشن ہرگز نہیں ہے۔ ایک رپورٹر بولا۔ میں نے کہا حضت سب سچویشن جہاں
، جان و مال کی تباہی، ہلاکت اور خونریزی کا تعلق ہے یکساں ہیں۔ مشرقی پاکستان کی سچویشن کیا تھی؟ جو لوگ
ں سے جان بچا کر کٹھمنڈو اور کلکتہ پہنچے تھے کیا وہ اندلس سے نکلے تھے؟ ان کو ان کے ہم مذہبوں نے مارا اور
اتھا ——— اس نے پوچھا اب کیا ہوگا۔ میں نے کہا میں تری کال درشنی نہیں ہوں کہ بھوت، ورتمان
ش کا حال ایک ساتھ بتا دوں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ دھوپ چھاؤں۔ اسی طرح گاڑی چلتی رہے گی جب تک سارا
تی نظام نہیں بدلتا ———"

ہم لوگ کالج کے احاطے میں سے ٹہلتے ہوئے فصیل تک پہنچے۔ گذشتہ سال ایک شام کو میں یہاں شاعر
ن اور نواب زادہ کزن کے ساتھ چہل قدمی کے لیے آئی تھی۔ ایک دلچسپ منظر دیکھا تھا۔ فصیل کی اندرونی دیوا
ایک طاقچے میں چراغ روشن تھا، پھول رکھے تھے، اگربتی سلگ رہی تھی۔ یہ کسی پیر کا چلّہ تھا۔ اس کے نیچے
دوسرے سے دور کچھ فاصلے پر دو غریب مسکین صورت آدمی چپ چاپ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک دھوتی
ں۔ ایک بگی داڑھی والا۔ یہ دونوں کالج کے چپراسی ہیں۔ شام کو دونوں یہاں بیٹھتے ہیں۔ آپس میں معا

ہے۔ اس چلّے کے مجاور بن گئے ہیں۔ ہندو مسلمان جو چڑھاوا چراغی کا نذرانہ لاتے ہیں اسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔" نواب زادہ کزن نے محظوظ ہو کر بتایا تھا۔

میں کچھ دیر کھڑی دیکھا کی۔ دونوں صبر سے ان چند پیسوں کی آس لگائے بیٹھے تھے جو کوئی عقیدت مند اس طاقچے پر چڑھا جائے۔

"تمھیں جان یم کی بات یاد ہے جس کا میں نے پچھلے سال نواب مظفر جنگ کی زمین اور مارواڑی کی جوٹ مل کے سلسلے میں تذکرہ کیا تھا پچھلے سال ماموں میاں کے ہاں؟" اس وقت قلعے کی شکستہ فصیل کے نیچے میں نے شاعر کزن سے پوچھا۔

"نئے کاروباری طبقات کے مفاد ــــــ؟" اس نے کہا۔

"ہاں لیکن اگر کم از کم اس شہر کے لوگ ان دونوں مفلس چپراسیوں سے عقل سیکھ لیتے کہ نئی خوشحالی میں جو نفع ہو اسے مل بانٹ کر کھاؤ ــــــ وہ دونوں ہیں کہاں؟"

"کون ــــ؟"

"وہی دونوں خود ساختہ مجاور جو گذشتہ برس یہاں دھونی رمائے بیٹھے تھے۔"

"شاید زندہ ہوں۔ انسان بڑا سخت جان ہے۔"

"اور شاید پھر یہاں چراغ جلا کر بیٹھ جائیں۔"

"جی ہاں۔ انسان بڑا سخت جان ہے۔ چلئے قایم کی سیڑیوں میں چھبن آپا کے ہاں۔ ان کا بڑا لڑکا کویت سے آیا ہوا ہے۔ اس کی منگنی کی دعوت ہے۔" شاعر کزن نے گھڑی دیکھ کر یاد دلایا۔

قایم کی سیڑیوں کے اس مکان میں بڑی چہل پہل تھی۔ انگنائی زرق برق کپڑوں میں ملبوس مہمان بیبیوں سے بھری ہوئی تھی۔ جس وقت ہم لوگ وہاں پہنچے اسی وقت چھبن آپا کا چھوٹا لڑکا ڈنمارک واپس جانے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو رہا تھا۔ سب ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔

"سدھارو۔ امام ضامن کی ضامنی اور بی بی سیدہ کی چادر میں دیا ــــــ" لڑکے کی دادی کی جھرجھری آواز بلند ہوئی۔

اتنے میں پچھلے دروازے کی کنڈی کھڑکی ــــ اور ایک کرارا نعرہ ــــــ "اجی میں نے کہا پردہ کرلو۔"

"توبہ ہے۔ نگوڑے کو عین اسی وقت آنا رہ گیا تھا۔ تحن بیٹے دس منٹ رک جاؤ ــــــ" دادی نے جھنجھلا کر کہا۔ "دور پار۔ چھائیں پھوئیں۔"

ڈھاٹا باندھے، ٹوکرا اور جھاڑو اٹھائے ذرا لنگڑاتا ہوا مہتر آنگن میں داخل ہوا۔

"اے کلو! تم صبح نہ آئے ـــــ" ایک اصیل نے شکایت کی۔

"کیا کرتا۔ تلوے میں شیشہ چبھ گیا۔ زمین پاؤں تلے سے نکل گئی۔ اتنی تکلیف تھی۔ دو گھنٹے دواخانے کی لین میں کھڑا رہا۔ اور صاحب کان کھول کر سن لو۔ میرا نام کلوا نہیں کلو خاں ہے۔"

کلو خاں ـــــ میں چونکی۔ انھوں نے جھاڑو ٹوکر زمین پر رکھا۔ بغل سے نکال کر دستانے پہنے۔ پھر جھاڑو ٹوکرا اٹھایا اور بیت الخلا کی طرف سر جھکائے اس طرح چلے جیسے ان کے بزرگ سراج الدولہ کے ساتھ پلاسی ـــــ سے لوٹے تھے۔

"کلو خاں ـــــ" میں نے کھوکھلی آواز میں دہرایا۔

میری للکار پر وہ ٹھٹھکے۔ پلٹ کر دیکھا۔ ڈھاٹا منہ ناک پر سے اس طرح سرکایا گویا میدان جنگ میں ڈٹے ہوں اور چہرے پر سے خود اٹھاتے ہوں۔

"بات گے ہے بٹیا ـــــ" انھوں نے کھنکار کر کہا۔ "اس قیامت کے بعد سے اس شہر کے خاکروبوں نے بائیکاٹ شروع کر دیا ہے گا۔ جھگڑا تو انھی کا شروع ہوا تھا۔ کیا کرتے۔ تیس پینتیس آدمی اس کام میں لگ گئے۔ میں بھی شہر آ گیا۔ اس میں پیسہ بہت مل جاتا ہے۔ رکشہ کھینچنے، ٹھیلہ چلانے سے کہیں زیادہ بڑھایا ہے۔ پھیپھڑے ناکارہ ہو گئے۔ رکشا نہ چلائی جاتی۔ بارہ جنوں کا ٹبر، کمانے والا اکیلا میں۔ دوسری بات گے ـــــ یہ جتنے باہر کے ملک ہیں اسلامی اور کرسچین، ان میں بھی تو یہ کام لوگ باگ خود ہی کریں ہیں۔"

میرا کوئی جواب نہ پا کر چند سکنڈ کھڑے رہے۔ پھر بولے ـــــ "اور آپ اپنے ماموں ممانی سے ملنے نہ گئیں؟ مل آئیے۔ چراغ سحری ہیں دونوں ـــــ"

"انھوں نے آپ کو کیسے آنے دیا ـــــ؟"

"ان کو بتایا ہی کاں ـــــ؟ چپکے سے سٹک لیا۔ آپ بھی نہ تبلائیے گا ـــــ اچھا اللہ بیلی۔"

ڈھاٹا منہ ناک پر واپس کھسکا کر وہ لنگڑاتے ہوئے غسل خانوں کی سمت چلے گئے۔

کبھی عبرانیوں نے قاصیوں کو پانی بھرنے اور لکڑی چیرنے والے بنایا تھا کبھی قاصیوں نے عبرانیوں کو۔

نوشیرواں عادل کے محل میں آگ روشن ہے۔

اس نے بھیم پلاسی کے سُر اتنے اونچے کیے کہ شیشہ ٹوٹ گیا۔

الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے۔

اس شہر آئینہ سے جواب شہر کا بوس ہے۔ چند میل دور اس قدیم قصبہ دانش منداں میں اپنے مغلیہ مکان کے اندر سرو کے نیچے آرام کرسی بچھائے والدہ مرحومہ کے کزن اور نوکتاش جواب بھی لال قلعے کی زبان کے چھپیٹے میں

ہیں، افسردگی سے کہیں گے ـــــ عبرت ۔ بے چارہ کلو بھی آخر رجعی بن گیا۔

اور اسی قصبے کی ایک اجاڑ حویلی کے دالان میں ایک داغ داغ شمشیر کے صندوق کے سامنے وہ بوڑھی عورتیں شاید سرنگوں بیٹھی ہوں۔ بہار آرا بیگم اور ان کی پڑوسن۔

یا صاحب العصر والزماں۔ الاماں۔ الاماں۔ الاماں۔

۲۲ جنوری ۱۹۸۱ء کا لکھا ہوا چھبن آپا کی لڑکی کا خط۔

باجی جان تسلیم۔ یہاں کے حالات معمول پر آرہے ہیں۔ کاروبار زور سے شروع ہو گئے ہیں۔ پہلے جیسا ماحول نظر آتا ہے لیکن ابھی تلاشیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ انشاء اللہ اب حالات صحیح رہیں گے کیوں کہ لوگ کاروبار میں مصروف ہیں۔ انھیں افواہیں سننے کی بھی فرصت نہیں۔ چند روز قبل ایک افواہ سارے شہر میں گشت کر رہی تھی کہ محلہ لال باغ کے فساد میں شہید ہونے والے بنّن خاں کی روح رات کو آکر اپنے دشمنوں سے بدلہ لیتی ہے۔ لیکن چند روز بعد اس افواہ نے دم توڑ دیا۔ پڑھے لکھے لوگ بھی یقین کرنے لگے تھے۔ اب سوچ کر ہنستے ہیں۔

کلوا حلال خور بھی خیریت سے ہے۔ سلام لکھواتا ہے۔ ◻

انتظار حسین
پاکستان

انتظار

وہ گلی کے اس نکڑ پہ سکوٹر لئے کتنی دیر کھڑا رہا۔ کتنے انتظار کے بعد وہ آئی اور کتنی گھبرائی ہوئی تھی۔

"بہت دیر لگائی۔"

"بہت مشکل سے نکل کے آئی ہوں۔ اصل میں آج ہمارے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ بہت بہانے کرنے پڑے۔" پھر ادھر ادھر دیکھ کر گھبرائے لہجہ میں بولی۔ "کوئی دیکھ نہ لے۔"

"تم آج گھر سے نئی تو نہیں نکلی ہو۔"

"وہ نکلنا اور ہوتا تھا۔ اس طرح تو کبھی نہیں نکلی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس ملاقات کو نارمل طریقہ سے نہیں لے رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو کہ یہ چاہنے والوں کی ملاقات ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسی باتیں کریں گے تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔"

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ تم اس ملاقات کو کسی دوسرے رنگ میں مت لو۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اس ملاقات کو کوئی رومانٹک ملاقات سمجھ رہی ہوں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں ورنہ خواہ مخواہ مجھے اپنے آپ کو ایک رومانٹک ہیرو تصور کرنا پڑے گا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "کہیں واقعی آپ اپنے کو ہیرو تو نہیں سمجھ رہے۔"

"ہیرو اگلے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ سکوٹر کے ساتھ کون آدمی اپنے آپ کو ہیرو تصور کر سکتا ہے۔"

"اچھا یہاں سے تو سرکو۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔"

"دیکھنے کی فرصت بھی اگلے زمانے ہی میں تھی۔ تبھی تو عشق کا آنا چرچا ہو جایا کرتا تھا۔ آج کی مصروف زندگی میں کسی کو دیکھنے کی فرصت کہاں ہے۔"

"اچھا جلدی کریں۔ اور چلنا کہاں ہے۔"

"اچھا بیٹھو۔ ایسا کرتے ہیں کہ شہر سے نکل کر کسی خاموش سے چائے خانے میں بیٹھتے ہیں۔"

وہ گھبرائی "میں بہت دور نہیں جاؤں گی۔"

"پھر یہیں قریب میں کہیں بیٹھے جاتے ہیں۔"

"مگر کوئی دیکھ نہ لے۔"

"جب ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ دور چل کر کسی خاموش جگہ بیٹھتے ہیں۔"

"مگر سکوٹر پہ آپ کیوں آئے ہیں۔"

"اس لئے کہ میرے پاس کار نہیں ہے۔"

سکوٹر کے پیچھے بیٹھتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی "سکوٹر پہ میں اس طرح بیٹھی ہوئی کیسی لگوں گی۔"

"اس طرح جھجکو گی تو کسی دوسرے کو تو بعد میں شک ہوگا، پہلے مجھے خود اپنے آپ پر شک ہونے لگا کہ میں شاید تمھیں......"

اس نے فوراً بات کاٹی "بس بس جلدی کرو۔"

"تو پھر جلدی بیٹھو۔"

وہ سکوٹر کی عقبی نشست پہ بیٹھی۔ اس نے آگے بیٹھ کر سکوٹر سٹارٹ کیا۔ مختلف بازاروں سے وہ کس تیزی سے گذرا۔ بازاروں سے گذر کر جب خاموش کشادہ سڑک پر آیا تو اس نے رفتار اور تیز کر دی۔

"آہستہ چلائیے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" ڈرنے کی بات بھی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ کسی کے ساتھ سکوٹر پر اس طرح بیٹھی تھی۔ اور سکوٹر اتنا تیز جا رہا تھا کہ وہ جیسے اڑی جا رہی تھی۔ جیسے کسی صبا رفتار گھوڑے پر شہسوار کی کمر میں بازو حمائل کئے بیٹھی ہے۔ گھوڑا سنسان راہوں پر سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اس کی لمبی زلفیں ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں اس تندرست کمر کو اور زیادہ شدت سے جکڑ لیا۔

چلتے چلتے وہ ایک سنسان مقام پر پہنچے۔ سامنے ایک عمارت کھڑی نظر آئی۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے اس دروازے پر دستک دی "کوئی ہے؟"

ایک سفید ریش نے اندر سے جھانکا "اس غیر وقت میں یہاں کون آیا ہے۔"

"اے شخص ہم مسافر ہیں کہ ہرج مرج کھینچتے یہاں ایسے وقت میں پہنچے ہیں جب شام پڑ رہی ہے اور رات سر پہ کھڑی ہے۔ اس سنسان بیابان میں یہ دروازہ نظر آیا۔ گویا امید کی کرن نظر آئی۔ سوچا کہ کوئی سرائے ہے یا کسی مہربان کا دولت کدہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ در ہماری دستک پہ وا ہو اور چند سے سر چھپانے کے لئے جگہ ملے۔"

وہ در بشاشان پر وا ہوا۔ اور جب انھوں نے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ شمعیں روشن ہیں، فانوس

کھلاتے ہیں۔ مسندیں بچھی ہیں۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ سامان ناؤ نوش ہے۔ خدام دست بستہ کھڑے ہیں۔ خادمائیں جا رہی ہیں۔ سفر کی ساری تکان دم بھر میں اتر گئی۔ جی باغ باغ ہوا۔ وصل کا شوق تیز ہوا۔ لب سے لب ملے۔ سینے سے سینہ ملا۔ یک جان دو قالب۔

جب مرغ نے بانگ دی تب وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اب اس کی آنکھیں کھلیں۔ گھر کی یاد آئی۔ خوف سے لرزنے لگی۔ تب اس نے دلاسا دیا کہ جان من، تشویش مت کرو۔ میرا رہوار صبا رفتار ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک جھپک گھوڑے پہ زین کسی، لپک کر خود بیٹھا، آغوش میں لے کر اسے بٹھایا۔ گھوڑے کو ایڑ دی۔ اس برق رفتار نے اشارے کو فوراً سمجھا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

جدائی کے مقام پر پہنچ کر وہ گلے ملے ایک دوسرے کے آنسو پونچھے۔ وعدے وعید ہوئے۔

وہ آبدیدہ ہو کر بولا "کیا یہ ہماری آخری ملاقات تھی؟"

"نہیں۔"

"پھر مجھے جاننا چاہیے کہ کب اور کیسے ملاقات ہوگی۔"

وہ چپ رہی۔ تب اس نے تجویز پیش کی "کل شام پڑے۔ یہیں اسی مقام پر۔ ٹھیک وقت پر آؤں گی ما؟"

"اگر میں ٹھیک وقت پر نہ آئی تو تم چلے جاؤ گے؟"

"نہیں۔ انتظار کروں گا۔"

"کب تک انتظار کرو گے۔"

"جب تک تم نہیں آؤ گی۔"

"فرض کرو کہ میں عمر بھر نہ آؤں۔"

"میں عمر بھر انتظار کروں گا۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنسے۔

"اچھا فرض کرو کہ میں نہ آؤں۔"

"نہیں تم آؤ گے۔"

"فرض کرو۔"

"انہونی کو کیسے فرض کر لوں۔ آؤ گے اور مقررہ وقت سے پہلے آؤ گے اور میرے آنے تک انتظار کرو گے۔

"ہماری وفا پر اتنا اعتماد ہے۔"

دونوں پھر کھلکھلا کر ہنسے۔ کتنا ہنسے اور کتنی ہنسی خوشی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

مگر ادھر اور ہی گل کھلا تھا۔ آئے مہمانوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا تھا۔ خالہ بی کہہ رہی تھیں کہ "فرخندہ کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"مگر خالہ بی، میں تو ..."

"میں تو کیا" خالہ بی نے فوراً بات کاٹی "تمہارے امتحان ابھی بہت دور ہیں۔ بہت وقت پڑا ہے پڑھنے کے لئے۔ میں جلدی واپس بھیج دوں گی۔"

اس نے بہت حیلے بہانے کئے۔ کوئی حیلہ بہانہ نہ چلا۔ جانا اس کا ٹھہر گیا تھا۔

وہ وقت مقررہ پر اس مقام پر پہنچا اور انتظار کی گھڑیاں گننے لگا۔ گھڑیاں گذرتی گئیں۔ اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔ کھڑا رہا۔ کھڑا رہا۔

ایک نظر شناس نے کہ زمانے کا گرم سرد دیکھے ہوئے تھا۔ اسے تاڑا۔ اس کے پاس آیا اور بولا "اے جوان میں دیکھتا ہوں کہ روز تو یہاں کوئی امید لے کر آتا ہے، کھڑا رہتا ہے، راہ تکتا رہتا ہے، جانے کس کی اور پھر افسردہ و رنجور واپس چلا جاتا ہے۔ کچھ کہہ کہ تو نے اپنا یہ حال کیوں بنایا ہے اور وہ کون ہے جس کا تو یہاں آکر انتظار کرتا ہے۔"

اس نے ایک آہ سرد بھری اور کہا "اس کا جسے ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی آرزو ہے۔"

اس نظر شناس نے غور سے نوجوان کو دیکھا اور ہمدردانہ بولا "اب میں سمجھا۔ کسی نازنین کے تیر نظر نے تجھے گھائل کیا ہے۔ اے جوان اپنی جوانی پہ رحم کھا اور اس خیال خام سے باز آ۔ ایک دفعہ دیکھے کو غنیمت جان۔ دوسری دفعہ دیکھنے کے خیال سے درگذر ورنہ جان لے کہ دربدری خاک بسری تیرے مقدر میں لکھی گئی۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولا "اے میرے مشفق، یہ تو کیا کہتا ہے۔ میں اس کے وعدے کو کیوں کر فراموش کر سکتا ہوں۔ صبح رخصت ہنوز میری آنکھوں میں رم رہی ہے۔ کس دکھے دل کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ کس خلوص سے اس نے شام پڑے اسی مقام پر مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔"

وہ شخص تلخ ہنسی ہنسا "نادان نازنینوں کے وعدوں پہ مت جا۔ عورت اور وقت جا کر واپس نہیں آیا کرتے۔"

انتظار کی گھڑیاں اس شام اس پر بہت سخت گذریں۔ جوں توں کر کے اس نے وہ گھڑیاں گذاریں۔ اور جب پلٹا تو اسے لگا کہ وہ ڈھے چکا ہے۔

"عورت اور وقت" وہ بڑبڑایا۔ دن بھر وہ ایک کرب کے عالم میں رہا۔ انتظار اسے اب لاحاصل نظر آرہا تھا۔ اے مرے دل، اس راہ جانا اور اس کی راہ تکنا بے سود ہے۔

پھر دن ڈھلے اس نے اپنے آپ کو پھر اسی مقام پر پایا، اسی شہر سنگ دل کے کنارے، اس شام بھی اس نے بہت انتظار کھینچا۔ تھک کر سکوٹر پہ بیٹھا بڑبڑایا۔ عجیب لڑکی ہے۔ آج بھی نہیں آئی۔ سکوٹر اسٹارٹ کیا اور واپس چلا گیا۔ □

جیلانی بانو
حیدرآباد

ظلِ سبحانی

سا ــــ رے ــــ گا ــــ ما ــــ پا ــــ دھا ــــ نی

ظلِ سبحانی بھیرویں کے سُروں پر پلکیں جھپکانے لگے۔

محل کا بوڑھا موسیقار آج اپنے حجرے کی بجائے ظلِ سبحانی کی خواب گاہ کے نیچے بٹھایا گیا تھا۔ تاکہ پَو پھٹنے سے پہلے بھیرویں کے سروں پر ظلِ سبحانی کو جگا سکے۔

ہوا یوں کہ کل دربارِ عام میں محل کے ایک شاعر نے نکلتے سورج کے حسن پر اتنی دل نشین نظم سنائی تھی کہ جہاں پناہ نے نکلتے سورج کا حسن ملاحظہ فرمانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

اس خبر کے عام ہوتے ہی سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ دربارِ عام کے جھروکے سے نظر آنے والے در و بام کو خوبصورت بنانے کی کاروائی شروع کر دی گئی۔ بعض اونچے پرانے مکانوں کو گرا دینا پڑا، تاکہ ظلِ سبحانی سورج کے حسن کو کسی رکاوٹ کے بغیر دیکھ سکیں۔ پرانی سڑکوں اور بدصورت عمارتوں پر رنگ کیا گیا۔ محل کے سامنے سے گذرنے والی ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے لئے پولیس کے خصوصی دستے ساری رات انتظامات میں مصروف رہے۔

پھر جب زلفِ شب کمر تک لہرانے لگی تو بوڑھے موسیقار کی آواز محل کے اندھیرے میں ایک ننھے سے تارے کی طرح لَو دینے لگی۔

سا ــــ رے ــــ گا ــــ ما ــــ پا ــــ دھا ــــ نی۔

بھیرویں کے سات کومل سُر مل کر ایک رس ساگر بنے اور سارے محل میں بہنے لگے۔ بھیرویں کے سُروں کا یہ سمپورن سنگار روپ اندھیرے میں جھلملانے لگا تو گہری تاریکی میں لپٹا ہوا سورج بھی جیسے بے کل ہو اٹھا اور ظلِ سبحانی نے اپنے پاس لیٹی ہوئی عورت کو لات مار کے سونے کے نقشی چھپر کھٹ سے ڈھکیل دیا اور زور سے چلائے۔

"یہ کیسا شور ہے ــــ؟

" ظلِ سبحانی! آج حضور کے حکم کے مطابق محل کا بوڑھا موسیقار عالی جاہ کو صبح کا راگ گا کر جگا رہا ہے تاکہ عالی جاہ نکلتے سورج کا خوبصورت نظارہ کر سکیں۔"

" تو کیا سورج نکل گیا ــــــ ؟ انھوں نے غصہ میں ریشمی تکیے کو پیٹ ڈالا۔"

" جی ــــ جی ــــ حضور ــــــ اب نکلنا ہی چاہتا ہے۔"

اصل بات یہ ہے کہ سورج تو ابھی محل سے بہت دور تھا۔ مگر بوڑھے موسیقار کی گنگناہٹ نے چاروں اور ایک جرت سی لگا دی تھی۔

سا ــــ رے ــــ گا ــــ ما ــــ پا ــــ دھا ــــ نی

" نہیں، جب تک ہم اسے دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہو جاتے سورج نہیں نکل سکتا!"

" جو حکم عالی جاہ،" وزیر اعظم نے دونوں ہاتھوں سے ڈھیلی ڈھالی پتلون کو اوپر سرکایا، سامنے کی طرف جھکے اور پھر الٹے پیروں ہوم منسٹر کے پاس دوڑے۔

" سرکار کا حکم ہے کہ جب تک وہ تیار نہ ہو جائیں، آج سورج نہ نکلے۔"

" ہائیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے ــــــ ؟ ہوم منسٹر نے اپنی گنجی چندیا پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ اور پھر کچھ سوچ کر وہ سر پر پانو رکھ کر، بھاگے کلچرل آفیئرز کی منسٹر کے پاس۔

" بھئی یہ چاند، سورج، ستارے، تو سب کلچرل آفیئرز کی منسٹری کے تحت آتے ہیں نا ــــــ ؟

" چاند، سورج، ستارے ــــ ؟ ہائے اللہ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟

کلچرل آفیئرز کی منسٹر ایک خاتون تھیں، جو دن رات اپنی منسٹری میں مصروف رہتیں۔ یعنی آئینے کے سامنے بیٹھی اپنی بھوئیں، پلکیں اور زلفیں سنوارا کرتی تھیں۔

" ہاں ہاں، بالکل ہے ــــــ" ہوم منسٹر نے پاؤں پٹک کر کہا۔

" چاند، سورج، ستارے، یہ سب اسٹیج ڈراموں اور کلچرل پروگراموں ہی میں تو کام آتے ہیں، تو میں ظلِ سبحانی کا حکم ہے کہ آج جب تک وہ تیار نہ ہو جائیں سورج نہ نکلے۔"

" اوئی اللہ ــــ" کلچرل آفیئرز کی منسٹر نے کمر پر ہاتھ رکھا اور انگلی ناک پر ٹکائی ــــــ" نکلتے سورج کو میں کیسے روکوں گی جی ــــــ ؟

" مت روکو ــــــ اپنی منسٹری سے بھی ہاتھ دھو لو۔"

سورج کی باگ ڈور کلچرل آفیئرز کے منسٹر کو سونپ کر، وہ دوڑے دوسرے انتظامات کی دیکھ بھال کرتے۔"

"اے ہے! اب کیا کروں! شریمتی منسٹر نے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا اور پھر انھیں ایک ترکیب سوجھی۔ ابھی فلم ڈویژن والوں کو فون کرتی ہوں کہ نکلتے سورج کی ایک فلم لاکر محل کے سامنے دکھادیں۔

اب وہ پھر اطمینان سے میز کے سامنے بیٹھ کر اپنی لپ اسٹک درست کرنے لگیں۔ اتنی دیر میں دھیمے دھیمے بھیرویں کے سُر ظلِ سبحانی کو دس نوکروں کی مدد سے تیار کرواکر جھروکے تک لے آئے تھے۔ خواب گاہ سے جھروکے تک تمام راستے کو سُرخ گلابوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ جھروکے کے بیچ میں سونے کے فریم والی سُرخ مخمل کی گدے والی بڑی سی کرسی بچھی تھی۔ آس پاس فرانسیسی عطر میں ڈوبے ہوئے مورچھل ہاتھوں میں تھامے دو خادمائیں پتھر کی مورت بنی کھڑی تھیں۔

درِ تانا دیرے نادیم تانہ نا

یالالی یالالی یالوم تانا دیرے نا

موسیقار اب اجالے کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ بہلاوے دے رہا تھا۔ بجلی کی طرح کبھی ادھر چمکتا کبھی ادھر دمکتا۔

"ملاحظہ فرمائیے عالی جاہ، یہ کرنوں کا راجہ اب اجالے کی رتھ پر سوار ہوکر ہولے ہولے ہماری اُور بڑھ رہا ہے۔" شاعر ایک کونے میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اپنی رنگین بیانی سے اس منظر کو اور خوبصورت بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈگمگاتے قدموں اور کانپتے ہاتھوں سے، کئی خادموں کی مدد سے ظلِ سبحانی مسند پر جلوہ نشین ہو گئے۔

"یہ یہ سورج کدھر سے نکل رہا ہے ــــ؟ رات کی سرشاری کے کڑوے ذائقے اور تھکادینے والی رنگینیوں کی وجہ سے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے۔

"جی ــ جی سرکار ــ؟ وہ ــ وہ ــ" وزیر اعظم نے سٹپٹاکر ہوم منسٹر کی طرف دیکھا۔ ہوم منسٹر بھی نہیں جانتے تھے کہ سورج کس طرف سے نکلتا ہے۔ اس لئے انھوں نے فوراً اربن ڈیولپمنٹ کے ڈایریکٹر کو ٹھوکا دیا۔ اور اس نے جلدی جلدی شہر کا نقشہ سامنے پھیلا کر، ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"مشرق سے عالی جاہ۔"

"مہ مہ مشرق سے ــ ؟ ظلِ سبحانی نے گرج کر پوچھا۔

"مہ مہ مشرق سے کیوں ــ؟ ہمارے ملک کا سورج مشرق میں کیوں جاتا ہے ــ؟ ادھر تو ہمارے دشمن کا علاقہ ہے!

"عالی جاہ! اس وقت اپنا چہرہ مبارک سورج کی طرف رکھیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ نور کی ایک چادر سی آسمان پر تنی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔

سورج تو حضور روز مشرق ہی سے نکلتا ہے۔ مغرب میں ہی ڈوبتا ہے۔"
شاعر نے بڑی عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔
درتانا دیرے نادیم دیم تانہ نا ــــــ
موسیقار کی آواز سے جیسے روشنی کی پھوار سی پڑنے لگی تھی۔
" یہ مغرب میں ڈوبتا ہے روزانہ! یعنی کے یورپ میں! ظلِ سبحانی نے اپنی بوجھل آنکھیں کھول کر ہکلاتے ہوئے شاعر سے پوچھا۔
" مغرب کی بے حیائی اور بے دینی دیکھنے کے لئے سورج روز رات کو وہاں رنگ رلیاں منانے جاتا ہے ــــ ؟ ہوم منسٹر ــــ !
ہوم منسٹر تھر تھر کانپتے، اپنی گنجی چندیا کو سامنے جھکائے، ہاتھ جوڑے آگے بڑھے۔
" ہوم منسٹر! آج سے ہمارے ملک کا سورج مشرق سے نکلے گا اور نہ مغرب میں ڈوبے گا ــــ کیا سمجھے ــــ ؟
" جی سمجھ گیا جہاں پناہ۔" وزیر اعظم نے جلدی جلدی فرمان مبارک کو سنہرے فریم لگے قرطاس پر سونے کے قلم سے لکھتے ہوئے کہا:
" ہاں! ما بدولت اپنے ملک میں بے دینی اور بد اخلاقی پھیلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ انھوں نے تمام درباریوں کو داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:
ان کے پیچھے وزیر اعظم، ہوم منسٹر، وزیر دفاع، کوتوال شہر، اور تمام اہم وزیر ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے تھے کہ کیا پتہ کس وقت، کس کی طلبی ہو جائے وہ سب دل ہی دل میں شاعر کو کوس رہے تھے، جس نے آج رات ان سب پر نیند حرام کر دی تھی۔
حضور! اس منظر کے لئے ایک شاعر نے کہا ہے کہ ؎

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

شاعر نے ہاتھ اٹھا کر جھومتے ہوئے شعر سنایا۔
" یہ یہ کس کا شعر ہے ــــ ؟ ظلِ سبحانی اچھل پڑے۔ نعوذ باللہ، یعنی اگر رسول نہ ہوتے تو ایک پیالی کافی سے کام چل جاتا اس ملعون شاعر کا!
کون ہے وہ دہریہ ــــ اسے ہمارے سامنے پکڑ کر لاؤ۔

"جی مناسب عالی جاہ" ہوم منسٹر سر پہ پیر رکھ کر اس شاعر کو پکڑنے دوڑے۔ اب ظلِ سبحانی نے آنکھیں چندھیا کر سامنے کی طرف دیکھا تو دور آسمان پر سفید بگلوں کی قطاریں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔

"یہ یہ پرندے کہاں جا رہے ہیں ——" انھوں نے فائر کرنے کے انداز میں وزیر اعظم کی طرف ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

"جی حضور، یہ تو جنگل کے آزاد پنچھی ہیں، صبح سویرے دانے دُنکے کی تلاش میں ادھر سرحد کے پار جنگلوں کی طرف جاتے ہیں۔" وزیر اعظم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون توند پر سرکا کر ذات نکو سے ——

"کیا —— کیا ہمارے ملک میں اناج کا قحط ہے جو یہ پرندے سرحد کی طرف جا رہے ہیں۔ اس سے ہمارے ملک کی بدنامی ہوگی —— وزیر اعظم، کل سے سرحد کی طرف اڑنے والے تمام پرندوں کو ہلاک کر دیا جائے۔"

"جی بہت اچھا جہاں پناہ۔" وزیر اعظم نے ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پر سرکا کر جلدی جلدی فرمان مبارک کو سنہرے فریم لگے قرطاس پر سونے کے قلم سے لکھتے ہوئے کہا۔

"عالی جاہ! اب ملاحظہ فرمائیے اس خوبصورت منظر کو، یہ جو بادلوں کے پیچھے سے سنہری روپہلی کرنیں آسمان پر ——

لیکن دوربین کو آنکھوں پہ فوکس کرنے کے بعد ظلِ سبحانی کو سنہری روپہلی کرنیں تو زمین پر بکھری نظر آئیں۔ چالیس پچاس لڑکیاں رنگین تتلیوں کی طرح چہلیں کرتی کہیں اکٹھی جا رہی تھیں۔

"وہ —— وہ —— ظلِ سبحانی نے اپنے رعشہ سے کانپتے ہاتھ کو اٹھایا۔

"جی وہ —— اوہ! ادھر تو یونیورسٹی —— ہے عالی جاہ۔ لڑکیاں ہاسٹل سے نکل کر صبح سویرے چہل قدمی کرنے جا رہی ہیں۔ ہوم منسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"اتنی بہت سی لڑکیاں ——" ظلِ سبحانی تھوک نگل کر دیکھنے لگے —— "یہ سب کنواری لڑکیاں ہیں —— ؟ ان کے ماں باپ پر ان کی شادیوں کا کتنا بوجھ ہوگا! ہم اپنی رعایا پر اتنا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے —— وزیر اعظم ——!

"جی —— جی ظلِ سبحانی، میں آج ہی ان سب لڑکیوں کو حرم مبارک میں پہنچا دینے کا انتظام کر دوں گا ——" اور وزیر اعظم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پر سرکا کے جلدی جلدی سنہرے فریم والے قرطاس پر سونے کے قلم سے ——

جاگا کر نوں والا۔ چاروں اُور ہوا اُجیارا۔

بوڑھا موسیقار اب راگ کی سرشاری میں وہاں تک پہنچ گیا تھا، جہاں فضاں میں ہر طرف نور ہی نور

تھا۔ رنگ ہی رنگ بکھر رہے تھے۔

"اف کتنا خوبصورت منظر ہے! عالی جاہ! یہی وہ وقت ہے جس کی تعریف میں کوئی سنگیت کار

دھورا——

"ہاں ہاں بہت اچھا ہے۔ مابدولت نے پسند فرمایا اس منظر کو——

اور پھر انھوں نے دوربین سے اپنا چہرہ ہٹا کر، آنکھیں چندھیا کر، دور کسی طرف دیکھا۔

"وہ—— وہ کیا بلڈنگ ہے——؟

"وہ سفید سی اونچی بلڈنگ جہاں پناہ! وزیر دفاع نے بڑی مسرت کے ساتھ سامنے کی طرف جھک کر کہا——" وہ اس خادم کے بیٹے کا مکان ہے حضور آپ کا وہ غلام زادہ اس ملک کا بہت اچھا ارکیٹکٹ ہے۔ اس نے اپنا وہ مکان ایک انوکھے ڈھنگ سے بنایا ہے۔"

"اچھا——؟ مابدولت وہ مکان ملاحظہ فرمائیں گے۔" ظل سبحانی نے یوں وزیر دفاع کی طرف دیکھا جیسے اسے خلعت سے نواز رہے ہوں۔

"زہے نصیب عالی جاہ۔ جب ارشاد عالی ہو، سواری مبارک غریب خانے پر رونق افروز ہو۔" وزیر دفاع نے جھک کر سات بار سلام عرض کرتے ہوئے کہا۔

"مگر مابدولت اس کھٹیچر آرکیٹکٹ کے مکان میں نہیں جائیں گے۔ پہلے وہ مکان ہماری ملکیت میں داخل کیا جائے۔"

"ذرہ نوازی ہے سرکار۔" وزیر دفاع نے نہایت مریل آواز میں کہا اور اس بار اس نے چودہ سلام کیے——اور وزیر اعظم نے جلدی جلدی فرمانِ مبارک سنہرے فریم والے قرطاس پر سونے کے——

"یہ—— یہ کس کی آواز ہے——؟ کیا کوئی فریادی ہم سے انصاف مانگنے آیا ہے۔؟

"ظل سبحانی نے چونک کر نیچے کی طرف دیکھا۔"

ایک بھکاری لڑکا اپنی ٹوٹی ہوئی رکابی کو بجاتا ہوا گا رہا تھا——

اللہ دلوائے گا سو دیوے گا

اللہ کا پیارا کوئی دیوے گا

"یہ تو کوئی بھکاری ہے عالی جاہ۔ صبح سویرے اللہ میاں سے اپنا رزق مانگ رہا ہے۔" ہوم منسٹر نے اپنی گنجی چندیا پر سے پسینہ پونچھ کر عرض کیا۔

"نہیں یہ لڑکا باغیوں کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے۔" ظل سبحانی نے بڑے متفکرانہ انداز میں آہستہ

سے کہا۔

"ایسا لگتا ہے کچھ لوگ ملک میں ہمارے خلاف اللہ میاں سے سازش کر رہے ہیں۔
وزیر اعظم! ان تمام بھکاریوں کو پکڑ کر عمر قید کی سزا دو جو ہماری بجائے ڈائریکٹ اللہ میاں سے اپنا رزق مانگتے ہیں۔"

"جی مناسب بندہ پرور۔" وزیر اعظم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون اوپر سرکا کے جلدی جلدی سنہرے فریم والے قرطاس پر ــــــ

اب موسیقار نے اندھیرے کو مکمل شکست دے دی تھی اور کرنوں والے دیوتا نے چاروں اُور اُجیارے کی پچکاریاں چھوڑنا شروع کر دی تھیں۔

ظلِ سبحانی اب کرسی کے تکیے سے ٹیک لگائے بڑے مدبرانہ، متفکرانہ انداز میں داڑھی کھجانے لگے۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑے اور سونے کے نقش و نگار والی کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مار کے فرمایا۔

"وزیر اعظم! ہمارے ملک میں کسی کے ساتھ ناانصافی تو نہیں ہو رہی ہے۔ کوئی ظالم ہماری رعایا کو پریشان تو نہیں کر رہا ہے ــــــ؟

"بالکل نہیں عالی جاہ!" تمام درباریوں نے ظلِ سبحانی کی طرف جھک کر بہ آوازِ بلند کورس گایا۔

ظلِ سبحانی یہ سن کر مسکرائے اور ادھر ادھر دیکھ کر فرمایا۔

"یہ ــــــ یہ گرمی کیوں ہو رہی ہے اس وقت ــــــ؟

یہ سنتے ہی مورچھل تھامنے والی نے پتھر کی مورتیوں کے ہاتھ آہستہ آہستہ مورچھل ہلانے لگے۔

"عالی جاہ، آج اگر نکلتے سورج کا حسن ملاحظہ فرما لیتے تو بہتر تھا۔ کیوں کہ اب دھوپ میں تیزی آ رہی ہے۔ شاعر نے بڑے افسوس کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اچھا! یہ گستاخ سورج ہمارے سامنے تیزی دکھا رہا ہے ــــــ؟ اچانک ظلِ سبحانی چلانے لگے ــــــ" وزیر اعظم! سورج کو ابھی شوٹ کر دو ہمارے سامنے۔ اور اس احمق شاعر کا بھی سر قلم کر دو، جس نے ہمیں اس خود سر سورج کو دکھانے کی زحمت دی ــــــ

ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پہ سرکا کے وزیر اعظم نے فوراً دو فائر کیے ــــــ دھائیں ــــــ دھائیں۔

اچانک سارے ملک میں اندھیرا چھا گیا ــــــ کیوں کہ دوسرے فائر کی زد میں سورج کی بجائے بھیروں کے وہ سُر آ گئے تھے، جو روزانہ آکاش اور پاتال کی گہرائیوں سے سورج کو کھوج نکالتے تھے۔ ☐

جوگندر پال

بے مراد

پنڈت بڑا گھبرایا ہوا تھا اور پتہ نہیں، تھیلے کے بوجھ سے ہانپ رہا تھا یا ضمیر کے۔ وہ گویا سڑک کی بھیڑ بھاڑ میں نہیں چل رہا تھا بلکہ یہ سارا ہجوم اس کی تلاش میں اپنے آپ سے نکل کر اس کی نظر میں آ نکلا تھا اور اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا ـــــ پنڈت خجل سی فتح یابی سے مسکرانے لگا ـــــ بڑے شہروں کی چکا چوند کا یہی تو ایک فائدہ ہے کہ کچھ بھی کر لو، کسی کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا، اسی لئے جو بھی کرنا ہو یہاں لوگ کھلے عام کرتے ہیں ـــــ چلتے چلتے کسی بھلی سی عورت سے ٹکرا گئے ـــــ چھما کرو بہن جی ـــــ اور بہن جی کی خنداں آنکھیں پوچھنے لگیں، کیوں؟ تم نے کیا ہی کیا ہے؟ ـــــ تو پھر آؤ بہن جی، پہلے کچھ کر لیتا ہوں ـــــ

پنڈت ہنسنے لگا۔

کوئی پندرہ برس پہلے وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں میں مندر کا پجاری تھا۔ ایک گہری رات کو وہ چھنو کا منہ پرشاد کے لڈوؤں سے بھرنے کے لئے اسے اپنی کوٹھڑی میں لے آیا۔ سب تھک کر سوئے پڑے تھے بس ایک بھگوان کی مورتی ہی جاگ رہی تھی۔ کیا مجال، کبھی جھوٹ موٹ ہی آنکھیں موند لے۔ شور مچا مچا کر سارے گاؤں کو جگا دیا اور پنڈت بے چارہ خواہ مخواہ پکڑا گیا۔

پنڈت نے تھیلا دائیں ہاتھ سے بائیں میں لے لیا اور ہڈیاں سہلانے لگا، مانو ابھی ابھی پندرہ برس پہلے کی مار کھا کے اٹھا ہو ـــــ کچھ بھی ہو مار کھا کے کئے کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ورنہ کئے جاؤ اور کلیجے کا بوجھ بڑھاتے جاؤ ـــــ پنڈت کا دل بوجھ ہی بوجھ سے اس کے حلق میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا کہ مل جائے تو پہلے پانی پی لے، مگر یہاں تمالی پانی کہاں؟ ـــــ وہ ایک بار ہے ـــــ کیوں بھائی پانی ملے گا؟ ـــــ ارے اِنا معلوم کیا کر کے آیا ہے کہ پانی مانگ رہا ہے ـــــ جاؤ بابا، چار ہی قدم پر تھانہ ہے۔ پانی ان سے مانگو۔ ہمارا تم نے کیا بگاڑا ہے؟ ـــــ جاؤ!

لال پگڑی والے کو دیکھ کر پنڈت بے سبب بوکھلا جاتا تھا۔ گذشتہ منگل کا ذکر ہے کہ سامنے

کی چوکی کا حوالدار وردی پہنے کھٹ کھٹ مندر میں چلا آیا۔ پنڈت اس وقت بھگوان کرشن کے منھ میں بھوجن ڈال رہا تھا۔ لال پگڑی کی جھلک پاکر اس نے کھانے کا تھال وہیں رکھ دیا اور باہر آکھڑا ہوا۔

"جے سری کرشن، پنڈت جی۔"

"جے سری کرشن۔"

"کہیے، ہمارا بھگوان کیسے ہے؟"

"بھگوان تو سدا مزے میں ہی ہوتا ہے۔"

"نہیں، دیکھ کر بتائیے، کہیں مزے سے بیٹھے بیٹھے اس کی آنت تو نہیں اکڑ گئی۔" حوالدار کو اچانک خیال آیا کہ وہ تھانے میں پھنسے ہوئے کسی ساہوکار کا ذکر نہیں کر رہا، اور وہ سنبھل گیا۔ "کیا کریں پنڈت جی؟ چوبیس گھنٹے چوری، ٹھگی اور ڈکیتی کی رپورٹیں لکھ لکھ کر ہمیں ہمیشہ الٹی باتیں ہی سوجھتی ہیں۔" اس نے پنڈت کے ہاتھوں میں منگلوار کے پرشاد کا لفافہ تھما دیا۔

پنڈت نے اطمینان کی سانس لی۔

"جے سری کرشن! — بنانے والے نے تو آدمی کو آدمی ہی بنایا، پر آدمی آپ ہی آدمی نہیں رہا حوالدار جی۔"

حوالدار جوتے اتارنے لگا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں پنڈت جی۔ آپ سے کیا پردہ؟ کسی خونی کی ماں نے رو رو کر پانچ روپے رشوت دے دی تھی کہ مجھے اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھ لینے دو۔ پیسے تو میں اپنی سگی ماں سے بھی نہ چھوڑتا مگر اسی دم سوچ لیا، ان برے پیسوں کو کسی اچھے کام میں ہی خرچ کروں گا — جے شری کرشن!"

حوالدار نے نل سے ہاتھ دھو کر انھیں کسی مجرم کے مانند چھاتی پر باندھ لیا اور پنڈت کے پیچھے پیچھے چل کر بھگوان کی مورتی کے سامنے آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔

پنڈت کو اپنا بایاں بازو بھاری معلوم ہونے لگا تو اس نے تھیلا پھر دائیں ہاتھ میں لے لیا۔

تمھاری مہما اپرم پار ہے بھگوان۔ قانون کی رکشا کرنے والے کے من میں شنکا پیدا ہو یا قانون میں بگاڑ پیدا کرنے والے کے، تم سب کا پرشاد بے جھجک منھ سے لگا کے ان کا منھ بھی میٹھا کر دیتے ہو۔ اچھے اور برے سب چین کی بانسری بجاتے ہوئے تمھارے دوارے لوٹتے ہیں — دھنیہ ہو! — تھیلے کو کھمبی کی طرف سرکا کے پنڈت نے جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ کے کرشن بھگوان کو پرنام کیا اور پرنام کرتے ہوئے ایک شرابی سے ٹکرا گیا وہ جو ہڑبڑا کر اس سے پوچھنے لگا، "پیے ہوئے ہو؟ بھری سڑک پر ہاتھ باندھ

کے چلتے ہو، کم سے کم آنکھیں تو کھلی رکھو۔"
"مگر آنکھیں کھلنے پر ہاتھ کیسے باندھے گا؟" شرابی کا ساتھی بھی لڑکھڑاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔
"ہاں بڑی سمجھ کی بات کہی ہے۔ آؤ، اسی بات پر ایک ایک جام اور چڑھاتے ہیں۔"
"ہاں، آؤ، اس تلک دھاری کو بھی ساتھ لے چلیں۔"
پنڈت ان سے جان چھڑا کر جلدی جلدی آگے ہو لیا۔ وہ اپنے دوست مدن لعل کے ساتھ اکثر شراب پینے بیٹھ جاتا تھا۔ مدن کو تو سب کو دکھا کے پیتے ہوئے خوشی ہوتی تھی مگر وہ ہمیشہ چھپ کر پیتا تھا۔ اول تو برے کرم سے بچ کر رہو۔" وہ مدن لعل کو سمجھایا کرتا۔ "مگر بچنا بس میں نہ رہے تو اتنا تو کرو کہ کسی کا من میلا نہ ہو۔"
"ہو بھی جائے تو کیا ہے؟ ہنستے کھیلتے ان کی ساری میل کو دھو دو۔"
مندر کا فلیٹ ایک بہت بڑی بلڈنگ کی چھٹی منزل پر تھا۔ ہر منزل پر ایک ایک بیڈ روم کے دو دو فلیٹ تھے لیکن اس منزل پر ایک چھوٹا سا مندر تھا اور مندر کے اندر ہی کھلتا ہوا صرف پنڈت کا فلیٹ۔ بلڈنگ کے مالک سیٹھ مول چند کا کہنا تھا کہ بھگوان کرشن خود آپ بیکنٹھ سے چل کے اس کے سپنے میں آئے اور بولے، اپنی اس بلڈنگ کی چھٹی منزل پر میرا مندر بنوا دو۔ میں نے بہت کہا، میرے داتا، آپ کا ایک شاندار مندر الگ سے بنوائے دیتا ہوں۔ لیکن بھگوان اڑ گئے، نہیں، میرے بھگتوں کو ان چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں رہنا ہوگا تو میں الگ سے اپنا محل کیوں بنواؤں، سو جسے بھی کرائے پر فلیٹ دیتا ہوں اس سے حلفیہ بیان لے لیتا ہوں کہ وہ بھگوان کرشن کا بھگت ہے۔
"میں نے تو اس بیان پر بخوشی دستخط کر دیئے۔" مدن لعل نے پنڈت کو بتایا تھا۔ "اگر سیٹھ سچ بولتا ہے تو کرشن بھگوان بھی میری طرح مارکسسٹ ہے۔"
مدن لعل مندر ہی کی بلڈنگ کی دسویں منزل پر رہائش پذیر تھا۔ "تمہارے بھگوان سے چار منزلیں اوپر رہتا ہوں ——— مگر رہتا کہاں ہوں بس یہ مان کے چلو کہ اپنی خباثتوں کے باعث لوٹتا پوٹتا رہتا ہوں اور تمہارے بھگوان کو ترس آ جائے تو وہ آپ ہی کہہ دیتا ہے، جاؤ مدن لعل پنڈت کے ساتھ بیٹھ کے دو گھونٹ پی آؤ۔"
بھگوان کی آرتی کے بعد کافی رات گئے مدن ایک پورا ادھا لے کر پنڈت کے پاس آ پہنچا۔ پنڈت اس کے آتے ہی فلیٹ کی چٹخنی اندر سے چڑھا لیتا اور پھر مدن کو اپنے سونے کے کمرے میں جانے کا

اشارہ کر کے مندر کا دروازہ بند کرنے کے لئے بڑھتا۔

"دروازہ کیوں بند کرتے ہو؟" مدن لعل اس سے کہتا۔ "وہ میرے ساتھ کئی بار پی چکا ہے۔"

ایسے ہی ایک موقع پر پنڈت میدان صاف کر کے مدن کے پیچھے پیچھے اپنے سونے کے کمرے میں وارد ہوا تو وہ اسے بتانے لگا۔ "پرسوں جب تم یہاں اپنے بھگوان کی آرتی اتار رہے تھے پنڈت، تو وہ میرے پاس پہنچا ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے میرے ساتھ خوب ڈٹ کے پی، اور پی کر بڑے گہرے ہوش میں آ گیا اور ہمارے یگ کی ایک نئی مہا بھارت کا اعلان کیا ——— "اے ارجن، کان کھول کر سنو ——— میں نے ہاتھ باندھ کر اسے بتایا کہ میں ارجن نہیں بھگوان، مدن لعل ہوں۔" ——— "ہاں، تم ارجن کیوں کر ہو سکتے ہو؟ ——— دھیان سے سنو، مدن لال ———"

پنڈت نے اپنے دونوں کانوں کے پٹ سرپٹ کھول رکھے تھے کہ من بھاتے کھانے پینے کی توقع ہو تو انوکھی باتیں بڑی بھلی لگتی ہیں

"جانتے ہو بھگوان نے مجھے کیا بتایا؟ ——— اس نے کہا، اے مدن لعل، تمہارے یگ میں مہا بھارت رن بھومی میں آمنے سامنے لڑ لڑ کر نہیں لڑی جائے گی، بلکہ اس یدھ کو ہر کسی نے ہر وقت ہر جگہ مسکرا مسکرا کر محبت سے لڑنا ہے اور ہر کسی کا اسی طرح ناش کرنا ہے ——— جانتے ہو پھر کیا ہوا، پنڈت؟ بھگوان کا کہا سن کر میرا نشہ ہرن ہو گیا اور میں نے اسی کا شکر ادا کیا کہ وہ وہاں تھا ہی نہیں۔"

"بھگوان کے بارے میں الٹی سیدھی مت ہانکا کرو؟" پنڈت کو مدن کی باتوں سے مزہ آ رہا تھا مگر اس نے سوچا کہ وہ چڑا ہوا دکھائی دے گا تو بھگوان کی نظروں میں اس کی پوزیشن صاف رہے گی۔

"الٹی سیدھی؟ کیا تمہارا ہی ذہن تو الٹا نہیں، پنڈت؟ بھگوان ایک تمہاری ہی جائداد نہیں، وہ میرا بھی ہے، اور میری خواہش ہے کہ جو کچھ مجھے اچھا لگتا ہے اس سے میرا بھگوان بھی محروم نہ رہے۔" وہ بوتل کا ڈھکنا کھول کر ہنسنے لگا۔ "جاؤ، دروازہ کھول کر اسے بھی لے آؤ۔ کیا حرج ہے؟"

پنڈت نے ہونٹوں پر انگلی باندھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ اگر اس کا موڈ ہو گا تو دروازہ کھلا ہو یا بند، وہ میرے یا تمہارے گلاس سے وہیں بیٹھے بیٹھے پی لے گا۔"

پنڈت ہنسنے لگا لیکن جھٹ ہی سنبھل کر اپنے اوپر غصہ طاری کرنے لگا کہ ہنس کیوں رہا ہوں۔

"میں مذاق نہیں کر رہا، پنڈت، میں نے کئی بار یہیں اس کمرے میں اپنی دو آنکھوں سے

دیکھا ہے کہ میرا گلاس بھرتے ہی اپنے آپ خالی ہو جاتا۔ بولو وہ نہیں، تو اور کون اسے خالی کرتا ہے؟"

کئی دفعہ مدن لعل پنڈت کے ساتھ پینے کے بجائے پی کر ہی اس کے یہاں آتا اور سیدھا بھگوان کے چرنوں میں جا بیٹھتا۔

"مانا کہ میں بہت برا ہوں بھگوان۔" وہ بھگوان کرشن سے مخاطب ہو کر کہتا، مگر میں جو بھی کرتا ہوں تمھاری ہی ذمہ داری کو نبھانے کے لئے کرتا ہوں۔ یہ ذمہ داری تمھاری ہے کہ میں زندہ رہوں بولو، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاؤں تو مجھے کہاں سے کھلاؤ گے؟ بانسری کو منھ سے ہٹا کے جواب دو، میں برا نہ بنوں تو کھاؤں کیا؟ مجھے کوئی منتر پھونکنا نہیں آتا کہ نیکی ہی نیکی سے روٹیاں بنا لوں ـــــ نہیں، بانسری بجانا بند کرو اور میری بات کا جواب دو ـــــ یا اپنے پنڈت کو اتنی بدھی دو کہ میری بات کا جواب دے سکے۔"

پنڈت کو قبول تھا کہ مدن لعل کی باتوں کا جواب اس سے نہیں بن پڑتا۔

"تو پھر بھگوان کرشن کو چین کی بانسری بجاتے دو۔ تم ہمیشہ وہی کرو جو میں کہوں۔"

پنڈت کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ مدن لعل کی باتوں میں آکر میں نے غلطی کی ہے۔ تھیلے کو ہاتھ پر لٹکانے سے اس کا بازو اکڑ گیا تھا۔ اس نے اسے پیٹھ پر لٹکاتے ہوئے، اپنے آپ سے پوچھا، ابھی واپس چلا جاؤں؟ نہیں، وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس نے اپنی کلائی کو آگے کر کے گھڑی پر سے ٹائم دیکھا ـــــ سوا نو بجنے کو آ رہے ہیں۔ ساڑھے نو تک مجھے وہاں پہنچ ہی جانا چاہئے ـــــ وہ تیز تیز چلنے لگا اور ابھی تھوڑی ہی دیر چلا ہو گا کہ اپنے قدموں کی طرف دیکھ کر ٹھٹک کے رہ گیا ـــــ پٹڑی پر سے بھگوان کرشن منھ سے بانسری ہٹائے بغیر اسے آواز دے رہے تھے ـــــ پنڈت! ـــــ ہو بہو وہی صورت، وہی پہناوا ـــــ وہ ہی! ـــــ بوکھلاہٹ میں پنڈت نے تھیلے کو کندھے پر سے گرنے سے بڑی مشکل سے روکا اور پھر پٹڑی پر کھنچی ہوئی رنگولی کو گھورتا رہا۔ بھگوان کے وجود پر اور آس پاس پانچ پانچ دس دس پیسے کے کئی سکے پڑے تھے ـــــ اس کا ہاتھ لاشعوری طور پر اپنی ایک جیب میں چلا گیا جہاں ایک چونی اور دو چار چھوٹے بڑے نوٹ رکھے تھے۔ چونی کھوٹی تھی مگر پنڈت اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ سکہ کھوٹا ہو یا کھرا، جس کے پاس پہنچ جائے اسے لگا نا ہی ہوتا ہے ـــــ اس نے بڑے تعظیم سے چونی بھگوان کے قدموں میں پھینک دی اور وہاں سے پانچ پانچ پیسے کے تین سکے اٹھانے کے لئے جھک گیا ـــــ پانچ پیسے مجھے دینا ہی تھے اور اوپر کے پانچ پیسے اس لئے کہ چونی کھوٹی ہے ـــــ مگر تین سکے اٹھانے کے بعد اس نے جلدی سے چوتھا بھی اٹھا لیا ـــــ میرے مندر میں جس نے یہ

چونی پھینکی ہو گی، کیا پتہ، وہ اسے لگانے کے لئے ہی لایا ہو اور اپنے پانچوں پانچ پیسے لے اڑا ہو ارے ——— !میرا سارا وقت یہیں نکلا جا رہا ہے۔ وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے ——— وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا اور جب اس کے قدموں میں آہنگ پیدا ہو گیا تو اس کے خیالات کی بے آہنگی اس آہنگ میں سمٹنے لگی۔

مدن لعل ٹھیک ہی کہتا ہے، جب ساری دنیا سڑکوں پر اتر آئی ہے تو بھگوان بھی اندر پڑے پڑے چڑھاوے کی برفی کھا کھا کر اپنا خون کیوں میٹھا کرتا رہے؟ وہ بھی پٹڑیوں پر کیوں نہ رہائش اختیار کر لے؟ سیٹھ مول چند کا محتاج کیوں بنا رہے؟ ——— کیوں؟

مدن لعل پنڈت کو صرف شراب ہی نہ پلاتا تھا، بلکہ لیڈروں کی تقریریں سنانے کے لئے بھی لے جایا کرتا تھا۔ اس وقت پنڈت کو محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے اندر ایک بہت بڑے میدان میں وہ آپ ہی ہزاروں کی تعداد میں بیٹھا ہے اور اپنے آپ کو بڑے دھیان سے سن رہا ہے ——— کیوں؟ ——— اس کا کیا خیال در اصل اس نشیب پر بہہ نکلا تھا کہ سیٹھ مول چند نے اس کی تنخواہ کیوں بند کر دی۔ بیس لوگ بھگوان کے درشن کو آئیں تو بڑی مشکل سے ایک روپے کا چڑھاوا جمع ہوتا ہے۔ بھگوان کا سیوادار بننے کا کیا یہی معاوضہ ہے؟ ——— اے ارجن، کام کر اور پھل کی ابھلاشا مت رکھ! ——— مگر تھوڑا بہت تو ——— "پنڈت جی،" سیٹھ مول چند نے اس سے کہا تھا۔ "بھگت یہاں پیسے ہی نہیں چڑھا جاتے بلکہ پھل، اناج، اور بھانت بھانت کے پکوان بھی ڈال جاتے ہیں۔ فلیٹ آپ کو مفت میں ملا ہوا ہے۔ آپ کو اور کیا چاہئے؟ ———" ——— "تمہارا سر!" مگر اس نے گھگھیا کر جواب دیا تھا۔ "کچھ نہیں، ان داتا!" ——— "پنڈت جی، آپ بھگوان کے نوکر ہیں، سو وہ آپ ہی روز کے روز آپ کی تنخواہ کا پربندھ کر دیتا ہے۔ میں کون ہوتا ہوں جو آپ کو تنخواہ دینے کا دعوے دار بنوں؟"

"میں آپ کا بھی بے دام نوکر ہوں [illegible] ان داتا۔"

سیٹھ خوش ہو گیا تھا۔

"آپ دل لگا کر کام کرتے رہیں، پنڈت جی۔ ہم کچھ نہ کچھ بھگوان کے چرنوں میں چڑھا جایا کریں گے۔"

بھگوان کے چرنوں میں دو روپے چڑھا کر [illegible] اس طرح دیکھتا ہے گویا بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔ پھل کیا خاک پائے گا؟ ——— جیسے [illegible] نوکروں کی تنخواہ دیتا ہے، ویسے ہی اپنی نیک نامی کا کام بھگوان کو سونپ رکھا ہے ——— ہاتھ جوڑ جوڑ کر سارے جہان کو ———

بھگوان کو کبھی اپنا نوکر بنائے ہوئے ہے۔ دشٹ کا بھلا کیسے ہوگا؟

"بھلا تو تمھارا بھی کیسے ہوگا؟" پنڈت نے اپنے آپ سے پوچھا۔

ہاں، میں خواہ مخواہ مدن لعل کے چکر میں پھنس گیا۔ جو کام کرنے جا رہا ہوں اس کے خیال سے بھی ڈر لگتا ہے، مگر مدن لعل کہتا تھا، تم بے وجہ ڈر رہے ہو پنڈت۔ بھگوان کا اپدیش یاد کرو ——— جو کچھ بھی ہوتا ہے میری مرضی سے ہی ہوتا ہے، اسے میں ہی کرتا ہوں ——— سو پنڈت میرے بھائی، تم کون اور میں کون؟ ہمارا کام وہی کئے جانا ہے جو ہم کرتے ہیں۔ بے فکری سے اپنا کام پورا کرو۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

فائدہ ہو تو سارا اسی کا ہے۔ کل ہزار روپیہ ملے گا جس میں ڈھائی سو اس کا حصہ ہے اور اور ——— "دیکھو پنڈت" مدن لعل کی بیوی نے اسے دھمکی دی تھی۔ "دو چار سیڑھیاں چڑھ کے خالی ہاتھ آجاتے ہو، شرم نہیں آتی۔ اگلی بار آؤ تو میرے لئے سونے کا نیکلس لے کے آؤ، نہیں تو شور مچا کر بلوا دوں گی" ——— بیوی کو اتنا [illegible] منہ لگائے؟ ——— مگر شاید ان دونوں نے مل کر ہی یہ جال بچھایا ہے ——— مدن لعل کو پتہ [illegible] اور اس کی بیوی کا ——— نہیں، ایسے نہیں ہوسکتا۔ مدن لعل شریف آدمی ہے ——— مگر شریف آدمی تو میں بھی ہوں ———

پنڈت کو بیماری اپنے پیچھے سے چور، چور کی صدائیں سنائی دیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ اس کے عین عقب میں چند لوگ ایک آدمی کے پیچھے پیچھے دوڑے آرہے ہیں۔ اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے چور کے آگے آگے بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا اور تھیلے کے بوجھ کے باوجود آناً فاناً سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پنڈت نے جب دوڑنا بند کیا تو اپنے آپ کو ایک بڑے اعلیٰ درجے کے گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑا پایا اور دم لینے کے لئے تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا اور اپنے آپ سے پوچھتا رہا کہ میں نے کس کی چوری کی ہے۔ اگر پکڑا جاتا تو بے سبب شامت آجاتی۔ وہ خیال ہی خیال میں ہنستا رہا اور گھبرا گھبرا کر مسکراتا رہا ——— یہاں لوگ چور کو پکڑنے کے لئے چور کے آگے آگے بھاگ رہے ہوں وہاں وہ دراصل آپ ہی اپنے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ اتنے فاصلے پر رکھتے ہیں کہ اپنے قابو میں نہ آپائیں ——— کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے پیچھے واقعی کوئی نہ ہو اور میں اپنے کان بجتے ہی آپ ہی اپنے پیچھے ہو لیا ہوں؟

پنڈت نے جی ہی جی میں زور سے قہقہہ لگایا اور سامنے گیسٹ ہاؤس کا بورڈ پڑھنے لگا ——— داگر یٹ گیسٹ ہاؤس ——— ہاں۔ مجھے یہیں آنا تھا ——— مگر اندر جاؤں یا لوٹ جاؤں؟ ——— وہ

لے نہیں کر پا رہا تھا کہ جس کام کے لئے آیا ہوں اسے کر دوں یا کئے بغیر واپس ہو لوں ۔۔۔ یونہی لوٹتا
ا تو آئے کیوں؟ ۔۔۔ "تم پنڈتوں کی سدا یہی مصیبت رہی ہے ۔۔۔ مدن لعل اس سے کہا کرتا تھا
۔۔۔ کہ سچ بھی بولنا چاہتے ہو تو بڑے جھوٹے دل سے! ۔۔۔ سچائی کا سچ یہی ہے کہ جیسے کوئی ہو ویسے
وہ کھرے کھرے کر دے ۔۔۔ چلو اندر چلو!

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے گریٹ گیسٹ ہاؤس سے مدن لعل برآمد ہوتے ہوئے نظر آیا۔

"ارے پنڈت!" مدن لعل نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ "ہم اندر تمھارے انتظار میں سوکھ
ہے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہو؟ چلو، صاحب خفا ہیں کہ تم ابھی تک کیوں نہیں پہنچے۔"

پنڈت اور مدن تیز تیز چل کر گیسٹ ہاؤس کے ایک دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوئے
ن نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔

"کون ہے؟ آ جاؤ۔"

دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو سامنے ہی صوفے پر بیٹھا ایک یورپی اپنے پائپ کے
وئیں کو تیز تیز آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے بے صبری سے پنڈت کی طرف دیکھنے لگا۔

"لے آئے؟"

"ہاں۔"

پنڈت نے تھیلے سے اپنے مندر کے بھگوان کو نکال کر یورپی کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"بائی گاڈ! یہ تو سچ مچ کا گاڈ ہے۔" یورپی مورتی کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھول رہا تھا۔ "پکے
ر کا انگ انگ نور اور حسن اور زندگی میں رچ بس گیا ہے۔"

اس نے جیب سے بٹوا نکالا، سو سو کے دس نوٹ گنے اور انھیں پنڈت کی طرف بڑھا کر کہا۔
۔ لو تمھارے گاڈ کی قیمت! گن لو!"

پنڈت نے نوٹوں کو گنے بغیر جلدی جلدی اندر کی جیب میں ٹھونس لیا۔

"ایک بات بتاؤ۔" یورپی اس سے پوچھنے لگا۔ "اپنا گاڈ تم نے بیچ دیا۔ اب تمھاری مرادیں
ن پوری کرے گا؟"

"میں نے کچی مٹی پر روغن کروا کے ایسا ہی ایک نقلی گاڈ تیار کروا لیا ہے۔"

مدن لعل ہنسنے لگا۔

"آپ ہماری فکر نہ کریں، صاحب۔ ہم سب لوگ اپنے نقلی گاڈ کا دیا ہی کھاتے ہیں۔" □

غیاث احمد گدی
فتح پور لین، جھریا

آخ تھو

بکری گلّے سے کٹ کر الگ سی کھڑی ہوئی ہے !

قصابوں کے لونڈے تہمد لپیٹ کر کمر میں اُڑسے تشویش بھری نظروں سے گلّے کو جانچ رہے ہیں۔ دن بھر جنگل میں بکریوں کے ریوڑ سے گھیرے ہوئے پتے چرانے میں، بیڑیاں پیتے ہیں۔ اپنے موٹے مشٹنڈے توندیلے قصابوں کو گالیاں دیتے اور آپس میں فحش مذاق کرتے کراتے تھک جاتے ہیں کہ سورج آسمان کے پچھمی کنارے پر سُرخ طشت جیسا، ڈھلان کی طرف جھکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات بکریاں بھی شاید سمجھتی ہیں کہ فضا میں سورج کی حکمرانی کو زوال ہوتے ہی وہ جہاں تہاں سے جمع ہو کر گلّے کی صورت میں، منھ اٹھا اٹھا کر، لونڈوں کو، کبھی قصابوں کے یہاں پہنچانے والی پگڈنڈیوں کو تکنے لگتی ہیں تب "میں۔ میں" کی آواز سے فضا بوجھل ہونے لگتی ہے۔

آج بھی یہی ہوا۔ ــــــ

مگر آج ایک دم سے ویسا نہیں ہوا جیسا روز ہوتا ہے آج بات ذرا الگ سی ہو گئی۔ ریوڑ سے ٹوٹ کر ایک دبلی پتلی بکری الگ اونچائی پر جا کھڑی ہوئی اور غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کمزور روشنی میں ریوڑ کی دوسری بکریوں کو تکنے لگی۔ گویا آج وہ ان میں سے نہیں ـــــ !

"ابھی تو تھی۔" ایک لونڈے نے لنگی کے اندر ہاتھ ڈال کر کھجاتے ہوئے کہا 'ہوگی، ان ہی میں ہوگی، گن کر دیکھ لو۔'

"تم گن لو...... میں نے تو گن لیا۔" دوسرا لونڈا بولا، پھر ریوڑ کی بکریوں کو دوبارہ گننے لگا، اچھی طرح سے ایک ایک کو پکڑ کر، الگ کر، کر، کے گننے کے بعد اس نے پھر کہا، ایک کم ہے.....

"کم ہے پر گئی کہاں۔؟" دوسرے لونڈے نے تشویش ظاہر کی، استاد تو اپنی کھال کھینچ لے گا۔

"ہاں بکریوں کو پٹک کر جیسے ذبح کرتا ہے.... ویسے ہی۔

بالکل درست کہا تم نے....." اس کی باڑ بار کانپنے لگی، پر گئی کہاں.....؟

بکری بلندی پر سے دیکھ رہی تھی، ریوڑ کو بھی اور چرواہوں کو بھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک آگئی

جب موٹے توندیلے قصاب نے اسے بڑھیا کے یہاں سے سود کے پیسوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں اس کی رسّی تھام لی تھی، بڑھیا گھگھیاتی رہی، لاکھ چلایا کی "ارے میں مرجاؤں گی آدھ سیر دودھ دیتی ہے پاؤ بھر پانی ملا کر بیچتی ہوں تب دادی پوتے کا پیٹ بھرتا ہے۔ ارے خدا کی مار ہم کھائیں گے کیا..... ارے قصائی، ار ــــے قصائی......"

مگر قصائی تو قصائی ہی تھا، ہنسنے لگا۔ دودھ ہم پئیں گے مائی ہم..... دیکھو کتنے دبلے ہوگئے ہیں ..... اور رسّی پکڑ، اسے گھسیٹنے لگا۔

دادی کو روتے دیکھ کر بے ماں، باپ کا بچہ بڑھیا کے گلے سے تھول گیا۔ جانے دے ــ جانے دے دادی، ہم روٹی نہیں کھائیں گے.... پانی پئیں گے.... پانی۔!

"پانی۔ آنکھوں کا پانی مرگیا رے بے مروت۔ ارے قصائی کا جنا۔"

پر بے مروت قصائی تو قصائی کا ہی جنا تھا، کسی اور کا نہیں۔ رسّی کو مضبوطی سے پکڑ کر زور زور سے گھسیٹنے لگا۔ بس اسی وقت بکری کی آنکھوں میں جانے کہاں سے ذرا سا پانی آگیا اور اس میں ایسی چمک کہ گھسٹتی ہوئی بکری دیکھ کر قصاب نے پلٹ کر دیکھا تو چونک اٹھا۔

"سالی......" یہ گالی اس نے بڑھیا کو نہیں بکری کو دی۔ دیکھتی کیسے ہے؟ ـــ کھڑی جگہ سینگ ہو جائیں تو....."

سینگ ہو جائیں تو وہ جھپٹ کر بے مروّت قصاب پر چوجھ پڑے، اور اس کی تکا بوٹی کرکے...... بات الٹی ہو گئی نا..... لوگ بکری کو تکا بوٹی کرکے کھاتے ہیں..... مگر بکری اگر ایسا سوچ لے۔ وہ بھی تکا بوٹی کرنے والے قصاب کے لئے تو.....

پر سینگ کہاں سے ہو جائیں گے، بکری، بکری ہی رہے گی، گوشت نہیں، پتّے ہی کھائے گی، ہڈی نہیں چبائے گی اور دے گی دودھ، آدھ سیر بکری کا گاڑھا گاڑھا دودھ۔ ذرا گرم کرو اونٹو، تو بالائی کی تہہ آجائے گی۔ اوپر، دیکھتے دیکھتے، بالائی کی تہہ..... قصاب نے زبان کو ہونٹوں پر پھیر، مونچھوں کو تاؤ دیا ـــ پھر تو آنکھوں میں خود بخود چمک آگئی ـــ سالی یہ آنکھوں کی.....

سالی یہ آنکھوں کی چمک بھی کیا چیز ہوتی ہے؟

قصاب کے طویلے میں بکری نے دو دنوں تک کچھ کھایا نہ پیا، سارا دن "میں میں" کرتی رہی، قصاب نے تھنوں کو ہاتھ لگانا چاہا تو لتاڑی جھاڑی، اچھل کود دی، تھن تھے کہ دودھ سے تنے ہوئے تھے، کسمسا رہے تھے۔ موٹے قصاب کی لجلجی زبان بار بار ہونٹوں کا طواف کرکے، انھیں گیلا کرکے اندر چلی جاتی، جیسے کچھوے

کی گردن اندر گھس جاتی ہے۔

کسی نے کہا، ابھی نہیں، پرانا گھر چھوڑ کر آئی ہے، دو دن چھوڑ دو، پھسلاؤ بہلاؤ، پھر دودھ دے گی۔ دے گی نہیں تو جائے گی کہاں۔" چنانچہ موٹا قصاب جُٹ گیا۔ کھلی، چنا، ہرے پتے سب کچھ لاکر سامنے رکھتا گیا، مگر بکری نے منہ نہیں دھرا آخر وہ تھک گیا، زبردستی دوہنے کی کوشش کی، مگر دودھ نام کو نہیں، تھن پتھر ہو رہے تھے، بے حس، بے جان، بالکل پتھر: قصاب کے دل کی طرح!

آخر ہار مان کر قصاب نے چاروں چرواہوں کو حکم دیا، "کل سے اور بکری بکروں کے ساتھ یہ بکری بھی چرنے جائے گی، اس کے نصیب میں جو لکھا ہے وہی ہوگا، کوئی کہاں تک چمکارے، اور وہ قصاب، وہ جو کہتے ہیں کہ گھوڑے نے گھاس سے مروت کی تو بھوکوں مرا، قصاب نے بھی بکریوں سے رفاقت کی تو.....

میں بھوکوں مرنے والا نہیں، بکری کا دودھ نہیں تو اس کا گوشت ہی سہی، چھوڑوں گا نہیں، خود بھی کھاؤں گا اور لوگو، مطلب گاہکوں کو بھی کھلاؤں گا۔۔۔۔۔۔ دیکھ لوں گا سالی حرام جادی کو۔۔۔۔۔۔

قصائی کی چھری۔۔۔۔۔!

قصائی کی چھری سے بچ کے جائے گی کہاں۔۔۔۔۔۔؟

کہاں۔۔۔۔۔۔؟؟

ارے وہاں، دیکھ اس ٹیلے پر،......ایک لونڈے کی نظر پڑ گئی۔

ہاں ٹیلے پر، کتنے آرام سے بہن چود چگالی کر رہی ہے، باقی تینوں لونڈوں کی باچھیں کھل اٹھیں۔

بکری ٹیلے پر کھڑی ڈوبتے سورج کی نارنجی روشنی میں شرابور تھی، اور مزے سے چگالی کر رہی تھی، مگر کب تک.....

لونڈوں نے چاروں اور سے گھیر ڈال دیا، اور لگے دوڑانے، وہ کبھی بائیں دوڑتی داہنے کو مڑ جاتی کبھی دائیں کو دوڑتی دوڑتی ایک دم سے پیچھے کی طرف پلٹ جاتی۔ اور لونڈوں کی پکڑ میں آتے آتے یوں چھل دے کر نکل جاتی، جیسے کسی کنجوس کی ساری عمر کی کمائی پل بھر میں ہاتھوں سے نکل جاتی ہے اور وہ بے چارہ ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے.....

گھنٹے بھر کی دوڑ دھوپ (یہاں صرف دوڑ ہونا چاہئے تھا، کیوں کہ آفتاب قریب قریب ڈوب چکا تھا، زیادہ سے زیادہ دوڑ دھند کہا جا سکتا ہے..... مگر یہ اُردو زبان باپ رے باپ.....) کے بعد جب بکری نے دیکھا کہ اب بچنا محال ہے، اور چاروں اور سے لونڈوں نے گالیاں دے دے کر یقین دلا دیا کہ بھاگنا، اور نکل بھاگنا بچنا اور بچ نکلنا ممکن نہیں تو بکری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جھاڑیوں سے چھپے ہوئے

کھڈے میں کود گئی۔

"گئی ـــــ ا" لونڈوں کے منہ سے بے اختیار نکلا "گئی سالی تو ... ٹر ... ے میں۔"

"اور ہم گئے ماں کی اس میں" لونڈوں میں سے ایک نے کہا، کلو استاد کھال کھینچ لے گا۔

بکریوں کو پٹک کر جیسے ذبح کرتا ہے ......

بہت دیر تک وہ گردن لمبی کر کے جھانکتے رہے۔ کوئی کلبلاہٹ ؟ سرسراہٹ ؟ ؟ کوئی ہیں یاں کی آواز ؟ ؟ ؟ کچھ نہیں۔ آخر رونی صورت بنائے بکرے بکریوں کے ریوڑ کو ہانکتے جائے قصاب کے یہاں ۔ دل میں طوفان لئے .....

"وہ قصاب۔"

"کلو استاد ۔"

"مارے گئے ......"

ادھر بکری کیسے نہ کیسے کھڈے سے نکل، پہنچی بڑھیا کے پاس، بڑھیا گھر پر نہیں تھی، پوتا تھا۔ کانٹوں سے بھری، لہولہان بکری کو دیکھتے ہی پہچان گیا اور تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگا، خوشی سے جھومتا بکری کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ بکری کی وہ ساری رگیں جو کئی دنوں سے تنی ہوئی تھیں ڈھیلی پڑنے لگیں، بکری ہواؤں میں اڑنے لگی، غبارہ کی طرح، آنکھوں میں ایسی چمک عود کر آئی گویا وہ ایک دم سے ماں ہو گئی ہو ....

بڑھیا آئی تو بجائے خوش ہونے کے رونے لگی، آنکھوں سے ٹپ ٹپ پانی بہنے لگا، وہ بکری کے گلے باہیں ڈالے سسک سسک روتی رہی...... پھر تھنوں کو دیکھا جو کسمسا رہا تھا بلکہ ٹپ ٹپ دودھ ٹپک رہا تھا دوڑی دوڑی اندر سے مٹی کا آبخورہ لے آئی، تھنوں کو ہاتھ لگایا کہ سفید گاڑھا، اشتہا انگیز دودھ بھر بھر آبخورے میں گرنے لگا۔

ساری دنیا، سیاہ بدہیئت دنیا، اُجلے اُجلے جھاگوں بھرے دودھ، میں یوں نہا گئی کہ ذرہ ذرہ موتیوں کی طرح چمکنے لگا اور سفید جھاگ کے بلبلوں میں، ہزاروں آبگینوں میں، ایک ایک نہ رہا انیک ہو گیا، ایک بڑھیا کئی چھوٹی چھوٹی بڑھیاؤں کی، ایک بکری کئی ننھی ننھی بکریوں کی، اور ایک پوتا، کئی ننھے ننھے پوتاؤں کی صورت میں جلوہ گر، جھلملاتے للچاتے چہچہاتے سارے عالم میں اوپر سے نیچے، اور نیچے سے اوپر اور اُدھر، اور اُدھر نظر آنے لگے، اور یہ عالم سنگ وحشت، رنگوں، کیفیتوں، اور جذبوں، سے بھر گیا۔۔

ادھر کئی گھنٹوں تک کلو قصاب نے جب اچھی طرح لونڈوں کو پیٹ لیا اور ان کی ماں بہنوں سے بیک وقت رشتے جوڑ جوڑ کر تھک گیا تو اس کے دماغ میں اچانک ایک بات کوندی، پیشانی پر کنکھجورے آ گئے۔ اس کا ہاتھ

آپ ہی آپ مونچھوں پر گیا، پھر وہ لپکا بڑھیا کے یہاں، دیکھا تو سچ مچ اس کا گمان صحیح تھا۔

تب اس نے، اس کلو اقصاب نے پہلے بڑھیا کو ایک دھکا دیا، آپ خورسے کو ٹھوکر ماری، پھر بکری کو ایک زوردار لات رسید کرنے کو تھا کہ اس کی آنکھیں بکری کی آنکھوں سے ٹکرا گئی۔

"سالی حرام جادی، دیکھتی ہے کیسی......" وہ منہ ہی منہ میں بدبدایا" چل ابھی ڈنڈا کرتا ہوں.. ...." مادر چود..، حرام خور یہاں دودھ کی ندی بہار ہی ہے، کچھ کھائے پیئے بغیر اور وہاں یار کے گھر میں پتھر ہو گئی تھی۔

کلو اقصاب نے کندھے سے گمچھا اتارا اور بکری کے گلے میں ڈال کر اسے طویلے کی طرف گھسیٹنے لگا ......بکری زور سے منمنائی اور دونوں پیروں ہاتھوں کو زمین میں روپ کر بیٹھ گئی، پتھر ہو گئی۔

ایک دم پتھر ہو گئی......!

مگر کلو اقصاب بھی کم نہ تھا، وہ پتھر ہو گئی تو وہ چٹان تھا، پتھر کا بھی باپ، اس نے جھک کر بکری کے آگے پیچھے ہاتھ دیئے اور جھٹکا دے کر اسے گود میں اٹھالیا، بکری چلاتی رہی، ممیاتی رہی، ہاتھ پاؤں پٹکتی رہی لیکن کلو قصاب پھر کلو قصاب ہی تھا۔ لوگ باگ رک رک کر دیکھتے، ٹوکتے رہے ہنستے ہنساتے گذرتے رہے۔

لوگوں کا کیا ہے وہ تو پروانہ (پرندے) کو بھی نگل جاتے ہیں گلاب کے پھولوں کو بھی (گلقند) کھا جاتے ہیں۔ اور لمبی ڈکار لے کر یوں مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں گویا کوئی معمولی بات نہیں، بہت بڑا کارنامہ ہے۔

اب کلو قصاب بھی بکری کو گود میں لئے یوں چل رہا تھا، لوگوں کو داد طلب نظروں سے تک رہا تھا گویا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

اس بار وہ طویلے میں آنے کے بجائے بکری کو لئے دیئے سیدھے مذبح پہنچا زور سے پٹخ کر اس پر سوار ہو گیا۔

حرام جادی،.......اب تیری خیر نہیں.......(بکری یا بکری کی ماں کب تک خیر مناتی)

وہ چیختی چلاتی، ممیاتی رہی، لاکھ ہاتھ پیر مارے، لیکن سب بیکار۔ کلو قصاب کوئی معمولی قصاب ہوتا تو شاید دو چار دنوں کے لئے..... نہ سہی گھنٹے دو گھنٹے کے لئے ضرور چھوڑ دیتا، بکری کو ذبح کرنے سے پہلے دو گھونٹ پانی ضرور پلاتا کہ رسم دنیا بھی ہے اور سنت بھی اور دستور بھی۔ مگر اس نے تو ذرا رعائت نہیں کی پاس کھڑے لونڈوں کو اشارہ کیا چمڑے کے نیام سے تیز دھار والی چھری نکالی، دھار پر انگلیاں پھیرنے کو ہوا

تو اچانک چونک گیا۔ مگر کیوں چونکا...... سمجھ نہ سکا..... ہو نہ ہو..... دھار تو کچھ زیادہ ہی تیز ہے....

لیکن جیسے ہی بکری کی گردن پر چھری پھیرنے کو تھا کہ کلو قصاب کی نظر اس کے تھن پر گئی جو دودھ کی حدت سے سرخ ہو رہے تھے، اس کی زبان آپ سے آپ ہونٹوں کی خبر لینے لگی سارے منھ میں گاڑھے ایمان کی طرح کے کھرے دودھ کا ذائقہ پھیل گیا، ہاتھ آپ سے آپ مونچھوں پر پہنچ گیا.....

"بکری کو چھوڑ دو!" اچانک اس زبان سے یہ الفاظ یوں ادا ہوئے کہ اسے خود تعجب ہوا۔

"آئیں..... کیا استاد۔؟۔ لونڈا جو ایک ران بکری کے پچھلے حصے پر، اور دوسری گردن پر رکھے ہاتھوں سے اسے دبائے بیٹھا تھا، چھوڑ دوں'؟؟

ہاں چھوڑ دے ابھی، ہم پہلے اس کا دودھ پئیں گے..... دوڑ کر لوٹا لے آ.....!

پر لونڈا لوٹا لے کر آیا، اور استاد نے بکری کو دوہنا چاہا، تو تھن پھر ایک دم سے سخت پتھر!

حرام جادی چُرا گئی...... اچھا دودھ نہیں تو نہ سہی ہم تیری کھیری کھائیں گے..... کھیری کھائیں گے کھیری کھائیں گے...... دودھ سے بھری کھیری......

پھر چھری لے کر گردن پر رکھ دی......

بسم اللہ حر...... رحمٰن رحیم...... یعنی شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا.......

مطلوب ختم......!

یعنی آنکھوں کا تھا قصور، چھری دل پر..... گردن پر ہی سہی..... چل گئی۔

کلوا قصاب نے خوب جھوم جھوم کر لطف لے کر کھال اتاری، بوٹیاں بنائیں، دل کھول کر اونے پونے دن ڈوبتے ڈوبتے سارا گوشت بیچ ڈالا۔

چلئے قصہ تمام ہوا، بہت اتفاقی تھی رنڈی...... سارا گوشت بک گیا، اب لوگ باگ مزے لے لے کر بکری کا گوشت کھا رہے ہوں گے۔ جھوم رہے ہوں گے۔ قصاب کی تعریفیں کر رہے ہوں گے.....!

مگر دوسری صبح جو پہلا گاہک دوکان پر آیا، اس نے چھوٹتے ہی شکایت کی،

کیا گوشت دیا تھا کلو بھائی...... سارا دن چولہے پر چڑھا رہا مگر گلا ہی نہیں.......

ہاں جی ٹھیک کہتے ہو، کلو قصاب نے منھ بنایا گلا نہیں۔ میں نے بھی نہیں.....

پھر رات کو کھانے بیٹھا تو.....

ہاں، کلو قصاب پہلے ہی سمجھ گیا۔

گاہک نے منھ بنایا، "منھ میں رکھا، چبایا تو ایسا کڑوا ایسا کڑوا تھو، آ

قصاب نے بھی دہرایا،...... ہاں تھو، آخ تھوہ..... □

دوماہی الفاظ

۱۵۳/۳ بی، جنک پوری، نئی دہلی

دیویندر اسر

میرا نام شنکر ہے

نئے مکان میں آئے مجھے چند دن ہی ہوئے تھے۔ لیکن مجھے جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ اس کے پاس کے لوگ میری طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کچھ دن تک مجھے یہ سمجھ میں نہ آیا کہ مجھ میں کون سی ایسی بات ہے کہ لوگ مجھے حیرت سے دیکھتے ہیں۔ کیا میں کوئی عجوبہ ہوں! لیکن جب ذرا جان پہچان بڑھی تو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

——کیا آپ ۱۲ نمبر میں آئے ہیں۔ کسی نے پوچھا۔

——نمبر ۱۲ میں آپ ہی آئے ہیں۔ کوئی دوسرا کہتا ہے۔

——اچھا تو آپ ہی نمبر ۱۲ میں رہتے ہیں کسی اور نے کہا۔

——نمبر ۱۲۔ اچھا۔ اچھا جس میں وہ صاحب رہتے ہیں۔ برساتی میں۔ ایک اور آواز تھی۔

—— وہ صاحب کون؟ میں نے پوچھا۔

——وہی جو کچھ کچھ—— انھوں نے ہاتھ کی انگلی اپنے سر کے قریب گھمائی۔ یعنی سنکی ہیں۔

تب بات میری سمجھ میں آئی کہ یہ حیرت میرے باعث نہیں اس شخص کے بارے میں ہے۔ جو مکان نمبر ۱۲ کی برساتی میں رہتا ہے۔ اور تعجب کی بات یہ تھی کہ کوئی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ کتنی پر اسرار ہستی تھی وہ——

اب جب میں سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ لوگ کچھ کچھ صحیح ہی کہتے ہیں۔ میں نے بھی اس شخص کو بہت کم دیکھا ہے۔ شاید بالکل نہیں دیکھا۔ محض اس کی پرچھائیں دیکھی ہے جو دن، دوپہر دھوپ میں یا رات چاندنی کی روشنی میں ٹیریس پہ ٹہلتے ہوئے۔ کرتے پاجامے میں یا چادر اوڑھے ہوئے۔ اور کبھی کوئی آواز نہیں سنی سوائے رات کے آخری پہر میں کبھی کبھار ستار کی ہلکی ہلکی سرودیں کے۔ ایسی آواز جو چھت سے دیواروں کے اندر ہوتی ہوئی میرے بستر کی سلوٹوں میں تیرنے لگتی ہے۔ اس کے کمرے کی روشنی اکثر رات کے تیسرے پہر تک جلتی رہتی ہے۔

یہ شخص کب سوتا ہے! کب جاگتا ہے! کیا کام کرتا ہے! یا کچھ نہیں کرتا! اسے کہیں آتے جاتے بہت کم دیکھا ہے۔ کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا یونہی دھوپ، چاندنی اور ہوا پانی پہ زندہ رہتا ہے۔ کئی بار من چاہا کہ سیڑھیوں پہ

پڑھ اس سے آمنا سامنا کروں اور اس نے اپنے اردگرد اس کا جو جال بن رکھا ہے اسے تار تار کر دوں۔

لیکن ــــ

اور ایک روز میں نے اپنے آپ کو اس کے دروازے کے سامنے کھڑا پایا۔ بالکل غیر ارادی طور پر تو نہیں لیکن مکمل ارادی طور پر بھی نہیں۔ اس رات بارش زوروں پر تھی۔ چھت پر ٹپ ٹپ بوندوں کے گرنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی اور اس آواز میں اس کی ستار کی سروں نے مل کر ایک جادوئی اثر پیدا کر دیا تھا۔ ایسا اثر کہ آدمی نہ سو سکے نہ جاگ سکے۔ بس نیم جنون کی حالت میں سر دھن سکے۔

میں نے چائے پینے کے لئے سوچا لیکن ماچس مل نہیں رہی تھی۔ جو ملی بھی وہ شاید بارش کی بوندوں سے اتنی نم ہو گئی تھی کہ جل ہی نہیں رہی تھی بس چا کیوں نہ اس سے ماچس لے آؤں۔ شاید چائے پینے کے بعد کچھ نیند آ جائے۔ میں دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ بس اتنا عمل ارادی تھا۔ باقی جو کچھ ہوا وہ بالکل غیر ارادی تھا۔

اس کا دروازہ نیم کھلا تھا۔ دروازے کے باہر چھت پر روشنی شیشے کے صلیب کی مانند پڑی تھی اور اس شیشے کی صلیب پر بارش کی بوندوں کا مدماتا رقص جاری تھا۔ اور ستار کی سریں فرش پر پھیلتی روشنی اور بوندوں میں تھرک رہی تھیں۔ میں چند لمحے سحر زدہ اس طرح خاموش کھڑا رہا اور پھر اچانک میرا ہاتھ دروازے پر دستک کی صورت میں پڑا ــــ اندر آ جائیے۔ آپ اتنی دیر سے باہر بارش میں کیوں کھڑے ہیں" اس نے کہا جیسے اسے میرے اوپر آنے کا احساس ہو گیا تھا۔ کیا عجب شخص ہے نہ کوئی خوف نہ استعجاب کہ اتنی رات گئے کون اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اجنبی۔ دوست یا دشمن چور ڈاکو۔ لٹیرا یا خفیہ کا آدمی مخبر!

میں دھیرے دھیرے اندر داخل ہوا۔

بیٹھئے ــــ اس نے کہا ــــ

میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ سامنے اسٹو پر پانی کھول رہا تھا۔

ــــ چائے تو آپ پئیں گے ہی۔ اس نے کہا۔

یہ حکم تھا یا دعوت - - میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ کرسی سے اٹھا۔ اس نے کیتلی میں تھوڑا پانی اور ڈال دیا۔ میں نے چاروں طرف ایک اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ کتابیں، تصویریں اور رنگ برنگے مختلف اشکال کے کیوبک نما پتھر، اور میز پر پائپ اور ایش ٹرے۔

وہ واپس مڑا۔ میں جیسے خواب سے چونکا۔

ــــ دراصل میں آپ سے ماچس ہی لینے آیا تھا۔ چائے بنانے کے لئے ــــ آپ ستار بہت اچھا بجاتے

ہیں۔ میں نے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔

—— آپ نے پوچھا نہیں کہ میں کون ہوں!" میں نے کہا۔

وہ پھر مسکرا دیا۔

—— اس سوال کا جواب تو میں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں"!

—— میں اس ۱۲ نمبر میں نیچے والی منزل میں رہتا ہوں۔ ابھی ابھی آیا ہوں؟" میں نے کہا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

کیا میں نے کوئی غیر واجب بات کہہ دی۔

اس نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا—— آپ کا کوئی نام تو ہوگا ہی۔ یا محض ۱۲ نمبر والے مکان میں رہنے والا کوئی ایک شخص ہے۔"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ بولا—— میرا نام شنکر ہے۔ اور گلی محلے کے لوگ بس اتنا جانتے ہیں کہ میں نمبر ۱۲ کی برساتی پر رہتا ہوں۔" وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا—— اور پھر اچانک بولا۔ جیسے میں حساب کا کوئی ہندسہ ہوں۔"

اس نے چائے کی چسکی لی اور خاموش ہو گیا۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔

—— تو آپ کو لوگ نہیں ہندسہ ناپسند ہیں۔ میں نے کہا——

—— جی ہاں۔ وہ لوگ جو محض ہندسہ بن کر رہ گئے ہیں۔" وہ ۱۲ نمبر کے مکان میں رہتا ہے۔ وہ تین لڑکیوں والا—— وہ جو ۲۰۷ نمبر کی بس پر جاتا ہے —— ہمارا پورا سماج، ہمارا تمام کلچر، نظم و نسق چلانے والی مشین، اخبار نویس، اہل دانش—— سب کے سب نے سازش کر رکھی ہے کہ وہ ہر شخص کو ایک ہندسے میں بدل دیں۔ اس کا نام، اس کا چہرہ، اس کی شخصیت، اس کا دل دماغ، احساس، فکر محض ایک ہندسہ بن کر رہ جائے۔ کیا یہ ماتم کا مقام نہیں کہ اخبار والا جو برسوں سے مجھے اخبار دے رہا ہے وہ بھی جب بل لاتا ہے تو اس پر لکھا ہوتا ہے ——" شری مان نمبر ۱۲ جی——"

اس کے اندر کی جمی ہوئی برف جیسے پگھل کر باہر آ رہی تھی۔

لیکن آپ کو یہ احساس کب ہوا۔ اور اس بارے میں آپ زود حس کیوں ہیں۔ یہ تو عام رواج ہے۔ کام کاج کو سہل ڈھنگ سے چلانے کا۔ میں نے کہا

وہ جیسے ماضی میں کھو گیا۔

چند برس پہلے کی بات ہے۔ میں بہت زیادہ بیمار ہوگیا تھا۔ اور مجھے ہاسپٹل داخل ہونا پڑا۔ وارڈ نمبر ۲ بستر نمبر ۹۔ ایک روز میری حالت اچانک خراب ہوگئی۔ سانس کی رفتار جیسے رکنے لگی۔ میرے پہلے میرا کوئی عزیز دوست، رشتے دار نہیں تھا۔ میں نے نرس کو بلایا۔ وہ آئی میری حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی۔ اس نے ڈیوٹی پر ڈاکٹر کو فون کیا۔ بیڈ نمبر ۹ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ شاید کارڈیک ایسولیشن کا خطرہ ہے۔" میرے جسم میں جیسے ایک دم سے جان آگئی "سسٹر۔ بیڈ نمبر ۹ کی حالت خراب نہیں۔ میری حالت خراب ہے۔ میرا نام شنکر ہے۔" ہاں ہاں۔ بیڈ نمبر ۹ کے مریض مسٹر شنکر کی حالت خراب ہے۔ اس نے کہا۔ جب میری حالت کچھ سنبھلی تو میں سوچنے لگا کہ میں محض وارڈ نمبر ۲ کا بیڈ نمبر ۹ ہوں۔ میرا کوئی نام نہیں، کوئی چہرہ نہیں، کوئی احساس نہیں، کوئی شخصیت نہیں، کوئی شناخت نہیں سوائے ایک ہندسہ کے۔ جوں جوں میں سوچتا جاتا میرا اضطراب بڑھتا جاتا۔ میرے ماں باپ نے مجھے شنکر نام دیا ہے۔ مجھے یہ نام پسند بھی ہے۔ لیکن اسکول میں محض رول نمبر ۱۱ بن کے رہ گیا۔ رول نمبر ۱۱ ایس سر آج رول نمبر ۱۱ نہیں آیا۔ یس سر۔ ہندوستان چھوڑو تحریک میں میں چند روز کے لئے جیل بھی گیا۔ وہاں میں قیدی نمبر ۵ تھا۔ جس جس مکان میں رہتا رہا اس کا نمبر مجھ سے لپٹتا چلا گیا۔ کہاں تک یہ داستان امیر ہندسہ سناؤں، یہ داستان بہت لمبی ہے۔ ریاضی کی پوری کتاب ہے۔ میں جب آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں تو میرے چہرے پر بے شمار ہندسے جمع، تفریق، ضرب تقسیم ہوتے ہوئے کوڑوں کی ضربوں کے نشانوں کی طرح ابھر آتے ہیں۔

آخر تنگ آکر میں نے اپنے ہی نام کی چادر پرنٹ کروائی، لوگ رام نامی اوڑھتے ہیں اور میں شنکر نامی۔ حالانکہ میں وشنومت کا ماننے والا ہوں۔ لیکن شنکر نامی کے باعث شیومت کا پیروکار بن گیا۔

میں نے اب غور سے دیکھا کہ جو چادر وہ اوڑھے ہوئے ہے اس پر مختلف زبانوں میں شنکر شنکر لکھ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ فرنچ، جرمن، روسی۔ اسپینی اور انگریزی میں بھی۔ اس نے چائے کی آخری چسکی لی اور پیالی ایک طرف سرکاتے ہوئے پائپ سلگایا۔ وہ کرسی سے اٹھا۔ سامنے شیلف سے ایک کتاب اٹھا لایا۔ اور ورق الٹتے ہوئے ایک جگہ رک گیا۔

میرے قریب آؤ ——— اور قریب، اس کے ایک ہاتھ میں کتاب تھی اور دوسرا ہاتھ اس نے میرے کندھے پر رکھا ——— سنو ——— وشنو دگمبر ———"

——— میں وشنو دگمبر نہیں، بشن دیال ہوں۔" میں نے کہا۔

——— خیر وشنو مہاراج جی ——— سنو شنکر کیا کہتا ہے

"مہذب تواریخ میں پہلی بار شاید تمام تواریخ میں پہلی بار ہم اس دبائے ہوئے علم کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور کئے گئے ہیں کہ ہماری شخصیت کا سب سے چھوٹا رخ، یا ہمارے خیالات کا سب سے مختصر اظہار یا خیالات کی عدم موجودگی اور شخصیت کے فنا کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اعداد و شمار کے ایک وسیع عمل میں ایک صفر

کی موت پہ صبر نہیں۔ جہاں ہمارے دانت گر جاتے [illegible] ہمارے بال محفوظ رکھے جائیں گے لیکن ہماری موت بغیر نام، بغیر تنظیم اور بغیر دکھ کے رہے گی۔ موت کسی کینسر وارڈ میں ہو یا ریڈیو ایکٹو شہر میں۔ آج اس تہذیب نے انسان کی حالت کے لئے آئینہ پیش کیا ہے اور جس نے کبھی اس میں دیکھا وہ اندھا ہو گیا۔ —— وہ اندھا ہو گیا ——" اس نے دہرایا

اس نے اپنے گرد سے شنکر تام کی چادر ہٹا کر پرے رکھ دی۔ اور میرے سامنے بالکل سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ میری نبض تیز تیز چلنے لگی دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئی۔ اور رگوں میں خون جیسے تیز و تند سیلاب کی مانند امڈنے لگا۔ اور جیسے جو کچھ بھی میرے اندر ہے جسم کی حدوں کو توڑ کر باہر آنے کے لئے بے تاب تھا۔ سب کے سب بند ٹوٹنے والے تھے۔

—— اچھا شنکر میں چلتا ہوں پھر کبھی آؤں گا۔ میں باہر کی طرف لپکا۔ وہ اس طرح سیدھا تن کر کھڑا تھا شولنگ کی طرح، یونی سے اٹھتا ہوا۔ آکاش کی طرف بڑھتا ہوا —— باہر دروازے سے نکلتی روشنی میں اس کی پرچھائیں فرش پر بے حرکت پڑی تھی اور اس پہ بارش کی بوندوں کا ابدی رقص ابھی تک جاری تھا —— □

جنوری - اپریل ۱۹۸۱ء

رام لعل

شانتی نکیتن، ڈی ۲۲۹۰ رام ساگر مصرا نگر
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۰

کئی سال پہلے کا وہی دن

بیشتر زخم وقت کے ساتھ ساتھ مندمل ہو جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑ جاتے۔ یہ جملے سریتا کے پتی نے ہنستے ہنستے کئی بار کہے ہیں۔ پتہ نہیں اس کا مقصد کیا ہوتا ہے یہ وہ آج تک نہیں جان سکی۔ اس کے ساتھ اس کے پانچ سال بیت چکے ہیں۔ لیکن اسے یہ یقین نہیں ہو سکا مہندر نارنگ نے کبھی کسی سے واقعی محبت کی ہوگی! پشپا اس کی زندگی میں بیس سال پہلے آئی تھی۔ اس سے بھی وہ محبت کا اظہار نہیں کرتا۔ لیکن پشپا نے اس بات کی کبھی شکایت بھی نہیں کی۔ وہ اسی بات سے مطمئن نظر آتی ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ سریتا تو بہت بعد میں آئی ہے۔ اس کے ساتھ بھی اس کی شادی محبّت کا نتیجہ ہرگز نہیں تھی۔ ہندوستان میں بیشتر لوگ شادی کے بعد ہی محبّت کرنے کا دعوی کرتے ہیں۔ نارنگ نے تو یہ دعوی بھی ابھی تک نہیں کیا ہے وہ دونوں بیویوں کی موجودگی کو گھر کے بہت ضروری سامان کی طرح سمجھتا ہے۔ فرنیچر، فرج، ٹی وی، قالین، موٹر کار وغیرہ کی طرح۔ اور جس طرح وہ ان ساری چیزوں کی دیکھ ریکھ کرتا ہے اسی طرح پشپا اور سریتا کی بھی۔ دونوں کی صحت ٹھیک رہنی چاہئے، دونوں کو اعلے سے اعلے کپڑے اور گہنے وغیرہ ملتے رہنے چاہیئے اور وہ اپنی من پسند غذائیں پوری آزادی سے کھا سکیں اور اپنے اپنے رشتے داروں سے بلا روک ٹوک مل سکیں۔ اور وہ دونوں کے ساتھ اس قدر نرمی اور شفقت سے پیش آتا ہے کہ انھیں ایک لمحے کو بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ان پر دل وجان سے فدا نہیں ہے۔!

سریتا نارنگ نے اس کی زندگی میں آنے سے پہلے اس کی ان ساری خصوصیات کا اندازہ کر لیا تھا۔ اور یہی سوچا کہ وہ پوری طرح مطمئن رہے گی۔ جب اسے یہ تک یقین دلایا گیا تھا کہ پشپا نارنگ اپنی سوت کے ساتھ حسد نہیں کرے گی تو وہ اس سمجھوتے کو قبول کیوں نہ کرتی۔ اسے ایک پتی کی سخت ضرورت تھی۔ ایسے ہی ایک پتی کی جس کے پاس سب کچھ ہو۔ وہ اسے مل چکا تھا۔ لیکن وہ ہر خوبصورت اور جوان بیوی کی طرح یہ بھی گھات لگائے رہی کہ رفتہ رفتہ اپنے آدمی پر پورا قبضہ کر ہی لے گی۔ جو عمر میں اس سے تیس برس بڑا ہے۔ بڑی عمر کے پتی زیادہ بھوکے ہوتے ہیں۔ وہ جوان بیویوں پر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ وہ اس کی بڑھیا کو بڑی آسانی سے کسی روز ایک الگ

کونے میں ڈال دینے میں کامیاب ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی اور صدمہ بھی پہنچا کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے پہلے سے بھی زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ اس کی حیثیت گھر میں ایک جونیئر دالف کی ہی ہے جسے ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے وہ کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت یہ اس کے لئے ایک شکست ہے۔ اس کی انا کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اِسی کشمکش سے بچنے کے لئے اس نے پھر سے یونیورسٹی کی ملازمت لے لی تھی۔ جسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے وہ اس گھر میں آئی تھی۔ لیکن اب وہ روزانہ پڑھانے کے بہانے سے اس ماحول سے چند گھنٹوں کے لئے دور چلی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کی مصروفیات نے رفتہ رفتہ اسے ایک دوسری راہ پر ڈال دیا ہے۔ جس میں صبر و سکون ہے اور ایک انٹلکچوئل طریقے سے ساری باتوں پر غور و فکر کرنے کی تحریک بھی مل جاتی ہے۔ جب کبھی وہاں کوئی فنکشن ہوتا ہے اور مہندر اس کے ساتھ ہوتا ہے وہ کبھی کبھی اسے وہاں ڈراپ کرنے کے لئے یا واپس لے جانے کے لئے آجاتا ہے تو اسے اچانک اپنا وجود بہت اہم لگنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس کے سامنے کسی کی ملکیت ہونے کے احساس میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ان لمحوں کو یکسر فراموش کر بیٹھتی ہے کہ اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے!

گھر لوٹ کر وہ ایک تکلیف دہ معمول میں پھنس جاتی ہے۔ ایک اس کا اپنا کمرہ ہے جہاں اس کی تعلیمی کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہیں، ایک آرام دہ صوفہ ہے، ایک رائٹنگ ٹیبل ہے جس پر ہر وقت ایک ٹائپ رائٹر اور بڑے سے خوبصورت شیڈ والا لیمپ پڑا رہتا ہے اور اسی میز کے قریب اس کا ایک چوڑا آرام دہ پلنگ پڑا ہوا ہے۔ جس پر وہ اکثر و بیشتر تنہا ہی ہوتی ہے۔ مہندر کبھی کبھی اچانک آبھی جاتا ہے تو زیادہ دم تک نہیں رکتا۔ اور اس کمرے کے ساتھ ہی ملحق اس کا اپنا صاف ستھرا باتھ روم ہے۔ اور اس کمرے کے باہر لمبا سا گول برآمدہ ہے اور ایک شاندار ڈائننگ روم ہے جہاں گھر کے سارے افراد مقررہ وقت پر گانگ کی آواز سنتے ہی ناشتے اور کھانے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور پھر وہ بھی اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ اتنے بڑے گھر کے سارے ملازم بھی گھر کے اصولوں اور ضابطوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہر شخص ایک خاص مقررہ تنخواہ پاتا ہے اور ایک خاص مقررہ ڈیوٹی سر انجام دیا کرتا ہے۔ اور وہ سب بھی اس ٹھنڈے گھریلو نظام سے پوری طرح مطمئن نظر آتے ہیں۔ اس گھر کے دونوں ایلسیشین تک بڑی خاموشی سے گھومتے رہتے ہیں یا زنجیروں سے بندھے ہوئے خاموش پڑے رہتے ہیں۔ اس نے کبھی کسی کی اونچی آواز نہیں سنی ہے۔ کسی کو کسی بات پر پروٹسٹ کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ پروٹسٹ تو اس نے بھی کبھی نہیں کیا۔ لیکن اس کے اندر ایک احتجاج یقیناً موجود رہتا ہے۔ بھلے ہی وہ اسے دبا کر رکھتی ہے اور کسی سے کچھ نہیں کہتی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی ہے مہندر نے اس کے ساتھ شادی کیوں کی ہے، وہ اس گھر میں نہ آئی ہوتی تب بھی

اس گھر کے معمولات میں ذرا سا بھی فرق نہیں آتا۔ مہندر نے اسے بیوی بنا کر اپنی کون سی ضرورت پوری کر لی ہے؟ اس کے گھر میں اتنے زیادہ شو پیس موجود ہیں۔ ان میں ایک اور اضافہ نہ ہوا ہوتا تو کون سا بڑا فرق پڑ جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کے مہمانوں کے ساتھ بڑی اچھی گفتگو کر لیتی ہے۔ پولٹکس، سماجیات اور کبھی کبھی لٹریچر پر بھی۔ اگر کوئی مہمان واقعی اس ذوق کا مالک ہوتا ہے۔ مہمانوں میں کئی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ خالص تجارتی ذہن کے اونچی سیاسی سطح کے، پروونشیل بیوروکریسی سے قریبی تعلق رکھنے والے اور کبھی کبھی کوئی منسٹر یا گورنر بھی آنکلتا ہے۔ اسے اپنے مہمانوں کے ساتھ محو گفتگو یا ان کے درمیان اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر نارنگ واقعی بہت خوش نظر آتا ہے لیکن وہ اسے بار بار اس طرح خوش کر کے بھی اس پر اپنا قبضہ نہیں جما پاتی ہے۔ وہ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی پھر وہی کچھ بن جاتا ہے جو کچھ وہ ہے ایک باوقار، متین، مہذب اور خاصا آسودہ لینڈ لارڈ۔ جس کی جائیداد بہت بکھری ہوئی ہے۔ بڑے بڑے لان اس نے رہائش یا تجارتی بلڈنگوں میں تبدیل کر دیئے ہیں۔ بہت کچھ بیچ بھی چکا ہے۔ سیلنگ کے ڈر سے۔ شاید سیلنگ کے ہی ڈر سے مہندر نے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ تاکہ ایک اور پارٹنر بن جائے۔

اُسے یاد ہے کہ ایک روز مہندر نے اسے صبح سویرے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ اس وقت وہ ایک میز کے سامنے بیٹھا حسب معمول شیو بنا رہا تھا۔ شیو بناتے بناتے وہ اس کے ساتھ جائیداد کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کرتا تھا۔ جس بلڈنگ کو اس نے ایک کمرشیل بینک کے حوالے کر رکھا تھا اسی کو وہ اس کے نام لکھ دینا چاہتا تھا۔ وہ جائیداد کی اتنی بھوکی نہیں تھی اس لئے وہ اس کی ساری گفتگو بھی نہیں سن سکی تھی۔ اس کی نظر شیونگ کریم کی ٹیوب پر ٹکی رہتی تھی جسے اس نے انجانے ہی میں ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔ ٹیوب کے اندر آدھی سے کم ہی کریم ہوگی لیکن اس کے بیرونی حصے پر کوئی شکن نہیں پڑی تھی۔ جس طرح وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کا عادی تھا ویسی ہی احتیاط ٹیوب جیسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو استعمال کرنے میں بھی برتتا تھا۔ ایسی ہی شیونگ کریم کی ایک ٹیوب کو اس نے کئی برس پہلے آدرش کے پاس دیکھا جو بالکل مڑی ہوئی تھی اور اس کی ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کی بھی ویسی ہی گت بنی ہوئی تھی۔ اس نے آدرش سے مصنوعی غصے سے پوچھا تھا۔ اُف تم کس قسم کے وحشی ہو! اتنی نرم و نازک چیزوں کو بھی ایسی بے رحمی سے استعمال کرتے ہو!"

آدرش بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا ۔۔۔ "تم نے شاید ان چیزوں میں اپنے آپ کو دیکھ لیا ہے سچ سچ کہنا، تم ڈر گئیں ناکہ کہیں میں تمھارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک نہ کر دوں؟"

وہ خاموش سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ آدرش نے جو کچھ کہا تھا ممکن ہے سچ نکلتا۔ لیکن یہ بھی تو ایک سچ تھا کہ

وہ بہت زیادہ وحشی واقع ہوا تھا۔ وحشی اور مطلب پرست۔ جب اس نے آدرش کے سامنے شادی کا سوال رکھا تو وہ اپنے خاندان بھر کے بکھیڑے لے بیٹھا۔ فلاں فلاں بھائی بے حد دقیانوسی واقع ہوا ہے۔ میری فلاں موسی میرے خلاف طوفان برپا کر دے گی، اور میرے بیوی بچے تو میری اس حرکت کو کبھی معاف نہیں کریں گے، ہوسکتا ہے میرا لڑکا جو بے حد ابنارمل واقع ہوا ہے میری جان ہی لے لے ——— کیا تم چاہتی ہو میں مار ڈالا جاؤں؟ میرے بغیر تم میرے گھر میں کیسے رہ پاؤ گی! سوچ لو۔"

سریتا کو یہ سوچنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگی تھی وہ ایک بہت بڑا سماجی بزدل تھا ——— ڈیم سوسائٹی کا ورڈ اینڈ مڈل کلاس سوسائٹی میں زیادہ بہادر عاشق شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اس طبقہ کا آدمی صرف تماشہ دیکھتا ہے بڑی انٹلکچول قسم کی بحث کر لیتا ہے اور خوش بھی رہتا ہے۔ محبت کرتا ہے تو محض شغل کے طور پر۔ جس میں کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔ خطرہ ہو بھی تو وہ اس کی ذمہ داری نہیں اٹھاتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک اسے ایک رکھیل سمجھ کر اس سے ملتا رہا تھا۔ جب جی چاہتا اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ دو چار روز رہنے کے لئے ایک ٹورسٹ لاج میں کمرا ایک کرا لیتا تھا۔ معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کے لئے یہ کھیل بہت دلچسپ بن جاتا ہے۔ وہ اسے ایک اڈونچر سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں۔ کیوں کہ وہ فطرتاً اڈونچرس ہوتی ہیں۔ انھیں بچپن ہی سے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکیں گی ——— ماں باپ بھی انھیں ہر وقت یہی احساس دلاتے رہتے ہیں۔ بہت زیادہ محبت کرتے ہیں، بہت اچھے کپڑے دیتے ہیں، بہت اچھی تعلیم و تربیت بھی کہ دوسرے گھر میں جا کر ہمیشہ خوش و خرم رہ سکیں۔ اجنبی لوگوں کے ساتھ اڈجسٹ کر سکیں۔ اور ان کا نام بھی روشن کر سکیں کہ وہ فلاں گھر کی اولاد ہیں! جو ماں باپ خود ان کے لئے رشتہ نہیں تلاش کر پاتے ان سے یہ توقع بھی رکھنے لگتے ہیں کہ وہ خود اپنا ساتھی تلاش کر لیں گی۔ اس قدر کشادہ دل ہونے کے اشارے وہ کئی موقعوں پر دیتے رہتے ہیں۔ سریتا اپنی زندگی کی بے شمار سوچوں کا سمندر پار کر کے آدرش تک پہنچی تھی۔ لیکن اس کا رویہ کسی مچھلی کو نگل لینے کا ہرگز نہیں تھا ——— آدرش ایک مچھلی جیسا بھی ہرگز نہیں تھا۔ ایک خوش شکل، خوش اطوار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ادھیڑ عمر لیکچرار تھا۔ دونوں کی ملاقات ایک یونیورسٹی کے تعلیمی سیمینار میں ہو گئی تھی۔ اور وہ بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ شروع کی ملاقاتوں میں آدرش نے اسے یہ تاثر ہرگز نہیں دیا تھا کہ وہ سماجی طور پر حد درجہ محتاط واقع ہوا ہے۔ وہ اسے لمبے لمبے محبت بھرے خط لکھا کرتا تھا۔ اس کے شہر میں آجاتا تو اس کے ساتھ گھومنے پھرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھاتا تھا۔ اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو ——— اس کے پیچھے جو کچھ بھی تھا ——— بیوی، بچے، پوری دنیا ——— اس سے جیسے دور ہو جانے کے لئے ہی سریتا کے پاس چلا آتا ہے۔ سریتا نے اسے اس حیثیت سے بھی قبول کر لیا تھا۔ اس نے کسی نوجوان مرد کے خواب دیکھنا ترک کر دیا

تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا اب اس کی منزل بھی دور نہیں رہ گئی، کسی روز اچانک اپنی بیوی اور بچوں سے الگ ہو جانے کے مسائل پر اس کے ساتھ گفتگو لے بیٹھے گا۔ وہ اس قسم کی گفتگو میں حصہ لینے کے لئے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھی لیکن اس نے ایسی گفتگو کبھی نہ چھیڑی جس کے لئے اس کے کان ہمیشہ ترستے رہے۔ اگرچہ یہ سوچ سوچ کر اسے دکھ بھی ہوتا تھا کہ آدرش اسی جیسی ایک عورت کو چھوڑ کر اس کے پاس آنے کے لئے تیار نظر آتا ہے جو اس کے ساتھ کئی برس سے رہ رہی ہے۔ وہ اس سے بھی بے پناہ محبت کرتا ہے کیوں کہ اس نے کبھی بھول کر بھی اپنی بیاہتا بیوی کی برائی نہیں کی ہے۔ اس کے بنے ہوئے سوئٹر، اس کی پسند کے خریدے ہوئے کپڑے وغیرہ ہر چیز بڑے فخر سے اسے دکھاتا ہے اور پھر عجیب طرح سے خاموش بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ اس سوچ میں مبتلا ہو کہ وہ اس دوسری عورت کی بھی بہت سی باتیں پسند کرنے لگا ہے۔ رہن سہن اور کپڑوں وغیرہ کی پسندیدگی بھی ایک طرح سے محبت ہی ہوتی ہے۔ محبت کا ایک فطری اور جذباتی اظہار! ——— ایک دوسرے کے دل تک پہنچنے کے لئے کئی راستے ہیں، کئی پگڈنڈیاں اور کئی سیڑھیاں ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے صرف پھولوں کے تحفے لے کر نہیں آتے، اپنی اپنی آنکھوں میں محبت کی قندیلیں ہی روشن کئے ہوئے ایک دوسرے سے نہیں ملتے، نہ ہی ان کے لئے ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کے لئے جسموں کی کشش اور گرمی اور خوشبو کافی ہوتی ہے ——— ان کے لئے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہی کچھ جو ہر آدمی کی زندگی میں اس کے آس پاس ہوتا ہے ——— آدرش کے آس پاس جتنا کچھ تھا اسے سریتا مختلف اوقات میں دیکھتی اور پرکھتی رہی تھی ایک بار وہ خوب گہری نیند میں اپنی بیوی کو نام لے کر پکار اٹھا تو اس نے چونک کر پوچھا تھا ——— "تم نے ابھی اپنی بیوی کو پکارا نا!"

آدرش کتنے لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا سا رہ گیا تھا۔ نیم بیداری کے عالم میں۔ جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ کیا جواب دے۔ وہ اسے سینے کے ساتھ لپٹا کر پھر سو گیا تھا۔ لیکن وہ سوچتی رہ گئی تھی کہ آدرش بہت بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ اس سے بھی اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی اپنی بیوی سے ——— ایک آدمی بیک وقت دو عورتوں سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ ایک سی شدت سے ——— جس طرح وہ اپنے مرد ساتھیوں سے محبت کرتا ہے کئی کئی مرد ساتھیوں سے محبت اس کے لئے سماجی مسئلہ نہیں بنتی۔ لیکن ایک سے زیادہ عورتوں سے محبت یقیناً مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس معاملے میں عورت بھی آزاد نہیں ہے۔ یہ بندھن پرانے ہیں اور خود انسان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں جنھیں توڑنے کے لئے وہ ترستا ہے لیکن ایسا کر نہیں پاتا۔ آدرش نے اس کے ساتھ تعلقات قایم رکھنے کے لئے ایک ہی راستہ تجویز کیا تھا ——— کہ وہ اسی طرح ملتے جلتے رہیں لیکن سریتا نے اس پرپوزل کو ریجکٹ کر دیا تھا۔ وہ اسے باعزت نہیں سمجھتی تھی۔ وہ خود بھی ایک سماجی بزدل تھی۔ سماج کے ساتھ دور تک لڑنے کی اس

کے اندر بھی ہمت نہیں تھی۔

ایک روز سریتا کو اپنی پرانی یونیورسٹی سے خط ملا۔ جہاں سے اس نے ایم اے کیا تھا پھر وہیں سے پی ایچ، ڈی کی ڈگری لی تھی اور وہیں اس نے کچھ عرصہ تک لیکچرار کے طور پر ملازمت بھی کی تھی ـــــ وہاں اسے ایک کلاس کا وائیوا لینے کے لئے جانا تھا۔ اس نے سوچا ماحول میں تبدیلی کے لئے یہ موقعہ اچھا ہے۔ اس نے اپنے ہسبنڈ کو بتایا تو اس نے اسے فوراً اجازت دے دی۔ اس کے لئے ہوائی جہاز سے سیٹ بھی بک کرادی اور جس روز اس کی فلائیٹ تھی جھندر ناتھ نے اسے خود ہی گاڑی میں بٹھا کر ایرپورٹ پر چھوڑ گیا۔

اپنے پتی سے چند روز کے لئے دور ہو جانے میں اسے بڑا سکون ملا۔ جیسے ایک لمبی قید سے پیرول پر رہائی مل گئی ہو۔ اسے اسی ماحول میں پھر واپس چلے جانا ہوگا ـــ جس میں بے پناہ گھٹن تھی۔ بے حد حسین تھا۔ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں پہنچ کر اسے یاد آیا آج تو سترہ اپریل ہے۔ کئی برس پہلے وہ اسی روز ٹورسٹ لاج میں پہلی بار آدرش سے ملی تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس واقعہ کو آٹھ برس سے کچھ زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے بعد میں بھی ملتی رہی اور کبھی کبھی انھیں وہی کمرہ مل گیا ہو ... کسی کے لئے پہلے سے بک ہو جانے کی وجہ سے۔ لیکن اس کمرے کی یاد اس کے دل سے کبھی نہیں نکل پائی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہاں وہ پہلی مرتبہ ایک لڑکی سے عورت بنی تھی۔

سریتا کا جی چاہا اگر وہی کمرہ مل جائے تو وہ وہیں جا کر قیام کرے۔ اپنا سامان ساتھ لے جانے سے پہلے یونہی ٹہلتی ہوئی نکل پڑی۔

اسی راستے پر کئی بار آدرش کے ساتھ چہل قدمی کر چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف یونیورسٹی کے ٹیچروں کے بنگلے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لان اور خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے یوکلپٹس اور رات کی رانی کے پیڑ اور پھولوں کی کیاریاں اور دیواروں سے لپٹی ہوئی بیلیں کہیں کہیں ٹیچروں کی سادھارن سے دستروں میں بیویاں، کوئی جوان، کوئی ادھیڑ، اور ادھر ادھر کھیلتے ہوئے ان کے بچے۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں کھیت اور ان میں دھان کی پنیری کھاتے ہوئے کسان۔ سڑک پر جو بھی رکشا نکلی تو اس نے اس کے چالک کی اور چونک کر دیکھا۔ شاید کوئی اسے جاننے والا مل جائے۔ جو اسے ہاسٹل سے ڈیپارٹمنٹ یا بستی میں لے کر جایا کرتا تھا اسے کئی رکشا چالکوں کے نام یاد تھے۔ شُدا ما، رام بلاش مکرجی، جہانگیر، نتائی۔ نتائی اگرچہ پہاڑی تھا لیکن اسے بہت سے بنگالی گیت یاد تھے۔ ہاسٹل کی لڑکیاں اسے وزٹنگ روم میں بلا کر اس سے گیت سنا کرتی تھیں۔ وہ گیت گاتے گاتے رو پڑتا تھا تو لڑکیاں ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی مسکرانے لگتی تھیں ـــــ کوئی پوچھتی ـــــ "اچھا نتائی دا، بولو تو، تمہاری کا دو شو گے بھالو باشا چھیلو؟ ... نتیجہ اُدری چھیلو نا!..." نتائی کو پہاڑن پسند نہیں کرتی ہوگی ـــــ اس کا پتہ بتادے

تو ہم تیری سفارش کر سکتی ہیں۔"

نتائی اپنی آنکھیں پونچھتے پونچھتے کہہ اٹھتا تھا"—— تم کیا جانو پریم کیا ہوتا ہے۔ ایٹا تے کار د رسفارش چولنا—— ۔اچھا تم لوگ ایک گیت اور سنو——

جودی تارے نائیں چینی گو
شیکی آمائیں نیبے چینے
ایئی نو بو پھالگنیر دینے
جانی نے
جانی نے

اگر اسے ہم نہ پہچان پائے، کیا وہ مجھے پہچان جائے گا، نئے پھاگن میں! معلوم نہیں معلوم نہیں۔

کبھی کبھی اس کا گیت ختم ہی نہیں ہو چکتا تھا کہ وہاں اچانک سُپر دیدی پہنچ جاتیں۔ ان کی ڈانٹ پھٹکار شروع ہونے سے پہلے ساری لڑکیاں جلدی جلدی اپنے کمروں کو کھسک لیتیں۔ پھر شامت نتائی بہار ۔ کی آجاتی تھی۔ لیکن وہ کسی کی شکایت کرنے کے بجائے سر جھکائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا گیٹ سے باہر نکل جاتا تھا۔ وہاں اپنی رکشا کا تالا کھول کر اسے آگے بڑھالے جاتا۔

سریتا کو نتائی پر بہت ترس آتا تھا۔ پتہ نہیں کیسے یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ وہ کسی پہاڑن دہاڑن سے عشق نہیں کرتا ہے۔ اسے یونیورسٹی کی ہی لڑکیاں پسند ہیں جو ہر سال وہاں آتی ہیں کچھ چلی جاتی ہیں کچھ اگلے چند برسوں کے لیئے رہ جاتی ہیں۔ انھیں کئی کئی سال تک اپنی رکشا پر بٹھا کر دوڑتا رہتا ہے۔ ان میں کسی کے بھی ساتھ اس کا رشتہ جڑنے کا امکان نہیں ہوتا—— پھر وہ ان سب کو من ہی من میں چاہتا رہتا ہے۔ وہ سب مل کر ایک ہی پورے چہرے کے مانند اس کے دل میں دماغ میں بسی رہتی ہیں—— وہ اس چہرے کا کوئی ایک نام بھی نہیں رکھ پاتا۔ اس کی کوئی ایک شکل بھی قائم نہیں کر سکتا۔ بس ایک تصور کے سہارے وہ جی رہا ہے اور اسی کو گیت سنا سنا کر رجھاتا رہتا ہے۔

سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے سریتا نے چھوٹی چھوٹی دوکانوں کی طرف دیکھا جہاں وہ اکثر آیا کرتی تھی—— برودیرن اسٹور، کلاکیندر، دستو بھنڈار، کیمپ شاپ جس کے بوڑھے مالک سے لڑکیاں نرودھ اور سینٹری ٹاولز بلا جھجک خرید لاتی تھیں، ایک چھوٹا سا ایرکولڈ ٹی ہاؤس، چمڑے سے مڑھے ہوئے بانس کی مضبوط تیلیوں کے چھوٹے چھوٹے موڑھے اور ایک ماسک ہاؤس، جس کے اندر مختلف جانوروں کے علاوہ درگا، راون اور کئی دیوی دیوتاؤں کے پلاسٹک کے بنے ہوئے رنگ برنگے مکھوٹے دیواروں پر اور شو کیسوں میں سجے رہتے تھے

اور وہاں جاکر ایسا لگتا تھا ان سارے نکسولوں کے تخلیقی کردار انہیں وہاں ڈیپارٹ کر کے چلے گئے ہیں۔ کچھ کبھی نہ لوٹ آنے کے لئے۔

سریتا بے اختیار اس دوکان کے اندر چلی گئی۔ ماسک بیچنے والی ایک عورت تھی۔ وہ ایک کونے کے شوکیس پر جھکی اخبار پڑھنے میں مصروف تھی۔ یہ وہی عورت تھی جو گاہکوں کی طرف اسی وقت نظر اٹھاتی تھی جب وہ اپنی پسند کا ماسک خرید کر اس سے دام پوچھتے تھے۔ اسی دوکان سے آدرش اور اس نے بھی دو ماسک خریدے تھے۔ اور اپنے اپنے چہرے پر لگا کر خوب ہنسے تھے۔ ماسک کے پیچھے ان دونوں کی شخصیتیں بالکل چھپ گئی تھیں۔ اس نے ایک اساطیری دیوی کا ماسک پھر سے انتخاب کر لیا۔ اور اسے دام دے کر واپس آگئی۔

وہ ٹورسٹ لاج کو جانے والی سڑک پر مڑی تو اس کی نظر ایک بہت بڑے سائن بورڈ پر جا ٹکی۔ سائن بورڈ اسے گوشت پوست کے ایک زندہ انسان کی طرح لگا مسکراتا اور لاج کی اور جانے کے لئے اشارہ کرتا ہوا ——— وہ گھبرا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ جیسے اس نے اسے پہچان لیا ہو۔

کاؤنٹر پر ایک بنگالی دادا دونوں نتھنوں میں نوشی چڑھا کر چھینک مارنے کے لئے منہ کھولے بیٹھا تھا۔ وہ کوئی نیا آدمی تھا۔ ادھر ادھر کوئی بیرہ بھی نہیں دکھائی دیا۔ اگرچہ وہ ایک بڑے مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے اس کے قریب چلے آئے۔ چہرے جانے پہچانے نہ ہوں تب بھی کبھی کبھی ایسا شک ہونے لگتا ہے وہ جان پہچان کے ہیں۔ کوئی چہرہ ——— کوئی ایک شاید، اچانک اپنی ایسی ہی بے تناختی میں سے نکل کر اس طرح مسکرانے لگے جس میں اس کی شناخت ثابت ہو جائے! اس نے بڑی بے بسی سے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ماسک کی طرف دیکھا۔ جو بہت ہی مسرور کیفیت کا حامل تھا۔

اس نے پوچھا ——— "انتیس خالی ہو گیا؟"

پھر اسے خود ہی ایسا لگا اس نے یہ فرض کیوں کر لیا ہے کہ وہاں پہلے سے ٹھہرا ہوا کوئی مسافر واقعی خالی کر کے چلا گیا ہوگا۔ بنگالی دادا نے سر گھما کر اپنے پیچھے دیوار پر لگے ہوئے کی بورڈ کی طرف دیکھا۔ بے شمار نمبروں پر چابیاں لٹک رہی تھیں۔ کوئی کوئی نمبر خالی بھی تھا۔

"ایکمن اوبیدی ہائی تی۔ آپ کو بیس نمبر پا سکتا۔ سینگل ہائی۔"

ایک بیرہ دخل انداز ہو کر بولا ——— "انتیس نمبر والا بسترا ابھی نہیں آیا۔ پر آئے گا ضرور۔"

سریتا نے کچھ بنگالی، کچھ ہندوستانی اور کچھ انگریزی میں سمجھایا ——— "وہ آئی یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس کو چھوڑ کر یہاں آنا چاہتا ——— سمجھا؟ اگر انتیس نمبر۔"

"ٹھیک ہائی، ٹھیک ہائی۔ وہ آج نہیں مل سکتا۔ ایک پینجر ہر سال آج کے دن ٹھہرنے کے واسطے آتا ہے اڈوانس منی آرڈر بھیج کے بک کرالیتا۔ کل مارننگ چھوڑ بھی دے گا۔ آپ کے واسطے ہم اسے کل کے واسطے بک کرے گا۔

بھالو!"

"اچھا کھولو تو اسے ذرا۔ میں ذرا دیکھ لوں۔"؟

وہ میرے کے پیچھے چپ چپ سی کاریڈور میں چل رہی ہے۔ جو ہاتھ میں چابی اٹھائے جا رہا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر ایک کمرے کی چوکھٹ پر لکھے ہوئے نمبر دیکھتی جا رہی ہے۔ وہ چاہے تو آنکھیں بند کر کے بھی چل سکتی ہے اسے معلوم ہے اسے کہاں جانا ہے۔

وہ گردن گھما کر دھوپ میں نہائے ہوئے لان کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ کوئی غیر ملکی جسم پر صرف جینز پہنے پیٹ کے بل لیٹا گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کی ننگی گوری پیٹھ پر پڑا ہوا اخبار ہوا کے جھونکے سے اڑ کر دور جا پڑا ہے ——— ایک گہری کین چیئر میں ڈوبی ڈوبی سی کوئی عورت اپنے تازہ دھلے ہوئے لمبے بال پیٹھ پر بکھرائے سوئیٹر بننے میں مصروف ہے۔

کمرے کے اندر جاتے ہی اسے ایسا لگا وہ ایک پورے مرد کی مضبوط بانہوں میں پہنچ گئی ہے جو اسے منع کرنے پر بھی بار بار چوم رہا ہے ——— اس کی آنکھوں پر، اس کے ہونٹوں پر اور اس کی ناک کے خوبصورت بانسے پر۔ وہ بار بار گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ تو وہ اس کی گردن کی شہ رگ پر اپنے دانت گاڑ دیتا ہے۔ اسے بالکل بے بس کر دیتا ہے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے ایک ہی طرف دیکھتی رہ جاتی ہے۔ جدھر کھلے ہوئے وارڈروب میں سے اسے ہینگر پر لٹکی ہوئی پینٹیں اور شرٹیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اور ایک اسٹول پر رکھے ہوئے سوٹ کیس کے اوپر لاپرواہی پر پھینکا ہوا رنگین تہمد اور فرش پر گرا ہوا ایک میگزین اور باتھ روم میں واٹر ٹیپ کے پائپ پر پھیلا ہوا تولیہ۔

وہ اچانک دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگتی ہے۔"میں ممی کو کیا جواب دوں گی، وہ میری شکل دیکھتے ہی سمجھ جائے گی ——— تم چلے جاؤ یہاں سے ——— پھر کبھی مت آنا یہاں ———"

سریتا کو اچانک ہاتھ میں اٹھایا ہوا ماسک یاد آ جاتا ہے ——— وہ اسے بڑی حیرت سے دیکھتی ہے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اس کا کیا کرے ——— ادونوں نے اپنے اپنے چہرے پر ماسک چڑھا کر ایک کیسٹ کی دھن پر ڈانس کیا تھا ——— پھر اس نے اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹے لیٹے ایک گیت سنایا تھا۔

پُرالونیئی رینیہ کو تھا
بھولے کیرے ہائے اوشیئی
جو کھیر دیکھا پرائیر کا تھا
شیکی بھولا جائے

وہ بنگالی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اسے ایک ایک لفظ کا مطلب بھی کہہ سنایا تھا۔
اس پرانے دن کی راحت
بھول جاؤ گے کیا؟
ہائے وہ آنکھ کا ملنا
دل کی بات ہوئی
وہ کیا بھلایا جا سکتا ہے؟

سریتا نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے چہرے پر ماسک چڑھا لیا۔ اور کمرے کو ایک بار پھر دیکھا۔ اِدھر اُدھر گھوم کر۔ وہ اپنا ماسک فرش پر پھینکے پلنگ پر نڈھال سا ہو کر خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی کیفیت سے بالکل بے خبر ـــــ اسے اچانک غصہ آگیا ـــــ اس نے پاؤں سے زور سے ٹھوکر ماری۔ اس کا قدیم مردانہ وجاہت کا ماسک دور جا پڑا۔ میز کے پیچھے، بالکل الٹا ہو کر کانپنے لگا۔ لال چیونٹے کی طرح آسمان کی طرف ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک ٹھوکر اور ماری۔ پھر اسے زور سے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا ـــــ

"میم صاحب کمرہ خالی کرنا ہوگا۔"

وہ جانتی ہے بیرہ کھڑکی میں سے جھانک کر ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ کتنی دیر سے حیرت زدہ سا اس کی حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ وہ اسے کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل آتی ہے۔ چہرے پر اسی طرح ماسک لگائے ہوئے۔ وہ بھول سی گئی ہے کہ وہ ماسک لگائے ہوئے ہے۔ اسے صرف اتنا یاد ہے کہ اسے وہاں سے چلے جانا ہے۔ یہ کمرہ آج اسے نہیں مل سکتا۔ کیوں کہ وہ کسی ایسے آدمی کے لئے پہلے سے بک ہے جو ہر سال اسی روز یہاں آتا ہے اسے وہ لمبے کاریڈور کے آخری سرے پر، ریسپشن روم کے سامنے ٹیکسی میں سے باہر آتا ہوا دیکھ سکتی ہے۔ ایک بیرا ڈکی میں سے اس کا سامان باہر نکال رہا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کا سر بالکل سفید ہو چکا ہے۔ اس نے اسی رنگ کی ہلکی ہلکی داڑھی بھی اگالی ہے۔ سریتا کو ایسا لگا جیسے کاریڈور پہلے سے بہت لمبا ہو گیا ہو۔ وہ کتنی دیر سے چل رہی ہے لیکن یہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ اس طرح چلتے چلتے تو کئی یُگ بیت جائیں گے۔ وہ اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے۔ پھر جیسے بھاگنے سی لگتی ہے۔ اور اس کے سامنے سے گزر کر گیٹ سے باہر نکل جاتی ہے۔ ☐

انور عنایت اللہ
۱۱۸۔یو، چوتھی منزل، بلاک نمبر۲
پی۔ای سی۔ایچ۔سوسائٹی۔ کراچی ۲۹

ثواب کی خاطر

قبرستان کی چار دیواری کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں آثار قدیمہ کے کسی کھنڈر میں آگیا ہوں۔ جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی تھیں اور اس کے ٹیڑھے ترچھے پتھروں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے موسم اور وقت نے اِس قبرستان کے ساتھ بھی بڑا ظلم کیا ہو۔

سورج غروب ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود یہاں خاصی روشنی تھی۔ میں بڑے پھاٹک میں سے قبرستان میں داخل ہوا تو دیکھا آس پاس کے چھوٹے بڑے، حسین اور بے ہنگم مقبروں میں تیز روشنیاں جل اٹھیں اور دن کا سا گمان ہونے لگا۔ غالباً یہاں ایسے امیر مردے دفن تھے جو اندھیرے کے عادی نہیں تھے۔ اس لئے اُن کے مزار کے علاوہ کارپوریشن نے بھی چاروں طرف تیز روشنی کا انتظام کر رکھا تھا، جب کہ آس پاس کی سڑکیں کچھ زیادہ روشن نہیں تھیں۔

میں نے ایک جگہ رک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا تو دائیں طرف مجھے ایک سیاہ فام موٹا تگڑا شخص نظر آیا جو ایک صاف ستھری پکی قبر پر بیٹھا حقے کی چلم بھر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کپڑے جھاڑتا اٹھا اور مسکراتا ہوا میرے پاس آیا۔ بڑے ادب سے سلام کیا اور جھک کر خوشامدانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"جناب کو کتنی جگہ چاہئے؟ یوں تو سرکار نے یہ قبرستان بند کر دیا ہے لیکن وڈری ہم نے آپ جیسے شریف آدمیوں کے لئے تھوڑی بہت جگہ بچا کر رکھ لی ہے۔ ایک جگہ تو بہت ہی اچھی ہے۔ آپ کے مردے کو یہاں بالکل تکلیف نہیں ہوگی بجلی کا بھی معقول انتظام ہے۔ وڈی ایک درخت بھی نزدیک ہے۔ اگلی گرمی میں اس کا سایہ بھی آپ کو ملے گا۔"

اس نے یہ تفصیلات اتنی تیزی اور مہارت سے بتائیں کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کا کون مرا ہے؟" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"کوئی نہیں ـــــ دراصل آج صبح ہمارے گھر کے عین سامنے ایک غریب چلتے چلتے گرا اور مر گیا۔ خدا جانے کون تھا بیچارہ ـــــ دن بھر ہم پولیس اور تھانوں کے چکر میں رہے۔ شام کو لاش ملی۔ وارثوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پولیس والے خود دفن کرنا چاہتے تھے لیکن مجھے اچھا نہ لگا۔ ثواب کمانے کو بھی بہت جی چاہا۔ اس لئے میں لاش

گھر لے آیا۔ محلے والوں کے ساتھ مل کر چندہ جمع کیا اور سیدھے تمہارے پاس آیا ہوں۔ ایک عدد قبر چاہیئے۔ تقریباً ساڑھے پانچ فٹ لمبی۔ اب بتاؤ تم کیا لوگے؟" میں نے تفصیلات بتاتے ہوئے پوچھا۔

میری باتیں سنتے ہی گورکن کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کی جھکی کمر آناً فاناً آپ ہی آپ سیدھی ہوگئی۔ اور اس نے نہایت خشک لہجے میں جواب دیا۔

"ادھر جگہ ذرا مہنگا ہے صاب ۔۔ جوں کہ پہاڑ کے اوپر قبرستان ہے اس لئے ادھر کا ریٹ زیادہ ہے آپ یا تو ہم کو ڈھائی سو روپیہ دے دو یا مردے کو لالوکھیت لے جاؤ۔ ہم نے آپ کو رعایتی ریٹ بتایا ہے۔ اپن کو پکا مسلمان ہے صاب۔ اس لئے سب کو ٹوا ٹکہ دیتا ہے۔ ایک مردے کو نکال پھینک کر دوسرے کو اس میں دفن کرنا۔ وڑی ہم کو اچھا نہیں لگتا۔ مرنے کے بعد انسان کی عزت تو کرنی ہی پڑتی ہے صاب۔ اس کے آرام کا بھی بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ فٹافٹ ڈھائی سو نکالو ابھی کام شروع کر دیگا!"

یہ سننا تھا کہ فوراً میرے حواس ٹھکانے آگئے "یعنی ڈھائی سو روپے صرف ایک میت کے" بے اختیار میرے منہ سے نکلا

"اور نہیں تو کیا لاکھ ہزار کے؟" اس نے نہایت بدتمیزی سے جواب دیا۔" ہم نے تو آپ پر ترس کھا کر رعایت کر دیا تھا ورنہ بابو صاب ادھر تو پانچ سو میں بھی قبر نہیں ملتی۔ منظور ہے تو بتادو ورنہ گھر جاؤ۔ کیوں خالی پیلی ہمارا وقت ضائع کرتا ہے؟"

"نہلانے دھلانے کا کیا لوگے؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کام ہم نہیں کرتا صاب۔ ہم تو صرف قوم کا قبر کھودتا ہے۔ ادھر شہر میں بڑا اچھا کومپنی ہے۔ کسی کو بھی ٹیلیفون مارو۔ وہ سب کچھ کر دیگا۔ میرا خیال ہے تم پر ترس کھا کر سو روپے میں کر دیگا!"

اس کے حساب سے پورے ساڑھے تین سو کا نسخہ تھا۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے حساب لگایا تو یاد آیا کہ ہم سب نے مل کر کل ساٹھ روپئے بھتر پیسے جمع کئے تھے۔

"ارے کس سوچ میں پڑ گئے صاب؟۔۔۔۔ جلدی کرو۔" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"ذرا گھر جا کر محلے والوں سے بات کرلوں۔۔۔۔ ابھی آکر جواب دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے مڑا۔

"ذرا جلدی جواب دینا صاب۔۔۔۔ وڑی، ہم رات کو ساڑھے آٹھ اور صبح کے سات بجے کے درمیان بالکل کام نہیں کرتا۔ اگر کوئی ارجنٹ معاملہ ہے تو اس کا ریٹ دگنا ہے!" وہ بڑی بدتمیزی سے چیخا۔

میں صبح سے بجھا بجھا تو تھا ہی۔ اب گورکن کی باتوں سے مجھے بڑی وحشت ہونے لگی۔ وقت تیزی سے گذر رہا تھا اور رہ رہ کر مجھے اپنی نئی نویلی دلہن کا خیال آرہا تھا جو ابھی ہفتہ بھر پہلے ٹنڈو آدم سے کراچی آئی تھی۔ اس بیچاری کے ساتھ تو بہت سے ظلم ہوتے تھے۔ شادی کے فوراً بعد میرا تبادلہ کراچی میں منتقل

گھر کا ملنا۔ پھر بڑی مشکل سے ہاؤسنگ سوسائٹی کے اس غیر آباد علاقے میں چھوٹے سے مکان کا ملنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں سے بازار خاصا دور تھا۔ صرف قبرستان محلے کے بیچوں بیچ تھا۔ شاید اسی لئے رہنے والوں کی سہولت کے لئے یہ سوسائٹی آباد بھی کی گئی تھی۔

بہر حال صبح سے میری بیوی نے طوفان مچا رکھا تھا۔ وہ شام کو یہ کہہ کر اپنی ایک سہیلی کے یہاں چلی گئی تھی کہ جب تک غیر کا مردہ گھر میں ہوگا وہ دہلیز پار نہیں کریگی۔ ادھر ملازم نے علٰحدہ جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ ڈر سے اس کا بُرا حال تھا۔ میری مشکلات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اگر کوئی مومن میرے گھر کے عین سامنے مرتا اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو کیا میں اسے میڈیکل کالج کے حوالے کر دیتا تاکہ لونڈے اور لونڈیاں چیر پھاڑ کر تجربے کریں؟ میں تو انسانی ہمدردی میں اس کی لاش اپنے یہاں لایا تھا۔

اب گورکن سے تبادلۂ خیال کے بعد جو سوال مجھے پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ اگر ساڑھے تین سو روپئے جمع نہ ہو سکے تو اس غریب کی لاش کا کیا ہوگا؟ خود میرا حشر کیا ہوگا؟ بیگم حالات کا جائزہ لینے کے لئے صبح لوٹنے والی تھیں ٹھیک سات بجے۔ انھوں نے پورے ستر گھنٹوں کی مہلت دی تھی اور دھمکی دی تھی کہ اگر اس وقت تک لاش ٹھکانے نہ لگی تو وہ سیدھے میکے کا ٹکٹ کٹائیں گی۔

اسی ادھیڑبن میں جب میں قبرستان سے گھر لوٹا تو مجھے اپنے گھر کا صدر دروازہ چوپٹ کھلا ملا۔ نہ ملازم کا پتہ تھا اور نہ پڑوسیوں کا۔ میت برآمدے میں جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں۔ میں نیا نیا اس محلے میں آیا تھا۔ مجھے تو ان پڑوسیوں کے نہ نام معلوم تھے اور نہ پتے جنھوں نے چندہ دیا تھا۔ ان لوگوں کو تو میں میت کے پاس چھوڑ گیا تھا اب خدا جانے وہ کہاں غائب تھے۔ میں نے بےچینی سے گھڑی دیکھی۔ سات بجے تھے۔ جلدی سے میں نے گھر کا صدر دروازہ بند کیا اور مسجد کا رُخ کیا۔

محلے کی یہ مسجد ابھی زیرِ تعمیر تھی۔ چونکہ آبادی کم تھی اس لئے اکثر خالی رہتی تھی۔ اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ منبر کے قریب ایک اسٹول پر لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے نمازیوں کے ساتھ ساتھ مولانا صاحب بھی گھر جا چکے تھے۔ صحن میں مجھے ایک لنگڑا فقیر نظر آیا جو ایک طرف بیٹھا سر کی جوئیں مار رہا تھا۔ میں نے اس سے پیش امام صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "وہ تو گھر چلے گئے۔ اب عشاء کے وقت آئیں گے ——— بات کیا ہے؟ کیا کسی کی شادی وادی ہے بابوجی؟" وہ اپنے ٹیڑھے میڑھے زرد زرد سے دانت نکالے مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"نہیں بھئی ——— ایک میت ہے۔ اسے نہلانا دفنانا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے مشورہ کرنا تھا۔"
میں نے جواب دیا

"اجی وہ کیا مشورہ دیں گے بابوجی؟ سارے مشورے تو وہ مجھ سے لیتے ہیں۔ کیا آپ کہیں قریب ہی رہتے ہیں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا؛ جیسے میری امارت کا اندازہ لگانا چاہتا ہو۔ "ہاں"۔ میں نے جواب دیا۔

"تو بابوجی۔ آپ ۹۸۷۶۳۲ پر ٹیلیفون کر دیجئے۔ ایک اچھی انجمن ہے جو تسلی سے سب کام کر دیتی ہے۔ اس کا نام ہے —— "انجمنِ فلاحِ گورکن وغسال وکفن فروشان ومرحومین" —— مرحوم کون تھا؟ —— آپ کا رشتہ دار؟"

"نہیں" "ملازم ہوگا۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ گورکن سے بصیرت افروز گفتگو کے بعد میں ذرا محتاط ہوگیا تھا۔

"تو پھر آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ قبر تک کا انتظام وہ انجمن کر دیگی۔ ویسے آپ کرتے تو بہتر تھا کیوں کہ سنا ہے لوگ موقع پاکر ایک ہی قبر میں کئی کئی مردے دفن کر دیتے ہیں —— لیکن بابوجی آپ کو کیا —— آپ کا مردہ نئی میں دفن ہو یا پرانی میں۔ ملازم ہی تو تھا —— جائیے بابوجی جلدی سے فون کھڑکھڑائیے۔"

"اخراجات کیا ہوں گے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اجی بابوجی آپ سے کیا زیادہ لیں گے۔ ان کو آپ سے ایسے موقعے ملتے ہی رہیں گے۔ آپ نوجوان ہیں، دولت مند ہیں —— کنبہ بھی بڑا ہوگا۔ بہرحال یہی کوئی ڈیڑھ سو روپئے لیں گے!" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

ڈیڑھ سو روپئے؟ —— میں نے گھبراکر سوچا۔ مزید نواسی روپئے پچیس پیسے کہاں سے آئیں گے یکایک مجھے یاد آیا کہ بیگم نے میرے نئے سوٹ کے لئے سو کا ایک نوٹ چھپاکر الماری میں رکھا تھا۔ اس سے مجھے تسلی ہوگئی اور میں نے فوراً اس لمبے چوڑے نام کی انجمن کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور چلنے کے لئے مڑا تو لنگڑے فقیر نے مجھے روکا۔

"اگر کوئی دقت ہو تو مجھے بلوا لیجئے گا بابوجی —— نام میرا جانو لنگڑا ہے۔ اسی مسجد میں رہتا ہوں۔ اپنا ریٹ کچھ زیادہ نہیں —— صرف پانچ روپئے —— اگر دو چار اور خرچ کریں تو میت کے ساتھ قبرستان تک جانے والوں کا بھی انتظام کرتا ہوں!"

مجھے جلدی تھی اس لئے میں نے اس کی پیش کش پر زیادہ غور نہیں کیا، سیدھے ایرانی کے ہوٹل پہنچا اور انجمن مرحومین وغیرہ وغیرہ کو فون کیا۔ دوسری طرف سے گھنٹی کے بجتے ہی ریسیور فوراً یوں اٹھایا گیا جیسے کوئی بے چینی سے ٹیلیفون کے انتظار میں بیٹھا ہو۔ "جی؟ کیا فرمایا؟ —— جی ہاں انتظام ہو جائے گا۔ صرف دو سو روپئے

لیں گے ـــــ جی؟ ـــــ جی نہیں جناب۔ رات کا ریٹ دگنا ہوتا ہے۔ دن کو ہم سو روپئے لیتے ہیں ـــــ جی نہیں اس سے پائی کم نہیں ہوگی ـــــ خدا حافظ ـــــ جلدی فیصلہ کیجئے گا۔ دفتر رات بھر کھلا رہتا ہے!"

اس کے ساتھ ہی کھٹ سے سلسلہ منقطع ہوگیا اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے ساتھ ہی میرے لئے امید کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ صبح کے سات بجنے میں پورے پونے تیرہ گھنٹے رہ گئے تھے اس وقت تک مشکل آسان نہیں تو کیا ہوگا؟ بیوی اور ملازم دونوں سے ہاتھ دھونا ہوگا ـــــ خدایا ـــــ میری مدد کرو ـــــ میری توبہ ـــــ آئندہ جو کسی پر ترس کھاؤں ـــــ بس اِس بار نجات کا راستہ دکھادے ـــــ تیری قسم۔ ساری عمر ایسے جھمیلوں سے دور رہوں گا۔ قومی کاموں کے بارے میں کبھی سوچوں گا بھی نہیں!

میری دعا یہیں تک پہنچی تھی کہ یکایک اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی جس نے پلک جھپکتے جاآنو لنگڑے کا روپ دھار لیا۔ میں تیزی سے دوبارہ مسجد پہنچا۔ جاآنو وہیں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں نے دبے لفظوں میں اپنی تجویز پیش کی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ پھر اس نے بعض اہم مشورے دیئے۔ چند لمحے مزید گفت وشنید جاری رہی۔ آخر کو پورے سو روپئے پر معاملہ طے ہوگیا اور میں نے فوراً جیب سے پچاس روپئے نکال کر بطور پیشگی اسے دیئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اتنی جلدی میری سن لی اور میں سستے چھوٹا۔

اس سے معاملہ طے کر کے میں گھر پہنچا۔ لاش جوں کی توں رکھی ہوئی تھی اور ملازم یا پڑوسی، کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر لنگڑوں لولوں اور کانوں کی ایک فوج وہاں آگئی اور بڑی مہارت سے کام شروع ہوگیا۔ سب نے مل کر پانی گرم کیا۔ ایک جا کر کہیں سے پھاوڑا لے آیا۔ دوسرا بس میں صدر گیا اور کفن وغیرہ لے آیا۔ میسرے نے میت کے سرہانے بیٹھ کر قل ہو اللہ پڑھنا شروع کر دیا کیوں کہ اس بیچارے کو صرف یہی سورۃ یاد تھا۔ چوتھا جا کر قبر کے لئے پُرسکون اور محفوظ جگہ دیکھ آیا۔ اس دوران میں، میں نے سب کے لئے چائے اور کھانے کا انتظام کیا۔

خدا کے فضل سے دیکھتے ہی دیکھتے سارے کام اطمینان سے ہو گئے۔ رات کے ایک بجے جب دنیا سو گئی اور محلے پر سناٹا چھا گیا تو اللہ کا نام لے کر میت اٹھائی گئی اور ہم اس قبرستان میں جا پہنچے جس کے گورکن نے صرف قبر کے ڈھائی سو مانگے تھے۔ احتیاطاً ہم نے روشنی کا انتظام نہیں کیا تھا ویسے جاآنو یہاں کے چپے چپے سے جس طرح اپنی واقفیت کا ثبوت دے رہا تھا اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ اب پروگرام یہ تھا کہ قبرستان کے ایک ویران گوشے میں چپ چاپ قبر کھودی جائے اور میت کو اللہ کا نام لے کر دفن کر دیا جائے۔

جب ہم وہاں پہنچ گئے تو جاآنو ہی نے جنازے کی نماز پڑھائی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا

"بابو جی ـــــ لیجئے ہمارا کام پورا ہوگیا۔ اب آپ کا شروع ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب ؟" میں نے گھبرا کر پوچھا کیوں کہ اس کا لہجہ مجھے گڑبڑ لگا۔

"اگر ہمارے ہاتھ پاؤں ٹھیک ہوتے تو ہم کبھی آپ کو تکلیف نہیں دیتے —— یہ پھاوڑا اٹھایئے بابوجی اور فوراً قبر کھودنی شروع کر دیجئے!" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

یہ سننا تھا کہ میرے ہوش اڑ گئے۔

"میں قبر کھودوں ؟ — — میرے باپ دادا نے کبھی کبھی —— !" میں تقریباً چیخ پڑا۔ اس پہ جانو نے فوراً مجھے روکا۔ "شی —— ذرا آہستہ بولیئے۔ اگر کسی نے سن لیا تو شامت آجائے گی۔ ہم سے قبر کہاں کھودی جائے گی ؟ —— آپ ماشا اللہ تندرست ہیں —— جوان ہیں، دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ پھر اتنی پریشانی کیوں ؟ —— اٹھایئے پھاوڑا اور کام شروع کر دیجئے کام۔۔ پیچھے لولے نے دو بالٹی پانی یہاں ڈال رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی وقت لگے گا ہی —— یہ مُسری زمین ہے پتھریلی — — کورا قبرستان ہوتا تو منٹوں میں کُھد جاتی قبر۔" اس نے رسان سے مجھے سمجھایا۔

اس کی بکواس سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن آخر کرتا کیا ؛ انکار کرتا تو صبح کو قیامت آجاتی، نئی نویلی دلہن بچھڑ جاتی۔ ان کی ضد سے میں واقف ہو چکا تھا۔ وہ ضرور میکے جا کر دم لیتیں۔ مجھے خاموش دیکھ جانو میرے قریب آیا اور اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے بابوجی ؟ —— وقت کم ہے۔ شروع کیجئے نا کام، سات بجے گورکن لوٹ آتا ہے۔ اس سے پہلے سب کچھ ہو جانا چاہیئے۔ آپ تیزی سے ہاتھ چلائیں۔ اتنی دیر ہم ذرا کمر سیدھی کر لیں —— آج بڑا مصروف دن گذرا —— جب چار فٹ کھد جائے قبر تو ہمیں جگا دیجئے گا —— بقیہ کام ہم کر لیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ لنگڑاتا ہوا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی کے بعد دیگرے تمام فقیر چپ چاپ اندھیرے میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور اس ہیبت ناک قبرستان میں، اس انجانی میّت کے ساتھ میں تنہا رہ گیا۔

دنیا میں بہت سے کام کئے تھے لیکن یہ کام میرے لئے نیا تھا۔ اس لئے خاصی دیر لگ گئی۔ آخر کو خدا جانے کتنی دیر کے بعد قبر تیار ہو گئی اور ہم سب نے مل کر بڑے احترام سے میت دفن کر دی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد میں نے کمر سیدھی کی اور پیشانی کا پسینہ پونچھا تو ساڑھے پانچ بجے تھے اور کہیں اذان ہو رہی تھی —— اللہ اکبر —— اللہ اکبر!!! □

اقبال مجید آل انڈیا ریڈیو بھوپال

ابھی ابھی

جب اس کا کارڈیو گرام تیار ہوا تو اس کے دل کی کیفیت کے زائچے کا کاغذ ہر ایک نے پڑھا سب کو حیرت ہوئی کیوں کہ حیرت کی بات صرف اتنی تھی کہ اس طرح کی رپورٹ سے ان تجربہ کار لوگوں کا کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

اس کاغذ پر لکھا تھا۔

کوئی محرومی نہیں۔ زندگی نے سب کچھ دیا۔ چھوٹے چھوٹے دکھ اور چھوٹے چھوٹے سکھ۔ تین لڑکے ہوئے، ان کو پڑھایا لکھایا ان کی شادیاں کیں۔ انھیں گھر بسا کر بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے رہتے دیکھا۔ اب جب کبھی موت آئے گی آرام سے مر جاؤں گا لیکن موت کیوں آئے گی۔ اگر اسے آنا ہی ہے تو ابھی کیوں آئے گی دو چار دس بارہ سال بعد کیوں نہیں آئے ـــ ہائے تو کیا میں مر جاؤں گا ـــ یہ صبحیں، یہ شامیں یہ ہنستے بولتے میرے ننھے ننھے پوتی پوتے میرا لڑکا میری بہویں۔ یہ کرسی جس پر روز منھ ہاتھ دھوکر میں ناشتے کے لئے بیٹھتا ہوں۔" یہ خالی ہو جائے گی۔ مجھ سے خالی ہو جائے گی۔ یہ کوٹ جو کھونٹی پر ٹنگا ہے جسے بازار جانے سے پہلے میں پہنتا ہوں وہ سڑک کا موڑ جہاں چھوٹا سا پل ہے اور جس پر سہ پہر کو میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا ہوں وہ سب مجھ سے چھوٹ جائیں گے۔ بازار میں سبزی والے ہر شام جو مجھے سلام کرتے ہیں اور ہری ہری سبزیاں تول کر میرے جھولے میں ڈالتے ہیں اور پھر کیلنڈر پر ان تاریخوں پر بنے ہوئے نشانات جن تاریخوں پر مجھے، شادی بیاہ، اور دوسری تقریبات میں دوست احباب کے گھروں پر جانا ہے وہ سب چھوٹ جائے گا ایک پل میں کہیں کھو جائے گا۔

موت آئے گی تو ضرور۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی آجائے۔ ابھی جب کہ میرا بڑا لڑکا پردیس میں ہے کتنے دنوں سے اس نے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ ہائے وہ کتنا بے مروت ہے! لیکن وہ کر بھی کیا سکتا ہے جہاں روٹی روزی لے جاتی ہے جانا پڑتا ہے ـــ یہی کیا کم ہے کہ میری دو اولادیں میرے پاس ہیں ان کی بیویاں میری خدمت میں لگی ہیں۔ ابھی میری بڑی بہو نے میرے سر کے نیچے میرا تکیہ ٹھیک کیا ہے۔ میری بیوی۔ میری

باوفا، خدمت گزار بیوی وارڈ کے باہر پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ ۳۰ سال سے وہ میری زندگی کے ایک ایک پل کی ساجھے دار ہے۔ کیسا تڑپ رہی ہے وہ ــــ میں مرجاؤں گا تو وہ کیسے جی پائے گی وہ۔ لیکن کیا میں اپنے بڑے لڑکے کو اب کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ اتنی دور سے کیسے آئے گا وہ ــــ ہائے دونوں ہاتھوں سے وہ اپنا کلیجہ نہ پکڑے گا کہ میں اپنے باپ کے آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ کیا میں مرجاؤں گا۔

کارڈیوگرام پر دل کی کیفیت کا زائچہ۔ اس کے دل کی دھڑکنوں اور ان کے ارتعاش کے ساتھ ساتھ اتناسب کچھ لکھ رہا تھا کاغذ برابر باہر آرہا تھا اور وہ تجربہ کار لوگ ان اونچی نیچی لکیروں کو غور سے دیکھ رہے تھے انھیں پڑھ رہے تھے۔ تب ان میں سے کسی نے کہا کہ اس کو مارفیا دے دیا جائے۔ لیکن بالآخر یہ طے پایا کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے اور زائچہ کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ انھوں نے پھر کاغذ کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا۔

اے پالنے والے میں نے بہت گناہ کئے ہیں۔ مجھے دوزخ کی آگ سے بچانا۔ اے معبود میں تیرا شکر بجا لاتا ہوں اور تیری بخشی ہوئی نعمتوں کے لئے کروٹ کروٹ تیرا احسان مند ہوں۔ میرا منہ اس لائق نہیں کہ کلماتِ تشکر زبان پر لاسکوں۔ لیکن تو رحیم و کریم ہے۔ خطاکاروں کی خطاؤں کو درگزر کرنے والا۔ تیری شان وعظمت کے قربان میری بخشش کر مجھے اپنی رحمتوں کی پناہ میں لے لے۔ میرے پاس تجھے دینے کے لئے کچھ نہیں مجھے بچالے مجھے زندہ رکھ، مجھے بخش دے۔ میں مرنا نہیں چاہتا کہ دوزخ کی آگ / میں نے کچھ یتیموں کو ستایا مگر ــــ اے رحیم و کریم جوانی میں گرمیوں کی دوپہر گھر کی چھت پر اس خادمہ کی لڑکی کے پستانوں پر / میرا ہاتھ دوزخ کی آگ سے بچالے کہ زندگی ابھی مجھے اور دے دے اور ذائقہ ان پاپڑوں کا جو میں چاولوں کے ساتھ کھاتا ہوں کہ سب کچھ تیری رحمت پر منحصر ہے / اور وہ امرود بس ایک امرود جسے ڈاکٹر نے مجھے روزانہ کھانے کے بعد کھانے کے لئے کہا ہے اور بکری کی ہڈیوں کا شوربہ اور پھلکے کہ ان کا ذائقہ جو / مٹر کی گرم گرم ٹکیاں چٹنی اور دہی ڈلواکر میں چاٹ والے کے ٹھیلے سے لے کر / کھاتا ہوں۔ چوری چھپے وہ بوڑھا تانگہ والا جسے جوانی کے جوش میں میں نے مارا تھا اور کرایہ بھی نہیں دیا تھا کہ میں بہت گناہ گار ہوں اور تو بخشنے والا ہے۔

ان تجربہ کار لوگوں نے جملوں کی بے ربطی پر کارڈیوگرام کی مشین کی طرح غور سے دیکھا اور اس میں کسی کل کو بار بار ادھر ادھر ہلاڈلا کر دیکھنے لگے کہ یہ بے ربطی مشین کی خرابی کے سبب سے تو نہیں تو اس بار انھوں نے دل کی کیفیت کے زائچہ پر دیکھا تو لکھا تھا۔

مریم کا شوہر مجھ پر شک کرتا تھا۔

میرے بستر کے قریب بیوی کیوں رو رہی ہے۔

میری پوتی کے دل میں چھید ہے ۔ اس ننھی سی جان پر خدا کو رحم نہ آیا ۔
میرا پوتا پھٹ چکا ہے ۔
پوتی کے آپریشن کے لئے اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا ۔
اس دن اس کا شوہر میرے پیچھے چاقو لئے گھوم رہا تھا ۔ جوانی کے معرکے ۔ کہاں گئے وہ دن ۔
میں نے اپنی بیوی کی زبان پر انگارہ رکھ دیا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بولی ۔
مجھے بچا لو ۔ مجھے بچا لو ۔
میں نہیں مروں گا ۔ مجھے بچا لو ۔

ابھی تو صرف ۶۰ برس ہی تو گزرے ہیں ۔ ممون خان ۷۰ سال کے ہیں اور زندہ ہیں ۔ لکڑیاں چیرتے ہیں ۔ کریمن کی کمر دہری ہو چکی ہے مگر سوئی میں دھاگہ ڈالتی ہے ۔ کہتی ہے ایڈورڈ صاحب بہادر کو اپنی آنکھوں سے اس نے دیکھا تھا ۔ مجھے بچا لو ۔ میرا درد ۔ یہ درد یہ درد یہ سانسیں ، یہ ہاتھ پیروں میں تھرتھری ، یہ شل ہوتے ہوئے پاؤں ۔ بستر جیسے کمرے میں تیر رہا ہے ۔ کیا موت اسی طرح آتی ہے ۔ کیا سب یونہی مرتے ہیں یہ چھاتی میں دھوکنی سی کیا چل رہی ہے ، یہ زبان اتنی موٹی سی اتنی بے ذائقہ سی اتنی بھاری سی اور یہ جبڑے اتنے بوجھل سے کیوں ہو رہے ہیں اور یہ گلے میں گلے کی دیوار میں سوئیاں سی کیوں چبھ رہی ہیں اور یہ آنکھوں کے ڈھیلوں میں اندر بہت اندر چڑیاں جیسے چونچیں مار رہی ہیں اور باہر بارش ہو رہی ہے کہ کانوں کے پردوں پر ٹپ ٹپ کر کے کچھ مستقل بجے جا رہا ہے ۔ نتھنوں میں اور ہونٹوں پر جیسے لو کی گرمی کا احساس کیوں ہے پیر کے دونوں انگوٹھوں کو کوئی موڑ رہا ہے پسلیوں میں درد اور سینے کی بائیں طرف جیسے اندر کسی نے جلتا ہوا توا سا رکھ دیا ہے ــــــ موت کو جھیلنا بڑا مشکل ہے ، یہ وہ گھڑی ہوتی ہے جب کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا ، یہ اذیت دھیرے دھیرے بڑھتی جائے گی ۔ پھر کیا ہوگا ــــ؟ اس تکلیف کی کیفیت کیا ہوگی ، کوئی نہیں بتا سکا ہے اسے ۔ سب اسے جھیل کر چلے جاتے ہیں ۔ مجھے بھی اس کے لئے تیار رہنا چاہئے ۔ وہ کیفیت اب بہت قریب ہے ۔

تب ان تجربہ کار لوگوں نے بالآخر یہ طے کیا کہ مریض کو مارفیا دے دینا چاہئے ــــــ اور انھوں نے مریض کو مارفیا دے دیا ــــ پھر ان تجربہ کار لوگوں کو پتہ نہ چل سکا کہ آگے کیا ہوا ۔ مریض کے دل کی دھڑکنوں کو عارضی سکون دے کر وہ سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے ــــــ

مارفیا زدہ مریض ۔ پرسکون ہو گیا ۔ بعد میں ان لوگوں نے جیسا جیسا تجویز کیا وہ ہوتا رہا ۔ اور دن گزرتے رہے ــــ صبح مریض کی بیوی وارڈ کے باہر نماز ادا کر کے مریض کے لئے دودھ کا پیالہ

لے کر آتی۔ مریض باتیں کرتا۔ دن چڑھتے موسمی کا رس پیتا۔ دوپہر کو اس کی بہو اس کے لئے تازہ تازہ کھانا لے کر آتی۔ شام کو اس کے پوتے اور پوتی اچھے اچھے کپڑے پہن کر پھولوں کا گلدستہ لے کر آتے اور مریض ان کے گالوں کو چوم کر ان سے ہنستا کھیلتا۔ رات میں اس کی بوڑھی بیوی اس کے سرہانے بیٹھ کر تسبیح پڑھتی اور وہ اسلامی فتوحات کے معرکے کتابوں میں سے پڑھ کر اپنی بیوی کو سناتا اور دین و ایمان کی اچھی اچھی باتوں کو پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کے سبب آنسو آجایا کرتے۔ وہ تھوڑی دیر رو کر پھر کتاب سنانا شروع کرتا۔ رات وہ اپنی پسندیدہ کروٹ کے بل لیٹ کر تھوڑی دیر جمائیاں لیتا اور پھر بڑے کولر کے دھیمے دھیمے شور میں آرام سے سو جاتا۔

اب وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا شیو بناتا۔ آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہو کر وہ چپل پہنتا اور چہل قدمی کرتا ہوا وارڈ سے باہر آتا اور کچھ دیر باہر کی چہل پہل کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتا اور اس بوڑھے فقیر کو اپنے ہاتھ سے پیسے دینا نہ بھولتا جو روزانہ اس کی جان و مال کو دعا دیا کرتا تھا۔

پہلے ہر سویرے اسے کارڈیوگرام کی مشین کے سامنے پیش ہونا پڑتا اور اب اسے پندرہویں دن آنا ہوتا۔ اسپتال آنے سے ایک دن پہلے وہ کسی طرح سے اپنے کو بازار کے اس موڑ سے دور رکھتا جہاں ایک نامی ٹھیلے والا مٹر کی ٹکیاں بڑی سی کڑھائی میں سینکا کرتا اور انھیں دونے میں رکھ کر ان پر چٹکی سے نمک مرچ اور مسالے ڈال کر اور ان پر میٹھی چٹنی اور دہی کی تہہ لگا کر لوگوں کو کھلایا کرتا اور لوگ مزے لے لے کر کھایا کرتے۔

ایک دن وہ اپنے پوتوں کو ساتھ لے کر سینما دیکھنے گیا ـــ ایک دن اس نے اپنے چھوٹے لڑکے کے نئے مکان میں بجلی کا میٹر لگوانے کے لئے تین میل پیدل چل کر بجلی گھر میں درخواست لگائی۔ ایک دن وہ اپنی بڑی پھوپی بیوی بچی کو گود میں لے کر ایک ہومیوپیتھ کو دکھا کر لایا۔ اور کئی دن اس نے لگاتار چاٹ والے کے ٹھیلے کے کنارے کھڑے ہو کر چوری چھپے چاٹ اڑائی۔ وہ اپنی جیب میں ہمیشہ اپنی پاکٹ منی ضرور رکھتا۔ بھنے ہوئے چنے وہ ضرور کھاتا، تربوز کی پھانکیں وہ ضرور خریدتا اور جلدی جلدی ایک کنارے کھڑے ہو کر کھا لیتا۔ گنے کا رس نکلوا کر پیتا، ابلے ہوئے سنگھاڑوں کی سوندھی سوندھی گودیاں لے کر جیب میں بھر لیتا اور راستہ چلتے [illegible] کھاتا جاتا۔

اس نے اپنے لئے میاں [illegible]

بڑے لڑکے نے اسے فارن سے پیسے بھیجے تھے اس سے اس نے اپنے لئے ایک شاندار ٹمپ شوٗ خرید لیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں پھر سے ٹسٹ کروائی تھیں [illegible] ہر ایک خاصا بھاری بھرکم فریم بھی [illegible] اس کے چہرے پر علٰحدہ سے ایک وجود کا احساس دلاتا تھا۔

اس بار جب اسے کارڈیوگرام کے لئے تیار کیا گیا تو اس کے دل کی کیفیت کے زائچہ کا کاغذ جن آڑی ترچھی اور اونچی نیچی لکیروں کو ساتھ لے کر باہر نکل رہا تھا ان کو ان تجربہ کار لوگوں نے جب پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

میرا چھوٹا لڑکا گھر میں دیر سے آتا ہے۔ اس کی بیوی سیدھی سادی ہے کچھ بولتی نہیں میں حرامزادے کو کئی بار سمجھا چکا ہوں۔ مگر نہیں مانتا اب اگر دیر سے آیا تو سور کے بچے کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں گا ——— اپنے کو سمجھتا کیا ہے ——— دو ہاتھ میں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔

ان ہاتھوں نے لاکھوں کمائے آج بھی یہ ہاتھ کسی کے دست نگر نہیں رہیں گے دوسرے صاحبزادے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے روپیہ بھیج کر خرید لیں گے۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں ایسے ہی دنوں کے لئے میں نے اپنا فنڈ الگ سنبھال کر رکھا تھا۔ دو آٹو رکشہ خرید کر کرائے پر چلاؤں گا۔ ایک مکان بیچ کر کپڑے کا کاروبار کروں گا۔ پڑے پڑے زنگ لگ رہا ہے۔ امجد کئی بار کلکتہ بلا چکا ہے لکھتا ہے جو عیش یہاں ہے وہ تم نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ کچھ روز کے لئے میری مہمانی قبول کر لو پھر سے جوان ہو جاؤ گے۔ سالے وہی دن اور وہی رات۔ ہرگز یہ مکان میں کسی کو نہیں دوں گا۔ ضرور بیچ دوں گا اسے۔ بڑی بہو دکھاوے کی باتیں کرتی ہے۔ اس نے لڑکے کو قبضے میں کر رکھا ہے۔ سمجھتی ہے کہ گھر کی سب سے بڑی وہی ہے۔ سب کے دماغ ٹھیک کر دوں گا میں ——— کپڑے کی دوکان، بہت منافع ہے۔ پھر ہم دونوں بڑھیا بڈھے ہوائی جہاز سے حج کو جائیں گے اور وہاں سے واپسی پر یوروپ کا دورہ کریں گے کتنی خوبصورت دنیا ہے یہ کتنا کچھ دیکھنے کو پڑا ہے، کتنا کچھ کرنے کو ہے ابھی تو/ابھی/ابھی/ابھی

تجربہ کار لوگ جلدی سے کارڈیوگرام پر جھک گئے۔

ابھی تو/ابھی/ابھی/ابھی/

وہ سب باہر نکلی ہوئی آنکھوں سے مبہوت ہو کر زائچہ کو دیکھ رہے تھے۔ بے بس ہو کر دیکھ رہے تھے

ابھی تو ابھی - ابھی ابھی --- ابھی اب

اور زائچہ گرنگا ہو چکا تھا ——— کاغذ سے سارے آثار ختم ہو چکے تھے وہاں سیدھی سی ایک بے جان لکیر کے علاوہ کچھ نہ تھی جس کے کوئی معنی نہ تھے کوئی مطلب نہ تھے۔ اور سب کچھ ابھی ابھی ہوا تھا ——— □

صدیقہ بیگم سیوہاروی

بنتِ حوّا

میں حوّا ہوں ——— حوّا کی بیٹی ہوں ——— لیکن میں تمہاری بہن بھی ہوں۔ اور تمہاری ماں بھی ہوں—"

میں چونک پڑی ——— یہ کون ہے ... کوئی دیوانی لڑکی ہے جو ایسی بے سر پیر کی باتیں کر رہی ہے لیکن مجھے یہ آواز اور یہ صورت کچھ جانی پہچانی سی لگی جیسے میں اسے صدیوں سے جانتی ہوں ... جیسے ہر زمانے میں میں نے کچھ نہ کچھ وقت اس کے ساتھ گزارا ہے کبھی تو میں اس کے ساتھ مدرسے میں پڑھتی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ جب ہمارا جی چاہتا کہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر کنکر کھیلیں تو ہم بستہ ایک طرف ڈال کے کھیلنے بیٹھ جاتے۔ اور جب مدرسہ کا خیال آتا تو گھبرا کر چل پڑتے۔ دیر سے مدرسے پہنچنے پر مولوی صاحب ہمارے کان اینٹھتے۔ ہماری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اور ہم ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتے۔ لیکن سزا برابر ملتی۔

اس کے بعد جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کہ ہماری ملاقات سفر میں ہوتی تھی اس وقت ہم دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں اپنی ساس نندوں کے قصے سنا سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کر رہے تھے۔ پھر ایک اسٹیشن پر وہ اتر گئی۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا، وہ آگے آگے جا رہا تھا اور یہ غلاموں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی میری نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا——— اور پھر اس جنم میں ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔

اس کے بعد میری ایک بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس بار میں نے دیکھا کہ اس کے منہ میں کوئی دانت نہیں تھا۔ اس کے سر کے بال بھی سفید ہو گئے تھے، اس کے چہرے پہ جھریاں پڑ گئی تھیں۔ مگر دانت تو میرے منہ میں بھی نہیں تھے۔ بال تو میرے بھی سفید ہو گئے تھے۔ اور میرے چہرے پہ ان گنت دنوں اور راتوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ ہمارے کندھے ماہ و سال کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔

اور ہم دونوں نے بیتے دنوں کی کہانیاں سنائیں۔

آج برسوں کے بعد ——— نہیں صدیوں کے بعد یہ لڑکی میرے پاس سوالیہ نشان بنی ہوئی کھڑی ہے

اور کہہ رہی ہے کہ "میں حوا ہوں ــــــ حوا کی بیٹی ہوں ــــــ لیکن میں تمھاری بہن بھی ہوں اور تمھاری ماں بھی ہوں ــــــ"

میں پوچھتی ہوں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی آدمی اتنے روپ بھرے۔ یہ لڑکی ضرور اداکار ہے۔ کسی تھیٹر میں کام کرتی ہے۔

"کیوں جی! کیا تم کسی تھیٹر میں کام کرتی ہو۔"

جی ہاں تھیٹر میں ــــــ تمھارے ساتھ ــــــ میں اور تم دونوں اداکار ہیں جیسا پارٹ ملتا ہے کرتے ہیں، کرنے پر مجبور ہیں ــــــ کیوں کہ ہم اسی کی روٹی کھاتے ہیں۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتی ہو کہ تم صرف ایک پارٹ ہی زندگی بھر کرتی رہتی ہو۔"

میں اس سوال سے گھبرا جاتی ہوں۔ جب کبھی کوئی جواب نہیں بن پڑتا میں اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتی ہوں اس وقت بھی یہی صورت ہے۔ اب میں اس لڑکی کو کیا جواب دوں ــــــ یہ خود تو اداکار ہے۔ مجھے بھی اداکار بنا رہی ہے۔ جب کہ مجھے اداکاری کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ میں کیا جانوں اداکاری کسے کہتے ہیں۔

دیکھو بی بی! تم سچ سچ بتاؤ کیا معاملہ ہے ــــــ تم مجھ سے پہلیاں کیوں بجھوا رہی ہو ــــــ جو بات کہنا ہے صاف صاف کیوں نہیں کہتی۔ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔

میں کیا کہنا چاہتی ہوں ــــــ تم ایسے کہہ رہی ہو، جیسے میں کوئی بھکارن ہوں اور تمھارے سامنے سوال کر رہی ہوں ــــــ اور ذرا سی دیر میں تم مجھے مالا مال کر کے رخصت کر دوگی۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتیں ــــــ تم جانتی ہو ــــــ میں نے ایک سیدھے سادے گھر میں اپنے آپ کو جنم دیا تھا۔ میں اپنی ہی ماں اور اپنی ہی بیٹی ہوں"

اب تو یہ عورت اور زیادہ مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا آگے بولو۔"

"جی میں حوا ہوں۔ جب پیدا ہوئی تو گھپ اندھیرے گھر میں چراغ جل اٹھے۔ مجھے بڑے اچھے اچھے نام دیئے گئے ــــــ پیار کی بھرمار کر دی گئی۔ ایسا لگا کہ دنیا کی رونق میرے ہی دم سے تھی۔ میں کبھی کھلونے کھیلتی اور کبھی خود کھلونا بن جاتی۔ مجھے یہ دنیا بڑی خوبصورت لگی ــــــ اور ایسا لگا کہ اگر میں نہ ہوتی تو یہ دنیا سونی سونی ہو جاتی۔ میرے طاقوں میں گڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں جو کہ خود ایک بڑی گڑیا تھی، چھوٹی چھوٹی گڑیوں سے کھیلتی تھی کبھی کبھی تو میں اپنی گڑیوں کا بیاہ رچاتی اور مجھے ایسا لگتا کہ میری گڑیا مجھے چھوڑ کر کہیں اور جا رہی ہے۔ میں سوچ سوچ کر روتی۔۔۔

لیکن یہ سب کھیل تھا ــــــ بڑا انوکھا کھیل ــــــ لیکن یہ سب سچ بھی تھا۔ اس میں حقیقت بھی تھی۔ اس راز کو میں نے اب جانا ہے۔ میں اپنے گھر کے کونے کونے سے آشنا تھی اپنے آس پاس کی فضا سے مانوس تھی۔ اور اسی آشنا گھر اور اسی مانوس فضا کو ایک دن میں نے آخری سلام کیا ــــــ میں نے اپنے طاقوں کی گڑیوں کو چھوڑا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے

آنگن میں چڑیوں کا غول کا غول آکر بیٹھا، ابھی ابھی چہچہا رہا تھا کہ کسی نے پھر سے اڑا دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے ایک دن ہماری اچھی بھلی گائے کو کسی نے کھولا اور دوسرے کو دے دیا۔ سب دیکھتے رہ گئے — مجھے یاد ہے اس بھولی بھالی گائے نے کتنی حسرت سے ہم سب کی طرف دیکھا — بار بار دیکھا اور ہم سب دیکھتے رہ گئے۔ جس نے روپیہ دیئے تھے وہ اسے اپنے کھونٹے پر باندھنے کے لئے لے جا رہا تھا۔ اس میں شکایت کی کیا بات ہے — یہ ایک بڑی بھلائی ہے — چڑیاں ہاتھ سے اڑ گئیں — یہ تو ہوتا ہے کہ گائے کو کوئی آنگن سے کوئی کھول کر لے گیا — یہ بھلائی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے لوگ دیکھنے آئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہماری گائے دیکھنے آتے تھے۔ بڑے غور سے دیکھتے — اپنی نظروں سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے اور میرے سارے بدن میں جھرجھری سی آجاتی ہے — ہائے اللہ میں کیا کروں — یہ زمین کیوں نہیں پھٹتی، میں اس میں سما جاؤں — مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے پیچھے کوئی سودا ہو رہا ہے۔ میرا بھی سودا۔ لیکن جب گائے کا سودا ہوا تھا تو میرے باپ کو روپے ملے تھے۔ چند روز کے لئے میرے گھر میں خوشحالی آئی تھی۔ میرا باپ مقروض تھا اس نے گائے بیچ کر قرض ادا کر دیا۔ میں سوچتی کاش میں لڑکی ہونے کے بجائے ایک گائے ہوتی۔ جس سے میرے ماں باپ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا — لیکن میں گائے کی طرح ہونے کے باوجود گائے سے بھی زیادہ حقیر تھی

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ ان روز روز کے آنے والوں میں سے کسی کو میرے اوپر یا میرے ماں باپ پر رحم آگیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی گائے کو میرے آنگن کے کھونٹے سے لئے جا رہا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت جب میری گائے چلی گئی تھی تو اس کے بدلے خریدار نے میرے باپ کو اس کی قیمت دی تھی۔ میرے گھر میں چند روز کی خوشحالی آگئی تھی۔ مہاجن کا قرض ادا ہو گیا تھا۔ لیکن یہاں تو کچھ اور معاملہ تھا۔ میرے باپ نے اس بار جو گائے دوسرے کو دی تھی اس کے ساتھ روپیہ پیسہ بھی دیا — پہلا خریدار گائے کو لے کر خوش خوش گیا تھا۔ لیکن دوسرا خریدار منہ بناتا ہوا گیا۔ ہر طرف جشن منایا گیا — دعوتیں ہو رہی تھیں، باجے بج رہے تھے لیکن ایک حوا اپنی بیٹی کے لئے دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ کبھی لگتا کوئی پالکی جا رہی ہے اور کبھی محسوس ہوتا کوئی جنازہ اٹھ رہا ہے۔ ہر ایک کہہ رہا تھا کہ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ یہی نہیں جو بھی مجھے دیکھنے آتا وہ میری قیمت عجیب طرح سے بتاتا۔ یہ بتاؤ کیا دیا ہے۔ میں بڑے ساز و سامان سے لدی ہوئی آئی تھی۔ بڑے زرق برق کپڑے پہنے تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ میرے نئے گھر والے چند روز تو مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگے رہے۔ اس کے بعد جب ان کو فرصت ملی تب مجھے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے زندہ ضرور تھی لیکن زندگی نہیں گزار رہی تھی۔ میں پریوں کی طرح فضا میں اڑ رہی تھی — زندگی تو اب گزارنی ہے۔ جانور کو جب قربانی کے لئے لاتے ہیں تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے، بچہ بچہ اس کی خدمت کرتا ہے۔ اسے کھلاتے پلاتے ہیں اور بالآخر اس کو اپنے انجام پر پہنچنا پڑتا ہے

نئی فضا اور نئی دنیا مجھے راس نہ آئی۔ میں روتی رہی۔ لوگ ہنستے رہے اور [illegible]۔ [illegible] اس کا [illegible] ہونے سے باندھا اور اس پر تیل چھڑکا اور آگ لگا دی ——— میں تو پہلے ہی جل رہی تھی [illegible] اس بار جل کر راکھ ہو گئی۔

میں تم سے پوچھتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا، کیا انسان [illegible] کرتے ہیں کیا دنیا میں [illegible] ہوتا آیا ہے تم افسانے لکھتی ہو ——— کیا تمھارے پاس اس کا کوئی جواب [illegible] ——— تم افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ [illegible] بھی تو ہو۔ کیا تم بھی یہی جواب دو گی کہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا [illegible] حیرت [illegible]۔

"میں نے بیٹھی بیٹھی آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ تم جل کر راکھ ہو گئی ——— [illegible]

میں نے تم سے کہا نہیں کہ میں حوا کی بیٹی ہوں۔ میری ماں مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی [illegible] ایک پسلی کام آ گئی۔ کیوں کہ وہ تنہا تھا وہ سہارے کی تلاش میں تھا۔ بن عورت کے [illegible] ہر لمحہ چل سکتا تھا۔ اسے پھر میری ضرورت ہوئی۔ میں پھر پیدا ہوئی، کبھی ماں [illegible] ——— [illegible]؛ —— کیوں کہ ولدیت کی قیمت عزت بھی ہوتی ہے۔ میرا جسم بھی [illegible] ہے۔ لیکن جس طرح چچوڑی ہوئی ہڈی کو لوگ پھینک دیتے ہیں، مجھے بھی پھینک دیا۔ [illegible] آگیا [illegible] لیکن بے حیا تھی ——— اس زندگی کے لیے دوبارہ جی اٹھی۔ میں نے کئی دن سے دعا کی تھی کہ مجھے [illegible] کبھی پھر وہی شوہر ملے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ [illegible] قدرت کے قانون ہیں۔ ایسے ہی قانون جیسے برسات میں بارش تو ہوتی ہی ہے لیکن کبھی کبھی طوفان بھی آ جاتے اور اپنے لپیٹ میں ہر چیز کو لے لیتا ہے۔ اور [illegible] سال اس کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ کھڑی فصل برباد ہو جاتی ہے۔ میں مرتی رہی جیتی رہی [illegible] اور ہر بار شاید مجھے وہی مرد ملتا رہا [illegible] دعائیں قبول ہوتی رہیں۔

ایک بار میں نے اپنی [illegible] مرد کو جنم دیا۔ بڑا اطمینان ہوا۔ تم پوچھو گی کہ [illegible] لڑکی کو جنم دے کر کیوں نہیں ہوا۔ یہ بڑی معمولی سی بات ہے لڑکی کو جنم دے کر میں کیوں اپنے [illegible] سلسلے کو جاری رکھوں۔ دنیا میں مظلوموں کی کون سی کمی ہے جو میں ایک مظلوم کا اور اضافہ کروں —— ہاں تو میں نے ایک مرد کو جنم دیا اور اپنا سر فخر سے اونچا کیا۔ یہ بچہ بڑا ہوتا رہا۔ میں اپنا خون پلا پلا کر اسے پالتی رہی، مجھے ایسا لگتا ہے [illegible] یہ میرا ہی جسم ہے اور سچی بات بھی یہ ہے کہ وہ تھا بھی میرے ہی جسم کا حصہ جس طرح ہماری غذا ہمارے سارے جسم کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس غذا سے ہمارے جسم کا ایک ایک انگ فیض یاب ہوتا ہے۔ اسی طرح جو غذا میں کھاتی تھی اس سے وہ بھی طاقت حاصل کرتا تھا۔ میری صحت اس کی صحت تھی۔ میں نے اپنا خون اس کے بدن میں انڈیل دیا۔ اس کے جسم کو توانائی دی۔ اس کے بازوؤں میں طاقت آئی اور میں اس کو بڑھتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی۔

وہ لڑکپن کی سرحدوں سے گذر کر جوانی کی حدوں میں داخل ہوا۔ اس سے مجھے ایسا لگا کہ پیڑ کی ایک شاخ نے کٹ کر پاس کی زمین، میں جڑ پکڑلی ہے اور اب وہ اپنی غذا خود حاصل کر رہا ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کرتی جڑوں میں پانی دیتی جب تیز دھوپ ہوتی تو اس پر آنچل ڈال دیتی۔ جب وہ لہلہاتا تو میں خوش ہوتی، اس کی نئی پتیاں میرے جسم کو توانائی عطا کرتیں۔

لیکن ایک روز اس پودے نے مجھ سے کہا: "اے بوڑھے کھوسٹ پیڑ تو کس خیال میں ہے۔ تیرا زمانہ پورا ہوگیا اب کوئی آدمی کلہاڑی لے کر آئے گا اور تجھے کاٹ ڈالے گا اور تو ایندھن کی شکل میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔ تو کیوں میرے راستے میں کھڑا ہے۔"

میں نے کہا "بیٹے! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں تیری ماں ہوں۔ میں نے تجھے پیدا کیا ہے، تجھے پالا ہے اور جوان کیا ہے۔ تیری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے، میں تیری ماں ہوں۔

یہ سن کر وہ اور بپھر گیا ـــــــ

تم نے ایسا کون سا کام کیا جو دوسری عورت نہیں کرتی ـــــــ تم نے مجھے پیدا کیا ـــــــ ہر عورت بچہ پیدا کرتی ہے ـــــــ تم نے مجھے دودھ پلایا، پالا پوسا ـــــــ ہر عورت اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اسے پالتی پوستی ہے ـــــــ کوئی نئی بات ہو تو بتاؤ ـــــــ"

واقعی میں نے کوئی نئی بات نہیں کی ـــــــ حوا کی بیٹی آج تک یہی کرتی آئی ہے، اس کے ساتھ آج تک یہی ہوتا آیا ہے۔ پھر میں نے اپنے بیٹے کے لئے کیا نئی بات کی۔

مجھے تنہائی کا احساس ہوا۔ یہ تنہائی میری زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ میں جب گڑیاں کھیلتی تھی تب بھی تنہا تھی ـــــــ جب میں ایک کھونٹے سے دوسرے کھونٹے سے باندھی گئی اور نئے گھر میں آئی ـــــــ باجے گاجے کے ساتھ آئی تب بھی تنہا تھی۔ جب ایک مرد نے مجھے کسی ایسے قصور پر جلایا جو میرا اپنا نہ تھا، تو بھی تنہا تھی۔ کوئی میری مدد کو نہیں آیا۔ اور جب میں نے اپنے پیٹ سے کسی کو جنم دیا ـــــــ میں روئی، چیخی چلائی ـــــــ تو بھی میں تنہا تھی۔ میں نے اکیلے ہی جان پر کھیل کر ہر دکھ درد کو سہا ہے۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں۔ کسے اپنی مدد کو پکاروں ـــــــ

میں نے ہمت کر کے کہا "لیکن مجھے تیرے اوپر حق ہے۔ کیوں کہ تو میرا بیٹا ہے ـــــــ میں نے اسی دن کے لئے تجھے پالا تھا کہ جب میں بے سہارا ہوں گی تو، تو مجھے سہارا دے گا۔"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو ـــــــ کسی پرانے زمانے کی باتیں ـــــــ یہ زمانہ ایٹم کا زمانہ ہے مصنوعی سیاروں کا زمانہ ہے۔ ٹیلی ویژن کا زمانہ ہے۔ انسان اب پہلا جیسا نہیں رہا۔ آج ہر نوجوان آزاد ہے۔ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے بناتا ہے اور اس میں وہ کسی کا دخل برداشت نہیں کرسکتا ـــــــ تم نے اپنا زمانہ گزار دیا۔ اب مجھے

اپنی [illegible] زندگی گزارنے دو ــــ میری اپنی مرضی سے۔"

میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ مجھے اپنے بیٹے کے یہ جملے سن کر ہنسی آئی۔ ابھی وہ کہہ رہا تھا کہ یہی ہوتا آیا ہے یعنی جو پہلے ہوا وہی اب بھی ہوگا۔ تم نے مجھے دودھ پلایا۔ پالا پوسا۔ ہر عورت اپنے بیٹے کو دودھ پلاتی اور اسے پالتی پوستی ہے۔ کوئی نئی بات ہو تو بتاؤ۔

[illegible] بات یہی ہے کہ یہ ایٹم کا زمانہ ہے مصنوعی سیاروں کا زمانہ ہے ــ کیا اس زمانے میں انسانی رشتے اسی طرح ٹوٹتے ہیں۔ کیا اس زمانے میں کسی کو کسی سے محبت نہیں ہوتی ــــ کیا اس زمانے میں بھی لڑکی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ وہ کھونٹے سے باندھ دی جائے چڑیوں کی طرح سے گھر کے آنگن میں چہچہائے ــ پھر اسے کوئی دوسرا اس کھونٹے [illegible] کرے جائے ــ پھر چڑیوں کو اڑا دیا جائے ــ مجھے عمل دو جملے نہیں چاہئے ــــ [illegible] دور گزر زمین کی [illegible] ہے۔ کیا یہ ایٹم کا زمانہ ــــ یہ مصنوعی چاند کا زمانہ ہے۔ اگر مجھے کوئی اور حق نہیں [illegible] سکتا [illegible]

کے غلاف سے [illegible] نکالے گا۔

یہ سوال میں تم سے پوچھتی ہوں [illegible] ہوا اور [illegible] کا رہی [illegible] تم کو وقت ملے تو اس عورت کی کہانی لکھنا جو میری کہانی بھی ہے اور تمھاری بھی

میں حوا ہوں اور حوا کی بیٹی بھی ــــ میں تمھاری بہن بھی ہوں اور تمھاری ماں بھی اور اسی ایٹم کے زمانے میں [illegible] اس مصنوعی سیاروں کے زمانے میں جب کہ دنیا بدل گئی ہے اور بہت [illegible] بدلنے کو ہے ــ [illegible] اس عورت کی کہانی [illegible] ــ جو اس عورت سے مختلف [illegible] لیکن ابھی تو یہ عورت [illegible] ہے [illegible] اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی [illegible] وہی حوا اور حوا کی بیٹی بہن بھی اور ماں بھی ــ اور جو بار بار پیدا ہوتی ہے اور جس کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو ہوتا آیا ہے۔ ☐

رشید امجد

۱۸۵-۱ے، نانک پورہ
راولپنڈی، پاکستان

اندھیرے کی بکّل سے

بڑی غیر متوقع اور عجیب رات تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے بھری دوپہر میں رات نے گھات لگا کر حملہ کیا ہے۔ اور آناً فاناً سارے شہر کو اندھیرے کی بکل میں لپیٹ لیا ہے۔

آسمان پر گھنے سیاہ بادلوں نے شب خون مارا تھا۔

بادلوں کے آگے آگے دوڑتے ستارے جان بچانے کی کوشش میں دور گہرائیوں میں ڈوب ڈوب گئے تھے۔

بڑی سڑک پر دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔

شٹروں کے گرنے، شوکیسوں کے کھنچنے کی اکا دکا آوازوں کے درمیان ہوا کی سرسراہٹ کا مسلسل احساس

اور ایک عجیب بے یقینی کی کیفیت میں ذرا تیز تیز چلتا وہ۔

تعاقب کرتی آہٹ کا ایک ہی ردھم؛

دو شخص اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے،

ہوا میں کوڑوں کی سرسراہٹ، بوند بوند گرتی بے یقینی،

اس کے قدموں میں تیزی آ جاتی ہے،

تعاقب کرتی آہٹ کا ردھم وہی،

وہ دونوں اس کی رفتار کا برابر ساتھ دے رہے ہیں۔

"تعاقب" خوف پہلو میں سے بل کھاتا نکل جاتا ہے

وہ تیز ہو جاتا ہے اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے۔

وہ بھی تیز ہو جاتے ہیں۔

سامنے چوک ——— سمت کا انتخاب۔

پیدل کراسنگ کی بتی سُرخ ہے لیکن وہ ٹریفک کی پرواہ کئے بغیر دوڑ پڑتا ہے اور گاڑیوں سے بچتا

بھاگتا، ہانپتا کانپتا دوسری طرف نکل جاتا ہے۔
پیچھے آتے وہ دونوں سڑک کے درمیان پہنچ چکے ہیں۔
"تو تعاقب ــــــ" وہ دوڑ پڑتا ہے ــــــ دوڑتا رہتا ہے،
دوکانیں کب کی بند ہو چکی ہیں، لوگ گھروں کو جا چکے ہیں اور وہ اس تنہا اکیلی سڑک پر ہانپتی ہوا کے
ساتھ قدم قدم چل رہا ہے۔
"وہ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟"
"کیوں؟"
فضا میں شعلہ لپکتا ہے۔ ہوا بجلی کے تاروں کو تھوڑے کی رسی کی طرح گھما رہی ہے۔
تار تار سے ٹکراتی ہے تو شعلہ لپکتا ہے اور پھر گھور اندھیرا ــــــ
اگر تار ٹوٹ کر مجھ پر آ گریں ــــ؟
وہ جست لگا کر سڑک کے بیچوں بیچ آ جاتا ہے۔
یہ انتہائی غیر متوقع اور تاریک رات تھی،
یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے نے روشنی کی ایک ایک کرن کو چن چن کر نگل لیا ہے۔
وہ سڑک کے بیچوں بیچ چل رہا ہے۔
اڑتی مٹی سے آنکھوں کو بچاتے۔ اسے خیال آتا ہے اگر اچانک کوئی تیز رفتار گاڑی آ جائے تو ــــــ
تو ــــ
وہ سمٹ کے دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر آ جاتا ہے۔
ہوا تیز ہاتھوں سے سائن بورڈوں کو ڈھول کی طرح بجا رہی ہے۔
اس کے سر پر سائن بورڈوں کی قطار ہے۔
ہوا پھنکارتی ہے، خوف کا کتا اس کے گرد چکر لگاتا، بھوں بھوں کر رہا ہے۔
اگر کوئی سائن بورڈ مجھ پر آن گرے تو ــــ
تو ــــ
وہ اُچھل کر پھر سڑک کے بیچوں بیچ آ جاتا ہے۔
یہ بڑی ڈراؤنی سرد رات تھی،
کھمبوں پر لگے ہوئے بلب تھک کر پیلے پڑ گئے تھے اور ٹمٹماتے ہوئے آخری ہچکیاں لے رہے تھے

وہ رک جاتا ہے۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے اور سڑک پہ دوزانو ہو کر سگریٹ سلگانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ہوا ہاتھوں میں تیر کمان لیے نشانے لگا رہی ہے۔

وہ سڑک کے درمیان بیٹھ جاتا ہے اور گھٹنوں میں سر دیے کراہتا ہے۔ اچانک اسے خیال آتا ہے اگر ایسے میں کوئی گاڑی اس کے اوپر سے گزر گئی تو ---

تو ———

وہ اتنی تیزی سے اٹھتا ہے کہ سگریٹ منہ سے [illegible] گر جاتا ہے

یہ رات ٹوٹ ٹوٹ کر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی،

گہرا گاڑھا اندھیرا تارکول کی طرح چیزوں کے سروں پر بہہ رہا تھا

ایک طرف کی فٹ پاتھ پر بجلی کی تاریں اور تیز طوفانی ہوا،

دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر سائن بورڈ اور ہانپتی کانپتی پاگل ہوا،

سڑک کے بیچوں بیچ شاں شاں کرتی تیز گاڑیاں

"گھر ———"

جیسے تاریکی میں ڈوبا ہوا گھر عکس کی طرح ہلتا جھلملاتا ہے،

تیز ہوا، ڈراؤنی شکلیں بناتے بادل

نہ ختم ہونے والی ہیبت ناک رات اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے،

چہرے — اندھیرا

آواز ——— اندھیرا

پہچان ——— اندھیرا

رنگ ——— اندھیرا

وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا کبھی مڑ کر دیکھتا ہے کہ کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا۔ کبھی ایک طرف کی فٹ پاتھ پر نظر ڈالتا ہے جس کے اوپر بجلی کی تاریں ہوا کے زور سے پھڑپھڑا رہی ہیں۔ ان کے ٹکرانے سے بجلی کا شعلہ لحظہ بھر کے لئے اندھیرے میں چمکتا ہے۔ پھر تیز ہوا اور رعد کی سیٹی کا مسلسل شور، دوسری طرف کی فٹ پاتھ پر بڑے بڑے سائن بورڈ ہل ہل کر اپنی اپنی میخوں میں ڈھیلے ہو کر جھول رہے ہیں۔

سر پر گہرے گھنے امڈتے بادل اور دل ہلانے والی گڑگڑاہٹ،

سڑک کے بیچوں بیچ تیز گاڑیوں کے نیچے آ کر کچلے جانے کا خوف،

آگے گھور اندھیرا جس میں ڈوبے ہوئے گھر کا تصور ــــــ ایک خواب ــــ محض ایک خواب،
اس خواب کے پیچھے قدم قدم چلتا وہ کبھی رک جاتا ہے، چل پڑتا ہے۔ پھر رک جاتا ہے آگے پیچھے دائیں
بائیں دیکھتا ہے، پھر چل پڑتا ہے۔ بادل پورا زور لگا کر چیختے ہیں اور بارش کا ایک بھرپور تھپیڑا اس کے منہ
پر آکر لگتا ہے۔ کھمبے کے اوپر زوردار دھماکہ ہوتا ہے، شعلہ چمکتا ہے تو سڑک دور دور تک روشن ہو جاتی ہے،
لیکن دوسرے لمحے بتاشے کی طرح اندھیرے میں گھل جاتی ہے۔ ایک سائن بورڈ چرچراتا ہے اور دھماکے سے پیچھے
آگرتا ہے
وہ کبھی دائیں ۔ بائیں اور کبھی درمیاں میں ہونے کی کوشش میں سر سے پاؤں تک بھیگ جاتا
ہے۔

[illegible] باقی ہیں
برف [illegible] کے ساتھ گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے لگا [illegible] جیسے
ٹھنڈک اس کے بدن پر ننگی ننگی انگلیاں پھیر رہی ہے۔
دروازہ کھلتا ہے اور اس کی بیوی لپک کر کہتی ہے ــ "شکر ہے آپ ـــــ"
پھر فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے ـــ "کون ہیں آپ؟"
"میں ــــ میں" وہ ہکلا کر رہ جاتا ہے۔
اندر سے اس کی بیٹی کی آواز آتی ہے ـــ "امی کون ہے؟"
"پتہ نہیں کون ہے؟" اس کی بیوی خوف زدہ سی آواز میں کہتی ہے۔
اور جلدی سے دروازہ بند کر لیتی ہے۔
یہ بڑی غیر متوقع اور عجیب رات ہے،
یوں لگتا ہے جیسے بھری دوپہر میں رات نے گھات لگا کر حملہ کیا ہے اور [illegible] شہر کو
اندھیرے کی بکل میں لپیٹ لیا ہے۔ □

مرزا حامد بیگ
راولپنڈی، پاکستان

دِل کے موسم

اس بدکار کے داہنے گال پر تل ہے، اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی ہیں اور بول ترشے ہوئے نگینے، جب بات کرتی ہے تو یاقوتی ہونٹوں کے نگینے اپنا رنگ بدلتے ہیں۔

اس کمرے میں چاندنی بچھی ہے، گاؤ تکیے دھرے ہیں۔

وہ اوپر والے ماڑے میں رہتی ہے جہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اوپر جاتا ہوا، بل کھاتا چوبی زینہ بہت سنبھل کر قدم رکھنے پر بھی انگڑائیاں توڑتا ہے۔

نچلی منزل میں وہ رہتا ہے، جس نے یاقوتی ہونٹ نہیں دیکھے، اس نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ نگینے کس طرح رنگ بدلتے ہیں۔ بس سنا ہے کہ اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی ہیں اور بول ترشے ہوئے نگینے، اس کمرے میں چاندنی بچھی ہے اور گاؤ تکیے دھرے ہیں۔

پہلے پہل، جب وہ یہاں نیا نیا آیا تھا، اس شام اوپر کے ماڑے سے پھوٹتا ہوا نقرئی قہقہہ ہر طرف بڑھتے سرمئی اندھیرے کے پھیلاؤ میں جوار بھاٹا بن گیا تھا اور وہ لہروں کی مار پر اکیلا تھا۔ اٹھتی گرتی، مترنم لہروں کے جھکورے اسے برآمدے میں لئے لئے پھرے۔ اوپر کے ماڑے میں ہونٹوں کے نگینے رنگ بدل رہے تھے اور وہ نڈھال برآمدے کی ریلنگ پر جھکتا چلا گیا تھا۔

اسی شام اس نے تیز دھوپ اور بارشوں سے سیاہ، چوبی زینے کی چرچراہٹ پہلی بار سنی تھی جوار بھاٹا ٹھہر گیا تھا اور کوئی بہت آہستہ، سنبھل کر قدم رکھتا اوپر سے اتر رہا تھا۔ نیچے آتی اکھڑی ہوئی سانسیں بل کھاتے ہوئے زینے میں چکر کھاتی، لڑکھڑاتی اندھیرے میں اندھیرا ہو گئیں۔

مہیب ٹھاٹھیں مارتی تاریکی رات بھر پرسکون رہی اور اس نے وہیں ریلنگ پر جھکے جھکے صبح کر دی۔

پھر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنے چلنے والوں میں گھرتا چلا گیا۔

مدتیں گذر گئیں، وہ اس حجرے میں گوشہ نشیں، کمرے میں بچھی ہوئی صف پر اپنے

صادق العقیدت مریدوں کو حالات جذب میں استغفار کی دھیمی اور تیز صداؤں کے بہاؤ میں ڈوبتے ابھرتے دیکھتا رہا ہے۔

وہ اولین شام کے اندھیرے کا مترنم پھیلاؤ توبہ استغفار کے شور میں کہیں کھو گیا ہے۔

اس نے ہمیشہ اپنے مریدوں کے روبرو اس بدکار کے ذکر اذکار سے اجتناب برتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی حوالے سے یاقوتی ہونٹوں اور رنگ بدلتے ہوئے نگینوں کا ذکر چھڑ ہی جاتا ہے۔ صادق العقیدت مرید نہیں جانتے کہ استغفار کی دھیمی التجائیں کیسے آن کی آن میں تیز ندی کا روپ دھارتی ہیں اور ندی کی اٹھتی گرتی لہروں میں ان کا ہادی، مرشد بہتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے، اور اوپر کے ملبے سے بہت سنبھلے ہوئے قدم ڈگمگا کر چکر کھاتے ہوئے سرمئی اندھیرے کو اجاگر دیتے ہیں۔ چوبی زینے کی چرچراہٹ رات بھر کی ٹھاٹھیں مارتی پسپا ہوتی ہوئی تاریکی میں کھو کر پرسکون ہو جاتی ہے۔

زمانے بیت گئے۔

اوپر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور اس نے دیکھا نہیں بس سنا ہے کہ اس کے داہنے گال پر تل ہے اور اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ جانتا ہے کہ اپنے چاہنے والوں کے سامنے بھاؤ بتاتے ہوئے وہ اکثر اس پر چوٹیں کرتی، پھبتیاں کستی ہے۔ اس نے بھی اسے کبھی اچھے حوالوں سے یاد نہیں کیا۔ لیکن وہ اولین شام کے اندھیرے کا پھیلاؤ اب ایک مشکل بنتا جا رہا ہے۔

کہتے ہیں برے دنوں میں یاقوت مصیبت اپنے سر لیتا ہے۔

جوار بھاٹا تھم نہیں چکتا، اندر کی ہر شے تہہ و بالا ہو گئی ہے۔

گذشتہ کئی روز سے سب کا ہادی، مرشد خاموش ہے، مریدوں کو حجرے تک آنے کی اجازت نہیں۔

وہ برآمدے کی ریلنگ پر جھکے جھکے صبح کرتا ہے اور اسی صورت میں شام۔ سرمئی اندھیرا، خاموشی سے بڑھتا رہتا ہے، پھیلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے۔

باہر زینہ بھی خاموش ہے۔ بہت دنوں سے اوپر بھی کوئی نہیں گیا۔

آج شام سمیت تمام شامیں گونگی ہیں، اور وہ ریلنگ پر ترازو، دونوں جانب جھول گیا ہے۔

صدیاں گذر گئیں۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی آج پہلی بار اپنی بالکنی تک آئی ہے۔

نیچے یکایک جانے کہاں سے اتنی خلقت امڈ پڑی ہے۔ تیز سیٹیوں کے شور میں سب گرتے پڑتے

اوپر ہی کھنچے چلے آتے ہیں۔ اتنے چہروں میں دمکتے صادق العقیدت مریدوں کے چہرے ریلنگ پر
ترازو مرشد کی آنکھوں میں دھندلا جاتے ہیں۔ چوبی زینہ بوجھ سے کڑکڑاتا ہے۔

مرشد برامدے کی ریلنگ سے گھسٹتا، اندر حجرے سے اوپر جاتی ہوئی۔ ان سیڑھیوں تک
آتا ہے۔ جن کے دروازوں میں قفل ڈال دیا گیا تھا۔

باہر سیٹیوں اور تالیوں کا شور بپھری ہوئی تاریکی کے مستقل [illegible] مرحل کھاتے [illegible]
زینے سے ہوتے ہوئے بند دروازوں پر دستک دیتے ہیں۔

یکایک شام کے سرمئی اندھیرے کے پھیلاؤ میں۔ یاقوتی ہونٹ [illegible] تھے [illegible]
اپنا رنگ بدلنے لگتے ہیں۔

سب شانت، ہر طرف سکوت چھا جاتا ہے۔

وہ بالکنی سے جھک کر کھانستی ہوئی بہت ٹھہر ٹھہر کر ہمیشہ کے لئے دھندہ چھوڑ دینے کا اعلان
کرتی ہے۔ اب ہر طرف سے احتجاج کرنے والے اٹھ رہے ہیں۔

کہتے ہیں برے دنوں میں یاقوت۔۔۔۔۔۔۔

مرشد ــــــ سرمئی اندھیرے کی اٹھتی گرتی، مترنم لہروں پر تنکا تھا جو [illegible] ہوا کانپتے
ہاتھوں سے اوپر جاتی تاریک سیڑھیوں کا دروازہ کھولتا ہے۔

پہلی سیڑھی پر قدم دھرتا ہے۔

باہر کا شور مدھم پڑتا جا رہا ہے، اور چوبی زینے کی ٹوٹتی [illegible]

دوسری سیڑھی کے بعد تیسری۔

کچھ دکھائی نہیں [illegible] اوپر کی جانب رواں ہے۔ سیڑھیوں کی
تاریک سنسناہٹ [illegible] قریب سے ہو کر [illegible] حجرے کی جانب
نکل جاتی ہے۔

یہ اپنی دھن [illegible] اوپر پہنچتا ہے
[illegible] کر لیا دیکھتا ہے کہ سجے سجائے دو خالی کمرے ہیں۔ ایک میں چاندنی بچھی ہے [illegible]
دھرے ہیں۔ ایک طرف کپڑے سے ڈھکے ہوئے ہارمونیم، طبلہ اور پٹارے میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی [illegible]
بالکنی میں رنگین چلمن، اندھی ہوا کے ساتھ جھول رہی ہے اور نیچے سیٹیاں، شور [illegible] اس کے
[illegible] ــــــ □

کنور سین

۴۷ ۔ ای ، ویسٹ پٹیل نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

[illegible]

کتاب [illegible] کے نام!

میرے فن کی تختی پر ابھرتی عبارت کو پڑھتے ہوئے ملاوی کے ہونٹوں پر بھی خاموشی پگھلنے لگی:

پھر وہی بات۔ آج پھر تم۔۔

ملاوی بولتی ہے تو اندر باہر سن ہو جاتا ہے۔ اور یہ بے ویرانی پھیل جاتی ہے۔ آس پاس ندامت سے بکھر جاتا ہے۔ سب کچھ جھوٹا پڑنے لگتا ہے۔ سمندر اور لہر، آبادی اور شہر ـــ ناؤ، مانجھی ساحل ـــ کسی میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔

اس بار بھی ملاوی کے چہرے پر پھیلا مہین جال جاگ اٹھا:

ابتدا کئے بغیر اختتام تک پہنچنے کا دعوے کرنے کی مورکھتا کب تک کرتے رہوگے۔ جو ہے ہی نہیں اسے میرے نام کرنے میں کیا تک ؟ میں کتنی بار بتاؤں کہ جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے سے مختلف نہیں ہے۔ جو ہونے والا ہے اس میں مجھے وشواس نہیں۔ تم ہو کہ شروع کئے بغیر کتاب کے مکمل ہو جانے کے وہم کا شکار ہو جاتے ہو۔ تم ہی بتاؤ ـــ راستے اور منزل میں بھید ہے یا نہیں ؟ لیکن تم ۔۔۔!

مجھے اپنی [illegible] خالی [illegible] ملاوی جھلا اٹھی:

[illegible] کوئی نہیں ہوتی۔ میں جانتی ہوں [illegible] زیادہ [illegible] کہانی اور بھوم کا کے فرق [illegible]

[illegible]

[illegible] ہر بار [illegible] بتاتی ہوں۔ [illegible] ڈھلان پر [illegible] چار رے سلین چوٹی سے ذرا [illegible] بس سے باہر ہو کر پیچھے لڑھک جاتی ہے [illegible] ـــ

[illegible] میں بڑی حسان اور [illegible] کا اپنی حد [illegible] زدانی۔۔ [illegible] ایمان!

ملاوی ماضی کے کھنڈر سے لوٹ آئی:

شاید پرانی بات پر تمھیں وشواس نہیں آتا... میں جانتی ہوں تمھیں نئی دیومالا چاہیے۔ لیکن یہ نہ بھولو کہ بات نہیں بدلتی۔ تم آج بھی سکھ بھوگ سکتے ہو نہ سوگ منا سکتے ہو۔ ورنہ ستیہ دھام نامکھیا مُکتی کام میرے من کے پردے پر کیوں آتا۔

گانو میں موت ہو جاتی۔ مرنے والے کے سگے سمبندھی رونے پیٹنے لگتے۔ سبھی اداس من کے ساتھ ارتھی کے ساتھ چلتے۔ مُکتی کام کی الگ بات۔ وہ ہنستا، کھڑتال بجاتا، ناچتا گاتا ارتھی کے آگے آگے چلتا۔ انوکھے سُر میں ایک ہی رٹ لگاتا:

قبریں ہمارا انتظار کرتی ہیں

جیسے مائیں بیٹوں کا

بیٹے کو ماں کی گود میں لیٹنے کا لیا غم

کیسا رونا دھونا!

کیسا ماتم!

مُکتی کام کے جوان بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا۔ لوگ لاش کو شمشان میں لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ مُکتی پاؤں میں گھنگھرو باندھنے لگا۔

سب کو وشواس تھا مُکتی کام موت اور زندگی سے بے نیاز ہو گیا۔ سب نے دیکھا...!

ملاوی رکی اور میری بدحواس آنکھوں میں جھانکنے لگی:

ضروری نہیں میں تمھیں بتاؤں مُکتی کام کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ جو پردے پر ہو رہا ہے وہ پردے کے پیچھے ہونے والے سے الگ ہے۔

ملاوی چیخ اٹھی:

گھنگھرو کا کام بجنا ہے۔ پھر وہ خاموش کیوں ہو جاتا ہے۔ لوگ کسی فسں کے بارے میں کچھ بھی کہیں میں نہیں مانتی۔ انتہا اور اختتام کو دیکھ سکنا اور ان کی جستجو میں مارے مارے پھرنا ڈرامے کا ڈراپ سین! لیکن ڈراما شروع تو ہو! آنے کا سوچ کر پیچھے لوٹ آنا!

ملاوی نے آہ بھری:

مہابھارت کا یدھ سماپت ہو چکا تھا۔ پانڈو جیت کا ماتم منا رہے تھے۔ کوروؤں کی لاشیں یدھ کے میدان میں بکھری پڑی تھیں۔ مہارانی گاندھاری کے ایک سو ایک بیٹوں کی لاشیں۔ ماں کا

لیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ ایک ایک لاش کو دیکھتی سینے سے لگاتی ہوئی وِلاپ کر رہی تھی۔ کرشن کو اپنی تباہی کے لئے ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی۔ اسے بددعا دیتی ہوئی اپنے بیٹوں کو پکار رہی تھی۔

دن ڈھل گیا۔ رات کی نحوست یدھ کے میدان پر چھانے لگی۔ منظر سیاہ پڑنے لگا۔ سب کچھ ہولناک نظر آنے لگا۔ دور تک بچھی لاشوں کے درمیان، بیٹھی گاندھاری نے رونا بیٹنا، سسکنا سبکنا بند نہ کیا۔

رات گہری ہوئی تو کرشن کو گاندھاری کا خیال آیا — بے چاری ممتا کی ماری صبح سے بیٹوں کی موت کا ماتم کر رہی ہے۔ نہ بھوک کا خیال نہ پیاس کی فکر۔ اسی طرح ہلکان ہوتی رہی تو . . .

کرشن بھوجن لے کر یدھ کے میدان میں پہنچے۔ تھالی گاندھاری کے آگے رکھ کر بولے:

سنسار کا کوئی دکھ بھوک کو بھلانے میں مدد نہیں کرتا۔

کرشن کی بات سن کر گاندھاری تڑپ اٹھی:

او پاپی! تو پرش ہے۔ استری کی ذات کو نہیں جانتا۔ ماں کی کوکھ کے دکھ کو نہیں پہچانتا۔ تجھے کیا معلوم ممتا کس انتہا کو چھو سکتی ہے۔

گاندھاری نے بھوجن سے بھری تھالی پرے ہٹا دی۔ وہ پھر وِلاپ کرنے لگی۔

کرشن مسکرائے۔ اپنے اڈے کو لوٹ آئے۔

منیشہ نہیں جانتا کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔

رات آدھی سے زیادہ گذرتے ہی گاندھاری تھکاوٹ کا احساس کرنے لگی۔ دھیرے دھیرے غم کی آنچ ماند پڑنے لگی اور پیٹ کی آگ سلگنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بیٹوں کو بھول کر بھوک کی پکار سننے لگی۔ اسے بجھانے کی چنتا کرنے لگی۔ کرشن جا چکے تھے۔

بدحواس گاندھاری نے آس پاس نظر دوڑائی۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ذرا فاصلے پر انار کا پیڑ کھڑا تھا۔ شاخوں سے لٹکتے پکے ہوئے سرخ انار گاندھاری کو بلا رہے تھے۔ مہارانی اٹھی۔ پیڑ کی طرف بڑھی۔ اسے یقین تھا انار اس کی پہنچ میں ہیں۔

لیکن انار کے پیڑ کے نیچے پہنچتے ہی گاندھاری نے دیکھا پھل اس کی پہنچ سے ہاتھ بھر اونچے لٹک رہے ہیں۔ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ دوسرے ہی پل وہ لپکی۔ پاس پڑے ایک بیٹے کی لاش گھسیٹ لائی۔ لاش کو پیڑ کے نیچے رکھ کر اس پر کھڑی ہو گئی۔

گاندھاری کی حیرانی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ پھل اب بھی اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ وہ لاش سے اتری۔ دوسرے بیٹے کا مرا ہوا شریر گھسیٹ لائی۔ اسے پہلے بیٹے کی لاش پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھل اب بھی اس

کی پہنچ سے باہر تھا۔

بھوک سے پاگل گاؤں والوں نے لاشوں کا مینار کھڑا کر دیا —— اپنے بیٹوں کی لاشوں کا مینار!

ملاوی سسکنے لگی:

سمجھوتے اور حقیقت میں بڑا فرق ہے۔ میرے بچے۔ تم اسے سمجھے بغیر ہی کتاب لکھنے...

پلیگ کا زور تھا اور موت کا ناچ۔ تمھارے پچھلے جنم کی بات ہے۔

میں نے ماتا، موت اور بھوک پر اس طرح کبھی دھیان نہ دیا تھا۔

گاؤں کے [illegible] گھروں [illegible] باقی بچتی تھی [illegible] زیادہ تھے انھیں ٹھکانے لگانے والے کم۔ کوئی کسی

کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔

میرے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا [illegible] سوائے تیسرے بیان نہ تھی۔ تمھارا باپ [illegible]

[illegible] ہونے کے [illegible] نہ آتے رہتی۔ لیکن

[illegible] کو کون روک سکتا ہے۔

ملاوی اور بھی زور سے سسکنے لگی۔

[illegible] لوگ گھر میں پڑے مردے کے پاس بیٹھ کر کھانا شروع کر دیتے۔ کئی

[illegible] ساتھ شمشان [illegible] جاتے۔

مجھے معلوم نہ تھا [illegible] شریر کے قرض اور من کے فرض کے بیچ کی کھائی اتنی گہری ہوتی ہے۔

ملاوی نے [illegible] آنچل سے آنسو پونچھے:

[illegible] سے پہلے باگ [illegible] دروازہ کھول دیا۔ دہلیز پر مرا پڑا چوہا اٹھا لیا اور

بیچ آواز [illegible]

[illegible] ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ تمھارے ہاتھ میں چوہا دیکھ کر میری روح سن ہوگئی۔ میں نے ماتھا پیٹ

لیا۔

شام ہوتے ہوتے تمھاری بغل میں گلٹی نکل آئی۔ تم بخار سے تپنے لگے۔ پتہ نہیں کیا کچھ بولنے لگے۔

[illegible] راستہ گھوم گیا [illegible] پا اٹھی۔ دوسرے پل میں نے فیصلہ

کر لیا۔

ملاوی کی آواز لرز اٹھی:

گاؤں میں لکڑی ختم ہو چکی تھی۔ جس شام تمھاری موت ہوئی گاؤں میں بچے کھچے چند لوگوں کے

پاس کھانا بنانے کے لئے بھی ایندھن نہ تھا۔ بہت سارے مردے کتوں اور گدھوں کی خوراک بننے کو باہر کھیتوں میں پھینک دیئے گئے تھے۔

میں نے گھر کے کواڑ الگ کرکے آنگن میں تمھاری چتا تیار کی۔ جب چتا دہک چکی تو میں چونکی۔ میرا پیٹ آنچ سی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے پیٹ کو بہت دبایا لیکن اس کا درزنتہ برابر دھڑکتا گیا۔

میرا فیصلہ!

شرمسار نگاہوں [illegible] میں نے چپ [illegible] ہوگا [illegible]
تم سامان [illegible] اور [illegible] او
ساوی سب [illegible] کر [illegible] آ [illegible] اترتا
لوگوں کے آنے [illegible] میں چتا پر بانہہ ی چڑھا چکی تھی

FORM IV (See Rule 8)

1 Place of publication — یونیورسٹی [illegible] مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
2 Periodicity of its publication — [illegible]
3 Printer's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
4 Publisher's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
5 Editor's Name — اطہر پرویز
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
6 Names and address of individuals who own the newspapers and partners or share-holders holding more than one percent of the total capital

اسد یار خاں (مالک)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

I, ASAD YAR KHAN, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Dated 1 3-81

Signature of Publisher

شمیمہ صادقہ

شعبۂ اردو، گورنمنٹ ویمنس کالج
گردنی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۲

طرحِ دیگر

ذہانت اس طوفانی ندی کی طرح ہے جس کا بہاؤ، اگر راستہ نہ ملے تو بندھ توڑ دیتا ہے ـــــ میں بھی ذہین تھا، بے حد ذہین! یہ بات بچپن سے ہی میرے شعور میں منجمد تھی ـــــ حالات اور افراد کا دائرہ ہی کچھ ایسا تھا ـــــ بچپن میں جب میری مکتب کرائی گئی اور مولوی صاحب مجھے پڑھانے لگے، انھوں نے اکثر ابا سے کہا تھا ـــــ

"آپ کا بیٹا ـــــ ماشاءاللہ، بہت ذہین ہے"

پتہ نہیں یہ لفظ ذہین کیا بلا ہے ـــــ میں ابا کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ـــــ تعبیر ان کے الفاظ میں نہ تھی ـــــ اور مخصوص مسکراہٹ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی تابانی ان دنوں میرے لئے دھندلی کتاب کے حروف جیسی تھی ـــــ پھر بھی مجھے محسوس ہوتا جیسے یہ لفظ 'ذہین'، جو کچھ بھی ہے، بہت قیمتی ہے، انوکھا ہے، قابل قدر ہے، شیشے کی طرح سنبھال کے رکھنے جیسا ہی کچھ ہے۔ اسی لئے میں اور زیادہ انہماک کے ساتھ جیم کے دائرے کی مشق کرنے لگا ـــــ

میں مدرسے میں داخل کیا گیا ـــــ وہاں بھی یہ لفظ مجھ سے منسلک کر دیا گیا ـــــ دو سال بعد ہی، اسی لفظ ہی کی بدولت میرا داخلہ ہائی اسکول میں ہو گیا ـــــ اور یہیں سے میری شخصیت کے سلف کنٹراڈکشن (SELF CONTRADICTION) کا آغاز شروع ہوا تھا۔ کیوں کہ ہائی اسکول میں پڑھائی کم اور پٹھائی کا رعب زیادہ تھا۔ سینیر لڑکوں کو خواہ مخواہ سزائیں دی جائیں ـــــ اور کریدنے والوں کو پہلے ہی سوال پہ اس طرح ڈسکریڈٹ کیا جاتا کہ آئندہ کلاس میں کھڑے ہو کر ریڈ نگ لگاتے ہوئے خواہ کتنے ہی سوال ذہن میں آئیں وہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکیں اور ماسٹر جی کا اونگھتا ہوا ذہن ڈسٹرب نہ ہو میرے ساتھ بھی یہی ہوا کرتا، پھر بھی، آہستہ آہستہ میں جان گیا تھا کہ میری ذہانت کا رعب یہاں بھی قدم جما چکا ہے کیوں کہ اب میرا شعور بالیدہ ہو رہا تھا۔ بڑھتا ہوا شعور ارد گرد کی مناسب فضا سے اپنا سپورٹ چاہتا ہے۔ مگر یہاں ایسا نہ تھا، بلکہ ایک اور بات کیکڑے کی طرح میرے اندر

پہنچے گاڑنے لگی کہ میرے پاس چند لڑکوں کی طرح چمچماتے ہوئے جوتے نہیں ہیں ـــــ میں صرف سمبار کے دن دھوبی کے یہاں سے دھل کر آنے والے آئرن شدہ کپڑے پہن سکتا ہوں کیونکہ دھوبی اتوار کے اتوار ہی آتا ہے ـــــ اگر کسی دن نہ آئے تو مجھے اس کے گھر جانا پڑتا ہے ـــــ کیونکہ سمبار کے دن پی۔ ٹی ہوتی ہے ـــــ اور کرشنڈ کپڑوں کی وجہ سے پی۔ ٹی ٹیچر تھرماسر لائن سے باہر کر دیں گے اور امیر لڑکوں کی وہ مخصوص جماعت مجھے ٹیز کرنے کے لئے بے ساختہ ہنسنے لگے گی۔ پھر بھی میں کچھ نہیں کر سکتا ـــــ یہ آئرن تو ایک دن میں ختم ہو جاتا ہے ـــــ لیکن مجھے انھیں کپڑوں کو ہفتہ بھر گھسیٹنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ میرے پاس صرف دو جوڑے ہیں، دونوں سوتی ـــــ میں آئرن نہیں کر سکتا کیوں کہ نہ تو گھر میں آئرن ہے اور نہ ماں پیسے دیں گی۔ ان لڑکوں کے قہقہوں سے لگتا ہے جیسے انھیں میری مجبوریوں کا اندازہ ہے ـــــ اور مجھے ان سے بے پناہ نفرت ہے۔ وہی نفرت جو احساس کمتری کا ردعمل ہوتی ہے۔ یہ لوگ صرف پاس ہوتے ہیں، پھر بھی اتنے ٹھسے اور رعب میں رہتے ہیں۔ جیسے ساری جماعت ان کے باٹا کے ناٹی شو کے نیچے ہو ـــــ سبھی ان سے ڈرتے تھے۔ یہ اپنے احسانوں کی خیرات سے سبھوں کو قبضے میں رکھتے تھے ـــــ کسی کو پنسل دے دی۔ کسی کو ربر اسکیل، کسی کو پریکٹیکل بکس، تو کسی کو ٹفن کے وقت اپنی آئس کریم اور چاٹ میں شریک کر لیا ـــــ

میرا ہوم ورک اور کلاس ورک یکساں شاندار ہوتا لیکن اس کی اہمیت صرف اس وقت تھی جب کاپیاں جمع ہوتیں اور ٹیچر ساری کلاس کے سامنے مجھے کہتے ـــــ

"دل سمیع ـــــ دیکھو نالائقو ـــــ سوال یوں کیا جاتا ہے ـــــ" بیشتر لڑکے ورک نہ کرنے کی وجہ سے کھڑے رہا کرتے اور یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہتے جیسے نا اہلی بھی ایک اجتماعی اہلیت کا ثبوت ہو۔

میں بالکل اکیلا تھا۔

غریب اور ذہین!!۔

تنہا اور اداس!!!۔

اور یہ تنہائی مجھے بہت بڑی سزا محسوس ہوتی ـــــ اداسی کا اندھیرا تل تل بڑھتا جاتا اور اکثر مجھے خواہش ہوتی، میں بھی ایک عام طالب علم ہوتا ـــــ ہجوم میں گم ہو کر رہنے والا ـــــ میری اپنی کوئی شناخت نہ ہوتی ـــــ مگر میں اکیلا نہ ہوتا ـــــ بلکہ سب میں مل کر ملے ملے کی

خوشی سے سرشار ہوتا ——— دوسروں کے ساتھ مل قہقہے لگاتا ——— اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں کو آپس میں بانٹ کر ایک بڑے کل کا جز و بن جاتا ——— اکثر میری خواہش ہوتی، ٹفن میں، یا ایک گھنٹی کے ختم ہونے کے بعد دوسری گھنٹی کے آغاز کے گیپ میں کسی کے بنچ پہ جا کر ان کی باتوں میں شریک ہو جاؤں ——— دو ایک بار گیا بھی ——— لیکن وہ سب آپس میں اتنے مگن ہوتے کہ کوئی میری نوٹس نہ لیتا ——— بلکہ اکثر مجھے چڑا کے کہتے ———

"ہاں بھئی مٹھ پڑھاکو ——— کتابیں [illegible]" [illegible] ان [illegible] سب کے سب ہنس پڑتے ۔" [illegible] ——— [illegible] جیسے [illegible] یاد نہیں رہا ——— آپ ہمارے ساتھ شریک ہو جائیے ۔ کلاس کی عزت [illegible]

میں روہانسا ہو کر بھاگ جاتا ———

کبھی میرے پہنچتے ہی وہ سب کے سب یوں چپ ہو جاتے جیسے کوئی خاص بات ہو رہی ہو ——— اور مخل ہو رہا ہوں ——— میں یوں بھی کم گو تھا ——— خود سے گفتگو کا کوئی سلسلہ شروع کرنا چاہتا [illegible] الفاظ نہیں مل پاتے اور نہ کوئی موضوع سمجھ میں آتا ——— اگر ہمت کرکے پوچھ بیٹھتا ۔

"شاہد ——— کیا باتیں ہو رہی ہیں ۔"

تو شاہد طنز سے کہتا ۔

[illegible] ——— [illegible] پوچھ [illegible] کی جائیں"———

وہ فخریہ اپنے دوستوں کی طرف [illegible] پہ سب کے سب مسکرا دیتے

[illegible] کے تیل میں بھیگے ہوئے بالوں [illegible] ہٹ جاتا ۔

یہ لوگ اپنی دوستی ——— [illegible] میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں ——— میں ان تک نہیں پہنچ سکتا ۔ ان کے درمیان کوئی خلا نہیں ، جہاں میں فٹ ہو سکوں ———

آہستہ آہستہ [illegible] تھک کر اور ہار کر میں کتابوں کی طرف سمٹتا گیا ——— سمٹتا گیا ——— صبح پڑھائی ——— اسکول میں پڑھائی ——— شام کو گھر کا سودا سلف لانا ——— لالٹین صاف کرنا ——— بستر کرنا ——— اور پھر مغرب کے بعد روٹی سبزی کھا کر رات گئے تک پڑھتے رہنا ۔ چند سال کیسے بیت

گئے۔ مجھے احساس کبھی نہ ہو سکا۔ اسکول کی تعلیم کا یہ دور جو بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ انوکھا اور خواب آفریں ہوتا ہے، مجھ سے چھنتے گئے۔ میں نے یہ عرصہ، میعاد قیدی کی طرح گھسیٹ گھسیٹ کر کاٹا ــــ میرا وہاں کوئی دوست نہ تھا۔ باتیں سبھی کرتے، مگر یوں جیسے کسی دشمن سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی ہو ــــ اگر میں ناغہ کرتا تو دوسرے دن کوئی بے تابی سے یہ نہ پوچھتا ــــ

"بتاؤ۔ کل کیوں نہیں آئے ــــ میں دن بھر بور ہوتا رہا" ــــ بلکہ میں خود ہی کسی کو وجہ بتلانے لگتا۔ اور میری بات سنی ان سنی کر کے وہ کہہ دیتا ــــ

"اوہ! ــــ کل تم نہیں آئے تھے کیا؟" ــــ

اور میں خود کو اور بھی چھوٹا محسوس کرنے لگتا ــــ وقت تو بہتا دریا ہے ــــ میں میٹرک میں آیا ــــ ٹسٹ ہوا اور سنٹ اپ بھی ہو گیا ــــ مگر ان دنوں کی یادیں اب بھی میرے اندر محفوظ ہیں ــــ کہ میں سنٹ اپ ہو کر کتنا خوش تھا ــــ کیوں کہ اس گھٹن آمیز ماحول سے مجھے نجات مل گئی تھی ــــ میں نے پوری لگن کے ساتھ خود کو کتابوں میں ڈبو دیا ــــ کتابوں کی دنیا مجھے بہت عزیز تھی ــــ بڑے بڑے علما کی کتابیں ــــ اونچے آدرش کی باتیں ــــ زندگی اور موت کے فلسفے ــــ عروج اور زوال کی اصلیتیں ــــ حق اور ناحق کی جنگیں ــــ کتابوں میں کتنی گہرائی، کتنی وسعت تھی ــــ اب میرے ذہن کی دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی تھی۔ میں چیزوں کو فیکٹرز کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا، سمجھ سکتا تھا، پہچان سکتا تھا ــــ اسی لئے اب میں محسوس کرنے لگا، میرے یہ ساتھی جو اسمگل شدہ کپڑوں اور اپنے گھر کی بدیسی چیزوں کی اتنی تعریف کرتے ہیں ــــ اپنا کلچر کھو کر، جس ماحول میں رہنے کا فخر محسوس کرتے ہیں وہ در اصل ذہانت اور دریافت کی گہرائی سے کتنی دور ہیں ان کی زندگیاں کتنی کھوکھلی ہیں اور اس کھوکھلے پن پہ انھیں کتنا غرور ہے ــ سلی پیپل (SILLY PEOPLE) آہستہ آہستہ مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی ــــ لیکن نہ ابھی خوف پوری طرح ختم ہوا تھا۔ نہ ہمدردی اور سلف کا چہرہ کھل کر سامنے آیا تھا ــــ اسی لئے ذہنی آئینے کا مادی سطح پر سامنا کرنے کی ہمت ابھی مجھ میں نہ تھی۔ اسی لئے ایڈمٹ کارڈ لینے کے دن جب میں ایک بار پھر ان کے درمیان گھر گیا تو مجھے کچھ اپنے نظریات کھوکھلے محسوس ہونے لگے۔ اور لگا جیسے میں جن باتوں کو زندگی کا حصول سمجھتا تھا وہ سب کی سب آؤٹ ڈیٹیڈ چیزیں ہیں ــــ لکھنے والوں نے در اصل اپنی محرومیوں کو پرانے لفظوں میں لپیٹ ڈالا ہے۔ نقاب کے لئے ــــ ایک بار پھر مجھے محسوس ہوا جیسے ان لوگوں کے سامنے میرا قد چھوٹا ہے۔ میں بونا جیسا ہوں ــــ اور جب کوئی خود کو ڈوآرف (DWARF)

سمجھنے لگتا ہے تو جمناسٹک آرٹ کی کشش بہت بڑھ جاتی ہے ـــــ میرے اندر بھی کچھ ایسی ہی رسہ کشی تھی ـــــ

اس کے بعد کے چند سال بڑی تیز رَوی کے تھے۔ میٹرک کی شاندار کامیابی کے بعد میں نے انٹر سائنس میں داخلہ لیا ـــــ اور یوں تندہی کے ساتھ پڑھنے لگا جیسے کوئی فائیو ہنڈرڈ میٹرس ریس کے آخری حصے میں دوڑتا ہے۔

اب زندگی کے اصلی چہرے کے خدوخال کچھ نظر آنے لگے۔ زندگی کا کلوز اپ، بڑا کریہہ تھا ـــــ زندگی حقیقی معنوں میں کیا ہوتی ہے اور کیا بیتیں کی جاتی ہے ـــــ اور کیا نظر آتی ہے ـــــ لائف از نو رینڈ شو فار لائف ـ ـ

بہتر اور تیز اسٹوڈنٹ بھی اتنا متاثر نہیں کر سکتے جتنا کہ وہ جو کند ذہن ہونے کے باوجود اسمارٹ ہوں۔ فٹ فاٹ میں ہوں۔ اور امریکن طرز کی انگریزی بول سکتے ہوں۔ کانونٹ پروڈکٹ کا کمپلکس یہاں بھی تھا ـ ـ

دیکھتے دیکھتے میں نے میڈیکل میں داخلہ لے لیا۔ کیوں کہ ان دنوں ایڈمیشن ٹسٹ، پیروی کا اتنا زور نہیں تھا۔ صرف میرٹ اور نمبر پر ہی داخلہ ہوتا تھا ـــــ اور میری یونیورسٹی میں سکنڈ پوزیشن تھی ـــــ پتہ نہیں کیوں گلیمر اور شور سے خوف زدہ ہونے کے باوجود میں نے کانٹوں سے اٹے ہوئے اس راستے کا انتخاب کیا تھا ـــــ دراصل میرے اندر کہیں مردِ آہن سو رہا تھا۔ اور میں نے حالات کا ایک آہنی وار کر کے اسے جگانے کا ارادہ کر لیا تھا حالانکہ میں جانتا تھا۔ ایم بی بی ایس اور پھر ایم ایس کر لینا اتنا مشکل نہیں تھا، جتنا کہ خود کو معاشرے میں بہ حیثیت اچھے ڈاکٹر کے انٹروڈیوز کرنا مشکل تھا ـــــ پھر بھی میں چونکہ بہت ذہین تھا، اس لئے بے حد ضدی بھی تھا ـــــ اور جب ضد تھی تو قوت احتجاج بھی ـــــ اور کچھ بھی کر گذرنے کا جذبہ بھی تھا اور رسک لینے والا کردار بھی موجود تھا ـــــ مجھے گوتم کے 'مدھیم مارگ' سے نفرت تھی ـــــ میں احتیاط کو بزدلی اور بزدلی کو کردار کی نفی سمجھتا تھا۔

فرسٹ ایر اور سکنڈ ایر میں صرف کتابوں کی دقت تھی ـــــ اس کے لئے میں نے میٹرک کے سنٹ اپ لڑکوں کے کئی ٹیوشن طے کر لئے تھے ـــــ ہر شام سے سات بجے تک انھیں کوچ کرتا ـــــ اور جب ان سے فراغت ہوتی تو لائبریری چلا جاتا ـــــ کچھ کتابیں خریدیں ـــــ اور یوں میں نے زندگی کے ایک اور چیلنج کو قبول کر لیا ـــــ دن مہینے اور برس بیتتے رہے ـــــ ان دنوں وقت

کی پرواز شاہینی تھی ـــــ اور میں خود کو فضا کی بلندیوں میں محسوس کیا کرتا ـــــ پھر مجھے ماڈلس خریدنے کی ضرورت ہوئی کیوں کہ ماڈلس کے بغیر میں صحیح اور اچھی تیاری نہیں کر سکتا تھا ـــــ اور ماڈلس کی قیمت بہت زیادہ تھی!

وہ عجیب سا دور تھا۔ ڈاکٹر، نچلے مڈل کلاس کے لئے بہت بڑا تھرل تھا ـــــ گریٹسٹ اچیومنٹ ان لائف (GREATEST ACHIEVEMENT IN LIFE) اور اس طوفانی دور میں میرے ماں نے مجھے ایک قیمتی چیک کی طرح کیش کرلیا ـــــ وہ ان کے ایک واقف کار کی لڑکی تھی جس سے انھوں نے میری شادی کردی ـــــ اور شادی کے اخراجات کے نام پر کئی ہزار روپے لے لئے ـــــ جن سے میں ماڈلس، کتابیں اوزار اور دیگر ضروری چیزیں خرید سکتا تھا ـــــ میری شادی ایک عام شادی تھی ـــــ اور میری بیوی ایک عام بیوی ـــــ میرا مقصد کسی بھی طرح ایک کامیاب ڈاکٹر بننا تھا ـــــ اس کے علاوہ نہ میری توجہ کا کوئی مرکز تھا ـــــ اور نہ ذہن کا کوئی زاویۂ فکر ـــــ بیوی بس بیوی تھی ـــــ اور ویسے بھی، عورتوں کو میں شئے سمجھنے والوں میں تھا ـــــ نرم و نازک احساسات کا پودا کھلے بغیر ہی مرجھا گیا کیوں کہ میں جس سینیئر ڈاکٹر کی یونٹ میں تھا، اس کے رویے نے اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا ـــــ یہ شئے، قابل احترام ہو ہی نہیں سکتی ـــــ حضرت آدم کو جنت سے نکلوانے والی یہ مخلوق بڑی ہی شاطر اور سفاک ہوتی ہے ـــــ ان کے پاس زہر کی اتنی قسمیں ہوتی ہیں کہ بڑے سے بڑے مفکر، عالم، اور خود کو سرحد ادراک پہ سمجھنے والا بھی بے موت مرجاتا ہے۔ میں ہر دن دیکھا کرتا، ڈاکٹر لڑکیوں پہ خصوصی توجہ دیتا، خواہ وہ وارڈ ڈیوٹی ہوتی یا جنرل لیکچر ـــــ وہ لڑکوں کو قطعی نظر انداز کر کے صرف لڑکیوں سے ہی مخاطب ہوتا، انھیں ہی سیکھنے کا موقع دیتا اور یہ لڑکیاں، کبھی بے باک کبھی شرمیلی، کبھی کرسٹن کیلر جیسی اور کبھی مونا لیزائی مسکراہٹ سے ڈاکٹر کے شعور کو، سلف کو، احساس ذمہ داری کو مفلوج کر دیا کرتیں ـــــ خصوصاً دلاکھیٹ پر تو وہ شدت سے مہربان تھا ـــــ بے حد عام سی ذہانت اور بے حد منفرد چہرے والی یہ لڑکی کہیں میرے خوابوں کو روند نہ ڈالے، میں اس لئے بہت خوفزدہ تھا ـــــ کیوں کہ مجھے یہاں کی ہسٹری معلوم تھی ـــــ یہاں کس مول کیا بکتا ہے اور کیا خریدا جاتا ہے، یہ صرف لیجنڈ نہیں تھا ـــــ اور پھر سائنس نے بتا دیا تھا، جو کچھ ایر (ether) میں ہوتا ہے، وہ کسی نہ کسی سطح پر سچ بھی ہوتا ہے ـــــ

میں نے تندہی محنت اور جانفشانی کی انتہا کردی ـــــ آخر کار میدان کارزار کے اس ڈرامے کا خاتمہ ہوا ـــــ مجھے فرسٹ پوزیشن مل گئی ـــــ میں نے حکومت کو درخواست دی اور مجھے ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کے لئے لندن بھیج دیا گیا ـــــ

میرے اور مجھ جیسے اسٹیبلشمنٹ دیکھنا چاہتے تھے وہ دراصل ماضی کی اقدار کے نمائندہ تھے ـــــ ان کے نزدیک کسی شخص کا یکبارگی دل کے دورے سے مر جانا بہت بڑی ٹریجیڈی تھی ـــــ لیکن میں نے حال کی، اور آج کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا ـــــ میں جانتا تھا، موت خواہ حادثے سے ہو، اتفاق سے، یا قلب کی حرکت رُک جانے سے، وہ برین ہیمرج یا بلڈ کینسر اتنا بڑا المیہ نہیں، جتنا کہ وجود کے اندر کسی بھیانک مرض کو ڈھونا ہے، سیریس نس جانتے ہوئے بھی زندگی کے ساتھ نباہنا ہے ـــــ اور ہر دن کے روٹین ورک میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اندر سہمے رہنا ہے ـــــ آج کی زندگی کی چمک دمک، ہوٹلنگ، اور فری مکسنگ صرف بیماری دیتی ہے یہ مجھے پتہ تھا ـــــ اور جب ان بیماریوں کی تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے تو یہ لوگ ایمرجنسی وارڈ میں ایڈمٹ ہوتے ہیں ـــــ اور آپریشن کرانے کے لئے دوا سے لے کر دعا تک کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنی عمر بھر کی کمائی گنوا دیتے ہیں ـــــ میں نے محسوس کیا تھا، گھٹے ہوئے متوسط طبقہ کے لئے آپریشن بہت بڑا اتھرل ہے۔ یہ طبقہ، تنہائی کا شاکی، اور خود غرضی کا شکار ہوتا ہے۔ یہ لوگ جان کے یا انجانے میں صرف رینا جانتے ہیں۔ دبتے رہتے ہیں ـــــ انھیں سمجھنے والا کوئی نہیں، اور چیٹ کرنے والی ساری دنیا ہوتی ہے۔ آفیسر اور ماتحت۔ بچے، پڑوسی، رشتہ دار احباب سبھی چیٹ کرتے ہیں ـــــ اسی لئے جسے زندگی بھر، عزیزوں۔ رشتہ داروں، دوستوں اور دشمنوں نے کوئی اہمیت نہ تھی، وہ بھی آپریشن ٹیبل پہ ڈاکٹر کی قینچی کے نیچے بہت اہم بن جاتے ہیں ـــــ اور یہ اہمیت انھیں اتنی عزیز ہوتی ہے کہ اس کے لئے وہ بخوشی آمادہ ہو جاتے ہیں ـــــ دورِ وحشت کا انسان، مہذب لباس میں آج بھی تھا ـــــ اقتدار کے اس روپ بہروپ کو میں نے ہر شکل میں پہچانا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ کہ پیٹ کی بیماریاں دن بدن کامن ہوتی جا رہی ہیں ـــــ اس لئے میں لندن سے ایک ماہر سرجن بن کر واپس آیا ـــــ مجھے جنرل ہاسپٹل میں ملازمت تو مل گئی لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا۔ پرائیویٹ پریکٹس!

شہر میں بڑے بڑے ماہر سرجن موجود تھے ـــــ جنھوں نے اپنی اپنی کلینک کھول رکھی تھی ـــــ اور یہاں ہسپتال سے زیادہ بھیڑ ہوتی تھی ـــــ ایسے بازار میں اپنے لئے جگہ بنانا مجھے ایک مرتبہ پھر اتنا ہی کٹھن محسوس ہوا جتنا کہ اسکول کے دنوں میں اپنے ایکزسٹنس (EXISTENCE) پر یقین کرنا! ـــــ میں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی ـــــ میں جانتا تھا یہ کلرکزم کا زمانہ تھا ـــــ اور اسٹیبلشمنٹ (ESTABLISHMENT) کا سارا اختیار نچلے لوگوں کو حاصل تھا ـــــ میں نے کمپاؤنڈروں، کلرکوں حتیٰ کہ سویپرز سے اصلیت کا سراغ لیا ـــــ دوا کی دوکانوں سے پتہ کیا پیتھولوجسٹ

جتنے تھے ان سے کانسلٹ کیا — ایجنٹ مقرر کئے، جنھیں دلال بھی کہا جا سکتا ہے۔ عجیب سی بات تھی، نئے دور نے گھٹیا حرکتوں کے لئے نئے نئے کلچرڈ لیبل بنائے تھے حالانکہ ایسی ایجنسی بھی دلالی سے کم نہ تھی — یہ لوگ گھاٹ سے اور جنکشن سے مریضوں کو مناسب کمیشن پر لایا کرتے — ادھر ادھر اپنی سرکل میں میرا اشتہار کرتے — اور یوں آہستہ آہستہ میری پریکٹس چل پڑی — میں اپنی راہ کشادہ کرنے میں بے دریغ پیسے خرچ کرنے لگا — اور یوں تین چار سال کی مزید جدوجہد کے بعد میں ایک مشہور و معروف اور مقبول سرجن بن گیا — میری ایک شاندار کلینک تھی — اور میں اس قدر مصروف تھا کہ بیوی اور بچوں سے باتوں کی بھی مجھے فرصت نہ تھی — لیکن میں اس کے لئے پریشان بھی نہ تھا کیوں کہ ان معصوم اور سچی باتوں کی جب پہلے ہی ضرورت نہ تھی تو آج کیا اہمیت

اب میری سمجھ میں آجانے والی زبان صرف ایک تھی — "دولت — روپیہ" —

میرے بچے بھی کانونٹ میں پڑھتے تھے۔ اسمگل شدہ قیمتی کپڑے پہنتے — اور کانونٹ کامپلکس کی وجہ سے مخصوص امریکن طرز کی انگلش بولتے تھے — ان کے پاس کتاب اور کاپی کے علاوہ وہ طرح طرح کے کپڑوں اور فیشن کی اشیا کی بھی بھرمار تھی — ساتھ ہی انھیں وہ سب کچھ میسر ہو جاتا جن کی وہ تمنا کرتے — شروع میں بیوی نے اکثر چاہا کہ بچوں کی زندگی کی راہ عام سیدھی اور سچی ہو، مگر میں نے تیز لہجے، تلخ آواز، اور ٹھوس دلیل کے ساتھ اسے یوں چپ کر دیا کہ اسے بھی اپنی راست روی پہ خام خیالی کا یقین ہو گیا — اور ہمیشہ کے لئے قوت احتجاج کھو دی — کیوں کہ میں سمجھتا تھا، بیک ٹو سمپلی سٹی، دراصل محرومی کا دوسرا نام ہے — میں نے اپنے بچوں کے لئے کئی مہنگے ٹیوٹر رکھے تھے — اور پھر کلاس ریپوٹیشن بھی برا نہ تھا —

اکثر رات گئے، کلینک سے واپسی کے بعد میں ایک بار بچوں کے بیڈ روم میں ضرور جاتا — پتہ نہیں کیوں، لامحالہ ہی میرے قدم اٹھ جاتے — اور فوم کے بستر پہ الگ الگ سوئے سوئے بچوں کو دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا احساس کا CONTRADICTION ۔ انھیں گرم کمرے کے گرم اور آرام دہ بستر میں پا کر جہاں مجھے طمانیت کا احساس ہوتا، وہیں اپنے بچپن کا منظر ذہن پہ ابھر آتا —

"امی کا منہ میری طرف — نہیں میری طرف" —

امی کے ساتھ سونے کے لئے بڑے ہونے کے بعد بھی پیٹ درد کا بہانہ۔

"رونی میاں! — آج ہم بیمار ہیں۔ آج ہم امی کے ساتھ سوئیں گے"، ماں کے سوتی، بغیر غلاف

کے میل خوردہ لحاف کی گرمی شاید ان بچوں سے چھن گئی ہے ـــ شاید یہ سنوری ہوئی کیاری کے خودرو پودے ہیں ـــ جن پہ کسی مالی نے کبھی کوئی توجہ نہیں دی ہے ـــ

کیا اس طرح یہ زندگی کو جھیل سکیں گے؟ ـــ

لیکن کچھ تو تکان ہوتی ـــ اور کچھ مسلسل متوازی راستوں پر دوڑنے والے ذہن کا بوجھل پن کہ میں بستر پہ لیٹتے ہی سو جاتا۔ صبح سے پھر وہی معمول ـــ وہی زندگی اور وہی سب کچھ! ـــ

سال میں چار مرتبہ مجھے بچوں کے چہروں کو غور سے دیکھنے کا موقع ملتا ـــ جب وہ اپنا کواٹرلی پروگریس کارڈ لے کر دستخط کے لئے میرے پاس آتے ـــ

ڈولی ـــ نکی ـــ بیبی ـــ بجو

میرے بچوں کے ناموں سے لڑکی لڑکے کی تخصیص مشکل تھی۔ لباس سے بھی ـــ اور اندازے بھی ـــ یہ کسٹڈ ریلوز کا المیہ تھا ـــ بغیر سمجھے کسی شئے کو قبول کر لینا اور اہمیت جانے بغیر کچھ بھی لوز کر دینا ـــ اس ٹریجیڈی کا براہ راست سامنا کرنے سے بچنے کے لئے میں انھیں "مائی ہارٹ" کہا کرتا تھا ـــ ان کے پروگریس کارڈ میں میرے رزلٹ پیپر جیسی چونکا دینے والی بات نہ تھی۔ اگر کسی سبجکٹ میں نمبر اچھا تھا تو کسی میں ریڈ مارک بھی ـــ

دستخط کرتے ہوئے اکثر مجھے اپنا پال پن خشک ہوتا ہوا محسوس ہوتا ـــ "کیا میرے بچے کبھی میری طرح ذہین، نہیں ہو سکتے تھے؟" ـــ

میری بے توجہی نے انھیں صحیح گروتھ سے دور رکھا ـــ

مگر جب ہی میرا ذہن مجھے سنبھال لیتا ـــ

"مجھے ذہانت سے فرسٹریشن حاصل ہوا ـــ ان کی زندگی میں کوئی فرسٹریشن نہیں۔ اس لئے ذہانت نہ ہونے کا دکھ کیوں؟ ـــ

لیکن یہ جواز اکثر بڑا سطحی لگتا ـــ کیوں کہ بچپن کی پڑھی ہوئی کتابیں پتھروں کی طرح ایک ایک کر کے میرے ذہن پہ گرنے لگتیں۔ شاید کہیں کچھ غلط تھا ـــ کوئی بھرم ـــ کوئی ایلوژن ـــ خود فریبی کا کچا راستہ ـــ

پتہ نہیں کیوں اندر ـــ بہت اندر سے غیر مطمئن تھا میں ـــ جیسے کوئی حق تلفی ـــ کوئی احساس جرم، انجان جذبے کی طرح میرے اندر موجود ہو ـــ اور میں جلدی سے دستخط کر کے، بچے کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے، بے حد رسمی انداز سے کہتا ـــ

"ڈو مور جٹیر ــــــ نکسٹ ٹائم" ــــــ

اور وہ کبھی نارمل سی ایک مسکراہٹ بکھیر کے چل دیتے ــــ میں شاید کچھ کرنا چاہتا تھا ــــ بہت کچھ ــــ مگر کیسے ؟ ــــ زندگی دن بدن اتنی فاسٹ ہوتی جارہی تھی کہ نیک و بد کا فرق سمجھنے کی مہلت بھی نہ ملتی ــــ میرا سارا وجود ایک مشین میں تبدیل ہو چکا تھا ــــ میری ہر حرکت ایک خود کار پرزے کی طرح میرے لئے غیر اختیاری ہو گئی تھی ــــ

میں اوٹ ڈور ڈیوٹی میں ہوتا۔ وہاں جس مریض کی مالی حالت اچھی نظر نہیں آتی اس کی عام بیماری کو بھی اس قدر کامپلیکیٹڈ بنا کر بتاتا کہ اس کا وجود کانپ اٹھتا پھر اسے اپنے کلینک کا کارڈ تھما کر شام کو آنے کے لئے کہہ دیتا ــــ اور جب ایسا کوئی بھی مریض مجھ تک پہنچتا تو میں اس کی بیماری اور جنرل ہاسپٹل کی بے رحمی کا ذکر یوں کرتا کہ وہ جائے پناہ سمجھ کر میرے یہاں ایڈمٹ ہو جاتا ــــ اور میں آپریشن کر کے ہزاروں کے بل پے کروا لیتا ــــ میرے چاق وچوبند دلال ہر وقت چوکو شیا ٹوپی پہنے رہتے ــــ ہر ماہ میرے ان گنت اکاؤنٹس میں ایک طرف سے ہندسے کا اضافہ ہوتا رہتا دوسری طرف میری زندگی کا معیار لفٹ کی تیزی کے ساتھ، بغیر زینہ بہ زینہ چلتے ہوئے اوپر اٹھتا گیا ــــ اوپر ــــ اور اوپر ــــ

مگر یکبارگی، زوال کا آغاز، میرے اندر ہی ہونے لگا جیسے وہ نادیدہ پودا، جو میرے اندر پل رہا تھا، اپنی شناخت کے لئے میرے جسم کا حصار توڑ کر باہر آنے کے لئے بے کل ہو۔ میں اندر اندر گھبرایا ہوا رہنے لگا ــــ خوفزدہ اور بے سہارا ــــ میرے بالوں کی سیاہی، سفیدی میں بدلنے لگی ــــ اور بچوں کے کالے کالے بالوں کے گرد سفیدی پناہ ڈھونڈنے لگی ــــ اور اب میری نظریں غیر ارادی طور پر ہی، بچوں کے گرد منڈلایا کرتیں ــــ

لیکن بچے کیا تھے ؟ ــــ میرے بچے! ــــ

نئے دور کے ان اجنبی چیزوں میں میری پہچان کہیں نہ تھی! ــــ

میں نے خود کو گم کر دیا تھا ــــ

میری بیٹی ڈولی ــــ ایم۔ اے کی طالبہ، باب ہیر والی ایک ماڈرن لڑکی تھی ــــ جو کلاس کے لئے تیار ہونے سے پہلے شیمپو کرتی ــــ بیوٹی پارلے جا کر ہر ہفتے فیشئیل کروانی ــــ اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گھنٹوں لپ اسٹک اٹھا اٹھا کر اپنی منی کے ساتھ میچ کرنے میں مصروف رہا کرتی ــــ منی اور میکسی پہننے والی یہ لڑکی، میری کون تھی ؟ ــــ

ایک دن میں نے سے بلا کر کہا ــــ

"ڈولی ـــ علم حاصل کرنا ایک تپسیا ہے ـــ تم نے اسے شو بزنس بنا دیا ہے ـــ ہاؤ ول یو گٹ اپنی تھنگ دس دے؟" اس لمبی پتی ماڈل گرل نے میری طرف حیرت سے دیکھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں ـــ یا میں نے کسی ایسی زبان میں باتیں کی ہوں، جو وہ جانتی ہی نہ ہو ـــ پھر اس نے اپنی کلائی پہ بندھی ہوئی بڑی سی مردانہ گھڑی دیکھ کر کہا ـــ

"ڈیڈ ـــ ڈونٹ بی سلی ـــ میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ـــ آپ کو پتہ نہیں ـــ میرا ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کس منٹلیٹی کا ہے ـــ ڈل اور کھونڈی لڑکیوں کو اس نے آج تک فرسٹ کلاس نہیں دی ـــ اور وہ پرس کاندھے سے لگا کر چل دی ـــ اس کی پینسل ہیل کی کھٹ کھٹ، میرے ذہن میں ہتھوڑے کے ضرب کی طرح بجتا رہی ـــ میں پھٹی پھٹی نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا ـــ

جب ہی فون رنگ کرنے لگا ـــ

"ہیلو ـــ یس ـــ کیا؟ ـــ بالدار کلائنٹ ہے ـــ اینڈ تی سائنٹس ـــ اسے پیٹ کا کینسر بتا کر پانی چڑھانا شروع کر دو ـــ جسٹ کمنگ!؟ ـــ

اور میں ڈولی کو بھول کر مال کی بھٹی میں کود پڑا ـــ

وہ ہوٹل اسی راستے میں نکلا ـــ اپنی طالب علمی کے دور میں میری اس کی طرف نظریں اٹھانے کی بھی ہمت نہ ہوتی۔ یہ بڑی سی شاندار عمارت مجھے دوسری دنیا کی چیز لگتی ـــ اور اب مجھے اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ میں ادھر کا رخ کرتا ـــ نہ حاصل کر پاتا، تمنا کی تخم کاری کرتا ہے، اور حصول کا یقین اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ شاید یہی بات تھی ـــ لیکن آج شاید میں بہت تھک گیا تھا اس لئے کلینک سے واپسی کے درمیان میں نے وہیں پارک کیا ـــ اور کولڈ ڈرنکس کارنر کی طرف چل دیا ـــ ہاں میں شراب نہیں پیتا تھا ـــ میرا خیال تھا، شراب وہ پیتے ہیں، جن کا ماضی کسی نہ کسی طرح ذلیل اور قابل فراموش ہوتا ہے اور جو ماڈرن اور اسمارٹ بننا چاہتے ہیں ـــ بنے ہوئے اسمارٹ میں اور اسمارٹ ہونے میں جو فرق تھا۔ وہ ابھی باقی تھا ـــ اور ماضی کی تابانی، اقدار کی حفاظت شاید کہیں موجود تھی ـــ اس لئے میں نے کبھی شراب کے لئے سوچا تک نہیں ـــ

دور سے باہری کاونٹر صاف نظر آ رہا تھا ـــ جہاں ایک شخص سوٹ کیس لئے غالباً اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا تھا ـــ میری طرف اس کی پشت تھی ـــ مگر پیچھے سے ہی، اس کا اسمارٹ

فیگر، خوبصورت سے بڑھے ہوئے بال اور سائیڈ پوز کی دلکشی بڑی اچھی لگ رہی تھی ــــ لڑکی بھی بڑی اچھی تھی ــــ کاؤنٹر مین نے مجھے متوجہ دیکھ کر مکاری کے ساتھ کہا ــــ

"کسی بڑے ڈاکٹر کا بیٹا ہے صاحب ــــ سوٹ کیس میں صرف کتابیں ہیں ــــ روم لینے کا صرف یہی بہانہ رہ گیا ہے ان لوگوں کے پاس مالک سب جانتا ہے مگر بزنس کا ہے کو خراب کرے گا۔"

میری جھکی ہوئی گردن اور بھی جھک گئی جب پاس سے گذرتے ہوئے اس نے "ہیلو ڈیڈ!" ــــ کہا اور کاؤنٹر مین نے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھ کر "سوری سر" کہا تھا ــــ میں نے کوک کی کھلی بوتل چھوڑ دی ــــ پیسے رکھے اور لوٹ آیا ــــ

مجھے ہاسپٹل بھی جانا تھا ــــ مگر میرے اعصاب جیسے بہت تھک گئے تھے ــــ میرا جی چاہا، گھر جاکر، اپنے اسی پرانے بستر کو کہیں سے ڈھونڈ لاؤں ــــ مارکین کا ڈوریا دالا؛ دو کلو روئی کا پتلا توشک ــــ پتلی سی سفید کنارے والی سبز چادر ــــ تکیہ پہ خریدا ہوا سستا غلاف ــــ وہی پرانی میلی خوردہ چوکی ــــ جس پر لیٹ کر مجھے گہری نیند آیا کرتی تھی ــــ آج میرے تھکے ہوئے، شکست خوردہ ذہن کو پناہ گاہ کی ضرورت تھی ــــ اس لئے میں ہاسپٹل جانے کے بدلے گھر آگیا ــــ میرے کار کی مخصوص ہارن سن کر دربان گیٹ کھول کر ایک طرف مہذب اور اٹینٹیو (ATTENTIVE) انداز سے کھڑا تھا ــــ

مگر آج مجھے لگا جیسے میں غلطی سے کسی اجنبی کے گھر آگیا ہوں ــــ

کیا یہ میرا گھر ہے ــــ

کیا اسے گھر کہتے ہیں ــــ

باہر سے ہی اسٹیریو کی آوازیں آرہی ہیں ــــ

بنٹی اور ببلو ــــ بنٹی کے ہاتھوں میں سگریٹ ہے۔ اور ببلو رقص کر رہا ہے ــــ اس کے ساتھ ایک ہم عمر لڑکی ہے ــــ کئی لڑکے ہیں ــــ قہقہے کا ننگا پن ہے ــــ جملے کی عریانیت ہے۔

میں اندر گیا ــــ وہاں سب کچھ ویسے ہی ہے جیسے گھر نہ ہو ایک بہت بڑی فیکٹری ہو ــــ جس کے ہر حصے میں الگ الگ ورکر اپنے اپنے کام کر رہے ہوں ــــ ایک دوسرے سے لاتعلق اور ٹوٹے ہوئے ــــ یکائی کے تصور کے ریزے بکھرے تھے ــــ میں بہت بے کل تھا ــــ میں نے بیوی کو بلوایا ــــ وہ شاید کسی تقریب کے لئے تیار ہو رہی تھی ــــ گھبرائی ہوئی آئی اور بولی ــــ

"آپ ــــ آج ہاسپٹل نہیں گئے ــــ کیا بات ہے ــــ کچھ چاہئے" ــــ

"بیٹھو ان ـــ تیرے لہجے میں برسوں پرانی شکست تھی۔
"تم نے کبھی بچوں پہ توجہ دی ـــ یہ لوگ کس راستے پہ چل نکلے ہیں ـــ تم ماں ہو

ـــ اور ـــ

اس نے گھبرا کے میری طرف دیکھا اور جلدی سے بولی ـــ
"لگتا ہے آج آپ بہت تھک گئے ہیں ـــ اچھا کیا جو کلینک سے گھر چلے آئے ـــ تھوڑا آرام کر لیجئے پھر فنکشن میں بھی تو جانا ہے ـــ مجھے بھی دیر ہو گئی ـــ ان لوگوں نے پہلے سے بلایا تھا ـــ اتنی انٹی میسی ہونے کے باوجود مہمان کی طرح جانا اچھا نہیں لگتا" اور میں اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی اجنبی عورت ہو ـــ اور خاموشی سے بستر پہ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مطمئن ہو کر چلی گئی ـــ آج مجھے اتنی گھبراہٹ اور ایسی بے چینی تھی جیسے میری کوئی بہت ہی عزیز، بڑی ہی قیمتی شئے کھو گئی ہو ـــ انتہاء دولت۔ شاندار کوٹھی۔ عزت۔ نام۔ شہرت، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی شاید میرے پاس کچھ نہ تھا ـــ میں شاید بہت ہی قیمتی شے ہار چکا ہوں ـــ
لیٹے لیٹے میں نے بہت سوتوں میں بڑی بے چینی محسوس کی۔ برآمدے میں ٹہلنے لگا ـــ میرے ذہن نے دوست کی طرح مجھے کہا ـــ
"کلب چلے چلو ـــ طبیعت بہل جائے گی" ـــ
پھر دوسرا مشورہ ـــ
"مسز بھارگوا ـــ آج خالی ہوں گی ـــ وہیں چلتے ہیں" ـــ
"آج کی ایک کلچرل پروگرام بھی ہیں" ـــ
لیکن میں نے ذہن کے تمام مشوروں کو پرے ڈھکیل دیا ـــ جیسے کوئی دشمن مجھ پہ حملہ کرنے کو ہو ـــ یوں ہی کروٹیں بدلتے بدلتے ساری دوپہر بیت گئی ـــ اسٹیریو کی آواز بند تھی ـــ اب گھر میں غالباً مکمل سناٹا تھا ـــ دھوپ بھی ڈھل چکی تھی ـــ میں کمرے سے باہر آیا ـــ اور غیر ارادی طور پہ بچوں کے کمرے کی طرف چل پڑا ـــ اندر شور اور ہنگامے کی جگہ سنجیدگی چھائی تھی ـــ شاید سب بچے اکٹھے تھے۔ اور سب کے سب چپ ـــ مجھے حیرت ہوئی ـــ اور اپنی پچیس سالہ تجارتی زندگی میں میں نے پہلی بار بچوں کی باتیں چھپ کر سننے کی ضرورت محسوس کی ـــ
"ڈولی ـــ ڈونٹ وری ـــ ڈیڈ کے پاس بہت ڈھیروں دوائیں ہیں ـــ کمپاونڈر سے ہیلپ لی جائے گی"

'آف کورس ـــــ میں نے اپنی گرل فرینڈ کی کئی بار مدد کی ہے ـــــ

مجھ سے اور وہاں رکا نہیں گیا ـــ جیسے اندر کہیں زلزلہ آگیا تھا ـــ ان چوبی آوازوں نے مجھے فراز سے نشیب کی طرح یوں ڈھکیل دیا کہ میں ماضی میں گر پڑا ـــ گھر کا مذہبی ماحول ـــ ابا کی آدرش وادی باتیں ـــ سماج کا احاطہ ـــ زندگی کی زنجیریں ـــ وہاں شاید کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا ـ پھر میں کسی سراب کی تلاش میں اتنی دور نکل آیا کہ واپسی کی ہر راہ میری ہی لاش سے ہو کر جاتی تھی۔ یہ بچے، میرے ہی جسم کے حصے ہیں! ـ ان کی تباہی کا ذمہ دار میں خود ہوں!

میں کل سے ہی ہر شام بچوں کے ساتھ گذاروں گا ـ انھیں دھیرے دھیرے بتاؤں گا ـــ ہمارے دھرم اور ایمان کی ذمہ داری کیا ہے ـــ سچ اور جھوٹ کا فرق ـــ سکھ اور نجات کے راستے ـــ سچی اور پرسکون زندگی کے عزائم ـــ مجھے شاید واپس لوٹنا پڑے گا کہ میں اجنبی راستے پر نکل آیا ہوں ـــ

مگر راہیں محدود ہو چکی تھیں ـــ یہ دوسری نسل کا المیہ تھا۔ دوسری نسل کو بہر حال اس عذاب سے گذرنا ہی ہے تاکہ آنے والی نسل اپنے بے ننگ و نام راستے پر فخر محسوس کر سکے ـــ اس لئے کہ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

اور میں نے یکبارگی ماضی کو مسمار کر کے، نئی طرح کا فیصلہ کر لیا ـــ کیوں کہ میرے ہاتھ فون کی طرف بڑھ چکے تھے ـــ قسطوں پہ مرنے والا ایک انسان آج واقعی مر گیا۔ طرح دیگر خراج دینا ہی پڑتا ہے!!ـــ

☐

انور خان

۴۸/۲۲، کنگھی والی چال
شیخ برہان قمرالدین اسٹریٹ
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

بلاوا

اس کی آنکھوں کے سامنے اچانک اندھیرا چھا گیا جیسے سورج بدلیوں میں گھر گیا ہو۔ اس نے دیکھا وہ ایک بہت بڑے سوراخ کے دہانے پر کھڑا ہوا ہے اور تمام چیزیں اس سوراخ میں کھنچتی چلی جا رہی ہیں۔ ہرے بھرے درخت فضا میں اڑتے پرندے، مکانات، بجلی کے قمقمے، موٹریں، گاڑیاں، ڈاک کا ڈبہ، خوش پوش راہ گیر، سڑک پہ کھیلتے بچے، سبک اندام حسینائیں، بازار، رکشائیں سب ہی اپنی ملی جلی آوازوں سمیت جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ سوراخ سے مسلسل ایک ڈراؤنی [illegible] گھوں گھوں کی آواز آ رہی تھی اور وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو روکا۔ اس کا دل بڑے زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام لیا۔ اور دیر تک دبائے رکھا یہاں تک کہ اس کے سامنے پھیلا اندھیرا دھیرے دھیرے چھٹا اور ایک بار پھر تپتی دھوپ اسے اپنے سر پر محسوس ہوئی۔ وہ سوراخ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ اسے بے حد نقاہت محسوس ہوئی۔ اور بھوک۔ اس کے پیٹ میں جیسے خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ برسوں کے مریض کی طرح آہستہ آہستہ چلتا وہ نکڑ کے ایک ڈھابے نما ہوٹل تک پہنچا اور لکڑی کی بینچ پر خود کو گرا دیا۔ اس نے ٹیبل والے کو آملیٹ اور ڈبل روٹی کا آرڈر دیا اس کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اگر ٹیبل والا فوراً ہی آرڈر کی تعمیل نہ کرتا تو شاید وہ سو ہی گیا ہوتا۔ مگر آملیٹ اور ڈبل روٹی سامنے دیکھ کر اس نے خود کو سنبھالا اور چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر حلق سے اتارنے لگا۔ پہلے چند لقمے وہ بڑی مشکل سے لے سکا۔ مگر دو چار لقمے پیٹ میں گئے تو کچھ جان میں جان آئی۔ آملیٹ ختم کر کے اس نے چائے منگوائی۔ چائے کا گرم گرم سیاہ جوشاندہ حلق سے اترا تو اس کی طبیعت کسی قدر بحال ہوئی۔ وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھا رہا پھر زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہ جان کر وہ اٹھا۔ نزدیک ہی ایک میونسپل پارک نظر آ رہا تھا۔ پیسے ادا کر کے وہ اس طرف بڑھ گیا۔

پارک تقریباً خالی تھا۔ ایک جگہ سایہ دیکھ کر وہ لیٹ گیا اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تب اچانک اس کا ذہن اپنے کالج کے نوجوان لیکچرر کی طرف منتقل ہوا جو برسوں قبل کہا کرتا تھا کہ کائنات ایک بہت بڑے سوراخ میں داخل ہو رہی ہے اور عنقریب ہم سب اس میں کھو جائیں گے۔ اس وقت اس کی بات اسے بہت عجیب لگی

تھی۔ لوگ اسے سنکی سمجھتے تھے اور اس کا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ حالانکہ وہ بہت ہی ذہین آدمی تھا اور اس کا تعلیمی ریکارڈ غیر معمولی طور پر شاندار تھا۔

'کیا کوئی شخص اس سے باہر بھی آسکتا ہے؟' ایک لڑکی نے کھڑے ہو کر اس سے سوال کیا تھا۔

'مجھے نہیں معلوم' لیکچرار نے جواب دیا تھا، 'میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک بہت بڑا سوراخ ہمیں نگلنے کا منتظر ہے۔ ہم ہر لحظہ اس کی طرف کھنچتے جا رہے ہیں۔ اندر مجھے صرف اندھیرا نظر آتا ہے۔ اس کے اندر کیا ہے مجھے نہیں معلوم۔ اس سوراخ سے گذر کر ہم کہاں پہنچتے ہیں اور آیا اس سوراخ سے ہم کبھی نکل بھی سکیں گے یا نہیں مجھے نہیں معلوم۔ لیکن ہر شخص اس میں اترتا جا رہا ہے چاہے اسے پتہ ہو یا نہ ہو۔"

"یہ سوراخ ہر کسی کو نظر کیوں نہیں آتا؟" اس لڑکی نے پوچھا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید وہ اپنی دنیاوی دلچسپیوں اور کاموں میں اس قدر الجھے رہتے ہیں کہ انھیں اس کی خبر ہی نہیں ہوتی"

"آپ اور کیا محسوس کرتے ہیں؟" کسی اور نے سوال کیا تھا۔

"بس یہی کہ مجھے اس سوراخ میں اترنا ہے۔ اور ہر شے اب میرے لئے بے معنی ہو چکی ہے۔ جب تک میں اس سے نہ گذروں مجھے نامکملیت کا احساس ستاتا رہے گا۔"

چند مہینوں بعد وہ لیکچرر گم سم ہو گیا تھا۔ شاید وہ واقعی اس میں اتر چکا تھا۔ وہ گھنٹوں خاموش گم سم اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا رہتا۔ پڑھانا اس نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی اس حالت پر سب ہی کو افسوس ہوا تھا اس لئے اور بھی کہ اس نے کالج ہی کی ایک خوبصورت خوش مزاج لیکچرار سے شادی کی تھی۔ کئی طالب علم اور لیکچرار اس کے گھر گئے اور گفتگو کی کوشش کی مگر وہ ان کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا جیسے وہ نہ تو انہیں پہچانتا نہ ان کی گفتگو سمجھتا ہو۔

اور اب برسوں بعد جب وہ ان باتوں کو بالکل فراموش کر چکا تھا مطمئن اور کامیاب گھریلو زندگی گذار رہا تھا اور روز بروز ترقی کی نئی منزلوں پر گامزن تھا اچانک وہ خود اس حادثے سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا کیا وہ سچ ہے یا محض ایک بھیانک خواب۔ لیکن اس کے لئے تو وہ ایک آنکھوں دیکھا واقعہ تھا۔ وہ اسے خواب کیسے مان لیتا؟ وہ بھیانک، ڈراؤنی آواز اب بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔

دو چڑیائیں اچانک پھدکتی ہوئی اس کے قریب آئیں اور اڑ کر قریب کے ایک درخت کی شاخ پر جا بیٹھیں۔ بچوں کا ایک غول شور مچاتا ہوا باغ میں داخل ہوا اور باغ کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ گھاس پر چلتی چیونٹیوں کی قطار کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا کہ اس تجزیے سے وہ دوچار کیوں ہوا؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ان گنت

لوگوں کی طرح وہ بھی اس سے بے خبر گذر جاتا شاید مشیت کچھ اور ہی تھی لیکن مشیت کیا ہوتی ہے؟ اس پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ایک دن وہ خود اس سے دوچار ہوگا۔ شاید یہ لیکچرار بتا سکے؟ شاید اب وہ اس تجربے سے گذر چکا ہو۔ یا ہو آچکا ہو۔ ممکن ہے وہ اس کی مدد کر سکے۔

اب وہ خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ نقاہت کا احساس بھی زائل ہو چکا تھا۔ وہ اٹھا کپڑے جھاڑے اور بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

جب وہ لیکچرار کے مکان پر پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ گھر پر سوائے اس کی بیوی کے اور کوئی نہ تھا جو اب بھی شاید اسی لگن سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ ہاں ایک بوڑھی خادمہ آنگن میں آلو چھیلے بیٹھی تھی۔

لیکچرار کی بیوی نے اسے پہچان لیا کیوں کہ وہ اسے پڑھا چکی تھی۔

'کیسے آنا ہوا؟' اس نے پوچھا 'اتنے عرصے بعد'

'بس یونہی آپ لوگوں سے ملنے،' اس نے مختصر جواب دیا۔

'ان کی طبیعت کیسی ہے ابھی؟' اس نے بستر پر لیٹے لیکچرار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'ویسی ہی،' اس نے جواب دیا۔ 'کوئی فرق نہیں، تم بیٹھو میں چائے بناتی ہوں۔'

وہ کرسی کھینچ کر لیکچرار کے پاس جا بیٹھا۔ لیکچرار نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں جیسے وہ اس کے وجود سے بھی بے خبر ہو۔

"ہلو" — اس نے کہا۔

لیکن وہ بدستور خلا میں گھورتا رہا۔

'سر' — اس نے زور سے کہا 'میں نے بھی اسے دیکھا ہے'

لیکچرار نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ شاید اس نے اسے نہیں پہچانا یا اس کی بات نہیں سنی۔

وہ اپنا منہ لیکچرار کے قریب لے گیا اور کافی بلند آواز میں چیخا۔ 'آپ نے سچ کہا تھا، میں نے دیکھا ہے۔ اپنی آنکھوں سے'' اس نے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔

لیکچرار اسے ویسی ہی خالی نگاہوں سے تکتا رہا۔ اس کے چہرے پر اب بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔

لیکن شاید اس کی بات لیکچرار کی بیوی نے سن لی تھی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس کا چہرہ بالکل سپید پڑ گیا تھا۔ جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔

'کیا کہا تم نے ؟'

"ہاں مادام" میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ؟' اس نے آہستہ سے کہا۔

'نہیں نہیں تم تو ابھی بہت چھوٹے ہو، اس کی آواز بھرا گئی' تم اس میں مت پڑو ــــــ ہرگز بھی نہیں

ابھی تمھارے سامنے عمر پڑی ہے'

سورج کی الوداعی کرنیں اب درختوں کی شاخوں پر تھیں [illegible]

کچھ لمحے [illegible]

'مجھے افسوس ہے مادام، اب میں واپس نہیں جا سکتا۔ مجھے اس سے [illegible] ہوگا۔ میں اس سے

آیا تھا کہ پوچھوں کہ مشیت کیا ہوتی ہے۔ لیکن ابھی جو باتیں آپ نے مجھ سے کیں اس کے ساتھ میرے ذہن میں

اس کا جواب آیا ہے کہ مجھے جانا ہی ہے۔ یہ اب میرا مقدر ہے۔ شاید یہ مشیت ہے۔ میرا مقدر تھا خوشی سے یا ناخوشی

سے لیکن اب میں واپس نہیں ہو سکتا' مجھے اس میں آنا ہی ہوگا

درختوں کی پھنگیوں سے الوداعی کرنیں بھی رخصت ہو گئی [illegible] کے علاوہ ذہن

میں جھینگروں کی چکی مکی بھی شامل ہو گئی تھی۔ لیکچرار کی بیوی مجھے پتھرائی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکچرار کی نگاہوں

میں شاید ہلکی سی چمک ابھری ــــ یا یہ میرا واہمہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور جانے کا

انتظار کرنے لگا۔ ☐

ڈاکٹر سابیہ اختر
لاہور، پاکستان

ایک اور بستی کی کہانی

بستی ایک پر فضا مقام پر آباد تھی، بلند پہاڑ، شفاف پانی، گنگناتے چشمے، گیت گاتے آبشار، نظر کی حد تک زمردیں میدان،

یہ صاف ستھری بستی نیک پاک لوگوں سے آباد تھی، نہ کمزور کو طاقت ور کا ڈر تھا نہ غریب کو فاقوں کا، ہر در رزق حلال پر قانع تھے دن بھر محنت کرتے اور رات کو عبادت، اس لئے مرد ہمیشہ نظریں نیچی رکھتے عورتیں باحیا اور عفت مآب۔ تجسس عشق میں ثابت قدمی تھی تو حسن میں وفا، سب بزرگوں کا احترام کرتے اور بچوں سے پیار، واعظ میں خستہ قلب نہ تھی، اساتذہ میں علم کی لگن تھی تو طلبہ میں علم کی پیاس، کشادہ پیشانیوں، روشن آنکھوں اور پر مسکراہٹ ہونٹوں والی اس بستی کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ ہوا دامن جھٹک کر ادھر سے گذرتی وہاں سے نکلتی تو نیک نیتوں کی خوشبو سے لدی ہوتی!

بستی پر پیار حکمراں تھا، وہ زندگی سے پیار کرتے زندگی بخش چیزوں سے پیار کرتے، زندگی آموز باتوں سے پیار کرتے اور سب۔ بڑھ کر حسن سے پیار کرتے اس لئے وہاں پھول کو شاخ سے ٹوٹ کر خوشبو کی قیمت ادا نہ کرنی پڑتی نہ ہر تتلی کو رنگ کے جرم میں سزائے موت ملتی، نہ کبھی اس بستی کے کسی پنچھی نے پنجرہ میں برہا کا گیت گایا اور نہ ہی گھر میں کسی سیاہ چشم حسینہ نے ــــــ وہاں چاندنی زیادہ نرم تھی، رنگ زیادہ اجلے تھے، دن زیادہ چمکیلے تھے اور دھوپ زیادہ روشن!

بستی والے مرحومین کو بہت عقیدت اور محبت سے یاد کرتے تھے۔ دن کو قبرستان پر گلستان کا گماں ہوتا تو شب کو چراغاں، قبروں کے سرہانے ٹمٹماتے رہتے دیکھ کر محسوس ہوتا گویا قبرستان نے ستاروں کا آنچل لے لیا ہو۔ وہاں خوشبوئیں جلائی جاتیں تو خوشبو کے بل کھاتے دھوئیں کے ساتھ محبت سے یاد کرنے والوں کی دعائیں بھی سوئے فلک رواں ہوتیں!

مطمئن ضمیر بستی والے رات کو سوتے تو شیریں خواب دیکھتے!

ــــــ اور پھر ایک دن!

قبرستان کی جانب سے ایک بزرگ صورت مردیوں وحشت زدہ بھاگا گویا اس نے کبھی بھوت کو ننگا دیکھ لیا ہو، چوراہے پر پہنچ کر رکا تو اس کے گرد جب ہجوم ہو گیا۔ اس نے بمشکل بے ترتیب سانسوں کا مرتب کیا اور کانپتی آواز میں رک رک کر جو بات بتائی وہ ناقابل فہم تھی اور اس لئے ناقابلِ یقین بھی!

یہ قیامت کی نشانی تھی مگر ایسی نشانی کہ بذاتِ خود قیامت، کل جس خوبرو نوجوان کو آنسوؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ سپردِ خاک کیا تھا اس کی قبر منہ پھاڑے ان کے غم کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس کا کفن غائب تھا اور یوں محسوس ہوتا گویا نعش نے اپنی برہنگی سے شرما کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لی ہوں۔

یہ حادثہ ایسا تھا جس کا ثانی لبتی کے سب سے معمر فرد کو بھی یاد نہ تھا۔ مردہ کی بے حرمتی ؟ یہ بدترین تصورات سے بھی بدتر بات تھی۔ یہ نوجوان نیک اطوار تھا اس لئے اس کی نعش کی بے حرمتی باعث عبرت بھی نہ تھی تاہم لبتی کے نیک بندوں نے اسے اپنے لئے باعث عبرت ہی جانا، کردہ گناہوں کی معافی مانگی اور ناکردہ گناہوں سے بھی استغفار کیا مگر نہیں! یہ ازغیب سامان عبرت نہ تھا، کسی پیشہ ور کفن چور کے کاروبار کا آغاز تھا بستی والوں نے اپنی روایت کے برعکس قبرستان میں چوکیدار مقرر کئے مگر کفن چور تھا کہ چھلاوہ، رات کے پچھلے پہر جب نیند کے بوجھ سے پپوٹے خود بخود بند ہو جاتے اور جب کھلتے تو کفن چور ہاتھ کی صفائی دکھا گیا ہوتا۔

چندے یہی صورت حال رہی تو بستی والوں نے تنگ آکر قبر کے سرہانے فالتو کفن رکھنا شروع کر دیا تاکہ وہ آئے مردے سے خراج وصول کرے اور چلتا بنے مگر بات نہ بن سکی، کفن چور کو کفن سے دلچسپی نہ تھی کیوں کہ اس نے قبر کے سرہانے رکھے کفن کو کبھی نہ چھیڑا اسے تو قبر کھود کر لاش پر سے کفن اتارنے میں مزا ملتا تھا۔ بستی والے عجیب طبیعت رکھتے تھے نہ کفن چور کو روک سکتے تھے اور نہ ہی موت کو ـــــ تو کیا کریں ؟ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو شاکر ہو کر بیٹھ رہے، قبرستان سے چوکیدار ہٹا لئے مردوں پر ماتم کرنا بند کر دیا۔ اب وہ قبر کو زیادہ پختہ بھی نہ بناتے تاکہ کفن چور کا نام میں خلل نہ پڑے تاکہ جلد از جلد فارغ ہو کر رخصت ہو، اگلے دن وہ قبرستان جاتے سرہانے رکھے کفن میں نعش لپیٹتے اسے دفن کرتے اور پھر دل کھول کر اپنے اور اس کے مقدر پر بین کرتے ـــــ

چندے یہی عالم لیل ونہار رہے رات کو کفن چور آتا۔ اطمینان سے اپنا کام کر جاتا اور پھر رات کو لواحقین آتے اور بے اطمینانی سے اپنا کام کرتے، جس کے نتیجے میں موت محض موت نہ رہی بلکہ کچھ اور ہی بن گئی اب مردے کو نہلانا دھلانا کفنانا سب بے معنی لگتا، موت پر ماتم میں تسکین نہ رہی تھی، یہ معلوم نہ تھا رونا مرنے پر ہو یا کفن چور کے ہاتھوں نعش کی بے حرمتی پر!

اور پھر اچانک یہ سلسلہ جس طرح پر اسرار طریقہ پر شروع ہوا تھا اسی طرح اس نے پر اسرار طریقہ پر نئی کروٹ لی جو مقابلہ میں اتنی خوفناک تھی کہ لوگوں کو کفن چور فرشتہ معلوم ہونے لگا کہ صرف کفن چراتا تھا اس نے

آج تک نعش [illegible] تھی۔

جب دوشیزہ [illegible] کے لواحقین اگلی صبح قبرستان پہنچے تو [illegible] پائے دھر اکفن بھی غائب پایا لیکن یہ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی یہ ناقابل فہم بات تھی کہ بستی کے مردے تو کبھی زندہ عورت کی بے حرمتی نہ کی تھی چہ جائیکہ لاش کی بے حرمتی! یہ قابل یقین تھا۔ غالباً قیامت بیت چکی تھی اور اب وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں دوزخ کے اس گوشے میں تھے جہاں آگ کے علاوہ بھی آلات عقوبت تھے، اس معصوم صورت اور خاموش طبع لڑکی نے کسی کا کچھ نہ بگاڑا تھا پھر یہ بے حرمتی؟ مرنے کے بعد وہ اس پامالی کی مستحق تو نہ تھی!

اس انداز کی یہ پہلی مثال تھی مگر آخری نہیں ——— عورتوں کی لاشیں [illegible] کی جاتیں جب کہ مردوں کی پشت میں ڈنڈا گاڑ دیا جاتا۔ حتیٰ کے فرشتہ صورت بچے بھی نہ بخشے جاتے اور نہ ہی احترام میں بزرگوں کو چھوڑ دیا جاتا۔

پسماندگان ساری ساری رات قبرستان میں جاگ کر گذارتے مگر نہ معلوم کیسے رات کے کسی پہر جیسے آنکھوں پر افسوں ہو جاتا، صبح جب آنکھ کھلتی تو بے گور وکفن نعش کو آنکھ بھر کے دیکھنے کی ہمت نہ پاتے چنانچہ جیسے تیسے اسے دوبارہ مٹی میں دباتے اور بوجھل قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ واپس آجاتے۔

تنگ آکر انھوں نے وہاں سے نکل بھاگنے کا بھی سوچا بلکہ کچھ تو چلے بھی گئے مگر باپ دادا کی ہڈیاں چھوڑ کر جانا بھی تو آسان نہ تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ مردوں کی اس بے حرمتی کے علاوہ زندوں کے معمولات میں کچھ فرق نہ آنے پایا تھا انھیں یوں محسوس ہوتا کہ گذشتہ قوموں کی مانند انھیں بھی نافرمانیوں کی بنا پر مبتلائے عذاب کیا گیا ہے۔ اگرچہ صبر وشکر کے علاوہ چارہ نہ تھا لیکن کبھی کبھی سوچتے کیا یہ عذاب گناہوں کے مقابلہ میں زیادہ نہیں؟

ادھر موت کی بے حرمتی نے زندگی سے مزا بھی چھین لیا ——— یہ ایک اور طرح کا عذاب تھا! لیکن انسانی فطرت کے بموجب آہستہ آہستہ وہ اس نئے عذاب کے بھی عادی ہوتے گئے جس کے نتیجہ میں موت کے برحق ہونے کی مانند انھوں نے نعش کی بے حرمتی کو بھی اٹل تسلیم کر لیا چنانچہ اب وہ قبر کھود کر اس کے سرہانے بلا کفن نعش لٹا دیتے اگلی صبح کفن لے کر جاتے آنکھیں چراتے اور نعش کو کم سے کم دیکھتے ہوئے اسے کفن میں لپیٹ لپاٹ قبر میں ڈالنے کی کوشش کرتے۔ بے حرمتی کے بعد مردہ کی بخشش کے لئے دعا مانگنے کو بھی جی نہیں چاہتا بس وہاں ——— بھاگنے کی کوشش کرتے۔

چند سے [illegible] لیل ونہار [illegible] تو انھیں یوں محسوس ہونے لگا گویا یہ سب کچھ ہمیشہ اسی طرح ہوتا آیا ہے [illegible] جلتے دیئے سے تیل کی بوند تک کبھی کم نہ ہوتی تھی [illegible] کہانی سنائی جا رہی ہو بلکہ بعض اوقات تو خود

سنانے والے کو بھی اپنی یادداشت پر یقین نہ آتا اور یوں محسوس ہوتا گویا کسی اور بستی کی کہانی سنا رہا ہو۔

اب تک جو کچھ ہوا وہ رات کی سیاہی میں ہوتا تھا مگر دن محفوظ اور امن و سکون کے تھے وہ جو کوئی بھی بلا تھی اسے صرف نعشوں سے دلچسپی تھی اس نے زندوں کو کبھی نہ چھیڑا تھا اور پھر ایک دن —— ہاں ہاں چمکیلی دھوپ میں وحشت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ فضا کے دو غیر مرئی ہاتھوں نے بڑھ کر ایک بزرگ کو دبوچ لیا —— وہ ایک بے ضرر بوڑھا تھا، دن بھر گھر کی دہلیز پر بیٹھا خوبصورت ماضی کی کہانیاں سناتا یا پھر پوتے سے کھیلتا رہتا سبھی اس کی عزت کرتے اور وہ سب سے شفقت کا سلوک کرتا، اس روز بھی وہ معمول کے مطابق خوشگوار دھوپ میں بیٹھا تھا کہ اچانک جیسے کسی نے اسے اچک لیا کسی کو کچھ نظر نہ آرہا تھا بس اسے کشاں کشاں کھینچا جا رہا تھا اور وہ بُری طرح سے چیختا چلاتا جا رہا تھا یہ عجیب دہشت ناک منظر تھا کوئی نادیدہ قوت اسے گھسیٹے لئے جا رہی تھی اس کی چیخوں سے سننے والوں کے دل دہلے جاتے تھے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے سانسیں رک رہی تھیں مگر وہ کچھ کر نہ سکتے تھے جیسے پتھر کے بن گئے تھے اور وہ ان سب کے سامنے چیختا فضا میں تحلیل ہو گیا۔

اس رات کوئی بھی نہ سو سکا!

صبح ہر شخص کے سر پر اس کا اثاثہ تھا اور سب کا رخ بستی سے باہر جانے والے راستہ کی جانب تھا اب بستی میں رہنا ناممکن تھا کہ عافیت فرار میں تھی وہ سب سر جھکائے بوجھل قدموں سے یوں چلے جا رہے تھے جیسے میت کندھے پر رکھی ہو۔ بستی کی حد پر پہنچ کر انھوں نے پیچھے پلٹ کر اپنے گھروں کو دیکھا جن کی چمنیوں سے اب کبھی دھواں نہ اٹھے گا۔ مگر بستی کی حد سے باہر نکلنے لگے تو غیر مرئی ہاتھوں نے انھیں پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا انھوں نے بہت زور لگایا مگر وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے خوف نے زبانیں جکڑ لیں۔ دہشت نے قدم تھام لئے مساموں نے ٹھنڈا پسینہ نکالنا شروع کر دیا۔ آنکھوں کی پھیلتی پتلیاں نظر نہ آنے والے ہاتھوں کو دیکھنا چاہتی تھیں مگر دیکھنے کی تاب بھی نہ تھی۔ وہ تھک ہار کر واپس مڑتے ہیں!

ہوا کے جھکڑ چمنیوں سے دھواں اچھال رہے تھے۔ تب تیز ہوا سے گھروں کے کھلتے بند ہوتے دروازے ان کا یوں استقبال کرتے ہیں کہ گھر کے کسی دروازے نے بھی اپنے مکیں کا یوں استقبال نہ کیا ہوگا۔ □

آمنہ ابوالحسن
۳۷ پٹودی ہاؤس، نئی دہلی ۱

پہچان

بھاگتے بھاگتے وہ تھک گیا۔ سلگتا دہکتا ہوا منظر لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔ ابل رہا تھا اور چیخ و پکار اس کے کان چھیدے ڈال رہی تھی۔ اس منظر اور آہ و بکا کو خود سے دور کرنے وہ کسی ایسے مقام پہ پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں سکوت کے سوا کچھ نہ ہو لہذا جب تک قدموں نے ساتھ دیا وہ نہیں رکا مگر آخر کار گرا اور بے سدھ ہو گیا۔

مہربان زمین نے اپنی آغوش پھیلا دی۔

تازہ ہوا نے شفقت سے اسے تھپکا اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ جب جاگا تو اندھیرے کی چادر خوب تنی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر اتھاہ سناٹے کے سوا نہ کوئی آواز تھی نہ متنفس ——— جلتی ہوئی آنکھیں اور بس اپنا مجروح احساس ———

کتنی خوفناک آگ تھی جو لذیز غذا کی طرح آدمیوں اور چیزوں کو بھون بھون کر نگل رہی تھی۔ بھر بھر بالٹیاں پانی کی انڈیلی جا رہی تھیں مگر شعلوں کی زبانیں جانے کون ساز ہر چاٹ چاٹ کر ماند ہونے مرنے کی بجائے بڑھتی لپکتی ہر شے کو ختم کئے دے رہی تھیں۔ وہ تو بچ گیا شاید کچھ اور لوگ بھی بچ گئے ہوں مگر بے حساب خاک ہو گئے۔ جب تک ہمت سلامت رہی وہ بھی دوسروں کے ساتھ مل مل کر زندگیوں کو بچاتا رہا مگر جب آگ بجھانے والا عملہ آگیا تو نیم جان نڈھال ناتواں سا قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا اور اب جانے کہاں پہنچا ہوا تھا ——— ارد گرد کو پہچاننے کی نہ ہمت تھی نہ سکت بس ایک ہی منظر تھا جو نظر کے آگے جم سا گیا تھا۔ ہٹ نہیں رہا تھا اور نالہ و شیون کی آوازیں جو آسمان تک رسائی پانے کو بے قرار تھیں۔ اس نے آنکھیں اور سختی سے بند کر لیں۔ جانے کب تک یونہی پڑا رہتا کہ بھیڑوں کے ممیانے کی آواز نے سکوت کو توڑا اور کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔ آنکھوں کی جھری سے ایک انسان کو دیکھ کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سیاہی مائل رنگت کا ایک تندرست نوجوان تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا جود کو سمیٹ کر سنبھال کر بمشکل وہ بولا۔ ———

"بہت بھوک لگی ہے کچھ کھلاؤ ———"

چرواہا چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر مخصوص انداز میں سیٹی بجائی ——— یہ سیٹی

دور دور تک گھوم کر جوں ہی ختم ہوئی کہیں دور پرے سے ایک اور ایسی ہی سیٹی ابھری اور ارد گرد کا طواف کرتی ٹیلے سے ٹکرا کر لوٹ گئی۔ وہ اپنی جگہ پڑا احمقوں کی طرح پلکیں جھپکاتا رہا۔ چرواہا ٹیلے سے اتر کر پھر اس کے پاس آگیا کچھ ہی دیر بعد ایک نقطہ چھوٹے سے بڑا ہوتا ہوتا بالکل ان کے آگے آکر مجسم ہو گیا ــــ عین روشنی میں شام کی شبیہہ اس کے سامنے ٹھہری ہوئی تھی۔ سانولی سانولی۔ گھبیر جیسے کسی نے وارفتگی اور ٹھہراؤ کو خوب گوندھ کر ایک شکل دے دی ہو۔ سادہ لوحی جس سے یوں ظاہر ہو رہی تھی جیسے پکے ہوئے پھل سے ٹپکتا رس ــــ

وہ بھونچکا سا اسے تکتا رہ گیا۔

چرواہے نے اپنے لب و لہجے میں آنے والی سے کہا۔

"دوڑ کر دودھ لے آؤ۔ یہ اٹھ کر چلنے کے قابل نہیں ــــ"

یہ سن کر لڑکی جس طرح آئی تھی اسی طرح لوٹ گئی اور جلد ہی کانسی کا ایک لوٹا لے کر پلٹی جو دودھ سے لبالب لبریز تھا ــــ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے لوٹا لیا اور بے دریغ ہونٹوں سے لگا لیا۔ جب تک پورا دودھ اس کے پیٹ میں نہیں پہنچ گیا وہ لوٹے کے کنارے سے اپنے ہونٹ چپکائے رہا پھر جب آخری بوند بھی ختم ہو گئی تو لوٹا نیچے دھر کر ایک طویل سانس لی اور اپنی بھوک اور ندیدے پن پر خود ہی شرمندہ ہو گیا تب قریبی پتھر پر ٹکے ہوئے چرواہے نے پوچھا۔

"کیا تم زخمی ہو ــــ؟ بیمار ــــ؟ یا کوئی تمھاری گھات میں ہے ــــ؟" اور یہ پوچھتے ہوئے نیزے پر اس کی گرفت غیر ارادی طور پر مضبوط ہو گئی۔

"نہیں ــــ" وہ آہستہ سے بولا ــــ "پہلے یہ بتاؤ میں کہاں ہوں ــــ؟"

"تم بستی سے دور ترائی میں ہو ــــ اس قابل نہیں کہ لوٹ سکو۔ ابھی آرام کرو جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ تب چلے جانا ــــ"

وہ پھر لڑکی سے مخاطب ہوا ــــ

"میں ریوڑ کو لے کر آگے جا رہا ہوں تم اسے ساتھ لے جاؤ ــــ"

تعمیل حکم میں لڑکی نے زبان کی بجائے آنکھوں سے کہا۔ آؤ میرے ساتھ اور وہ ہر ہر طرح کی خود اختیاری بھول کر آہستہ آہستہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دیر چل کر وہ ایک جھونپڑی کے آگے رکے۔ لڑکی نے اس کے لئے چٹائی لا کر بچھا دی اور خود پرے بیٹھ کر ادھوری والی چٹائی بننے لگی۔

پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ لڑکی کا سراپا جتنا نازک اور لچکیلا ہے اس کے ہاتھ پاؤں اتنے ہی بھدے ــــ چٹائی پر ٹک کر وہ چند لمحے اس غیر موزونیت کے بارے میں سوچا کیا پھر بے اختیار ایک سوال اس

کی زبان سے ادا ہو گیا ——

"وہ کون ہے جس نے ہمیں یہاں بھیجا ——؟"

"میرا بھائی ——"

"اور تمہارا ماں باپ ——؟"

"بستی میں سامان بیچنے گئے ہوئے ہیں —— میری بنی ہوئی چٹائیاں اور بھیڑوں کے دودھ سے بنا ہوا مکھن اور پنیر ——"

"مگر کیا یہ عجیب اور بے تکا نہیں لگتا کہ اکیلی لڑکی کے ساتھ ایک اجنبی کو بھیج دیا جائے ——؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا —— ہم مہمانوں کی عزت کرتے ہیں اور اپنی حفاظت کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔ جب ہمیں درندوں سے محفوظ رہنا آتا ہے تو انسان پھر آخر انسان ہے ——"

اس جواب کی خود اعتمادی نے اسے لاجواب کر دیا —— انتہائی تھکن میں پیٹ بھرنے کے احساس نے اس پر سرشاری طاری کر دی۔ وہ چٹائی پر لڑھکا اور اطمینان کی اس دنیا میں پہنچ گیا جہاں کبھی کبھی خوابوں کی بھی مجال نہیں ہوتی کہ اپنا رنگ جمائیں ——

دن ڈھلا —— شام آنے لگی —— شام کے ساتھ بھیڑیں اپنے ٹھکانے کو واپس پلٹیں۔ ——

چرواہے نے انھیں باڑے میں دھکیل کر جب کانٹے دار دروازہ بند کیا تب بہن سے پوچھا ——

"کیا یہ سارا دن سوتا رہا ——؟"

بہن مسکرائی ... "بس سوتا رہتا" اس نے دودھ پیا اس کا تقاضہ یہی ہے کہ دودھ ضرور نشہ بن جائے۔

تبھی چرواہے کے ماں باپ بھی لوٹے۔ چرواہے نے مختصراً اجنبی کی بابت انھیں بتایا۔ اگرچہ کہ بڈھا بڈھی نے تہذیب و تمدن کو نہیں دیکھا تھا مگر اچھے برے کی پرکھ رکھتے تھے۔

جب چرواہے نے اجنبی کو جگا کر اسے ماں باپ سے ملایا تو دونوں نے نہایت مسرت سے اس کا سواگت کیا اور اپنے ساتھ بٹھا کر پیاز، پنیر اور روٹی کھلائی۔ پھر تھکا ہوا چرواہا اور اس کا باپ فوراً چٹائی پر پسر گئے۔ ماں لڑکی کے ساتھ جھونپڑی میں چلی گئی ——

وہ اپنی چٹائی پر بیٹھا بڑی بے دردی سے آنکھیں مل مل کے سوچنے لگا —— کہیں یہ سب خواب تو نہیں —— خوف سے نجات کا ایک سہانا پس منظر ——؟؟

دن غائب تھا۔ اندھیرا سارے میں اُمڈ آیا تھا —— اس کا دل شدت سے دھڑکا —— کہیں اب

اندھیرا ہی تو اس کا مقدر نہیں ۔۔۔۔ ؟ مگر تاروں سے چھنتی ہلکی ہلکی چمک تک میں سویا ہوا چمپا ذرا مضبوط سہارے کی طرح علانیہ نظر آ رہا تھا ۔۔۔۔ اس نے خود کو یقین دلایا یہ کوئی پس منظر نہیں حقیقت ہے ۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا بڑی عجیب جگہ جس کے کچھ حصوں میں اس وقت رونقیں اپنے عروج پر ہوں گی مگر اس حصۂ زمین پر کیسی گہری اٹوٹ خاموشی ۔۔۔۔ ؟؟ دم بہ دم گاڑھی ہوتی ہوئی تاریکی ۔۔۔۔ اور آگ تاریکی ہی میں تو بھڑکی تھی ۔۔۔۔

تاریکی نے پھر اس کے احساس میں پنجے گاڑ دیئے ۔۔۔ تاریکی اس دشمن کی طرح لگی جو مسلسل اس کا تعاقب کئے جا رہا ہو ۔۔۔۔

بے اختیار اس کا جی چاہا کوئی اتنی زور سے ہنسے کہ اجالا اس ہنسی سے فوارے کی طرح ابل کر تاریکی کو چھید دے اور اس کے زخمی وجود سے رس رس کر لہو زمین میں ملے تو پھولوں کی طرح اگے اور پھر تمام پھول مل کر ایک قالب میں ڈھل جائیں اور یہ قالب اس کی محرومیوں ۔۔۔ مایوسیوں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر کے اسے زندگی کا ایک نیا ذائقہ نئی لذت دے ۔۔۔ نیا طور ۔۔۔ نئی جہت ۔۔۔

گھسی پٹی فارمولا زندگی نے اسے کتنا اکتا دیا ہے ۔ صبح سے شام تک ایک جیسا کام کرو ۔ شام پڑے نڈھال ہو کر پیٹ کا دوزخ بھرو اور پھر وقت کو آنو آنو خرچ کرو ۔ ۔ اب تو وہ مقام بھی نہ رہا جہاں رات گذار کر وہ خود کو تشفی دے سکتا تھا کہ اس کا بھی ایک ٹھکانہ ہے ......

اسی درد میں گھلتے گھلتے اس کے پپوٹے پھر جھک گئے اور اس وقت کھلے جب کوئی چیز اچانک اس کے [illegible] گھبرا کر ہاتھ کے تیز ارادے سے جھٹکے سے اس نے [illegible] اچھال دیا پھر اپنے [illegible] سوکھی گھاس کے چند تنکے [illegible] حیرت کہ اس پر آ پڑے تھے بازو پڑے تھے ۔ [illegible] ہاتھ بڑھا کر اس نے تنکے سمیٹے اور انھیں ہتھیلی پہ پھیلا لئے ۔۔۔

تو گویا گھونسلے بنانے کا موسم آ گیا ۔۔۔ ؟

اس نے سر اٹھا کر پیڑ کو بغور دیکھا جہاں بے فکر پرندے آزادی کے نغمے الاپ رہے تھے ۔ وہ تنکوں کی مدد [illegible] رہے تھے ۔ خوب چہچہا کر وہ اپنے پنکھ پھڑپھڑاتے اور دور تک اڑتے چلے جاتے ۔۔۔ فضا میں تیراکی کا یہ [illegible] اسے اچھا لگا ۔۔۔ جب گھر بن جائیں گے تو یہ پرندے انڈے دیں گے اور پھر اونچی پروازوں میں ہمہ تن منہمک ہو جائیں گے ۔۔۔

اس خیال نے اس میں یکلخت پھرتی بھر دی ۔۔۔ لپک کر وہ اٹھا اور نرم نرم صبح صبح کو اپنے پورے وجود میں میٹھے گھونٹ کی طرح بھر کر یکلخت مسکرایا ۔۔۔

[illegible] دھوپ کی زعفرانی آبشار تلے

سونے کی طرح لو دیتی اپنی مصروفیت میں مگن تھی۔ چپکے سے قریب پہنچ کر وہ بولا ——

"تم ہر وقت کام ہی کیوں کرتی رہتی ہو —— ؟"

"مجھے بیکاری پسند نہیں ——"

"تم نے کبھی پرندوں کو دیکھا ہے —— ؟"

"نہیں ——"

"کیوں —— ؟"

"انھیں دیکھنے سے کیا ملے گا ——"

"اچھا اگر تمھیں بہت سا پیسہ مل جائے تو —— تو کیا کروگی —— ؟"

لحظہ بھر کو ہاتھ روک کر لڑکی نے اسے دیکھا ——

"کیا تمھارے پاس بہت پیسہ ہے —— ؟"

اس سوال نے اسے سٹپٹا دیا۔ وہ کیا جواب دے ——

کہہ دے ہاں یا نہیں —— ؟ اور تذبذب کو اس کے چہرے پر دیکھ کر لڑکی زیرِ لب مسکرائی ——

"ہمیں پیسہ نہیں چاہئے —— ہم محنت کرتے —— پیٹ بھر کھاتے —— بے فکری سے سوتے ہیں —— ہاں کبھی کبھی فضائی طوفان ضرور ہمیں پریشان پراگندہ کر دیتے ہیں ورنہ زندگی آرام سے کٹتی ہے۔ چلو اب دانت صاف کرو اور ناشتہ کر لو —— بھائی تمھاری راہ دیکھ رہا ہوگا ——"

وہ وہاں سے ہٹ کر مٹکے تک پہنچا اور پانی لے کر دانت صاف کرنے لگا —— جب اس نے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارے تو ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ مٹکے کا سارا پانی لڑکی پر انڈیل کر دیکھے اپنے دل آویز پیچ و خم کے ساتھ وہ کیسی لگتی ہے مگر اگلے ہی لمحے سارے جنگل نے اس کے اندر گونج کر کہا —— خبردار —— یہ یہاں کی ریت نہیں —— یہاں کے باسی معصوم اور بے غرض ہوتے ہیں مگر عیاری کے لئے ان کے نیزے بہت نشانہ باز اور چاقو بہت دھاردار —— اور پھر کیا اعتماد کوئی چیز نہیں —— ؟

بے حد ندامت سے اس نے منہ میں بھرا ہوا پانی اگل دیا اور بغیر کچھ کھائے ہی دوڑ پڑا —— لڑکی حیرانی سے دیکھتی رہ گئی مگر اس نے پلٹ کر ایک بار بھی پیچھے نہیں دیکھا —— سیدھا چرواہے کے پاس پہنچ کر بڑی متانت سے بولا ——

"میں جا رہا ہوں —— اللہ حافظ ——"

چرواہے نے ایک دم کمر میں اڑسا ہوا چاقو نکال کر کھولا ——

"تم بھاگ کیوں رہے ہو ـــ اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو ـــ ؟"

ایک لمحے کے لیے چاقو کی چمکتی دھار نے اس پر کپکپی طاری کر دی مگر اگلے ہی لمحے اس نے بے خوفی سے دھار کے آس پاس انگلی پھیر کر پوچھا ـــ

"کیا اسے روز سان پر چڑھاتے ہو ـــ ؟"

چرواہے نے اس کی صاف آواز سنی ـــ شفاف آنکھوں کو دیکھا ـــ بے خوفی محسوس کیا تو چاقو بند کر کے دوبارہ کمر میں کھونستے ہوئے مسکرایا ـــ

"ہاں ـــ ہم اپنے ہتھیاروں کو کند نہیں ہونے دیتے ـــ

یہی تو ہمارے محافظ ہیں ـــ نیزے اور چاقو ـــ

درندے ہوں کہ لٹیرے ـــ ان کے وار سے کوئی نہیں بچ سکتا ـــ

اچھا تم ایسا کرو کوئی سا جنگلی پھل توڑ لاؤ ـــ چھوٹے سے پھوٹا اور اسے جتنی تیزی سے اچھال سکتے ہو اچھالو اگر میرا نشانہ خطا کر جائے تو بے شک میرے ہتھیار کو مجھی پر آزما لینا ـــ"

"خوب" ـــ وہ مسکرایا۔ "مطلب یہ کہ بھاگتے ہوئے کو بھی گرا سکتے ہو ـــ ؟"

"ہاں ـــ"

"تبھی اتنے نڈر ہو تم لوگ ـــ"

"لیکن تم اس قدر جلد کیوں جا رہے ہو ـــ کچھ روز اور رہ لیتے ـــ"

نہیں اب مجھے جانا چاہیئے ـــ اس نے سوچا۔ آگ کتنی بھی شدید سہی۔ آہ و بکا کتنی بھی المناک مگر جینے کی تمنا کیا ان سب سے زیادہ خطرناک نہیں ـــ ؟

تب اس نے اچھل کر ایک بے پرواہ تتلی پکڑی پھر اسے آزاد کرتے ہوئے بولا ـــ

"پھر کبھی ملاقات ہو نہ ہو تم بھلا نہ جاؤ گے ـــ"

"تم بھی ـــ" چرواہے نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

"جاؤ آسمان تمہاری مدد کرے ـــ"

مگر اس نے سر اٹھا کر آسمان کو نہیں دیکھا بلکہ دنیا کے زخموں کو خود میں بسائے اجنبی انجان کھائی میں اتر گیا ـــ

زندگی کو از سرِ نو جینے کے لئے .... □

عبد الصمد

وراثت

اب کے جو رات آئی تو بہ انداز دگر آئی کہ اس نے میری ساری کہانیوں کو چرا لیا اور صبح کو میرے ہاتھوں میں بسورتے ہوئے صرف چند کاغذ کے سفید پرزے رہ گئے۔

میں صبح سے منہ چھپانے لگا کہ اب میرے پاس اس کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا اور میرے ہاتھوں میں جو سفید پرزے تھے ان میں چہرہ کبھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

صبح کو شاید میرے خالی پن کا احساس ہو گیا کہ اس نے میرے اندر جھانک کر مجھے مزید رسوا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سورج کی گود میں سمٹ سمٹا کر آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ پوری طرح سورج کی چال میں آ گیا اور سورج اسے بہکا کر دور کہیں سناٹے میں لے جا کر گم ہو گیا۔

[illegible] پاس [illegible] کا [illegible] میں نے اسے تھپک تھپک کر تسلی دی کہ میرا قصور کیا تھا، وہ تو رات [illegible] اس [illegible] کہ میرے پاس دھرا رہ گیا تھا——

[illegible] آئے گی۔

اس [illegible] کوئی بات نہیں اگر میں مفلس ہو گیا کاغذ کے سفید پرزے تو میرے پاس ہیں [illegible] —— چنانچہ میں نے پھر کاغذ پر کہانیاں بننی شروع کر دیں۔

جب اتنی کہانیاں تیار ہو گئیں کہ میرے دل کو چھونے لگیں تب میں نے احتیاط کے طور پر تمام کہانیوں کو گھر کے کونے کونے میں پھیلا دیا کہ رات اگر پھر بدنیت بھی ہوئی تب بھی کچھ کہانیاں تو بچ جائیں گی جن کے سہارے صبح کا سامنا کیا جا سکے گا۔

لیکن صبح کو میرے دونوں ہاتھ پھر خالی تھے اور صبح اپنے اجلے پن کو سمیٹے، مجھ پر طنزیہ انداز میں مسکراتی ہوئی دور ہٹتی جا رہی تھی۔

میرے لئے لمحۂ فکریہ تھا کہ سورج کی ایک پوری چال میں، میں دو بار مفلس ہوا تھا اور اگلی چال کے بارے میں دل خوش کن توقعات رکھنا عقلمندی کی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے

احتیاطی تدابیر سوچنی شروع کر دی لیکن کوئی تدبیر بھی ذہن و دل کے صحرا میں پھول نہ کھلا سکی۔ میں نے بیوی سے مشورہ کیا کہ بات جب ذات کی حدوں سے نکلنے لگتی تھی تب پھیل کر اسی کی ذات میں داخل ہوتی تھی اور پھر وہاں سے پھیلنے یا سمٹنے کا عمل شروع ہوتا تھا۔

بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رات کو تم پر نیند کا غلبہ بھی بہت گہرا ہوتا ہے۔"

یہ اس کی پرانی شکایت تھی۔ میں نے اسے دھیان دلایا کہ یہ وقت پرانی شکایتوں کا نہیں تدابیر سوچنے کا ہے۔ اس پہ اس نے جواب دیا کہ سوچنے کا کام تو تم لوگوں کا ہے، ہم لوگ تو صرف کرنا جانتے ہیں ——— میں خوشی سے اچھل پڑا اور سوچ کی تمام بوجھل تہیں اپنے دماغ سے کھرچ ڈالیں کہ ایک واضح اور مضبوط سہرا میری بیوی کے ہاتھوں میں تھا۔

میری عادت ہے کہ زیادہ کرید میں نہیں پڑتا، چنانچہ سب باتیں بھلا کر میں صرف کہانیاں بننے میں مصروف ہو گیا کہ سفید کاغذ پر اب تک میری ملکیت برقرار تھی۔

جب شام کے حسن پر رات کی سیاہی منڈلانے لگی تب میں ہوشیار ہو گیا اور ان تمام کہانیوں کو سمیٹ کر اور چھپا کر بیوی کے پاس گیا کہ اب جو کچھ بھی کرنا تھا، اسی کو کرنا تھا۔ بیوی نے کہانیوں کی ایک پوٹلی بنائی۔ پوٹلی کو اپنے زیوروں کے صندوقچے میں بند کیا۔ اس پر دوہرا تار لگایا اور اطمینان کی نیند سو گئی، نیند تو مجھے بھی آ گئی کیوں کہ میری یہ کمزوری ہمیشہ سے رہی ہے کہ میں کسی بھی واقعے کا گواہ نہیں ہوں۔

صبح کے چہرے پر اجنبیت کے میک اپ کو دیکھ کر میں پھر دہل گیا اور بیوی سے فوراً صندوقچہ کھولنے کو کہا ———

وہی ہوا، جواب تک ہوتا آیا تھا۔

بیوی کے تمام زیورجوں کا توں رکھے تھے اور سفید سادے کاغذ اس طرح اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہے تھے کہ ان میں بہرو بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا ——— صبح پھر میری دسترس سے باہر جا رہی تھی، میرے کھوکھلے پن پر آنسو بہانے کو صرف میری بیوی رہ گئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے لئے ہی آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، رونے سے کیا فائدہ، اب یا تو تقدیر کے سہارے بیٹھ رہنا ہے یا پھر تدبیر کی مختلف نہریں کھودنی ہیں ———

بیوی کو سب سے بڑا غم یہ تھا کہ اس کی سب سے محفوظ جگہ، غیر محفوظ ہو گئی تھی ——— اب

کوئی دن تو اس کا زیور بھی غائب ہو سکتا ہے، کپڑے بیسے بھی غائب ہو سکتے ہیں ــــ کوئی دن کو....
میں نے اسے بتایا کہ اتنی معمولی چوریوں کے لئے اتنی منصوبہ بندی نہیں ہوتی ــــ یہ تو ڈاکے ہیں دن دھاڑے ڈاکے ــــ لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، مجھے اس بات کی خبر تھی کہ میری کہانیوں کے غائب ہونے سے وہ اسی حد تک مغموم ہوتی تھی جس حد تک اسے اس کا احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے شوہر کو محبوب تھیں، اور شوہر کے غم میں برابر کا شریک ہونے کے لئے اس کا آنسو بہانا ضروری تھا ورنہ حقیقت یہ بھی کہ اگر اس کے زیور غائب ہو جاتے تو میرے پاس اسے دلاسا دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا ــــ جو کچھ بھی میرے پاس تھا، اس پر نظر لگ چکی تھی اور مفلسی اور قلاشی کا احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا ــــ

جب دل مر گیا تو میں نے اپنے بکھرے ہوئے احساسات کو جمع کر کے انہیں خود فریبی کا نہایت میٹھا رس پلایا تو اس بات سے طمانیت محسوس ہوئی کہ ابھی میری انگلیاں اتنی مضبوط تھیں جن سے میں قلم پکڑ سکتا تھا، آنکھوں میں اتنی بصارت تھی جن سے میں دیکھ سکتا تھا، بیدار شعور تھا جس سے کام لے سکتا تھا اور بازاروں میں کاغذات کی کمی نہیں تھی ــــ

غم تھا تو صرف اس بات کا کہ جو کہانیاں، رات اپنی سیاہی میں چھپائے گئی تھی، وہ کہانیاں اب میرے پاس نہیں تھیں۔ ان کا تانا بانا بکھر چکا تھا اور اب جو کچھ بھی امید تھی وہ مستقبل سے وابستہ تھی۔ مجھے مستقبل کے اس راز کی خبر تھی کہ اس کے دامن میں ان گنت کہانیاں چھپی ہوئی ہیں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ مستقبل ان کے سلسلے میں فراخ دل واقع نہیں ہوا تھا اس لئے میں نے اس سے پہلے ہی سمجھوتہ کر رکھا تھا۔

میں یہ سوچ سوچ کر لرز جاتا کہ اگر مستقبل نے میری طرف سے آنکھیں پھیر لیں تو ــــ

اس لئے میں نے اپنی مفلسی اور قلاشی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔ اب تک اس راز سے میں اور میری بیوی کے علاوہ رات اور سورج ہی باخبر تھے اور صبح تو دور ہی دور سے مسکراتی ہی رہتی تھی۔

اب کے میں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی، راز داری کا خاص خیال رکھا، بیوی کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی، خود کلامی سے بھی محفوظ رہا کہ دیواروں کو بھی کان ہوتے ہیں اور اندر ہی اندر سارا پروگرام مرتب کر کے بس کہانیاں بننے میں مصروف رہا، جب کہانیاں اتنی ہو گئیں کہ اس کے بعد میں اپنے پروگرام پر عمل کر سکتا تھا تو میں نے ان کہانیوں کو ــــ گھر کی دیواروں میں چن دیا اور اس پوری کارروائی میں اتنی احتیاط برتی کہ شاید دیواروں کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی ہوگی کہ راز داری کے اس مرحلے میں وہ خود کس حد تک شریک ہیں۔

مجھے یقین تھا کہ اب کے میں نے اتنا منظم اور محتاط رویہ اختیار کیا ہے کہ رات کی سیاہی سر ٹپک کے بھی رہ جائے گی تب بھی اسے کوئی چھانی نہیں دینے والا ۔ اس رات بڑی مدت کے بعد ایسی نیند سویا جس میں خواب ہی خواب تھے۔

لیکن صبح میں سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ سورج میری بےبسی اور مفلسی پر قہقہے لگا رہا تھا اور اس کی گود میں سمٹی تمتمائی صبح کے ہونٹوں پر ایسی طنز آمیز مسکراہٹ تھی جس سے کلیجے میں تیر لگنے لگتا ہے۔

احساس محرومی مجھے رہ رہ کے ڈنک مارنے لگا تو مجھے ایسا لگنے لگا جیسے اب میں کچھ نہیں کر سکوں گا میرے ترکش کے سارے تیر ضائع ہو چکے ہیں اور میں خالی ہو چکا ہوں ـــــ لیکن جب بارے دھند چھٹی اور ہوش و حواس اپنی اپنی جگہ پر واپس آئے، تو میں نے پھر دیکھا کہ قلم پکڑنے والی میری انگلیاں سلامت ہیں، دیکھنے والی آنکھیں موجود ہیں، بیدار ہونے والا شعور جاگ رہا ہے اور وہ بازار ابھی تک بند نہیں ہوئے جہاں کا غذات کی کمی نہیں تھی۔ ان سے میں نے جانا کہ میں زندہ ہوں اور زندہ رہ سکتا ہوں کہ اس کے باوجود کہ صبح میری دسترس سے باہر تھی، مجھے حسین دکھائی دے رہی تھی، اور باوجود اس کے کہ میں خود فریبی کے کرب سے اچھی طرح آشنا تھا، مجھے اس حسین صبح کا انتظار تھا جو رات کی سیاہی اور سورج کی تمازت میں پڑ کر اپنے حسن کو برباد کر رہی تھی۔ انھوں نے اسے خوشنما فریبوں میں مبتلا کیا تھا اور میرے اندر یہ خواہش شدت سے موجود تھی کہ اگر ایک بار وہ مجھے مل جائے تو میں اسے ساری باتیں سمجھاؤں اونچ نیچ اور اسے کسی طرح یہ باور کرانے کی کوشش کروں کہ ابھی میں اتنا قلاش نہیں ہوا ہوں جتنا اسے نظر آتا ہے ـــــ میں تو خود فریب اور دھوکہ کا شکار ہو رہا ہوں اور یہ کہ میں بے قصور ہوں، بےبس ہوں۔

لیکن وہ تو مجھے مفلس اور قلاش جان کر اس طرح بھاگتی تھی کہ اس وقت مجھے اسے پکارنے کی صلاحیت بھی نہیں رہ جاتی تھی اور چمکیلے سورج کی چرب زبانی اسے کچھ سوچنے کی مہلت نہیں دیتی تھی۔

مسلسل یقین اور بیدار شعور نے میرے اندر تدبیریں اختیار کرنے کی صلاحیت کو محفوظ ہی نہیں، زندہ رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے تخلیقی قوت کبھی امنگ پاتی تھی جس کے تحت میں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس سے زیادہ محفوظ اور محتاط رویہ میرے نزدیک کوئی دوسرا نہیں تھا کہ اس میں، میں نے خود کو ماخوذ کر دیا تھا۔ اس سے قبل جو تدبیریں میں نے اختیار کی تھیں، وہ دور رہ کر کی تھیں اور اگرچہ میں نے ہی انھیں بھگتا تھا لیکن میں ان میں ماخوذ نہیں تھا۔ چنانچہ اب کے جو میں نے کہانیاں بنیں ان میں خود کو کردار بنا ڈالا ـــــ کہانیوں کے ہاتھ پاؤں میرے اپنے ہاتھ پاؤں تھے، آنکھیں ـــــ

میری آنکھیں ـــــ کان، ناک اور جسم کے دوسرے اعضا، میرے اعضا تھے اور ان میں جو شعور کارفرما تھا وہ میرا اپنا تھا جسے میں نے بقدر ظرف اپنی ذہانت کی آبیاری سے جلادی تھی اور جسے بچا بچا کر اب تک محفوظ رکھتا آیا تھا۔

میں اس سے واقف تھا کہ میں نے ایک بڑا فیصلہ کیا تھا اور اس پر فوراً عمل پیرا بھی ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی اطلاع اپنے سوا کسی کو کبھی نہیں دی تھی ـــــ بیوی کو بھی نہیں، کہ اس کی وابستگی میری اس ذات سے تھی جسے میں نے داؤ پر لگا ڈالا تھا اور میں اسے ایک اندوہ ناک صدمے سے دو چار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود کو بچانے کے لئے اپنی ذات کو داؤ پر لگادوں، آخر میں کب تک خود کو مفلس اور قلاش رکھ سکتا تھا۔ میرے لئے ایک بڑا قطعی فیصلہ نہایت ضروری تھا، اس لئے میں تو اپنے قدم سے مطمئن تھا۔

دوسری صبح میرے ہاتھ پاؤں، اب میرے ہاتھ پاؤں نہیں رہے تھے، میرے سارے اعضا میرے لئے اجنبی بن چکے تھے اور میں بظاہر ایسا مفلس و قلاش بن چکا تھا جس کے پاس اب کچھ بھی باقی نہ رہا تھا ـــــ کہانیوں پر قبل ہی گہن لگ چکا تھا اور اب تو میں خود بھی کچھ نہیں رہا تھا ـــــ لیکن میرے اندر کوئی پچھتاوا نہیں تھا کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ آخر ایک دن یہ ہونا ہی ہے ـــــ میرے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضا اسی وقت تک میرے اپنے تھے جب تک کہ میرا ان پر اختیار تھا لیکن ان چیزوں کی مدد سے جو میں نے اپنے میں تیار کیا تھا، اس پر ابھی تک میرا مکمل اختیار باقی تھا اور وہ میرے اندر اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ بہت ممکن ہے ایک وقت ایسا آجائے جب صبح کو یہ احساس ہو کہ میں اتنا مفلس نہیں ہوں اور میرے پاس ایک ایسی چیز ضرور ہے جس پر رات اور سورج کا کوئی بس نہیں چلتا تو وہ یقیناً کف ندامت ملتی ہوئی میرے پاس آئے گی ـــــ

میں محسوس کر رہا تھا کہ سودا برا نہیں رہا تھا۔

مجھے اپنی وراثت پر اعتماد تھا۔ □

احمد یوسف

مکالمہ

ضعیف العمر قصہ گو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ــــ

ــــ ہاں تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، وہ چشمہ ہنستا کھیلتا، خوشی کے شادیانے بجاتا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سبھی جنگل کے باسی اور اس کے کنارے بسی آبادی چشمے کا پانی پی کر تازہ دم ہو جایا کرتی۔ جہاں سے وہ چشمہ نکلا تھا، وہاں سے کچھ دور آگے جاکر نیچے کی سطح پر بہا کرتا۔

ایک دن کا واقعہ ہے ــــ

اس تمہید کے بعد جب قصہ گو نے یہ جملہ چھیڑا تو سننے والے اور ذرا سمٹ آئے کہ گویا اب دریا میدانوں میں اتر آیا ہے اور بات آگے بڑھے گی۔

ــــ تو یہ ہوا کہ اس دن اوپر کی جانب ایک شیر چشمے کا پانی پی رہا تھا۔ جب وہ جی بھر کر پانی پی چکا تو اس نے آس پاس کے ماحول اور دور دور تک پھیلی ہوئی فضا کو اپنی آنکھوں میں بسایا۔ اس درمیان اس نے کئی زاویے اپنی گردن کے بدلے، کئی بار اپنی آنکھوں کو سمیٹا اور پھیلایا، اور تب ہی ایک منظر اس کی آنکھوں کو ایک نئی چمک دے گیا۔

جہاں وہ شیر کھڑا تھا اس سے کچھ ہی فاصلے پر نشیب کی طرف ایک میمنا چشمے کا پانی پی رہا تھا۔ چشمے کا حیات بخش پانی دور دور تک پھیلی ہوئی فرحت بخش فضا اور اس پر میمنے کی شکل میں ایک لذیذ نعمت ــــ

دوسری ہی ساعت شیر کے دل میں ایک خیال آباد ہوا، ماتحتوں سے بات چیت کے طور طریقوں سے بخوبی واقف تھا۔ جو فعل اس کے لئے صحیح ہو سکتا ہے وہ اس کے ماتحتوں کے لئے غلط ہو سکتا ہے [illegible] ہو سکتا ہے وہ شیر کے لئے غلط ہو سکتا ہے۔ [illegible] کچھ آداب [illegible] جو

[illegible] کئے تھے

تب ہی شیر نے گرجتے ہوئے کہا ـــــ
" ابے چھوکرے تیری یہ مجال کہ اس پانی کو گندہ کرے جسے میں پیتا ہوں۔ تو نے یہ نہیں دیکھا
کہ تجھ سے کچھ ہی دور پر میں بھی اس چشمے کا پانی پی رہا تھا۔"
میمنا کانپ اٹھا، اور اس نے بڑی مشکلوں سے خود کو یکجا کر کے کہا ـــــ
حضرت سلامت! آپ اوپر ہیں اور میں نیچے ہوں۔ چشمے کا بہاؤ اوپر سے نیچے کی طرف
ہے، ایسے میں بھلا میں آپ کا پانی کس طرح گندہ کر سکتا ہوں۔
سننے والوں میں سے کسی نے کہا ـــــ "شیر اور میمنے کی منطق کا فرق واضح ہے"
اس پر قصہ گو نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں ان سے کہا کہ وہ قصّے کے درمیان کسی قسم کی رائے
زنی سے پرہیز کریں، ورنہ وہ قصہ بھول جائے گا ـــــ
ـــــ ہاں تو پھر شیر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، اس کا چہرہ کچھ اور بڑا ہو گیا اور اس کا قد
کچھ اور کھنچ گیا۔
اور جب وہ زور سے دھاڑا تو ساری فضا تھرا اٹھی، لیکن دوسری ہی ساعت یہ محسوس ہوا
کہ فضا نے اپنے دم سادھ لئے ہیں۔ یہی حال میمنے کا بھی تھا۔
شیر نے کہا ـــــ ٹھہر تجھے تیری گستاخی کا مزہ چکھاتا ہوں۔ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھ سے
اس جنگل کے پنچھی پکھیرو، چھوٹے بڑے جانور اور پیڑ پودے کس طرح بات کرتے ہیں ـــــ
یہ کہہ کر شیر نے نشیب کا رخ کیا۔ میمنے کی اتنی ہمت کہاں کہ فرار کی سوچے، پہلے ہی شیر کی
شان میں کافی گستاخی کر چکا تھا۔
میمنے کے جسم کا سارا خون اس کے دل میں کھنچ آیا تھا اور وہ بڑی ہی معصومیت اور مظلومیت
سے شیر کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن تم نے وہ کہاوت سنی ہو گی کہ گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کرے تو
پھر کھائے کیا
چنانچہ شیر نے میمنے کی تکا بوٹی کر کے اسے برابر کر دیا۔
سننے والوں کی صف سے ایک نوجوان کھڑا ہوا اور اس نے کھنکھارتے ہوئے کہا ـــــ
" محترم بزرگ! یہ قصہ اس مقام پر ختم نہیں ہوتا اس سے آگے بھی جاتا ہے "
قصہ گو جھنجھلا اٹھا ـــــ "بکتے ہو یہی اس کا انجام ہے"
تب حاضرین کے بے حد اصرار پر نوجوان نے اس کے آگے کا قصہ بیان کیا۔

شیر مینے کو ٹھکانے لگا کر اپنی جگہ واپس آیا تو اس نے چشمے پر منہ صاف کیا اور خوب سیر ہوکر پانی پیا۔

اور جب یہ سب کر چکا تو اپنی عادت کے مطابق اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور نشیب کی طرف نظر دوڑائی۔

نشیب کی جانب پھر وہی مینا اسی جگہ کھڑا پانی پی رہا تھا۔

شیر غصے سے بے اختیار ہوکر گرجا۔

تو پھر آگیا چشمے کا پانی گندہ کرنے ـــــ تیری یہ ہمت۔

مینے نے وہی جواب دیا جو اس سے پہلے دے چکا تھا۔

"جہاں پناہ! پانی بلندی سے ڈھلان کی طرف آتا ہے۔ ڈھلان سے بلندی کی طرف نہیں جاتا ـــ"

چنانچہ اس بار بھی شیر اسی انداز سے نشیب پر آیا اور اس نے مینے کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی۔

تیسری بار بھی یہی ہوا ـــــ

چوتھی بار بھی یہی ہوا ـــــ

تب بار بار کے اس عمل سے فضا نے اس پورے مکالمے کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا۔

اور جب وہ مینا سامنے آتا تو فضا خود بول اٹھتی ـــــ

"گستاخ چھوکرے! تیری یہ مجال کہ میرے پینے کے پانی کو گندہ کرے۔"

پھر وہی فضا مینے کا بھی جواب دیتی ـــــ

"جہاں پناہ! پانی بلندی سے ڈھلان کی طرف آتا ہے۔ ڈھلان سے بلندی کی طرف نہیں جاتا۔"

اس مکالمے کے بعد شیر اپنے مخصوص انداز سے نشیب کی جانب آتا اور مینے کو چیر پھاڑ کر ٹھکانے لگا دیتا۔

پر اس بھاگ دوڑ سے شیر کافی نڈھال ہوگیا تھا۔

اس کی آنکھوں کے آگے تتلیاں سی ناچ رہی تھیں۔ منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

تب قصہ گو نے سوال کیا۔

"میرے عزیز یہ بتاؤ کہ پھر یہ قصہ ختم کہاں ہوتا ہے۔" ☐

علی امام نقوی

۸۴ جوتی سیکرا چیمبرز II نریمان پوائنٹ
بمبئی ۴۰۰۰۲۱

نئی کربلا

کل ـــ

سورج، صحرا، ریت، ریگستان [illegible] پیاس

چاند، چاندنی، ریگستان [illegible] سراب

روشن صبح، تپتی دوپہر، خون بہاتی شام

پیاس، پیاس، اور صرف پیاس کا شور

لشکر یزید، خیمے [illegible] ننھے ننھے بچے [illegible] میں [illegible] حرف

[illegible] قلیں [illegible] اور پیاس سے جاں بلب، عبادت میں مجسم اطمینان

لشکر

کربلا

حسینؑ اور اصحاب حسینؑ

آج ـــــــــ

سورج، صحرا، ریت، ریگستان، حدت اور پیاس

چاند، چاندنی، ریگستان، برف کی طرح سرد، محض سراب

طلوع ہوتا ہوا سورج، جھلستی دوپہر، اتنی [illegible] روتی شام

پانی قلت

متلاشی نظریں، کچھ صبر، تھوڑا سا شکر، اور تہذ[illegible]

پانی محبوب لیکن . . . نایاب

راجستھان اور وہاں کے لوگ

چھاگل، محبوب، سکورا، عاشق، ریت کے ذروں [illegible] سورج، آنسو، آہیں [illegible] اور نظم روتی ہیں

تہذیب قدریں، ٹوٹتی، بکھرتی، سب کچھ ان ہی ذروں میں پوشیدہ، مندر میں کلس، مسجد میں گنبد، مندر سے نکل کر صحرا کی وسعتوں میں دوڑتی مندر کی گھنٹیوں کی آوازیں، گنبد سے ٹکرا کر فضا کی اور لپکتی اذان کی صدائیں "میرا محبوب..... مجھ سے بہت دور ہے۔ کوئی جا کر اس سے کہہ دے کہ میں اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہوں، یہ ..... یہ برہا کی آگ کب بجھے گی ؟..... کب بادل چھائیں گے، دور آکاش سے گلے ملنے والو..... آؤ کہ تمھاری راہ دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں، آؤ..... ورنہ یہ آگ..... ہمیں راکھ کر دے گی۔ ہمیں..... ہاں ہمیں تمھارا انتظار ہے۔

نوحے، ماتم، گریہ، آنسو، کرب..... اور بلائیں۔

"جو مجھے جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ اور جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ میں.....

"میں آپ کا سیوک ہوں۔ برسوں سے آپ کی سیوا کرتا آرہا ہوں کہ سیوا ہی میرا دھرم ہے۔ اور میرا دھرم بتا رہا ہے کہ ہماری سب سے بڑی ضرورت پانی ہے میں نے اور میرے ساتھیوں نے بارہا کر اس ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے اور سرکار..... آپ کے اس سیوک کے کارن جان گئی ہے کہ ریت کے ان ذروں میں ہماری موت چھپی بیٹھی ہے۔ وہ کہ پہلے ہی بھر، سو رہیہ دیتا، آکاش سے اتر کر ان ہی ذروں میں سما جاتے ہیں۔ گرمی حد سے بڑھ جاتی ہے۔ زبانوں میں کانٹے پڑ جاتے ہیں اور وہ تالو سے جا لگتی ہے۔ اس کی اینٹھن ہمیں بہروں رلاتی ہے، ڈھور ڈنگر زبانیں لٹکائے ہمیں تاکتے ہیں۔ اور ہم..... ہم تڑپ پڑتے ہیں..... یوں تو ہم برسوں سے چیخ رہے تھے لیکن..... ہماری کمزور آوازیں سرکار تک پہنچنے سے پہلے ہی ریگستان کے بگولوں کی بندی ہو جایا کرتی تھیں پر آج..... نیٹ، ایٹمی دھماکہ، آریہ بھٹ اور بھاسکر

جنگ، شکست، فتح، جنگ، بھوک اور پیاس

العطش، العطش، مشک و علم صیقل ہوتی تلواریں۔ تسبیح، سجدے، شکرن شکرن شکرن

دور، شی تج کی کوکھ سے اڑتی دھول

واٹر ٹینکر گرد کا طوفان۔ انجن کا شور، لمبی قطاریں

گھڑے، چھاگل، مشربہ اور صراحیاں

انتظار، محبوب، انتظار، عاشق، پانی۔ گرد کا بیٹھتا طوفان، دھندلے، ہیولے، واضح صورتیں

"آج میں ایک سندیسہ لایا ہوں

"سندیسہ

"سندیسہ

"کیا ہو سکتا ہے

"سرکار نے سمپسیر وچار کے بعد ہماری سمسیا کا حل کھوج نکالا ہے۔
تھوڑے سے مسکراتے چہرے، حیرت سے پھیلتی آنکھیں
"اب ـــــ ہماری آپ کی زبانوں پر کانٹے نہیں پڑیں گے کوئی پیاسہ نہیں رہے گا۔ نہ پشو، نہ پنچھی، نہ ہی منش، سرکار..... ہمیں سیراب کرنے کا پربندھ کر چکی ہے۔ جلد ہی پانی ہمارے گھروں میں ہوگا۔ آپ کو ..... آپ کو ان ٹینکروں کی راہ نہ دیکھنی ہوگی پتھرائی پتھرائی آنکھیں، اور سوکھے کنوؤں کی تہہ سے پھوٹتے سوتے۔
"میں جانتا ہوں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں... کوسوں دور سے پانی گھر گھر کیسے پہنچے گا؟ ـــــ یہی نا ـــ تو سنئیے، ہماری سرکار اس علاقے میں نہر کھود دے گی..... ریت کے ان ذروں میں جہاں آج ہماری موت چھپی بیٹھی ہے زندگی انگڑائیاں لے گی، سبزہ اگے گا ہریالی چھائے گی۔ سایہ دار درخت ہوں گے
"بند کرو یہ بکواس
پتھرائی آنکھوں کی پتلیوں کا رقص، سوالات کا آنکھوں سے تبادلہ، ایک گونجتی آواز
"میں کہتا ہوں اپنی بکواس بند کرو
"کون ہو تم تری مان؟
"یہ ماتھر صاحب ہیں
"ارے یہ ماتھر صاحب ہیں
"آپ انھیں نہیں جانتے..... حیرت ہے
"ہاں تو شری ماتھر جی ـــــ ہماری سمسیائیں.....
"ہمیں اس سے زیادہ اپنی روایتوں کا خیال ہے۔
"لوگ پیاسے مر جاتے ہیں
"اس لئے کہ وہ اپنی روایت پر مٹ جانا پسند کرتے ہیں
"یہ جھوٹ ہے
"اس کا اتر ـــــ اب ہم ـــــ تم سے سیکھیں ـــ
"تجویز پاس ہو چکی ہے۔ بہت جلد اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔ اس کے لئے ہمیں آپ کی سہائتا چاہئے۔
"تمھیں یہاں سے ایک بھی مزدور نہ مل سکے گا۔
سناٹا..... صرف سناٹا

ایکسی لیٹر پر پیروں کا دباؤ، دوڑتے ہوئے بل ڈوزر، ہائے، سرکاری مزدور، کدالیں، پھاوڑے، تسلے پر آتیں، سنبل تیر سہ شعبیہ، کمانیں، خود، تلواریں، گرز، علم وطبل اور ہزار ہا اسپ غضب ناک۔

"میں تمھاری گردنوں سے اپنی بیعت اٹھارہا ہوں۔ کہ میرے ساتھ رہنے والوں کی موت یقینی ہے یہ لوگ.... صرف میرے سر کے طلب گار ہیں!...... ان میں سے کوئی تم سے باز پرس نہیں کرے گا.... میں پھر کہتا ہوں جو جانا چاہتا ہو، لوٹ جائے..... کہ میرے ساتھ رہنے والوں کی موت یقینی ہے..... لو میں چراغ گل کئے دیتا ہوں.... جنھیں لوٹنے میں شرم آرہی ہو..... اب چلے جائیں

"رات کے دوسرے پہر میں نے آپ کو یہاں اس لئے جمع کیا ہے کہ ہم سب کو سرکار کے خلاف آواز اٹھانی ہے۔ ہمیں سرکار کو بتانا ہے کہ تمھاری نہر اپنے ساتھ ہمارا کلچر، اور ہمارا فطری حسن بہالے جائے گی۔

یلغار، دفاع، رجز، اور جنگ

ایک، دو، تین

دوست، احباب، عزیز، اقربا، آل واولاد

مورچے، نعرے، احتجاج، بے ضابطہ کاروائیاں،

لاٹھی چارج، آنسو گیس کے شیل، دھواں، سوزش،

بل ڈوزر، ہائے، سرکاری مزدور،

وقفہ

"میں عظیم روایتوں کا امین ہوں، دیکھو اب بھی باز آجاؤ۔ تم نے میرے دوستوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ عزیزو اقارب مار دیئے، میرے بازو قلم کر دیئے، میری اولاد.........

"مسٹر ماتھر ـــــ اپنے آدمیوں کو سرکاری کاموں میں حارج ہونے سے روکیں، یہ نہر..... اگر تعمیر ہوگئی تو نئی روایت کو جنم دے گی۔

"میں ماضی کی عظیم ترین روایتوں کی سرکشائی کی خاطر آپ کی سرکار کے خلاف اٹھا ہوں۔ آپ اس بات کو مان کیوں نہیں لیتے کہ آپ کی نئی روایت ہمارے کلچر کی قاتل ہوگی!

چنوتی، وارننگ، دھمکیاں، اور پھر فائرنگ

واپسی، استقامت، دم توڑتے انسان، بوڑھے، جوان، بچے اور خون۔ خون۔ خون، پانی پانی، پانی۔

(برسوں کی مخالفتوں اور تصادم کے بعد آخر کار نہر تعمیر ہوئی۔ کمشنر منتری نے اس کا ادگھاٹن کیا کنارے کھڑے لوگوں نے نہر کا پانی دیکھا تو ان سب کا سر جھک گیا۔ انھیں اپنی بے چارگی بہت یاد آئی

چھاگلیں کوڑیوں پہ ڈال دی گئیں، کمہاروں نے صراحیاں بنانی چھوڑ دیں، سکورے عنقا ہو گئے پلاسٹک کے گلاسوں میں آج بھی جب وہ سب پانی پیتے ہیں تو انھیں ماتھر صاحب بے حد یاد آجاتے ہیں) ◻

ڈاکٹر مہادیر بھون
مہندرو۔ پٹنہ ۶

شوکت حیات

سیلاب

پانی بڑھتا جا رہا ہے۔

آدمی، جانور، پیڑ پودے، سب کے سب دھیرے دھیرے اپنی جڑوں سے اکھڑنے لگے ہیں اور سیلابی ریلوں کی گود میں بے یار و مددگار آسمان کی طرف تک رہے ہیں۔ پانی اگر اسی طرح بڑھتا رہا تو پہلے سیڑھیاں، کچھ چھت، پہلی منزل، دوسری منزل، ..... اور اسی طرح سارا شہر ڈوب جائے گا۔

سطح آب پر ایک چھپر بہا چلا جا رہا ہے۔ اس کے اوپر ایک کمزور آدمی اپنے زرد ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے بسی کے عالم میں "بچاؤ بچاؤ" چیخ رہا ہے۔ ٹھیک اس کے بغل سے ایک تنومند چمکتی ہوئی بھینس بہہ رہی ہے۔ سیلابی تموج کے دو اطراف میں شہر بلندی پر ہے۔ جہاں کھڑے ہوئے لوگ یہ سب کچھ یا تو محض تماشائی کی طرح دیکھ رہے ہیں یا سہمے سہمے اپنے اپنے علاقوں کی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

کچھ تنومند لوگ سمندر دی میں کود پڑے ہیں۔ تیزی سے تیرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ اسی طرف، جہاں ایک آدمی چھپر پر اور بغل میں کچھ دوری پر ایک تنومند بھینس بہے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں سب لوگ چھپر سے گذرتے ہوئے اس آدمی سے آگے بڑھ گئے ہیں اور چاروں طرف سے بھینس کو گھیر چکے ہیں۔ سب کے چہروں پر کامیابی اور حصول کی مسرتیں ہیں۔ آہستہ آہستہ سب لوگ بھینس کو چھان کر کنارے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آدمی پیچھے چھوٹ گیا ہے اور متوحش انداز میں "بچاؤ ..... بچاؤ" چیختا ہوا مایوس آنکھوں میں موت کو سمیٹے بہا چلا جا رہا ہے۔

"بچاؤ... بچاؤ ..." کی چیخ دور ہو گئی ہے۔

پانی پھیلتا جا رہا ہے۔ آدمی، جانور، پیڑ پودے سب کے سب دھیرے دھیرے اپنی اپنی جڑوں سے اکھڑنے لگے ہیں اور سیلابی ریلوں کی گود میں بے یار و مددگار آسمان کی طرف تک رہے ہیں۔

سب کے سب یہی سوچ کر خوف سے لرز رہے ہیں کہ اگر پانی اسی طرح تیز رفتاری سے بڑھتا رہا تو ان کا کیا ہوگا۔ وہ لوگ جن کے ہاتھ آسمانی چھت تک پہنچ چکے تھے اور پاؤں زمین پہ نہیں تھے اور یوں وہ تمام زمینی بلاؤں سے نجات حاصل کر چکے تھے، سیلاب کے ایک تیز ریلے میں ان کے جسموں کے طیارے مٹی کی ناؤ بن جائیں گے اور پھر وہ

بکھر بکھر اکر پانی میں ریزوں کی طرح بہہ جائیں گے۔

سطح آب پر آبی پودوں کے ایک جھنڈ میں ایک آدمی کی لاش پھنسی ہوئی بہہ رہی ہے۔ پانی کے کنارے بہت سارے بیٹھے، کھڑے اور سوئے اپنے اپنے علاقوں کے حشر سے خوف زدہ ہیں۔ ایک طرف بیٹھے ہوئے کچھ سیاہ فام لوگ سطح آب کا بہت دور دور تک عقابی آنکھوں سے جائزہ لے رہے ہیں۔ پانی سے لاوارث لاشوں کو نکال کر اسے اسپتال کے اینا ٹومی ڈیپارٹمنٹ میں فروخت کر دینا ان کے فاضل اوقات کا پیشہ ہے۔ یہی ان کی زائد آمدنی کا ذریعہ ہے۔ ایک دو لاشیں کسی حد تک صحیح سلامت مل جائیں تو تھوڑی سی محنت سے رات بھر کی اچھی خاصی عیاشی کا انتظام ہو جاتا ہے۔ لاش پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ پانی میں کود پڑے ہیں۔

تیزی سے یہ لوگ لاش کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ لاش بالکل صحیح و سالم ہے۔ ان کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی ہے۔ یہ لوگ مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔ لاش کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اتنے سارے زندہ آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر لاش نے مدد کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے ہیں۔

"ارے زندہ ہے......!!!

ان کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے اور وہ بوجھل بوجھل انداز سے الٹے پاؤں واپس لوٹ پڑے ہیں اچانک وہ مڑتے ہیں۔ لاش کے ہاتھ ہل رہے ہیں۔ اس کے قریب پہنچتے ہیں اور اسے ڈبکی لگا دیتے ہیں۔ ہلتے ہوئے ہاتھ دھیرے دھیرے ساکت ہو جاتے ہیں۔

پانی پھیل چکا ہے۔ شہر کے وسطی علاقے میں کمر تک پہنچ چکا ہے۔ شہر کی سب سے خوبصورت دائرہ نما کالونی میں پانی مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔ سب لوگ اپنے قیمتی اثاثے کے ساتھ چھتوں پر چلے آئے ہیں۔ پانی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک لاش کافی دیر سے کالونی کے علاقے میں سطح آب پر چکر کاٹتی ہوئی پھول اور سڑ رہی ہے۔ چکر کاٹتی ہوئی ایک مکان کے سامنے کسی چیز میں پھنس کر رک گئی ہے۔ لاش کا خالی پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے مرنے سے پہلے مرحوم مرنے کی اذیت ناک جدوجہد سے گذرا ہوگا۔ چہرے پر موت سے لڑنے والی شکنیں اتنی گہری ہیں کہ لاش کے پھولنے کے باوجود اب تک نمایاں ہیں۔ لاش کی آنکھیں پھٹی ہیں اور ان سے احتجاج کا مردہ لاوا ابل کر پانی میں اُبال پیدا کر رہا ہے۔

چھتوں پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ اپنا بیش قیمت اثاثہ چھتوں پر منتقل کرنے کے بعد مطمئن تھے اور سیلاب کے مناظر خوف اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پھولتی ہوئی اس لاش کو دیکھ کر انھیں ابکائی آنے لگی ہے۔ جس چھت کے پاس لاش آ کر رک گئی تھی اس پر سے کچھ لوگ ہاتھوں میں لکڑی لئے ہوئے بیزار قدموں سے پانی میں اترے ہیں۔ لکڑی کے ایک زوردار جھٹکے سے لاش پرے ہٹ جاتی ہے۔ اطمینان کی سانسیں لیتے ہوئے وہ اپنی چھت پر

واپس آگئے ہیں۔

سطح آب پر تیرتی ہوئی لاش دوسرے مکان کے سامنے آکر کسی چیز کے سہارے ٹک گئی ہے۔ اس چھت کے لوگ جو سیلابی منظر کے رومانی پہلو سے لطف اندوز ہو رہے تھے، پھولتی ہوئی لاش کو دیکھ کر پہلے تو حواس باختہ ہو گئے اور پھر ایک ابکائی ان کے اندر سے باہر آنے کے لئے کروٹیں بدلنے لگی ہے۔ یہ لوگ بھی اسی طرح لکڑی لے کر پانی میں اترتے ہیں اور لاش کو آگے دھکیل کر واپس چھت پر پہنچ جاتے ہیں۔

لاش بہتی بہتی تیسری چھت کے پاس آکر رک گئی ہے۔ اس چھت کے لوگ بھی سڑتی ہوئی لاش کی ناقابلِ برداشت بدبو کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی ناکوں پر رومال رکھ لیتے ہیں اور پھر ایک ہاتھ سے منہ اور ناک بند کئے ہوئے پانی میں اتر کر لاش کو لکڑی سے آگے دھکیل دیتے ہیں۔

سطح آب پر بہتے بہتے لاش چوتھی چھت کے قریب آتی ہے اور یہاں سے اگلی چھت کی طرف دھکیل دی جاتی ہے اور پھر پانچویں چھت سے چھٹی چھت کی طرف پھینک دی جاتی ہے۔۔۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اور اسی طرح یہ لاش مستقل پوری کالونی کا چکر کاٹ رہی ہے۔ جس چھت کے پاس بھی پہنچتی ہے، اس چھت کے لوگ اسے آگے دھکیل دیتے ہیں۔ لاش کئی گھنٹوں سے سیلابی سطح پر اسی طرح سورج اور چاند کی کرنوں میں چکر کاٹتے کاٹتے سڑنے اور پھولنے لگی ہے۔ لاش کا خالی پیٹ بڑے غبارے کی طرح پھولتا چلا جا رہا ہے۔ ایک بے حد سیاہ کوا اڑتا ہوا آتا ہے اور لاش کی اختلاج سے بھرپور دونوں آنکھیں نکال لیتا ہے۔

خالی پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔۔۔۔ کچھ ہی دیر میں اسی طرح چکر کاٹتے ہوئے کسی بھی چھت کے پاس لاش کا پیٹ اچانک پھٹ جائے گا اور خالی پیٹ کی زہریلی بدبو ساری کالونی میں پھیل جائے گی۔ □

فرخندہ لودھی

۴۔ اے ایمپرس پارک
لاہور۔ پاکستان

اخباری بات

بات تو اخباری ہے مگر لکھنے کو جی چاہتا ہے۔

دانا کہتے ہیں "زندگی ایک کتاب ہے" لیکن جدید دور کی زندگی کو اخبار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نوع بنوع اور رنگ برنگی خبریں، جن میں سے کوئی بھی ذہن میں تادیر محفوظ نہیں رہتی۔

قادر آباد روڈ کسی زمانے میں ہرے بھرے کھیتوں میں سے یوں گزرتی تھی جیسے مالا میں ڈوری۔ آج کل یہ پختہ سڑک ہے جس کے دونوں جانب مکان، کارخانے اور گندگی کے ڈھیر ہیں۔ گنجان شہری شاہراہوں کی طرح یہاں بھیڑ بھاڑ تو نہیں تاہم اسے فارغ اور بیکار بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں شور اور ہنگامہ کبھی کبھی ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک گزرگاہ ہے بازار نہیں۔ راہیوں کو روکنے کے لئے دلکشی کا سامان نہیں۔

میں اس سونی سڑک پر اپنی دھن میں مگن چل رہی تھی کہ ایک آواز نے میرے قدموں کو بریک لگا دی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"اور وہ میرے ہاتھوں سے گیا جیسے کوئی کیڑا — ہا ہا — —

میں نے فوراً قیافہ لگایا کہ مرنے والا مکھی نہ سہی کوئی کتا بلا ہوگا اور یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں تاہم میں متجسس تھی اور مجھے اپنے ساتھ ساتھ چلتی لال دوپٹے والی لڑکی کی بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ معمولی ناک نقشے والی اس لڑکی نے بولتے بولتے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"دیکھیں نا باجی انھوں نے ملک کی ہر شے [illegible] کر دی ہے اور [illegible]" میں نے اس کی بات اچک لی اور داد اسے داغ دی:

"کتنا اچھا ہوا اب قصّہ اور کیا چاہئے — انھوں نے وہ کام کیا ہے جو آج تک کوئی نہ کر سکا —"

مجھے اس لمحے قوم کا مستقبل نہایت شاندار نظر آ رہا تھا میں نے کہا

"علم کی روشنی پھیلانے کے لئے لہو جلانا پڑتا ہے مگر اس پارٹی نے یہ کام نہایت سہل طریقے سے سر انجام دیا ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت ہر سمت امید کے دروا ہوتے نظر آرہے تھے اور ہر در کے ورے روشن آنگن تھا۔

انوکھی آرزو جیسی مسرت کی لہر میرے حلق میں پھنس گئی میں نے بے فکری سے قہقہہ لگاتے ہوئے، لال دوپٹے والی سے پوچھا:

"پھر۔"

اپنے پیچھے چلے آتے لڑکوں کی آواز دوبارہ میرے سینے میں آکر لگی۔ لڑکا کہہ رہا تھا۔

"یار! پھر میں نے بسیرتی اس کے سر پر دے ماری۔"

"اچھا — پھر —" دوسرے نے استفسار کیا۔

یہ گفتگو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ مار پیٹ اور قتل و غارت کا موضوع ہو تو انسان کا دھیان بلا تردد ادھر ہو جاتا ہے لیکن میری ہم سفر نہ معلوم کس مزاج کی تھی کہ بس اپنی ہانکے جاتی تھی۔ اب کے اس نے مجھ سے پوچھا:

"باجی! جب باقی سب نیشنلائزڈ ہو گئے۔ تو مجھے کیوں نہیں کیا؟"

"کیا مطلب؟"

میں نے اسے خوش کرنے کے لئے حیران اور پریشان ہو کر پوچھا جس کا جواب اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دیا۔ وہ سچ مچ اداس تھی۔ روہانسی سی ہو کر بولی۔

"دیکھیں نا! جمعدارنی ہو گئی، چوکیدار ہو گیا، بیلدار، مالی ۔۔۔ سارے ہی نیشنلائز ہو گئے ہیں۔"

"تو ایسی ضروری اور اہم نہ ہو گی بی بی!"

میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا۔ اصل میں میری تمام تر توجہ پیچھے تھی۔ اور میں چاہتی تھی کہ وہ کچھ دیر کے لئے اپنی ریں ریں بند کرے تو پتا چلے کہ لڑنے کے لئے ہاتھ ... والا کون تھا؟

"یار جس دم اس نے تڑپ کر آخری سانس لیا تو مجھے یاگل کتا یاد آیا جسے ابا نے گولی ماری تھی۔"[1]

لال دوپٹے والی نے غم اور مایوسی بھری نظروں سے یاروں اور دیکھا پھر دوپٹے کو سنوارتے ہوئے تقریباً میرے ساتھ چپک کر چلنے لگی۔ اس کے لبوں سے شکایت اب بھی جاری تھی:

"قلم رسے بھی سرکاری ہو گئی اور مولوی بن جو کبھی کبھار آیا کرتے تھے ۔۔ مجھے اس کی باتیں بک بک لگ رہی تھیں تاہم میں نے ... کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینا چاہی لیکن مجھے کوئی دلیل یا جواز سوجھ نہیں رہا تھا

---

[1] مائع سر کا مانٹ۔

اسی لمحے پشت سے آواز آئی:

"دیکھو بی! جن کے سرپر سائیں[۱] ہوں وہی ایسے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں — عام آدمی نہیں۔"

دوسری آواز نے پھر ہنکارا بھرا جیسے اندھیری رات میں کوئی بچہ بھوت پریت کی کہانی سنتے ہوئے لمبی سرد آہ بھرے — میں نے کمال ہوشیاری سے ایک طرف تھوکنے کے بہانے سر موڑ کر پیچھے دیکھا۔

فلیٹ کریپ کا سبز سوٹ، پاؤں میں سفید کھسا، لڑکا اچھا خاصا پاکستانی جھنڈا بنا ہوا تھا۔ عمر یہی کوئی سترہ یا اٹھارہ برس ہوگی۔ اس کی چال میں عجب ٹھسک اور مستانہ پن تھا۔ دوسرا لڑکا اس کے ساتھ سر نیوڑھائے چل رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا لمبا 'ہنکارا' بھرنے والا یہی لڑکا ہوگا۔ اس دنیا میں کچھ لوگ صرف سننے اور سہنے کے لئے آتے ہیں کچھ کہنے اور کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے — ایک چپ سو سکھ — ان کی زندگی قطرے کی طرح لرزتے کانپتے ختم ہو جاتی ہے۔

لڑکے ہمارے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ ان میں ایک قاتل تھا۔ میرے کان اس کی آواز پر ہی تھے لیکن میں نے لال دوپٹے والی سے پوچھا:

"کیوں بی بی! تم بھی نیشنلائز ہونا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے بلا تامل جواب دیا:

"میرے ابا تو کہتے ہیں کہ ہم سب اسی دن نیشنلائز ہو گئے تھے جس دن پاکستان وجود میں آیا مگر بعد میں کچھ گھپلا ہو گیا۔"

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"خدا کی قسم باجی! میرے ابا بڑے سیدھے ہیں۔ میں بہت کہتی ہوں کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ لوگ دینے لینے کے بغیر بات نہیں سنتے مگر وہ کہتے ہیں کہ تم بچی ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دی۔ اب کے میں نے اس کے کندھے کا سہارا لیا کیوں کہ میں کچھ ڈگمگا گئی تھی۔

"ہاں پرانے لوگ جس خوش فہمی میں رہتے رہے اپنے عہد کے ساتھ خود ختم ہو گئے، بہر حال" [illegible]

اپنی طرف سے میں نے پتے کی بات کی تھی لیکن میں جانتی تھی کہ لڑکی کی تسلی کے لئے ناکافی تھی کیوں کہ وہ نئے حالات کا شکار تھی۔

سبز سوٹ والا لڑکا اب پولیس والوں کو نہایت ننگی گالیوں سے گرما رہا تھا۔ اتنے میں ایک ٹھلا اور

---

[۱] سرپرست۔ پشت پناہی کرنے والا۔

سکوٹر رکشا ایک دوسرے کو کراس کرتے گزرے، مجھے فقط اتنا سنائی دیا۔

"اس نے چوٹ کھاتے ہی اپنا سر سرکاری نلکے کے نیچے کر دیا۔ ٹھنڈے پانی کی دھار پڑتے ہی——

اللہ بیلی۔"

میرے اٹھتے ہوئے قدم کو میرے وجود کے اندر ست ٹھوکر لگی۔ لال دوپٹے والی نے دوپٹے کو پیشانی تک کھینچ لیا—— اب دونوں لڑکے ہمارے برابر برابر چل رہے تھے—— سبزپوش لڑکے کے چہرے پر خوشحالی کی لالی اور لاابالی پن تھا۔ لمبے لمبے بال، لمبی قلمیں، شکل و شباہت، خاصی دلکش تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ہم سفر اسے لگاوٹ سے تک رہی ہے —— اب ہم دونوں اس لڑکے کی گفتگو میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ اگرچہ رویے میں فرق عیاں تھا۔

"جناب! پھر پولیس آ گئی۔—— سپاہی نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور ہتھکڑی لگانے لگا۔ میرے بچانے اسے اڑنگا دے کر دو مارا۔ میرے ابا کو پتہ چلا وہ اسی وقت دوڑا دوڑا آیا —— تھانیدار نے موقع پر ہی میرے ابا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے "چودھری صاحب! یہ کیس تو قتل کا ہے ہی نہیں۔ میرے سپاہی سے جو گستاخی ہوئی اس کے لئے میں معافی مانگتا ہوں۔ دیکھئے، چودھری صاحب! آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ سپاہی بھی بندہ بشر ہوتا ہے غلطی ہو گئی۔"

دوسرے لڑکے نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں مفلسی کی زردی اور چہرے پر زمانے کا خوف طاری تھا۔ بال پریشاں اور میلے کپڑے۔ میری ساتھی نے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر دوبارہ اپنی بپتا کہنی شروع کر دی۔ وہ اپنے باپ کی پوزیشن واضح کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"میرے ابا پرانے خیالات کے ہیں۔ دنیاداری میں یقین نہیں رکھتے۔"

"چلو نہیں تو ہے—— تم ایسے کرو بی بی! کہ جب تک گھر میں بیٹھ کر گھرداری کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاؤ۔ لڑکیوں کے لئے یہ کام تو ہر وقت موجود رہتا ہے۔ عورت کچھ نہ بن سکے بیوی تو بن سکتی ہے—— شادی کرا لو — اللہ اللہ خیر صلا ——" میں نے قصہ مختصر کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن شادی ایسے ہی نہیں ہو جاتی۔" لڑکی نے مجھے جواب دیا۔

"نہ معلوم کوئی دن دالا مل جائے"

میں نے بات سنجیدگی کو مذاق میں اڑانا چاہا۔ اس پر وہ ہنس دی—— یونہی ہلکا سا——

"باجی! آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔" اس نے پوچھا۔

اس پر میں نے قہقہہ لگایا—— بس کھلو کھلا سا۔

ڈوبتا ہوا انسان تنکوں کا سہارا لینا نہیں بھولتا۔ کیوں کہ امید زندگی کی آبرو ہے۔

اس لمحے وہ لڑکی مجھے ایسی بھکارن نظر آئی جس کے ہاتھ میں نہ کاسا تھا نہ کاسئہ سر میں بھیجا۔

میں نے احساس کا پورا زور خرچ کر کے کہا:

"بی بی! ہم چھوٹے موٹے سرکاری ملازموں کی کیا حیثیت ہے۔ تم اس مسئلے کے لئے کسی سیاسی آدمی سے کہو ۔۔۔ کسی بڑے افسر کو کہلواؤ۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنی رفتار تیز کر دی جیسے مجھ پر اچانک انکشاف ہوا ہو کہ مجھے دیر ہو گئی ہے۔

لال دوپٹے والی کا سکول میری منزل سے دو تین فرلانگ آگے نادر آباد روڈ پر ہی کہیں واقع تھا ۔۔۔

اب لڑکے ہم سے ذرا سا آگے چل رہے تھے۔ ان کی گفتگو ابھی جاری تھی اور ہوا کے دوش پر پیغام کی طرح کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ سبز پوش نے کہا:

یار! میں نے اس چھوکرے کو جان سے مار دیا ۔۔۔ میرے گھر والوں نے مجھے گرم ہوا تک نہیں لگنے دی۔ کتنی مزے کی بات ہے۔"

اس کے ساتھی کی آواز کسی ہمدرد کی [illegible]

"یار! تمہارے اس کارنامے کی خبر کسی اخبار نے نہیں چھاپی"

"واہ۔ یہ کون سی نئی خبر تھی" وہ کچھ تامل کے بعد [illegible]

"مٹھیاں ۔۔۔ مٹھیاں ۔۔۔ گرم گرم ۔۔۔ کیا سمجھے؟"

اس روز تمام وقت، میرا دھیان کام میں نہیں لگا۔ لڑکوں کی گفتگو تو بھول بھال گئی۔ البتہ لڑکی کا خیال آتا رہا۔ میں کتنی کنجوس ہوں ۔۔۔ کوئی دلاسا، کوئی بھروسہ ۔ مجھے اس کی اخلاقی مدد کرنی چاہیے تھی۔ ہاں میں اس کے لئے دعا کر سکتی ہوں ۔۔۔ لیکن نہ معلوم دعاؤں کے زمانے کہاں لد گئے۔ اب تو ایک الجھاؤ سا ہے۔

سہ پہر کام سے فارغ ہو کر واپس ہوئی تو سڑک پر روز کی طرح رونق تھی۔ کارخانوں کے مزدور اور مجھ جیسے لوگ چھٹی کر کے تیز تیز قدم اٹھاتے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی اپنی دھن میں قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی کہ اتنے میں میرے سامنے جھنڈا سا پڑا ۔۔۔ ہلے جلے ۔۔۔ جیسے لتوں میں دوڑ لگی ہو۔

میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ سفید [illegible] پر سبز سوٹ لال چنی کو ہوا میں اڑاتا دوڑ رہا تھا۔ اس کے پیچھے لڑکوں کا ایک گروہ چلا تھا، قہقہے لگاتا ہوا ۔۔۔

میں نے اچانک مردوں کے گھیرے میں سر ڈال دیا۔ گھیرے کے بیچوں بیچ میری صبح والی ساتھی اپنی چھاتیوں کو گھٹنوں تلے دبائے، ننگے سر کو ہاتھوں سے ڈھانپے چیخ رہی تھی۔
مجھ پر غشی کی بے ہوشی چھا گئی —— اس کی چیخوں پر تیرتی ہوئی اک گونج میرے وجود کا حصہ بن گئی
"ان کو رد —— جنھوں نے تجھے جنم دیا۔۔ رو۔ بکھیتے رو" —— □

لہ ستر سے مدد کی شدید ضرورت۔ بے سہارا

سلام بن رزاق

خوں بہا

میری رگوں میں جہنم کدہ دہک رہا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتا مگر محسوس کر سکتا ہوں کہ تمام جسم سے بھاپ یوں اٹھ رہی ہوگی جیسے سمندر سے ابخرات اٹھتے ہیں۔ گلے میں بار بار سوئیاں سی گڑ رہی ہیں۔ مجھے پتا ہے کوئی سرہانے بیٹھا متواتر حلق میں پانی کے قطرے ٹپکاتا رہا ہے۔ مگر وہاں کون تھا؟ اگر بس چلتا تو میں خود اپنے وجود کا گٹھر موت کے گھاٹ اتار آتا کہ پچھلے تین روز سے خود اپنا وجود ناقابلِ برداشت بوجھ بن گیا تھا۔

ابھی ابھی رگھو بتا گیا ہے کہ پاٹل کے مکان پر تھانے دار آیا ہے۔ تحقیقات کے لیے۔ اس کے ساتھ چار سپاہی بھی ہیں۔ پاٹل نے اس کے لیے اپنی کوٹھی میں ایک کمرہ مختص کر دیا ہے۔ جہنم کی حرارت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا۔ رگھو مجھے وید کی دی ہوئی پڑیا کھلا کر میرے حلق میں پانی کے دو گھونٹ انڈیل کر جا چکا ہے۔ مگر اس کی دی ہوئی اطلاع میرے کانوں میں ابھی تک بھنورے کی طرح گھوم رہی ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے مگر ہوا بالکل بند ہے۔ باہر تالاب، قبرستان اور دور دور تک پھیلے دھان کے کھیتوں پر دھوپ فولاد کی چادر کی طرح تنی ہوئی ہے۔ صبح سے میں نے رگھو سے کھڑکی کھول دینے کو کہا تھا مگر اب دھوپ کی کرچیں آنکھوں میں اس بری طرح چبھ رہی ہیں کہ باہر ایک نگاہ دیکھنا بھی بے حد تکلیف دہ ہے۔ اٹھ کر کھڑکی بند کر دینا چاہتا ہوں مگر بدن پر جیسے کسی نے بڑی بڑی پتھر کی سلیں رکھ دی ہوں۔ اٹھنا تو کجا کروٹ لینا محال ہے۔ مگر نہیں اٹھنا تو پڑے گا ہی۔ اگر آج اس طرح سوتا رہ گیا تو پھر کبھی نہ اٹھ سکوں گا۔ چھاتی پر رکھی اس سل کو سرکانا ہی ہوگا ورنہ تاحیات الٹے پڑے تلچٹے کی طرح چھٹپٹاتا رہ جاؤں گا۔ دائیں ہاتھ کی کہنی پر زور دے کر ایک جھٹکے سے اٹھتا ہوں اٹھ کر کھاٹ پر بیٹھ بھی جاتا ہوں۔ مگر دوسرے ہی لمحے لگتا ہے اچانک میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا ہوں اور چاروں طرف سے ہوا کے طاقتور جھکڑ چلنے لگے ہیں۔ سائیں سائیں۔ سائیں کان سنسنا رہے ہیں۔ بدن کانپتا ہے اور میں پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتا چٹانوں سے ٹکراتا، جھاڑیوں سے الجھتا کھائی میں گرتا ہوں۔

تکیے پر سر رکھے اوندھے منہ گہری گہری سانسیں لیتا ہوں۔ آنکھیں بند کرکے تھوڑی دیر تک ہانپتے رہنے کے بعد سرہانے پڑے تولیے سے ماتھے اور گردن کا پسینہ پونچھتا ہوں۔ پھر بستر پر چت لیٹ جاتا ہوں۔ کھڑکی سے باہر دھوپ اس طرح برچھیاں تانے کھڑی ہے۔ ایک لمحے کو سوچتا ہوں۔ رگھو کی بات مان لوں۔ شام کو ساڑھے چھ بجے کی ٹرین سے گھر چلا جاؤں۔ مگر اب کہیں بھی جاؤں وہ منظر تو پرچھائیں کی طرح میرے ساتھ جائے گا۔ وہ منظر جس کا میں خود ایک جز بن گیا ہوں۔ بلکہ وہ پورا منظر میرے وجود میں کسی اینٹھتے سمندر کی طرح سانسیں لے رہا ہے۔ اور میری آتما ایک بے بس تنکے کی طرح اس سمندر میں غوطے کھا رہی ہے۔ پچھلے تین روز سے کتنی بار یہ منظر آنکھوں میں تصویر ہوا اور پھر اوجھل ہو گیا۔

شام کے سایے ڈوب چکے ہیں۔ سورج پہاڑی کی اوٹ سے کسی دیو کی غضب ناک آنکھ کی طرح گھور رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دیو کی آنکھ بھی جھپک گئی۔ شام کے ملگجے اجالے میں ہنومان مندر کا کلس بھی دکھائی دے رہا ہے۔ اتنے میں مندر کے پیچھے سے کوئی بھاگتا ہوا نکلا اور تیزی سے بائیں طرف دھان کے کھیتوں میں اتر گیا۔ اس کے پیچھے سات آٹھ لوگ لاٹھی بلم لیے نکلے اور پہلے والے شخص کے پیچھے وہ بھی کھیتوں میں اتر گئے۔ پھر وہ نیم دائرے کی شکل میں دوڑتے ہوئے پہلے والے شخص کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔ میں ٹھٹھک کر پیپل کے نیچے رک گیا۔ کھیت کٹ چکے تھے۔ پودوں کی کٹی ہوئی جڑیں کھونٹیوں کی طرح زمین سے سر ابھارے کھڑی تھیں۔ کھیتوں میں دوڑتے لوگوں کو ان کی کھونٹیوں کی وجہ سے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ لوگ برابر دوڑ رہے تھے۔ اب آگے بھاگنے والے شخص کی رفتار سست پڑتی جا رہی تھی۔ کیوں کہ وہ لڑکھڑا لڑکھڑا کر دوڑ رہا تھا۔ شاید اس کا پاؤں زخمی تھا۔ تعاقب کرنے والے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اتنے میں آگے بھاگنے والا شخص کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ اور دم کی دم میں پیچھا کرنے والے اس کے سر پہ پہنچ گئے۔ پھر کسی کی لاٹھی اس کے سر پہ پڑی اور ایک دردناک چیخ دور تک گونجتی چلی گئی۔ کوئی چلایا۔ "زندہ مت چھوڑو۔ مارو ــــــ مار ڈالو"۔

اچانک ان میں سے ایک دو قدم پیچھے ہٹا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے بلم کو تولا اور پوری طاقت سے بلم کی انی گرنے والے کے سینے میں گاڑ دی۔ ایک تیز تڑپتی کراہ کے ساتھ باقی سبھوں کی لاٹھیاں ہوا میں تیرتی رہ گئیں۔ میں نے کانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب کھولیں تو مارنے والا زخمی شخص کے سینے سے اپنے بلم کو کھینچ لینے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ ایک پارہ پارہ خون آلود جسم بلم کے ساتھ ہی نصف

کے قریب اوپر کو اٹھ آیا تھا۔ بلم کی نوک شاید زخمی شخص کی پسلیوں میں پھنس گئی تھی۔ بیک وقت چار پانچ لاٹھیاں ہوا میں لہرائیں اور ایک ساتھ اس انسانی جسم پر پڑیں۔ زخمی شخص کا بے جان جسم کسی لٹھے کی طرح دھپ سے زمین پر گر گیا۔

"کون ہے ادھر؟"

آواز شری کانت کی تھی۔ میں پرانے پیپل کے نیچے یوں کھڑا تھا جیسے میرے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہوں۔ چاروں طرف اب اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

"ارے کوئی بھی ہو۔ جانے مت دو حرام جادے کو۔"

وہ سب لاٹھیاں ٹھک ٹھکاتے میری طرف لپکے۔ اور مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شری کانت میرے قریب آیا۔ جھک کر میرا چہرہ دیکھا۔

"ارے یہ تو شالا ماشٹر ہے۔"

"کیوں ماشٹر اتنے بکھت کو یہاں کیا کرنے کو آیا تھا۔"

"ماشٹر بولو، نہیں تو تمھارا ابھی ادھر ہی کریا کرم ہو جائے گا۔"

کسی نے میری کمر میں لاٹھی کا ٹھوکا دیا۔ میں کیا جواب دیتا۔ میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔

"ماشٹر! بول نہیں تو ابھی بیندھ کر رکھ دوں گا۔ ادھر تو کیا کرنے کو آیا تھا۔"

"نہیں، نہیں دتو! اس کو جانے دو گاؤں کا ماشٹر ہے اس سے باپو بات کریں گے۔" شری کانت بیچ میں آ گیا۔

"مگر اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔"

"کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ شالا ماشٹر سالا، کیا کر سکتا ہے۔"

"تم جاؤ شری کانت! ہم اپنا کام کر چکے۔"

"چلو، ماشٹر صاب! اپنا راستہ ناپو، اور جو کچھ دیکھا اسے بھول جاؤ۔ ورنہ ....."

پھر ایک لاٹھی سے میری کمر میں ٹھوکا دیتے ہوئے کوئی غرایا۔

"چل بھاگ ادھر سے ــــــ سالا ــــــ"

کھٹ، کھٹ۔

"کون ہے؟" میں نے اپنی جلتی آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"کھٹ کھٹ"

"کون ہے آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہے"۔

"دروازہ کھلا اور پاٹل کا خاص نوکر گلاب راؤ میرے سامنے آکھڑا ہوا"۔ گلاب راؤ تھوڑی دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا"۔

"ماشٹر! پاٹل نے کل تیرے کو بلایا تھا۔ کیوں نہیں آیا؟"

"میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیٹے لیٹے گلاب راؤ کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ گلاب راؤ نے آگے بڑھ کر میرا پنڈا چھوا"۔

"ارے، تم کو تو بخار ہے"۔ گلاب راؤ چند سیکنڈ تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "اچھا ماشٹر! میں جاتا ہوں۔ جب بھی طبیعت ٹھیک ہو جائے آجانا۔ میں پاٹل سے بول دوں گا"۔

گلاب راؤ چلا گیا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ پاٹل نے بلایا ہے۔ پاٹل کے گھر تھانے دار آیا ہوا ہے۔ ششی کے قتل کی تفتیش کے لیے۔ پاٹل نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

"تھانے دار صاحب! میں نے خود اپنی آنکھوں سے ششی کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ ہاں، قاتلوں کو میں جانتا ہوں۔ قاتل کوئی اور نہیں۔ آپ جس کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ یہی سب لوگ ششی کے قاتل ہیں"۔

مگر میں یہ سب کہہ پاؤں گا؟

"چلو ماشٹر اپنا راستہ ناپو۔ اور جو کچھ دیکھا اسے بھول جاؤ۔ ورنہ ...." رگھو کہہ رہا تھا

"آج سویرے ششی کی داہ کریا ہوگی۔ بے چارے کا بوڑھا باپ ارتھی کو کاندھا دینے بڑھا اور راستے ہی میں غش کھا کر گر پڑا۔ جوان بیٹے کی ارتھی تو پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ بوڑھے مادھو کی سوکھی ٹانگوں میں اتنی قوت کہاں؟"

میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہو۔ میں نے اپنے خشک گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"رگھو! پانی!!"

رگھو اس اچانک تبدیلی پر بوکھلا گیا۔ لپک کر صراحی سے کٹورے میں پانی انڈیلا اور میرے سر کو سہارا دیتے ہوئے کٹورا میرے منھ سے لگا دیا۔ میں نے دو تین گھونٹ پانی پیا۔ اور سر کو تکیے پر رکھ کر ہانپنے لگا۔

"ماشٹر صاحیب! اب کیسا ہے؟ وید کو بلا کر لاؤں؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ پھر تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لیں۔ چند سیکنڈ بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو رگھو مجھے تشویش آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اب کیسا ہے؟" اس نے دوبارہ گھبرائے لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"رگھو اب تو جا، کافی دیر ہو گئی۔ تجھے ڈھور ڈنگر بھی دیکھنے ہوں گے۔"

رگھو شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اور میرے سامنے ششی کے بوڑھے باپ کا چہرہ گھوم گیا۔ ایک دبلا پتلا شخص، رنگ کچھ دھوپ، کچھ غربت سے سنولایا ہوا۔ سر منڈا ہوا جس سے سفید بالوں کی کھونٹیاں جھانک رہی تھیں۔ آنکھیں گدلی اور منہ قریب قریب پوپلا۔ کپڑوں کے نام پر اس کے چوتڑوں کے درمیان پھنسی ہوئی ایک لنگوٹی اور کاندھے پر ایک میلا سا گمچھا۔

"ماشٹر صاب! ششی آپ کی بہوت عجت کرتا ہے۔ آپ اس کو جرا سمجھا دو۔ وہ آج کل پاٹل سے الجھا ہوا ہے۔"

"کیوں؟"

"کہتا ہے مجوری بڑھا کر دو نہیں تو ہم لوگ کھیت میں کام نہیں کریں گے۔"

"مادھو! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "سبھی کھیت مزدور ششی کے ساتھ ہیں۔"

"نہیں ماشٹر صاب۔ دو چار کو چھوڑ کر کوئی بھی ششی کے ساتھ نہیں ہے۔ پاٹل کے غنڈوں سے سبھی ڈرتے ہیں۔"

"اچھا تم اسے میرے پاس بھیج دو، میں اس سے بات کروں گا۔"

مگر ششی میرے پاس نہیں آیا۔ شاید وہ جانتا تھا۔ مجھ جیسا معمولی، بزدل شالا ماشٹر اس سے کیا کہے گا۔ کیا کہہ سکتا ہے۔

"کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ شالا ماشٹر کیا کر سکتا ہے؟"

واقعی شاید ماسٹر [illegible] سکتا ہے۔ اگر میں تھانے دار کے پاس پہنچ کر خود کو گواہ کی حیثیت سے پیش کر دوں ؟ مگر تھانے دار تو پاٹل کے گھر بیٹھ کر پوچھ تاچھ کر رہا ہے۔ کیا وہ میرا بیان سنے گا۔ اگر سن بھی لیا تو بیان دینے کے بعد کیا ہوگا ؟"

" میں تو بولتا ہوں۔ اس کو بھی خلاص کر دے۔ بعد میں کھٹ کھٹ مت ـــــــ" "ارے نہیں"۔ تم نہیں سمجھتے۔ چلو ماسٹر! اپنا راستہ ناپو۔ اور دیکھو جو کچھ دیکھا اس کو بھول جاؤ ورنہ ....."

میں نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اپنی کنپٹیوں پر دباؤ ڈالا۔ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ کنپٹیوں پر دباؤ ڈالنے سے دماغ میں اٹھتی ٹیسوں میں قدرے کمی کا احساس ہوا۔ جی چاہ رہا تھا کوئی پاس بیٹھا اسی طرح دھیرے دھیرے کنپٹیوں پر دباؤ ڈالتا رہے۔ اور میں تھوڑی دیر کے لئے صرف تھوڑی دیر کے لئے سکون سے آنکھیں بند کیے پڑا رہوں۔ سونے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ پچھلے تین دن سے جاگ رہا ہوں۔ اگر آنکھ جھپک بھی جاتی ہے تو خون میں لت پت ایک انسانی ہیولا سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور پھر چاروں طرف سے اس قدر دردناک چیخیں بلند ہوتی ہیں کہ میں ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں۔

پچھلی رات تو ایک بار اس بری طرح چیخا تھا کہ پڑوس سے رگھو دوڑتا ہوا آیا تھا۔ رگھو کی کاکی بھی ایک ٹوٹی لالٹین لٹکائے جس کی چمنی کالک اور دھوئیں سے پُتی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ کمر پر رکھے ٹٹولتی، ٹھوکریں کھاتی آگئی تھی۔

"ماسٹر ساب، ماسٹر ساب!"

"باہر رگھو زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا تھا۔ میں بڑی مشکل سے چارپائی سے اٹھ پایا۔ لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اور دروازے کی سٹکنی گرا کر دوبارہ چارپائی پر آکر ڈھیر ہوگیا۔

"کیا ہوا ماسٹر ساب، کیا ہوا ؟" رگھو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"کچھ نہیں رگھو ــــــ مٹکے سے تھوڑا پانی پلا دے"۔

کاکی نے بھی میرا پنڈا چھوا اور بولی۔

"ارے رگھوا! ماسٹر کو بہوت تاپ ہے رے!"

رگھو مجھے سہارا دے کر اٹھاتا ہوا بولا۔

"کاکی! میں نے تو سانجھ ہی کو کہا تھا کہ وید سے دوا لے لو۔ مگر ماسٹر ساب نہیں مانتے"۔

میں نے دو گھونٹ پانی پی کر اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چار بج رہے تھے۔ کاکی لالٹین کو

فرش پر رکھ کر اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جھکی ہوئی پر تشویش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں پانی پی کر دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

"ناشتہ! چا بنا کر بھیجوں۔ دو گھونٹ گرم گرم چا پئیں گا تو اچھا لگے گا رے!"

میں نے قریب قریب ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں کاکی! اب رہنے دو۔ سویرا ہوئے کو ہے"۔

"چا پئیں گا تو بہوت فرق پڑے گا رے بابا! میرے پاس ہری چا کی پتی ہے"۔ کاکی لالٹین اٹھا کر دروازے کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔ پھر دو قدم چل کر رکی اور پوچھا۔ "گڑ کی چا چلیں گی نا رے بابا! ساکھر نہیں ہے میرے پاس"۔ میں نے کاکی کو پھر منع کرنا چاہا مگر نہیں کر سکا۔

"چلے گی کاکی! بس ایک پیالی بنانا زیادہ نہیں"۔

"اچھا ——— اچھا ———"

کاکی باہر نکلتی ہوئی رگھو سے بولی۔

"رگھو! تھوڑی دیر سے آکر چائے کر جا ——— ہاں"۔

رگھو فرش پر اکڑوں بیٹھا میرا سر دبا رہا تھا۔ مجھے تھوڑا سا راحت کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر رگھو اور کاکی نہ ہوتے تو شاید اس رات میں اس طرح چیخ چیخ کر بے ہوش ہو جاتا۔ پچھلے تین دن سے رگھو میرے کمرے کے کئی کئی چکر لگا چکا ہے۔ کبھی دوا پلاتا۔ کبھی کاکی کی دی ہوئی ہری پتی کی چائے یا ابلے چاولوں کی پیچ لاکر دیتا۔ سب سے پہلے اس نے مجھے آکر بتایا تھا کہ کچھ نامعلوم لوگوں نے ششی کو ہنومان مندر کے پاس والے کھیتوں میں قتل کر دیا ہے۔ پھر شام میں خبر دی کہ تحصیل سے تھانے دار آیا ہے۔ پنچ نامہ ہو رہا ہے۔ لاش شہر لے جائی گئی ہے۔ تیسرے روز لاش پوسٹ مارٹم کے بعد اس کے بوڑھے باپ مادھو اور اس کی بیوہ کے حوالے کر دی گئی ہے۔ صبح بتایا کہ ششی کی ارتھی اٹھائی گئی ہے۔ اور اسے شمشان میں نذر آتش کر دیا گیا ہے۔ اور ابھی ابھی خبر دے گیا ہے کہ تھانے دار چار سپاہیوں کے ساتھ پاٹل کے گھر میں بیٹھا قتل کی تحقیقات کر رہا ہے۔

"قاتل کے گھر میں قتل کی تحقیقات ———"

یہی سب سوچتے پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب دوبارہ آنکھ کھلی تو دن ڈوب چکا تھا۔ سامنے چار پانچ مرغابیاں تالاب میں ڈبکیاں لگا

رہی تھیں۔ اور دن بھر جنگل میں چرنے والے ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو لوٹ رہے تھے۔ ایک چرواہا یہہ، یہہ، یہہ کی آواز نکالتا، اپنا ڈنڈا بجاتا ریوڑ سے نکلے ایک بچھڑے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرے بدن کی ٹوٹن کم ہو گئی تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ ذہنی تناؤ بھی غائب ہو گیا تھا۔

میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قمیص پسینے سے تر تھی۔ میں اٹھ کر موری کے پاس گیا۔ لوٹے میں پانی لے کر منہ پر پانی کے دو چار چھپاکے دیئے۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ پسینہ خشک ہو چکا تھا۔ مگر بدن اب بھی چپچپا لگ رہا تھا۔ میں نے قمیص اتار دی اور دوسری قمیص پہن لی۔ پھر چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ ذہن میں پھر پچھلے واقعات کے مناظر یوں رینگنے لگے، جیسے اسٹیج سے دھیرے دھیرے پردہ سرکتا جا رہا ہو۔ میں ان واقعات کو بار بار تصور میں دوہرا دوہرا کر مزید پریشان ہونا نہیں چاہتا تھا۔ تین دن سے میں جس کرب ناک عذاب سے گزر رہا تھا۔ وہ میرا ہی دل جانتا تھا۔ مجھے ایک طویل عرصے کے لیے آرام کی ضرورت تھی ـــــ میں نے طے کر لیا کہ میں دو تین مہینے کی چھٹیاں لے کر گھر چلا جاؤں گا۔ اس بیچ چپ چاپ یہاں سے تبادلہ کروا لوں گا۔ اب میرا اس گاؤں میں رہنا، رہ کر کام کرنا بے حد مشکل تھا۔ چھٹی لینے سے پہلے پاٹل سے مل لینا ضروری تھا۔ پاٹل نے دو دو بار مجھے بلوا بھی بھیجا تھا۔ میں تین دن سے جس روحانی کرب سے گزر رہا تھا۔ اس نے میری روح کو چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ اب اس سے زیادہ برداشت کرنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ مجھے جلد ہی اس گاؤں کو چھوڑ دینا ہوگا۔ یا یہاں سے اپنا تبادلہ کروا لینا ہوگا۔ مگر یہ سب اتنی جلدی کیوں کر ممکن ہو سکے گا۔ چھٹی ـــــ ہاں دو تین مہینے کی لمبی چھٹی تو لے ہی سکتا ہوں۔ مگر لمبی چھٹی سے پہلے پاٹل سے مل لینا ضروری ہے۔ اسکول کی چابی بھی تو اس کے حوالے کرنی ہوگی۔ میں دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے اٹھا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آرہے تھے۔ اب داڑھی بنانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کنگھی اٹھائی۔ ادھر ادھر بالوں کو جمایا۔ چپلیں پہنیں اور گھر سے باہر نکل گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں رگھو نہ مل جائے۔ ورنہ اس حالت میں وہ مجھے اکیلے کہیں نہیں جانے دیتا۔ خود بھی ساتھ ہو لیتا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں مکان کے پچھواڑے سے گھوم کر پاٹل کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گھروں میں دیئے جل چکے تھے۔ بعض دوکانوں میں گیس کی بتیاں بھک بھکا رہی تھیں۔ دو ایک جان پہچان والے ملے۔ انھوں نے پرنام کیا۔ میں نے پرنام کا جواب دیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ جب میں پاٹل کے گھر کے سامنے پہنچا تو اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پاٹل کے مکان کے سامنے چھت سے ایک بڑی سی گیس لالٹین لٹک رہی تھی۔ جس کی تیز روشنی سے پورا ورانڈا روشن تھا۔ میں پھاٹک سے داخل ہو کر ورانڈے

میں پہنچ گیا۔ درانڈے میں ایک دری بچھائے پولیس کے چار سپاہی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ غالباً یہ وہی چار سپاہی تھے جو تھانے دار کے ساتھ تحصیل سے قتل کی تحقیق کے لیے آئے تھے۔ میرے درانڈے میں داخل ہوتے ہی ان چاروں نے یکبارگی پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گئے۔ میں درانڈے کے ایک ستون کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ نقاہت کی وجہ سے اتنی سی مسافت ہی میں میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ میں ستون سے ٹیک لگائے ایک منٹ تک سستاتا رہا۔ اتنے میں کہیں سے کتے کے غرانے کی آواز آئی۔ اور اس سے پہلے کہ میں پاٹل کو آواز دیتا ایک بڑا سا کتا غراتا ہوا مکان کے اندر سے باہر نکلا۔ میں نے گھبرا کر آواز دی۔ "پاٹل صاحب!"

کتا مجھ سے صرف دو بالشت کے فاصلے پر کھڑا گردن اٹھائے بھونک رہا تھا۔ اندر سے کسی نے پکارا۔ "موتی —— موتی ——"

اور ساتھ ہی گلاب راؤ باہر نکلا۔ 'موتی —— موتی' گلاب راؤ نے کتے کو پچکارا۔ اور موتی نے بھونکنا بند کر دیا۔ مگر اس کی غراہٹ اب بھی جاری تھی۔ میری جان میں جان آئی۔ گلاب راؤ نے مجھے پہچان لیا۔

"ارے ماسٹر تم ——"

"پاٹل صاحب ہیں گھر میں؟"

"ماسٹر! تم کو دن میں بلایا تھا۔ تم رات میں چلے آئے۔ پاٹل گھر پر ہیں۔ مگر تھانے دار صاحب کے ساتھ کچھ جروری بات چیت کر رہے ہیں۔"

"ارے کون ہے؟ —— کیا بات ہے؟"

درانڈے میں پسر کر بیٹھے ان چار سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے للکارا۔

"کچھ نہیں —— یہ گاؤں کا شالا ماشٹر ہے۔ پاٹل سے ملنے کو آیا ہے۔" گلاب راؤ نے وضاحت کی۔

"اس کو بولو۔ کل آ کر ملو۔ ابھی پاٹل ہمارے صاب کے ساتھ بیٹھا ہے۔ ابھی پاٹل کسی سے نہیں ملے گا۔"

گلاب راؤ میری طرف جھک کر ڈرنے اور ڈرانے والے لہجے میں بولا۔

"حوالدار صاب ہے۔ بڑے صاب کے ساتھ آئے ہیں۔ تم کل سویرے آ کر ملنا ماشٹر پاٹل سے۔ ابھی رات میں کیا کرو گے مل کر؟"

"گلاب راؤ مجھے پاٹل نے بلایا تھا۔ جاکر پاٹل سے کہو، میں آیا ہوں۔ اگر انھوں نے بلالیا تو مل لوں گا۔ ورنہ سویرے آؤں گا"۔

"ارے گلاب راؤ! اس کو بولو، سویرے آکر پاٹل سے ملو۔ نہیں تو صاب غصہ کرے گا"۔

"گلاب راؤ! جاؤ پاٹل کو میرے آنے کی خبر کرو"۔ میں نے حوالدار کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"گلاب راؤ اندر جانے کا نہیں ــــــ" حوالدار گلاب راؤ کو دھمکانے لگا۔

"پر صاب، پاٹل نے ان کو بلایا تھا۔ یہ سچی بات ہے"۔

"ارے بلایا تھا تو کل بھی مل سکتا ہے۔ آخر ابھی کے ابھی ملنے کے لیے یہ ہے کون؟"

"صاب! یہ ہمارے گاؤں کا شالا ماسٹر ہے"۔

"شالا ماسٹر ہے نا، لاڈ گورنر تو نہیں ہے"۔

اتنے میں اندر سے پاٹل کی دھاڑ سنائی دی۔

"کون ہے رے، گلاب!"

شاید پاٹل نے ہماری تکرار سن لی تھی۔ گلاب راؤ لپک کر اندر چلا گیا مونچھوں والا حوالدار مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد گلاب راؤ پھر واپس آگیا۔

"چلو ماسٹر! پاٹل نے بلایا ہے"۔

میں بپھرے حوالدار پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہوا گلاب راؤ کے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ مجھے بغل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں کیروسین کے بڑے بڑے دو لیمپوں کا گدلا گدلا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سامنے ایک صوفہ بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں پر کچھ تصاویر آویزاں تھیں۔

گلاب راؤ مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں تذبذب کے عالم میں کھڑا کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

ایک کیروسین لیمپ کے پاس ہی دیوار پر ٹنگی ایک تصویر میں رام اور لکشمن ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک بھیلنی بیٹھی تھی اس کے سامنے بیروں سے بھری ٹوکری تھی۔ وہ ان دونوں کو بیر کھلا رہی تھی۔ دوسرے لیمپ کے ادھر ادھر دیوار پہ ہرنوں کے دو سر لگے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک دو نالی بندوق ٹنگی ہوئی تھی۔

معاً اپنی پشت پر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں چونک کر پلٹا۔ پاٹل اپنے اونچے پورے ڈیل ڈول کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ان کی نکیلی مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ چہرہ تمتما رہا تھا اور بھویں تن گئی تھیں۔

"اچھا ہوا ماشٹر ـــــ تم آگئے ـــــ بیٹھو"۔ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر خود بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ماشٹر! گلاب راؤ بول رہا تھا۔ تم بیمار تھے"۔

"ہاں پاٹل میں تین دن سے بیمار ہوں"۔

"اچھا ـــــ آچھا ـــــ ٹھیک ہے۔ ماشٹر تم ایک دو مہینے کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ تم کو آرام کی ضرورت ہے"۔

پاٹل کے لہجے سے ہمدردی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ہاں پاٹل! میں بھی یہی کہنے آیا تھا"۔

"کب جا رہے ہو؟"

"سویرے کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ یہ اسکول کی چابی رکھئے"۔ میں نے اسکول کی چابی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے چابی لے لی۔

"اچھا ہے۔ ٹیشن تک گلاب راؤ کو بھیج دوں ـــــ ؟"

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ میں چلا جاؤں گا"۔

"اچھا ماشٹر! چھٹی میں خرچے پانی کے لیے رکھو"۔

پاٹل نے جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ "پانچ سو روپے ہیں"۔

"پاٹل صاحب!" میں جھٹکے سے صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ غصہ، ذلت اور ندامت سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔

"بیٹھو ماشٹر، بیٹھو ـــــ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بیٹھو"۔

"پاٹل صاحب! اب مجھے اتنا ذلیل تو مت کرو"۔ میرے الفاظ میرے حلق میں پھنسنے لگے۔

"ماشٹر! مجھے غلط مت سمجھو، جو کچھ ہوا اس کا مجھے بھی بے حد دکھ ہے۔ مگر یہ چھوکرے کب کسی کی سنتے ہیں۔ اب یہی دیکھو۔ غلطی یہ لوگ کرتے ہیں۔ نبھانا ہم کو پڑتا ہے"۔

پاٹل نے یہ بات کچھ اتنے پرسکون انداز میں کہی۔ جیسے شری کانت اور دتو نے ششی کا قتل

نہ کیا ہو محض پڑوس کی بیری پر ایک آدھ پتھر مار دیا ہو۔ میں چپ رہا۔ یک بیک شسشی کی خون میں ڈوبی لاش میرے آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ میرے کان انسانی چیخوں سے گونج اٹھے۔ اس کا باپ ایک ارتھی کو کاندھا دیئے لڑکھڑاتا چلا جا رہا تھا۔

"پاٹل، مجھے سب معلوم ہے۔ مجھے سب معلوم ہے، اب مجھے جانے دو۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ میں ہلکے ہلکے ہانپ بھی رہا تھا۔

"ماسٹر! پریشان مت ہو، تم سیدھے سادے آدمی ہو۔ تم نہیں جانتے یہ سب ہر جگہ ہوتا رہتا ہے۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ چھوکرے اس حد تک بڑھ جائیں گے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ ان روپیوں کا غلط مطلب مت لو۔ تم دو تین مہینے کی چھٹی پر رہو گے۔ تمھیں روپیوں کی ضرورت ہو گی۔ انھیں رکھو اپنے گاؤں جا کر اپنا علاج بھی کرنا۔"

پاٹل دو قدم آگے بڑھا۔ اس نے وہ لفافہ میری جیب میں ٹھونس دیا۔ مجھے تعجب ہے کہ میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا کیوں نہیں دیا۔

پاٹل نے دروازے کی طرف مڑ کر پکارا۔

"گلاب راؤ!"

گلاب راؤ اندر آیا۔

"گلاب راؤ! ماسٹر کو گھر تک چھوڑ آؤ۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اچھا ماسٹر!——"

پاٹل میرے کاندھے کو تھپتھپاتا ہوا الٹے قدموں لوٹ گیا۔ میں بیچ کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ گلاب راؤ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ "چلو ماسٹر!"

اور میں سحر زدہ سا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ ورانڈے سے گذرتے ہوئے پیچھے —— سے حوالدار کی آواز آئی۔

"گلاب راؤ! کدھر؟"

گلاب راؤ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے شاید پلٹ کر انھیں اشارے سے کچھ کہا۔ چاروں حوالدار ہی۔ ہی، کر کے ہنسنے لگے۔ میں پھاٹک سے باہر نکل آیا۔ گلاب راؤ اب میرے ساتھ آ گیا تھا۔

"کیا ماسٹر! کیا بولا پاٹل نے —— ؟"

میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی ۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔
یوں چلتے چلتے رک گیا۔

"گلاب راؤ، تم واپس جاؤ ـــــــ میں چلا جاؤں گا گھر ـــــــ"

"ارے نہیں ماشٹر! چلو میں گھر تک چلتا ہوں"۔

"میں نے کہا نا ـــــــ میں چلا جاؤں گا۔ میری فکر مت کرو۔ میں ٹھیک ہوں"۔

"میں واپس گیا تو پاٹل غصہ ہوگا ماشٹر"۔

"نہیں ہوں گے ـــــــ ان سے کہہ دینا میں نے واپس کر دیا ہے"۔

گلاب راؤ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا سا کھڑا رہا۔ پھر کاندھے اچکاکر بولا "تمھاری مرضی ماشٹر!"

اور مڑ کر پاٹل کے مکان کی طرف چلا گیا۔

جب اس کی شبیہہ تاریکی میں ڈوب گئی تب میں بھی دھیرے دھیرے ایک طرف کو چلنے لگا۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ گلیوں کے نکڑوں پر گرام پنچایت کے لیمپ پوسٹ بیمار بڈھوں کی طرح کپکپاتے کھڑے تھے۔ مکانوں کی چمنیوں اور اولتیوں سے دھواں نکل نکل کر ماحول کو گدلا کر رہا تھا۔ میں کچی سڑک پر بکھرے پتھروں سے بچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اپنے آپ میں ڈوبا، خیالوں میں گم۔

کل سویرے سورج نکلنے سے پہلے میں گاؤں چھوڑ دوں گا۔ رگھو سے رات ہی میں کہہ دوں گا۔ بہت دکھ ہوگا اسے ـــــــ نہیں اس سے یہ نہیں کہوں گا میں اس گاؤں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں ۔ ورنہ رو رو کر مجھے پریشان کر دے گا۔ نہیں اب میں اس گاؤں میں نہیں رہ سکتا۔ اس گاؤں کی ہر کھڑکی سے شری کانت اور دتو کے چہرے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر دیوار سے ششی کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ششی کی آخری چیخیں دوبارہ کانوں میں بجنے لگیں۔ اس کا بلم سے پھدا جسم نظروں کے گھیرے میں چھٹپٹانے لگا۔

اف، کیا اب اس منظر سے، ان چیخوں سے میں کبھی پیچھا نہ چھڑا پاؤں گا؟

اچانک مجھے ایک ٹھوکر لگی ۔ میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں چونک کر رک گیا۔ میں ششی کے جھونپڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے جھونپڑے کے سامنے ایک قندیل جل رہی تھی۔ دروازے کے سامنے دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ جن پر چار پانچ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اندھیرے میں ان کی صرف کالی کالی پرچھائیاں نظر آرہی تھیں۔ انھیں میں کوئی ششی کا باپ مادھو بھی ہوگا۔ ششی کے جھونپڑے کے اندر بھی ایک چھوٹا سا دیا ٹمٹمارہا تھا۔ دیئے کی روشنی میں اندر بھی دو تین عورتیں گٹھریاں سی بنی

بیٹھی تھیں۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا چارپائی پر بیٹھے لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی باتیں بند ہو گئیں۔ جب میں بالکل ان کے قریب پہنچ کر رک گیا تو ایک آواز آئی۔

"کون ہے؟"

انھوں نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں تھا۔ میں چپ رہا۔ ان میں سے ایک شخص اٹھا۔ دروازے میں ٹنگی لالٹین لے کر میرے قریب آیا۔ لالٹین کو چہرے تک اٹھا کر میرے چہرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"کون ہے کاشیا!"

غالباً یہ سوال مادھو نے ہی پوچھا تھا۔

"شالا ماشٹر!"

"ماشٹر ———" تھوڑی دیر تک سب چپ رہے۔ پھر کوئی بولا۔

"ادھر آؤ، ماشٹر ادھر آؤ ———"

چارپائی پر بیٹھے سبھی لوگ کھڑے ہو گئے۔ میں نے مادھو کو پہچان لیا۔ مادھو اپنی چارپائی پر سے اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مادھو ——— بیٹھو ———"

"تم بھی بیٹھو ماشٹر ———"

"میں بیٹھ رہا ہوں۔ میں بیٹھ رہا ہوں۔"

کہتا ہوا میں اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ کھڑے تھے۔ مادھو بھی اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا اس کا جسم پتنگ کی طرح کانپا۔ اور وہ پچاس ساٹھ برس کا بوڑھا شخص بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے جھک کر اس کے لرزتے کانپتے کاندھے تھام لیے۔ مادھو تھوڑی دیر تک اسی طرح پھپک پھپک کر روتا رہا میں بت بنا اسے دیکھتا رہا تھوڑی دیر بعد مادھو اپنے کاندھے پر پڑے گمچھے سے آنکھیں اور ناک صاف کرنے کے بعد بولا۔

"کھلاس ہو گیا ماشٹر! سب کچھ کھلاس ہو گیا۔"

"مادھو ———" میں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر میری بزدلی نے پھر میرا گلا دبا دیا۔ اور میں کھانسنے لگا۔ کھانسنے لگا تو کھانستا ہی چلا گیا۔

" مادھو! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تین دن سے بخار ہے۔ کل سے چھٹی پر جا رہا ہوں۔ سوچا جانے سے پہلے تم سے مل لوں"۔

کاشیا لالٹین کو قریب کی ایک اینٹ پر رکھے کھڑا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ہمارے سائے ہماری جسامت سے دس گنا بڑے ہو کر جھونپڑے کی دیوار پر لرز رہے تھے۔ چاروں طرف ایک عجیب ماتمی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں سب چپ چاپ بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ کیسٹروں کی کرکرا اور کبھی کبھی پتوں کی سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے اندر ایک عجیب سی ندامت ایک عجیب سی بے اطمینانی محسوس کی۔ آخر میں تھوڑی دیر بعد چارپائی سے اٹھتا ہوا بولا۔

" اچھا مادھو! میں چلتا ہوں۔ مجھے سویرے سوا پانچ کی گاڑی سے اپنے گھر جانا ہے"۔

" اچھا ماسٹر!" مادھو نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں پاس ہی سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ جھونپڑے کے سامنے چھجے کی کڑیوں سے ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ بچے کے رونے کی آواز اس جھولے میں سے آ رہی تھی۔ کاشیا نے ہاتھ بڑھا کر جھولے کو دو تین جھٹکے دیئے۔

بچے کا رونا رک گیا۔

" نشتی کا بچہ ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"ہاں ـــــ" کاشیا نے جواب دیا۔

میں اٹھ کر جھولے کے قریب گیا۔ سن کے بورے کے چاروں سروں کو چار الگ الگ رسیوں سے باندھ کر رسیوں کے چاروں سرے چھجے کی کڑیوں میں باندھ دیئے گئے تھے۔ میں اندھیرے کے سبب بچے کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ مگر اتنا اندازہ ہو گیا کہ ایک دس گیارہ مہینے کا تندرست بچہ جھولے میں سویا ہوا ہے۔

میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا ـــــ اور ـــــ اس دوران سب کی نظریں بچا کر پاٹل کا دیا ہوا پانچ سو روپے کا پاکٹ اس کے پنگوڑے میں ڈال دیا

پھر میں تیزی سے مڑ کر بولا۔

" اچھا ـــــ مادھو، اب میں چلتا ہوں"۔

" ماسٹر آدھی پیالی چا تو پی کر جاؤ ـــــ"

" نہیں مادھو دیری ہو جائے گی۔ پھر کبھی ـــــ سویرے جلدی اٹھنا ہے۔ اچھا ـــــ"

میں مادھو اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے ہاتھ ملا کر تیز تیز قدم اور بھاری من کے ساتھ اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔ □

علی حیدر ملک
پاکستان

اُتھلے جل کی مچھلی

سارا شہر کرفیو کا کفن اوڑھے سو رہا تھا۔

رات بہت ڈراؤنی اور پر اسرار ہو گئی تھی۔ ہر چیز سانس روکے۔ دم بخود تھی،۔ اس بھید بھری خاموشی میں صرف بوٹوں کی آواز وقفے وقفے سے ڈنکے کی چوٹ کی مانند بلند ہوتی اور پھر رفتہ رفتہ کہیں تحلیل ہو جاتی۔ اچانک ایک انسانی چیخ ابھری اور خوف و احتیاط کے سارے پردے چیر کر گلی گلی بین کرنے لگی۔

میں نے تکئے سے سر اٹھا کر پہلے آواز کی سمت متعین کی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس سمت میں چلنے لگا جدھر سے چیخ کی آواز آئی تھی۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد وسوسے کی سنگینوں نے مجھے چاروں طرف سے آگھیرا ——

اگر کسی نے اس گھور اندھیرے کے باوجود میرا اٹھا ہوا سر دیکھ لیا۔ یا میرے وجود کی آہٹ محسوس کر لی تو؟ ——

انجام کا تصور زیادہ مشکل نہیں تھا۔

انجام کا خیال آتے ہی میں نے اپنا سر نیہوڑا لیا اور زمین پر جھک کر کسی زخمی جانور کی طرح گرتے لگا۔ خوف کی چیونٹیاں اب بھی میرے اندر رینگ رہی تھیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے زمین پر رکھ کر پاؤں پیچھے کی طرف پھیلا دیئے اور زمین کے سینے سے سینہ ملا کر آگے بڑھنے لگا۔

گدلے تالاب کے اس پار بانس کی جھاڑیوں کے درمیان گھری جھونپڑی سے چیخیں اب بھی رہ رہ کر ابھر رہی تھیں۔

جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا —— دروازہ کھلا تھا۔ اور عین دروازے کے سامنے ایک دبلا پتلا سا آدمی ایستادہ تھا جس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی دھول اڑ رہی تھی۔ اس کی پشت پر دو لڑکیاں تھیں۔ خوف زدہ ہرنیوں کی طرح سہمی اور دبکی ہوئی اور ان کے پیچھے سراسیمگی کی تصویر بنی ایک ادھیڑ عمر کی عورت۔ ان سے ذرا ہٹ کر دونوں جوان پستول تانے کھڑے تھے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی دبلے آدمی کی آنکھوں میں امید کا سورج طلوع ہوا مگر دونوں نوجوانوں کے چہرے پر ناگواری کے سانپ لہرانے لگے۔

"تم یہاں کیسے آمرے ہو؟"—— ایک نوجوان نے بارود بھری آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنے آیا ہوں۔" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم ہ؟"—— دوسرا نوجوان مکروہ سی ہنسی کے ساتھ بولا—"ہم ان لڑکیوں کو لینے آئے ہیں۔" ہرنیوں کی مانند سہمی ہوئی لڑکیاں تیز ہوا کی زد پر آئے ہوئے درخت کی کمزور کچی شاخوں کی مانند تھر تھرانے لگیں۔

"لیکن میں تمھیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" میں نے اپنے اندر کی ساری قوت اور سارا اعتماد سمیٹ کر کہا۔

"یہ غدار کی لڑکیاں ہیں اور ہمارے لئے مالِ غنیمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تمھیں ان سے کیا واسطہ؟" ایک نوجوان نے اپنی پستول کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم شاہی قبیلے کے فرد ہو اور یہ غدار ماہی قبیلے کا آدمی ہے...." دوسرے نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں شاہی قبیلے کا فرد نہیں ہوں"—— میں نے سختی سے اس کی تردید کی۔

"تم شاہی قبیلے کے نہیں ہو پھر بھی تمھارا تعلق اسی قبیلے سے بنتا ہے۔ ماہی قبیلہ تمھارے اور شاہی قبیلے کے خلاف ہے اس طرح ....."

"میں کسی قبیلے کا نہیں ہوں۔ کوئی قبیلہ میرا نہیں ہے"—— میں نے بلند آواز میں کہا—"یا میں ہر قبیلے کا ہوں۔ ہر قبیلہ میرا ہے—— مگر کان کھول کر سن لو۔ میں تمھیں وہ ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ جو تم قبیلے کے نام پر کرنا چاہتے ہو۔"

"غدار!"—— ان میں سے ایک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں تمھیں اس غداری کا مزا چکھاتا ہوں۔" دوسرا نوجوان پستول لہراتا ہوا آگے بڑھا مگر قبل اس کے کہ وہ مجھے گولیوں کا نشانہ بنائے میں نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں نے دیکھا دبلے پتلے آدمی نے بھی دوسرے نوجوان کو دبوچ لیا تھا—— دونوں لڑکیوں نے شیرنی کی طرح جھپٹ کر نوجوانوں کے ہاتھوں پر جن میں انھوں نے پستول پکڑی ہوئی تھی اپنے دانت گڑو دیئے۔ وہ دونوں اچانک چیخ پڑے اور ان کے ہاتھوں سے پستولیں تقریباً ایک ساتھ ہی زمین پر گر پڑیں۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ جانے کے بعد ان کا سارا دم خم ہوا ہو گیا اور وہ غصے اور نفرت سے مجھے گھورنے لگے۔

"فوراً یہاں سے دفعان ہو جاؤ اور پھر کبھی بھولے سے بھی اِدھر کا رخ نہ کرنا"—— میں نے کہا وہ دونوں اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے سہلاتے، دانتوں کو پیستے، دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں کہیں ڈوب گئے۔

دُبلا پتلا آدمی آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

" میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔" اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور گردن جیسے کسی بوجھ سے دبی جارہی تھی۔ " یہ میری بہن ہے ـــــ اس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا ـــــ " اور یہ میری بیٹی" اس نے دوسری لڑکی کی جانب انگلی اٹھائی دونوں لڑکیوں نے ایک لمحے کو میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔

اچانک موسم تبدیل ہو گیا۔ طوفان کا رُخ اب دوسری سمت میں تھا۔ ہر طرف آہ و بکا اور نالہ و شیون کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ بارود اور انسانی خون کی بو پھیل رہی تھی۔ میں نے کئی دن تک سورج کی روشنی اور آسمان کی نیلاہٹ نہیں دیکھی۔ اور پھر ایک دن طوفان میرے دروازے پہ دستک دینے لگا۔

" تم غدار ہو۔ تم نے ہمارے قبیلے کے خلاف سازش کی ہے۔"

" تم دلال ہو۔ تمھیں دلالی کی سزا بھگتنی ہوگی۔"

میں گم سم کھڑا رہا۔ میں نے کسی کے خلاف سازش اور کس کی دلالی کی تھی، مجھے معلوم نہ تھا۔

" چپ کیوں کھڑے ہو؟"

" چلو۔ اسے غداروں کی آخری آرام گاہ میں لے چلو۔"

" نہیں۔ تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اس نے کوئی دلالی، کوئی سازش نہیں کی۔" تالاب کے اس پار رہنے والے دبلے پتلے شخص نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا جیسے کہیں دور سے دوڑ کر آرہا ہو۔

" اس نے ہمارے دشمنوں کا ساتھ دے کر ہم سے غداری نہیں کی؟"

" نہیں۔ اگر یہ ایسا کرتا تو آج میں تمھیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

جب طوفان ٹل گیا تو میں نے اس آدمی سے کہا ـــــ " تم مجھے کب تک اس طوفان سے بچا سکو گے اس نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔ آج نہیں تو کل مجھے پھر آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔"

اس نے اپنی زبان بند رکھی اور قدموں کو حرکت دی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ قدم اٹھائے اور ہم دونوں بانسوں کے جھنڈ کے درمیان تالاب کے کنارے آکر کھڑے ہو گئے۔ رنگ برنگی مچھلیاں تالاب میں اِدھر سے اُدھر دوڑ لگا رہی تھیں۔ اس نے مچھلیوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

" یوں تو ایک سے ایک مچھلیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ سلیمانی مچھلیاں پسند ہیں۔" وہ چلا گیا ـــــ اور جب دوبارہ آیا تو اس کا سارا وجود رُسوائیوں کے داغ سے لہولہان تھا۔

" کیا ہوا؟ تمھیں کس سانپ نے ڈس لیا؟"

"آستین کے سانپ نے۔"

"آستین کے سانپ نے؟"

"ہاں! طوفان اب بگولا بن گیا ہے۔ کوئی گھر اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس اندھے طوفان نے مجھے میری ماں جائی اور میرے خون کے پیکر سے جدا کر دیا ہے..... وہ لوگ میری بہن اور بیٹی کو....."

"لیکن وہ تو تمھارے اپنے قبیلے کے....."

"پاگل کسی کو کب پہچانتے ہیں....." اسے چپ سی لگ گئی۔

"کیا تم نے شاہی قبیلے میں جانے کا واقعی فیصلہ کر لیا ہے؟" اس نے ذرا ٹھہر کر سوال کیا۔

"ہاں! یہاں تو اب اپنا سایہ بھی خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔"

"میں بھی اس قبیلے کو خیر باد کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟" تالاب کے کنارے آکر مچھلیوں کو گھورتے ہوئے اس نے بڑی حسرت کے ساتھ پوچھا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تمھیں تو سلیمانی مچھلیاں پسند تھیں....." میں اس سے کہنا چاہتا تھا ــــ "میں بھی ایل مچھلیوں کا پرستار ہوں لیکن..."

لیکن میں خاموش رہا اور نظریں پانی پر جما دیں ـــ مبادا اس کے ہاتھ سے موہوم سا وہ آخری تنکا بھی چھوٹ جائے جسے حرزِ جاں بنائے ہوئے میں اب تک زندہ تھا۔ ☐

ایس۔ این۔ شاہ

دمینس یالی ٹکنیک
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کہانی

یہ جو میری بیوی ہے ان دنوں ایک نو عمر لڑکی تھی اور لوگ کہتے ہیں کہ بہت آوارہ تھی۔ اس کی ماں ایک بدکار عورت تھی اور اس کی ماں کی ماں ——— اب بھئی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ خیر ———

تو ان ہی دنوں وہ ایک روز اپنے ساتھی لڑکوں کے ساتھ پکنک پر گئی۔ بھری برسات تھی۔ آسمان پر دور دور تک بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ہلکا ہلکا سا ٹھنڈا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

وہ اور اس کے دوست چاروں لڑکے اپنی ٹوٹی پھوٹی موٹر میں پوں پوں والا ہورن بجاتے دیہات کی کچی پکی سڑک پر ہچکولے کھاتے قہقہے لگاتے چلے جا رہے تھے۔ دور دور تک پھیلے کھیتوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور ان میں کہیں کہیں ایک ایک دو دو بگلے چل پھر رہے تھے۔

ایک جگہ جب کیچڑ میں موٹر کے پچھلے پہیے دھنس گئے تو وہ ٹھپ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ داڑھی والے نے انجن کی چابی نکال کر جیب میں ڈالی اور ربڑ کا گولہ زور زور سے دبا کر ہورن بجایا اور اعلان کیا کہ بھائیو اب گاڑی آگے نہیں جائے گی اترو اور اپنا اپنا مال اسباب اپنے کندھوں پر رکھ کر اپنے پیروں پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو کہ پکنک اسپاٹ ابھی کچھ دور ہے۔

زمبو نے اتر کر سینہ پھلایا، پیلیٹ کسی اور دونوں پیر چیر کر کھڑا ہوا ایک جھٹکے کے ساتھ دری اور گول تکیوں کا گٹھر اپنے کندھے پر رکھا اور ہاتھ میں کھانے سے بھرا کیس لے کر آگے آگے ہو لیا۔ ورزش سے اس کا جسم کسا ہوا تھا۔ وہ جمنیزیم کا رسیا تھا اور اکثر خواب میں زبسکو سے کشتی لڑتا تھا۔

اس کے پیچھے گھنگھریالے بالوں والا لانبا خوبصورت دیوتا چلا پھر معلے خاں اور داڑھی اور سب سے آخر میں نزاکت سے پیر دھرتی موری۔

کھیتوں کی منڈیروں پہ چڑھتے اترتے ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہنستے بولتے وہ ایک چھوٹے سے میدان میں پہنچ گئے۔ اس کے ایک کنارے پر زمین ذرا اونچی سی تھی اور اس پر کسی کسان نے جاڑوں میں کھیت رکھانے کے لئے کچی پکی سی جھونپڑی بنائی تھی جو اب خالی پڑی تھی۔ جھونپڑی

کے پیچھے آم کا باغ تھا۔ گہرے سبز پتوں میں ادھ پیلے گدرائے آم جھول رہے تھے۔

موربی نے داڑھی سے کہا۔

"ہائے رام ——"

داڑھی نے کہا

"اوش —— جاؤ تو یار معالے خاں —— یہ لو روپے —— وہ سفید بھیلائے لو ——"

معالے بھیلائے کو باغ کی طرف کٹ گیا۔

پہلوان بوجھ اٹھائے آگے آگے چل رہا تھا۔ اور پیچھے دیوتا اپنے آپ میں مگر سنبھال سنبھال کر قدم رکھ رہا تھا۔ آگے بڑھ کر نم زمین پر وہ پھسلی تو داڑھی نے بڑھ کر بازو تھام لیا۔ پھر اس کا ہاتھ اس کی کمر کی طرف پھسلنے لگا۔ لڑکی نے اس ہاتھ ہٹایا اور آگے آگے چلنے لگی۔

کچھ آگے جا کر نیم کے درخت کے نیچے انھوں نے اپنا ڈیرہ جمایا دری بچھائی اس پر نائلون کا بڑا سا کور اور گول گول کشن بیچ میں راجہ اندر بن کے بیٹھا۔ بوتل نکالی گئی۔ گلاس سجائے گئے۔ اور خوش گپیاں شروع ہوئیں

لڑکی نے پنچ کیس کھول کر پلیٹیں نکالیں۔ تولیے سے پونچھ پونچھ کر پلاسٹک کے ٹیبل کلاتھ پر قرینے سے رکھی کھلانے کا سامان نکالا۔ اور اسٹوو جلا کر فرائی پان میں مچھلی کے قتلے تلنے لگی۔ سینکڑوں ہزاروں سال سے یہی ریت چلی آتی ہے ان کی ماؤں نے ان گنت پیڑھیوں سے ان کے دسترخوان سجائے ہیں۔ ان کی پیاس بجھائی ہے۔ اور ان کی اولاد کو جنم دیا ہے۔

وہ پیتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے جھگڑتے رہے۔ جب ذرا زیادہ چڑھی تو سب سے پہلے پہلوان آپے سے باہر ہوا۔ لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔

"یہ کیا معاملہ ہے بھائی —— ہم بھی تو ہیں ——" پٹھان بھی قریب آگیا وہ پیچھے کھسکنے لگی تو وہ قہقہے لگانے لگے۔

"ارے کھا تو نہیں جائیں گے کبھی —— بیٹھی بھی رہو —— اس نے پلیٹیں ان کے ہاتھوں میں تھمائیں اور کھانے کی ڈلیں آگے سرکائیں وہ کھانا نکالنے کھانے لگے۔

دیوتا اپنی پلیٹ ہاتھوں میں لئے اٹھ کر لڑکی کے قریب آیا اور اپنا منہ اس کے رخسار کے قریب لا کر لڑکھڑاتی زبان سے پوچھنے لگا۔ "اور تم —— تم —— کیا کھا —— کھا رہی ہو"

"چاول اچار یہ —— اپنے چمچے سے چاولوں میں اچار ملاتے ہوئے کہا۔

"ہا ہا سویٹ ——"

"سویٹ —— ارٹ ٹیسٹی" داڑھی بھی جھومتے ہوئے بولا۔ یار معاملے خان اور لو تھوڑی سی —— نونا بھئی"

دھیرے دھیرے سرخ وحشت ان کی آنکھوں میں تیرنے لگی۔ ان کے قہقہوں میں جانوروں کی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ معاملے زیادہ پی کر ناچنے لگا۔ پھر سب سے پہلے موٹر کا مالک داڑھی جھومتا ہوا اٹھا۔

"آؤ ذرا وہاں —— وہاں تک گھوم آئیں —— آئیں" ہاتھ پکڑ کر اس نے لڑکی کو اٹھایا۔

"ارے بارش آرہی ہے"

باریک بوندوں کا جھرنا برسنے لگا۔

"آنے دو —— آنے دو —— وہ ہنسا۔

ہا ہا ہا —— خا خا خا —— خی خی خی —— وہ سب ہنستے ہی جا رہے تھے۔

بوندیں بڑھنے لگیں۔ بارش تیز ہوگئی۔ وہ سامان ہاتھوں میں اٹھائے دری کو کھینچتے ہوئے نیم کے نیچے بھاگے۔ بارش اور تیز ہونے لگی۔ نیم بھی برسنے لگا۔ تو وہ سامان اٹھائے بھیگتے ہوئے جھونپڑی کی طرف بھاگے۔

وہاں پہنچتے پہنچتے وہ بالکل بھیگ گئے۔ اپنے رومالوں سے اپنا چہرہ اور سر پونچھا پتلونوں کے پائنچے نچوڑے۔ اور جھونپڑی کے اندر دیکھنے لگے۔ پتلے سے چھپر کا پھوس جگہ جگہ سے ادھڑ گیا تھا۔ اور کچی پکی ٹیڑھی میڑھی دیواریں تھیں۔ تیل کا دیا رکھنے کے طاق پر لو کے دھوئیں کا سیاہ نشان ماتھے کے ٹیکے کی طرح اوپر کی طرف کھنچا ہوا تھا

"دیکھو —— وہ جگمگاتا میرا ستارہ ہے —— جس دن وہ ڈوب جائے گا —— میں بھی ڈوب جاؤں گا"

یکایک روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں —— بجلی کا ایک کوندا ان کے بالکل ان کے سر پر سے تڑپتا گرجتا آسمان کے کنارے تک نکل گیا۔

لڑکی اور دیوتا دونوں کے منہ سے ایک ساتھ ہلکی سی چیخ نکلی۔ ایک لمحے کے لئے خاموشی ہوئی پھر ایک زبردست دھماکا ہوا اور ایک بھاری سا گولہ گھڑگھڑاتا ہوا بادلوں

کے اوپر لڑھکتا چلا گیا۔ بارش سے بھیگتے کھیتوں میں دور تک اس کی گونج ٹھوکریں کھاتی مدھم ہوتی چلی گئی۔

پھر ایک ایک لمحے بعد بجلی ایک تیز چمکتے سانپ کی طرح بالکل ان کے سروں پر تڑپنے لگی مچلنے لگی۔ گرج سے ان کے کان گنگ ہونے لگے وہ ڈرے کھڑے تھے۔

پھر دو چار لمحے کے لئے سکون ہوا تو پہلوان نے ایک لمبا سانس لیا۔ دیوتا نے کہا

"دیکھا تم ــــــ خدا کی پناہ ــــــ میری ماں کہتی تھی کہ جب آسمان پر بجلی تڑپتی ہے تو اسے ڈھونڈھتی ہے جس کا وقت آگیا ہے ــــــ ہاں ڈھونڈھ ہی نکالتی ہے ــــــ"

ایک لمحے کے لئے روشنی پھیلی اور پھر غائب ہوگئی اور اس کے بعد ایک بھاری گرج بادلوں سے گونجتی دور تک نکل گئی۔ پھر ایک زبردست دھماکہ ہوا اور وہ سہم کر ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور کچھ بولنے ہی والے تھے کہ پھر بالکل ان کے سروں پر سے بجلی کڑکتی چنگاڑھتی گذر ی۔ بارش سے اندھیرا سا ہو گیا تھا۔

دیوتا نے چیخ کر کہا

"وہ کون ہے بابا ــــــ نکل جاؤ یہاں سے ــــــ نکل جاؤ خدا کے لئے ــــــ"

وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

پہلوان نے لڑکی کو کھینچ کر باہر دھکا دے دیا

"نکل کمبخت ــــــ نکل جا"

"ارے ــــــ ارے" وہ گھگھیائی۔ پھر اندر آنے لگی۔

انھوں نے اسے پھر دھکا دینے کے لئے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے

"چلی جا ــــــ چلی جا" وہ سب چیخے

وہ سہمی گھبرائی بھیگتی پھسلتی نیم کے درخت کی طرف بھاگی۔ جیسے ہی وہ نیم کے درخت کے نیچے پہنچی

یکلخت بجلی بڑے زور سے چمکی بادلوں کو چیرتی ہوئی زبردست آواز نکلی تڑا ــــــ تڑا ــــــ تڑا ــــــ تڑا آسمان سے زمین تک آگ کی ایک لکیر کھنچ گئی جھونپڑی ایک لمحے کے لئے شعلہ بن گئی۔ دیواریں بکھر گئیں اور چھپے میں سے دھواں اٹھنے لگا ــــــ

یہ جو میری بیوی ہے ان دنوں ایک نو عمر لڑکی تھی اور لوگ کہتے ہیں ــــــ □

ناظمہ منزل، دودھ پور، علی گڑھ

طارق چھتاری

کھوکھلا پہیہ

"ہم تو خدا کے بنائے ہوئے پہیے ہیں، کھوکھلے پہیے۔۔۔۔ جس طرح وہ چاہتا ہے ہمیں گھماتا ہے اور اگر ہم گھومنے سے انکار کریں۔۔۔۔ انکار؟ انکار کیسے کر سکتے ہیں، ہمیں تو گھومتے ہی رہنا ہے۔ خدا پر اتنا اعتماد؟ اعتماد کیوں نہ ہو، رزق بھی تو وہی دیتا ہے۔۔۔۔!!" ہر شام دھندے پر نکلنے سے پہلے وہ یہی سوچتا۔

اس نے لونی لگی دیوار میں ٹنگی کھونٹی سے پرانے جھولے کو اتارا اور اپنے دھندے کے اوزاروں کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ ہتھوڑی، چھینی، سنڑاسی، چھوٹی سی کدال اور ایک آنکڑا۔ سب ٹھیک ہے۔۔۔۔ سب ٹھیک تھا مگر ایک بار پھر اس نے جھولے میں جھانک کر دیکھا۔ غروب ہوتے سورج کی مدھم روشنی میں اسے اپنے اوزار دکھائی دیئے۔ آنکڑا منھ اٹھائے اسے تک رہا تھا، اسے محسوس ہوا کہ آنکڑا اس کی قمیص کے دامن میں پھنس گیا ہے۔۔۔۔ وہ سہم گیا اور جلدی سے جھولا بند کر دیا۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے نا، اسی لئے آنکڑے سے ڈر جاتا ہے۔

وہ دھندے پر جا رہا ہے۔ اس کی بغل میں جھولا اور ہاتھ میں پتلی چھڑی ہے۔ اسے کدھر جانا ہے اسے کیا معلوم، ابھی دو چار گاؤں یونہی بھٹکے گا پھر آدھی رات ہو جائے گی، کام بن گیا تو ٹھیک ورنہ صبح ہوتے ہوتے گھر واپس ــــ گھر؟ گھر تو بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا تھا۔ تو کیا ہوا ہے تو گھر ہی۔۔۔۔!! اسے دور کوئی چیز چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ کچھ قریب پہنچا تو دیکھا ایک چھوٹا سا بلب چمک رہا ہے۔ یہ تو پہیہ ہے۔۔۔۔ پہیہ نہیں گاڑی ہے ایک بچے نے دو پہیوں میں ڈنڈا باندھ کر گاڑی بنا رکھی تھی۔ دونوں پہیوں کے بیچ میں دو سیل کھپچیوں میں لپیٹ کو رکھ دیئے تھے اور بلب سے تار میں بلب لگا کر ڈنڈے میں لٹکا دیا تھا۔" واہ رے خدا سچ مچ ہم کھوکھلے پہیے ہیں، تو جس طرح چاہتا ہے ہمیں گھماتا ہے۔" اسے یاد آیا بچپن میں بنجاروں والے کوئیں پر اسے ایک پہیہ ملا تھا جو بالکل کھوکھلا تھا۔ یہ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کھوکھلا کیوں تھا۔ اس نے دیکھا بچہ آہستہ آہستہ اس گاڑی کو چلا رہا ہے۔ ارے اس میں تو لو ہے کے دو تار بھی بندھے ہیں۔ اس نے غور سے دیکھا بچے نے ایک

تار کھینچا گاڑی کے دونوں پہیے ایک جانب مڑ گئے، دوسرا تار کھینچا تو گاڑی رک گئی، یہ بریک تھا۔۔۔۔ اتنا آہستہ چلانے پر بھی بریک کی ضرورت؟ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی ــــ کیا اسے سمجھنے کے لئے بچہ بننا پڑے گا؟ مگر کیوں۔۔۔ کیا وہ کبھی بچہ نہیں تھا۔ بچپن میں جب وہ کھیت پر بابا کو روٹی دے کر زنگ آلود لوہے کے کھوکھلے پہیئے کو مکا کے ٹھیٹھرے سے ڈھکیلتا بہت تیز دوڑتا ہوا گھر واپس آتا تھا تو اس کے پہیئے کو نہ تو کہیں بریک کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی وہ اتنا دھیمے چلتا۔ اگر کبھی وہ آہستہ چلانے کی کوشش بھی کرتا تو پہیہ دو چار چکر لے کر گر جاتا۔ وہ پہیئے کے سہارے کتنی جلدی گھر واپس آجاتا تھا۔ وہ جب تھوڑا بڑا ہوا تو اس کے بعد کی نسل نے مکا یا سرکنڈے کے ٹھیٹھرے کے بجائے لوہے کے آنکڑے بنالئے تھے اور سب پہیئے دھیمے دھیمے چلنے لگے تھے، جب وہ جوان ہوا تو پہیوں میں آنکڑے اس طرح جڑ دیئے گئے کہ پہیئے اپنی رفتار کھو بیٹھے اور اب جب کہ وہ بوڑھاہے موڑنے اور بریک لگانے کے لئے تار بھی کس دیئے گئے ہیں۔ اب اسے پہیوں سے نفرت ہوتی لگی ہے پہیوں سے ہی کیوں قصبے کی زمین سے اگتی ہوئی نئی نئی بلند عمارتوں سے بھی اسے نفرت ہے۔۔۔۔!!

جب عمارتیں کم تھیں تو پہیئے تیز چلتے تھے اور جب پہیئے تیز چلتے تھے تو اس کا دھندا بھی اچھا چلتا تھا۔ جب وہ تمام دھندوں سے تھک گیا تبھی شکور تیلی مرا اور اس نے اپنا نیا دھندا شروع کیا ــــ شکور تیلی کی قبر کھود کر تختہ ہٹایا اور کفن کھینچنے کے لئے آنکڑا ڈالا تو اس میں سے کتنا قیمتی کپڑا نکلا تھا ــــ اور پھر آہستہ آہستہ وہ کفن کھسوٹنے میں ماہر ہو گیا، وہ رات ہی رات میں دس دس کوس کے مردوں کے کفن کھسوٹ لاتا ــــ

"تیرا نام کیا ہے۔؟" اس نے گاڑی والے بچے سے پوچھا۔

بچّے نے جواب دیا۔ "سلیم"

"تو حاجی وحید کا ناتی ہے؟" بچہ کچھ کہے بغیر آہستہ آہستہ اپنی گاڑی ڈھکیلتا آگے بڑھ گیا۔

"حاجی وحید" ــــ؟ ہاں وہی وحید پہلوان ــــ جن کی اب دو منزلہ پکی عمارت ہے۔ یہیں پر ان کا کچا مکان تھا۔ اسارے میں اپنے چیلوں کے لئے بیٹھے رہتے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانا پینا چلتا رہتا، کبھی بادام، کبھی دیسی گھی میں بنا انڈے کی زردی کا حلوہ، دیسی گھی تو وہ پانی کی طرح اوک سے پی جائے پھر انھوں نے اسارے کی جگہ دو باری بنوائی اور دیسی گھی پینا بند کر دیا۔ جب کچا کوٹھا تڑوا کر دو کمرے بنوائے تو زردی کا حلوہ بھی بند ہو گیا۔ اور جب ان کی لکڑی کی ٹال آرا مشین کا کارخانہ بنی تو چیلے چپاٹے غائب ــــ اب ان کے بچے شہر میں پڑھتے تھے اور وہ دو باری میں بیٹھے کھانستے رہتے تھے۔ اور ایک دن ان کا انتقال ہو گیا تو اس نے ان کی قبر کھودی۔ اس نے سوچا تھا، آج تو بہت قیمتی کپڑا ملے گا اس دفعہ وہ کپڑا

رام سروپ بزاز کے ہاں نہیں بیچے گا، بے ایمان بہت کم پیسے دیتا ہے۔ مگر رام سروپ کیا کرے اب قبر سے کپڑا ہی کتنا باریک اور خراب نکلتا ہے۔ جس دن اخبار میں یہ خبر چھپی کہ ہمارا قصبہ تحصیل ہو گیا ہے اس دن دلشاد پٹواری کی قبر سے کتنا مہین کفن نکلا تھا۔ رام سروپ نے تو اٹھا کر پھینک دیا مگر پھر مان ہی گیا آخر تھا تو اسی کی دکان سے خریدا ہوا۔ مگر حاجی وحید کے بیٹوں نے بڑا قیمتی کفن پہنایا ہوگا۔ اس نے چھڑی میں آنکڑا کسا اور تختہ ہٹا کر قبر میں ڈال دیا۔ دو تین جھٹکے مارے پھر آہستہ آہستہ کھینچا، دیکھا تو کپڑا کیا تھا چیتھڑا تھا۔ رام سروپ تو دو آنے کو بھی نہیں پوچھے گا۔ اس وقت اسے یاد آیا کہ اس کے استاد نے بتایا تھا.... بہت دن کی بات ہے جب اس قصبے میں سب مکان کچے تھے اور ہر آدمی کا چھپر برسات میں ٹپکتا تھا اس وقت استاد کے دادا نے جس قبر سے کفن چرایا تھا اس میں سونے اور چاندی کے تاروں سے بنا ایک دوشالہ نکلا تھا۔

بچہ گاڑی لے کر حاجی وحید کی دو منزلہ عمارت میں گھس گیا۔ اندھیرا کافی ہو چکا تھا، ابھی اسے کئی گاؤں گھومنا پڑے گا شاید کہیں موت ہوئی ہو۔ خیرات پور، نرائن پور، گنگا گڑھ اور پھر وزیر پور کے قبرستان کے قریب پہنچا۔ اسے قبرستان میں روشنی نظر آئی، سکون کی سانس لی اور قبرستان کے باہر ایک پلیا پر بیٹھ گیا۔ لوگ دفنا کر واپس جا رہے تھے ــــــ اس نے چھپ کر واپس جاتے لوگوں کو دیکھا ان کے چہروں پر نہ غم کے آثار تھے اور نہ موت کا خوف ــــ

یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا سچ مچ یہ وزیر پور کا قبرستان ہے یا وہ کہیں اور آن بھٹکا ہے۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا ــــ "مگر مجھے کیا۔ کوئی بھی جگہ ہو۔ ہے تو قبرستان ہی۔ اور قبرستان بھی نہ ہو تو کیا ہوا قبر تو ہے جس میں ابھی ابھی کچھ لوگ مردے کو دفن کر کے واپس گئے ہیں۔"

چاروں طرف چنبیلی کی خوشبو مہک رہی ہے۔ "لگتا ہے امیروں کا قبرستان ہے۔ اور جو لوگ دفنا کر گئے ہیں ان کے کپڑوں سے بھی عجیب عجیب خوشبوئیں نکل رہی تھیں۔" اس نے اپنے جھولے کو ٹٹولا، آنکڑا نکال کر چھڑی میں لگایا۔ اور تازہ قبر کی تلاش میں چل دیا۔ اسے قبر ملی تو اس پر گلاب کی ٹہنی اڑسی ہوئی تھی اور قبر کی مٹی کیوڑے سے مہک رہی تھی۔ اس نے کدال نکالی اور قبر کھودنے لگا۔ وہ جتنا کھودتا خوشبو تیز ہوتی جاتی، اچانک "ٹن" سے آواز ہوئی۔ وہ اچھل گیا۔ اسے لگا کہ کدال لوہے کے زنگ آلود کھوکھلے پیپے میں لگی ہے۔ اس نے پھر کدال ماری آواز اور زور سے ہوئی، وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "اے خدا وہ کہاں آن پہنچا ہے۔ یہ لوگ کون تھے جو مردے کو دفن کر گئے ہیں۔ اور یہ آواز.... یہ آواز کیسی ہے۔ کیا مٹی پتھرا گئی ہے یا اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔"

اس نے ہمت کو سمیٹا اور ایک بار پھر کدال ماری اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ تختے کی جگہ پتھر کی پٹیا

رکھی ہے۔ "آج تو برسوں کے بعد اس کی حسرت پوری ہوگی۔ کسی امیر کی قبر ہے۔ شاید سونے اور چاندی کے تاروں والا دوشالہ ہو۔" اس نے ہاتھ سے پتھر کو کھسکانا چاہا مگر پتھر بہت بھاری تھا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا کہ پتھر بہت بھاری ہو، ہلکا پھلکا پتھر رکھنے والے مردے کو دوشالہ کیا اُڑھائیں گے۔ اب وہ چھینی اور ہتھوڑی سے پتھر میں چھید کرتے کرتے پسینے سے شرابور ہوچکا ہے۔ پتھر کاٹنے کی آواز قبرستان کے سکوت کو توڑ رہی ہے۔ کبھی کبھی جب آواز زور سے ہوتی ہے تو وہ کانپ جاتا ہے۔ "کون؟" "ارے یہ تو میرا وہم ہے یہاں اندھیرے کے سوا کون ہوسکتا ہے ——" پتھر بہت موٹا ہے۔ وہ ہتھوڑی کی چوٹیں زور زور سے مارنے لگا آخر چھید ہو ہی گیا۔ اس نے آنکڑے والی چھڑی چھید کے اندر ڈال دی۔ "آج وہ اتنا خوف زدہ کیوں ہے؟ آخر بیس سال سے وہ یہی کام کررہا ہے...." اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس نے ہمت کی اور آنکڑے میں کفن پھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید دوشالہ بہت دبیز ہے اس نے زور سے آنکڑا پھنسایا اسے محسوس ہوا کوئی موٹی سی چیز آنکڑے میں پھنس گئی ہے۔ اس نے آنکڑے کو کھینچنا چاہا مگر آنکڑا نہیں کھنچا.. بہت موٹا کپڑا ہے۔ اس نے زور سے جھٹکا دیا اب آنکڑا پتھر کے چھید سے باہر آچکا تھا۔ اس نے آنکڑے کو چھوا تو اس کے ہاتھ میں لجلجی سی کوئی چیز آگئی، یہ مردے کے جسم کی بچی ہوئی کھال تھی۔ وہ چیخ پڑا اور بے تحاشا وہاں سے بھاگنے لگا... وہ اپنی سمت بھول چکا تھا۔ وہ کب سے بھاگ رہا ہے... برسوں سے؟ صدیوں سے........؟ یہ تو یاد نہیں مگر اب وہ جہاں آن پہنچا ہے جگمگاتی ہوئی روشنیوں والا کوئی بہت بڑا شہر ہے۔ اسے دور سے دھواں اگلتی چمنیاں نظر آرہی ہیں۔ چمنیاں لوہے کی ہیں مگر کھوکھلے پیٹ والے زنگ آلود لوہے کی نہیں —— وہ شہر کے باہر عیسائیوں کے قبرستان کے قریب کھڑا ہے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ شہر کی جانب سے گیس کی لالٹینوں کے ساتھ بارات آرہی ہے.... ارے یہ تو کسی عیسائی کا جنازہ ہے۔ اسے اپنے استاد کی بات یاد آئی۔ "جب کوئی عیسائی مرتا ہے تو اسے تابوت میں سونے کی زنجیر، گھڑی اور قیمتی کپڑے پہنا کر بند کیا جاتا ہے۔" کیا سچ مچ آج بھی سونے کی زنجیر اور گھڑی پہناتے ہیں عیسائی لوگ —— ہاں کیوں نہیں.... وہ تو بہت امیر ہوتے ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا ایک بڑا ستارہ چمکتا ہوا نظر آیا —— "ارے یہی تو ہے اپنی قسمت کا ستارہ.... کتنے دنوں بعد چمکا ہے۔

وہ قبرستان کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ "ان لوگوں کے چہروں پر خوف کیوں ہے۔ شاید موت کا خوف ہو —— مگر کسی کے چہرے پر رنج و الم کا نام و نشان بھی نہیں۔"

اس کے استاد نے بتایا تھا۔ "عیسائی لوگ کسی کی موت پر روتے پیٹتے نہیں ہیں، بس کالے کپڑے پہن

لیتے ہیں۔"

"یہ لوگ کچھ باتیں کر رہے ہیں....." اس نے کان لگا کر سننا چاہا مگر باتیں اتنی آہستہ ہو رہی تھیں کہ شاید بات کرنے والا بھی اپنی بات نہیں سن پا رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اشارہ کیا اور سب لوگ دو دو چار چار کر کے ادھر ادھر چلے گئے۔

"اے خدا یہ کون سا دستور ہے....." اس نے سوچا اور پھر جلدی سے قبر کے پاس پہنچ گیا اور کدال سے مٹی ہٹانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں تابوت نظر آ گیا۔ اس نے چھو کر دیکھا اس پر پیتل کی پتیاں جڑی ہوئی تھیں "اف تابوت بھی اتنا قیمتی___" اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور تابوت کی ایک کیل اکھاڑی.....پھر کیل کو آنکھوں کے قریب لا کر اس طرح دیکھنے لگا کہ کہیں یہ کیل سونے کی تو نہیں۔ مگر رات کی تاریکی میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اندر کتنا خوبصورت مردہ ہوگا ___ گھڑی اور سونے کی زنجیر پہنے......اور دوشالہ......؟ دوشالہ نہیں بھی ہوا تو سونے کی زنجیر تو ہوگی ہی ___ جب وزیر خاں حج کر کے آئے تھے تو دونوں ہاتھوں میں گھڑی پہنے تھے اور عیسائیوں کا کیا ہے چار چار گھڑیاں بھی پہنا سکتے ہیں مردے کو...

وہ ہاتھوں میں چار چار گھڑیاں پہنے، گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے اور چاندی سونے کے تاروں سے بنا دوشالہ اوڑھے بڑے بڑے شہروں کی چوڑی سڑکوں پر ٹہل رہا ہے۔ بڑے سے بڑا سنار بھی اس کی زنجیر اور دوشالہ خریدنے کو تیار نہیں ___ خرید بھی کیسے سکتا ہے۔ کس کے پاس ہے اتنا روپیہ۔ اتنا قیمتی سامان تو کوئی راجا ہی خرید سکتا ہے۔ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا، اس نے مڑ کر دیکھا.....پولیس.....نہیں.....نہیں......!!

اس کی سانس پھول رہی ہے..... وہ قبرستان میں تابوت پر تنہا بیٹھا ہے۔ آسمان پر بڑا تارہ اور تیز چمکنے لگا ہے۔ اس نے تابوت پر ہاتھ پھیرا۔ پیتل کے پتھر کے نقوش ابھرے محسوس ہوتے تو اس کی امیدوں کو تسکین ملتی اور دل کھل اٹھتا___ اب دیر کرنے سے کیا فائدہ___ "کھل جا سم سم"___ اس نے تابوت کے اوپر کا تختہ ہٹایا اور جلدی سے مردے کی دونوں بانہوں کو پکڑ کر اٹھانا چاہا مگر وہ لرز گیا جب اس کے ہاتھ مردے کے بجائے تابوت کے نچلے تختے پر جا لگے۔ اس نے دیکھا تابوت خالی تھا.....بالکل خالی.....!! وہ چیخا اور پھر چکرا کر اس طرح گر گیا جیسے کسی نے اس کے جھولے سے کدال نکال کر اس کے سر پر دے ماری ہو۔ وہ اتنا ہلکا کیوں ہو گیا ہے، شاید اس کے جسم سے بہت کچھ نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ وہ اندر سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ اس کی پسلیاں گلنے لگی ہیں، ایک ایک کر کے سب گلتی جا رہی ہیں۔ اس کا گوشت بھی سڑ چکا ہے اور کھال پر زنگ لگ گئی ہے۔ اب وہ بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس نے بھاگنے کے لئے زور لگایا وہ بھاگ

زنہ سکا مگر زمین پر لڑھک پڑا اور اتنی تیز لڑھکنے لگا کہ وہ رکنا بھی چاہے تو نہ رک سکے۔ وہ لڑھکتا رہا
چھوٹے بڑے آڑے ترچھے راستوں پر لڑھکتا رہا۔
اسے محسوس ہوا کہ وہ زنگ آلود لوہے کا کھوکھلا پہیہ ہے اور کوئی شخص مکّا کے ٹھڈے سے
سے مار مار کر اسے تیزی سے لڑھکا رہا ہے...!! ☐

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

۱۔ پرایا گھر	جیلانی بانو	اردو مرکز، حیدرآباد	۲۰/..
۲۔ خوشی کے موسم	علی باقر	سیما پبلی کیشنز، نئی دہلی	
۳۔ دستک	صفیہ ملک	علی برادرز، لاہور	۱۵/..
۴۔ فرشتے خاموش ہیں	ویریندر پٹواری	سیمانت پرکاشن، نئی دہلی	۱۶/..
۵۔ کوندے	تقی حسین خسرو	ادارہ نوائے سروش، کراچی	۱۵/..
۶۔ سورج کا چکر	رشید عارف	ڈاکٹر دھادے بلڈنگ، کرلا بمبئی	۳/..
۷۔ ادھورے چہرے	شمیم صادقہ	بھوپال ہاؤس، بھوپال	۶/..
۸۔ ہوا	محمود احمد قاضی	کلاسیک، دی مال، لاہور	۱۰/..
۹۔ نئے مکان کی دیمک	علی امام نقوی	شمیم پبلی کیشنز، بمبئی	۱۰/..
۱۰۔ ہارا ہوا پرندہ	مظہر الزماں خاں	ادارۂ شعر و حکمت، حیدرآباد	۱۰/..
۱۱۔ آگ کے ہم سائے	احمد یوسف	شمیم یوسف	۱۵/..
۱۲۔ بارہ رنگوں والا کمرہ	عبدالصمد	انجمن تہذیب نو، الٰہ آباد	۱۵/..
۱۳۔ گمشدہ کلمات	مرزا حامد بیگ	خالدین، لاہور	۳۰/..

اس وقت ہمارے سامنے اردو کے تیرہ[۱۳] افسانوی مجموعے ہیں جو نہ صرف یہ کہ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف ممالک سے شایع ہوئے ہیں بلکہ افسانوی ادب کے مختلف رجحانات کے حامل ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو افسانہ نہ صرف یہ کہ خیالات کے اعتبار سے متنوع ہے بلکہ تکنیک کے اعتبار سے بھی ان میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔ اردو افسانے نے پچھلے دس پندرہ سال میں جو نئے نئے تجربے کئے ہیں ان کی بھی ان افسانوں سے نشاندہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک افسانہ نگار نہ صرف یہ کہ اپنا اسلوب بیان تلاش کر رہا ہے بلکہ وہ تکنیک کے میدان میں بھی اپنی چھاپ چھوڑنا چاہتا یا چاہتی

ہے۔ اس لئے ان افسانوں کو سرسری طور پر بھی نہیں پڑھا جا سکتا اور نہ یہ وقت گزاری کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اگر آپ ان کو اپنے کسی سفر میں شریک کریں گے تو آپ کا وقت شاید اور مشکل سے کٹے۔ ظاہر ہے کہ ادب کے اپنے مطالبات ہوتے ہیں اور اگر اردو افسانہ اپنے قاری سے ذہانت کی فرمائش کرے، ذرا غور و فکر سے پڑھنے کی خواہش ظاہر کرے تو یہ کوئی زیادتی نہیں ہے۔

اس بزم میں جیلانی بانو سے لے کر شمیم صادقہ تک کے مجموعے شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک قارئین کی توجہ کا مستحق ہے۔

● جیلانی بانو صفِ اول کی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں روایت بھی ہے اور بغاوت بھی۔ اس مجموعے میں نئے مسائل بھی ہیں اور پرانے بھی، وہ مسائل جو آج بھی اتنے ہی نئے ہیں جتنے پہلے تھے ـــــ عورت اور مرد کے مسائل ـــــ جیلانی بانو کے یہاں عورت کا احتجاج بھی نظر آتا ہے۔ اس میں غصہ کم، اداسی اور غم زیادہ ہے "بند دروازہ" نہ صرف ایک مرد کی بہیمیت کا آئینہ دار ہے بلکہ شہری زندگی کی ناہمواری اور "اپ اسٹارٹ" طبقے کی بڑی جاندار پیش کش ہے۔ بلاشبہ اس کا شمار اردو کے بہت اچھے افسانوں میں ہو سکتا ہے۔ "بے مصرف ہاتھ" رفو بھو بھو کی کہانی ہے جس کا ظاہر ایک چڑیل کا سا تھا "منہ شاید جیل کوؤں نے نوچ لیا تھا اور آنکھوں کی جگہ سرخ گڑھے تھے اور ناک سے ٹھوڑی تک کہیں گوشت اور کھال نہ تھی" کتنا بھیانک چہرہ تھا لیکن دل محبت سے لبالب بھرا تھا کہ ذرا سے ہچکولے میں چھلک جاتا تھا ـــــ جیلانی بانو نے اس کہانی میں بڑی خوبصورت کردار نگاری کی ہے۔ جیلانی بانو نے اپنی متعدد کہانیوں میں نفسیاتی گرہوں کو الفاظ کی انگلیوں سے کھولنے کی کوشش کی ہے اور انھیں کھولا بھی ہے۔ ایسے افسانوں میں "کلچرل اکیڈیمی"، "اسکوٹر والا"، "اے دل، اے دل"، "ایک دن کیا ہوا" شامل ہیں۔

جیلانی بانو نے اردو افسانے کی جاندار روایتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور ان روایتوں کی نہ صرف آبیاری کی ہے بلکہ انھیں آگے بھی بڑھایا ہے۔

● "خوشی کے موسم" علی باقر کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ علی باقر نے چودہ سال انگلستان میں قیام کیا ـــــ وہاں کی زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کیا ـــــ یہ کہانیاں اسی پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ پس منظر محض کہر آلود فضا کا نہیں ـــــ ان افسانوں میں برطانوی دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے "کرسمس کی ایک شام" "اندھیرا"، "حسن انتقام"، "شراب اور شہد"، "کسک"، "کہر" بلاشبہ اعلا درجے کے افسانے ہیں جن میں مغرب کی جدیدیت بھی ہے اور اس کا سونا پن بھی ـــــ تہذیب کی اس ترقی نے کیا کھویا کیا پایا ـــــ یہ سب کچھ ان افسانوں میں ہے ـــــ "حسن انتقام" میں خود غرضی اور نسلی عصبیت کی عکاسی تو ہے لیکن اس کے برخلاف انسانی دلوں کی دھڑکن کی ہم آہنگی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ علی باقر بلاشبہ اردو کے اچھے افسانہ نگار ہیں ـــــ لیکن انھوں نے "شمع" میں لکھ کر اپنے افسانے عوام تک پہنچائے، ان عوام تک جو افسانے محض لطف و انبساط کے لئے پڑھتے ہیں ـــــ علی باقر کو ابھی اپنے اصل قاری نہیں ملے اور مجھے یقین ہے کہ وہ جب پڑھیں گے تو یقیناً انھیں خیال ہوگا کہ اردو افسانے میں علی باقر نے یورپ کے معاشرے کی جھلکیاں

پیش کر کے اس کی سرحدوں کو وسیع کر دیا جو شاید بمبئی، دہلی، لکھنؤ، لاہور اور کشمیر تک ہی محدود ہو گئی تھی اور ان افسانوں کے ساتھ یورپ اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد جس طرح ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں ــــ علی باقر بھی "شمع" کی بزم سے آگے بڑھیں گے اور اپنے اصل قاریوں کو پہچانیں گے، جن میں بیشتر نئے افسانے کی شناخت میں "کنفیوز" ہو رہے ہیں۔

● صفیہ ملک کی کہانیاں ہماری گھریلو زندگی کی ٹوٹ پھوٹ، مرد کی بے حسی، معاشرے میں عورت کی مجبوری اور بے کسی کی عکاس ہیں۔ انھوں نے زندگی کو جیسا پایا، ویسا ہی پیش کر دیا ــــ انھوں نے اپنے خیالات زندگی کی بے رحم حقیقتوں سے بنائے ہیں اسی لئے ان میں توانائی ہے اور کہیں بھی تصنع نظر نہیں آتا۔ وہ حقائق کو پیش کرنے کے لئے نظریات کا تانا بانا تیار نہیں کرتیں بلکہ جو دل پر گزرتی ہے رقم کر دیتی ہیں۔ اس عمل میں کبھی کبھی فنی توازن برقرار نہیں رہتا لیکن پڑھنے والا وہ سب کچھ جان لیتا ہے جو وہ جاننا چاہتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کو سمجھا بھی ہے اور انھیں بڑی کامیابی سے اپنے افسانوں میں برتا بھی ہے۔ "ناشناسا اجنبی"، "دستک"، "طستی تنہائیاں" اور "پالتو" سے ان کے فن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان میں فنی مہارت پیدا ہوتی جائے گی ان کے تاثر میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

"دستک" میں کل ۱۲ کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں ہلکی پھلکی ہیں اور بقول سلیم احمد "روزمرہ زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔" یہ ان کی ابتدائی کہانیاں ہیں ــــ ان میں عورت کا کرب اور اس کا المیہ ہے ــــ ابھی یہ درد پورے طور پر صفیہ ملک کے دماغ و دل سے ہم آہنگ نہیں ہوا لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ درد، ایک کیفیت اور ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک لب و لہجہ لے کر ان کے افسانوں سے ابھرے گا اور پھر ان کو اپنی منزل مل جائے گی۔ اور اردو افسانے کو ایک اچھا اور دردمند افسانہ نگار ــــ میں سلیم احمد کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ "عمر، وقت اور مشق کے ساتھ ساتھ ان کا فن بھی ترقی کرے گا اور وہ زیادہ بہتر طور پر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں گی۔ وہ فطری افسانہ نگار ہیں۔ وہ کہانی کہنا جانتی ہیں۔ کہانیاں جو زندگی کی حقیقتوں سے جنم لیتی ہیں۔

● کشمیر نے اردو کو کئی اچھے افسانہ نگار دیئے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی بڑے ہونہار تھے۔ ان سے اردو افسانے کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن افسوس کہ یہ کلی کھلتے کھلتے مرجھا گئی۔ "فرشتے خاموش ہیں" ورندر تریاٹھی کے افسانوں کا مجموعہ ہے ــــ "ریت کی دیوار" بڑی دردناک کہانی ہے۔ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے کہ جو اپنی بڑی بہن کے سہارے "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی زندگی گزارتا ہے لیکن ایک روز وہ جب ایک نئے جسم کو خریدنے نکلتا ہے تو اسے اپنی بڑی بہن کا جسم ملتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ورندر تریاٹھی کو اپنے افسانوں میں تفکر کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی شدید احساس ہے۔ ان کے یہاں دردمندی اور انسان دوستی کی جھلکیاں ملتی ہیں جن سے اظہار کے خلوص کا یقین مستحکم ہوتا ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے تکنیکی تجربے کر رہے ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں انداز بیان میں روایت کی جھلک ملتی ہے۔ ان کا یہ طریقہ مناسب ہے۔ بقول جوگندر پال انھیں اس کا بھی احساس ہے کہ زندہ ہیئتیں بے ضمیر نہیں

ہوتیں، بلکہ فنی اہتمام انسانی ضمیر سے دم پکڑتا ہے۔"

● "کوندے" تقی حسین خسرو کے ۱۸ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ تقی حسین خسرو جدید دور کے افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے افسانے نہ علامتی ہیں اور نہ تجریدی۔ ان کی کہانیوں کی خصوصیت ان کی تکنیک اور اسلوب بیان ہے جو اتنے سادہ ہیں کہ مومن کے شعر کی طرح جب آپ ان افسانوں کو پڑھتے ہیں تو اس فضا میں کھو جاتے ہیں اور آپ کو کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ ان کے یہاں تقریر کی لذت تحریر میں جب بدلتی ہے تو ہمیں اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہیں۔ خسرو نے اپنا اسلوب دریافت کر لیا ہے اور ان کے ہر افسانے میں ان کے اسلوب کی چھاپ ہے۔ وہ جب کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو ان کی سادہ بیانی اس میں ایک خاص قسم کا حسن پیدا کر دیتی ہے جس میں "حرف عام کی" انفرادیت نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ روزمرہ کے پیش آنے والے واقعات جب شعور سے لاشعور کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ افسانہ نگار کے اندر ایک جال سا بُن دیتے ہیں — یہ کہانیاں متوسط طبقے کے ایک ذہین فرد کی کہانیاں ہیں جس میں یہی لوگ نظر آتے ہیں۔ بقول جمیل جالبی "اس متوسط طبقے کی کہانیاں ہیں جس میں خوابوں کے بکھرنے اور عمر کے تیزی سے گزرنے کا کرب موجود ہے جن کی زندگیاں ننھی ننھی خوشیوں اور ننھے ننھے غموں کی کسک سے عبارت ہے "— "لنگڑا عاشق"، "کہانی"، "ملامت"، "حرفِ مکرر" ان کے انفرادی اسلوب کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ انفرادیت بڑی ریاضت کے بعد نصیب ہوتی ہے اور تقی حسین خسرو نے یقیناً بڑی ریاضت کی ہے۔ وزیر آغا نے صحیح لکھا ہے کہ ان کے افسانوں کے اسلوب میں افسانہ نگار کی دلآویز شخصیت اپنی ساری مٹھاس، خوشبو اور سندرتا کے ساتھ سمٹ آئی ہے۔

● "سورج کا چکر" رشید عارف کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ جدیدیت ترقی پسند تحریک کی توسیع ہے۔ یہ افسانے ترقی پسند تحریک سے متاثر ذہن کی تخلیق ہیں لیکن ان کا فنی اظہار جدیدیت سے قریب تر ہے۔ رشید عارف کے افسانوں کا موضوع تقریباً وہی ہے جو ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ہے لیکن اظہار بیان ان کا اپنا ہے۔ رشید عارف نے علامتی کہانیاں بھی لکھی ہیں جیسے "منزل ایک مسافر تین" جہاں ٹرین کے پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے طبقاتی علامت بن گئے ہیں۔ رشید عارف نے علامت کو بڑے صاف ستھرے انداز سے پیش کیا ہے۔

رشید عارف کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے اور ایک ہونہار اور ذہین افسانہ نگار کے اچھے مستقبل کا پتہ دیتا ہے، بشرطیکہ وہ فن پر اسی طرح توجہ دیتے رہیں۔

● "ادھورے چہرے" شمیم صادقہ کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے سات افسانے ہیں۔ اس سے پہلے "کرچیاں" شایع ہو چکا ہے۔ میں نے "کرچیاں" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان افسانوں میں ایک اچھے افسانہ نگار کا مستقبل چھپا ہوا ہے اور چونک چونک کر ادھر ادھر دیکھ رہا ہے کہ کیسے سامنے آئے۔ "ادھورے چہرے" میرے خیال کی تصدیق کرتا نظر آتا ہے۔ بقول مصنفہ ان افسانوں میں زندگی کے ادھورے پن کی عکاسی ہے۔ کھوکھلے نظریات کا ملبہ ہے۔ شمیم صادقہ کا ذہن

بہت وسیع ہے۔ وہ محض عورتوں کے مسائل پر باتیں نہیں کرتیں۔ وہ اپنے وجود کی متلاشی نہیں ہیں۔ ان کے افسانوں میں داخلی اور خارجی زندگی کا بڑا خوبصورت امتزاج ہے۔ "بجھی ہوئی تیلی"، "دھند کی دیوار"، "ادھورے چہرے" مختلف قسم کے افسانے ہیں لیکن ان میں ہر ایک میں سماجی شعور ہی نہیں بلکہ واضح طور پر جانبداری ملتی ہے لیکن اس کے باوجود افسانے کے فن پر حرف نہیں آتا۔ شمیم صادقہ حساس فن کار ہے اور اس نے ان کے افسانوں کو گہرائی عطا کی ہے۔ "دھند کی دیوار" ہجرت کی کہانی ہے لیکن ہجرت کی عام کہانیوں سے مختلف ہے۔ یہاں ماضی ایک تہذیب کی علامت بن جاتا ہے۔ شمیم صادقہ کی زبان ان کے احساسات کی بڑی خوبصورتی سے ترجمانی کرتی ہے۔ نئے اردو افسانے کو ان سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔

● "ہوا"، محمود احمد قاضی کے تیرہ ۱۳ افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ یہ انسانی معاشرے کی الٹتی پلٹتی قدروں کی کہانی ہے جہاں احساسات بدلتے رہتے ہیں۔ اور بقول قاضی "کان ترش پھل کا ذائقہ چکھیں زبان زیرِ زمین چھپائی سرنگوں کے دھماکے سنیں، پاؤں چھالوں کی بولی بولیں، آنکھیں آسمانوں کی سختی محسوس کریں اور ہاتھ ہڈیوں کے بھن سونگھیں ـــ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں قلم اگر لفظوں کو چھونے کے بجائے زخموں کو کریدنے لگے تو تعجب کیا۔" "ہوا"، کے افسانے انسانی دکھ درد کی کہانیاں ہیں جن کی زبان، لب ولہجہ، اندازِ بیان، سب کچھ جدید ہے۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی فضا ـــ زبان، احساسات وجذبے کا اظہار تو کرتی ہے لیکن قاضی نے ان کے ذریعہ ماحول اور فضا کو اپنے پڑھنے والوں سے مانوس کر دیا ہے۔

دریا کی بڑھتی ہوئی باڑھ کو کچھ دیر تو باندھوں سے روکا جا سکتا ہے لیکن سیلاب رو کے نہیں رکتے۔ کہیں نہ کہیں سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ جب سیاسی موسم خراب ہوتا ہے، اظہارِ خیال پر پابندی ہوتی ہے تو خیال اپنے اظہار کے لئے نئی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے۔ شاید علامتی کہانیوں کا یہ بھی ایک جواز ہے۔

محمود احمد قاضی نے یہی سوچا کہ ایسا لکھا جائے کہ ہوا کو قید کرنے والے ہاتھ شل ہو جائیں اور بقول قاضی کے یہی جب ایسا لکھا جائے گا تب تمام زبانوں کے سچے سورج اکثریت کے ساتھ طلوع ہوں گے مہربان چاند کی ساری ٹھنڈک دھرتی کے زہر کو چوس لے گی اور اس طرح "نا حق لفظوں کی موت ہوگی"۔ وہ بولے گا سرِ راہ، ہوا، مگر اسٹیج خالی ہے۔ دریچہ، سنسر کا جواز، بے نوک خارجی قسم اس مجموعے کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ "ہوا" میں بشر اور اس کی بیوی فاطمہ حال کی علامت ہیں جنہوں نے اپنے زمانے سے ڈر دب کر سمجھوتہ کر لیا ہے ـــ لیکن ان کا بچہ جو مستقبل کی علامت ہے اور جس کا نام ٹیپو ہے وہ تازہ ہوا کا متلاشی ہے ـــ باپ فاطمہ سے پوچھتا ہے کہ ٹیپو ایسا کیوں سوچتا ہے؟" فاطمہ نے کہا "اسے روکنا ہمارے بس میں نہیں ـــ ضروری تو نہیں کہ جن چیزوں کے متعلق ہم نہیں سوچتے یا ہم نے نہیں سوچا ـــ ان کے بارے میں ٹیپو بھی نہ سوچے ـــ ہم اسے سوچنے سے نہیں روک سکتے ـــ اسے سوچنے دو"ـــ اتنا کہہ کر وہ رو دیتی ــ اب بشر نے تنگ آ کر بیرونی کھڑکی کے پٹ ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے کیوں کہ وہ یہی کر سکتا ہے۔ مگر ٹیپو اب بھی

بند کھڑکی کے ساتھ لگا کھا کرتا ہے ——" مجھے ہوا چاہئے۔ مجھے ہوا چاہئے۔"

پاکستان سے جو مجموعے ہم تک پہنچ رہے ہیں ان میں محمود احمد قاضی کے افسانوں کا مجموعہ "ہوا" یقیناً قابلِ ذکر ہے۔ اس مجموعے میں روحِ عصر پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ قاضی نے فنی اعتبار سے بھی خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ مجموعہ اردو افسانوی ادب میں یقیناً ایک اضافہ ہے۔

● "نئے مکان کی دیمک" علی امام نقوی کے ۱۳ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ علی امام نقوی نے مختصر عرصے میں اپنے افسانوں میں اپنا ایک مخصوص انداز اپنا لیا اور یہ بڑی بات ہے۔ نقوی جدیدیت سے متاثر ہیں لیکن اسلوب کی حد تک —— شاید جدیدیت کی پہچان اسلوب سے ہوتی ہے۔ ایک ایسا اسلوب جس میں سیدھی سادی بات کو پیچیدہ بنا کر کہا جاتا ہے ایسی صورت میں تاثر کی کمی ہو جاتی ہے۔ نقوی صاحب کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن وہ اپنے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اس لئے یہ پیچیدگی کہیں کہیں تفہیم کی دشواری پیدا کرتی ہے۔ افسانہ نگار یہ چاہتا ہے کہ قاری "ان کہی" بات کو خود دریافت کرے۔ نقوی اپنے قاری کو سہارا دیتے ہیں۔ "دانتوں میں گھری زبان"، "منہ زور گھوڑیاں" اس کی واضح مثال ہیں۔

"منہ زور گھوڑیاں" فساد کی کہانی ہے۔ مصنف نے جس کا انتساب مرحوم زکی انور کے نام کیا ہے۔ اس کہانی کا اہم کردار خود زکی انور ہے۔ یہ کہانی ایک مایوسی کی کہانی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاشرے میں صرف پاگل اور بیوقوف ہی رجائی ہو سکتے ہیں اور کہانی کا حقیقت پسندانہ انداز ہی اس کی معنوی خصوصیت ہے۔

امید ہے کہ علی امام نقوی کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ، ان کے آیندہ کے خوبصورت افسانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ ان کے یہاں ایک اچھے افسانہ نگار کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں۔

● "اڑا ہوا پرندہ"، مظہر الزماں خاں کا "پہلا آسمان" ہے —— اس کے ساتھ ہی انھوں نے چھے آسمانوں کی بشارت دی ہے جن میں ان کی ریڈیائی کہانیاں، ناولٹ، طنز و مزاح، تنقیدی مضامین اور جدید افسانے شامل ہوں گے۔ اس مجموعے میں شروع سے چونکا دینے والی بہت سی باتیں ہیں۔ وہ "ایک اہم بات" کے تحت لکھتے ہیں کہ میری دلی خواہش یہ تھی کہ میں اپنے افسانوی مجموعے میں اپنی تصویر کے بجائے اپنا لاشعاعی عکس لوں اور اس کا پازیٹیو بنا کر شایع کر دوں تاکہ میرا گوشت پوست کا لباس اتر جائے اور میں اپنی اصلی حالت میں آپ کے سامنے آ جاؤں۔ لیکن وقت کی کمی اور حالات کی وجہ سے میرے اندر کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔" پھر خاں صاحب نے اس کا انتساب اسی کے مجموعے کے نام کیا ہے اور اپنا نشان انگوٹھا ثبوت کے طور پر دیا ہے کہ شاید اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن جس آدمی کو اپنے پوست پر اعتماد نہیں، وہ کیوں اس کو اتنی اہمیت دیتا ہے۔ یہ بات بھی سوچنے کی ہے۔ اس مجموعے میں ۱۲ افسانے ہیں، جو تمام تر تجریدی رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے ابہام کی کیفیت ہے۔ کہیں کہیں یہ ذاتی علامتیں تفہیم سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے صحیح لکھا ہے کہ "اسے علامتی افسانہ کہیں یا تجریدی افسانہ، یا نیا افسانہ،

بہر حال ایک نئی چیز [illegible] کے میدان میں در آئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسے قبولیتِ عام کا شرف نہ بھی مل سکا تو [illegible] کی حیثیت ایک مزور بچے کی نہیں بلکہ تنومند نوجوان کی ہے۔"

مظہر الزماں خاں کے یہاں جہاں نئی بات نئے انداز سے کہی گئی ہے وہاں ذات کی مسلسل تلاش ملتی ہے۔ وہ ذات جو کسی مجمع میں اپنی انفرادیت کھو دیتی ہے یا پھر ہر لمحہ نئے چہرے لگا کر اپنے آپ کو خود چھپا لیتی ہے ـــــ افسانے کی زبان میں اگر یہ ذات مل جائے تو کیا کہنا ـــــ بہر حال مظہر الزماں خاں کے یہاں فنی تہ داری ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت بار بار یہ خیال آتا ہے کہ افسانہ اور شاعری کا بعد شاید جلد دور ہو جائے اور ایک اک افسانے کی مختلف تشریحیں ہوسکیں خاص طور پر جب کہ افسانہ نگار اس معاملے میں رہبری نہیں کرتا۔ اس مجموعے کے افسانے ایک ذہین قاری کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ اس کتاب دل کی تعبیریں خود کرے۔ نیا افسانہ اپنے افسانہ نگار سے زبان و بیان پر پوری قدرت کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ قدرت مظہر الزماں خاں کے قلم کو کسی حد تک حاصل بھی ہے۔ مظہر الزماں خاں کے یہاں داخلی اور خارجی زندگی کے تجربوں کا امتزاج ملتا ہے۔

"ہارا ہوا پرندہ" سرسری طور پر پڑھنے کی کتاب نہیں ہے۔ اسے بڑے غور سے پڑھنا پڑے گا اور تب جا کر قاری کی رسائی اس کی تہہ تک ہوگی۔ ظاہر ہے کہ موتی نکالنے کے لئے غوطہ زنی تو کرنا پڑتی ہے۔ جدید افسانوی ادب میں یہ مجموعہ بڑی انفرادیت کا حامل ہے اور نئے افسانے کے مطالعہ میں اس مجموعے کو یقیناً اہمیت حاصل ہوگی۔

● "آگ کے ہمسائے" احمد یوسف کے ۲۱ افسانوں کا مجموعہ ـــــ اس کا موضوع وہی انسانی المیہ ہے لیکن سنانے والا اسے چہرے بدل کر سناتا ہے۔ یہ افسانے جدید ہیں ـــــ علامتی ہیں ـــــ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ـــــ لیکن شاید پرانی شراب میں نشہ دو چند ہو جاتا ہے اس لئے محض بوتلوں کی تبدیلی نہیں ـــــ احمد یوسف کی کہانیاں اپنے انداز بیان سے متاثر کرتی ہیں ـــــ "قصہ حجام کے ساتویں بھائی کا" ہجرت کی کہانی ہے ـــــ لیکن وہ ہجرت نہیں ہے جو مکّے سے مدینے تک ہوئی ہے۔ یہ تو فرار ہے ـــــ حقیقتوں سے آنکھیں نہ ملانے کی بات ہے ـــــ بزارہ اپنے شہر کے آندھی طوفان سے بچ کر ایک دوسرے شہر میں قدم رکھتا ہے لیکن وہاں بھی مہیب طوفان آتے اور بالآخر شہزادی نے اہلِ شہر کی ایما پر اس اجنبی اور خوبرو شہزادے کو یہ کہہ کر محل سے باہر نکال دیا کہ مقرر اس کی بدبختی سے طوفان آتے ہیں۔"

اور پھر وہ بھوک اور پیاس سے نڈھال اپنی حویلی میں بند پڑا رہتا تھا اور اپنی نادانی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا تھا کہ طوفانوں کے خوف سے اس نے ناحق اپنا شہر چھوڑا اور بزرگوں کے اس قول کو فراموش کیا کہ "طوفان ہر شہر میں آتے ہیں اور بجلیاں ہر مقام پر کڑکتی ہیں۔"

احمد یوسف کے کردار عام انسانی کردار ہیں لیکن ان کے یہاں یہ کردار کوئی بھی جامہ پہن لیں، وہ اپنے انداز قد سے پہچان لئے جاتے ہیں۔

"چراغ کشتہ" کا ملازم ایک خاندان ہی نہیں ایک عہد کی کہانی سنا دیتا ہے اور اس کہانی میں

آمیں اور کی اپنی کہانی بھی سنائی دیتی ہے۔ گویا قصہ گو خود ایک کردار بن گیا۔ "نقش ناتمام" اس [illegible] کی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ اس میں مجبور و بے کس انسان کتنے ادر بلیوں کی زندگی گزارتے اور مرتے ہیں لیکن ان کے اندر جینے کی تڑپ اور احساسِ حسن باقی رہتا ہے۔ اور پھر حسین خواب جو جینے پر آمادہ کرتے ہیں۔

احمد یوسف نے اردو افسانے کی روایت کو یقیناً آگے بڑھایا ہے۔ آج کے نئے افسانے کا مطالعہ احمد یوسف کے افسانوں کے بغیر نامکمل ہے۔ احمد یوسف کے فن میں رچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے اور اب ہمیں ان کے نئے افسانوں کو دیکھنا ہے۔ ان کے یہاں علامتوں کا استعمال معنی خیز ہی نہیں بلکہ خیال انگیز ہے۔

● "بارہ رنگوں والا کمرہ" عبدالصمد کے ۱۹ افسانوں پر مشتمل ہے۔ عبدالصمد اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ اردو افسانے میں جو تکرار شروع ہوئی تھی کہ افسانہ نگار کا موضوع محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید اسی لئے جمود کی بحث نے زور پکڑ لیا تھا لیکن بھٹنے افسانے نے اس تکرار کو ختم کیا اور زندگی کے مسائل نے علامتی شکلیں اختیار کر لیں۔ عبدالصمد کے افسانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو افسانے میں نئے موضوعات کو اپنانے کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے یہاں آفاقی مسائل بھی ہیں —— عبدالصمد کے افسانے ذات کی تلاش نہیں بلکہ کائنات کی کھوج ہیں۔ ان کی فکر استعاروں کے توسط سے آگے بڑھتی ہے اور سچ پوچھئے تو کہانی بذاتِ خود ایک استعارہ ہے۔ عبدالصمد کے افسانے ہمارے معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کے علامتی اظہار ہیں —— "بارہ رنگوں والا کمرہ"، "کال بیل"، "زر مبادلہ"، "اپنی صلیب"، "چند غیر مستند واقعات" [illegible] یقیناً [illegible] میں شمار کئے جا سکتے ہیں —— عبدالصمد کے افسانوں کا بدلا ہوا [illegible] قاری کو نہ صرف [illegible] سکتا ہے بلکہ یہ نئے افسانے کا معتبر لہجہ ہے۔ جس میں عبدالصمد کی اپنی انفرادیت کا بھی ہاتھ ہے۔ عبدالصمد کی زبان میں ایک خاص قسم کی شعریت ہے جو اُن کی اپنی ہے۔ مجھے بیدی کی ایک بات یاد آتی ہے۔ "افسانہ اور شعر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔"

عبدالصمد اس مسلسل لمبی بحر سے عہدہ برا ہوئے ہیں۔ ان کے غیر معمولی شعور نے ان کے احساس کو اتنا ہی غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے اسی لئے ان دونوں کے امتزاج سے کبھی کبھی ابہام بھی پیدا ہونے لگتا ہے اور یہی ابہام عبدالصمد کے افسانے کا حسن ہے۔ یہ افسانے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

● "گمشدہ کلمات"، پاکستان کے ممتاز افسانہ نگار مرزا حامد بیگ کے ۱۶ افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ مرزا حامد بیگ کی ایک خصوصیت جو مجھے نظر آئی اور جس کی طرف ہمارے آج کے جدید افسانہ نگار زیادہ توجہ نہیں دے رہے ہیں کہ افسانے کی انسانیت حارجی حقیقت سے ابھرتی ہے اور یہی قاری سے اپنے کو پڑھواتی ہے۔ میں جناب سجاد باقر رضوی کی تائید کرتا ہوں کہ "حقیقت اور خواب" "نامعلوم"، "نامعلوم" موجود

اورنا موجود، سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ حامد بیگ ہمیں لبھانے کے لئے افسانہ شروع کرتے ہیں تو ان کے قدم ٹھوس زمین پر ہوتے ہیں ـــ گردو پیش کی دنیا ـــ ٹھوس تفاصیل، ہمیں ہر شے مانوس معلوم ہوتی ہے۔ پھر کسی موڑ پر مانوس، غیر مانوس میں ٹھوس اشیاء، تاثرات میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور پورا افسانہ ایک علامت بن کر ذہن میں در آتا ہے اور ہم سے اپنے معنی اور جہتیں متعین کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ افسانے کی روایت سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ انھوں نے اس روایت کے بہترین عناصر کو قبول کرتے ہوئے اسے آگے بڑھایا ہے۔ جناب سجاد باقر رضوی کا یہ خیال کہ مرزا حامد بیگ کسی موضوع پر افسانہ نہیں لکھتے مجھے زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ مجھے تو ان کے ہر افسانے میں نہ صرف یہ کہ موضوع نظر آیا بلکہ مجھے تو اس موضوع میں ایک انداز نظر کی کارفرمائی بھی دکھائی دی مثلاً "نیند میں چلنے والا لڑکا" ایک مخصوص معاشرے پر ایک مخصوص زاویئے سے طنز ہے۔ یہاں کسی قسم کی بے تعلقی نہیں۔ وہ مخلص فن کار کی طرح پورے جذبے کے ساتھ اپنے کرداروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے یہاں زوال پسند جاگیردارانہ نظام سے وہ ہمدردی کہیں نظر نہیں آتی جو ہمارے بعض افسانہ نگاروں کے یہاں نمایاں ہیں اور ہمارے قاری ان کا داستانوی انداز سے مطالعہ کرتے ہیں "کہانی کا بڑھاپا" میرے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ کے یہاں کبھی ابہام ملتا ہے لیکن وہیں تک جہاں تک کہ وہ حسن ہے۔ یہ اس لئے کہ ان کے قدم ٹھوس زمین پر ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند نقاد کبھی اگر سکہ بند تنقیدی نظر اپنائیں اور وہ مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا بغور مطالعہ کریں تو انھیں بھی اپنی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آئے گی۔

مرزا حامد بیگ کہیں کہیں کتابی زبان استعمال کرتے ہیں کہیں کہیں بالکل مقامی الفاظ ـــ میں سجاد باقر رضوی کی طرح ان کو ملزم نہیں سمجھتا اس سے شبہ کا فائدہ انھیں نہیں دینا چاہئے۔

مرزا حامد بیگ کے افسانے اردو افسانوی ادب کے لئے فال نیک ہیں اور جو لوگ آج کے اچھے افسانے پڑھنا چاہتے ہیں انھیں "گمشدہ کلمات" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ میں ان افسانوں پر پھر کبھی تفصیل سے بحث کروں گا کیوں کہ ہر افسانہ ایک علیحدہ مطالعہ چاہتا ہے۔

(ا۔ پ)

● آپ کا تازہ شمارہ جس پر میری تصویر چھپی ہے، ملا۔ جس کے لئے میں بہت بہت ممنون ہوں۔ چونکہ میں اپنی بیماری کی وجہ سے فرداً فرداً سب کو نہیں لکھ سکتا اس لئے آپ میری طرف سے انھیں لکھ دیجئے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور، اپندر ناتھ اشک، ابنِ فرید، ظ۔ انصاری، رام پال کو میں لکھنا چاہتا ہوں لیکن معذور ہوں۔

راجندر سنگھ بیدی۔ بمبئی

● آپ کا دوماہی رسالہ "الفاظ" جس کے سرورق پر میرے پرانے دوست راجندر سنگھ بیدی کی تصویر ہے، ملا۔ آج سے نصف صدی قبل جب میں "پھول" (لاہور) کا اڈیٹر تھا تو وہ اس کے لئے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ اشک اور رام پال کے مضامین پڑھ کر مجھے لاہور کا وہ زمانہ یاد آگیا اور بیدی کی تصویر نظروں میں پھرنے لگی۔ آپ کا رسالہ مختصر ہے مگر اپنی خوبصورتی، اپنے مضامین کے اعلیٰ معیار اور اپنے مرتبین کی خوش ذوقی کے باعث ضخیم رسالوں پر بھاری ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

غلام عباس، کراچی

● بیدی نمبر تو پوسٹ ہوتے ہی مل گیا تھا۔ آپ کے وفائے عشق کی داد دینا پڑے گی۔ خدا جانے تمھاری دادخواہی کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ مگر تمھارا لو لیٹر ۱۱ اپریل کو تحریر کیا گیا تو ۲۴ اپریل کو ملا۔ اتنی دیر یا تو تمھاری جیب کے گوشۂ عافیت میں رہا یا پوسٹل ڈیپارٹمنٹ تمھارے خط کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر بار بار پڑھتے رہے (ویسے اس ڈیپارٹمنٹ کے پاس بھی ایک گوشۂ عافیت ہے جسے لوگ ڈیڈ لیٹر آفس کے نام سے پکارتے ہیں۔)

چودہ دن میں دہلی سے علی گڑھ کا فاصلہ طے ہوا اس سے تو پاکستان اچھا، جو بدقسمتی سے (نجانے اُن کی یا ہماری) اگرچہ اجنبی ملک ٹھہرا مگر پھر بھی وہاں سے ایک ہفتہ میں خط مل جاتا ہے، بہرکیف تمھارا خط تو مل گیا۔ نصیب خیر تھا اچھا تھا ورنہ میں تو تمھیں سنگدل ڈیکلر کر ہی چکا تھا۔

الفاظ کے بیدی نمبر پر میں تبصرہ نہیں کروں گا کیوں کہ بیدی اب تبصرے کی اعلیٰ سطح سے بلند ہو چکا ہے۔ نمبر میں اختصار اور جامعیت دونوں تھیں ورنہ آج کل پہلوانوں کی طرح ضخیم ضخیم نمبروں کا چلن آپڑا ہے۔ جسے پڑھتے وقت ڈنڈ بیٹھکیں نکالنا پڑتی ہیں۔ یہ ایک ٹریجیڈی ہے کہ اتنے زیادہ ڈنڈ بیٹھکیں نکالنے کے بعد بھی پوچھا جائے "کچھ سمجھ میں آئیں بیدی کی گہرائیاں اور نکتہ بینیاں؟" تو جواب ملتا ہے "اس شخص میں تھکا دینے کی صلاحیت بہت ہے۔"

اطہر میاں! میں بھی بیدی کی سوچ اور اظہار کا ویسے ہی مداح ہوں جیسے لاکھوں دوسرے ہیں۔ مجھ

میں کوئی الگ انفرادیت نہیں۔ جو لوگ الگ انفرادیت کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے۔ تم نے بیدی نمبر نکال کر میری خود اعتمادی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ بڑا نمبر ضرور نکالو۔ اگرچہ ڈرتا ہوں کہیں بکھر نہ جاؤ۔ ویسے الفاظ اعلیٰ سطح کا ادبی پرچہ ہے۔ باقاعدہ نکالو تو یہ سطح برقرار رہ سکتی ہے۔ برقراری کی پیاس آج ہندوستان کے ادبی رسائل کو تڑپا رہی ہے۔

فکر تونسوی، نئی دہلی

● آپ نے افسانے کی فرمائش کی تھی اور ایک افسانہ زیر تحریر تھا۔ خیال تھا کہ جلد مکمل کر لوں گا اور الفاظ کے لئے نذر کر دوں گا مگر افسوس کہ افسانہ ابھی تک ادھورا رکھا ہے۔ سوچا آپ کو مطلع کر دوں جب بھی افسانہ لکھ لیا، بھجوا دوں گا۔ آپ اس کے لئے اپنا افسانہ نمبر نہ روکیں کسی آئندہ شمارے میں سہی۔ میں نے ایک غزل بہت عرصہ پہلے نذر کی تھی۔ نہ جانے وہ آپ تک پہنچی یا نہیں؟

احمد ندیم قاسمی، لاہور

● "الفاظ" کا "بیدی نمبر" میرے سامنے ہے۔ یقین فرمائیے کہ مجھے یہ خصوصی اشاعت بالخصوص بڑی اچھی لگی۔ راجندر سنگھ بیدی میرے محبوب افسانہ نگار ہیں، افسانہ نگار کیا ہیں جادوگر ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ انتہائی سادہ کار نظر آتے ہیں۔ ان کے فن پر پروفیسر آل احمد سرور، اپندر ناتھ اشک، ابن فرید، ظ۔ انصاری اور رام پال صاحبان کے مضامین کسی نہ کسی گوشہ کو منور کرتے ہیں۔ ضیاء الدین انصاری صاحب نے بیدی صاحب کی تصانیف کی فہرست پیش کی ہے۔ بظاہر یہ غیر اہم کام ہے لیکن میں ان دو صفحات کے مطالعہ کے بعد کچھ افسردہ کچھ مضمحل ہوا۔ بظاہر یہ چند کتابیں ہیں لیکن ایک دنیا ہیں۔ افسوس راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار کی تحریروں کا معتدبہ حصہ پاکستان میں ایک جگہ دستیاب نہیں ہو سکتا۔ جستہ جستہ مطالعہ کی بات ہی کچھ اور ہے جب آپ نے مجھ سے بیدی کے فن پر لکھنے کے لئے فرمایا تو میں بس یہی سوچتا رہا کہ کیا میں بیدی کے تمام افسانے پڑھ چکا ہوں۔ میں نے بیدی صاحب کے معتدبہ افسانوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن پھر بھی میں کیسے یقین کر لوں کہ اس کے تمام افسانے پاکستانی رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ رہا سوال بیدی کے نمائندہ افسانوں کے بارے میں مجموعی خیال کا تو بھائی بیدی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ان کی عظمت کے مجنوں صاحب بھی قائل ہیں، سرور صاحب بھی، باقر مہدی صاحب بھی اور ابن فرید صاحب بھی۔ گذشتہ دنوں سلیم احمد صاحب نے بھی ایک انٹرویو میں بیدی صاحب کے فن پر توصیفی رائے دی۔ میرا خیال ہے کہ بیدی نے اردو افسانے میں سطحیت اور جذباتیت کو نکال باہر کیا ہے اور وہ ان رشتوں کی گہرائیوں میں اتر کر "ان کہی" زبان میں وہ سب کچھ کہتے ہیں کہ بس الاماں۔

راہی معصوم رضا کا مضمون "غریب شہر" بہت پسند آیا۔ ۴۷ء کے بعد مضامین کی یاد تازہ ہو گئی۔ ندیم قاسمی، شاذ تمکنت، رفعت سروش، کشور ناہید، شہباز صدیقی، حامدی کاشمیری، ساغر مہدی اور منظور ہاشمی قابل مبارکباد ہیں۔

آپ نے قاسمی صاحب پر لکھنے کے لئے کہا ہے، حکم کی تعمیل کروں گا

محمد علی صدیقی، کراچی

آپ کے ارسال کردہ دونوں شمارے مل گئے۔ جدید رجحانات کے سلسلے میں آپ کا پرچہ ایک اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ سابقہ پرچے بھی عنایت فرمائیں اور آئندہ کرم فرمائی جاری رہے۔ عنقریب اشاعت کے لئے کچھ بھیجوں گا۔

وحید قریشی، لاہور

● مجھے مقالوں سے سخت کوفت ہوتی ہے اور براہ مہربانی میرے اوپر مقالہ نہ چھاپئے۔ مقالے کہانی کار کا گلا گھونٹنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ جس نمبر میں مقالے نہیں ہوں گے میں اس کے لئے کہانی بھیجوں گی۔ مقالوں نے میرا بہت دم گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کبھی نہیں پڑھے نہ کبھی پڑھوں گی۔ میں فلمی رسالوں میں لکھوں گی جو مقالے نہیں چھاپتے۔ میں قلم توڑ دوں گی، اگر انھوں نے بھی مقالے بازی شروع کر دی۔ میں علی گڑھ ہو کر آرہی ہوں۔ علی گڑھ سے نکلنے والا رسالہ میرے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ان مقالوں نے جو جدید لکھنے والوں کو پنجروں میں بند کیا ہے مجھے اس پر رونا آتا ہے۔ اب ذرا کھڑکی کھل رہی ہے اور امید ہے کہ دیواریں ڈھے جائیں گی۔ مجھے ہمیشہ دیواروں سے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ رسالے کے لئے دعائیں قبول کیجئے۔

عصمت چغتائی، بمبئی

● میں نے الفاظ کے صرف دو شمارے دیکھے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت خوب ہیں۔ الفاظ جس طرح آپ ترتیب دے رہے ہیں قابل ستائش و مبارکباد ہے۔ جاپان کو تو آپ اردو کے لحاظ سے ایک صحرا ہی سمجھئے۔ دور دور اردو کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔ ایسے میں آپ کا الفاظ یقین جانئے کسی گلشن سے کم نہیں ہے۔

محمد اقبال حنیف، ریڈیو جاپان، ٹوکیو

افسانہ نمبر (جلد دوم)

الفاظ

جلد ۶ | مئی، جون، جولائی، اگست ۱۹۸۱ء | شمارہ ۳، ۴

زرِ سالانہ ـــ سولہ روپے
قیمت افسانہ نمبر ـــ آٹھ روپے

پرنٹر پبلشر ـــ اسد یار خاں
مطبوعہ ـــ اسرار کریمی پریس، الہ آباد
کتابت ـــ ز۔ رشید، الہ آباد

مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق پر : انتظار حسین

پتہ : دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۶۹۸

آئینہ

گوشۂ انتظار

افسانوں کا افسانہ

افسانے ہی افسانے

○

اداریہ

آزادی کے بعد پہلی بار اردو کے حالات ذرا بہتر ہوئے ہیں۔ اکثریت اور حکومت کے رویے میں کچھ لچک پیدا ہوئی ہے، اردو کی تعلیم پانے والوں اور اردو کے ذریعے تعلیم پانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، اردو کے معیاری رسائل جاری ہوئے ہیں، عمدہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اب کچھ امید بندھی ہے کہ ہم اردو کو زندہ رکھنے اور اسے فروغ دینے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ لیکن وقت کے تقاضے کو نہ سمجھا گیا اور دانش مندی سے کام نہ لیا گیا تو جس صبح کے آثار نظر آرہے ہیں وہ صبح کاذب بھی ثابت ہوسکتی ہے۔

اس اندیشے کا سبب یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک کم اہم اور زیادہ اہم کاموں میں تمیز نہیں کی۔ اردو پڑھنے والے طالب علموں کو شکایت ہے کہ اردو کی درسی کتابیں بھدی اور غیر دلچسپ ہیں اور امدادی کتابیں تو سرے سے ہیں ہی نہیں۔ دوسرے طالب علم اردو پڑھنے والوں سے اس لئے سبقت لے جاتے ہیں کہ عمومی مطالعے کے لئے ان کے پاس بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو جو بچے اردو کے ذریعے تعلیم پا رہے ہیں وہ کسی اور زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر مجبور ہوں گے اور جو طالب علم اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھتے ہیں وہ اردو کے بجائے کوئی اور مضمون منتخب کرلیں گے۔ اس وقت ملک میں متعدد اردو اکیڈمیز موجود ہیں، انھیں اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔

ہمارے اداروں میں نہ باہمی رابطہ ہے نہ انھوں نے ترجیحات طے کی ہیں۔ مثلاً اردو اکیڈمیز جلسوں اور سیمناروں پر بڑی رقمیں اور بہت وقت صرف کررہی ہیں۔ بلاشبہ یہ بھی ایک مفید کام ہے مگر اس کے لئے ملک میں اردو کے بہت سے شعبے موجود ہیں جو یہ کام یو۔ جی۔ سی کے مالی تعاون سے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں اور دے رہے ہیں۔ بعض اکیڈمیز تحقیقی و تنقیدی رسائل جاری کرنے کے پروگرام بنا رہی ہیں۔ یہ بھی مبارک کام ہے لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ نئے رسالے نکالنے کے بجائے ان معیاری رسائل کو مستحکم کیا جائے جو پہلے سے نکل رہے ہیں اور مالی مشکلات میں گرفتار ہیں؟

ترقی اردو بورڈ اس وقت یونی ورسٹی سطح کے کتابیں تیار کرانے میں مصروف ہے۔ یہ کام بہت اہم ہے۔ اہل قلم کو اس کام میں بورڈ سے بھرپور تعاون کرنا چاہئے۔ جو لوگ کتابیں تیار کر رہے ہیں انھیں ذرا تیز رفتاری سے کام کرنا چاہئے۔ انجمن ترقی اردو سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہیں ہوسکیں۔ یہ ادارہ اپنی شاخوں کے ذریعے سارے ملک میں فروغ اردو کا کام انجام کام دے سکتا تھا مگر یہ محض بک ڈپو کا منصب سنبھال کر مطمئن ہوگیا۔ اس ادارے میں نئے سرے سے جان ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ہم اردو اکیڈمیوں کے منتظمین کی توجہ تین اہم کاموں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں:

* نرسری یعنی ابتدائی سے آٹھویں جماعت تک کے لئے درسی کتابیں ماہرین سے تیار کرا کے خوبصورت اور باتصویر آفسٹ سے چھاپی جائیں۔

* اردو میڈیم سے تعلیم پانے والے طلبہ بہترین اور بہت سی امدادی کتابوں کے بغیر دوسرے بچوں کے قدم بہ قدم نہیں چل سکتے۔ چھوٹی چھوٹی کتابوں کا ایک بڑا سیٹ تیار کیا جائے اس میں ہر موضوع پر آسان زبان میں لکھی ہوئی کتابیں شامل ہوں۔ یہ سیٹ اس طور پر تیار کیا جائے کہ مکمل ہونے کے بعد اس کی حیثیت بچوں کے جدید ترین انسائیکلو پیڈیا کی ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ پھر انسائیکلو پیڈیا ہی کیوں نہ تیار کرایا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ (۱) مکمل کتاب تیار کرانے کے لئے کئی برس درکار ہیں اور تاخیر اس وقت مضر ہے۔ (۲) قیمتی کتاب کا خریدنا دشوار ہوتا ہے۔ (۳) بچے ضخیم کتابوں سے گھبراتے ہیں — البتہ چھوٹی چھوٹی کم قیمت کتابیں ہر مہینے خرید کر پڑھی اور جمع کی جا سکتی ہیں۔

* بچوں کا ایک بہت عمدہ، معلوماتی، دلچسپ رسالہ جاری کیا جائے۔ یہ سہ رنگا، باتصویر ہو اور آفسیٹ پر چھاپا جائے۔ اردو میں بچوں کے کئی رسالے نکل رہے ہیں مگر دوسری زبانوں کے رسالے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ابھی بہت پیچھے ہیں۔

ہماری تجویز ہے کہ اردو اکیڈمیوں کے سربراہ سر جوڑ کے بیٹھیں اور مل کر کوئی مشترکہ پروگرام بنائیں۔ اگر ایک ایک اکیڈمی ایک ایک کام کی ذمہ داری سنبھال لے تو اس ضرورت کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے بچوں کی ضرورت اس وقت سارے کاموں پر مقدم ہے اور انھی پر اردو کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ اگر تمام اردو اکیڈمیز صرف ایک سال کو "بچوں کا سال" قرار دیں تو اردو کی بنیاد اس ملک میں مضبوط ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے ایسا کرنے میں باقی کاموں کو ایک سال کے لئے کم یا ملتوی کرنا پڑے مگر وقت کی آواز یہی ہے۔ اس کام میں تاخیر ہوئی تو وقت نکل جائے گا۔ پھر ساری کوششیں بے سود ہوں گی۔ جڑ سوکھ گئی تو شاخیں آپ سے آپ مرجھا جائیں گی۔

— مجلس ادارت

انتظار حسین
لاہور، پاکستان

سفرِ منزلِ شب

"اچھا؟..... تو؟..... تو وہ تو تھا؟"

ہاشم، حیدر، عبید، حمید، چاروں کی نظریں حبیب پر جم گئیں۔ ان پر یہ انکشاف بجلی بن کر گرا تھا وہ تو سکتہ میں آ گئے۔ کتنی دیر تک پتھر بنے بیٹھے رہے۔

"مگر......" حیدر نے زبان کھولی۔ کچھ کہنے لگا تھا۔ کیا کہنے لگا تھا۔ کہتے کہتے جیسے الجھ گیا ہو۔ چپ ہو گیا۔

پھر حمید نے جھرجھری لی۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا۔" اور اس نے حبیب کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بولے۔ شاید یہ کھلے کہ وہ کوئی اور تھا، وہ نہیں تھا۔ مگر حبیب نے جیسے ہونٹ سی لئے تھے۔

حمید نے پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ لہجہ میں تھوڑا تحمل پیدا کرتے ہوئے بولا "تو اس سے انکار نہیں کرے گا؟"

پھر سب کی متجسس نظریں اس پر جم گئیں۔ شاید اب وہ کچھ بولے گا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہے گا مگر ہونٹ سل گئے تھے، سلے رہے۔

"تو ہم یہ سمجھیں کہ۔" آخر عبید نے قطعی لہجہ میں زبان کھولی "وہ تو ہی تھا۔"

ذرا جو اس نے جنبش کی ہو۔

رفتہ رفتہ حیرت اور بے یقینی کے لمحے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ انھیں یقین آ گیا کہ وہ شخص وہی ہے۔ اور ان کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

چاروں نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا، جیسے وہ ان میں سے نہیں ہے۔ وہ جو انھیں میں سے تھا اچانک ان میں سے نہیں رہا تھا۔ کتنی سرعت سے وہ ان کے لئے بیگانہ ہوا۔ کتنی عجلت کے ساتھ وہ اس سے جدا ہوئے۔

پہلے ہی وہ گھٹ چھنٹ کر پانچ رہ گئے تھے۔ اب چار رہ گئے۔ حبیب ان سے کٹ چکا تھا، حبیب سے وہ کٹ چکے تھے۔ اب وہ ان کے لئے ایک اجنبی تھا۔ پہلے بھی تو یہی ہوتا رہا تھا۔ ساتھی ان سے کٹتے گئے اور اجنبی بنتے گئے۔ بس اچانک کوئی ایک کٹتا اور اچانک اجنبی بن جاتا۔ مگر جب پانچ رہ گئے تو یوں نظر آرہا تھا کہ یہ یک جان پانچ قالب ہیں۔ کتنے کتنے مشکل مرحلوں میں وہ قدم سے قدم ملا کر چلے تھے۔ کتنی دیر کتنی دور ساتھ چل کر ایک پھر ٹوٹ گیا، اور وہ جو سب سے پختہ دکھائی دیتا تھا۔

"عجیب بات ہے۔" حمید بولا۔ "ہم یہ سمجھتے رہے کہ سب کچھ باہر سے ہو رہا ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ہمیں میں سے ایک......"

"ہاں ہمیں میں سے ایک۔" عبید نے افسوس بھرے لہجہ میں کہا۔ "اور وہ جس پہ ہمیں سب سے زیادہ اعتبار تھا۔"

"مگر......" حیدر پھر کچھ کہنے لگا تھا۔ کتنی دیر بعد پھر اس نے زبان کھولی تھی۔ مگر کہتے کہتے پھر رک گیا۔ شاید پھر الجھ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس واقعہ کا سب سے زیادہ اس نے اثر قبول کیا ہے۔

"ہاں واقعی۔" حمید بولا۔ "سب سے زیادہ تو ہم نے اسی پر اعتبار کیا تھا۔"

"یہ تم لوگوں کی خوش فہمی تھی۔" اب ہاشم نے زبان کھولی۔ "مجھے تو اس پہ پہلے سے شک تھا۔"

عبید نے اسے غور سے دیکھا۔ "یہ تو تم اب کہہ رہے ہو۔"

"میں نے کئی موقعوں پہ اشارہ کیا تھا۔ مگر کسی نے میری بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔"

"ہم تو اس کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہم میں سب سے زیادہ جوشیلا تو وہی تھا۔ کتنا بے جگرا تھا۔ سر دھڑ کی بازی لگانے پہ تیار رہتا تھا۔" حمید نے یہ بات اس طرح کہی کہ ان کے تصور میں اگلے پچھلے مختلف واقعات گھوم گئے کہ کب کب اس نے جان جوکھوں میں ڈالی تھی، کب کب ایسے کام اپنے ذمے لئے تھے جن میں ذرا سی چوک اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

مگر ہاشم اس بیان سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ بولا "ایسے لوگ ایسے ہی جانباز نظر آیا کرتے ہیں۔" رک کر بولا۔ "وہ جو اتنا جانباز بنتا تھا اسی سے تو مجھے اور شک ہوا تھا۔"

عبید کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔

"انھوں نے ہم پر کتنا اعتبار کیا تھا۔ کتنا بھروسہ تھا انھیں ہم پہ۔ اب جب یہ خبر ان تک پہنچے گی تو وہ کیا سوچیں گے...... سمجھیں گے کہ ہم بھی ایسے ہی ہوں گے۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا۔" ہاشم نے اعتماد بھرے لہجہ میں کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ ہم میں جو ایک مشتبہ شخص تھا وہ دفع ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے پر پورا اعتبار کر سکتے ہیں۔"

"اچھا؟ اس کے بعد بھی؟" حیدر کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا۔ وہ کب سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر زبان کھولتے کھولتے رک جاتا کہ بات اس کے لبوں پر آتے آتے الجھ جاتی۔ اب بلا ارادہ اس کے منہ سے ایک جملہ نکل گیا، ایسا کہ سب چونک پڑے۔

ہاشم نے غصے سے اسے دیکھا۔ "تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"میں کہتا ہوں۔" اب اس کی زبان کھلنے لگی تھی۔ "اس میں اور ہم میں کیا فرق تھا۔ آخر ہم اکٹھے ایک ہی طرح سوچ رہے تھے، ایک ہی نہج پر کام کر رہے تھے۔ اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی ہے تو ہم اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں۔"

عبید اور حمید اس دلیل سے قائل ہوتے نظر آ رہے تھے۔ مگر ہاشم نے تاؤ کھایا۔ "تو ہم پر شک کر رہا ہے؟"

"کم از کم میں اپنے آپ کو شک سے بالاتر قرار نہیں دے سکتا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" ہاشم غصے سے بولا۔ "تو تو اس کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا تو اس سے بے خبر تو نہیں ہو سکتا۔"

عبید اور حمید نے چونک کر غور سے حیدر کو دیکھا۔

"چپ کیوں ہو گیا؟" ہاشم نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔

حیدر نے عبید، حمید، ہاشم تینوں کو دیکھا جو اسے شک بھری نظروں سے تک رہے تھے۔ پھر دھیرے سے بولا۔ "ہو سکتا ہے .... شاید میں بھی ...."

"تو؟ .... تو بھی؟ ...." عبید اور حمید دونوں کے منہ سے ایک ہی وقت میں ایک ہی جملہ بے ساختہ نکلا۔

"ہاں شاید میں بھی .... اگر اس نے گڑبڑ کی ہے تو میں کیسے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں اس میں ملوث نہیں تھا۔" یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔ تینوں نے اسے غور سے دیکھا۔ جب وہ چلنے لگا تو عبید اور حمید کچھ پریشان نظر آئے۔

"تو جا رہا ہے؟"

"ہاں میرا خیال ہے کہ میرا چلا جانا ہی بہتر ہوگا کہ اس کے نکل جانے کے بعد میری حیثیت بھی مشتبہ ہوگئی ہے۔"

وہ چلا گیا۔

ایک دفعہ پھر وہ گم سم ہوگئے۔ مگر ہاشم نے جلدی ہی خاموشی کی مہر توڑ دی۔ "تم تو اپنی وضعداری میں چپ رہتے۔ میں نے اسے EXPOSE کردیا۔"

عبید اور حمید دونوں تذبذب میں تھے۔ عبید چپ رہا۔ حمید سے رہا نہ گیا "یقین نہیں آتا کہ وہ بھی...؟"

"اب بھی یقین نہیں آیا۔" ہاشم تڑخ کر بولا۔ "اس نے تو خود اعتراف کرلیا۔ اصل میں میں بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت اکھڑا اکھڑا تھا۔ اور تم نے یہ غور نہیں کیا کہ اس سارے عرصے میں وہ بولا ہی نہیں تھا۔ ہر بات سنتا چلا جارہا تھا۔ میں نے اسے تاڑ لیا تھا۔ کیسا CORNER کیا۔ آخر کو پھٹ پڑا۔"

"اور ہم سے ٹوٹ گیا۔" عبید نے افسوس بھرے لہجہ میں آہستہ سے کہا۔

"اچھا ہی ہوا۔ ٹکا رہتا تو ہمارے حق میں یہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے اس طرح گھیرا کہ اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ ٹک کیسے سکتا تھا۔ اچھا ہوا۔ اب ہم محفوظ ہیں۔"

ہاشم رواں تھا۔ عبید اور حمید اس کا منھ تک رہے تھے۔ جیسے ان کی مت ماری گئی ہو۔ ایک کے بعد اتنی جلدی دوسرا۔ وہ کچھ بوکھلا سے گئے تھے۔ ہاشم فاتحانہ شان سے بولے چلا جارہا تھا۔ ثابت کررہا تھا کہ وہ دونوں ملے ہوئے تھے۔ "حیدر مصلحت کے تحت ٹکا رہنا چاہتا تھا۔ مگر بس میں نے اسے EXPOSE کردیا۔ اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ پھر وہ کیسے ٹک سکتا تھا۔ چلا گیا۔ اچھا ہوا۔ اس کا ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا چلا جانا بہت ہی اچھا ہوا۔"

عبید اور حمید سنے جارہے تھے۔ قائل ہونے لگتے کہ بے یقینی کی ایک لہر آتی اور وہ اکھڑ جاتے۔ ہاشم پھر اسی جوش و خروش سے اپنے استدلال کی تعمیر کھڑی کرتا۔ پھر وہ قائل ہونے لگتے مگر قائل ہوتے ہوتے پھر اکھڑ جاتے۔ وہ بس یقین اور بے یقینی کے بیچ ڈول رہے تھے۔ اسی میں رات ہوگئی۔

"اب سونا چاہئے۔"

"ہاں مٹی ڈالو اس پر۔ سوتے ہیں۔"

اس رات وہ جلدی لیٹے کہ اس واقعہ پر سوچ سوچ کر تھک گئے تھے۔ جلدی لیٹے مگر دیر میں سوئے کہ جانے کتنی رات تک ان کے ذہن اسی ادھیڑبن میں رہے۔

دیر سے سوئے، جلدی جاگے۔ جاگنے کے ساتھ ایک نئی حیرانی۔ جب وہ سوئے تھے تو تین تھے اور جب صبح کو جاگے تو دو رہ گئے تھے۔

"وہ کہاں گیا؟" حمید نے خالی چارپائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون؟"

"ہاشم۔"

"ہاشم؟" عبید کہ آدھا جاگ رہا تھا آدھا سو رہا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس چارپائی کو دیکھا جس پر ہاشم سویا تھا۔ تھوڑا چکرایا۔ مگر وہ اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سادگی سے بولا "یہیں کہیں ہوگا۔"

حمید نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ واپس آیا۔ بولا "یہاں کہیں نہیں ہے۔"

عبید نے قائل کیا۔ پھر کہا "شاید سیر کو نکل گیا ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔ مگر جب کبھی وہ صبح کی سیر کے لئے اٹھتا تھا تو ہمیں بھی ضرور جھنجھوڑتا تھا۔"

"ممکن ہے یہ سوچ کر کہ پریشانی میں دیر سے سوئے ہیں جگانا مناسب نہ جانا ہو..... کوئی بات نہیں آجائے گا۔"

اس استدلال سے بظاہر وہ دونوں ہی مطمئن ہوگئے تھے۔ مگر اندر سے دونوں ہی بےچین تھے۔ کتنی بیکلی کے ساتھ انھوں نے اس کا انتظار کیا۔ وقت گزرتا گیا۔ بیکلی بڑھتی گئی۔ اور وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ صبح کا دھندلکا کبھی کا چھٹ چکا تھا۔ دن چڑھ رہا تھا اور گرم ہوتا جا رہا تھا۔ عبید اور حمید پر وقت جتنا گزرتا جاتا تھا بھاری ہوتا جاتا تھا۔ آخر کو حمید سے رہا نہ گیا۔ "اب تو بہت دیر ہوگئی۔"

"ہاں آنا ہوتا تو اب تک آجاتا۔"

حمید عبید کا منہ تکنے لگا۔ خیال اس کا بھی یہی تھا۔ مگر عبید سے وہ اتنے قطعی لہجہ میں جواب کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

"تو کیا........."

"ہاں شاید اب وہ نہیں آئے گا۔"

"تو گویا وہ بھی......"

پھر دونوں ہی چپ ہوگئے۔ چپ بیٹھے رہے۔ تذبذب اب تمام ہو چکا تھا۔ اور عبید کو تو بالکل صبر آگیا تھا۔ "خیر اس کے لوٹ جانے پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ بول بہت رہا تھا۔" رکا۔ پھر بولا۔" ایسے وقت میں جو شخص بہت بولتا نظر آئے اسے شک کی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔"

"اور جو چپ چپ نظر آئے؟"

عبید نے تامل کیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔" اسے بھی۔"

"عجیب بات ہے۔" حمید بڑبڑایا۔

"ہاں عجیب بات ہے۔ مگر شاید اتنی عجیب بات بھی نہیں ہے۔ ایسے میں تو ہر بات ہی سے شک پیدا ہی ہوتا ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے کیسی کیسی گھڑی عبید کے دھیان میں آئی کہ جب ایک دم سے وہ سب ایک دوسرے کے لئے مشکوک ہو گئے تھے۔ کوئی چپ ہو جانے پر مشکوک ٹھہرا کوئی بول پڑنے پر۔ کسی پر شک کی خبر سن کر اتنا بو کھلا کیوں گیا۔ کسی پر شک کی خبر سن کر اسے سانپ کیوں سونگھ گیا۔ کسی کے باخبر ہونے سے شک پیدا ہوا کہ اسے کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ کسی کی بے خبری نے شک میں ڈالا کہ کہیں وہ جان کر تو بےخبر نہیں بن رہا۔ شکوک و شبہات کی دھند کتنی پھیلی کہ دوست دوست کو نہ پہچان پاتا۔ دماغ کے کسی گوشے میں چپکے سے ایک سوال سر اٹھاتا۔ بات زبان پر آتی اور سرگوشی بن کر کانوں کان پھیلتی چلی جاتی۔

بیٹھے بیٹھے ایک لہر آئی اور عبید اٹھ کھڑا ہوا۔ حمید نے سوال بھری نظر سے اسے دیکھا" کیوں؟... کہاں؟"

"یہاں سے نکل چلنا چاہیئے ورنہ ممکن ہے کہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں۔"

حمید چونک پڑا۔ اس پہلو پر تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بس فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

دن بھر چلتے رہے۔ یہ سوچے بغیر کہ کہاں جانا ہے۔ کوئی منزل نظر میں نہیں تھی۔ پھر بھی ایک عجلت میں چلے جا رہے تھے جیسے واقعی کہیں پہنچنا ہے۔ چلے جا رہے تھے یہ دھیان دیئے بغیر کہ کتنا چل لئے ہیں کتنا اور چلنا ہے۔ کتنے سنسان کتنے آباد رستے قدموں نے ناپے۔ قدموں میں بجلی بھری تھی کہ اسی ایک سی تیزی سے اٹھ رہے تھے اور رستے گرد ہوتے چلے جا رہے تھے۔

"بس اب یہاں ٹھہر جائیں۔" اچانک عبید نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"لیکن........."

عبید نے حمید کی بات کاٹی" رات تو یہیں گزارتے ہیں۔ صبح کیا کرنا ہے، کدھر جانا ہے، یہ سوچیں گے" تو وہ وہاں پسر گئے۔ اور اب انھیں احساس ہوا کہ وہ کتنا تھک گئے ہیں۔ ٹانگیں کتنا اکڑ گئی ہیں۔

جیسے یہاں سے اب وہ ایک قدم آگے نہیں اٹھا سکتے۔ حمید نے کمر ٹیک لگائی، ٹانگوں کو سیدھا کیا، پھیلایا بولا "آج بہت چلے ہیں۔ تھک کر چور ہو گئے۔"

"اس سے پہلے تو ہم بہت آرام کرتے تھے۔" عبید نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

اس فقرے نے عجب اثر کیا۔ دونوں ہی ملول ہو گئے۔ بیتے دنوں کی کلفتیں اور صعوبتیں نظروں میں پھر گئیں۔ کتنے دنوں سے وہ یہ رنج کھینچ رہے تھے۔

"مگر اس سے پہلے ہم اکٹھے چلا کرتے تھے۔" حمید نے عجب طرح سے کہا کہ بچھڑنے والے دونوں ہی کو ایک دم سے یاد آ گئے۔ وہ بھی جو پہلے بچھڑے تھے، وہ بھی جو اب آ کر بچھڑے، کب کب کا ملنا اور بچھڑنا یاد آیا۔ کون کون کس کس موڑ پر بچھڑا اور کس کس طور بچھڑا۔ کوئی تو چلتے چلتے بس یک گیا اور رہ گیا۔ کسی نے موڑ پر پہنچ کر اپنا اصلی چہرہ دکھایا اور خندق کے اس پار نظر آیا۔ کوئی بیچ منجدھار میں چھوڑ کر گیا۔ کوئی پانی میں اترنے سے پہلے ہی دوسری طرف بہہ گیا۔ یار حیران کہ کہاں گیا۔ کدھر نکل گیا؟ دوستوں کے تجسس، چہ میگوئیاں، سرگوشیاں۔ پھر خبر ملنا کہ وہ عزیز خندق کے اس پار پہنچ گیا۔ اچھا؟ واقعی؟ اول حیران ہونا، پھر ایک دوسرے کو قائل کرنا کہ وہ تو تھا ہی اس قماش کا۔ بس اسی طرح کتنے ہم سفر بچھڑ چکے تھے۔ آگے کتنے قریب تھے۔ اب کتنے دور ہو چکے تھے۔

حمید نے ٹھنڈا سانس بھرا "اب تو ہم دو ہی رہ گئے ہیں۔"

"ہاں یار۔" عبید افسردگی سے بولا۔ پھر کہنے لگا "ایسے حالات میں دو کا ہی رہ جانا بھی بہت غنیمت نظر آتا ہے۔"

"مگر کب تک؟"

عبید حمید کو تکنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا "ٹھیک کہتے ہو۔ آخر کب تک؟"

پھر آپس میں وہ کوئی بات نہ کر سکے۔ بس جیسے ذہن میں ایک پھانس پڑ گئی ہو۔ کب تک، آخر کب تک۔ دیر تک دونوں نہ سو سکے نہ بات کر سکے۔ پھانس بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ ہاں آخر کب تک دیر تک جاگا کئے اور کروٹیں بدلا کیے۔ مگر نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ مگر وہ نیند کہاں تھی۔ عبید کو تو بس ایک جھپکی سی آئی تھی۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ یوں ہی اس نے حمید پر نظر ڈالی جو اس کی طرف کروٹ لئے پڑا تھا۔ اور یوں ہی اسے خیال آیا کہ اسے تو نیند آ نہیں رہی مگر حمید کس اطمینان سے سو رہا ہے۔ اتنے میں حمید نے کروٹ بدلی۔ اس نے پھر حمید پر نظر ڈالی۔ شاید وہ جاگ رہا ہے۔ یا شاید سو رہا ہو اور سوتے سوتے کروٹ بدلی ہو۔ اس نے ایک مرتبہ پھر حمید پر نظر ڈالی۔ غور سے اسے دیکھا یہ جاننے کے لئے وہ

واقعی سو گیا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اگر وہ جاگ رہا ہے تو یہ کیوں ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے۔ کیوں؟
اور ایک شک کے ساتھ اس نے حمید کا جائزہ لیا۔ شاید سو ہی رہا ہو۔ میرا یہ محض وہم ہے کہ وہ جاگ رہا ہے۔ لیکن اگر وہ جاگ رہا ہے اور ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے تو یہ تو شک میں ڈالنے والی بات ہے۔ اور اس کے اندر شک تقویت پکڑتا چلا گیا۔ دماغ میں ایک اندیشہ جاگا، کہیں یہ نہ ہو کہ جب صبح میں اٹھوں تو اپنے آپ کو اکیلا پاؤں۔ اس خیال نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ اکیلا رہ جانے کا خیال بھی کتنا خوف بھرا ہوتا ہے۔ اچانک اسے کتنا ڈر لگنے لگا تھا۔ اگر میں اکیلا رہ گیا تو....
..... نہیں۔ اس نے فوراً ہی اپنے اس خیال کی تردید کی۔ حمید ہاشم نہیں بن سکتا۔ ہاشم کے تو شروع ہی سے تیور اور قسم کے تھے۔ آدمی ہی وہ اور طرح کا تھا۔ حمید ویسا آدمی نہیں ہے۔ اس نے اپنے آپ پر نفرین کی کہ بے دیکھے ایک رفیق رہ گیا ہے اس پر بھی وہ شک کرتا ہے۔ میں بہت کمینہ آدمی ہوں۔ مگر پھر اس نے اپنی کمینگی کے لئے ایک عذر بھی تراش لیا۔ رفیقوں کی دغا نے مجھے شکی المزاج بنا دیا ہے۔
عبید پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ حمید نے پھر کروٹ لی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں حمید کی طرف دیکھا جس نے کروٹ بدل کر پھر اس کی طرف پیٹھ کر لی تھی۔ گمان تو اسے پہلے ہی ہوا تھا۔ اب یقین آ چلا تھا کہ حمید سویا نہیں ہے۔ ظاہر کر رہا ہے کہ سو گیا ہے اس کے ساتھ ہی اسے حمید کا فقرہ یاد آیا۔
مگر کب تک؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حمید بھی اب ڈانواڈول ہے۔ اچھا حمید بھی۔ اس خیال کے ساتھ وہ کتنا افسردہ ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اپنی اس بدگمانی پر قابو پا لے۔ حمید اور طرح کا آدمی ہے، ہاشم نہیں ہے۔ سچا اور کھرا آدمی ہے۔ یہ تو گویا اپنے وسوسوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اپنے وسوسوں کے ساتھ وہ بہت لڑا۔ بہت کشتم کشتا ہوئی۔ مگر بے خوابی سے اس کے وسوسے طاقت پکڑتے چلے گئے اور وہ کمزور پڑتا چلا گیا۔

وہ اپنے وسوسوں کے نرغے میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ مجھے آج کی رات سونا نہیں چاہئے۔ سویا مویا برابر۔ بے خبری میں تو نہیں مارا جانا چاہئے۔ ہاشم نے آخر ہماری نیند ہی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ نہیں، مجھے جاگتے رہنا چاہئے۔
رات بھر جاگتے رہنے کے ساتھ وہ دور دور کی باتیں دھیان میں لایا۔ کوئی نیا سا خیال، کوئی عجب سی تجویز، جو بھی اس کے ذہن میں آتا اسے وہ دیر تک پکاتا۔ اس میں تفصیلات کا رنگ بھرتا چلا جاتا۔
اسی عالم میں ایک خیال اسے اور آیا۔ حمید کو کیوں موقع دیا جائے کہ میرے ساتھ وہ کرے جو ہمارے ساتھ ہاشم نے کیا تھا۔ کیوں نہ میں خود ہی........ ہاں بالکل۔ جب سب ہی نے یہ کیا ہے تو میں بھی......

ور حبیب تو ہم سب میں سب سے بڑھ کر صاحب کردار سمجھا جاتا تھا۔ اگر حبیب یہ کرسکتا ہے تو میں یہ کیوں
ہیں کرسکتا۔ اس خیال کی رو میں وہ بہنے لگا تھا کہ اچانک اس نے اپنے آپ کو تھاما۔ نہیں یار کسی کو قائم
بھی رہنا چاہیئے۔ جیسے اچانک اس کے ایک کے دو ہوگئے۔ ایک دوسرے سے شرمندہ سا تھا۔ عذر کرنے
لگا کہ بس یونہی مجھے ایک خیال سا آیا تھا۔ اور پھر اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ایسا خیال مجھے مغلوب نہ کرے۔

حمید نے ایک مرتبہ پھر کروٹ لی۔ اور پھر اس کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ سوتا سا بن گیا۔ دیکھوں
تو سہی کرتا کیا ہے۔ دیر تک ایسے پڑا رہا جیسے وہ بے سدھ ہو رہا ہے۔ مگر جب حمید نے کوئی کروٹ نہ لی تو اس
کی طرف سے بے تعلق ہو کر سوچنے لگا کہ تھوڑا سو لینا چاہیئے پتہ نہیں کل دن کس طرح گزرے اور رات کہاں
آئے۔ کم از کم تھوڑی نیند تو لے ہی لینی چاہیئے۔ اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ آخر وہ جاگ کیوں رہا ہے
حمید کی نگرانی کرنے کے لیئے؟ اور اپنی نگرانی؟ اسے خیال آیا کہ ابھی وہ بھی تو ڈانوا ڈول ہوگیا تھا۔ ایسے
عالم میں آدمی کو دوسرے سے زیادہ اپنی نگرانی کرنی چاہیئے۔

حمید واقعی جاگ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اس کی آنکھ ضرور لگی۔ مگر صرف آنکھ۔ دماغ نہیں سو رہا تھا
دماغ نہ سوئے تو آنکھ کتنی دیر تک لگی رہ سکتی ہے۔ آنکھ لگی اور کھل گئی بس پھر بار بار کوشش کرتا تھا کہ دماغ
سے سارے خیال نکل جائیں اور وہ سو جائے۔ کتنی مرتبہ اسے گمان ہوا کہ اس نے اچھے برے خیالوں کو
نکال باہر کیا ہے۔ اب نیند آجائے گی۔ دیر تک ایسے پڑا رہا جیسے بس نیند آنے لگی ہے۔ آرہی ہے، آگئی ہے،
مگر پھر پتہ چلتا کہ جنھیں نکال باہر کیا تھا وہ سب پھر اندر گھس آئے ہیں اور دھاچوکڑی مچا رہے ہیں۔ پھر کروٹ
لینا، جیسے کروٹ لینے سے دماغ سے اچھے برے خیال رخصت ہو جائیں گے اور نیند کے لیئے رستہ صاف ہو جائے گا

کروٹیں لیتے لیتے اسے احساس ہوا کہ عبید بھی سویا نہیں ہے۔ اچھا میں سمجھ رہا تھا کہ سو گیا ہے۔
جاگ رہا ہے تو ظاہر کیوں نہیں کرتا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مگر خیر اس نے اپنے اس خیال کو زیادہ طول نہیں
دیا۔ وہ اس وقت اپنے کسی بھی خیال کو طول دینا نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس وقت سونے کی فکر تھی۔ مگر خیال
خود بخود طول پکڑتے چلے جا رہے تھے۔ اور پھر اسے گمان گزرا کہ عبید نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ اس نے کئی
بار اس کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ پہلے گمان ہوا، پھر کروٹ لیتے ہوئے اس نے عبید کی طرف اڑتی سی نظر
ڈالی اور پایا کہ واقعی وہ تو اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ کیا میں بھی مشکوک ہو چکا ہوں۔ اس نے اس خیال
کو بہت رفع دفع کرنا چاہا۔ مگر اپنی ہر کروٹ کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ عبید چوکنا ہو گیا ہے۔

حمید نے ایک بار پھر کروٹ لی اور ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ عبید اس کی کروٹ

عبید یہ ظاہر تو نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مگر پھر بول ہی پڑا "ہوں" اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یار نیند نہیں آرہی ہے۔" پھر تھم کر بولا "تم تو سو گئے ہو؟"

"نہیں" حمید نے روکھا سا جواب دیا۔

"یار رات بہت لمبی ہو گئی۔" عبید نے جماہی لی۔

حمید نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور سنجیدگی سے مخاطب ہوا "عبید۔"

"ہاں۔ کیا بات ہے۔" عبید نے غور سے حمید کو دیکھا۔

"تمھیں میرے بارے میں کوئی شک ہے؟"

عبید جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو بشپٹا یا۔ پھر سنبھلا۔ آہستہ سے بولا "ہاں۔ تمھارے بارے میں بھی اور اپنے بارے میں بھی۔"

حمید اس کی صورت تکنے لگا۔ چپ رہا۔ پھر دبے لفظوں میں بولا "شاید میرا بھی یہی قصہ ہے۔" □

گوپی چند نارنگ
صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی

انتظار حسین چوتھے کھونٹ میں
(افسانہ نگاری کا حالیہ دور اور "کشتی" کا استفہامیہ سفر)

انتظار حسین اس عہد کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ اپنے پرتاثیر تمثیلی اسلوب کے ذریعے انھوں نے اردو افسانے کو نئے فنی اور معنیاتی امکانات سے آشنا کرایا ہے، اور اردو افسانے کا رشتہ بیک وقت داستان، حکایت مذہبی روایتوں، قدیم اساطیر اور دیومالا سے ملا دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ناول اور افسانے کی مغربی ہیئتوں کی بہ نسبت داستانی انداز ہمارے اجتماعی لاشعور اور مزاج کا کہیں زیادہ ساتھ دیتا ہے۔ داستانوں کی فضا کو انھوں نے نئے احساس اور نئی آگہی کے ساتھ کچھ اس طرح برتا ہے کہ افسانے میں ایک نیا فلسفیانہ مزاج، اور ایک نئی اساطیری و داستانی جہت سامنے آگئی ہے۔ انھوں نے فرد و سماج، حیات و کائنات اور وجود کی نوعیت و ماہیت کے مسائل کو بھی نئی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر روحانی اور ذہنی ہے۔ وہ انسان کے باطن میں سفر کرتے ہیں، نہاں خانۂ روح میں نقب لگاتے ہیں اور موجودہ دور کی افسردگی، بے دلی اور کش مکش کو تخلیقی آئینہ دکھاتے ہیں۔ عہد نامۂ عتیق و اساطیر و دیومالا کی مدد سے ان کو استعاروں علامتوں اور حکایتوں کا ایسا خزانہ ہاتھ آگیا ہے جس سے وہ پیچیدہ سے پیچیدہ خیال اور باریک سے باریک احساس کو سہولت سے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایسی سادگی اور تازگی ہے جس کی کوئی نظیر اس سے پہلے اردو افسانے میں نہیں ملتی۔ برصغیر میں کہانی کی روایت کتھا کی روایت ہے۔ داستان نے بھی اس لحاظ سے اسی روایت کو آگے بڑھایا تھا کہ وہ سننے سنانے کی چیز ہے۔ اس کے برخلاف بیسویں صدی میں افسانے کا سارا ارتقا ایک تحریری صنف کا ارتقا ہے۔ یہ لکھے اور پڑھے جانے کی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ انتظار حسین نے باصرہ کے ساتھ سامعہ کو پھر سے بیدار کیا ہے، اور کہانی کی روایت میں سننے اور سنائے جانے والی صنف کے لطف کا از سرِ نو اضافہ کیا ہے۔ یہ صرف داستان کے اسلوب ہی کی تجدید نہیں بلکہ کتھا کی ہزاروں سال پرانی روایت کی تجدید بھی ہے۔ انتظار حسین کی بیشتر کہانیوں میں کتھا کا لطف ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ اس دور کے قابلِ توجہ کتھاکار ہیں۔

حال ہی میں انتظار حسین کے فن میں ایک اور معنی خیز جہت کا اضافہ ہوا ہے۔ اسے ان کے چوتھے دور کا آغاز کہہ لیجیے۔ یا "چوتھے کھونٹ" کی طرف ان کا سفر، لیکن شاید پڑاؤ یا منزل نام کی کوئی چیز ان کے ذہنی سفر میں ہے ہی نہیں یہ ایک مسلسل سفر ہے، ایک متحرک ذہن کا، جو مختلف گزرگاہوں سے نکلتا ہوا جاری ہے، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا اگلا پڑاؤ یا منزل کیا ہوگی۔ داستانی طور پر "چوتھے کھونٹ" سے مراد وہ ان دیکھی دنیا ہے جس کے دیکھنے سے منع کیا گیا ہے، اور جس میں قدم رکھتے ہی شہزادے کو آسیب اور بلائیں آلیتی ہیں۔ انتظار حسین اپنے خیر خواہوں کی بار بار تنبیہ کے باوجود اس وادیِ ممنوع میں قدم رکھ چکے ہیں، اور تخلیقی اظہار کی نئی دنیاؤں کی تسخیر میں جو خطرات پیش آسکتے ہیں، انھیں لبیک کہہ چکے ہیں۔ یہ "چوتھا کھونٹ" یا انتظار حسین کے فن کی یہ چوتھی جہت عبارت ہے عہدِ وسطیٰ کے داستانی انداز سے بھی زیادہ پیچھے جاکر عہدِ قدیم کی مختلف النوع اساطیری روایتوں کو باہم آمیز کرنے اور زندگی کی صداقتوں کو بیک وقت آریائی، اسلامی اور قبلِ اسلامی اساطیری روایتوں کے تناظر میں دیکھنے، اور نئی تخلیقی سطح پر ان کا اظہار کرنے سے۔ اس نوعیت کی مثالیں ان افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو شہر افسوس کی اشاعت کے بعد ادھر ادھر رسائل و جرائد میں سامنے آئے ہیں، اور ابھی تک کسی مجموعے کی شکل میں شایع نہیں ہوئے۔ ان میں سے ذیل کے افسانے پیشِ نظر ہیں: "کچھوے" (شب خون) "واپس" (معیار ۱) "رات" "دیوار" (شعور) "کشتی" (محراب) "نئی بہویں" (ماہِ نو) "شور" (ماہِ نو) "پوری عورت" (ادبِ لطیف) "انتظار" (الفاظ) ان کے علاوہ اس دور کے اور افسانے بھی ہوں گے۔ لیکن نئے ذہنی سفر کی سمت نمائی ان سے بہر حال ہو جاتی ہے، اور حاوی رجحان کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے جس کی نمائندگی "کشتی" "کچھوے" اور "واپس" سے ہوتی ہے۔ ویسے ان کہانیوں میں ایک ذیلی رجحان بھی ملتا ہے، زندگی کے عام مسائل یا روزمرہ کے مسائل پر اظہارِ خیال کا، چھوٹی چھوٹی نفسیاتی حقیقتوں پر کہانی لکھنے کا، انتظار حسین نے ادھر کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں جن میں کسی سامنے کی بات کو موضوع بنا کر کہانی کہی گئی ہے۔ ایسی کہانیوں میں زیادہ گہرائی نہیں، لیکن تازگی ضرور ہے۔ کیوں کہ اکثر و بیشتر ان میں ایسے موضوعات کو لیا گیا ہے جن کی طرف انتظار حسین نے اس سے پہلے توجہ نہیں کی۔ ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے اس امر کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ موضوعاتی تنوع اختیار کرنے کی طرف قدم بڑھایا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر "نئی بہویں" میں عورتوں کے ملازمت کرنے کے مسائل ہیں اور آج کے نظامِ تعلیم پر طنز ہے۔ "شور" میں اس نفسیاتی نکتہ کا بیان ہے کہ اگر ہم کسی ایسی کیفیت

کا شکار ہوں جو پہلے ہی ناپسندیدہ ہو، لیکن اگر ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں تو اس سے چھٹکارہ پا کر بھی خوش نہیں ہو سکتے۔" انتظار" جدید دور کے نوجوان لڑکے لڑکی کی چوری چھپے کی ملاقات کی کہانی ہے، اس میں لڑکی لڑکے کی تطبیق داستانوں کے شہزادہ شہزادی سے کرکے کہانی کو زمانی عمق دیا گیا ہے، لیکن بنیادی نکتہ یہ ہے کہ عورت اور وقت جاکر واپس نہیں آتے۔ اسی طرح ایک اور چھوٹی سی کہانی ہے "پوری عورت" اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مرد اگر زندگی میں مار کھا جائے تو اس کی تکمیل نہیں ہو پاتی، مگر لڑکی کامیاب ہو یا ناکام، پوری عورت بن کر رہتی ہے۔ یہ سب سیدھی سادی بیانیہ کہانیاں ہیں۔ اس دور کی بعض تمثیلی کہانیوں میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے اور کسی نہ کسی نفسیاتی نکتے کو بیان کیا گیا ہے۔"رات" اور "دیوار" اس لحاظ سے پچھلے دور کی کہانیوں بالخصوص "وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے" کی توسیع ہیں کہ ان میں یاجوج ماجوج کی تمثیل سے مدد لی گئی ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ بھی نفسیاتی کہانیاں ہیں، اور اس لحاظ سے اس دور کی دوسری مختلف الموضوع چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے الگ نہیں، اس دور کی امتیازی تمثیلی کہانیوں کو لینے سے پہلے "رات" اور "دیوار" پر ایک نظر ڈال لینا اس لئے ضروری ہے کہ بنیادی تمثیل یعنی یاجوج ماجوج کی مرکزی KERNEL حکایت ایک سہی، لیکن انتظار حسین نے ہر جگہ نئے مفاہیم پیدا کئے ہیں۔ "رات" کا بنیادی مسئلہ یہ سوال ہے کہ انسان کسی لایعنی کام کا عادی ہو جائے تو کیا اس کے بغیر وہ زندہ رہ سکتا ہے یاجوج اور ماجوج کو معلوم ہے کہ وہ دیوار کو ازل سے چاٹ رہے ہیں، اور ابد تک چاٹتے رہیں گے اور ان کا حال وہی ہے جو کسی عامل نے اپنے ہمزاد کا کیا تھا کہ پالتو کتے کے گھنگھریالے بال سیدھے کرتے رہو۔ ہمزاد بار بار کتے کے بال سیدھے کرتا اور بار بار وہ مڑ جاتے۔ ان کو معلوم ہے کہ زبان کا کام بولنا ہے۔ دیوار چاٹنا نہیں، تاہم جب وہ دیوار چاٹنا بند کر دیتے ہیں، اور اسے بولنے کے کام میں لگاتے ہیں تو زبان میں کھجلی ہونے لگتی ہے اور بالآخر وہ دونوں لمبی لمبی زبانیں نکال کر پھر دیوار چاٹنے لگتے ہیں، زبان اگرچہ موٹی پڑ گئی ہے اور روز اس میں نئے زخم پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن وہ دیوار چاٹنے کے لایعنی کام سے باز نہیں رہ سکے۔ صبح ہونے سے چونکہ اس لایعنی کام میں خلل پڑتا ہے، اس لئے وہ یہ دعا کرنے پر مجبور ہیں: "اے ہمارے رب! تیری بخشی ہوئی لمبی درد بھری رات ہمارے لئے بہت ہے۔ صبح کے سر سے ہمیں محفوظ رکھ اور اجالے کے فتنے کو دفع کر۔" آخر جملے کے طنز سے کہانی کی معنویت اجاگر ہو جاتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ افراد ہوں یا جماعتیں جب کسی لایعنی عادت میں گرفتار یا جبر سہنے کے عادی ہو جائیں تو حواس بے حس ہو جاتے ہیں، اور وہ تاریکی کو روشنی پر ترجیح دیتے ہیں، گویا اپنی حالت سے باہر آنے کو تیار نہیں ہوتے۔

"دیوار" میں اگرچہ یاجوج ماجوج ہیں نہ دیوار چاٹنے کا عمل، لیکن ساری توجہ بھاری سخت دیوار

پر ہے، اور فضا بے حاصلی اور تحیر کی ہے یعنی دیوار کے دوسری طرف کیا ہے ؟ یہ سوال سب کو کھائے جاتا ہے کہ دیوار کے پار کیا ہے ؟ کتنے ہی رفیق دیوار پر چڑھے، مگر واپس نہیں آئے۔ دیوار کے اوپر پہنچ کر انھوں نے قہقہہ لگایا اور دوسری طرف اتر گئے۔ یہ دیوار کسی ایسے بھید کا سنگین اشاریہ تو نہیں جو محض اس لئے بھید ہے کہ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیوار کے دوسری طرف جاننے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، اور جو آدمی دیوار پر چڑھتا ہے بھی دیکھ کر کہ وہاں دیکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں، ہنستا ہے۔ مندرلیس جوان میں سب سے بڑا تھا، رسّی باندھ کر دیوار پر چڑھا تاکہ دوسری طرف نہ اتر جائے لیکن وہ بھی اوپر پہنچ کر قہقہہ لگاتا ہے۔ اس کے ساتھی اسے دوسری طرف جانے سے روکنے کے لئے کھینچتے ہیں، تو اس کا آدھا دھڑ دیوار کے اِدھر گرتا ہے اور آدھا اُدھر یعنی یہ کہ شوقِ فضول کا شکار ہو کر انسان نہ اِدھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا۔ یہ شوقِ فضول مغرب کی نقالی کا بھی ہو سکتا ہے جس نے مشرق کو کہیں کا نہیں رکھا اور مشرق کی شخصیت کو دو لخت کر دیا ہے، یا یہ شوقِ فضول ایسے بھید کو جاننے کا بھی ہو سکتا ہے جو محض اس لئے بھید ہے یا پُرکشش ہے، کیوں کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہے، یعنی نامعلوم کے لئے انسان ہمیشہ ایک کسک، ایک کشش محسوس کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں کہانیاں نفسیاتی ہیں۔ "رات" میں تاریکی کا شکار رہنے کی یا کسی فضول عادت میں گرفتار ہونے کی جبریت ہے۔ اور "دیوار" میں نامعلوم کی کشش کی نفسیاتی کیفیت ہے۔ اب تک جن کہانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سیدھی سادی بیانیاں کہانیاں بھی ہیں اور تمثیلی بھی، لیکن یہ اس دور کے ذیلی رجحان کی کہانیاں اس لئے ہیں کہ ان میں کسی گہری سچائی کو نہیں بلکہ سامنے کی کسی نفسیاتی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس دور کے امتیازی نشانات البتہ جن کہانیوں میں ملتے ہیں، وہ ہیں "کچھوے" "واپس" اور "کشتی" اول تو ان کے موضوعات میں زندگی کے بنیادی مسائل یعنی بقائے انسانی اور سرشتِ انسانی جیسے پیچیدہ سوالات کو لیا گیا ہے، لیکن اہمیت بالذات موضوعات کی نہیں بلکہ اس کی فنی پیش کش کی ہے یعنی جس پیرائے اور جن وسائل سے اسے بیان کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کہانیوں میں بودھ جاتکوں اور ہندوستانی دیومالا کو پہلی بار اعلیٰ تخلیقی سطح پر استعمال کیا گیا ہے، اور "کشتی" میں ہندوستانی دیومالا، اسلامی روایتوں، سمیری اور بابلی اساطیر سب کو ملا کر ایک بالکل نیا تکنیکی تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک اعلان سے معلوم ہوا ہے کہ انتظار حسین نے اپنے نئے مجموعے کا نام جو ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا، کچھوے رکھا ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو بلا وجہ نہیں، کیوں کہ گلی کوچے آخری آدمی، شہرِ افسوس، انتظار حسین کے اکثر مجموعے ان کے اس دور کے تخلیقی سفر کے حاوی رجحان کا پتہ دیتے ہیں، اور ان مجموعوں کی بیشتر کہانیوں میں باطنی وحدت موجود ہے۔ تازہ کہانیوں کے مجموعے کا نام کچھوے بھی غالباً اسی احساس کے تحت ہوگا۔

بودھ اثر کا پہلا اشارہ انتظار حسین کے یہاں "شہرِ افسوس" میں ملتا ہے جہاں گیانی بھکشو کہتا ہے کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے اور نروان کسی صورت نہیں ہے، اور ہر زمین ظالم ہے اور آسمان تلے ہر چیز باطل ہے لیکن یہ محض حوالے کی حد تک ہے۔ بودھ جاتکوں کا بھرپور اثر چوتھے دور کی خصوصیت ہے۔ "کچھوے" اور "واپس" دونوں کی بنیاد بودھ جاتکوں پر ہے۔ ان میں زبان بھی پراکرتوں کا عنصر لئے ہوئے قدامت آمیز ہے جس سے قدیم عہد کی فضا سازی میں مدد ملی ہے۔ "واپس" میں تتھاگت بھکشوؤں کو بنارس کے سندر نگر کی جاتک سناتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب تتھاگت بنارس کے مرگھٹ کے کتے تھے۔ رتھ کے گدوں کا چمڑا راج محل کے کتوں نے کھا لیا، لیکن سزا مرگھٹ کے کتوں کو دی گئی۔ مرگھٹ کے کتوں نے گرو کو اپنی بپتا کہہ سنائی گرو کتے نے راج محل کے کتوں کو دودھ میں گھاس اور گھی ملا کر پلایا اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ راج محل کے کتوں نے دودھ پینے کے بعد ابکائی لی اور چمڑے کے ٹکڑے اگل دیئے۔ مرگھٹ کے گرو کتے نے راجہ کو نیائے اور انیائے کی شکشا دی اور لاکھ برس تک بنارس میں نیائے ہوتا رہا اور سکھ چین رہا۔ تتھاگت نے بھکشوؤں سے کہا کہ وہ کتا میں ہی تھا" اور راج محل کے کتے ؟" ایک بھکشو نے پوچھا۔ "وہ آج بھی کتے ہی ہیں۔" بھکشوؤں نے سوچا کہ سچ کی جوت جگا کر کتے بھی آدمی بن گئے اور آج کا آدمی اگرچہ آدمی کے جنم میں ہے اور باہر سے آدمی دکھائی دیتا ہے لیکن اندر سے کچھ اور ہے، شاید کتے سے بھی بدتر، کیوں کہ لذتوں اور خودغرضیوں کا شکار ہو کر وہ نیائے اور انیائے میں فرق کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔

اسی طرح "کچھوے" بھی جاتکوں پر مبنی کہانی ہے۔ اس میں شانتی کی کھوج کی فضا ہے بھکشو ودیا ساگر، سندر سمدر، اور گوپال محوِ گفتگو ہیں۔ ان کا جی ترشنا کے جنگل میں ہے، اور وہ بودھی ستو کی حکایتیں سنا کر عقل و دانش کے رموز و نکات بیان کرتے ہیں۔ اس کہانی میں بودھی حکایتیں سلسلہ در سلسلہ چلتی ہیں۔ موہ، مایہ، پاپ اور ترشنا کے ستائے ہوئے انسان کچھوے کے سمان ہیں۔ جب تلیا کا پانی سوکھ گیا تو مرغابیوں نے کچھوے سے کہا اس ڈنڈی کو بیچ سے پکڑ لے اور ہم تجھے اڑا کر ہمالیہ پہاڑ پرے جائیں گی جہاں بہت پانی ہے۔ وہ زمین پر رینگنے والا جانور بھلا اتنی اونچائی پر کیسے پہنچتا۔ مرغابیوں نے اس سے وچن لیا کہ زبان نہیں کھولے گا تو وہ اسے ٹھیک ٹھاک پہنچا دیں گی۔ پر راستے میں کچھوے سے رہا نہ گیا جب زمین سے بالکوں نے کچھوے کو آسمان میں اڑتے دیکھ کر شور مچایا تو کچھوے نے جیبھ کھولی اور ٹپ سے نیچے آ گرا۔ تب سے اب تک کچھوا پانی کی تلاش میں یا شانتی کی کھوج میں ہے، اور ہر وقت اسی دبدھا میں ہے کہ ڈنڈی اس کے دانتوں میں ہے یا دانتوں سے چھوٹ گئی ہے۔

حالیہ دور کی بہترین تمثیلی کہانی بہرحال "کشتی" ہے۔ اس میں قدیم سامی و اسلامی روایتوں اور

ہندوستانی دیومالائی حکایتوں کو تخلیقی طور پر مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ افسانوی تکنیک کا ایسا تجربہ ہے جس کی کوئی مثال اس سے پہلے اردو میں نہیں ملتی۔ "کشتی" میں مسئلہ نسلِ انسانی کی تباہی و بربادی اور اس کی بقا (SURVIVAL) کا ہے۔ اس کی ایک جہت ہنگامی مقامی بھی ہو سکتی ہے اور ایک دائمی آفاقی بھی۔ یہ دنیا جب ظلم و ستم سے بھر جاتی ہے تو تباہی و بربادی کا دور آتا ہے، ہر چیز نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اس کا ذکر تمام مذہبی روایتوں میں آیا ہے، خواہ وہ قہرِ الٰہی کی صورت میں ہو، آفاتِ ارضی و سماوی کی صورت میں، یا طوفان و سیلاب بلا کی صورت میں، مدتوں تک پیڑ، پودے، جن و انس سب تہہ آب غرق ہو جاتے ہیں، کسی آبادی کا نشان باقی نہیں رہتا، لیکن خدا ابھی اپنی تخلیق سے مایوس نہیں، اور اس طرح انسان کو ایک موقعہ اور مل جاتا ہے۔ "کشتی" میں نہ صرف قرآن پاک بلکہ عہد نامہ قدیم، توریت اور ویدوں پرانوں اور شاستروں سب کی مذہبی اور اساطیری روایتوں سے مدد لی گئی ہے اور بقائے انسانی کے بارے میں بنیادی نوعیت کے سوالات قایم کئے گئے ہیں۔ "کشتی" میں سوار لوگ کرۂ ارض کے کسی ایک مقام کا کوئی بھی سماج ہو سکتے ہیں، یا کوئی ایک قوم، یا پوری نوعِ انسانی۔ کہانی بظاہر ہجرت کے احساس اور معاشرے کی اس گھٹن سے شروع ہوتی ہے جس کا فوری حوالہ برصغیر کی حالیہ تاریخ میں دستیاب ہے۔ باہر مینہ ہے اندر حبس ہے اور چاروں طرف پانی ہی پانی بارش ہے، یا قیامت، ہوئے چلی جارہی ہے، آدمی آخر کہاں جائے "جانوروں کے درمیان سانس لینا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔" "پتہ نہیں کب تک ہم اس طور جانوروں کی طرح بسر کرتے رہیں گے۔" "انسان چند ہی ہیں باقی چرند پرند۔" یہ جملے معاشرے کی عمومی حالت اور تاریخی جبر کا اشارہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کشتی میں کسی کو اندازہ نہیں کہ مینہ کب سے برسنا شروع ہوا تھا، کتنے دن سے سفر میں ہیں، اور کب سے گھر چھوٹ چکے ہیں۔ انتظار حسین کے فن میں سفر کو مرکزیت حاصل ہے۔ سفر کا گہرا رشتہ ہجرت سے ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنم جنم سے سفر میں ہیں۔ وہ سوچ کر حیران ہوئے کہ ہمارے گھر بھی تھے، زینے ڈیوڑھیاں، آنگن لیکن "ان گھروں کو کیا یاد کرنا جو ڈھے گئے۔ سب نے مل کر اپنے گھروں کو یاد کیا اور وہ روئے کیوں کہ ان کے گھروں کی بربادی مقدر ہو چکی تھی۔" گھروں کے اس ذکر میں وہ فضا ہے جو "دہلیز" "سیڑھیاں" اور "بستی" کے شروع کے ابواب میں ملتی ہے۔ لگتا ہے انتظار حسین کے یادوں کے سلسلوں کا کچھ نہ کچھ تعلق زینوں اور سیڑھیوں سے ہے۔ "کشتی" کے شروع میں گھروں کے ڈھے جانے کے ساتھ یہ ذکر ملتا ہے: "وہ ہرنی جیسے آنکھوں والی کہ اپنے لبادے کے اندر دو پکے پھل لئے پھرتی تھی، سیڑھیوں کے بیچ مجھ سے ٹکرائی تو لگا کہ دو گرم دھڑکتے پوٹے والی کبوتریاں اس کی مٹھی میں آگئیں... کاش وہ بھی میرے ساتھ سوار ہو جاتی، جانے اب کن پانیوں میں گھری ہوگی۔"

ایک زبردست سیلاب کا ذکر دنیا کی تقریباً تمام مذہبی روایتوں میں ملتا ہے۔ غالباً ان کے اولین ماخذ (GILGAMESH) گلگامش کی MYTH جس سے ہومر کی اوڈیسی بھی متاثر ہوئی ہے اور انجیل کی روایتیں ہیں جہاں عہد نامۂ عتیق (OLD TESTAMENT) کی پہلی کتاب GENESIS (VI-IX) میں طوفانِ نوحؑ کا ذکر آیا ہے۔ "کشتی" میں بھی طوفان کا ذکر گلگامش کی روایت سے شروع کیا گیا ہے جو موت کا تصور کرتا ہے، اور سوچتا ہے کہ جب خدا انلیل (ENLIL) نے ناراض ہو کر طوفانِ عظیم بھیجا تھا تو صرف اُتناپشتم (UT-NAPISHTIM) ہدایت کے مطابق بنائی ہوئی کشتی میں بچ رہا تھا، اور پوری نسلِ انسانی غرق ہو گئی تھی، انجیل میں اس کا جو ذکر آیا ہے، وہ YAHWEH روایت سے ماخوذ ہے۔ YAHWEH روایت انجیل سے چھ سو سال پرانی ہے۔ اس میں ہے کہ پوری نسلِ انسانی سوائے نوحؑ کے جب برائیوں میں گھر گئی تو YAHWEH نے اسے نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے نوحؑ کو خبردار کیا اور حکم دیا کہ وہ اپنی سلامتی کے لئے کشتی بنالے۔ جب طوفان آیا تو وہ مع اپنے گھر کے افراد کے جانوروں کے ساتھ جوڑوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا تاکہ ان کی نسل بھی باقی رہے۔ سات مہینوں اور سترہ دنوں کے بعد جب طوفان رک گیا تو نوحؑ نے ایک کوّے کو اڑنے دیا لیکن اسے کوئی امان نہ ملی اور وہ واپس آگیا۔ فاختہ اڑی وہ بھی اسی طرح لوٹ آئی۔ سات دن کے بعد فاختہ کو دوبارہ بھیجا گیا۔ اور اب کی وہ زیتون کی ایک ٹہنی چونچ میں لے کر آئی۔ مزید سات دن کے بعد وہ پھر اڑی، اور اس بار لوٹ کر نہ آئی۔ نوحؑ کشتی سے اترا اور نسلِ انسانی کی آبادکاری کے نئے دور کا آغاز ہوا۔

لگتا ہے کہ یہ روایت دو ہزار سال مسیح سے قبل سمیری (SUMERIAN) اور عبرانی قصوں سے شروع ہوئی اور دنیا کی تہذیبوں میں پھیل گئی۔ DEDCALION کے یونانی قصے بھی اسی سے متاثر ہوئے اور سنسکرت میں منو کی روایت بھی انھیں قصوں سے چلی ہوگی ان سب کی پشت پر غالباً وہ زبردست تاریخی سیلاب رہا ہوگا جس میں پورا TIGRIS-EUPHRATES دوآب غرق ہو گیا ہوگا اور جس کے ۱۹۰۰ سال قبل مسیح کے قدیم آثار میسوپوٹیمیہ کی کھدائیوں میں دریافت ہو چکے ہیں۔

قرآن پاک کی سورۂ نوحؑ میں بھی اس روایت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ملتی جلتی روایتوں میں مذکور ہے کہ حضرت نوحؑ نے ایک عرصے تک اپنی قوم کو خدا کا پیغام دیا لیکن لوگ بھلائی کی طرف نہیں آئے سوائے ۸۰ آدمیوں کے۔ تب خدا نے زبردست طوفان بھیجا۔ حضرت نوحؑ نے ہدایت الٰہی کے مطابق ایک کشتی تیار کی۔ اس میں ۸۰ ایمان والوں کے علاوہ ہر جانور کا ایک ایک جوڑا رکھا تاکہ طوفان کے بعد ان جانوروں کی نسل چلے۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا کنعان یا سام بے دین تھا، وہ کشتی میں نہ آیا اور طوفان میں غرق ہوا۔ طوفانِ

نوح کے بارے میں یہ بھی روایت ہے کہ آغازِ طوفان کے وقت کوفہ کے مقام پر ایک بڑھیا کے تنور سے پانی ابلنا شروع ہوا، اور آسمان سے زبردست بارش شروع ہوئی۔

"ملک کے بیٹے نوح نے زبان کھولی اور کہا کہ اے میری زندگی کی شریک ڈر اس دن سے کہ تیرا گرم تندور ٹھنڈا ہو جائے اور تو آکر مجھے طوفان کی خبر سنائے۔ اور بھور بھئے منو جی یہ دیکھ کر بھوچک رہ گئے کہ مچھلی بڑی ہو گئی ہے اور باسن چھوٹا رہ گیا ہے۔"

اس مقام پر انتظار حسین نے کہانی میں منو اور پرلے کی روایت کا ذکر جوڑ دیا ہے۔ منو من سے ہے یعنی "ذہن" یا "سوچنا"۔ منو کے چودہ سلسلے بیان ہوتے ہیں، ہر سلسلہ لاکھوں سال تک اس کائنات میں براجمان رہا ہے۔ مہا پرلے یا سیلابِ عظیم کی روایت ساتویں منو سے متعلق ہے۔ اس کا اولین ذکر ویدوں میں نہیں بلکہ SHATHPATHA BRAHMANA (۶۰۰ ق م) میں ملتا ہے۔ اور کشتی کا حوالہ غالباً اسی روایت سے ماخوذ ہے کہ ایک دن جب منو کے ہاتھ دھونے کا پانی لایا گیا تو اس میں سے ایک مچھلی نکلی، مچھلی نے کہا مجھے پناہ دو میں تمہاری حفاظت کروں گی۔ منو نے مچھلی کو گھڑے میں ڈال دیا۔ مچھلی دن بدن بڑی ہوتی چلی گئی۔ منو نے اسے دریا میں ڈالا۔ مچھلی دریا سے بھی بڑی ہو گئی۔ منو نے اسے سمندر میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ مچھلی نے کہا بہت جلد مہا پرلے آئے گی، جس میں سب چیز نیست و نابود ہو جائے گی۔ مجھے یاد کر کے ایک کشتی بنائیو، میں تجھے بچاؤں گی۔ سیلاب آیا اور منو نے اپنی کشتی مچھلی کی مونچھ کے بال سے باندھ دی جب سیلاب میں جن دانس، پیڑ، پودے، شہر آبادیاں سب غرق ہو گئے تو مچھلی نے کشتی کو ہمالیہ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر ٹکا دیا۔ جب پانی اترا تو منو حیران ہوا کہ سوائے اس کے کوئی جاندار سرِ زمین میں نہ بچا تھا۔ اسے اولاد کی خواہش ہوتی اور پوجا کرنے سے ایک لڑکی تخلیق ہوئی۔ منو نے اسے پال پوس کر بڑا کیا۔ پھر وہی اس کی رفیقۂ حیات بنی اور اسی سے از سرِ نو نسلِ انسانی کی آفرینش ہوئی۔

مہابھارت میں اس روایت کا ذکر ذرا مختلف طور پر آیا ہے، یعنی جب سیلابِ عظیم آیا تو منو کشتی میں سات رشیوں کے ساتھ سوار ہوئے۔ مچھلی نے کہا میں حق ہوں مجھے یاد رکھیو، میں تمہاری حفاظت کروں گی اور اس سیلاب کے بعد تمہیں سے دیوی دیوتا، نر، اسُر اور نر ناری سب ہوں گے اور انہیں سے یہ دنیا پھر بسائی جائے گی۔ یہی روایت متسیہ پران، بھاگوت پران اور اگنی پران میں بھی بیان ہوئی ہے۔

انتظار حسین نے اس موقع پر زبان بھی وہ اختیار کی ہے جو اگیا بیتال اور رو کرا دتیہ کی سنگھاسن بتیسی کے اٹھارویں انیسویں صدی کے قدیم ہندی اردو مصنفین نے برتی تھی اس سے دیو مالائی فضا کی بالیاتی

میں بڑی مدد ملی ہے:

"منوجی مچھلی کو تلیا میں چھوڑ کے ایسے آئے جیسے سر سے بڑا بوجھ اتار کے آئے ہیں۔ اس رات وہ چین سے سوئے۔ پر جب تڑکے میں ان کی آنکھ کھلی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مچھلی کی پونچ تلیا سے نکل لمبی ہوتے ہوتے ان کے آنگن میں آن پھیلی تھی۔ وہ جھٹ پٹ اٹھ تلیا پہ گئے۔ کیا دیکھا کہ تلیا چھوٹی رہ گئی ہے، مچھلی بڑی ہو گئی ہے، اتنی بڑی کہ تلیا کے اندر تو بس اس کا منہ تھا، باقی دھڑ اور پونچ سب باہر مچھلی بولی کہ ہے پربھو تمھارے شرن میں میں تیرنے اور سانس لینے کو ترستی ہوں۔ منوجی یہ دیکھ ہکا بکا رہ گئے۔"

اسی طرح جب حضرتِ نوحؑ کی روایت بیان ہوئی ہے تو انداز داستانوں اور حکایتوں کا ہے:

"تب زن بہ حضرتِ نوحؑ کی حضرت کے پاس پہنچی۔ اس حال سے کہ اس کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے اور ہوش اڑے ہوئے تھے۔ بصد تشویش بولی کہ مرے والی، ہمارا گرم تندور ٹھنڈا ہو گیا ہے اور پانی اس کی تہہ میں ابل رہا ہے۔ حضرت نے تامل کیا۔ پھر یوں بولے کہ دیکھو اب ذوالجلال کے جلال کا دن آن پہنچا ہے، تو یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔ اس پہ وہ جورو یہ بولی کہ میں تندور پہ طشت ڈھکے دیتی ہوں، پھر پانی نہیں ابلے گا۔ یہ کہہ کر وہ دوڑی ہوئی اندر گئی۔ طشت اٹھا کر کے تندور پہ ڈھکا اور اوپر اس کے بڑا سا پتھر رکھ دیا۔ یہ کر کے وہ باہر آئی اور اپنے والی سے بولی کہ دیکھو میری ترکیب کام آئی۔ پانی ابلنا بند ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہتی تھی کہ پانی انگنائی سے نکل کر باہر امنڈنے لگا۔ طشت اور پتھر اس کے بیچ تیر رہے تھے... پھر مختلف گھروں سے بیبیاں نکلیں اس حال سے کہ ہوش ان کے اڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے لب پہ خبر تھی کہ تندور ان کے گھر کا گرم سے ٹھنڈا ہوا، اور پانی اس سے ابلنے لگا، اور سیلاب باہر سے امنڈے تو اسے روکا جا سکتا ہے، مگر جب گھر کے اندر سے پھوٹ پڑے، تو کیوں کر اس پہ بند باندھا جائے۔"

کنعان کا ذکر "کشتی" میں اس طور آیا ہے کہ تنہائی کی موت ہجوم کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے پانی میں غرق ہو جانا بہتر ہے بمقابلہ اپنا گھر چھوڑ دینے، یا اجنبی پانیوں میں بھانت بھانت کے جانوروں کے ساتھ بسر کرنے سے۔ اس کے بعد کوّے، چوہوں اور شیر کا ذکر ہے۔ حضرت نوحؑ نے کہا "وائے خرابی کہ میں نے کشتی میں سوار کیا چوہوں کو جن کا شیوہ ہی یہ ہے کہ کترو اور سوراخ کرو۔" بار بار

انھیں ڈسا گیا مگر بار بار ڈسا گیا اور تبدیل تو ہو کے ساتھ پھرتے رہیں بیٹھے تو انھیں گیا بلکہ بار شنائے ۔ تب تنگ آکر حضرت نے شیر کے منھ پہ ہاتھ پھیرا اور اس کے نتھنوں سے ایک بلی نکلی جو چوہوں پر جھپٹی اور انھیں آن کی آن میں چٹ کر گئی۔ تب کشتی کے سب جانداروں نے شادمانی کی اور بلی پہ آفریں بھیجی کہ اس نے آنے والی تباہی سے بچالیا۔ انجیل سے روایت ہے کہ سات دن کے بعد جب فاختہ نے دوسری بار پر پھڑپھڑائے اور کشتی سے باہر اڑ گئی تو وہ زیتون کی پتی چونچ میں دبائے واپس آئی سب خوش ہوئے یہ سوچ کر کہ خشکی نمود کرنے لگی ہے اور کشتی کہیں تو کنارے لگے گی۔ انتظار حسین نے عام روایتوں سے الگ یہاں کہانی کو نیا موڑ دیا ہے: ”کبوتری (فاختہ) جونہی زیتون کی پتی سمیت کشتی میں اتری تو نہی بلی اس پر جھپٹی اور اسے چٹ کر گئی... ساتھ میں زیتون کی پتی کو بھی۔ انھوں نے دیکھا اور دم بخود رہ گئے۔“ زیتون کی پتی سلامتی کا علامیہ ہے۔ زیتون دنیا کا قدیم ترین ہمیشہ سر سبز رہنے والا پیڑ ہے۔ سامی، یونانی، رومن اور نورس اساطیری روایتوں میں زیتون کا ذکر پانچ چھ ہزار سال پرانا ہے لیکن ”کشتی“ میں جس طرح بلی، فاختہ اور زیتون کی پتی دونوں کا قلع قمع کر دیتی ہے، اس سے ظاہر ہے انتظار حسین روایت کو بدل کر دوسری بات کہنا چاہتے ہیں۔ روایت میں ہے کہ فاختہ سات دن کے بعد تیسری بار پھر اڑتی ہے اور اب کی چونکہ اسے پیر ٹکانے کی جگہ مل گئی، وہ لوٹ کر نہیں آئی۔ یعنی طوفان اتر گیا اور خشکی مل گئی لیکن ”کشتی“ میں ایسا نہیں ہوتا۔ انتظار حسین نے قصے کی آج کے عہد پر تطبیق کرتے ہوئے اس کا بالکل دوسرا رخ پیش کیا ہے۔ نوح اور منو دونوں کی روایتوں میں طوفانِ عظیم کا انجام نوعِ انسانی کی از سرِ نو آبادکاری پر ہوتا ہے اور انھیں سے جن وانس کی آفرینش ہوتی ہے۔ آریائی روایت میں مچھلی کشتی کو ہمالہ پر جا کر ٹکا دیتی ہے، سمیری، بابلی، سامی اور اسلامی روایتوں میں بھی پہاڑ کا ذکر، کوہ جودی (MT. ARARAT) (عہد نامہ عتیق) MT NISIR (قصۂ گلگامش)، لیکن انتظار حسین کے یہاں کشتی کسی ٹھکانے پر نہیں پہنچتی۔ بلی کا کبوتری اور زیتون کی پتی کو چٹ کر جانا اشارہ ہو سکتا ہے، سلامتی کی نفی یعنی نسلِ انسانی کے مسلسل عذاب و تباہی میں گھرے رہنے کا مینہ بے شک تھم جاتا ہے اور بادل کی گرج بھی رک جاتی ہے لیکن ”پانی کی دھار اسی شور سے گرج رہی تھی اور اونچے پہاڑ کی چوٹیوں سے گزر رہی تھی... اندر حبس بہت تھا اور بلی بیٹھی تھی باہر پانی گرج رہا تھا اور زمین و آسمان ملے نظر آرہے تھے۔ زمین و آسمان اور زمین و زماں“ ــــــ کیا اندر کا حبس اور بلی کی موجودگی انسان کی داخلی بہیمیت کی طرف اشارہ نہیں ہے؟ کیا پانی کا مسلسل شور، اور زمین و زماں کا ایک ہو نا مکاں و زماں کی وحدت کے اس جبر کی طرح اشارہ نہیں جس میں انسان مسلسل گھرا ہوا ہے اور جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ آخر میں پھر گلگامش کی یاد دلا کے انتظار حسین نے کہانی کا دائرہ مکمل کر دیا

ہے کیونکہ سیلاب شروع ہوا تھا اور کشتی روانہ ہوئی تھی تو سب کے دل ہجرت کے احساس سے بھرے ہوئے تھے لیکن گلگامش کے ذکر نے ڈھارس بندھائی تھی جس نے سفر کو وسیلۂ ظفر جانا، ہجرت اختیار کی، پُرشور سمندروں سے گزرا، نئی نئی مہمات سر کیں اور نئی نئی اقلیموں کو دریافت کیا۔ لیکن آخر میں گھروں کی یاد پھر سب کو آلیتی ہے۔ "کیا ہم کبھی واپس نہیں جا سکتے؟" "کہاں؟" "اپنے گھروں کو؟" ایک بار پھر انھیں حیرانی نے آلیا۔ "عزیزو کون سے گھر"۔ گھر تو جنت ہے اور جنت کو چھوڑے ہوئے آدم کو جانے کتنی صدیاں گزر گئیں اور آدم کی اولاد مسلسل اس کوشش میں ہے کہ جنت کو لوٹ جائے، اپنے اصل گھر کو، لیکن یہ سفر کبھی ممکن نہیں ہوتا، اور آدم کی اولاد " زمین و زماں" کے پرشور پانیوں میں گھری ہوئی مسلسل عذاب میں مبتلا ہے اور امان کی کوئی صورت نہیں کیوں کہ، بلی فاختہ اور زیتون کی ڈالی دونوں کو چٹ کر گئی ہے، اور اب تو کوئی اتنا بھی نہیں کہ خشکی (عافیت و شادمانی) کا پتہ دے، منو کی روایت کے مسلسل سفر اور مسلسل سیلاب والے حصے کو بھی انتظار حسین نے یہاں پھر دہرایا ہے۔ مارکنڈی (مارکنڈے) کو بھی یہاں عمداً لایا گیا ہے جو عمر کے طول یعنی مسلسل عذاب میں گھرے رہنے کا استعارہ ہے۔ مارکنڈے کشتی سے سر نکال کر دیکھتا ہے:

"چاروں اور گھور اندھیرا اور سناٹا اور جل کی گرج کی دھارا۔ پرم آتما نیند میں تھی اور اننت ناگ کے پھن پھیلے ہوئے تھے۔ نارائن نارائن نارائن.... خداوند کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔"

سب دعا مانگتے ہیں کہ اے رب العزت ہمیں برکت کی جگہ اتاریو اور تحقیق کہ تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔ سب حضرت نوح کی دہائی دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے بچ گئے لیکن کہانی میں یہاں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اساطیری روایتوں سے گندھی ہوئی یہ ایک داستان تھی جسے حاتم طائی بیان کر رہا تھا۔ انتظار حسین یہاں حاتم طائی کو اس لئے لائے ہیں کہ حاتم طائی ہی عہد وسطیٰ کا گلگامش ہو سکتا تھا، اور گلگامش مسلسل سفر کا استعارہ ہے۔ گلگامش کی طرح حاتم طائی نے بھی بھری ندیوں کے بیچ ایسی کشتیوں میں سفر کیا جس کا کوئی کھویا نہیں تھا اور نئی نئی مہمات سر کیں۔ کوہِ ندا کی مہم میں اس پر کیا کچھ نہیں بیتی۔ ایک پہاڑ بلند عظیم الشان، جس پتھر کو اٹھا کر دیکھا اس کے تلے خون بہتا پایا۔ ایک دریا تو زور شور سے رواں، اور نہ چھور۔ مچھلی نے دریا سے سر نکال کر کہا کہ اے حاتم یہ روٹیاں اور کباب تیرا ہی رزق ہے شوق سے کھا۔ وہی مچھلی جو منو سے گویا ہوئی تھی۔ سب نے باہر جھانک کر دیکھا۔ نہ نوح، نہ مچھلی، نہ حاتم طائی۔ سب سہارے ختم ہوئے۔ آج کا انسان سیلاب بلا کی زد میں ہے، لیکن اس کا دل و دماغ عقیدوں سے خالی ہے۔ عہد قدیم میں تو گلگامش تھا، اور اتنا پشتم کو بچانے والا انلیل، نوح تھا جس نے جن و انس کے ایک ایک جوڑے کو پناہ دی تھی اور سب

کی بقا کا اہتمام کیا، منو تھا اور مچھلی تھی، فاختہ اور زیتون کی شاخ تھی، اور مچھلی منو سے اور حاتم طائی سے گویا ہوئی تھی، لیکن اب کیا ہے، نہ گنگا مئی، نہ نوح، نہ منو، نہ مچھلی، نہ فاختہ، نہ حاتم طائی، ارتقائے انسانی نے سب سہارے کھو دیئے ہیں۔ "چاروں طرف گھور اندھیرا ہے اور گرجتے جل کی دھارا ہے اور ناؤ ڈول رہی ہے۔" لیکن نوح اور منو کا کہیں پتہ نہیں، فاختہ اور زیتون کی ڈالی بھی نہیں جو عافیت کی خبر دے گہر صدیوں پیچھے رہ گیا ہے۔ بھوساگر امنڈا پڑا ہے۔ مچھلی کی مونچھ سے سب بندھے ہیں، لیکن مچھلی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ صرف زمین وزماں "یعنی وقت کی لہراتی رسّی ہے جو" سانپ سمان ناؤ کے چاروں اور لہرا رہی ہے۔" آج کا انسان پھنسا ہے گھرا ہے۔ ناؤ ڈول رہی ہے اور چاروں اور جل کی دھارا گرج رہی ہے۔ انتظار حسین کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بقائے انسانی سے متعلق سمیری، بابلی، سامی، اسلامی اور ہندوستانی تمام مذہبی اور اساطیری روایتوں کا معنیاتی جوہر تخلیقی طور پر کشید کیا، اور اوّل تو اس سے یہ دکھایا ہے کہ آفرینش سے نسل انسانی ہجرت کی مرہونِ منت ہے، یعنی ہجرت انتہائی بامعنی نقطۂ آغاز ہے اور ارتقائے انسانی کا سلسلہ اسی سے چلا ہے، دوسرے انتظار حسین نے بقائے انسانی کی تمام اساطیری روایتوں کو جدید فکر سے آمیز کر کے ان کی یکسر نئی تعبیر کی ہے اور یہ بنیادی سوال اٹھایا ہے کہ زمین وزماں کے جبر کا مقابلہ کرنے کے تمام روحانی وسیلے کھو دینے کے بعد آج کے پرآشوب دور میں نسلِ انسانی کا مستقبل کیا ہے اور طوفانِ بلا میں گھری ہوئی یہ کشتی کنارے لگے گی بھی کہ نہیں؟

انتظار حسین کا "چوتھے کھونٹ" کا سفر جاری ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ انتظار حسین کی تخلیقات کے ذریعے ان کے فن کی مختلف جہات اور ذہنی وفکری ارتقا کی مختلف کڑیاں سامنے آجائیں اور یہ کہ ان کی تخلیقیت کے سرچشموں اور معنویت تک رسائی ہو سکے، اور اس طرح ان کی انفرادیت اور امتیازی نشانات حتی الامکان واضح ہو سکیں۔ ان تمام امور سے عہدہ برآ ہونا نہایت مشکل ہے، بالخصوص جب فنکار کا پیرایۂ اظہار رمزیہ، استعاراتی اور تمثیلی ہو۔ یوں بھی ہم عصر (SYNCHRONIC) سطح پر تمثیلی فلسفیانہ کہانیوں کی ہر ہر تعبیر ممکن نہیں۔ انتظار حسین کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ انھوں نے افسانے کی مغربی ہیئت کو جوں کا توں قبول نہیں کیا، بلکہ کتھا کہانی اور داستان وحکایت کے جو مقامی سانچے (INDIGENOUS MODELS) مشرقی مزاجِ عامہ اور افتادِ ذہنی کے صدیوں کے عمل کا نتیجہ تھے، اور مغربی اثرات کی یورش نے جنھیں رد کر دیا تھا، انتظار حسین نے ان کی دانش وحکمت کے جوہر کو گرفت میں لے لیا، اور ان کی مدد سے مروج سانچوں کی تقلیب کر کے افسانے کو ایک نئی تشکیل اور نیا ذائقہ دیا۔ داستان کی روایت سے استفادہ کرنے کی اوّلین کوشش اگرچہ عزیز احمد کی طویل کہانی "جب

آنکھیں آہن پوش ہوئیں" میں ملتی ہے، جس میں مغل اور تاتاریوں کے عہد کی باز آفرینی میں نثر کے پرانے اسالیب کو بھی برتنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ محض ایک تجربہ تھا، جب کہ انتظار حسین کے یہاں معاملہ اردو فکشن کو ایک نئے تخلیقی مزاج سے آشنا کرنے، یا دو اصناف کے جوہر کو کشید کر کے دو آتشہ کی کیفیت پیدا کرنے کا ہے۔ انتظار حسین کے کمالِ فن کا ایک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے افسانے کو متصوفانہ ـــــ فلسفیانہ جستجو اور تڑپ (MYSTICAL QUEST) سے آشنا کرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک کشف کا سا احساس ہوتا ہے اور کہیں کہیں ایسی فضا ملتی ہے جو آسمانی صحیفوں میں پائی جاتی ہے۔ انتظار حسین کے کردار، ان کی علامتیں دوسرے افسانہ نگاروں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ یہ ان کے اپنے تہذیبی شعور کی پیداوار ہیں۔ افراد ہوں یا معاشرے، ان کی نظر انسان کے روحانی اخلاقی زوال اور داخلی اور خارجی رشتوں کے عدم تناسب کی مختلف جہتوں پر رہتی ہے۔ آج کا انسان اور سماج جس طرح منافقت، نفس پروری، خود غرضی، ریاکاری، منافع اندوزی، اور اس طرح کی ہزاروں دوسری لعنتوں میں گھرا ہوا ہے، اس کے لئے اپنی شخصیت کی پہچان اور اپنی ذات کو برقرار رکھنا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ انتظار حسین کے افسانے انسان کی اسی کسک درد اور تڑپ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انتظار حسین کا فن آج کے انسان کے کھوئے ہوئے یقین کی تلاش کا فن اسی لئے ہے تاکہ مستقبل کا انسان اپنی آگہی حاصل کر سکے۔ اور اپنی ذات کو برقرار رکھ سکے۔ اس کے لئے انھیں پرانے عہدنامے، انجیل، قصص الانبیا، دیومالا، بودھ جاتکا، پرانو، داستانوں اور صوفیا کے ملفوظات سب سے استفادہ کرنا پڑا ہے، اور نتیجتہً ایسا انداز اظہار وجود میں آیا ہے جو خاص ان کا اپنا ہے۔ انتظار حسین کا فن خاصا تہہ دار اور پُر پیچ ہے۔ جہاں ایک طرف اس کی سادگی فریبِ نظر کا فراہم کرتی ہے، وہیں دوسری طرف اس کی ہشیاری اور پرکاری سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ انتظار حسین کا ذہن ایک متحرک ذہن ہے، اور اس کا سیّال سفر جاری ہے، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آگے چل کر اس کا رخ کن نئی زمینوں کی طرف ہوگا۔ □

انتظار حسین

وہ جو کھوئے گئے

زخمی سر والے آدمی نے درخت کے تنے سے اسی طرح سر ٹکائے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ پوچھا، "ہم نکل آئے ہیں؟"

باریش آدمی نے اطمینان بھرے لہجہ میں کہا "خدا کا شکر ہے ہم سلامت نکل آئے ہیں۔"

اس آدمی نے جس کے گلے میں تھیلا پڑا تھا تائید میں سر ہلایا "بیشک، بیشک، کم از کم ہم اپنی جانیں بچا کر لے آئے ہیں۔" پھر اس نے زخمی سر والے کے سر پر بندھی ہوئی پٹی کی طرف دیکھا۔ پوچھا "تیرے زخم کا اب کیا حال ہے؟"

زخمی سر والا بولا "مجھے لگتا ہے کہ خون ابھی تھوڑا تھوڑا رِس رہا ہے۔"

باریش آدمی نے پھر اسی اطمینان بھرے لہجہ میں کہا "عزیز فکر مت کر۔ خون رک جائے گا اور زخم اللہ چاہے تو جلد بھر جائے گا۔"

زخمی سر والے نے پوری آنکھیں کھول کر ایک ایک کو دیکھا۔ پھر انگلی اٹھا کر ایک ایک کو گنا، باریش آدمی کو تھیلے والے آدمی کو نوجوان کو۔ پھر تعجب سے بولا "ایک آدمی کہاں ہے؟"

نوجوان چونک پڑا "کیا؟...... ایک آدمی کم ہے؟"

باریش آدمی نے نوجوان کو غصہ سے دیکھا، پھر زخمی سر والے کو نرم لہجہ میں سرزنش کی "عزیز ہم اتنی تعداد میں نہیں ہیں کہ تو گننے میں گھپلا کرے۔"

تھیلے والے نے باریش آدمی کی تائید کی، پھر اعتماد کے ساتھ ایک ایک کو گنا، باریش آدمی کو زخمی سر والے کو، نوجوان کو، پھر ٹھٹھک گیا۔ بولا "ایک آدمی کہاں ہے؟"

نوجوان نے ہراساں ہو کر تھیلے والے کو دیکھا۔ پھر خود ایک ایک کو گنا، باریش آدمی کو، تھیلے والے کو، زخمی سر والے کو، پھر تشویش سے لہجہ میں بولا "کہاں گیا، ایک آدمی؟"

باریش آدمی نے غصیلی نظروں سے تینوں کو دیکھا۔ پھر خود انگلی اٹھا کر ایک ایک کو دیکھا، زخمی سر والے

کو، تھیلے والے کو، نوجوان کو، ٹھٹھک گیا۔ پھر گنا۔ پھر ٹھٹھکا تیسری بار پھر بڑی احتیاط سے گنا اور پھر ٹھٹھک گیا۔ دھیرے سے بڑبڑایا "عجیب بات ہے۔"

پھر چاروں نے ایک ہراس بھری حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر وہی ایک فقرہ ایک وقت میں چاروں کی زبان پر آیا، کچھ سرگوشی کی کیفیت لئے ہوئے "عجیب بات ہے۔" پھر چپ ہو گئے۔

وہ ایک بہت لمبی چپ تھی۔ مگر دور کہیں ایک کتا بھونکنے لگا تھا۔ نوجوان نے خوف بھری نظروں سے سب کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا "یہ کتا کہاں بھونک رہا ہے۔"

زخمی سر والے نے بے تعلقی سے پوچھا "کون ہوگا؟"

"وہی ہوگا" باریش آدمی نے اعتماد سے اونچی آواز میں کہا "اسے زیادہ دور نہیں ہونا چاہئے۔ وہ یہیں کہیں ہم سے بچھڑا ہے۔"

زخمی سر والے نے پاس پڑی ہوئی لاٹھی اٹھائی اور اٹھتے ہوئے بولا "اگر یہ وہی ہے اور کتے نے اس کا رستہ روکا ہوا ہے تو میں جاتا ہوں اور اسے لے کر آتا ہوں۔"

زخمی سر والا لاٹھی لے کر اس طرف چلا گیا جس طرف سے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تینوں چپ بیٹھے رہے۔ پھر تھیلے والا بولا "کیا واقعی وہی ہوگا۔"

باریش آدمی بولا "اس کے سوا اس غیر وقت میں اس غیر جگہ اور کون ہو سکتا ہے۔"

"ہاں وہی ہوگا" تھیلے والا کسی قدر اطمینان کے لہجہ میں بولا "وہ آگے بھی کتے سے ڈرتا تھا۔ رستے میں کہیں نظر آ جاتا تو وہ رک کر کھڑا ہو جاتا تھا۔"

نوجوان پھر شک بھرے لہجہ میں بولا "مگر کیا تم نے غور کیا کہ اب کتے کی آواز نہیں آ رہی۔"

تھیلے والے نے تھوڑی دیر کان لگا کر سننے کی کوشش کی، پھر کہا "ہاں اب آواز نہیں آ رہی۔ جانے کیا بات ہے۔"

باریش آدمی نے اطمینان دلانے کے لہجہ میں کہا "کتے کو دونوں نے مل کر بھگا دیا ہے۔ اب وہ آ رہے ہوں گے۔"

پھر تینوں چپ ہو گئے۔ جس طرف زخمی سر والا گیا تھا اسی طرف ان کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ تھیلے والا اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے کچھ دیکھ لیا ہو کہنے لگا۔ "وہ تو اکیلا ہی آ رہا ہے۔"

"اکیلا؟" باریش آدمی نے سوال کیا۔

"ہاں اکیلا"

تینوں زخمی سر والے کو دیکھتے رہے۔ زخمی سر والا آیا۔ لاٹھی الگ رکھتے ہوئے بیٹھا اور بولا "وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

ٹھیلے والے نے تعجب سے سوال کیا "پھر کتا کس پر بھونکتا تھا؟"

نوجوان بولا "کتے خلا میں تو نہیں بھونکتے۔"

زخمی سر والا کہنے لگا "مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔"

"بڑی عجیب بات ہے" ٹھیلے والے نے کہا۔

نوجوان نے پھر کان کھڑے کئے۔ پھر بولا "کیا خیال ہے یہ کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں ہے۔"

سب کان لگا کر سننے لگے۔ پھر بارلیش آدمی زخمی سر والے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "تم کہاں نکل گئے تھے۔ کتے کی آواز تو اس طرف سے آ رہی ہے۔"

ٹھیلے والے نے زخمی سر والے کے قریب پڑی ہوئی لاٹھی اٹھائی۔ کھڑے ہوتے ہوئے بولا "میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

بارلیش آدمی بھی اٹھ کھڑا ہوا "سب چل کر کیوں نہ دیکھیں۔"

یہ سن کر باقی وہ دو بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چاروں مل کر اس طرف گئے جس طرف سے ابھی ابھی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی تھی۔ دور تک گئے۔ کچھ نظر نہ آیا۔ ٹھیلے والا چلتے چلتے بڑبڑایا "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

بارلیش آدمی نے اس کی ہمت بندھائی۔ کہا کہ "پکار کر دیکھو۔ اسے یہیں کہیں ہونا چاہئے۔ آخر چھلاوہ تو نہیں تھا کہ غائب ہو گیا۔"

زخمی سر والے نے کسی قدر مایوسانہ لہجہ میں کہا "ہاں پکار کر بھی دیکھ لو۔" اور اس نے پکارنے کی نیت سے جھرجھری لی۔ پھر اچانک ٹھٹھکا۔ ٹھیلے والے سے مخاطب ہوا "میرے ذہن سے تو اس کا نام ہی اتر گیا۔ کیا نام تھا اس کا؟"

"نام؟" زخمی سر والے نے ذہن پہ زور ڈالا "نام تو اس کا مجھے بھی یاد نہیں آ رہا۔" پھر نوجوان سے مخاطب ہوا "نوجوان تجھے یاد ہوگا؟"

نوجوان نے جواب دیا "نام کیسا، مجھے تو اس کی صورت بھی یاد نہیں۔"

"صورت بھی یاد نہیں۔" ٹھیلے والا سوچ میں پڑ گیا۔ بولا "عجب بات ہے اس کی صورت تو مجھے بھی یاد نہیں آ رہی۔ پھر بارلیش آدمی سے مخاطب ہوا "اے بزرگ تجھے تو اس کی صورت یاد ہوگی؟ اور نام بھی۔"

بارش آدمی سوچ میں پڑ گیا۔ ذہن پر زور ڈال کر سوچتا رہا۔ پھر متفکر لہجہ میں بولا "عزیزو پلٹ چلو کہ اب ڈھونڈنے میں جوکھوں ہے۔"

"کیوں؟"

"یوں کہ اب نہ ہمیں اس کا نام یاد ہے نہ صورت یاد ہے۔ ایسی صورت میں کیا خبر کون مل جائے ہم سمجھیں کہ وہ ہے۔ اور وہ وہ نہ ہو، کوئی اور ہو۔ یہ غیر وقت ہے اور ہم راستے میں ہیں۔"

چاروں پلٹ پڑے۔ چلتے چلتے پھر وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ پھر انھوں نے آگ روشن کی اور تھیلے والے نے تھیلے سے موٹا جھوٹا نکالا اور آگ پر پکایا۔

کھانے پینے کے بعد انھوں نے آگ پر ہاتھ تاپے اور انھیں یاد کر کے آبدیدہ ہوئے جنھیں وہ چھوڑ آئے تھے۔

"مگر وہ آدمی کون تھا؟" نوجوان نے سوال کیا۔

سب نے انجانے پن میں پوچھا "کون آدمی؟"

"وہ جو ہمارے ہمراہ تھا اور پھر ہم سے ٹوٹ گیا۔"

"وہ آدمی" اچھا وہ آدمی......" اسے تو ہم بھول ہی چلے تھے۔ کون تھا وہ؟"

"عجیب بات ہے" تھیلے والا کہنے لگا "نہ ہمیں اس کا نام یاد رہا، نہ صورت یاد رہی۔"

"تو کیا وہ ہم میں سے نہیں تھا؟"

نوجوان کے اس سوال پر سب سناٹے میں آ گئے۔ تھیلے والا بولا "اگر وہ ہم میں سے نہیں تھا تو پھر کن میں سے تھا۔ اور کس مقصد سے ہمارے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کا یوں یکایک غائب ہو جانا...... یوں یکایک غائب ہو جانا..... یوں یکایک غائب ہو جانا" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ ایک دوسرے کو تکنے لگے جیسے سوچ میں پڑ گئے ہوں کہ آخر ہمراہ چلتے چلتے یوں غائب ہو جانا، کیوں، کیسے، کس لئے،

آخر بارش آدمی نے حوصلہ پکڑا اور کہا کہ "عزیزو شک مت کرو کہ شک میں ہمارے لئے عافیت نہیں ہے۔ وہ بے شک، ہمیں میں سے تھا مگر یہ کہ جس قیامت میں ہم گھروں سے نکلے ہیں۔ اس میں سے کون کس کو پہچان سکتا تھا۔ اور کون کس کو شمار کر سکتا تھا۔

"کیا ہمیں یہ یاد نہیں" نوجوان نے پھر سوال کیا "کہ جب ہم چلے تھے، تب کتنے تھے۔"

"اور کہاں سے چلے تھے" نوجوان نے ٹکڑا لگایا۔

بارش آدمی نے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ پھر بولا "مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جب میں غرناطہ سے

نکلا ہوں.......

" غرناطہ سے" ایک دم سے سب چونک پڑے اور بارِیش آدمی کو تعجب سے دیکھنے لگے ۔
پھر تھیلے والے نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ بارِیش آدمی سب کے چونک پڑنے پر ٹپٹا گیا تھا۔ اب اس ہنسی سے بالکل ہی ٹپٹا گیا۔ وہ ہنسے جا رہا تھا پھر بولا "یہ ایسی ہی بات ہے کہ میں ہانکنے لگوں کہ جب میں جہاں آباد سے نکلا ہوں تو..... "

" جہاں آباد سے " پھر سب چونک پڑے ۔

تھیلے والا خود بھی کہ ابھی تک بارِیش آدمی پر ہنسے جا رہا تھا ٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

تب زخمی سر والا تلخ اور افسردہ ہنسی ہنسا "میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہاں آباد سے نکلا ہوں یا بیت المقدس سے اور یا کشمیر سے .... " کہتے کہتے وہ رکا۔

زخمی سر والے کی اس بات سے سب عجیب طرح متاثر ہوئے کہ چپ سے ہو گئے مگر بارِیش آدمی آبدیدہ ہوا اور یہ کلام زبان پر لایا کہ " ہم اپنا سب کچھ تو چھوڑ آئے تھے مگر کیا ہم اپنی یادیں بھی چھوڑ آئے ہیں ۔"

تھیلے والا آدمی بہت سوچ کر بولا " مجھے بس اب اس قدر یاد ہے کہ ہمارے گھر دھڑ دھڑ جل رہے تھے اور ہم باہر نکل رہے تھے، بھاگ رہے تھے ۔"

نوجوان کا دل بھر آیا۔ بولا " مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس وقت میرا باپ جانماز پہ بیٹھا تھا اور ہاتھ میں اس کے تسبیح تھی، ہونٹ اس کے ہل رہے تھے اور گھر میں دھواں ہی دھواں تھا..... "

بارِیش آدمی نے رقت بھری آواز میں کہا " تیرا باپ یہ کچھ دیکھنے کے لئے زندہ رہا ۔"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے ۔

تھیلے والا بہت سوچ کر بولا " مجھے بس اب اس قدر یاد ہے کہ گھر دھڑ دھڑ جل رہے تھے اور ہم سراسیمہ و بدحواس نکل رہے تھے ۔"

زخمی سر والے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا تو یہ بولا کہ " دوست یادوں میں کیا رکھا ہے۔ میرے لئے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے سر پر علم پڑا تھا یا لاٹھی پڑی تھی یا اسے تلوار نے دو نیم کیا تھا، میرے لئے اصل بات یہ ہے کہ اس وقت میرا سر بے طرح دکھ رہا ہے اور خون اس سے ہنوز رس رہا ہے ۔

سب ہمدردانہ زخمی سر کو دیکھنے لگے۔

بارش آدمی زخمی سر والے کو تکتا رہا پھر بولا کہ "میرا سینہ تیرے سر سے زیادہ زخمی ہے" آہ سرد بھری۔ پھر بولا "کیا بستی تھی کہ جل گئی۔"

"کیا خلقت تھی کہ بکھر گئی۔" تھیلے والے نے بھی ٹھنڈا سانس بھرا۔

"کیا صورتیں تھیں کہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔" نوجوان افسردہ ہو کر بولا۔ وہ یادوں ہی یادوں میں دور تک گیا، اس ساعت تک جس ساعت اس نے اپنی زندگی کا پہلا بوسہ کسی لب پر ثبت کیا تھا۔ اور اس نے وہ اعلانات کئے جو ایسی ساعت میں کئے جاتے ہیں کہ اس ساعت میں تو وقت اور معاشرہ دونوں ہیچ دکھائی دیتے ہیں اور محبت کا راستہ جادواں نظر آتا ہے۔ اس ساعت کو اس نے ایک اداسی کے ساتھ یاد کیا۔ پھر بڑبڑایا۔

"اگر وہ اس وقت یہاں ہوتی تو ہم پورے ہوتے۔"

"ہوتی؟" بارش آدمی نے اسے تعجب سے دیکھا "کون ہوتی؟"

"وہ"

"وہ کون؟"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے خلا میں دیکھ رہا تھا۔ بارش آدمی اور تھیلے والا اسے غور سے دیکھتے رہے تھے۔ زخمی سر والے نے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موندلیں جیسے وہ اس سارے قصے سے تھک گیا ہے۔ تھیلے والا نوجوان کو دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے بولا "کیا وہ عورت تھی؟"

"عورت" بارش آدمی چونک پڑا۔

زخمی سر والے نے بھی چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"اگر وہ عورت تھی" تھیلے والا بولا، "تو خدا کی قسم تاہم ایک اچھے ہمسفر سے محروم ہو گئے ہیں۔"

بارش آدمی نے غصے سے اسے دیکھا اور کہا "اگر وہ عورت تھی تو خدا کی قسم اس کی ہمسفری ہمیں بہت خراب کرتی۔"

زخمی سر والا طنزیہ ہنسا اور کہا "اب ہم خراب نہیں ہیں؟"

"مگر وہ خرابی در خرابی ہوتی۔"

تب زخمی سر والے نے کسی قدر درشت لہجہ میں اسے مخاطب کیا "اے بوڑھے آدمی، عورت کی

بدولت خراب ہوا اس سے بہتر ہے کہ ہم بلا سبب بلا وجہ خراب پھریں۔" پھر اس نے آنکھیں موند لیں اور سر تنے پر ٹکا دیا۔

دیر تک خاموشی رہی۔ تھیلے والے نے آس پاس سے ایندھن جمع کیا اور الاؤ میں ڈال دیا۔ چپ چاپ اپنے اپنے خیالوں میں گم اپنے اپنے وسوسوں میں غلطاں وہ بیٹھے رہے، ہاتھ تاپتے رہے۔ پھر بارش آدمی بڑبڑایا "عجیب بات ہے نہ اس کا نام یاد رہا، نہ صورت یاد رہی، نہ یاد رہا کہ وہ عورت تھی یا مرد تھا۔"

تھیلے والا ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہنے لگا "سمجھ میں نہیں آتا کہ کون آدمی تھا۔ کون ہو سکتا ہے۔"

تھیلے والے نے شک بھرے لہجہ میں کہا "اور ہو سکتا ہے کہ آدمی ہی نہ ہو۔"

"آدمی ہی نہ ہو" نوجوان چکرا سا گیا۔

بارش آدمی نے تامل کیا۔ پھر آہستہ سے کہا "ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

اس پر خاموشی چھا گئی۔ مگر نوجوان کہ وسوسے میں پھنس گیا تھا بولا "اگر وہ آدمی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟"

بارش آدمی اور تھیلے والا آدمی دونوں ہی اس سوال پر سوچ میں پڑ گئے۔ زخمی سر والے نے آنکھیں کھولیں، نوجوان کو دیکھا، کہا "اگر وہ عورت نہیں تھی تو میری بلا سے وہ کون بلا تھی۔" اور پھر آنکھیں موند لیں۔

"بلا" تینوں چونک پڑے۔

تھوڑے تامل کے بعد بارش آدمی نے کہا "عزیز من، ایسا مت کہہ، مبادا آدمی پر سے ہمارا اعتبار اٹھ جائے۔"

زخمی سر والے نے آنکھیں کھول کر بارش آدمی کو دیکھا، اپنے مخصوص تلخ انداز میں ہنسا اور بولا "اے بزرگ، آدمی پر تیرا اعتبار ابھی تک قایم ہے۔" پھر اس نے آنکھیں موند لیں اور سر ڈھلک کر تنے پر ٹک گیا۔

بارش آدمی نے اسے تشویش سے دیکھا اور پوچھا "عزیز کیا تیرا سر زیادہ درد کر رہا ہے۔"

زخمی سر والے نے اسی طرح آنکھیں موندے موندے نفی میں سر ہلایا اور ساکت ہو گیا۔

بارش آدمی نے پھر پوچھا "تمھیں کچھ یاد ہے کہ تمھیں ضرب کس چیز سے آئی اور تم نرغے سے کیسے نکلے۔"

زخمی سر والے نے اذیت بھرے لہجہ میں آنکھیں موندے موندے کہا "مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"عجیب بات ہے" نوجوان بولا۔

"کوئی عجیب بات نہیں ہے۔" بارش آدمی کہنے لگا "چوٹ زیادہ شدید ہو تو دماغ سن ہو جاتا ہے اور حافظہ تھوڑی دیر کے لئے معطل ہو جاتا ہے۔"

"میرے سر میں کوئی چوٹ نہیں لگی۔" تھیلے والا بولا۔ "پھر بھی مجھے خاصی دیر تک یوں لگا جیسے میرا دماغ سن ہو گیا ہے۔"

بارش آدمی نے اسے سمجھایا "ایسے حالات میں ایسا ہو جاتا ہے۔ آدمی دہل جاتا ہے۔" یہ کہتے کہتے بارش آدمی چونکا۔ کچھ دیر یوں بے حس و حرکت بیٹھا رہا جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر سوالیہ نظروں سے تھیلے والے کو دیکھا "یہ وہی آواز نہیں ہے۔"

تھیلے والا کان لگائے سنتا رہا، پھر بولا "وہی آواز ہے۔"

تینوں کچھ دیر تک کان لگائے کچھ سنتے رہے۔ پھر انھوں نے خوف بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، دیکھتے رہے۔ پھر بارش آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ تھیلے والا اور نوجوان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب وہ چلنے لگے تو زخمی سر والے نے آنکھیں کھول کر انھیں دیکھا۔ ایک تکلیف کے ساتھ اٹھا اور پیچھے پیچھے ہو لیا۔

دور تک گئے، ایک سمت میں پھر دوسری سمت میں۔ پھر وہ حیران ہوئے۔ اور تھیلے والا بولا "یہاں تو دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

بارش آدمی بولا "مگر کوئی تو ہے جو کتا بار بار بھونکتا ہے۔"

"تو پھر کتا کہاں ہے؟" نوجوان نے سوال کیا۔

اس سوال پر سب چکرا گئے۔ یہ تو کسی نے اب تک سوچا ہی نہیں تھا کہ کتا ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔

تھیلے والے نے کہا "اب کتا بھی معمہ بن گیا۔"

بارش آدمی بولا "معمہ کتا نہیں ہے، آدمی ہے۔"

زخمی سر والے نے بے تعلقی سے ٹکڑا لگایا "بہتر ہے کہ ہم دونوں میں فرق قائم رکھ سکیں۔"

بارش آدمی نے اس کی بات سنی ان سنی کی پھر دفعتاً پلٹا "چلو واپس۔"

"کیوں؟"

زیادہ دور جانا ٹھیک نہیں۔"

اور وہ پلٹ پڑے۔ چپ چاپ چلتے رہے۔ اور پھر وہیں آ کر بیسر گئے جہاں سے چلے تھے۔ نوجوان نے بیٹھتے ہی خوف زدہ آواز میں کہا "ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں یا وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔"

"وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔" تھیلے والے آدمی نے ڈری ہوئی آواز میں کہا "یہ تجھے کیسے گمان ہوا۔"

"مجھے یہ ایسے گمان ہوا کہ جب ہم واپس آ رہے تھے تو لگا کہ کوئی پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔"

"تو نے مڑ کر دیکھا؟"

"نہیں"

بارش بزرگ نے اسے داد دی" نوجوان، یہ تو نے اچھا کیا۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہئے۔"

زخمی سر والا کہ آتے ہی تھک کر لیٹ گیا تھا یہ سن کر دفعتاً اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نوجوان کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا" یہ تو میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ جب میں اسے ڈھونڈنے گیا تھا تو پلٹتے ہوئے مجھے لگا کہ کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا پیچھے آرہا ہے۔"

بارش بزرگ نے تشویش سے کہا" مگر عزیز یہ تو تجھے اسی وقت بتانا چاہئے تھا۔"

"میں تو بھول ہی گیا تھا، اب نوجوان کے کہنے پر یاد آیا۔" کہتے کہتے ٹھٹھکا اور سوچ میں پڑ گیا۔

"کیوں، کیا ہوا۔"

"ٹھہر و یاد کر لینے دو۔" یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر گویا ناکام ہو کر" عزیزو تمہیں یاد ہو تو بتاؤ۔ جب میں گن رہا تھا تو میں نے اپنے آپ کو گنا تھا یا نہیں گنا تھا۔"

"اپنے آپ کو؟" تھیلے والے نے چکرا کر کہا۔

زخمی سر والا سوچتا رہا۔ پھر بولا" شاید میں نے اپنے آپ کو نہیں گنا تھا.....ہاں بالکل۔ میں اپنے آپ کو تو گننا بھول گیا تھا۔"

تینوں اس پر چکرا سے گئے۔ بولے" اچھا پھر؟"

"تو پھر یوں ہے کہ جو ایک آدمی کم ہے وہ میں تھا۔"

"تو؟" سب نے اسے چونک کر دیکھا۔

"ہاں میں"

یہ بات سن کر سب سناٹے میں آگئے اور زخمی سر والے کو تکنے لگے۔ پھر نوجوان دفعتاً چونکا۔ اسے یاد آیا کہ گنتے ہوئے اس نے بھی اپنے آپ کو نہیں گنا تھا۔ اور اس نے کہا کہ" جو آدمی کم ہے وہ میں ہوں۔"

یہ کلام سنتے سنتے تھیلے والے آدمی نے یاد کیا کہ گنتے ہوئے تو اس نے بھی خود کو نہیں گنا تھا۔ اس نے سوچا کہ کم ہو جانے والا آدمی وہ ہے۔ بارش آدمی دیر تک فکر میں غلطاں رہا۔ پھر وہ بعد تذبذب کے یہ حرف زبان پر لایا کہ" عزیزو، مجھے یہ چوک نہیں ہونی چاہئے تھی مگر مجھے بھی ہوئی۔ میں نے گنتے ہوئے سب کو گنا، مگر خود کو فراموش کیا۔ تو جو ایک آدمی کم ہوا ہے وہ یہ بندۂ کمترین ہے۔"

تب سب فکر میں پڑ گئے اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ آخر وہ کون ہے جو کم ہو گیا ہے۔ اس آن زخمی سر والے کو پھر وہ وقت یاد آیا جب کم ہو جانے والے آدمی کو ڈھونڈ کر پلٹ رہا تھا۔ کہنے لگا۔" اس وقت مجھے

لگا کہ وہ آدمی تو یہیں کہیں ہے مگر میں نہیں ہوں۔"

بارلیش آدمی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "عزیز تو ہے۔" یہ سن کر زخمی سر والے نے ایک ایک ساتھی کو یوں دیکھا جیسے اسے بارلیش کے بیان پر اعتبار نہیں آیا ہے۔ ایک ایک ساتھی نے اسے یقین دلایا کہ وہ ہے تب اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ "چونکہ تم نے میری گواہی دی اس لئے میں ہوں۔ افسوس کہ میں اب دوسروں کی گواہی پہ زندہ ہوں۔"

اس پر بارلیش آدمی نے کہا "اے عزیز شکر کر کہ تیرے لئے تین گواہی دینے والے موجود ہیں۔ ان لوگوں کو یاد کر جو تھے مگر کوئی ان کا گواہ نہ بنا۔ سو وہ نہیں رہے۔"

زخمی سر والا بولا "سو اگر تم اپنی گواہی سے پھر جاؤ تو میں کبھی نہیں رہوں گا۔"

یہ کلام سن کر پھر سب چکرا گئے اور ہر ایک دل ہی دل میں یہ سوچ کر ڈرا کہ کہیں وہ تو وہ آدمی نہیں نہیں ہے جو کم ہو گیا ہے۔ اور ہر ایک اس مخمصہ میں پڑ گیا کہ اگر وہ کم ہو گیا ہے تو وہ ہے یا نہیں ہے۔ دلوں کا خوف آنکھوں میں آیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اپنا اپنا شک بیان کیا۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے کا حوصلہ بندھایا اور ایک دوسرے پر گواہ بنے۔ دوسرے سے گواہی لے کر اور دوسرے کی گواہی دے کر مطمئن ہو گئے۔ مگر نوجوان پھر شک میں پڑ گیا۔ "یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ چونکہ ہم ایک دوسرے پر گواہ ہیں اس لئے ہم ہیں۔"

زخمی سر والا ہنسا۔ تینوں نے پوچھا کہ اے یار تو کیوں ہنسا۔ اس نے کہا کہ "میں یہ سوچ کر ہنسا کہ میں دوسروں پہ تو گواہ بن سکتا ہوں مگر اپنا گواہ نہیں بن سکتا۔"

اس کلام نے پھر سب کو چکرا دیا۔ ایک وسوسے نے ان سب کو گھیرا، اور ان سب نے نئے سرے سے اپنے آپ کو گننا شروع کر دیا۔ اس بار ہر گننے والے نے گننے کا آغاز اپنے آپ سے کیا مگر جب گن چکا تو گڑبڑا گیا اور باقیوں سے پوچھا کہ "کیا میں نے اپنے آپ کو گنا تھا؟"

ایک نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو، اور تیسرے نے چوتھے کو گڑبڑا یا۔ آخر نوجوان نے سوال کیا کہ "ہم تھے کتنے؟" اس سوال نے دلوں میں راہ کی۔ ہر ایک نے ہر ایک سے پوچھا "آخر تم تھے کتنے؟" بارلیش آدمی نے سب کی سنی۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "عزیزو میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب ہم چلے تھے تو ہم میں کوئی کم نہیں تھا۔ پھر ہم کم ہوتے چلے گئے۔ اتنے کم ہوئے اتنے کم ہوئے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ پھر ہمارا اپنی انگلیوں پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ ہم نے ایک ایک کر کے سب کو گنا اور ایک کو کم پایا۔ پھر ہم میں سے ہر ایک نے اپنا اپنی چوک کو یاد کیا اور اپنے آپ کو کم پایا۔"

نوجوان نے ایک شک سے ساتھ کہا "تو کیا ہم سب کم ہو گئے ہیں؟"

بارش آدمی نے نوجوان کو غصے سے دیکھا جو سلجھی ہوئی ڈور کو پھر الجھائے دے رہا تھا "کوئی کم نہیں ہوا ہے۔ ہم پورے ہیں۔"

نوجوان نے اکھڑپن سے پھر سوال کیا "ہم کیسے جانیں کہ ہم پورے ہیں۔ آخر ہم تھے کتنے؟"

"کب کتنے تھے؟" بارش آدمی نے برہم ہو کر پوچھا۔

"جب ہم چلے تھے۔"

زخمی سر والے نے نوجوان کو گھور کر دیکھا "ہم کب چلے تھے؟"

نوجوان زخمی سر والے کو تکنے لگا۔ پھر اس کی آنکھ بھر آئی۔ بولا "کچھ یاد نہیں پڑتا کہ کب چلے تھے۔ بس اتنا یاد ہے کہ گھر میں دھواں اٹھا ہوا تھا اور میرا باپ اس گھڑی جانماز پہ بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ ہل رہے تھے اور انگلیوں میں تسبیح گردش کر رہی تھی۔"

زخمی سر والا نوجوان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بڑی حسرت سے کہا "نوجوان تجھے بہت کچھ یاد ہے۔ مجھے تو اب کچھ بھی یاد نہیں۔"

نوجوان نے افسردہ ہو کر کہا "مگر مجھے بالکل یاد نہیں آتا کہ وہ اس وقت کہاں تھی۔"

بارش آدمی آبدیدہ ہوا اور بولا "کاش ہم یاد رکھ سکتے کہ ہم کہاں سے کب نکلے تھے اور کیسے نکلے تھے؟"

"اور کیوں نکلے تھے؟" نوجوان نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں کیوں نکلے تھے؟" بارش آدمی نے تائیدی لہجہ میں کہا جیسے یہ بات اس کے ذہن سے اتر گئی تھی اور نوجوان نے یاد دلائی ہے۔

نوجوان پھر کسی فکر میں غلطاں ہو گیا۔ کہنے لگا "اگر میں واقعی جہان آباد سے نکلا تھا تو مجھے بس اتنا یاد ہے کہ رت برسات کی گزر چکی تھی اور کوئل آم کے باغوں سے جا چکی تھی اور جھولا ہمارے آنگن والے نیم سے اتر چکا تھا۔" یہ کہتے کہتے وہ خیالوں میں کھو گیا۔ لہجہ دھیما ہو گیا جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتا ہو "مگر وہ تو جھولا اتر جانے کے بعد بھی ہمارے گھر آتی رہی تھی" خیالوں ہی خیالوں میں وہ دور تک گیا، ساون میں بھیگے ان دنوں تک جب آنگن میں کھڑے ہوئے اس گھنے نیم تلے پیلی پیلی نبولیاں ہی نبولیاں بکھری پڑی رہتیں اور جھولے میں بیٹھ کر وہ لمبے جھونٹے لیتی اور گاتی، ننھی منی بوندیاں رے۔ ساون میں میرا جھولنا" مگر وہ تو برسات کے بعد بھی ہمارے گھر آتی رہی تھی۔۔۔۔

ہاں بالکل .... مگر اس روز کہاں تھی"! وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر تھک گیا۔ بولا "کچھ یاد نہیں آتا کہ اس روز وہ کہاں تھی۔"

زخمی سر والا پھر نوجوان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

تھیلے والا آدمی بولا "اگر تو جہان آباد سے نہ نکلا ہو تو؟"

"یعنی؟" نوجوان نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"مثلاً جیسا کہ ہمارے بزرگ نے کہا کہ ہم غرناطہ سے نکلے ہوں تو؟" تھیلے والے نے یہ بات ایسے لہجہ میں کہی جیسے وہ بہت مضحکہ خیز بات ہو اور جیسے وہ بارش آدمی کا مذاق اڑا رہا ہو مگر نوجوان تذبذب میں پڑ گیا "غرناطہ سے؟" سوچتا رہا۔ پھر افسوس کے ساتھ کہنے لگا۔ "اگر میں غرناطہ سے نکلا ہوں تو پھر مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"اگر ہم غرناطہ سے نکلے ہیں۔" بارش آدمی نے دبے سے لہجہ میں کہا، اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا "مجھے یاد آتا ہے کہ ابھی صبح کا دھندلکا تھا، اور مسجد اقصیٰ کے مینار......"

تھیلے والا بے ساختہ ہنسا "مسجد اقصیٰ کے مینار، غرناطہ میں۔"

بارش آدمی سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔ نوجوان نے بارش آدمی کو یوں دیکھا جیسے کچھ نہ سمجھا ہو "مسجد اقصیٰ؟" بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

زخمی سر والا پھر بے مزہ ہو گیا "میں اکتا چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون سی ساعت تھی اور کون سا موسم تھا اور کون سی بستی تھی۔"

"ہاں اب یہ یاد کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون سی ساعت تھی اور وہ کون سی مسجد کے مینار تھے۔" بارش آدمی نے ٹھنڈا سانس بھرا "پھر بھی اچھا ہوتا اگر ہم یاد رکھ سکتے کہ ہم کب نکلے تھے اور کہاں سے نکلے تھے۔" "اور کیوں نکلے تھے۔" نوجوان نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں یہ بھی کہ کیوں نکلے تھے۔"

"اور یہ کہ" نوجوان نے مزید ٹکڑا لگایا "جب ہم نکلے تھے تو کتنے تھے۔"

بارش آدمی نے نوجوان کو سمجھانے کے لہجہ میں کہا "ہم اس وقت پورے تھے۔"

نوجوان نے بارش آدمی کی بات غور سے سنی پھر پوچھا "کیا وہ نکلتے وقت ہمارے ساتھ تھا؟"

"کون؟" بارش آدمی نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ جو ہم میں سے گم ہوگیا تھا؟"

"وہ؟" بارش آدمی نے نوجوان کو دیکھا "وہ کوئی نہیں تھا۔"

کوئی نہیں تھا؟ اچھا؟ پھر سب تعجب میں پڑ گئے۔ عجیب بات ہے کہ وہ کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو دیکھا۔ سب کی آنکھوں میں حیرت تھی اور خوف تھا اور گم سے بیٹھے تھے.......

ایسے جیسے اب کبھی نہیں بولیں گے۔

نوجوان نے تھوڑی جنبش کی اور کان کھڑے کیے۔ کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے دیکھ کر دوسرے کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ سب کان لگائے ہوئے تھے اور کچھ سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کوئی ہے؟" نوجوان نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں سائیں! کوئی ہے جب کتا بھونک رہا ہے۔" تھیلے والے نے کہا۔

چاروں ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ پھر نوجوان نے آہستہ سے کہا "کہیں وہی نہ ہو؟"

"کون؟"

"وہی"

بارش آدمی نے گھور کر نوجوان کو دیکھا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس طرف سے آواز آئی تھی۔ پھر اسی طرف سب چل کھڑے ہوئے۔ ☐

ابن فرید
حفیظ منزل، میرس روڈ
سول لائن، علی گڑھ

"وہ جو کھوئے گئے" ان کا المیہ

کچھ ایسی افتاد ان پر پڑی کہ انھوں نے اپنے گھروں پر حسرت بھری نظر ڈالی اور بے یار و مددگار نکل پڑے۔ نہ منزل کا کوئی نام و نشان تھا اور نہ راہ کے پیچ و خم سے کوئی آگاہی تھی۔ اپنا سب کچھ چھوڑ کر وہ چلے تھے اور اپنے سفینے انھوں نے نذرِ آتش کر دیئے تھے۔ تب طارق بن زیاد نے ان سے سوال کیا:

اَیُّہا النّاسُ ! اَینَ المَفَرُّ (اے لوگو! بھاگ کر تم کہاں جاؤ گے)

کہاں تھی ان کی نجات؟ یہ انھیں خود بھی معلوم نہ تھا۔ وہ تو بس اپنے گھروں سے نکل آئے تھے، اپنی زمین کو چھوڑ چکے تھے اور پژمردہ دلی کے ساتھ حیران و پریشان تھے کہ اب کہاں پڑاؤ ڈالیں۔ چلتے ہوئے انھوں نے حسرت و مایوسی کے ساتھ اپنی بستی کی طرف دیکھا اور ان کے دل رو پڑے:

دیارٌ بالکنافِ الملاعبِ تلمعُ   وما اِن بہا من ساکنٍ وھیَ بلقعُ
ینوحُ علیہا الطّیرُ من کلِّ جانبٍ   فیصمت احیانا وحینا یرجّعُ
فخاطبت منہا طائراً منفرِداً   لہُ شجنٌ فی القلبِ وھو مروَّعُ
فقلت علٰی ماذا تنوحُ وَتشتکی   فقالَ علٰی دھرٍ مضیٰ لیس یرجعُ

(محی الدین بن العربی)

تفریح گاہوں کے پاس کچھ گھر ہیں جو صاف نظر آتے ہیں،
اس حال میں کہ ان میں کوئی رہنے والا نہیں ہے اور وہ ویران ہیں۔
ہر طرف سے پرندے ان پر نوحہ کرتے ہیں۔
کبھی خاموش ہو جاتے ہیں اور کبھی اپنی آوازوں کی گونج بلند کرتے ہیں۔
انھیں میں سے ایک نغمہ سنج پرندے سے میں مخاطب ہوا،
اس کا دل غم سے بھرا ہوا تھا اور وہ ہراساں تھا۔
میں نے اس سے پوچھا: تو کس چیز کا نوحہ کر رہا ہے اور کس بات کا تجھے شکوہ ہے؟

اس نے کہا: اس زمانہ پر جو گزر گیا اور اب واپس نہیں آئے گا۔
تب ان کی بستیاں ویران ہو گئیں، اور ان کے گھر اجڑ گئے۔ ان کے کوچے سنسان تھے، اور ان کے گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کس کے لئے؟ اب کوئی ان سے یہ پوچھنے والا بھی تو نہ تھا:

قلت یوماً لدار قوم تفانوا — این سکانک العزاز علینا
فاجابت ھنا اقاموا قلیلا — ثم ساروا ولست اعلم اینا

(حزم بن جہور)

وہ جو فنا ہو گئے ہیں، ایک دن میں نے ان لوگوں کے گھروں سے کہا:
تمہارے وہ مکین کہاں ہیں جو ہمیں عزیز تھے؟
انھوں نے جواب دیا: اک تھوڑے عرصہ انھوں نے یہاں قیام کیا،
پھر وہ چلے گئے، معلوم نہیں کہاں!؟!

لیکن وہ جو اپنی مٹی سے دور تاریک ویرانوں میں بھٹک رہے تھے، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ "ہم نکل آئے ہیں۔" اس کے باوجود انھیں یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی اپنی اجڑتی ہوئی بستیوں سے نکل آئے ہیں۔ اور اگر نکل بھی آئے ہیں تو کیا وہ سب کے سب نکل آئے ہیں؟ کیا وہ خود فنا کے بے رحم ہاتھوں سے بچ کر نکل آئے ہیں اور کیا وہ بالکل سلامت نکل آئے ہیں؟

وہ جو نکل آئے تھے وہ چار تھے، لیکن وہ چار افراد نہیں تھے، چار کردار بھی نہیں تھے۔ وہ چار علامتیں تھے، چار طرح کے ہجرت کرنے والوں کی!۔ اور وہ جس کے بچھڑ جانے کا انھیں واہمہ تھا، صدمہ تھا وہ علامت تھا ان لوگوں کی جو پیچھے رہ گئے تھے۔

بارش آدمی کچھ بھی بچا کر نہیں لا سکا تھا، علاوہ اس تاریخ، مذہب، نسل، دیومالا، پرانے قصے کہانیوں اور عقائد و توہمات کے [ہمارے عہد کا ادب۔ انتظار حسین] جو اس کے وجود کا سیاق تھے۔ اس سیاق سے خود کو وہ کسی نوعیت سے لاتعلق نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا اصل سرمایہ ماضی تھا، اور ہر ماضی سے اس کا حال جنم لیتا ہے۔ ماضی کا زرّیں دور اس کے کرب کو ناقابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔ اسے غرناطہ میں مسجد اقصیٰ کے مینار نظر آتے ہیں۔ مشرق و مغرب میں پھیلا ہوا شاندار ماضی اس کے دل میں ایک ہوک پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن ہر عہد اور ہر تہذیبی ورثہ کا انجام ہی اس کی یادوں میں تازہ رہتا ہے، اور وہ گریہ کرتا ہے اپنے خسارہ پر، اپنی محرومی پر!

لیکن نوجوان یہ ورثہ بھی اپنے ساتھ نہیں لا پایا تھا۔ اس نے جب یاد کیا تو اس کا دل بھر آیا:

مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس وقت میرا باپ جانماز پہ بیٹھا تھا اور ہاتھ میں اس کے تسبیح تھی، ہونٹ اس کے ہل رہے تھے اور گھر میں دھواں ہی دھواں تھا......

اس کا ماضی اس کی نظروں کے سامنے ہی جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ وہ بے سیاق تھا، اس کا ذہن اجڑ کر بنجر زمین ہو چکا تھا، اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا:

اگر میں غرناطہ سے نکلا ہوں تو پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔

وہ ماضی سے وابستہ ہی کب ہے کہ اسے کچھ یاد رہے، وہ صرف حال میں ہے اور حال ہی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ زندگی اب اس مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی جب کانوں میں رس گھلنے لگتا ہے اور موسم نم آلود ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنی زندگی کے ہم سفر کا متلاشی ہوتا ہے لیکن ابھی اس ارمان کی تکمیل بھی نہ ہو پائی تھی کہ وہ بچھڑ گئی۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ تو اس کے ساتھ ہی تھی، لیکن جب اسے نکلنا پڑا تو وہ اس کے ساتھ نہیں تھی اس کا حال (PRESENT) پراگندہ ہو کر منتشر ہو گیا، بننے سے پہلے ہی مسمار ہو گیا۔ اور باوجود اس کے کہ وہ اپنا حال اپنے ساتھ لایا تھا، اس کا حال بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اب اس کے پاس اگر کچھ بچا تھا تو وہ ارمان، وہ آرزو اور وہ تمنا جس سے وہ اپنے غیر واضح مستقبل کی تعمیر کی امید کر سکتا تھا۔

تھیلے والا نہ ورثہ لایا تھا اور نہ کوئی جہانِ آرزو، وہ صرف اپنا قلیل سا مادی اثاثہ بچا کر لا سکا تھا، جو اس کے لئے زادِ راہ کا کام دے سکتا تھا، وہ بھی بے حد ناکافی حد تک! اسے وہ تذکرے بڑے مسخر آمیز معلوم ہوتے تھے جن میں ماضی کی عینی عظمتوں کو رومان انگیز جنت بنا کر بیان کیا جاتا ہے:

یہ ایسی ہی بات ہے کہ میں ہانکنے لگوں کہ جب میں جہان آباد سے نکلا ہوں.......

لیکن پھر اس کے اپنے مسلسل قہقہے اس کے سینے میں چبھنے لگتے ہیں، اور وہ خود ہی سٹپٹا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کیا اس نے کچھ نہیں کھویا؟ اس کا دل مسوس جاتا ہے۔ اس نے کیا نہیں کھویا! وہ تو بہت کچھ کھو چکا ہے۔ جہان آباد کھو چکا ہے۔ بہت بڑی سلطنت، بہت بڑا اقتدار، بے پناہ بالادستی۔ اور اب اس کے پاس اگر کچھ بچا ہے تو بہت ہی مختصر سا اثاثہ جو انتہائی ناکافی ہے:

مجھے اب بس اس قدر یاد ہے کہ ہمارے گھر دھڑ دھڑ جل رہے تھے اور ہم باہر نکل رہے تھے، بھاگ رہے تھے۔

اور راستہ میں اپنا سب کا پیٹ بھرنے کے لئے جب تھیلے میں سے آگ پر پکانے کے لئے اس نے جو کچھ نکالا وہ محض "موٹا جھوٹا" تھا۔ یہ تمام تر بربادی اس کے لئے بہت بڑا صدمہ تھی۔

"میرے سر میں چوٹ نہیں لگی"۔ تھیلے والا بولا۔ پھر بھی مجھے خاصی دیر تک یوں لگا جیسے

میرا دماغ سن ہو گیا ہے۔"

زخمی سر والا اس اذیت سے گزرا تھا جس نے اس کے ہوش و حواس تک ماؤف کر دیئے تھے۔ نہ اس کے پاس سوچنے کی صلاحیت بچی تھی، اور نہ یادیں! وہ تو محرومی کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا کہ جہاں ہر چیز اپنی کشش کھو دیتی ہے، جہاں ہر وابستگی بے معنی ٹھہرتی ہے:

میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہان آباد سے نکلا ہوں یا بیت المقدس سے اور یا کشمیر سے....."

جب ہزیمت ہی مقدر ٹھہری تو پھر وہ کہیں سے ہو، اور کسی بھی نوعیت کی ہو، بے جہد بادیہ پیمائی اور سرگردانی ان صدمات کو بھی بے اصل بنا دیتی ہے جو فرد کی ذات کو پہنچتے ہیں، چنانچہ وہ خود کو خاصا لاتعلق (ALIENATED) محسوس کرتا ہے:

دوست یادوں میں کیا رکھا ہے۔ میرے لئے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے سر پر بلم پڑا تھا، یا لاٹھی پڑی تھی یا اسے تلوار نے دو نیم کیا تھا۔ میرے لئے اصل بات یہ ہے کہ اس وقت میرا سر بے طرح دکھ رہا ہے اور خون اس سے ہنوز رس رہا ہے۔

یہ چوٹ اس کے لئے اتنی شدید ہے کہ وہ زمان، مکان اور سیاق سب سے عاری ہو جاتا ہے، اور اپنی اس محرومی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ انجام کار وہ اس حالت (SITUATION) سے بھی خود کو ناوابستہ کر لیتا ہے جس میں کہ وہ ہے:

زخمی سر والے نے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں جیسے وہ اس سارے قصے سے تھک گیا ہے۔

اضمحلال اور انفعال کی یہ انتہائی حد ہے جس تک وہ پہنچ گیا ہے۔

یہ علامتیں وہ ہیں جو افسانہ کے پیش منظر میں ہیں، لیکن ایک علامت وہ بھی ہے جو محوری حیثیت رکھتی ہے لیکن وہ پس منظر میں رہتی ہے۔ اس علامت کی نمائندگی اس فرد سے ہوتی ہے جس کی تلاش میں باریش، نوجوان، کھیلنے والا اور زخمی سر والا چاروں ہیں، لیکن وہ انہیں نہیں ملتا۔ وہ ان کے شمار میں نہیں آتا، ان کی شناخت میں نہیں آتا، پھر بھی اپنے میں اس کی کمی کو وہ واضح طور پر محسوس کرتے ہیں۔ شاید یہ وہ ہو جو اُن کے ساتھ نہیں آ سکا اور کہیں پیچھے رہ گیا، ان سے بچھڑ گیا۔ اور ان کے لئے ایک بڑا سوال، ایک بڑا مسئلہ بن گیا:

○ ایک آدمی کہاں ہے؟

○ کیا؟...... ایک آدمی کم ہے؟

○ ایک آدمی کہاں ہے؟

لیکن کیا وہ واقعی ان کی گنتی میں شامل ہے؟ کیا وہ انھیں کے ساتھ چلا تھا؟ لیکن اس پیچھے رہ جانے والے سے جوان کے سیاقی گروہ (REFERENCE GROUP) کی علامت ہے، اس لئے وہ خود کو کسی نوعیت سے الگ نہیں کر سکتے، اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتے، فراموش نہیں کر سکتے، انھیں اس کو بہر صورت تلاش کرنا ہے تاکہ خود ان کا اپنا وجود خلاء میں معلق نہ ہو جائے۔ اس معدومیت سے وہ اس حد تک خائف ہیں کہ وہ اس کی تلاش کے لئے مضطرب ہو جاتے ہیں :

○ اسے زیادہ دور نہیں ہونا چاہئے۔ وہ یہیں کہیں ہم سے بچھڑا ہے۔

○ اس کے سوا اس غیر وقت اس غیر جگہ اور کون ہو سکتا ہے۔

اس مشکوک یقین کی بنا پر وہ سب ایک ایک کر کے اس کی تلاش میں نکلتے ہیں لیکن وہ انھیں نہیں ملتا اور وہ باری باری مایوس واپس ہوتے ہیں۔ پھر وہ جوان ساتھوں کا ماضی میں کئی بار تجربہ کر چکا ہے، وہ مشورہ دیتا ہے :

سب چل کر کیوں نہ دیکھیں۔

اس اجتماعی تلاش کے باوجود وہ اس کا پتہ نہیں لگا پاتے۔ مجبوراً وہ اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہیں :

یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔

لیکن اس انکار کے باوجود وہ اپنے سیاقی گروہ کی نفی نہیں کر پاتے، چنانچہ وہ متعین فاصلے پر اعتماد کو ترک کر کے غیر متعین فاصلے سے امید آسرا لگانے کی کوشش کرتے ہیں :

باریش آدمی نے اس کی ہمت بندھائی۔ کہا کہ "پکار کر دیکھو۔ اسے یہیں کہیں ہونا چاہئے آخر چھلاوا تو نہیں تھا کہ غائب ہو گیا۔"

زخمی سر والے نے کسی قدر مایوسانہ لہجہ میں کہا "ہاں پکار کر بھی دیکھ لو۔" اور اس نے پکارنے کی نیت سے جھرجھری لی۔ پھر اچانک ٹھٹھکا۔ تھیلے والے سے مخاطب ہوا "میرے ذہن سے تو اس کا نام ہی اتر گیا۔ کیا نام تھا اُس کا؟"

"نام؟" زخمی سر والے نے ذہن پر زور ڈالا۔ "نام تو اس کا مجھے بھی یاد نہیں آرہا۔" پھر نوجوان سے مخاطب ہوا۔ "نوجوان تجھے یاد ہوگا؟"

نوجوان نے جواب دیا "نام کیسا، مجھے تو اس کی صورت بھی یاد نہیں۔"

"صورت بھی یاد نہیں؟" تھیلے والا سوچ میں پڑ گیا۔ بولا "عجب بات ہے۔ اس کی صورت مجھے بھی یاد نہیں آرہی۔" پھر باریش آدمی سے مخاطب ہوا "اے بزرگ تجھے تو اس کی صورت یاد ہوگی، اور نام بھی۔"

بارنیس آری سوچ میں پڑ گیا۔ ذہن پر زور ڈال کر سوچتا رہا۔ پھر متفکر لہجہ میں بولا۔
"عزیزو، پلٹ چلو کہ اب ڈھونڈنے میں جوکھوں ہے۔"

"کیوں؟"

"یوں کہ اب نہ ہمیں اس کا نام یاد ہے نہ صورت یاد ہے۔ ایسی صورت میں کیا خبر کون مل جائے۔ ہم سمجھیں کہ وہ ہے اور وہ نہ ہو، کوئی اور ہو۔ یہ غیر وقت ہے اور ہم راستے میں ہیں۔"

یوں وہ اپنے حیطۂ حوالہ (FRAME OF REFERENCE) سے محروم ہو جاتے ہیں، کہ اب اپنی بستیوں سے نکلنے کے بعد انھیں ان کی شناخت بھی نہیں رہی ہے۔ وہ ان سے اپنی وابستگی کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ اب انھیں اسی میں عافیت نظر آتی ہے کہ وہ اس محرومی کو صبر کے ساتھ قبول کر لیں۔ چنانچہ وہ پھر درماندگی کی طرف لوٹ پڑتے ہیں:

چاروں پلٹ پڑے۔ چلتے چلتے پھر وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔

یہ بے منزل سفر جاری رہتا ہے، اور وہ بار بار کھو جاتے ہیں۔ انھیں کوئی راستہ نہیں ملتا، وہ کہیں نہیں پہنچ پاتے:

○ بے انت ڈراؤنی گلی سے لشٹم پشٹم نکلے تو سانس میں سانس آیا ... یہ گلی ایسی لمبی نہیں تھی۔ چار قدم چلے ہوں گے کہ ختم ہو گئی اور اس طرح کہ آگے ایک کچی پکی دیوار راستہ روکے کھڑی تھی۔ "یار یہ تو اندھی گلی ہے۔" اور وہ پلٹ پڑے۔

○ چلتے چلتے انھیں احساس ہوا کہ پیچھے گلی میں کوئی عورت زور زور سے بول رہی ہے۔ انھوں نے ایک خوف کے ساتھ تیزی سے قدم اٹھائے اور یوں چلے جیسے بھاگ رہے ہوں۔ قدم ان کے آگے کی طرف اٹھ رہے تھے اور کان پیچھے کی طرف لگے ہوئے تھے ..... اور انھوں نے سچ مچ بھاگنا شروع کر دیا۔

"ارے یہ تو ہم پھر وہیں آ گئے۔" انھوں نے تعجب سے ارد گرد دیکھا۔

["اندھی گلی" ـــــ شہرِ افسوس]

یہی حال کچھ ان چاروں کا بھی ہے کہ وہ اندھی گلی میں بھٹک رہے ہیں۔ کان ان کے پیچھے کی طرف ہیں اور وہ آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں، لیکن کٹی ہوئی پتنگ کی طرح وہ ہوا میں ڈگمگا رہے ہیں ["بیڑھیاں" ـــــ شہرِ افسوس]۔ نہ وہ کہیں پہنچ پاتے ہیں اور نہ ان کا سفر ختم ہوتا ہے۔ وہ مسلسل گم کردہ راہ رہتے

ہیں۔

نظروں سے اوجھل فرد انھیں خود اپنے بارے میں تذبذب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ خود اپنا شمار کرتے ہیں۔ اوّلاً وہ یکے بعد دیگرے اپنے ہی وجود کو نظرانداز کر جاتے ہیں، گویا وہ جو ان میں کم ہے وہ خود انھیں میں سے گم ہوا ہے، لیکن پھر انھیں اپنے نسیان کا، اپنی سہو کا احساس ہوتا ہے اور دوسری بار وہ اپنے وجود کو شامل کر کے اپنا شمار کرتے ہیں، لیکن وہ جو ان میں سے کم ہے اس کے پورے نہ ہونے کا خوف ان کے دلوں سے محو نہیں ہوتا، اور وہ خود تذبذب میں مبتلا ہو جاتے ہیں:

> ایک نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو اور تیسرے نے چوتھے کو گڑبڑایا۔ آخر نوجوان نے سوال کیا کہ "ہم تھے کتنے؟" اس سوال نے دلوں میں راہ کی۔ ہر ایک نے ہر ایک سے پوچھا "آخر ہم تھے کتنے؟" باریش آدمی نے سب کی سنی۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "عزیزو! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب ہم چلے تھے تو ہم میں کوئی کم نہیں تھا۔ پھر ہم کم ہوتے چلے گئے۔ اتنے کم ہوئے اتنے کم ہوئے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ پھر ہمارا اپنی انگلیوں پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ ہم نے ایک ایک کر کے سب کو گنا اور ایک کو کم پایا۔ پھر ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی چوک کو یاد کیا اور اپنے آپ کو کم پایا۔"

گویا اب انھیں خود اپنے شمار پر اعتماد نہیں رہا۔ ان کا اپنا وجود اپنے لئے مشکوک بن گیا۔ اس لئے کہ وہ جس کے حوالہ سے وہ اپنا شمار کر سکتے تھے خود وہی ان کے درمیان نہیں تھا، اور اس کے "غیاب" نے ان کے لئے بہت سے سوالات کھڑے کر دیئے:

○ تو کیا ہم سب کم ہو گئے ہیں؟
○ ہم کیسے جانیں کہ ہم پورے ہیں۔ آخر ہم تھے کتنے؟
○ کب کتنے تھے؟
○ ہم کب چلے تھے؟
○ کاش ہم یاد رکھ سکتے کہ ہم کہاں سے کب نکلے تھے اور کیسے نکلے تھے۔
○ اور کیوں نکلے تھے؟

لیکن سوالات ان کو اور بھی زیادہ الجھاووں میں مبتلا کرتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے آپ کو پُرالتباس دلاسا دینا چاہا کہ ان کے لئے گواہ دینے والے تین دوسرے "وجود" تھے، اور وہ

جسے وہ تلاش کر رہے ہیں وہ لا وجود ہو گیا، فنا ہو گیا کہ اس کے ہونے کی گواہی دینے والا کوئی نہ رہا۔ لیکن یہ محض ایک مہمل سی منطق تھی، کیوں کہ اس طرح تو خود ان کا اپنا وجود معرض خطر میں پڑا جا رہا تھا:

زخمی سر والا بولا "سو تم اگر اپنی گواہی سے پھر جاؤ تو میں بھی نہیں رہوں گا"۔ یہ کلام سن کر پھر سب چکرا گئے اور ہر ایک دل ہی دل میں یہ سوچ کر ڈرا کہ کہیں وہ تو وہ آدمی نہیں ہے جو گم ہو گیا ہے، اور ہر ایک اس مخمصہ میں پڑ گیا کہ اگر وہ گم ہو گیا ہے تو وہ پہچانا نہیں ہے۔

اور اس طرح ایک بار پھر اپنے وجود کے بارے میں ان کا گمان متزلزل ہو گیا، اور انھوں نے بڑی بے بسی کے ساتھ اپنے لا وجود کے خدشہ کو خوف کی صورت محسوس کیا:

میں دوسروں پر تو گواہ بن سکتا ہوں مگر اپنا گواہ نہیں بن سکتا۔

یہ بے اعتباری ان کے دلوں سے ہر اعتبار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ نہ انھیں اپنے آپ پر یقین رہتا ہے اور نہ کسی ایسی چیز بات پہ جو ان کی بے حقیقتی کو حقیقت میں بدل دے۔ یہ تشکک اس حد تک بڑھتا ہے کہ وہ ایک نیا ہی خطرہ محسوس کرنے لگتے ہیں:

عزیز ایسا مت کہہ کہ مبادا آدمی پر سے ہمارا اعتبار اٹھ جائے۔

لیکن بارش دانا کی یہ فریاد بھی اس اعتماد کو دوبارہ استوار نہیں کر سکی جو متزلزل ہو چکا تھا:

زخمی سر والے نے آنکھیں کھول کر بارش آدمی کو دیکھا، اپنے مخصوص تلخ انداز میں ہنسا اور بولا "اے بزرگ، آدمی پر تیرا اعتبار ابھی تک قائم ہے؟" پھر اس نے آنکھیں موند لیں اور سر ڈھلک کر تنے پر ٹک گیا۔

آدمی پر سے اس اعتماد کے ختم ہونے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ انھیں اپنا سیاقی گروہ اور ماحولی حوالہ (ENVIRONING REFERENCE) میسر نہیں آ رہا ہے، بلکہ وہ خود اپنے وجود کی تصدیق سے محروم ہو چکے ہیں۔ وہ بکھر چکے ہیں اور بے اعتباری ان کے اپنے اندر جاں گزیں ہو چکی ہے۔ چنانچہ یہ بے اصل انسان، "بے جڑ کے پودے" [رام لعل] دوسروں کے بارے میں ہی نہیں اپنے بارے میں بھی مشکوک ہو چکے ہیں۔ یہ ان کی ایک مستقل کیفیت ہے:

"تمھیں میرے بارے میں کوئی شک ہے؟"

عبید جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔ سٹپٹایا۔ پھر سنبھلا۔ آہستہ سے بولا "ہاں۔ تمھارے بارے میں بھی اور اپنے بارے میں بھی۔"

[سفر منزل شب ــــــ الفاظ، افسانہ نمبر حصہ دوم]

وہ جو ان میں نہیں تھا، جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے، جو انھیں ان کے معاشرتی تہذیبی نقوشِ اوّلین (SOCIO-CULTURAL ARCHETYPAL) سے محروم کر کے مجہول بنائے دے رہا تھا اس کے وجود و مکان کا تعین وہ کتا کر رہا تھا۔ جس کے بھونکنے کی آواز اس پیچھے رہ جانے والے کے ہونے کو یاد کرا رہی تھی۔

کتا جو کبھی نفس امارہ بن جاتا ہے (زرد کتا "۔۔۔ آخری آدمی) کبھی بکری کی ٹانگوں والے آسیب جن/شیطان کو پہچاننے والا بن جاتا ہے ("ٹانگیں"۔۔۔ آخری آدمی) اور کبھی آبادی کے ہونے کی نشاندہی کرتا ہے ("وہ جو کھوئے گئے"۔۔۔ شہرِ افسوس) تو اس کتے کی آواز انھیں بار بار یہ یاد کراتی ہے کہ وہ جو ان کے ساتھ تھا اور اب ان میں نہیں ہے، وہ خود گم نہیں ہوا ہے بلکہ وہ وہاں اب بھی ہے جہاں کتا بھونک رہا ہے، اور وہ ان کے اور اس کے درمیان حائل ہے:

زخمی سر والے نے پاس پڑی ہوئی لاٹھی اٹھائی اور اٹھتے ہوئے بولا: "اگر یہ وہی ہے اور کتے نے اس کا راستہ روکا ہوا ہے تو میں جاتا ہوں اور اسے لے کر آتا ہوں۔"

لیکن یہ محض سعئ رائیگاں تھی:

وہ دور تک گئے، ایک سمت میں، پھر دوسری سمت میں۔ پھر وہ حیران ہوئے۔ اور تھیلے والا بولا: "یہاں تو دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

باریش آدمی بولا: "مگر کوئی تو ہے جو کتا بار بار بھونکتا ہے۔"

"تو پھر کتا کہاں ہے؟" نوجوان نے سوال کیا۔

اس سوال پر سب چکرا گئے۔ یہ تو کسی نے اب تک سوچا ہی نہیں تھا کہ کتا بھی ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔

تھیلے والے نے کہا: "اب کتا بھی معمہ بن گیا۔"

باریش آدمی بولا: "معمہ کتا نہیں ہے، آدمی ہے۔"

زخمی سر والے نے بے تعلقی سے ٹکڑا لگایا: "بشرطیکہ ہم دونوں میں فرق قایم رکھ سکیں۔"

لیکن کتا تو خود اس صلاحیت کا مالک ہے کہ وہ انسانوں اور انسانوں میں فرق قائم رکھ لیتا ہے وہ اپنی بھونکنے کی آواز سے صاف آشکارا کر رہا ہے کہ وہ ان کے درمیان ہے جو آبادی چھوڑ چکے ہیں، اجنبی بن گئے ہیں، اور جواب بھی اپنی ارضی وابستگی کو قایم و باقی رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ کتا ہی ہے جو اس معمہ

کا مل بنتا ہے کہ وہ جو کھوئے گئے ہیں وہ کون ہیں؟

○ وہ جو اپنی ارضی وابستگی اب بھی قایم رکھے ہوئے ہیں۔

یا:

○ وہ جو اکھڑ چکے ہیں اور خلا (VOID) میں سرگرداں ہیں۔

کتا ایک کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسروں کو پہچاننے سے انکار کرتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ کھوئے ہوئے تو خود وہ ہیں جو کھوئے ہوئے کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔

تو اے داستان طراز یہ ہے اس قصّہ کا تار و پود جس میں تونے ابتلا کو اس کی پوری کربناکی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس میں تونے خود گریہ کیا ہے، خانماں برباد وں کے الم و محن کا نمایاں ذکر کیا ہے، اور اپنے قارئین کو باران اشک سے مطہر کیا ہے۔

انتظار صاحب، آپ کہتے ہیں کہ:

> صاف بات یہ ہے کہ ہجرت کے تجربے کی وضاحت میرے لئے عقلی طور پر مشکل ہے میں اپنے افسانوں کے راستے اس تجربے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، اس تجربے کو اس نئے گرد و پیش کہ جو ۴۷ عیسوی میں پیش آیا یا ۴۷ عیسوی کی ہجرت تو ان تجربوں کے پس منظر میں جو کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ہوتی رہی ہیں، میں نے اپنے افسانوں کے راستے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ کا موقف صحیح ہے یا غلط! آپ فنکار ہیں اس لئے میں آپ کو آپ کے ہی زاویۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کروں گا۔

'ہجرت کی یہ داستان" وہ جو کھوئے گئے" سے شروع ہوتی ہے۔ اور" سیڑھیاں" اور" اندھی گلی" کے تجربوں سے گزرتی ہوئی" شہر افسوس" تک پہنچتی ہے۔ اب تک یہ عام خیال تھا کہ آپ نے یہ آخری فصل لکھ کر داستان کو اس کے اختتام اور عروج و کمال تک پہنچا دیا ہے، لیکن" سفرِ منزل شب" کی فصل لکھ کر آپ نے اس داستان کو ایک اور اگلے مرحلہ میں داخل کر دیا ہے۔ اور اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی آپ نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس کا موضوع ہجرت ہے؟ جی ہاں، ہجرت ہی ہے! لیکن کیا آپ کا مرکزی خیال (THEME) بھی ہجرت ہے؟

یہ سچ ہے کہ تجربہ فنکار کرتا ہے، اور اپنے دل کی بات وہی خود بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ پھر جب وہ اپنے دل کی بات اپنی زبان پر لے آئے تو اس میں کیا کلام رہتا ہے۔ سب مانتے ہیں کہ راوی اوّل

روایتِ ثانی کے مقابلہ میں زیادہ مستند ہوتا ہے۔ لیکن افسانہ تو ایک تجربہ ہے جو آپ نے کیا اور اس تجربہ میں شرکت کے لئے ہمیں مدعو کیا۔ تو اب ہمیں بھی جرأت ہوئی کہ ہم نے آپ کے تجربے کو جس طرح سمجھا اسے آپ کے سامنے بیان کریں۔ ہجرت کیا ہے؟ :

الھجرۃ ایضاً والھجرۃ = الخروج من ارض الی اخری

(المنجد)

تو وہ جنھوں نے اپنی سرزمین سے خروج کیا وہ کہاں گئے؟ ان کی منزلِ آخر کیا تھی؟ کیا وہ اسی لئے گھروں سے نکلے تھے کہ وہ کھوئے جائیں ("وہ جو کھوئے گئے") وہ محرومی و مایوسی کی اس انتہائی حد تک پہنچ گئے کہ ان کی یادیں ان سے رخصت ہوگئیں ("سیڑھیاں") ان کی مٹی نے انھیں واپس کھینچا وہ لوٹے لیکن پہلی کوٹھی مسمار ہوکر میدان ہو چکی تھی اور ان کے لئے راستہ بند تھا۔ وہ اپنی ہی بستی میں اجنبی بن کر اندھی گلی میں بھٹکتے رہے ("اندھی گلی") پھر وہ واپس ہوئے، لیکن یہ حقیقت ان کے لئے بہت بڑا سانحہ بن گئی کہ :

جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انھیں قبول نہیں کرتی ۔

("شہر افسوس ــــــ شہر افسوس)

چنانچہ وہ شک کے اس مرحلہ میں داخل ہو جاتے ہیں کہ نہ انھیں اپنے آپ پر اعتبار رہتا ہے اور نہ دوسرے پر ("سفرِ منزلِ شب") یہ فصل در فصل داستان لکھ کر آپ نے ہمیں جو تاثر دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہجرت تو دراصل آپ کا قرطاس ہے، اور اس پر آپ نے جو نقوش ابھارے ہیں وہ انحطاط، زوال، انخلا اور خانماں بربادی کے ہیں۔

آپ اپنی داستان وہاں سے شروع نہیں کرتے جہاں سے اسے شروع ہونا چاہیئے۔ آپ یہ تو بتاتے ہیں کہ ہجرت مسلمانوں کی تاریخ میں ایک اہم ترین مرحلہ ہے، لیکن آپ یہ نہیں بتاتے کہ وہ کہاں سے کب شروع ہوئی۔ وہ جو کھو گئے تھے انھیں قطعاً اس کا علم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے، کب، کتنے اور کس منزل کی طرف چلے تھے۔ انھوں نے کس پہلی زمین سے دوسری زمین کی طرف خروج کیا؟ اس کا جواب کہاں ہے؟ ان میں سے جو اپنی لاشیں اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے انھیں اس کا ماتم تھا کہ وہ بے گور و کفن رہیں، اور وہ اپنی میت اپنے دوش پر اٹھا لائے تھے وہ اس کرب میں گرفتار تھے کہ ان کے لئے وہ نئی زمین اپنا آغوشِ قبر کھولنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں تھی ("شہر افسوس") پھر وہ کہاں پہنچے؟۔ ان کا المیہ تو وہیں کا وہیں رہا "الی اُخریٰ" کی شرط تو پوری نہیں ہوئی۔ انھوں نے خروج

تو کیا تھا دوسرے دیار کی تلاش کے لئے لیکن :

اجڑتے موسموں میں تم کہاں نکلے　　　یہاں ہر سو سرابوں کے سوا کیا ہے

(ابنِ فرید)

"وہ جو کھوئے گئے" میں نقوشِ اولین (ARCHETYPAL) کا پہلا حوالہ غرناطہ کی طرف ہے، جو زوال کی علامت بن جاتا ہے۔ یہ اس وقت کی داستان ہے جب وہ ہزیمت خوردہ اس سرزمین سے رخصت ہو رہے ہیں جس کی فتح کی خوشی میں طارق بن زیاد نے کہا تھا:

رکبنا سفیناً با لمجاز مقیّراً　　　عسیٰ ان یکون اللہُ منّا قد اشتریٰ

نفوساً و اموالاً و اھلاً بجنّۃ　　　اذا نحن ادرکنا الذی فیھا تیسّریٰ

ولسنا نبالی کیف سالت نفوسنا　　　اذا نحن ادرکنا الذی کان اجدرا

اس امید میں کہ اللہ نے ہم سے خرید لیا ہے
جان، مال اور اہل و عیال کو اس جنت کے بدلہ میں
جس میں جب کبھی ہم کسی چیز کی خواہش کریں گے تو وہ مل جائے گی۔
ہمیں پروا نہیں کہ ہماری جانیں کس طرح لگاتار قربان ہوتی ہیں۔
جب کہ ان سے کہیں زیادہ قابلِ قدر چیز ہم کو حاصل ہوتی ہے۔

جہاں آباد / سلطنتِ مغلیہ سے محرومی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ بہادر شاہ ظفر نالۂ دل خراش آج بھی ہر کان میں گونج رہا ہے :

نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں، نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اور جب یروشلم صیہونیوں کی استبداد کے آگے سرنگوں ہو گیا تو مسجد اقصیٰ کے مینار نظروں سے اوجھل ہو گئے اور بیت المقدس کے امین فلسطین کی سرحدوں پر عارضی خیموں میں اس گھڑی کے منتظر ہو گئے جب انھیں ان کے گھروں میں دوبارہ داخل ہونے کی سعادت نصیب ہو گی۔ یہ بھی ہزیمت ہی ہے۔
کشمیر کا نام اس فہرست میں سیاسی مصلحت کے تحت شامل کیا گیا ہے۔

---

[1] ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم و اموالھم بانّ لھم الجنّۃ (التوبہ ۱۱۱)

لیکن خیر اس تنازع کو فی الوقت نظر انداز کر دیجیے کہ یہ موضوعِ بحث نہیں ہے۔
یہ سارے نقوشِ اولین انحطاط، زوال، ہزیمت اور خانماں بربادی کے رموز ہیں۔ یہ لوگ اس لئے نہیں بھٹک رہے ہیں کہ انھوں نے خروج کیا اور نئے وطن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ اپنا دین، ایمان اور عقائد لے کر رخصت نہیں ہوئے ہیں، بلکہ انتظار صاحب آپ ہی کے بہ قول اپنی "تاریخ، مذہب، نسل، دیومالا، پرانے قصّے کہانیاں اور عقائد و توہمات" (ہمارے عہد کا ادب) اپنے سینے سے چمٹائے دربدر پھر رہے ہیں کہ کہیں انھیں کسی سرزمین سے وابستہ کر سکیں، لیکن نہ انھیں کوئی راہ نظر آتی ہے اور نہ کوئی سرزمین انھیں قبول کرتی ہے۔ رنج و محن، آرام و مصائب، اضمحلال و انفعال، بے امانی و بیگانگی، بے شناختی اور مجہولیت ان کا المیہ ہے، جس کے لئے وہ ماتم گسار ہیں۔
میرے نزدیک تو بے بسی و بے سروسامانی، بے کسی و مظلومی، یادِ ماضی اور وطن کا ہڑکا (NOSTALGIA) اور اس کے لئے گریہ و بکا آپ کے افسانے کا مرکزی خیال ہے، ہجرت نہیں! یہ مرکزی خیال آپ کو اتنا عزیز ہے کہ اسے آپ نے "سوزنگ سے باندھا ہے۔" ☐

انتظار حسین

آخری آدمی

الیاسف اس قریے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں۔ اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا۔ اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اور اس قریے سے تین دن پہلے بندر غائب ہوگئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے اور پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغ خراب کرتے تھے نابود ہوگئے۔ پر اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تم ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے۔ اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا۔ اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجردم الیعذر کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی پھر الیعذر کی جورو خواب گاہ تک گئی اور حیران و پریشان واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر کی خواب گاہ میں الیعذر کی بجائے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا۔ اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں......

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی۔ کہ اے عزیز الیعذر بندر بن گیا ہے۔ اس پر دوسرا زور سے ہنسا۔ " تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا۔" اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ منہ اس کا سرخ پڑ گیا۔ اور دانت نکل آئے۔ اور چہرے کے خد و خال کھنچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرہ

بگڑ گیا ہے۔ ابن زبلون نے اس بات کا برا مانا اور غصے سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا کہ اے زبلون کے بیٹے! تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اس پر ابن زبلون کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور دانت بھینچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہوا اور ابن زبلون کا چہرہ غصے سے اور الیاب کا چہرہ خوف سے بگڑتا چلا گیا۔ ابن زبلون غصے سے آپ سے باہر ہوا۔ اور الیاب خوف سے اپنے آپ میں سکڑتا گیا اور وہ دونوں کا ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوٹ تھے آپس میں گتھ گئے ان کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضا بگڑے۔ پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں مدغم ہوتے چلے گئے۔ اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخیں بن گئیں۔ اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں عقل مند تھا۔ اور سب سے آخر تک آدمی بنا رہا۔ تشویش سے کہا کہ اے لوگو! مقرر ہمیں کچھ ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کے ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا۔ اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا۔ اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو! وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لئے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انھیں آلیا۔ دہشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں۔ اور خدو خال مسخ ہوتے چلے گئے۔ اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور سکتہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے چلنے والے بندر بن گئے تھے۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ جاننا چاہئے کہ وہ بستی ایک بستی تھی۔ سمندر کے کنارے اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی، بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کٹورا بجتا تھا پر دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں۔ اور اونچے برجوں میں عالی شان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آنے لگے۔ اور الیاسف نے ہراس سے چاروں سمت نظر دوڑائی اور سوچا کہ میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی۔ اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا۔ اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا۔ اور اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں۔ کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی اس نے ان کی لال بھبوکا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نفرت سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اچانک زبان

کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہوگئی تھی۔ اس نے کہا کہ الیاسف نفرت مت کر کہ نفرت
سے آدمی کی کایا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے شک میں انہیں میں سے تھا۔ اور اس نے وہ دن یاد کیے۔ جب وہ ان میں سے تھا۔ اور دل اس کا محبت کے جوش سے امنڈنے لگا۔ اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی۔ اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے۔ کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا۔ اور چھپر کھٹ کے لئے اسے ٹٹولا جس کے لئے اس کا دل چاہتا تھا۔ اور اس نے دیکھا لمبے بال اس کی رات کی بوندوں سے بھیگے ہوئے ہیں۔ اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں اور پیٹ اس کا گندم کی ڈھیری کی مانند ہے اور پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا۔ اور ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لئے اس کا جی چاہتا تھا۔ اور پکارا کہ اے بنت الاخضر! تو کہاں ہے اور اے وہ کہ جس کے لئے میرا دل چاہتا ہے۔ دیکھ موسم کا بھاری مہینہ گزر گیا اور پھولوں کی کیاریاں ہری بھری ہوگئیں۔ اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑپھڑاتی ہیں۔ تو کہاں ہے؟ اے اخضر کی بیٹی! اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہرنیوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اتر آ۔ اور مجھ سے آن مل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارتا۔ کہ اس کا جی بھر آیا۔ اور بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا۔

الیاسف بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا مگر اچانک اسے الیعذر کی جورو یاد آئی۔ تو الیعذر کو بندر کی جون میں دیکھ کر روئی تھی۔ حالانکہ اس کی ہڑکی بندھ گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقش بگڑتے چلے گئے۔ اور ہڑکی آواز وحشی ہوتی چلی گئی ـــــ یہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا۔ بنت الاخضر جن میں سے تھی ان میں مل گئی۔ اور بے شک جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ اے الیاسف ان سے محبت مت کر مبادا تو ان میں سے ہو جائے۔ اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا۔ اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہوگیا۔ اور الیاسف نے ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبوکا صورتوں اور کھڑی دم کو دیکھ

کرہنسا اور الیاسف کو الیعذر کی جورو یاد آئی کہ وہ اس قریے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی۔ اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں۔ اور الیعذر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کر میں انگور کے خوشے توڑوں گا۔ اور انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی طرف نکل گئی۔ الیعذر اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو اپنے گھر لے آیا۔ اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر الیعذر کی جوئیں بن بن کر کھاتی تھی۔ الیعذر جھرجھری لے کر کھڑا ہو جاتا۔ اور وہ دُم کھڑی کر کے اپنے لمبے پنجوں پر اٹھ بیٹھی اس کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوئی کہ اسے ساری بستی گونجتی معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا۔ مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا۔ اے الیاسف تو ان پر مت ہنس مبادا تو ہنسی کی ایسی بن جائے اور الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے غصّہ اور ہمدردی سے رونے اور ہنسنے سے ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اچکنا۔ دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا۔ کچے پکے پھلوں پر لڑنا۔ اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دینا۔ یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا۔ کبھی ہنساتا تھا۔ کبھی غصّہ دلاتا کہ وہ ان پر دانت پیسنے لگتا۔ اور انھیں حقارت سے دیکھتا۔ اور یوں ہوا کہ انھیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصّہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہوا۔ اور کسی کسی بندر نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جٹ گیا۔ اور الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی۔ کہ وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے۔ اور اس کا اس نے افسوس کیا الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ اس لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے کہ مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا۔ اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے۔ آج لفظ مر گیا۔ اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا۔ اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے، غصّے اور ہمدردی سے، ہنسنے اور رونے سے درگزرا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے کنارہ کیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر جزیرے کے مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق گھرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان اور جزیرے نے کہا کہ میں گھرے

پانیوں کے ۔ میان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔
الیاسف اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا۔ گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنالیا کہ محبت اور نفرت۔ غصہ اور ہمدردی۔ غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں۔ کہ جذبے کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کرنے لگا پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا کہ اے معبود کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں تب اس نے اپنے باہر پہ نظر کی اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ پتھری پھیل کر باہر آرہی ہے۔ کہ اس کے اعضا خوش، اس کی جلد بدرنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جارہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جارہا ہے۔ اور بال بدرنگ اور سخت ہوتے جارہے ہیں۔ تب اسے اپنے بدن سے خوف آیا۔ اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ خوف سے وہ اپنے اندر سمٹنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگیں اور بازو مختصر اور سر چھوٹا ہوتا جارہا ہے تب اسے مزید خوف ہوا۔ اور اعضا اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف پہ اسی طور غلبہ پاؤں گا۔ جس طور میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پالیا۔ اور اس کے سمٹتے ہوئے اعضا رکھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے۔ اور اس کی ہتھلیاں اور تلوے چپٹے اور لمبے ہو گئے۔ اور اس کے جوڑ کھلنے لگے۔ اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضا بکھر جائیں گے تب اس نے عزم کرکے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مٹھیاں کس کر باندھیں۔ اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے بدہیئت اعضا کی تاب نہ لاکر آنکھیں بند کرلیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضا کی صورت بدلتی جارہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کیا میں میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈوبنے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی اور چپکے سے اپنے اعضا پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے اعضا تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں۔ مگر اس کے بعد آپ ہی آپ سے اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضا بگڑتے اور بدلتے جارہے ہیں۔

راس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کرلیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی
ف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنویں میں دھنستا جا رہا ہے۔ اور الیاسف نے درد کے ساتھ
ا کہ اے میرے معبود میرے باہر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنویں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی
ورتوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اور گزری راتیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو سبت کے دن ہم جنسوں
ا مچھلیوں کا شکار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں مچھلیوں سے بھرا سمندر مچھلیوں سے خالی ہونے لگا۔ اور اس
ں ہوس بڑھتی گئی۔ اور انھوں نے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔ تب اس شخص نے
د انھیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتا تھا کہا کہ رب کی سوگند جس نے سمندر کو گہرے
انیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کی مچھلیوں کا امن ٹھہرایا سمندر تمھارے دست ہوس سے پناہ مانگتا ہے
ور سبت کے دن مچھلیوں پر ظلم کرنے سے باز رہو کہ مبادا تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے قرار پاؤ۔ الیاسف
نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا۔ اور الیاسف عقل کا پتلا تھا۔ سمندر
ے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطحِ آب پر آئیں
تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے پر نکل گئیں۔ اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت
سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر یوں بولا کہ
تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا۔ اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے۔ اور
الیاسف یہ یاد کرکے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ کیا وہ مکر میں گھر گیا ہے۔ اس گھڑی اسے اپنی پوری ہستی ایک
مکر نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے تو نے مجھے ایسا پیدا کیا جیسا پیدا کرنے
کا حق ہے۔ تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا۔ اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے کیا تو
اب مجھ سے مکر کرے گا۔ اور مجھے ذلیل بندر کے اسلوب پر ڈھالے گا۔ اور الیاسف اپنے حال پر رویا۔
اس کے بنائے پشتے میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پر رویا اور بندروں سے بھری بستی سے منھ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا۔
کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی۔ اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے
لئے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹہنیوں پر چھپ کر بسر کی۔

جب صبح کو وہ جاگا تو اس کا سارا بدن دکھتا تھا اور ریڑھ کی ہڈی درد کرتی تھی۔ اس نے
اپنے بگڑے اعضا پر نظر کی۔ کہ اس وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے

سوچا کیا میں میں ہی ہوں اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بے شک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے کہ آدمی آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اور جو جن میں سے ہے اُن کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی۔ اور وہ پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے ہوئے بچوں اور گندم کی ڈھیری۔ اس صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آرہا تھا۔ اور الیاسف نے درد سے صدا کی کہ اے بنت الاخضر اے وہ جس کے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ تجھے میں اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑیوں کی قسم ہے۔ قسم ہے کبوتروں کی جب وہ بلندیوں پر پرواز کرے۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہے تجھے رات کے اندھیرے کی۔ جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندھیرے اور نیند کی۔ اور پلکوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں۔ تو مجھے آن مل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا ہے اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ جیسے زنجیر الجھ گئی ہو۔ جیسے لفظ مٹ رہے ہوں۔ جیسے اس کی آواز بدلتی جا رہی ہو۔ اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر غور کیا اور ابن زبلون اور الیاب کو یاد کیا کہ کیوں کر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت انوکھا نظر آیا اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہو گیا۔ اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خائف چلتے چلتے جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا۔ جی ٹھنڈا کیا۔ اسی اثنا میں وہ موقع ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا۔ اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا تھا۔ اور بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ جیسے وہ چیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے۔ اور چپٹے ہونے لگے۔ اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ مگر وہ بھاگتا گیا۔ اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے۔ اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دی اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔ ☐

ابوالکلام قاسمی
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

"آخری آدمی"

(تجزیہ)

اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت کے دن ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں .... پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انھیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا کہ بندر ہو جاؤ، ذلیل اور خوار.

قرآن (اعراف ۱۶۳-۱۶۶)

پھر تمھیں قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنھوں نے سبت کا قانون توڑا تھا، ہم نے انھیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار، پھٹکار پڑے ....

(البقرۃ ۶۵)

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بزرگ اپنی عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا سبب یہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ جب آدمی، آدمی ہی باقی نہ رہے تو کوئی کس کے پاس جائے اور کس سے انسانی روابط رکھے۔ کئی برس گزر گئے اور معتقدوں پر اس قول کی حقیقت کا انکشاف کسی صورت نہ ہوا تو ان میں سے ایک، شیخ کی خدمت میں عرض پرداز ہوا، اور اس نے اپنی بے اطمینانی اور تشکیک کا اظہار اس اعتراف کے ساتھ کیا کہ وہ لوگ جو آپ کی نظر میں غیر انسان ہیں، ہمیں انسان کیوں دکھائی دیتے ہیں اور جنھیں ہماری آنکھیں آدمی دیکھتی ہیں، آپ انھیں آدمی کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ شیخ نے جواب میں خاموشی اختیار کی اور سوال کرنے والے کو اپنے ہمراہ لے کر بازار کی طرف روانہ ہوئے ـــــــ بازار میں پہنچ کر سائل نے جو کچھ دیکھا، اس نے اپنی آنکھوں پر سے اس کا اعتبار اٹھا دیا۔ اسے دوکانداروں، خریداروں، راہ گیروں حتیٰ کہ عبادت گاہوں کی طرف جانے والوں میں سے ایک بھی متنفس انسانی شکل و صورت میں نہ دکھائی دیا۔ کسی کی شکل

وصورت بندر جیسی تھی، کوئی خنزیر نظر آتا تھا اور کوئی کتے کے قالب میں تبدیل دکھائی دے رہا تھا۔ جنھیں وہ آج تک انسانی ہیئت میں دیکھتا آیا تھا، وہ سب ذلیل جانوروں کے پیکر اختیار کیے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے ـــــ اِن چند لمحوں نے مرید کی آنکھیں کھول دیں اور اس پر ساری حقیقت آشکار ہو گئی۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ فن کار بھی اشیا رکا اور اک اس بزرگ کی طرح روحانی حوالوں سے کرتا ہے مگر اس بات کی طرف ضرور اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ فنکار بیچ بازار میں بادشاہ کو ننگا دیکھنے اور اس کا اظہار کرنے کی جرأت رکھتا ہے اور اپنے وجدانی تجربے اور تیسری آنکھ کے مشاہدے میں دوسروں کو اپنا شریک بنانے پر قادر ہوتا ہے ـــــ کتا اور سور بعض مخصوص خصائل کے سبب ارذل اور قابلِ نفرت سمجھے جاتے ہیں، جب کہ بندر، صوری اعتبار سے بدترین انسانی ہیئت کا مظہر تصور کیا جاتا ہے ـــــ قرآن میں حضرت موسیٰ کی سرکش امت کے گناہوں کی سزا اس کے بندر کی ہیئت میں تبدیل کیے جانے کی شکل میں سامنے آتی ہے:

قلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین

(ہم نے ان سے کہا کہ بندر ہو جاؤ ذلیل اور خوار)

اس کہانی میں انسانوں کے بندروں میں تبدیل کیے جانے کا تصور قرآن اور عہد نامۂ عتیق کی اسی روایت سے ماخوذ ہے مگر یہاں اس پورے واقعہ کو ایسے علامتی پیکر میں تبدیل کر دیا گیا ہے کہ اس کی علامتیں معکوس تلمیحات اور اسطوری کیفیات کے ساتھ ایک نئے جہانِ معنی کی تخلیق کرتی ہیں۔ چونکہ فکشن میں علامت سازی کا عمل شاعری کی علامت کی تخلیق سے قدرے مختلف ہوتا ہے، اس لئے اگر فکشن میں علامتیں تاریخی و تہذیبی تسلسل کے پس منظر، یا زندگی کی کسی مخصوص صورتِ حال کے درمیان سے ابھریں تو فکشن کو بیانیہ سے قریب رکھتے ہوئے اسے طے شدہ معانی و مفاہیم سے کہیں زیادہ وسعت بخش دیتی ہیں اور ابلاغ کے مسائل بھی اس طرح پیدا نہیں ہونے دیتیں جو شاعری کا خاصہ ہے ـــــ انتظار حسین اس نکتہ سے آگاہ ہیں، اس لئے وہ خارجی سطح پر کہانی کو کہانی باقی رکھتے ہوئے اندرونی طور پر ایک عظیم ماضی کے تسلسل کا حصّہ بنا دیتے ہیں۔ ماضی سے ان کا رشتہ اور رابطہ کبھی ماضی پرستی کی شکل اختیار نہیں کرتا بلکہ تاریخ اور زمانی شعور کا تخلیقی اظہار بن جاتا ہے اور یہ شعور ہم عصر زندگی کی بدہیئتوں اور روحانی زوال اور اخلاقی ابتذال کے بیان میں سیاق و سباق فراہم کرتا ہے۔

سمندر کنارے بھرے پرے اور آباد قریے میں بسنے والی موسیٰ کی امت کا عدول حکمی اور حرص و ہوس کے سبب بندروں میں تبدیل ہو جانا "آخری آدمی" میں ایک عام انسانی صورتِ حال بن کر سامنے آتا

ہے۔ کہانی کار کو اس بات سے غرض نہیں ہے کہ یہ لوگ کس گناہ کی پاداش میں انسانی عظمت و مرتبت سے محروم کئے گئے ہیں اس کی توجہ تو اس بات کی طرف زیادہ ہے کہ انسان سے بندر بننے کے عمل میں انھیں کن حیوانی جذبات اور جذباتی ہلاکت خیزیوں سے گزرنا پڑا ہے اور اس پورے عمل میں انسان نے بحیثیت انسان کے اپنے وجود کی برقراری کے لئے کیا کیا جد و جہد کی ہے۔ کہانی کار ہمیں اجنبی زمانوں اور نامانوس زمینوں کی حکایات کے آئینے میں ہماری اپنی بے ضمیری، بے حسی اور حیوانیت کی تصویر دکھلاتا ہے —— بندر بننا قریے کے تمام لوگوں کا مقدر ہو چکا ہے مگر افسانہ نگار غیبی سزاؤں اور گناہوں کی پاداش سے ماورا ہو کر حکایت کو ایک ذاتی تخلیق میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انتظار حسین روایت کے خام مواد سے اپنے افسانے کی مستحکم بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور اس بنیاد پر اعلیٰ ترین فنکاری کی ہشت پہل اور پر اسرار عمارت تعمیر کرتے ہیں —— "آخری آدمی" میں معاملہ ارتکابِ جرم اور اس کی سزا سے ماورا ہو کر الیاسف کے اطراف و جوانب میں منقلب ہوتے ہوئے انسان اور مسخ ہوتے ہوئے چہروں کے درمیان اپنے آپ کو تبدیلی سے محفوظ رکھنے کی قوتِ ارادی اور مثبت اقدار کی ناپائداری میں سمٹ آیا ہے۔

> الیاسف اس قریے میں 'آخری آدمی' تھا اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا۔ اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخری دم تک کوشش کی۔

"آخری آدمی" کے یہ ابتدائی چند جملے ہمارے اندر مرکزی کردار اور کہانی کے موضوع سے متعلق غیر معمولی تجسس کو بیدار کرتے ہیں اور اس تجسس کے سہارے جب ہم کہانی کے پورے سفر کے بعد اختتام تک پہنچتے ہیں تو وہاں بھی کہانی کار ایک دوسری دنیا، دوسری زندگی اور بدلی ہوئی صورت حال کے بارے میں ہمارے ذہن میں بہت سے سوالات چھوڑ جاتا ہے۔ اس طرح "آخری آدمی" تاثر کی بھرپور شدت اور موضوع کی اکائی کے باوجود اپنے ماقبل اور مابعد کے رشتوں سے جڑی ہوئی ایک کہانی بن جاتی ہے۔ "آخری آدمی" کا خام مواد، زبان، اسلوب بیان اور ماحول یقیناً آسمانی صحائف سے مستعار لیا گیا ہے مگر یہاں الیاسف اپنے ہم قریہ لوگوں میں سب سے بڑا مجرم اور عصیاں گزیدہ ہونے کے باوجود انتظار حسین کے تخلیق کردہ ایسے کردار میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اپنے وجود، عمل اور قوتِ ارادی کی بے پناہ پختگی کے سبب داخل اور خارج، فرد اور معاشرہ اور طوفان اور مدافعت کی کشمکش اور رزمیہ کی ہمہ گیر اور آفاقی حقیقت کی عکاسی کرنے لگتا ہے۔ الیاسف کی ذات عام انسانی وجود سے مختلف اور بلند ہو کر ایک رزم گاہ بن جاتی ہے جو خارج اور داخل سے تصادم اور پھر اندر کی متصادم اور متضاد قوتوں کے لئے میدان جنگ سے

کم نہیں۔

الیاسف ہرچند کہ اپنی وسعت اور مرکزی حیثیت کے سبب پوری کہانی پر پھیلا ہوا ہے مگر اس کی شخصیت کا دوسرا رخ اس وقت ہمارے سامنے آتا ہے جب اندر اور باہر کی ساری مدافعتوں کے باوجود وہ اپنے ہم جنسوں کے حوالے کے بغیر اپنی صحیح شناخت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور پہچان کا یہ المیہ اس میں نئے سرے سے جبلّت کی منفی قوتوں کو بیدار کر دیتا ہے ــــــ انتظار حسین قریے کے ان تمام لوگوں کا حال بیان کرتے ہیں جن کا گناہ الیاسف سے بہت مختلف نہیں مگر وہ قوتِ مدافعت اور ارادہ کے فقدان کے سبب جذبات کی موجوں میں اپنے پیر نہیں جما سکتے۔ کوئی خوشی کے مارے اپنے انسانی وجود کو کھو دیتا ہے تو کوئی اندوہ کی شدت کے سبب اپنی اصلیت پر باقی رہ نہیں پاتا کسی کی صورت حیرت و استعجاب کی نذر ہو جاتی ہے اور کوئی تشکیک اور وسوسہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ بعض کی ہیئت کذائی خوف کے غلبہ سے بدل جاتی ہے اور بعض نفرت اور حقارت کی انتہا پر پہنچ کر "احسنِ تقویم" ہونے کی نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں اور اس طرح حد سے بڑھے ہوئے جذبات ان سب لوگوں کو اپنے سیلاب میں بہائے جاتے ہیں۔

الیعذر کی نفسانی خواہشات، اسے بندر بنا دیکھ کر حیران ہونے والے کی حیرت، اس تجربہ پر ہنسنے والے کا قہقہہ، ابن زبلون کا غضب اور الیاف کا خوف، یہ سب اپنی حدوں سے تجاوز کئے ہوئے انسانی جذبات ہیں جو ان کو ان کے انجام تک پہنچانے کا بہانہ بن جاتے ہیں ــــ الیاسف چونکہ چالاک اور عقل مند شخص ہے اور اس نے مچھلیوں کا شکار سمندر سے براہِ راست کرنے کے بجائے سمندر سے ایک نہر نکال کر، اور اس نہر کے ذریعہ مچھلیوں کو ایک گڑھے میں پہنچا کر کیا ہے، اس طرح وہ اپنی نفسیاتی خواہش اور ہوس بھی پوری کرتا ہے اور اپنی دانست میں عدول حکمی بھی نہیں کرتا مگر "وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا یہ دیکھ کر یوں بولا کہ تحقیق، جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اسے مکر کرے گا۔ اور بیشک اللہ زیادہ مکر کرنے والا ہے۔"

الیعذر اور اس جیسے دوسرے لوگ مغلوب الجذبات ہیں، اسی لئے ان کا موسمی وجود عذابِ الٰہی کی بہت ہی معمولی تپش اور حدت سے پگھل کر اپنا اختیار کھو بیٹھتا ہے ــــــ الیاسف بہت دنوں تک ان تبدیلیوں کا تماشائی ہے۔ مگر تماشائی بنے رہنے کی جو قیمت اسے چکانی پڑتی ہے، وہ اس کی استطاعت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ذات دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ آنکھیں اس کے لئے عذاب بن جاتی ہیں، نظر آنے والا ہر منظر اسے ردِ عمل پر مجبور کرتا ہے اور ہر ردِ عمل اس کے انسانی وجود کی قیمت چاہتا ہے۔ الیاسف چونکہ ہوشیار اور عقل مند ہے، اس لئے وہ سارے اعصاب شکن تجربات سے اثر قبول کئے بغیر گزر جانے کے

بتن کرتا ہے مگر وہ بھی اپنی جبلّت سے مجبور ہے۔ جب وہ اپنے ہم جنسوں کی لال بھبوکا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے جسموں کو دیکھ کر متنفر ہوتا ہے اور نفرت کا جذبہ اس کا چہرہ بگاڑنے لگتا ہے تو ابن زبلون کی نفرت کے انجام کی یاد اسے بر وقت بچالیتی ہے۔ وہ بنت الاخضر کو یاد کر کے روتا ہے مگر الیعذر کی بیوی کا رونا اس کے آنسوؤں کو روک لیتا ہے کہ الیعذر کی بیوی کے جمیل نقوش اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں بگڑتے چلے گئے تھے۔ وہ انسانوں کو بندروں میں بدلا ہوا اور بندروں جیسی حرکتیں کرتا دیکھتا ہے، اسے ان پر ہنسی آتی ہے مگر فوراً اسے اُن ہنسنے والوں کا انجام بھی یاد آتا ہے جو بوجہ ہنسنے کے بندر بن گئے تھے۔
یہ اور اُس طرح کے پے در پے حملے الیاسف کی شکل و صورت کو مسخ کر دینا چاہتے ہیں۔ باہر کا ہر منظر ہلاکت خیز منظر بن کر سامنے آتا ہے اور اس کا اپنا ہر جبلّی ردِّعمل اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا کرتا ہے مگر وہ کسی صورت بھی اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔ وہ عہد کرتا ہے کہ وہ آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہے اور اسی جون میں زندہ رہے گا مگر اس عہد کے باوجود وہ اب دوسرے ہی مسائل سے دوچار ہے۔ رابطہ کے سارے وسائل کے ہوتے ہوئے اب وہ رابطہ کے معروض سے محروم ہے، اس کا معاشرتی وجود لغو اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ لفظ جو اس کے اور معاشرے کے دوسرے افراد کے درمیان رابطہ کا بنیادی ذریعہ تھے، اپنی ساری توانائیوں کے باوجود بے حیثیت اور بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ پر اپنے ہم جنسوں پر اور لفظوں پر افسوس کرتا ہے۔ افسوس اس لئے کہ اس کے ہم جنس لفظ سے محروم ہو گئے، افسوس اس لئے کہ لفظ خود اس کے لئے خالی برتن کی مانند ہو کر رہ گئے اور اس طرح "الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا"۔۔۔۔ اس منزل پر اسے معاشرہ، خارجی صورت حال اور مادی منظر نامے سے صرفِ نظر کرنے اور لفظ کی بے بضاعتی کا اعتراف کر لینے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔

> "الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے، ہنسنے اور رونے سے درگزرا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے کنارہ کر لیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ گیر ہو کر جزیرے کی مانند بن گیا، سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا نشان۔ اور جزیرے نے کہا کہ میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔"

الیاسف نے جذبات کے سمندر میں اپنے آپ کو آدمیت کا جزیرہ سمجھا اور گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ پانی کی ہر لہر اس کے وجود کے لئے خطرہ تھی اور اسے ہر حال میں اپنے وجود کو محفوظ رکھنا تھا۔

"اس نے اپنے گرد پشتہ بنا لیا کہ محبت اور نفرت، غصہ اور ہمدردی، غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں، کہ جذبہ کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے۔ اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کھانے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے میں اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا کہ اے معبود! کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں؟"

"الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنویں میں دھنستا جا رہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبود! میرے باہر بھی دوزخ ہے، میرے اندر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنویں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا اور گزری یادیں محاصرہ کرنے لگیں۔"

الیاسف کا معاشرہ سے کٹ کر اپنی ذات میں پناہ لینا ہماری توجہ کو زندگی کی کئی متضاد قوتوں کی طرف مبذول کرتا ہے۔ کسی معاشرے میں انسان کا پیدا ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ جہاں وہ انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر معاشرہ کا حصہ بننے پر مجبور ہوتا ہے، وہیں خود معاشرہ بھی اس کے پورے داخلی وجود کے ایک ناگزیر جزو کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں کائنات فرد کو اپنے کُل کا ایک جزو بنا لیتی ہے وہیں وہ خود اس کے داخلی وجود کا چھوٹا سا حصہ بھی بن جاتی ہے —— الیاسف کا باہری دنیا سے آنکھیں بند کر لینا اور آنکھیں بند ہوتے ہی اندر کی پوری کائنات کا مرئی ہو کر سامنے آ جانا، اسی صداقت کے اظہار کی ایک صورت ہے۔ پس جس طرح دنیا سے آنکھیں پھیر لینے کا عمل الیاسف کے لئے بے سود ثابت ہوتا ہے، اسی طرح اپنے جذبات کی ہر لہر سے مزاحمت کی کوشش بھی اسے اندر سے بے حس اور بے جان بنا کر رکھ دیتی ہے جذبات سے محفوظ رہنے کی جد و جہد بظاہر اسے سطحی ضرور کرتی ہے مگر اندر ہی اندر اسے پتھر میں تبدیل کرنا بھی شروع کر دیتی ہے اور سینے کے اندر کی پتھری کا احساس اسے ایک بار پھر فطری ہیئت سے محروم کرنے لگتا ہے: "اور الیاسف اپنے حال پر رویا، اس کے بنائے ہوئے پشتے میں دراڑ پڑ گئی تھی اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا" —— جب معاشرہ سے کٹ کر بھی الیاسف کے لئے اپنے انسانی وجود کی بقا کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ تو اب سمندر کے کنارے بسے ہوئے اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی اور کھوے سے کھوا چھلنے والے بازار کی ویرانی اور بے رونقی اسے جنگل سے زیادہ وحشت خیز دکھائی دیتی ہے اور خوبصورت اور عالی شان گھر لفظوں کی طرح بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں کہ وہ بھی

اپنے معنوی وسائل سے محروم ہیں۔ اب جنگل کا غیر انسانی ماحول اسے بدلے ہوئے انسانوں کی بستی سے زیادہ معنی خیز اور مانوس معلوم ہونے لگتا ہے اور وہ جنگل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب جنگل بھی اسے راس نہیں آتا اور صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی ریڑھ کی ہڈی اور بدن کے درد کا احساس اور بگڑتے ہوئے اعضا کا ادراک یہاں بھی اسے چین نہیں لینے دیتا تو وہ شدید طور پر اپنے نامکمل ہونے کے احساس سے دوچار ہوتا ہے۔

"اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایسا انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بے شک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے کہ آدمی، آدمی، کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جو جون میں ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔"

یہ خیال الیاسف کو اندر سے توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ اب اسے بنت الاخضر اپنی ذات کی تکمیل اور اپنے ادراک کا واحد وسیلہ نظر آتی ہے۔ اسے بے تحاشا اپنی محبوبہ (بنت الاخضر) کی تلاش ہوتی ہے بنت الاخضر کے گھٹا ٹوپ بال، ہرن کے بچوں کی طرح مضطرب چھاتیاں، گندم کے ڈھیر جیسا پیٹ اور صندل کے گول پیالے جیسی ناف بری طرح یاد آنا شروع ہوتی ہے اور وہ وارفتگی کے اس عالم میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے منہ سے نکلنے والی ملفوظ آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر لفظوں سے عاری ہو جاتی ہیں۔ اس کے اعضا تیزی سے بدلنے شروع ہوتے ہیں۔ یہاں انسانیت پر قایم رہنے کا ایقان متزلزل ہو رہا ہے مگر اس منزل پر بھی وہ قوت ممیزہ پر اپنی سخت گرفت باقی رکھنا چاہتا ہے۔ یہی بات اس کردار کی انفرادیت، اہمیت اور مثبت شناخت کا ذریعہ قرار پاتی ہے۔ اپنے اطراف واکناف کی طاقتور اور موثر منفی قوتوں سے مسلسل الجھنے اور اپنے تحفظ اور قوتِ مدافعت کو نقطۂ عروج پر پہنچانے والا الیاسف اب اپنی ساری قوتیں کھو بیٹھا ہے، اس کی حیوانی جبلتیں عملی طور پر اس کے سارے انسانی امتیازات چھین چکی ہیں مگر اس انتہا پر بھی وہ اس وقت تک شکست تسلیم نہیں کرتا جب تک جھیل کا پانی اسے آئینہ نہیں دکھلا دیتا۔ یہاں جھیل عرفان حقیقت کا استعارہ بن جاتی ہے جو سفاک حقیقت نمائی کے سبب گریز اور خوف و دہشت کا مجسم پیکر بن کر اس کو قوتِ امتیاز کی آخری انسانی صفت سے بھی محروم کر دیتی ہے ـــــ اور اس طرح جھیل سے خوف زدہ ہو کر بھاگتے ہوئے صرف اس کے تلوے نہیں دکھتے، صرف کمر کا درد نہیں بڑھتا، صرف ریڑھ کی ہڈی دوہری نہیں ہوتی بلکہ آخری مرحلے میں اس کا جھکنا اور ہتھیلیوں

کو اضطراری طور پر زمین پر ٹپکا دینا اس نئی زندگی کا آغاز بن جاتا ہے جس کی بنیاد خالصتاً حیوانی جبلت اور بے روک جذبات پر قایم ہے۔ اور اس کا بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چلنا اور اس کی جستجو کو اپنا واحد مقصدِ حیات ٹھہرانا، بنت الاخضر کو ایک ایسی علامت میں تبدیل کر دیتا ہے جو بیک وقت جنس، ماتا، تخلیق، تکمیل اور پناہ کے وسیع ترین معانی و مفاہیم اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ ہی عام حیوانی جذبات پر الیاسف کا قابو پا کر جنسی اور تخلیقی جذبے کے سامنے سپر انداز ہو جانا اس مخلوق کی سرگزشت بن جاتی ہے جو جذباتی ہیجانات کی شدت اور ضبطِ نفس کے فقدان کے سبب شرف و فضیلت کی سطح سے محض حیوانی سطح پر اتر آتی ہے۔ یہ کہانی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر اس اخلاقی اور روحانی ابتذال کا علامیہ نظر آنے لگتی ہے جو ارذل ترین حیوانات سے مخصوص ہوتی ہے مگر اس ابتذال کے محرکات انسانی سرشت میں بھی مخفی ہوتے ہیں مگر مذہب، اخلاق اور تہذیب کی صالح اقدار اکثر ان محرکات کو پنپنے سے روکتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ (مذہبی اصطلاحات میں) انسان "خلیفۃ اللہ فی الارض" اور اشرف المخلوقات کے مرتبہ پر فائز ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس میں اندرونی طور پر حیوانی جذبات اور غیر انسانی عناصر بھی بارودی سرنگوں کی طرح خطرناک طور پر موجود ہیں اور انسان کے ہر چہار جانب منفی عوامل کی ایسی آتشیں لہریں بھی ہیں، جو کسی بھی لمحے شرف اور خلافت کے لبادہ کو جلا کر خاک کر سکتی ہیں۔ انسان کے لئے روحانی اور اخلاقی اقدار کا تحفظ اسی بات پر منحصر ہے کہ وہ اس آگ کو گلزار میں کیسے تبدیل کرتا ہے اور حیوانی جبلتوں پر کیوں کر قابو پاتا ہے۔ وہ قوم جو ضبطِ نفس اطاعت اور صبر و قناعت کی صلاحیت سے عاری ہو کر اپنے فطری وجود سے محروم ہو چکی ہے، ان کا انجام بھی ایک ایسے ہی منظر نامے میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کا ہر منظر اس قوم کے آخری آدمی (الیاسف) کے صبر و ضبط اور قوتِ برداشت کا امتحان لے رہا ہے ــــــ اس معاشرہ میں ایک رہے سہے آدمی کا اپنے آپ کو انسانی سطح پر باقی نہ رکھ پانا ایک استثنائی مثال کی معدومیت، منفی رجحانات اور غیر انسانی اقدار کے تسلط اور ناگزیریت کا اشاریہ ہے۔

"آخری آدمی" میں انتظار حسین کا بنیادی مسئلہ اخراجِ بشریت ہے۔ اس اخراجِ بشریت کے اسباب و علل ہر زمانے میں انسان کے اندر اور باہر موجود رہے ہیں۔ ان اسباب و علل کی نفی کرنا اور داخلی حیوانی جبلتوں اور خارج کے منفی محرکات کے خلاف نبرد آزما رہنا ہی آدمی کے لئے اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے اور اخلاقی امتیازات کو قایم رکھنے کا سہارا ثابت ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اپنی فن کارانہ چابک دستی: اس روایتی حکایت کو لمحاتی واقعات سے نکال کر غیر زمانی اور غیر مکانی صداقت کا حصہ بنا دیتا ہے وہ نہ فرد کو ماحول اور معاشرہ سے اس طرح جدا کر کے دیکھتا ہے کہ اس کا سیاق و سباق ہی مفقود ہو کر رہ جا

اور نہ وہ صرف اس کی سماجی حیثیت پر اتنا زور دیتا ہے کہ اسے ہجوم سے الگ کر کے پہچانا ہی جا سکے۔ اس کے نزدیک فرد کی پہچان تاریخ اور تہذیب کے حوالے کے بغیر منظم اور متعین نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کہانی کا مرکزی کردار امکان کے آخری لمحوں تک اپنی قوتِ مدافعت کے استعمال کے باوجود آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس کی ذاتی شناخت بھی اس کھوئے ہوئے معاشرے کے ساتھ کھو گئی ہے۔ الیاسف کا اس کو انسان تبلانے والے کسی شخص کی تلاش کرنا، اسی حقیقت کے اظہار کی ایک صورت ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ فنی نقطۂ نظر سے "آخری آدمی" کا افسانہ نگار نمایاں ہو کر کہاں سامنے آتا ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ انتظار حسین کا فن نہ تو آسمانی صحائف کی حکایت میں مضمر ہے اور نہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے (اگر ہم ڈارون یا دوسرے حیاتیاتی عالموں کے نظریات کی مدد سے اس کی توجیہہ کریں) اس کہانی کی تشریح و تفسیر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انتظار حسین کی غیر معمولی فنی اور تخلیقی صلاحیت اس حکایت کی بے پناہ پیش کش اور اس کے تخلیقی نظام کے انضباط اور تسلسل میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ انتظار حسین کی علامتیں ہمارے اجتماعی لاشعور اور تہذیب و تاریخ کے بطن سے جنم لیتی ہیں، اس لئے وہ نہ تو کلیشئر اور مجرد و منجمد استعارات کو علامت کے نام پر پیش کرنے والے روایتی افسانہ نگاروں کی طرح بے لچک اور اکہری ہوتی ہیں اور نہ آج کے بعض فیشن زدہ نئے افسانہ نگاروں کی بے سر پیر کی علامتوں جیسی لغو اور واہیات۔ اگر آپ "آخری آدمی" کو علامتی تعبیرات سے محروم بھی کرنا چاہیں، جب بھی اس سے پیدا ہونے والے تحیر، استعجاب، دہشت اور المناکی کے عناصر اس کہانی کو غیر معمولی کہانی کے طور پر باقی رکھیں گے ـــــ پھر جائے کہ ایک مخصوص قوم ماحول اور زمانے سے خام مواد حاصل کر کے افسانہ نگار کا آج تک کے زمانی فاصلے کو اس طرح عبور کر جانا کہ الیاسف آج کے جدید ترین دور کا جیتا جاگتا کردار نظر آنے لگے۔ الیاسف کا گناہ، گناہ کی عقلی تاویلیں، اس کا جہد للبقا اور اپنی ذاتی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے کسی بھی قیمت کو چکانے کے لئے تیار ہونا جدید آدمی کا مربوط استعارہ بن جاتا ہے جو جذبہ، احساس اور ضمیر تک کو قربان کر کے بھی ساری زندگی اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کی جد و جہد کر سکتا ہے۔

انتظار حسین نے الیاسف کو ایک مقام پر لفظوں کی حرمت اور قدر و قیمت سے عاری دکھلا کر سماجی اور انسانی رشتوں کے اس بنیادی وسیلہ کی ناقدری کا احساس دلایا ہے جو رشتوں کی شکست و ریخت اور رابطوں کے انتشار سے پیدا ہوا ہے۔ ہم رشتہ اشخاص کی صورت و ہیئت کی تبدیلی کے ساتھ ہی لفظوں کا پل خود بخود ٹوٹنے لگتا ہے۔ اور اس طرح لفظ کا خالی برتن کی مانند رہ جانا رشتوں کے کھوکھلے پن کا استعارہ بن جاتا ہے۔

انتظار حسین نے "آخری آدمی" کی زبان، اسلوب بیان اور کردار کے نام اور صورت حال کے ارتقا کو آسمانی صحائف اور بالخصوص قرآن کی اس مخصوص حکایت کے قریب رکھا ہے جہاں سے اس کہانی کے لئے فیضان حاصل کیا گیا ہے ـــــــ قرآن میں دو مقامات پر اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے دوسری صحائف میں صرف اشارے ملتے ہیں۔ انتظار حسین نے فضا آفرینی اور تاثر کو برقرار رکھنے کے لئے قرآن کے لب ولہجہ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ لہجہ قرآن سے اتنا قریب ہے کہ اس کہانی کے بیشتر جملے قرآن میں بکھری ہوئی مختلف آیتوں کے براہ راست ترجمے معلوم ہوتے ہیں ـــــــ افسانہ نگار کو اس عربی لب ولہجہ کو اردو میں اپنانے کے لئے کتنی ریاضت سے گزرنا پڑا ہوگا، یہ تو افسانہ نگار کا مسئلہ ہے، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ انتظار حسین نے کہانی کی جدید تر تکنیک کو استعمال کرکے اپنی روایت کو کس طرح ہم عصر زندگی کا حصہ بنا دیا ہے ـــــــ اگر انتظار حسین اس کہانی کو اردو کے عام لب ولہجہ اور مروجہ اسلوب میں لکھتے تو شاید اس میں یہ امکانات نہ پیدا ہو پاتے جو قرآنی لب ولہجہ اور انتظار حسین کی تخلیق کردہ جزئیات کے سبب پیدا ہو گئے ہیں۔

کہانی کی منطق، پلاٹ کی ماورائی ترتیب اور واقعات کی مافوق الفطرت، قرآن کی حکایت کے بنیادی ڈھانچے کی مناسبت سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر اس کہانی کو افسانہ کے مروجہ پیمانوں کی مدد سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو شاید اس کہانی کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے۔ "آخری آدمی" اپنے تخلیقی مزاج کے اعتبار سے ایک گتھی ہوئی تہہ دار اور علامتی نظم کی طرح اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انتظار حسین کی بیشتر کہانیوں کی طرح "آخری آدمی" کے انداز بیان اور تکنیک کے ساتھ ہماری کہانی پہلی بار داستانی روایت سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔ اردو میں کہانی یا ناول کا منبع دراصل مغربی فکشن کی روایت نہیں بلکہ ہماری داستانیں اور آسمانی صحائف اور بزرگوں کی حکایتیں ہیں۔ انجیل اور قرآن کی زبان کا بڑا حصہ صحیح معنوں میں فکشن کی زبان ہے جو اپنے اندر غیر معمولی لچک اور امکانات رکھتی ہے ـــــــ اس زبان اور اس کے وابستہ روایات میں معنی خیز علامتوں کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ انتظار حسین نے اس زبان اور مخصوص حکایت کے سارے علامتی امکانات کو کھنگالنے کی کوشش کی ہے۔ انتظار حسین کی تشبیہیں اور استعارے قاری کو زبان کی چمک دمک اور فریب میں الجھا کر کہانی کے تاثر سے لاتعلق نہیں کرتے بلکہ ان کا استعاراتی بیان، پیچیدہ تجربات اور زندگی کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی حقائق کو اپنے نور سے منور کرتا ہے۔ "آخری آدمی" اور اس نوع کی چند اور کہانیاں انتظار حسین کا امتیاز ہیں۔ اور اسی امتیاز نے انتظار حسین کو ہم عصر اردو کہانی کا نمایاں ترین نام بنا دیا ہے۔ □

شمیم حنفی

دریاہی الفاظ
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی

انتظار حسین

"جنگل میں ایک درویش کو میں نے دیکھا جو ایک کیکر کے درخت کے نیچے سخت جگہ میں تکلیف سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو کہا: اے بھائی، تجھے اس جگہ کس چیز نے بٹھایا ہے جو ایسے توقف سے اس سخت جگہ میں بیٹھا ہے۔ جواب آیا کہ: "مجھے ایک وقت حاصل تھا جس کو اس جگہ میں نے گم کیا ہے۔ اب اس جگہ بیٹھا ہوں اور غم کھا رہا ہوں۔"

شیخ علی ہجویری کے واسطے سے کہانی آگے یہ بتاتی ہے کہ ایک روز اس بزرگ کی دعا سے درویش بالآخر اپنی مراد کو پہنچا۔ گم کیا ہوا وقت اسے مل گیا۔ تس پر بھی درویش وہیں ڈٹا رہا۔ ہٹ دھرمی کا سبب پوچھا گیا تو جواب میں پلٹ کر یہ سوال کیا: "کیا یہ روا ہے کہ ایسی جگہ کو جہاں میں نے گم کیا ہوا سرمایہ پھر حاصل کیا اور میری محبت کا محل ہے چھوڑ دوں؟" پھر بولا ـــــ "اے شیخ! میں اپنی خاک کو اس جگہ کی خاک میں ملاؤں گا تاکہ قیامت کے دن اس خاک سے سر نکالوں کہ میری محبت اور سرور کا محل ہے۔"

انتظار حسین کا قصہ بھی ایک کھوئے ہوئے وقت اور اس کے آشوب کا قصہ ہے۔ اسے کبھی جو وقت حاصل تھا اور جو اپنے ہی سفر کی گرد میں گم ہو چکا، اسی کے آئینے میں وہ اپنے آپ کو بھی دیکھتا ہے اور اپنے زمانے کو بھی۔ میں نے بہت سے نئے تجربوں کو پرانی تمثیلوں میں جذب ہوتے دیکھا ہے۔ اس وقت بھی انتظار حسین کے بارے میں سوچتے وقت اس درویش کی یاد آئی ـــــ ایک فرق کے ساتھ کہ درویش انجام کار حاضر میں اپنے گم شدہ زمانوں کو ایک بار پھر سے پا گیا۔ یہ الگ بات کہ اس حصول کے بعد حاضر کی نوعیت بھی اس کے تئیں تبدیل ہو گئی۔ وہ جو غم کھانے کا محل تھا دارالسرور بن گیا۔ جب کہ انتظار حسین نے بے حصولی کو مقدر جانا۔ پھر بڑے جتنوں سے اسے اپنے لئے گوارا بنایا۔ سو وہ حاضر کا اثبات چاہے نہ کرتا ہو، شکایت کے سوقیانہ چلن سے بھی اس نے سروکار نہ رکھا۔ ناکامیوں سے کام لینے کا یہ ڈھب اس کے مقدر کو کشف المحجوب کے درویش سے الگ کرتا ہے اور اس زمانے کی عام روش اور خود انتظار حسین کے مابین بھی فرق کی ایک لکیر کھینچتا ہے۔

کبھی کبھی یہ لکیر اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ بعضے دانش مند، فی زمانہ جن کی بہتات ہے، انتظار حسین کو اپنے زمانے کی حسیات اور اسالیب فکر کی ضد کے طور پر دیکھتے ہیں۔ دور کیوں جائیے۔ ہمارے دوست

انور عظیم بھی انتظار حسین کو داستان گو کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں کہ داستان کا دور عقلیت اور روشن خیالی کا سائرن بجتے ہی کب کا ختم ہو چکا۔ مگر کیا چکر ہے کہ دور تو ختم ہو گیا، داستان ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اور داستانوں میں زندگی کرنے والوں پر نظر کیجئے تو یہ سارا عہد اپنی چمک دمک کے ساتھ ایک پراسرار دھن میں سانس لیتا دکھائی دے گا۔ ہم خواب میں جاگ رہے ہیں کہ یہ سارا تماشہ جاگتے کے خواب کا ہے؟ کئی مستقبل بین سائنس داں اور عقل پرست بھی اس سوال کے ہاتھوں بہت ہلکان ہوئے۔ ویسے ہمارے یہاں نئی دیو مالائیں ترتیب دینے والوں کا ریلا بھی لگا ہوا ہے۔ رسل، ایچ۔ جی۔ ویلز اور جارج آرول سے قطع نظر ہمارے مصوروں میں شاگل اور پال کلی بھی آخر اسی عہد کی خاک سے اٹھے۔

خیر، تو بات کشف المحجوب کے درویش کی ہو رہی تھی جس نے غم کے محل کو قلب ماہیت کے بعد بھی اپنی محرومی کے تجربے کو یاد رکھا۔ اس طرح دو زمانوں کے سرے ایک گرہ میں باندھ لئے اور وقت کی تقسیم کے عمل کی نفی کی۔ درویش کا یہ رویہ اصلاً ایک تخلیقی آدمی کا رویہ تھا جو ایسی مصنوعی حصار بندیوں کے پھیر میں پڑنے کے بجائے اپنے وقت اور ماحول کی سطح سے اوپر جا کے ایک ساتھ کئی زمانوں کا احاطہ کرتا ہے اور اسی حوالے سے اپنی پوری زندگی کا حساب جوڑتا ہے۔

انتظار حسین کے مسئلے کی نوعیت بھی یہی ہے۔ وہ کس وقت میں زندہ ہے؟ ماضی؟ حال؟ مستقبل؟ اسے کیا نام دیا جائے؟ بات اتنی سیدھی سادی بھی نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے توسط سے اپنی حقیقت کا بھید آپ پر کھول دے۔ آپ نے کھینچ تان کر اسے ایک حصار میں سمیٹ بھی لیا تو پھر کچھ تجربوں کی ہمیشگی کے مسئلے سے الجھنا ہو گا۔

اصل میں گئے دنوں اور آج کے عہد میں فرق کی لکیر جتنی واضح تھی نہیں اس سے زیادہ فرض کر لی گئی۔ لالچ، نفرت، غصہ، استحصال، بھوک اور غم۔ ان میں کون تجربہ ایسا ہے جو زمانے کی آنکھ نے پہلے نہیں دیکھا تھا یہ بات الگ کہ سچائی کے روپ اور اس کے تئیں رویئے برابر تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور اسی تناسب سے ان تجربوں کے درجات بھی۔ مگر سچائی تو جوں کی توں رہی۔ دلی اور لاہور میں جو دوریاں دکھائی دیتی ہیں ان پر حدیں تو خود آدمی نے کھینچیں۔ پھر ان حدوں کو کچھ نام دے دیئے۔ ناموں کو یاد رکھنے اور ان کے حوالے سے دور افتادہ واقعات تک پہنچنے میں سہولت تھی اس لئے دھیرے دھیرے حقیقت ناموں میں گم ہوتی گئی۔ پھر ہمارا زمانہ تو حقیقت کی استعاراتی اور فکری تعبیروں کا کچھ زیادہ ہی شیدائی ہے۔ سو عجب کیا ہے کہ ماضی رجعت کا نشان ٹھہرا، حال ترقی کا۔ مورخوں نے بتایا اور ہم نے یہ بھید پایا کہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز پندرھویں صدی میں ہوا اور ہمارے دیس میں یہ قصہ مغلوں کے زوال کے ساتھ چلا۔ تاریخ نے سچ مچ ہمارے لئے بڑے مسئلے پیدا کئے ہیں

گر اس سے بھی زیادہ وہ مسئلے تخلیقی آدمی نے تاریخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ تخلیقی آدمی کسی نہ کسی سطح پر تاریخ کے جبر سے دوچار ہوتا ہے اور اس سے نپٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ کشف المحجوب کا درویش ہوشیار تھا کہ اپنے مسئلے کا حل اس نے خود اپنے حواس کی زمین میں ڈھونڈ نکالا اور اس طرح جذبے کو بصیرت کا بدل ٹھہرایا۔ انتظار حسین نے بھی جس روز ایک اجنبی مسافر کی حیثیت سے ہمایوں کے مقبرے کی فصیل میں قدم رکھا اور احاطے میں کھڑے املی کے پرانے پیڑ کی پتی چکھی، اپنے قدموں کی چاپ اور پتی کے مزے پر حیران ہوا۔ اس حیرانی کو قیاس کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ زمین اور ذائقے کی نوعیت دوریوں کی ضرب سے دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو جاتی ہے؟ اس تبدیلی کا احساس کیوں کر ایک بوجھ بنتا ہے اور دل کو اداسی سے بھر دیتا ہے۔ جب کہ دراصل بدلتے تو ہم ہیں۔ ہم سے آگے جو صورتیں اور فصیلیں اور اشیاء وجود میں آئیں انہیں چار و ناچار رخصت ہونا ہی تھا۔ سو وہ گئیں۔ یہ سلسلہ تو ہمیشہ کا ہے۔ جس طرح یہ سلسلہ اور یہ وقت مستقل ہے اسی طرح یہ درد بھی مستقل ہے۔ گر یہ اطلاع کس اخبار نے بہم پہنچائی کہ اب کشف المحجوب کے درویش کی آمد کا سلسلہ تمام ہو چکا ہے۔ میں یہاں تنائج کی تعبیریں کرنے نہیں بیٹھا ہوں۔ پھر بھی یہ اعتراف کرتا چلوں کہ ادب کی کوئی کتاب، کیا شعر کیا افسانہ، میں نے کبھی اس امید کے ساتھ نہیں پڑھی کہ اس میں اپنے زمانے کی حقیقتوں کا بیان یا مسئلوں کا حل مل جائے گا۔ میری جستجو تو صرف یہ رہی کہ ان کے واسطے سے آپ اپنی حالت اور حقیقت کا کچھ اتا پتا پا جاؤں۔ ان میں چھپے ہوئے کسی معنی تک پہنچ سکوں اور اس کے آئینے میں اپنے روحانی مطالبات کا کوئی عکس دکھائی دے جائے۔ رہے خالص ذہنی مسئلے تو انھیں سلجھانے کے لئے ایک سے ایک عالم پڑا ہوا ہے۔ سائنس، ٹکنولوجی اور سیاست سے ہم چاہے جتنا بھاگیں، جہاں تک ہمارے طبیعی اور اجتماعی سوالوں کا تعلق ہے، ان کے جواب کی خاطر ہمیں ان ہی کا دریوزہ گر ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اجتماع سے الگ ہو کر، جب بھی میں اپنی جستجو کے سفر پر نکلا، کبھی اس درویش سے مڈبھیڑ ہو گئی، کبھی میر صاحب سے، کبھی شام کی سرمئی وسعتوں میں گم کسی پرندے سے، کبھی شانتی مُدرا میں کھڑے کسی درخت سے اور کبھی تھم تھم کر بہتے ہوئے دریا سے۔

انتظار حسین سے جو ربط قایم ہوا وہ بھی بڑی حد تک نجی اور ذاتی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ رشتے رفاقت کا ایک تجربہ بننے کے بعد رفتہ رفتہ احساس کے ایک مشترکہ طور اور جینے کے ایک اسلوب میں ڈھلتے جاتے ہیں، میرے ساتھ انتظار حسین کا معاملہ بھی یہی رہا۔ اس نے اپنے وقت سے، وقت کے مختلف دائروں سے دائروں میں گردش کرتے ہوئے چہروں، رنگوں اور ساعتوں سے ہر چند کہ ایک انتہائی شخصی تعلق استوار کیا ہے، مگر اسی تعلق کی تہہ سے زندگی کی طرف ایک مربوط اور منظم زاویے اور ایک مترتب طرزِ احساس کی

پرچھائیاں بھی نمودار ہوتی ہیں۔ ایک بار مشرقی اتر پردیش کے سفر میں پرانے شراوستی سے ذرا پہلے اور جس جگہ
اب کپل وستو دریافت ہوا ہے اس کے آس پاس دو سنتوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک بلا کا باتونی تھا، دوسرا اتنا
ہی خاموش۔ پھر بھی یہ فیصلہ مشکل تھا کہ کون زیادہ بول رہا ہے۔ وہ جو خاموش تھا وقفے وقفے سے ایک دو جملے
کہتا پھر یا تو سوچ میں گم ہو جاتا یا پھر اپنے ساتھی کے ہونٹوں پر حیران آنکھیں جمائے سر ہلاتا رہتا۔ دونوں
کو سنت شاعروں کا بہت کلام یاد تھا۔ ایک چند لفظوں میں کوئی دوہا، چوپائی، بھجن دوہرا کر چپ ہو جاتا، دوسرا
اسی کو حوالہ بنا کر تقریر جھاڑ دیتا۔ جتنی دیر ان کا ساتھ رہا وہ ایک استعجاب آمیز گم شدگی کے ساتھ اپنے ذاتی تجربوں
اور واہموں کی بات کرتے رہے۔ مگر یہ محسوس ہوا کہ جو تجربہ بھی ان پر وارد ہوا تھا اس کی تفسیر گئے زمانوں کے
صوفی سنت بہت پہلے کر گئے تھے۔ شخصی رویوں کی اجتماعی اساس اسی طرح اور اسی سطح پر قائم ہوتی ہے۔ تجربے
میں اکثر یہ آیا کہ آدمی کی جان کو لگے ہوئے بہت سے سوال جن پر عالم فاضل لوگ لمبی چوڑی بحثیں کر کے کچھ نتیجے
نکالتے ہیں۔ ان تک عام آدمی کبھی کبھی ایک جست میں جا پہنچتا ہے۔ بس یہی نا کہ اس تجربے کے بیان کے لئے
اس کے پاس سدھائے ہوئے لفظ اور آزمائی ہوئی اصطلاحوں کا ذخیرہ نہیں ہوتا۔ مگر اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟
کیا ان سوالوں کی حقیقت بدل جاتی ہے؟ انتظار حسین نے بھی اپنا سروکار حقیقت کی اصل بنیادوں سے رکھا
اور ان فروعات سے ہمیشہ گریز کیا جن کے سیل میں خاص طور پر افسانہ نگار بہت آسانی سے بہہ جاتا ہے
ان معصوموں کی سادہ نظری پر مجھے عبرت ہوتی ہے جو انتظار حسین کے اسلوب کو داستانوی سمجھتے ہیں۔ یہ
لفظ کے ہر عمل کو ایک لاٹھی سے ہانکنے اور زبان، لہجے اور اظہار کی سطح میں تمیز نہ کر سکنے کا قہر ہے۔ انتظار حسین
نے بہت صاف لفظوں میں یہ اطلاع بھی دے دی ہے کہ اس قصے کو پھیلانے سے زیادہ سمیٹنے کی فکر رہتی ہے
تخلیقی آدمی کا بنیادی کمٹ منٹ اس سچائی سے ہوتا ہے جو اس کا تجربہ بنتی ہے۔ اور سب سے بڑی سچائی تو
اس کا اپنا تخلیقی تفاعل ہے۔ انتظار حسین نے بھی اپنی کہانیوں کے عمل کو اپنے انفرادی حسی، جذباتی اور ذہنی
عمل کے تابع رکھا ہے اور اسی سطح پر اجتماع میں اختصاص کا پہلو نکالا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی کہانیوں
کے سلسلے میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کی تلخیص ممکن نہیں۔ جب ہر لفظ جاگتا ہو تو آپ کس کی سنیں گے اور
کسے نظر انداز کریں گے؟ مقرر، خطیب اور مفسر کے ساتھ یہی تو آسانی ہوتی ہے کہ بولتا زیادہ ہے، اس کے پاس
باتیں کم ہوتی ہیں۔ آپ جملے کے جملے پکڑ نہ سکے ہوں جب بھی کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے بہت سے کہانی لکھنے
والے کہانی کے نام پر کہانی کی شرح لکھتے ہیں چنانچہ کہانی سے الگ بھی ان کا بیان جاری رہتا ہے۔ یہاں انتظار
حسین کا حال یہ ہے کہ لہجہ تو فضا باندھتا ہے داستان کی مگر لفظیات کو پھیلانے کے بجائے سمیٹتے جاتے ہیں۔ بطور
قصہ گو یہ انتظار حسین کا مخصوص ہنر ہے۔ اسے چالاکی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور جب وہ عام انسانوں کی مثال ادھر

ادھر کی باتیں کرتا ہے اس وقت بھی لفظیات کے فرق کے باوجود گفتگو سے اس کے اسلوب کا یہ طور صاف جھلکتا ہے۔ اپنے مخاطب سے تقاضہ کرتا ہے کہ اس کے کم کے کو زیادہ جانے اور لفظوں کو جنسِ ارزاں نہ گردانے۔

(۲)

کتنے آسان ہوتے ہیں وہ لوگ جو کبھی شک میں نہیں پڑتے۔ ان کے تمام رویئے اور افعال خوارج کے اثبات اور قبولیت کا ایک مستقل سلسلہ ہوتے ہیں یا پھر سرے سے انکار۔ اپنے تئیں یا دنیا کے تئیں مکمل انکار ہو یا اقرار، اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ادھر انتظار حسین کا معاملہ یہ ہے کہ خواب اور حقیقت کا تانا بانا اس کی کہانیوں میں ایک دم الجھ جاتا ہے، بایں طور کہ دونوں کی اصل میں فرق آجاتا ہے ـــــ حقیقتیں خواب آثار اور خواب جاگتی آنکھوں کا سچ۔ میرے ایک مصوّر دوست نے جس روز پہلے پہل انتظار حسین کو دیکھا حیران ہوا۔ "یہ انتظار حسین ہیں؟" پھر کئی دنوں بعد میں نے اس کی میز پر قلم سے کھنچے ہوئے کچھ اسکیچز میں کمار گندھرو کا بھی ایک اسکیچ دیکھا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ کمار گندھرو نہیں ہے؟" پھر کون ہے؟" انتظار حسین!" تب تک اس کی حیرانی ختم ہو چکی تھی اور میری بھی کہ انتظار حسین سے ملاقات پرانی ہو چکی تھی۔

میں نے اتنے پُر فریب چہرے کم دیکھے ہیں۔ بہت عام اور مانوس پھر بھی کچھ گم سم سا، بھیڑ میں بھی الگ الگ اور دوستوں کی محفل میں بھی اکیلا اکیلا سا۔ لیکن ہر طرح کے تصنع سے محفوظ۔ یوں میں نے اسے جھٹپٹے کے وقت تنہا درخت کے نیچے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا بھی دیکھا ہے۔ مگر اسے خلا میں دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔ کوئی پرندہ، یا پتوں سے لدی کوئی ٹہنی یا پھر دور اس چہرے کی زد پر کوئی اور چہرہ۔ ایک انوکھی لاتعلقی ہر منظر سے اس کی بصارت کے رشتے کو قدرے پُر اسرار اور نامانوس بنا دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انتظار حسین کی زبان سے زیادہ گویا اس کی آنکھیں ہوتی ہیں، یوں عام طور پر بے پروا، کچھ غبار آلود اور سست روسی، بے اعتباری کی ایک مستقل کیفیت انھیں مانوس سے مانوس ماحول میں بھی بے گانہ بنائے رکھتی ہے۔

مگر انتظار حسین ان معنوں میں OUTSIDER بھی نہیں جن معنوں میں کولن ولسن نے دستوئیفسکی یا وینگات یا لارنس کو آؤٹ سائڈر سمجھا تھا THE HOLE IN CORNER MAN جس سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کا رشتہ اس لحاظ سے برابر کا ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناقابلِ قبول ہوتے ہیں، آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں اور معاشرے کے لئے ایک مسئلہ یا موضوع یا دردِ سر بن جاتے ہیں۔ بیزار، مشتعل، عجیب الوضع، پُر اسرار، باغی۔ بظاہر انتظار حسین بہت عام سا آدمی ہے۔ بادی النظر میں ہر اسرار سے تہی۔ نہ باغی نہ انقلابی۔ ویسے اپنی روح کے مطالبات، اپنی ترجیحات اور جذبات کی زمین میں پیوست جڑوں کی مثال مقاصد کا شعور جس سطح پر اور جس گہرائی میں جا کر انتظار حسین نے دریافت

کیا ہے اس تک اردو کیا، اردو سے باہر بھی ہمارے زمانے کے اکّا دکّا ادیب ہی پہنچ سکے ہیں۔ مگر وہ نہ علم لگاتا ہے، نہ چہرے بناتا ہے، نہ اتراتا ہے، نہ شور مچاتا ہے۔ اس کے یہاں ہزیمت کی تلخی اور کسی ایقان کی درشتی کا گزر بھی نہیں۔ بس ایک طنز کی دھار ہے جو گاہے ماہے اس کے وجود پر چھائی ہوئی عام نرمی اور ملائمت کی دھند کو چیرتی ہوئی مخاطب کے حواس پر آن وارد ہوتی ہے۔ دیر آشنائی، حجاب آمیزی اور کم سخنی کے باوجود شاید اسی لئے انتظار حسین نے بہت لوگوں کو اپنا مخالف بنایا ہے۔

طنز کی یہ لہر اس کے مزاج کی خلقی افسردگی پر ایک نقاب بھی ڈالتی رہتی ہے اور اوسطیت کے ہجوم میں اس کے ذہنی اور جذباتی امتیازات کی نشان دہی بھی کرتی ہے۔ اسے ہنسی کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔ اس لہر کی حیثیت بد مذاقیوں کی یورش میں ایک ڈھال کی بھی ہے کہ اس کے واسطے سے وہ اپنا دفاع بھی کرتا ہے اور متخالف میلانات کی بنیادوں پر ضرب بھی لگاتا ہے۔ اچھے فقرے تو بہت لوگوں کو سوجھتے ہیں لیکن بالعموم ہوتا یہ ہے کہ ایسے اصحاب اپنی ذہانت کے نشے میں اپنے فقرے ضائع کرنے کے عادی بھی ہو جاتے ہیں اور انھیں ہر کس و ناکس پر آزماتے رہتے ہیں۔ انتظار حسین کا طنز محض طبیعت کی تیزی اور درّاکی کے اظہار کا ذریعہ شاید اتفاقاً ہی بنتا ہے۔ میں نے اس کے طنز یا تمسخر کو ہمیشہ اس کی متانت ہی کے ایک عنصر کی صورت دیکھا۔ چنانچہ وہ ایک خاص سطح سے نیچے کے لوگوں کو طنز کا نشانہ بنانا تو دور رہا انھیں منہ لگانے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ کسی کٹھن گھڑی کا سامنا ہو تو اپنے آپ میں سمٹ جاتا ہے۔ گرد و پیش سے اس طرح بے نیاز ہو جاتا ہے جیسے اس کا وجود ہی نہیں ہے اور ہے بھی تو ہیچ ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انتظار حسین اپنے عشق میں مبتلا یا اپنی اہمیت کے نشے میں سرشار ہے، یا یہ کہ اسے عام رویّوں اور باتوں اور لوگوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ بالفرض ایسا ہوتا تو بہ حیثیت افسانہ نگار انتظار حسین کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔ اس نوع کا عذاب دوسروں سے زیادہ خود فنکار کی تخلیقی طینت کو جھیلنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس انتظار حسین کو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرّتوں، امیدوں، کامرانیوں محرومیوں اور نارسائیوں اور المیوں، مناظر کے بہت مانوس اور بہت معمولی نقوش اور موجودات کے ادنیٰ ترین مظاہر سے گہری دلچسپی ہے۔ دلچسپی ہی نہیں اسے ایک طرح کا وجدانی ربط سمجھنا چاہئے۔ نیم کا پیڑ یا ہارسنگھار کا پھولوں سے لدا اور اپنی مہک سے بوجھل درخت، کھیت، سبزہ زار اور پرندے، آدم زادوں سے چھلکتے ہوئے بازار اور بچوں، عورتوں، جوانوں اور بوڑھوں کی آوازوں اور قہقہوں سے لبالب بھری ہوئی گلیاں، آبادیاں اور ویرانے، نیدر اور دانشور، بھانت بھانت کے رنگ اور قسم قسم کے لوگ، احمق بھی، عقلمند بھی، جن سے انسانی کائنات کا تماشہ ترتیب پاتا ہے، پھر ان کے دکھ سکھ،

واہمے اور عقیدے، رسوم و روایات، بوالعجبیاں اور معمولات، یہ سب اس کی نظر اور احساس کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ میں نے اس بھرے پرے منظر نامے میں جب بھی انتظار حسین کو دیکھا اس میں گم ہوتا ہوا دیکھا۔ دانش مندوں کے زمرے میں وہ جتنا خود آگاہ نظر آتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اپنے آپ سے اتنا ہی غافل دکھائی دیتا ہے۔ گرمی کی چلچلاتی دوپہر میں شاہ جہانی مسجد کی سیڑھیوں سے ملحق بازار میں، جہاں آس پاس کولڈ ڈرنکس کے کئی اسٹال بھی تھے، پیاس بجھانے کے خاطر اس نے دفعتاً کٹورے بجاتے ہوئے سقے کی سمت رخ کیا اور پھر اس کے ہاتھ سے پیالا لے کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔ اس وقت پل بھر کے لئے بھی مجھے یہ گمان نہ گزرا کہ اس عمل کی غرض تجربے میں اضافہ یا پرانی دلی کے کسی گم ہوتے ہوئے رنگ کی بازیافت ہے۔ ایسوں کے حال پر میں نے ہمیشہ افسوس کیا ہے جو بستی نظام الدین کی گلیوں یا پرانے شہر کے بازاروں میں کبھی نظر آ گئے تو اپنے آپ سے شرمندہ یا پھر سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سمی کے محققانہ جذبے سے بوجھل دکھائی دیتے ہیں زندگی کی یا آپ اپنی بے حرمتی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی ؛ ہمارے عہد کی مصنوعات میں سب سے نمایاں شے تو وہ آدمی ہے جس نے زندگی کے براہِ راست تجربوں کی جگہ ڈیل کارنیگی کی کتابوں سے جینے کے طور مستعار لئے ہیں اور ہمہ وقت ردِ قبول کے پھیر میں پڑا رہتا ہے۔ ایسا آدمی محکمۂ تعلقات عامہ کا افسر اعلیٰ یا کسی تجارتی ادارے کا ایگزیکیٹیو یا کچھ اور بن جائے تو بن جائے افسانہ نگار لاکھ برس نہیں ہو سکتا۔ شاید ادب کا اچھا قاری بھی نہیں بن سکتا۔ چہ جائے کہ انتظار حسین بن جائے۔ زندگی سے اپنے رابطوں کی بابت ایک انتخابی رویے کی اطاعت اور بات ہے مگر جذباتی، حسی اور بصری مساوات کی اس کیفیت سے، جو افسانہ نگار کے تخیل کا رشتہ اس کی زمین سے جوڑتی ہے، یکسر محروم ہو جانا تو ایک ہیبت ناک المیہ ہے جس کی سزا سے بہتیرے افسانہ نگار اپنی تمام تر انسان دوستی کے باوجود محفوظ نہ رہ سکے۔

یہ محرومی انجام کار ایک طرح کے ڈی ہیومنائزیشن پر منتج ہوتی ہے اور اچھے بھلے آدمی کو تجرید بنا دیتی ہے۔ میرے خیال میں اس زمانے کے بیشتر تجریدی افسانہ نگاروں کی ناکامی کا رمز اسی حقیقت میں مضمر ہے۔ مثلاً مجھے گھنے، چھتنار اور پرانے پیڑ جن کی جڑیں زمین میں دور تک پھیل چکی ہوں اچھے لگتے ہیں۔ ایک دوست نے اس پسندیدگی کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا "بس اچھے لگتے ہیں" وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے: "شاید اس لئے کہ ایسا پیڑ روایت کے استحکام کا استعارہ ہوتا ہے۔" یہ میرا مسئلہ نہیں تھا پھر بھی خیال آیا کہ اچھا بھلا پیڑ تعبیر کی زد پر آتے ہی خواہ مخواہ استعارہ بن گیا۔ ہم عامیوں کے تئیں تو زندگی اور مناظر برتنے کے لئے ہوتے ہیں۔ تفہیم و تعبیر کے نام پر اس دولت سے ہاتھ دھو بیٹھنا شیوۂ دانش منداں ہے کوئی شے یا منظر اگر استعارہ بننے کی قوت رکھتا ہے تو یہ اس کی ایک زائد صفت ہوئی۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر

اس بہانے دیکھنے والے کی آنکھ کا جادو بولتا ہے۔ مجھے ایک جیتی جاگتی حقیقت کے استعارہ بننے پر اعتراض نہیں۔ بس یہ ڈر لگتا ہے کہ اس عمل میں متعلقہ حقیقت کا اپنا سحر ٹوٹ نہ جائے اور حقیقت استعارے کی نذر نہ ہو جائے۔ کئی بار صبح سویرے میں نے دیکھا کہ انتظار حسین رات کے ملگجے کپڑوں میں، سر جھکائے، کبھی ہوا یا کسی درخت کی سرگوشی یا کسی پرندے کی پکار پر چونکتا ہوا چپ چاپ اس سڑک پر رواں ہے جو آگے جا کر کیکر کے جنگلوں، گیندے اور بیلے کے کھیتوں میں گم ہو جاتی ہے، جہاں کوئل کی کوک اور مور کی چیخ رات کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے اور نیند سے پوری طرح جاگا ہوا سورج کرنوں کے بان سنبھالے جمنا کی سطح پر روشنی کی پٹریاں بچھاتا ہے۔ اُس وقت انتظار حسین اور پیش منظر میں ایسی مکمل ہم آہنگی دکھائی دی گویا کہ وہ فی نفسہ اس کی ترکیب میں شامل ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ہونے کا جواز مہیا کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے مطمئن ہیں اور طبیعی سطح پر بھی ایک دوسرے کو قبول کر رہے ہیں۔

ماحول سے لاتعلقی کے باوجود مظاہر سے حسی اور جذباتی تعلق کے ارتعاشات نے انتظار حسین کی شخصیت کو ایک بڑی سمفنی کا حصہ بنا دیا ہے۔ یہ شخصیت بے گانہ نظر آئے جب بھی اپنے خارج سے متصادم نہیں ہوتی۔ اس کی عنصری سادگی ہر طرح کے تصنع کی آمیزش سے اسے دور رکھتی ہے۔ باہر کی دنیا کے اثرات سے اس کا تحفظ کرتی ہے اور اس کی اپنی ذہنی اور حیاتی اساس کو استحکام بخشتی ہے۔ اسے رسمی امتیازات کی حرص اور معمولی بن کے ڈر سے نجات دلاتی ہے۔ کئی موقعوں پر یہ حال دیکھا کہ انتظار حسین کے منہ پر کسی نے اس کی تعریف شروع کی پہلے تو اس نے چاروں طرف شک کی نظر ڈالی، پھر یا تو موضوع بدل دیا، یا اپنے آپ میں سمٹ گیا۔ اور اگر اس سے بھی کام نہ چلا تو اس پورے تماشے سے لاتعلق ہو گیا۔ یہ بھی ہوا کہ لمحے بھر کے لئے چہرے پر کچھ اکتاہٹ دکھائی دی یا آنکھوں میں گھڑی دو گھڑی کے لئے ایک شوخ اور شرارت آمیز چمک، پھر اس نے اپنے ذکر پر یوں کان لگا دیئے جیسے بات کسی اور کی ہو رہی ہے اور خود اس کی حیثیت اس جگہ بس ایک عام سامع یا تماشائی کی ہے۔

یوں بھی انتظار حسین ایک شرمیلا آدمی ہے۔ اس کی حجاب آمیزی اس کے ردعمل اور جذبے کے بے حایا اظہار پر مستقل پہرے بٹھائے رکھتی ہے۔ ہنسی کا محل ہو یا رنج کا، وہ بادی النظر میں تقریباً بے حس دکھائی دیتا ہے۔ ایک سنگین لاتعلقی مگر ہر طرح کے فلسفیانہ پوز سے یکسر عاری۔ لیکن عجیب بات ہے کہ انتظار حسین کے چہرے کی عام نرمی اس کیفیت میں بھی برقرار رہتی ہے۔ شاید یہ حاصل ہے کٹھن سے کٹھن مرحلوں میں بھی اپنے داخلی نظم کو قائم رکھنے کا یا ایک طرح کی الم آسودگی کا جو صرف یہ کہتی نظر آتی ہے کہ حیرانی سے کیا ملے گا؟ جو ہوا وہ ہونا ہی تھا اور جو ہوا اسے جھیلنا ہے۔ پھر کیوں نہ اس طرح جھیلا جائے کہ اپنے جی کی دکھ سکھ کا

پردہ بھی باقی رہے اور دوسروں میں رسوائی نہ ہو۔ یہ طور اپنی فسردگی اور تنہائی کے احساس کی تکریم کا زائیدہ ہے۔ ایک وجودی اور تخلیقی بصیرت کا عطیہ۔ اونچی آواز میں رونے والوں سے انتظار حسین کو کراہت ہوتی ہے۔ میں نے اسے کھل کر ہنستے بھی نہیں دیکھا۔

(۳)

بس ایک آسیب ایسا ہے جو آٹھوں پہر انتظار حسین کے تعاقب میں رہتا ہے اور قدم قدم پر اس کے لئے مسئلے پیدا کرتا ہے۔ حافظہ جو ظالم بھی ہے اور اپنے حاضر کے تئیں آگہی کا آئینہ بھی۔ اگر یہ سچ ہے کہ اشیاء اور حقیقتیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں تو ماضی کے تجربوں کو بھی ہم آج کے متعلقات کی ضد فرض کئے لیتے ہیں ویرانوں میں انتظار حسین کو آبادیوں کی یاد آتی ہے اور ہانپتے کانپتے شہروں میں ان بستیوں کا جن کے رنگ اب ٹھہر گئے ہیں۔ پھر یہ رنگ پھیل کر ماضی سے موجود تک ایک لمبا سفر کرتے ہیں اور اس تجربے کی خبر لاتے ہیں جس کی حدوں میں گئے دنوں کے ساتھ آنے والے دن بھی سمٹ آتے ہیں۔ وہ اس تجربے کے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے عناصر کا موازنہ کرتا ہے۔ ایک کے حوالے سے دوسرے کی تعیین کرتا ہے اور رنج کھینچتا ہے وہ جو کھو چکا اسے کھونے کا احساس اور وہ جو ہو رہا ہے اس کے ہونے کا قہر، فسردگی کے یہ دو منطقے ایک دوسرے میں آمیز ہو کر ایک بڑے درد کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ انتظار حسین وقت کے معروضی تجربے اور اس کے ارتقا کی سچائی کو غیر جذباتی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ اپریل ۱۹۸۰ء میں جب علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا نے پاکستانی مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ایک پرجوش طالب علم نے مشترکہ کلچر کے تصور کی بنیاد پر تقسیم کے واقعے کو ہدف بنایا تو انتظار حسین سے نہ رہا گیا۔ اور وہ جس نے ایک روحانی ضرورت کی تکمیل کے لئے بندر کی دم کو پھلانگنے کا عزم باندھا تھا جذبے کی اس بے لگام فراوانی پر بھڑک اٹھا۔ اس وقت انتظار حسین نے تاریخ کی منطق اور اس کی ناگزیریت کا دفاع ایک منجھے ہوئے مقرر کی طرح کیا۔ وہاں اس کا انداز تقسیم کے تصور کی جذباتی وکالت سے زیادہ تاریخ کے فیصلوں کی قبولیت اور احترام کا تھا۔ سو وقت پڑنے پر انتظار حسین کو جذبوں کا حصار توڑنے اور نہایت عقلی دلیلیں جوڑنے کا ہنر بھی آتا ہے۔ غالباً یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ جذبے کی ایک سطح وہ بھی ہے جو جذباتیت سے ماورا ہے اور اس کے بغیر بھی اپنے آپ کو قایم رکھ سکتی ہے۔ یہی سطح جذبے اور شعور کی دوئی کو مٹاتی ہے چنانچہ رفتگاں کی یاد اس کے لئے محض جذبے کا جبر نہیں۔ اس کی آگہی کا تقاضہ بھی ہے کہ اسی واسطے سے وہ دونوں کی حقیقت کا سراغ پاتا ہے۔ پھر ماضی حال کی پلکوں پر جمی ہوئی خون کی ایک بوند یا زماں کی تختی کا ایک ٹھہرا ہوا نقطہ نہیں رہ جاتا، ایک مسلسل اور جاری واقعہ بن جاتا ہے اور ان

دیواروں کو مسمار کرتا ہے جو حال کے مبالغہ آمیز تصوّر نے جابجا استادہ کی ہیں۔ کہانیوں سے الگ ہو کر اس کے مزاج کا یہ رنگ میں نے پہلے پہل اب سے کوئی پانچ چھے برس ادھر اس رات دیکھا جب ہم بستی نظام الدین کے گلی کوچوں میں بھٹک رہے تھے۔ وہ شام انتظار حسین نے کناٹ پلیس کے مرحوم ٹی ہاؤس میں ہندی، اردو اور پنجابی ادیبوں کے ساتھ گزاری تھی۔ باتوں کا سلسلہ ایسا پھیلا کہ وقت کا اندازہ نہ رہا۔ ہم ٹی ہاؤس سے جب ہم نکلے دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ بازار سنسان ہو چلا تھا۔ انتظار حسین اور منّو بھائی ہمایوں کے مقبرے سے ملحق ایک عمارت میں مقیم تھے۔ "انتظار صاحب! اب کھانا لئے وہاں کون بیٹھا ہوگا۔ چلئے نظام الدین کے کسی ہوٹل کی راہ لیتے ہیں۔" پھر ہم نظام الدین پہنچے۔ بستی کے باہر رات چپ تھی۔ بستی کی گلیوں میں رت جگا تھا اور عرس کے موقع پر جو بازار جما تھا اس گھڑی بھی بہت بارونق تھا۔ جھولے، ہنڈولے، چک پھیریاں، بساطیوں کے ٹھیلے، شربت والے، پھول والے، پان والے، سقّے، اچکّے، نظر باز۔ نان کباب اور تکّے شیرمال کی مہک۔ ہم ایک ہوٹل میں گئے۔ کچھ کھاپی کر باہر نکلے "کیوں صاحب! پان کھاتے ہیں۔" اس نے چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا بیڑا بڑی مہارت کے ساتھ کلے میں دبایا۔ پھر ہم بے مقصد گھومتے رہے۔ مغربی اتر پردیش کے روایتی حلوے پراٹھے کی ایک دوکان پر نظر پڑی تو انتظار حسین نے افسوس کیا۔ "ہمیں کھانے کے لئے یہاں آنا تھا۔" واقعی اس ماحول میں چھری کانٹے سے لیس وہ ہوٹل جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا کچھ عجیب شترگربہ سا نظر آتا تھا۔ ہر ماحول کی اپنی شرطیں ہوتی ہیں اور ہر مٹی کے اپنے مطالبے۔ دیسی گملوں میں بدیسی پودے لگ جائیں جب بھی اجنبی ہی رہیں گے۔ دلی کی روح آج بھی اس کی فصیلوں میں بھٹکتی پھرتی ہے اور وہ سات شہر جو وقت کے ہاتھوں تاراج ہو کے اس کے خرابوں میں ابھی بھی آباد ہیں۔ شاید اسی لئے جب دن ڈھلتا ہے اور رات جاگتی ہے تو یہ آٹھ شہروں کا شہر بھی جاگ اٹھتا ہے۔ تب اندرپرستھ سے شاہ جہاں آباد تک ایک وقت کی حکمرانی ہوتی ہے۔ رات کے اس پہر میں بھی اسی کھوئے ہوئے، سوئے ہوئے وقت کا سکّہ بستی نظام الدین کے بازار میں چل رہا تھا۔ اور صدیوں کی حدیں پھلانگ کر جو وقت سامنے آن کھڑا ہوا تھا اس رات وہی سچ دکھائی دیتا تھا۔ صدیوں پہ چاندنی چوک کے بازار سے گزرنے والی نہر کہاں، اب وہ شہر کہاں۔ نہ قلعہ و دربار، نہ جمنا کی سیر نہ اردو بازار، پالکی نالکی سب غائب۔ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا۔ میر صاحب ادھر کو سدھارے اور ریل کی پٹری کے کنارے سوتے ہیں۔ سرہانے میر کے آہستہ بولو۔ مگر روحوں کے لئے زمانوں اور فاصلوں کے حصار، سب ہیچ۔ محبوب الٰہی کا فیض جاری۔ کسی نے منّت مانی کسی نے اتاری۔ اور اس کے سائے میں کیسے کیسے باکمال آسودۂ خاک تھے۔ امیر خسرو، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف، جہاں آرا اور محمد شاہ رنگیلے امیر امرا، شہزادے شہزادیاں اور ہمارے مرزا غالب۔ پھر اسی ماحول میں نئی وضع کی چند عمارتیں، ہارن کا شور

اور وہ جدید ریستراں اور طعام خانے۔ دو زمانے۔ مل رہے تھے کہ باہم دست و گریباں تھے۔ اور جنگیں تو اب اسلحوں سے جیتی جاتی ہیں۔ شجاعت اور جسمانی طاقت خواب ہوئی۔ بخت خاں کی مٹی خراب ہوئی۔ شاہ ظفر ہارے تھے۔ صبح کے سائرن کے ساتھ پرانا وقت بھی ہار جائے گا۔ مگر شکستوں کا وہ سلسلہ جو پانڈوؤں کے شہر سے میر صاحب کی دلی تک جاری رہا بہت ڈھیٹ ہے۔ نئے وقت کی گرد گھڑی بھر کو دبی کہ کیڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس رات بھی انتظار حسین کی کچھ گفتگو گم کئے ہوئے وقت سے ہوئی۔ پھر ہم جتنی دیر بیلے میں رہے باتیں تو ہوئیں مگر شاید بولنے کی ضرورت زیادہ نہ رہی کہ حسوں کی ضیافت کا سامان وافر تھا۔ یہ تو ہمارے عہد کا آشوب ہے کہ بس دماغ چوپٹ کھلا ہے۔ حسوں کے تمام دریچے بند ہیں اور مستقل بولے چلا جاتا ہے۔ وہاں کچھ شور ضدوں کے تصادم کا بھی تھا۔

یہ شور نہ بھی ہو تو اس کا سرا وقت بے وقت انتظار حسین کے ہاتھ آجاتا ہے۔ کھانے کی میز پر۔ اس نے کانٹے سے آم کا ایک قتلہ اٹھایا۔ "اب آم بھی ٹیبل پر پہنچ گیا۔" دور ساون کی جھڑی لگی ہے۔ جھولے پڑے ہیں جھونٹے لگ رہے ہیں اور نیم کے پیڑ کی ڈال جھوم رہی ہے۔ اور چاندنی چوک میں سو سال پرانی جلیبیوں کی دکان کے آگے فٹ پاتھ پر دونا لیے کھڑے ہیں کہ قصبہ ڈبائی کا جلیبیا دورلیوں کو پھلانگتا سامنے آن موجود ہوتا ہوتا ہے۔ بھولا بسرا ذائقہ دیکھتے دیکھتے پھر سے زندہ ہو گیا۔ یا ناشتے میں پوری پراٹھے، حلوے کے ساتھ بٹر ٹوسٹ اور مارملیڈ پر نظر پڑی نہیں کہ دو جگوں میں آپا دھاپی شروع ہو گئی۔ "صاحب! یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے!" ایسے موقعوں پر انتظار حسین کا ہاتھ ہمیشہ پرانی رُتوں کے ذائقے تک پہنچتا ہے اور انھیں سہارا دیتا ہے تاکہ سند رہے —— ابھی ان رتوں کا رنگ پامال نہیں ہوا۔ وقت کا کیا ہے؟ گزرے سو گزرے۔ مگر پرانے ملے اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جیسے گزراں تجھ رہے ہو وہ تو ابھی بھی رکا ہوا ہے۔

تو کیا واقعی وقت کا عمل ان تمام تجربوں کی تنسیخ تک محدود ہے جن کے واسطے سے ہم اپنی پہچان کرتے ہیں یا خود کو پاتے ہیں۔ یا جن کے آئینے میں گرد و پیش کی ضدوں کا عکس دیکھتے ہیں؟ ایک روز انتظار حسین نے فرمائش کی۔ "تلی ہوئی مٹر کھائی جائے۔" میز پر روزمرہ کی چیزوں کے ساتھ مٹر کی قاب پر نظر پڑی تو اس کی آنکھوں میں چند ثانیوں کے لئے وہی جھل مل جھل مل کرتی شوخ اور معصومانہ چمک تھی۔ پھر وہ چمک ماند پڑ گئی۔ صبا نے پوچھا۔ "انتظار بھائی! یہ کیسی لگی آپ کو!" اس وقت دور کچھ اڑتے ہوئے پروں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ انتظار حسین نے اپنی پلیٹ میں پیاز کے کچھ اور قتلوں کا اضافہ کیا۔ پھر ایک اور ہری مرچ بیچ سے کاٹی۔ "ٹھیک ہے۔ مگر ہماری نانی اماں ——" اور یہ ہو بھی تو کیسے؟ بعضے پرانے پتے ٹوٹ کر بھی شاخ سے جدا کب ہوتے ہیں؟ یہ ضرور ہوتا ہے کہ شاخ باہر کے جس درخت پر جھول رہی ہوتی ہے وہ بس جگہ بدل لیتا ہے۔ رلکے نے کہا تھا:

پرندے مجھ میں ہو کر گزرتے ہیں اور وہ پیڑ، جس پر آنکھ اب تک ٹھہری ہوئی تھی، اب میرے اندر پنپ رہا ہے کبھی کبھی جون نہیں بدلتی۔ صرف جغرافیہ بدلتا ہے۔ اور جہاں تک ذائقوں کا سوال ہے، انھیں تو بدلنا ہی تھا کہ مٹی اور پانی اور موسم بدل گئے نیتیں بھی بدل گئیں۔ اور جب سے آبادی بڑھی ہے اور بھانت بھانت کی دوائیوں اور مصنوعی طریقوں سے فصلوں میں اضافے کی کوشش کی جارہی ہیں۔ سبھی کہتے ہیں کہ ہر شے اپنا مزہ کھوتی جاتی ہے۔ مگر یاد تو بہت سخت جان ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ اور نکھرتا جاتا ہے۔ طویل عرصوں پر پھیلے ہوئے رنگ بھی دھیرے دھیرے خود کو پہلے سے زیادہ واضح اور متعین کرتے جاتے ہیں۔

ریوتی سرن شرما نے کہا۔ "یہ تصویر دیکھ رہے ہو! یہ گھنے بالوں والا دبلا پتلا نوجوان!" پتوں سے لدے پیڑ کے نیچے بنس کھٹیا بچھی ہوئی تھی۔ ذاکر اور سرپندر آنکھوں میں پھر گئے۔ صابرہ کی پرچھائیں بھی کہیں آس پاس منڈلا رہی ہوگی۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ جیسے قصبوں کے عام مسلمان نوجوان ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ قمیص اور سر پر بہت اہتمام سے کڑھے ہوئے بال۔ شاید اسی پرچھائیں کے لئے۔ اب وہ بستی نہ وہ دریا نہ وہ لوگ۔ یوں ان سب کے ہونے کی خبر ابھی معلوم نہیں ہوئی۔ یہی خبر انتظار حسین کی نظر کا واسطہ بھی ہے۔

میرا مصور دوست سچا تھا کہ انتظار حسین پر اسے کمار گندھرو کا گمان ہوا۔ ایک افسردہ متانت لاتعلقی کی گرد میں چھپی ہوئی اور طمانیت کا فریب پیدا کرتی ہوئی۔ سنا ہے کمار گندھرو کے سینے میں سانس گہرا نہیں سماتا کہ ایک پھیپھڑا چھلنی ہو چکا ہے۔ لیکن آواز اونچی نہ اٹھے جب بھی اونچی محسوس ہوتی ہے، اپنی گونج اور گہرائی کے سبب۔ اپنے حال سے کتنی باخبر مگر کتنے زمانوں کے تماشے سے گزرتی ہوئی اور ان سب کو تجربے کے ایک محور پر مجتمع کرتی ہوئی، اپنی ریزہ ریزہ روح کی مثال۔ میں نے جب بھی اس آواز کے ساتھ سفر کیا، بہت دنیاؤں سے گزرا۔ پھر گھوم پھر کر کمار گندھرو کے سامنے آسن جما کے بیٹھ گیا۔

انتظار حسین کا یہ عکس پیڑ کے نیچے چارپائی پر بیٹھے ہوئے اس نوجوان کے عکس سے بہت مختلف ہے۔ شاید اسی کی خاکستر سے اس کا خمیر اٹھا ہے۔ بناؤ اور بگاڑ کے اس کھیل میں گھاٹا کس کا ہوا؟ ڈبائی کے اس نوجوان کا یا اس قصہ گو کا جس نے اپنی زمین چھوڑ دی مگر زمین اسے نہ چھوڑ سکی اور لاہور کے گلی کوچوں میں جس نے ناصر کاظمی کے ساتھ بہت رت جگے کیے۔ ڈبائی کا ایک نام ابنالہ بھی ہے۔

اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا — لایا ہوں اس خرابے سے میں لعل معدنی
جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی — روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی
خوش رہنے کے ہزار بہانے ہیں دہر میں — میرے خمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی

یارب! زمانہ دشمن اہلِ ہنر ہے   دے اس دلی کو اور بھی توفیقِ دشمنی

اور جب سے ناصر کاظمی نے بھی آگے کی راہ لی ہے وہ کہتا ہے کہ اب اسے رات کو جلدی نیند آجاتی ہے۔ نہ معلوم واقعہ کیا ہے۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اس کے معمولات میں اس تغیر کا سبب بھی دراصل رات سے پوچھنا چاہئے جس کا دامن ہجر کی رات کے ایک ستارے سے اب خالی ہے۔ دلی کی راتوں میں تو میں نے یہی دیکھا کہ دن بھر کی تھکن کے باوجود نیند پچھلے پہر سے پہلے کم کم ہی اس کی طرف رخ کرتی تھی۔

کشف المحجوب کے درویش کو گم کیا ہوا وقت بالآخر مل گیا تھا، اسی مقام پر جہاں اس نے یہ وقت کھویا تھا۔ مگر درویش میں اور انتظار حسین میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انتظار حسین نے ہمیشہ کے لئے ایک وقت کو کھو کر خود کو پایا ہے، اور شاید اس سودے پر راضی ہے۔ □

انتظار حسین

ڈیڑھ بات اپنے افسانے پر

میں پناہ مانگتا ہوں اپنے اس قاری سے جس نے 'دن' پڑھا اور کہا کہ کہانی تشنہ ہے کہ تحسینہ اور ضمیر کا اختلاط تو ہوا ہی نہیں۔ اور میں پناہ مانگتا ہوں اس قاری سے جس نے 'بستی' پڑھا' صابرہ کو دیکھا اور سوال اٹھایا کہ انتظار حسین کے یہاں عورت کیوں نظر نہیں آتی۔ عورت، جنسی تجربہ —— بیشک یہ انسانی زندگی کی بڑی سچائیاں ہیں مگر میں افسوس کرتا ہوں اپنے نقادوں پر جن کے ہاتھوں میں آکر یہ سچائیاں کلیشے بن گئیں، نئی نفسیات کی کتابوں سے حفظ کیا ہوا سبق۔

عورت یعنی چہ؟ محض جنسی جانور؟ پھر مرد کو بھی اسی خانے میں رکھئے۔ یہ کوئی الگ جانور تو نہیں ہے اسی مادہ کا نر ہے۔ خیر میں اس بحث میں میں نہیں پڑوں گا۔ مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ عورت اور مرد کے درمیان جو ایک پر اسرار رشتہ چلا آتا ہے وہ کیا ہے۔ اس کی تکمیل تو جنسی تجربے ہی میں جاکر ہوتی ہے مگر یہ کیا ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوتا اور پھر بھی اتنا کچھ ہو جاتا ہے۔ اور وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے بھی کم ہوتی ہے آدمی کے ساتھ کیا کچھ کر جاتی ہے۔ بس اسی کیا کچھ پر میری حیرت جاگتی ہے۔ میں نے کتنی کوشش کی ہے کہ یہ کیا کچھ میری گرفت میں آجائے۔ افسانے کے جس قاری نے عورت مرد کے رشتے کو تیسری چوتھی دہائی کے افسانے کے واسطے سے جانا ہے اس کے لئے 'دن'، ایک بے کیف تحریر ہونی چاہئے۔ یہاں کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ تحسینہ اور ضمیر ایک دوسرے سے ایک ڈیڑھ بات ہی کر لیں حالانکہ ایک ہی صحن میں گھوم پھر رہے ہیں۔ کتنے قریب کتنی دور۔ کم از کم باہر کی سطح پر تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ مگر اندر کتنا کچھ ہو گیا۔

ایک باریک بین بی بی نے کیا خوب تاڑا۔ کہا کہ بستی میں صابرہ کوئی نیا کردار نہیں، یہ تو وہی تحسینہ ہے۔ ہاں بالکل۔ مجھے آئے دن نئی عورتیں تلاش کرنے کا لپکا نہیں۔ میرے لئے ایک عورت بہت ہے۔ تو تحسینہ بھی وہی ہے، صابرہ بھی وہی ہے، 'پتے' کی ناری بھی وہی ہے۔ پتے سے مجھے خیال آیا کہ اس افسانے میں وہ عورت بھی آتی تو ہے جو میرے نقادوں کے حساب سے عورت ہو سکتی ہے۔ یہ عورت مردوں کو رجھانے کے چالیس داؤں جانتی ہے۔ میں اس عورت کو بیان کرنے لگا تھا کہ بھکشو جس کی خاطر اس عورت نے اپنا عورت پن دکھایا

شروع کیا تھا بیچ میں دم توڑ جاتا ہے۔ اس نے بھکشو کو اپنا کتنا کچھ دکھایا ہے مگر تتھاگت کی پرشانت سورت پر کائنات ہوئی اور عورت پسپا ہوگئی۔ مگر وہ عورت جو شرادستی کی گلی میں دم بھرنے کے لئے ڈیوڑھی پرآئی تھی اور جو عورتوں کے چالیس داؤں میں سے کوئی داؤں نہیں جانتی اور جس نے اپنا کچھ نہیں دکھایا بس بیر یا اچٹتی سی ایک نظر، ایک نگہ بظاہر نگاہ سے بھی کم۔ بھکشو اس مقام پر مارا گیا؛ "یہ منی بھی پھر اسے نہیں بچا سکے۔ شرادستی کی اس گلی سے دور کتنے زمانے تک نگر نگر جنگل جنگل مارا مارا پھرا۔ مگر پھر اس کے قدم اسے اسی گلی میں اسی ڈیوڑھی پر لے آئے۔ ساری ریاضت بھنگ ہوگئی۔ مگر ذاکر تو اپنی شرادستی میں واپس نہیں گیا تھا۔ پھر اس سے فرق کیا پڑا۔ وہ خود آگئی۔ اور کیسے عجب وقت میں آئی کہ باہر آگ برباد ی ہورہی تھی۔ اندر اس نے تباہی پھیلائی۔ ؎ دل ہمارا اگر یادلی شہر ہے۔

تحسینہ، صابرہ، پتے، کی ناری جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ وہی ایک عورت۔ تحسینہ، پھر تحسینہ، اور پھر تحسینہ۔ تحسینہ کو میں نے کہاں اور کب دیکھا تھا۔ 'دن' لکھنے کے بعد دیکھا تھا یا 'دن' لکھنے سے پہلے ان دنوں میں جب میں بھکشو پاتر لئے شرادستی کی گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ یا شاید خواب میں دیکھا ہو۔ بہر حال یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ عورت پوری یا ادھوری کس راستے سے میرے تصور میں داخل ہوئی۔ واقعی زندگی اور واقعی لوگ بھی میرے لئے شجر ممنوعہ تو نہیں ہیں۔ مگر یوں نہیں کہ بے روک ٹوک میرے افسانے میں گھس آئیں۔ جسے میں نے دیکھا ہے وہ پھر مجھے خواب میں نظر آنا چاہئے۔ اس کے بعد ہی وہ میرے افسانے میں راہ پائے گا۔ ویسے یہ بھی میرے لئے ایک سوال ہے کہ واقعی زندگی زیادہ واقعی ہے یا میرے خواب زیادہ واقعی ہیں۔ شاید میرے خواب۔

میں جب افسانہ سوچتا ہوں تو خواب میں تو نہیں ہوتا مگر کچھ ایسا جاگتا ہوا بھی نہیں ہوتا۔ ایک بات بتادوں۔ رت جگے میں نے جتنے کرنے تھے ناصر کاظمی کے ساتھ کر لئے۔ بہت کئے۔ لگتا تھا کہ رات کو سونا کفرانِ نعمت ہے۔ اب مجھے رات کو جلدی نیند آجاتی ہے۔ دوپہر کو قیلولہ بھی مقرر کرتا ہوں۔ جن دنوں افسانے کا تانا بانا پھیلاتا ہوں ان دنوں نیند زیادہ آتی ہے۔ وقت بے وقت۔ افسانہ سوچنا شروع کیا اور نیند آنے لگی۔ افسانے کا تانا بانا پھر بھی پھیلتا رہتا ہے۔ کتنی حسرت ہے کہ کبھی یہ کیفیت افسانے میں سرایت کر جائے غالب کا میں ایسا شیدائی نہیں مگر اس کی ایک حسرت میری بھی حسرت ہے ؎

کوئی نہیں ہے اب ایسا جہان میں غالب
کہ جاگنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ

کبھی ایسا معجزہ میرے افسانے میں ہو جائے تو کیسا ہو۔ لوری بن جائے گا؟ بن جانے دیجئے۔ مجھے اپنے افسانے کو

پیام بیداری بنانے کا کون سا ایسا شوق ہے۔ جن لکھنے والوں نے اپنے لکھے ہوئے سے ملت کو، قوم کو، یا عوام کو جگانے کا کام لینا چاہا ان میں ایسے بھی ہیں جن کا میں قائل ہوں۔ مگر ان پر مجھے رشک کبھی نہیں آیا۔

رشک تو مجھے میرؔ پر آتا ہے۔ کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ اور کبھی کسی نے اس سے نہ پوچھا کہ مہتاب میں جو شکل نظر آئی وہ اپنی جگہ مگر عورت تمہاری شاعری میں کہاں ہے۔ وصل اس کا خدا نصیب کرے، جنسی تجربہ تمہاری غزل میں کہاں ہے۔ اور کومٹ منٹ میرؔ جی تمہارا کیا ہے ویسے میرؔ ہماری ادبی روایت میں سب سے زیادہ کومٹڈ آدمی ہے ؎

کچھ رنجِ دلی میرؔ جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

عمر ساری اسی رنجِ دلی کو بیان کرتے گزری۔ اسی میں دفتر لکھے گئے۔ کہیں میرا کج فہم نقاد بیچ میں زبول پڑے کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ میر صاحب کے یہاں تجربے کا تنوع نہیں۔ ان کی غزل تکرار کا شکار تھی۔ تو نے خوب پہچانا میرے معصوم نقاد۔ میں اور میرؔ دونوں ہی اپنے آپ کو دہراتے بہت ہیں۔

خیر تو میر صاحب تو بھلے وقتوں میں شعر کہہ کر چلے گئے۔ ایسے فضول سوالوں کا جواب دینے کے لئے مجھے چھوڑ گئے۔ ترقی پسند تحریک گزر گئی مگر مسلمانوں کو خراب کر گئی کیا مسلمانی ہے کہ سوشلسٹوں کو ملحد جانتے ہیں مگر ان کے بخشے ہوئے تصور ادب کو آیت حدیث سمجھتے ہیں۔ اور اب جب میں خیر سے اپنی رجعت پسندی میں راسخ ہو گیا ہوں تو وہ اپنی ترقی پسندی کو مجھ پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے تعمیری اور مقصدی افسانے کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے افسانے میں پاکستان کا جغرافیہ مانگتے ہیں۔ میں انہیں تاریخ کی طرف بلاتا ہوں مگر تاریخ سے تو وہ خوف کھاتے ہیں۔ تقاضا یہ ہے کہ سنتالیس سے اُرے اُرے رہو، پرے مت جاؤ، مبادا پاکستان سے دور ہو جاؤ، لیجئے کہاں کی بات کہاں یاد آئی۔ انور عظیم نے انٹرویو کرتے ہوئے مجھ سے میرے ابتدائی افسانوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے معذرت کی کہ ان افسانوں میں اظہار بہت ناپختہ ہے۔ اس سے اس عزیز نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں پاکستان میں رہتے ہوئے مصلحت اسی میں دیکھتا ہوں کہ جن افسانوں میں چھوڑی ہوئی بستی کا بیان ہوا تھا ان سے دامن چھڑالوں اور اس تجربے کو فراموش کر دوں۔ اِدھر پاکستان میں بھی انور عظیم کی قماش کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ تم کن زمانوں اور زمینوں میں آوارہ پھرتے ہو۔ تمہارے افسانے میں صرف پاکستان کی زمین نظر آنی چاہئے۔ ہندوستانی انور عظیم برہم ہے کہ مجھے اسلام ہو گیا ہے۔ پاکستانی برانڈ والے انور عظیم چیں بچیں ہیں کہ تمہارے اعصاب پہ تو ہندو دیو مالا سوار ہے۔ میں ان سب سبز سرخ ہندوستانی پاکستانی انور عظیموں سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کبھی یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ تخلیقی عمل کیا ہوتا

ہے۔ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ... مگر کیا کہنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس مخلوق کو صرف سننا چاہیے، اس سے کچھ کہنا نہیں چاہیے۔ طے تو میں یہی کرتا ہوں۔ مگر پھر کسی کمزور لمحہ میں بول پڑتا ہوں۔ مہاتما بدھ نے پکھوے کی جاتک میرے ہی لئے تو کہی تھی۔ پکھوا جب قازوں کے سہارے بلندیوں میں پہنچ ہی گیا تھا تو اسے کیا پڑی تھی کہ نیچے والوں کے شور و غل پہ کان دھرے اور جواب دینے کی ٹھانے۔ پھر اسے نیچے گرنا ہی تھا۔ بشر رازِ دلی کہہ کر اور ادیب جواب دے کر ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ذلیل و خوار ہی ہونا ہے تو آدمی عشق کر کے ذلیل و خوار ہو۔ اس ذلت و خواری کے تو کوئی معنی بھی ہوتے ہیں۔ میں یہ باتیں سمجھتا تو ہوں، خاموشی کے آداب بھی کچھ کچھ جانتا ہوں۔ مگر انھیں نبھا نہیں پاتا۔ خاموشی کے آداب میرے کردار بہتر سمجھتے ہیں، بہتر طور پر نباہتے ہیں۔ دور کیوں جاؤ تحسینہ اور صابرہ ہی کو دیکھ لو۔ یہیں سے میں نے جانا کہ میں چھوٹا ہوں، میرے کردار مجھ سے بڑے ہیں۔

صابرہ کے کردار کے بارے میں میرے کتنے دوستوں نے مجھے پکڑا۔ یار تم نے اس کردار پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ اس کا بیان بہت تشنہ ہے۔ اور ادھر اسے بیان کرتے ہوئے میرا یہ خیال تھا کہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا کہ کہیں بیان میں کوئی فقرہ فالتو نہ لکھا جائے۔ ایسے کردار بھی ہوتے ہیں جو مفصل بیان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایک فقرہ بھی زائد لکھا جائے تو کی کرائی محنت اکارت جا سکتی ہے۔ ہاں 'پتے' میں کنچنی کو مزید بیان کیا جا سکتا تھا۔ آخر جب وہ مرد کو رجھانے کے چالیس داؤں جانتی ہے تو مجھے بھی تو اس کے ساتھ کچھ انصاف کرنا چاہیے۔ پھر اس کے مفصل بیان میں کیا چیز مانع ہوئی؟ میرے اخلاقی تعصبات؟ ہرگز نہیں اس باب میں میرے کوئی اخلاقی تعصبات نہیں ہیں۔ مجھے تو شکایت یہ ہے کہ ہماری پرانی داستانوں کو شائع کرنے والے ادارے اور مرتبین مقامات وصل کو 'بر بنائے کثافت' حذف کیوں کر دیتے ہیں۔ چلئے وہ کثافت ہی سہی مگر خود لطافت کثافت بغیر اپنا جلوہ نہیں دکھا پاتی۔ اصل میں میں رکا یہ سوچ کر کہ یہ کہانی اس کنچنی کی تو نہیں ہے۔ اس کا بیان اس کے ظرف کے حساب سے نہیں کہانی کی ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے۔ کہانی تو یہ شرادستی کی ناری کی ہے مگر اس کا بیان کتنا ہے۔ ایک جھلک شروع میں، ایک جھلک آخر میں۔ بس ننگے پیر دکھائی دیتے ہیں اور کیسری ساڑی۔ باقی کہیں نظر آتی ہی نہیں، میرے کردار بھی عجب ہیں۔ گزرتی عورتوں کے سینے اور کمر اور کولہوں کو ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں، مگر جسے دیکھنا چاہتے ہیں اس میں کیا دیکھ لیتے ہیں کہ پھر جسم کی تفاصیل پر آتے ہی نہیں۔

ایک بات ناصر کاظمی کی کہی ہوئی یاد آئی۔ اچھا لکھنے والا وہ ہے جو جانتا ہے کہ اسے کہاں جا کر تھم جانا ہے سو صحیح کہا۔ یہیں سے لکھنے والے کے اچھے اور برے ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ برا لکھنے والا وہ ہے

جو بات پوری ہونے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ میں لکھتے ہوئے سب سے زیادہ اسی خیال سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ نہ ہو کہ بات پوری ہو جائے اور بیان جاری رہے۔ سو مجھے پھیلانے سے زیادہ سمیٹنے کی فکر رہتی ہے۔ شاید اسی لئے میں ضخیم ناول نہیں لکھ سکتا۔

تو بیان کے بارے میں تو میں تردد کرتا ہوں۔ لکھتے ہوئے اپنے آپ کو ٹوکتا جاتا ہوں کہ نادان اسراف بیجا سے باز آ۔ دولت اتھ کا میل ہوتی ہے۔ لفظ ہاتھ کا میل نہیں ہیں۔ اتنے خرچ کر متبنوں کی ضرورت ہے۔ ہاں فارم کے بارے میں میں نے کبھی تردد نہیں کیا۔ نہ افسانے کی فارم کے بارے میں نہ ناول کی فارم کے بارے میں۔ میں نے 'بستی' لکھا ہے تو امتیاز کہتے ہیں کہ یہ ناول کی فارم کے مطابق نہیں صاحب میں لکھتا ہوں، جوتے نہیں بناتا۔ جوتے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ پیر کے ناپ کے مطابق ہو۔ میں نے نہ افسانہ لکھتے ہوئے کبھی یہ سوچا کہ یہ افسانے کی ناپ کے مطابق ہے نہ ناول لکھتے ہوئے یہ خیال رکھا۔

'بستی' ناول کی فارم کے مطابق ہے یا نہیں، اس پر مجھے اپنی افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ یاد آیا۔ میرے مہربان ایک زمانے تک یہی کہتے رہے کہ افسانے نہیں، خاکے ہیں، بس اسی مسلسل اعتراض کے بیچ مجھے رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ میں اس طرح کا افسانہ نہیں لکھتا جس طرح کا افسانہ لکھ کر میرے بزرگ تیسری اور چوتھی دہائی میں دھومیں مچا چکے ہیں۔ 'بستی' کی دفعہ بھی یہی ہوا۔ صحیح ہے کہ مغرب کے انیسویں صدی کے ناولوں سے ناول کا جو تصور اردو میں پہنچا تھا اور جس طرح ہمارے وضعدار نقاد اور قارئین بیسویں صدی کے ناول سے بے خبر اس ناول کے خیال میں گم تھے اس سے میں اپنی بیزاری کا اظہار اپنے مضامین میں جہاں تہاں کر چکا تھا۔ مگر ناول لکھتے وقت میں نے ایسی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی کہ مجھے چالو ناول کی راہ سے بچ کر چلنا ہے۔ یہ تو جب 'بستی' پر اعتراضات کی یورش ہوئی تب میں چونکا۔ 'بستی' کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں چالو ناول سے بال بال بچ گیا ہوں۔

ویسے میں اپنے معترضین کے اعتراضات سے فائدہ اٹھا کر یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ میں نے ناول کی مروجہ فارم سے کوئی بہت بڑی بغاوت کر ڈالی ہے۔ میں اس فارم کو مسمار کرنے کی نیت ضرور رکھتا ہوں۔ مگر اندھا دھند پھاوڑا بھی چلانے کا قائل نہیں۔ توڑنے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہئے کہ بنانا کیا ہے محض توڑنے سے ملبہ پیدا ہوتا ہے۔ نثری نظم کی وجہ سے پہلے ہی اپنے ادب میں ملبہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ اس میں میں اضافہ کرتا تو کیا اچھا لگتا۔

اتنی مجھے خبر ہے کہ بیسویں صدی میں آکر یورپ میں ایسے ناول نگار پیدا ہوئے جنھوں نے

ناول کے روایتی سانچہ کو ملیامیٹ کر دیا۔ ان کے ہاتھوں اس صدی میں ناول کی شکل ہی بدل گئی۔ تو اگر میری ناول کے روایتی سانچہ سے نہیں نبھتی تو مجھے انہیں سے رجوع کرنا چاہئے۔ درست۔ مگر مجھے ایک اور خیال خراب کر رہا ہے۔ وہ تو مغرب والے تھے۔ انھوں نے اب آ کر نئے سرے سے انسانی زندگی کو اور کائنات کو جانا پہچانا۔ اس عرفان سے ناول کی نئی شکل ابھری۔ مگر میں تو مشرق کی مخلوق ہوں۔ وہ زمانہ تو رہا نہیں جب مشرق والے مغرب کی ہر چیز کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا کرتے تھے۔ اب وہاں سے استفادہ کرتے ہوئے یہ خیال رہتا ہے کہ ہمیں اپنی مشرقی روح کے سامنے بھی جواب دہ ہونا ہے اور میرا معاملہ یہ ہے کہ میری ایک بغل میں الف لیلہ ہے اور دوسری بغل میں کتھا سرت ساگر ہے۔ افسانہ لکھوں یا ناول مجھے اپنے فکشن کی ان دو بڑی طاقتوں کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ ☐

وحید اختر

سخن گسترانہ بات

(تہذیبی بازیافت کا مسئلہ)

ایک حالیہ انٹرویو میں نوبل ادبی انعام پانے والے یہودی مصنف سنگر نے کہا ہے کہ "بے جڑ کردار ادب کا موضوع نہیں بن سکتے"۔ جب اس سے کہا گیا کہ وہ خود بے جڑ لوگوں پر لکھتا ہے اس نے کہا کہ "یہ لوگ اپنی جڑیں اپنے ساتھ لائے ہیں"۔

آزادی کے بعد برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام نے ہجرت کے نئے قافلوں کو سلسلہ در سلسلہ تقسیم کی سرحد عبور کرتے دیکھا جو لوگ ہندوستان سے دوسری طرف گئے وہ اپنی آنکھوں میں خوابوں کا ایک مثالی جہان کا تصور بسائے ہوئے تھے۔ اسی تصور نے انھیں بے جڑ ہونے نہیں دیا، جو معاشی بہتری کے خیال سے ادھر گئے وہ بھی اپنی روایتیں، رسمیں اور رواج اپنے ساتھ لے گئے۔ انسان جب ایک زمین سے اکھڑ کر دوسری زمین پہ قدم رکھتا ہے تو وہ اپنی تہذیب کی جڑیں بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ اگر ان جڑوں کو نئی زمین اور آب و ہوا راس آگئی تو وہ پھلتا پھولتا ہے ورنہ سوکھ کر بے برگ و بار ہو جاتا ہے۔ آج جس ملک کو پاکستان کہتے ہیں وہ تہذیب کے لحاظ سے برصغیر ہی کا ایک جز تھا اور اب بھی ہے۔ ہماری بیشتر رسمیں علاقائی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر ایک ہی اصل کی فروع ہیں۔ ہمارے عقائد، ہمارے تعصبات و توہمات، ہمارا رہنے سہنے، کھانے پینے پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ ایک سا ہے۔ ہمارے سوچنے اور محسوس کرنے کا سانچہ بھی ایک جیسا ہے۔ اس لئے جڑ سے اکھڑے ہوئے لوگوں کے لئے نئی زمینیں ناسازگار نہ تھیں۔

سوال یہ ہے کہ پھر آخر تقسیم کے فوراً بعد پاکستانی ادب میں ہجرت کا مسئلہ اور ہجرت کی نفسیات اس قدر شد و مد سے کیوں موضوع بحث بنی؟ برصغیر تہذیبی وحدت کے باوجود ایک اکائی نہیں۔ ہمارے یہاں ہمیشہ علاقائی کلچر، لسانی روایات اور مذہبی عقائد کی گوناگونی نمایاں رہی ہے۔

اتر پردیش یا دکن سے پنجاب یا سندھ جانے والوں کو ان علاقائی اختلافات کا سامنا کرنا پڑا۔
وہاں نیم کے چھتنار درخت نہ تھے۔ گلابوں پر وہ نکھار نہ تھا۔ ساون بھادوں کا وہ رنگ نہ تھا جس سے
مہاجرین آشنا تھے اور جس نے ان رسموں، تہواروں اور گیتوں کو مختلف رنگ و روپ عطا کئے تھے۔
پنجاب سے پنجاب جانے والوں کو نئی سرزمین میں جو فرق نظر آیا وہ ہندوؤں اور سکھوں کی غیر موجودگی
تھی۔ صدیوں سے باہم شیر و شکر ہو کر عزیزوں اور قرابت داروں کی طرح ایک دوسرے کا گوشت پوست
بن کر رہنے والے اس خلا کو محسوس کرتے تھے۔ اس خلا کو انھوں نے بھی محسوس کیا جو اپنی زمین پر
ہی قائم تھے۔ لیکن یکایک سیاست کی تیز آندھی نے ان کی زمین کے وہ پیڑ پودے اکھاڑ پھینکے تھے
جس کے گھنے سائے میں اس کی زندگی صدیوں سے سانس لے رہی تھی۔ اس بدلے ہوئے ماحول میں اپنی
ہی زمین اجنبی ہو رہی ہو تو لازمی امر ہے کہ تہذیبی روایت کو کسی مضبوط بنیاد پر کھڑا کرنے کی کوشش کی
جائے۔

پاکستان، دو قومی نظریے کی بنا پر وجود میں آیا تھا، سرزمین موعودہ بن کر۔ اسی لئے جڑوں کو
پیوست کرنے کے لئے اسلامی آئیڈیالوجی کے امکانات کو پرکھنا فطری امر تھا۔ یہ کام سیاسی نظریہ سازی
کی سطح پر کسی نے بھی کیا ہو یہاں اس سے بحث نہیں۔ ادب میں الہ آباد کے محمد حسن عسکری اور بنگلور کے
ممد شاہین و ممتاز شیریں نے پاکستانی ادب کا نعرہ دیا۔ یوں تو پہلے سے خالص مذہبی ادبا و شعرا کی
اپنی تحریک چل رہی تھی لیکن اتفاق سے اس گروہ کے لکھنے والوں کو ادب میں اعتبار کا وہ مقام حاصل
نہ تھا جو ان ادیبوں کو میسر تھا۔ پاکستانی ادیب کے نعرے کو سنجیدگی سے کم ہی ادیبوں نے قبول کیا۔ لیکن
ایسے لکھنے والوں کی نسل ابھری جو ادب کو اسلامی نقطۂ نظر اور قرآن اور حدیث کے حوالوں اور تصوف
کی روشنی میں دیکھنے پرکھنے لگے۔ ان میں حنیف رامے، سلیم احمد، جیلانی کامران اور عبدالعزیز خالد کے
نام نمایاں ہیں۔ لیکن اس کے ردعمل کے طور پر قدیم ہندوستان کی تہذیب سے اپنا رشتہ جوڑنے کی
کوشش بھی شروع ہو گئیں موہن جو داڑو کے قبل آریائی تہذیب کو ابھارا گیا کہ وادی سندھ اور پنجاب
کا علاقہ اسی کے ساتھ دنیا کے تہذیبی جغرافیے میں سامنے آیا تھا۔ پاکستان کے علاقے میں بدھ مت کے
قدیم مراکز پر زور دیا گیا۔ کبھی کبھی تو میں اپنی زمین پر رہتے ہوئے بھی جڑ سے اکھڑنے لگتی ہیں موجودہ
پاکستان کی تہذیبی روایت مجموعی طور پر وہی ہے جو پورے برصغیر کی روایت ہے اس سے خود کو منقطع
کر کے نئی بنیادوں پر تہذیب کے بالائی ڈھانچے کی تشکیل کا کام آسان نہ تھا جب کہ زیریں ڈھانچہ اپنی
جگہ قائم تھا۔ اگر جسم کا کوئی حصہ پورے جسم سے الگ ہو کر اپنی سالمیت کو منوانا چاہے تو اسے اپنے لئے نیا

ہمیں جنم دینا پڑے گا۔ ہندوستان تقسیم کے باوجود تہذیبی لحاظ سے ثابت و سالم تھا۔ پھر ہمارے یہاں
ریاست کے تصور نے ماضی کی طرف واپس جانے کی تمام، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی تحریکوں کو
نیت سے تعبیر کرکے اس کا سدِباب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں مذہبی احیا کی کوئی تحریک اتنی
وط آج تک نہیں ہو سکی کہ کلی طور پر زمامِ اختیار اس کے ہاتھوں میں آجائے۔ پاکستان میں موٹی تقسیم کے
ے دو طاقتیں برابر نبرد آزما رہی ہیں۔ ایک وہ جو پاکستانی تہذیب کو اسلامی عقائد کی بنا پر مشرق وسطیٰ سے
نا چاہتی ہے دوسری وہ جو برِصغیر کی تہذیبی وحدت کو پاکستان اور پاکستانی ادب کی بنیاد سمجھنے پر مصر
۔ خوش قسمتی سے اردو ادب کا کردار ابتدا سے صوفیا اور علما دین کی ادبی کاوشوں کے باوجود سیکولر
روادارانہ رہا ہے۔ محمد حسن عسکری نے اپنے ایک مقالے میں یہ تصور پیش کیا کہ اردو ادب کی بنیادی روایت
ہے یعنی اسلام اور اسی پر اکتفا نہیں کی یہ بھی فرمایا کہ ادب کو صوفیا کے ملفوظات اور بزرگانِ دین کی تحریروں
جس طرح سمجھا جا سکتا ہے مغرب و مشرق کے تنقیدی تصورات کی مدد سے نہیں سمجھا جاتا۔ یہیں انھیں اردو
ی کی کم مائیگی نظر آئی۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے وہ اپنے جوشِ دینی میں یہ بھی بھول گئے کہ سرسید، حالی، شبلی،
کہ اقبال نے بھی اپنے اسلام کی راسخ العقیدگی کے باوجود ادب کو کلی طور پر دین سے مربوط نہیں کیا تھا۔ میں
اس مقالے کے جواب میں خود صوفیا کے ادب اور حوالوں سے اردو ادب کے سیکولر کردار کو واضح کرنے
لئے شواہد اور دلائل پیش کیے۔ مجھے پتہ نہیں کہ ہمارے پاکستانی دوستوں کا ردِعمل کیا تھا لیکن اتنی خبر
رور ہے کہ عسکری صاحب کی ادب کو اسلامیانے کی کوشش زیادہ بار آور نہیں ہوئی۔

جمیل جالبی نے پاکستان کے مسئلے پر کتاب لکھی تو وہ بھی غیر اسلامی عناصر کو نظر انداز نہ کر سکے۔ ڈاکٹر
یر آغا کی تنقیدی تحریروں میں قدیم ہندو دیومالا اور اس کے ARCHETYPES کے اطلاق کا عمل تیز
ہو گیا۔ انتظار حسین نے تہذیبی بازیافت کے عمل کو ماضی کی طرف موڑا۔ انھوں نے احادیث ائمہ کی روایات
وظات قصص الانبیاء اور اسلامی تاریخ کے واقعات کے وسیلے سے اپنی تخلیقات کو نئی معنویت دی۔
نی کے اسلامی سرمائے کا ادبی استعمال اس طرح عام ہوا لیکن یہ میلان پاکستان سے ہی مخصوص نہیں خود
ندوستان میں جہاں ہندو دیومالا اور اساطیر کو اظہار کے ادبی وسیلے کے طور پر برتا گیا، وہیں ہجرت اور
ربلا کے واقعات کا استعاراتی استعمال عام ہوا۔ مذہبی سرمایہ سے یہ استفادہ مشرقی روح کی عام بے چینی
ر عقیدے کی تلاش کے عمل کا ایک اظہار ہے۔ پاکستان کا غیر اسلامی ماضی لاشعوری طور پر حال سے کبھی
ھی الگ نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۱ء کی بنگلہ دیش جہد آزادی کے بعد جہاد اور شہادت، قید و زنداں کے موضوع پر
سلامی جوش سے افسانے بھی لکھے گئے شاعری بھی ہوئی۔ لیکن یہ ایک وقتی ردِعمل تھا اس تصور کی شکست

کا جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ مشرقی بنگال کے ادیب اور شاعر کبھی ہندوستانی ماضی اور رشتے کو نہ بھول سکے تھے حالانکہ مذہبی عقیدے کے معاملے میں وہ مغربی پاکستان سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ منفی ردِ عمل کے ساتھ مثبت ردِ عمل اس احساس کے ساتھ ابھرا کہ محض مذہب تہذیبی یا سیاسی وحدت کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ ۱۹۵۸ء کے بعد سیاسی اتھل پتھل کا دور آیا۔ جمہوریت اور فوج کی کشمکش شروع ہوئی گیا وہ تمام اقدار و تصورات جن پر اس نومولود ملک کی تہذیب مبنی تھی عمل کی کسوٹی پر معرضِ تنقید میں آئے اس کا اظہار آج کے ادب میں ہو رہا ہے۔ پاکستانی ادب جو ابتدا میں رمزیت و علامتیت کی راہ پر چل پڑا تھا پھر نظریاتی وابستگی اور سماج و سیاست سے گہرے تعلق کے احساس سے دوچار ہوا۔ اس پورے عمل میں تہذیب کے مسئلے کو مغرب کی آویزش کی صورت میں بھی دیکھا جانے لگا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کا ایک مقصد سطحی مغرب زدگی سے معاشرے کو نجات دلانا بھی ہے۔ مشرق و مغرب کی تہذیبی وصفوں اور ان کے پس پشت فلسفوں کے مزاجی اختلاف کا احساس اپنی تہذیبی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے کوئی سا راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ مغرب و مشرق کے اختلاف کی لہر تو سطح کے نیچے کارفرما ہے۔ سطح کے اوپر جو سوال تہذیب سے متعلق ہے اس کے ضمن میں برِ صغیر کی تہذیب سے رشتے کا مسئلہ آج بھی اہم ہے۔ چنانچہ چند دن قبل پاکستان کے ادیبوں کے ایک مذاکرے میں تہذیب کے مسئلے پر دو رائیں سامنے آئیں۔ کچھ تو پاکستانی تہذیب کو براہِ راست اسلامی تصورات اور طرزِ زندگی سے جوڑنے پر مصر ہیں لیکن زیادہ تر ادیب ہندوستانی ماضی کی اہمیت و معنویت کو تسلیم کرتے ہیں اس مذاکرے میں غلام عباس، شوکت صدیقی، احمد ندیم قاسمی اور دوسرے ادیبوں نے شرکت کی۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان کے عوام کا مذہب اسلام ہے اور سیاسی لحاظ سے اس وقت پاکستان اسلامی بلاک کا ایک اہم رکن ہے اور اپنی تعلیمی، صنعتی اور سائنسی ترقی کی بنا پر مستقبل میں اس سے بھی زیادہ اہم بلکہ رہنمایانہ رول ادا کر سکتا ہے لیکن تہذیب اگر محض مذہب سے وابستہ ہوتی تو بنگالی، پنجابی اور سندھی میں اختلاف نہ ہوتا، عرب و عجم کی تفریق نہ ہوتی۔ برِ صغیر کی اسلامی روایات و رسوم مشرقِ بعید کے اسلامی ملکوں سے مختلف نہ ہوتی آج بھی تقسیم کے چونتیس سال بعد پاکستان کا مسلمان عرب انڈونیشیا کے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوستان کے مسلمان ہی سے نہیں ہندو اور سکھ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

جب قرۃ العین نے ۱۹۶۰ء کے قریب "آگ کا دریا" لکھی تو پاکستان میں اس ناول کی ہندوستانیت پر خاصے اعتراضات ہوئے اس لئے کہ انھوں نے موجودہ پاکستانی تہذیب کی جڑیں ہندو اور بدھ روایات اور دورِ وسطیٰ کی مشترکہ ہندو مسلم تہذیب میں تلاش کی تھیں۔ آج بیس برس بعد انتظار حسین کی "بستی"

لسفیانہ سطح کی بجائے عام جذباتی سطح پر اپنی جڑوں کی تلاش میں اسی آگ کے دریا، کو پھر کھنگال رہی ہے۔ ایک انتظار حسین ہی نہیں ایسے کتنے پاکستانی شاعر اور ادیب ہیں جو ہندوستان کے دور فتادہ گوشوں میں چھوڑی ہوئی اپنی زمینوں کی یادیں پاکستانی ادب کی زمین میں پیوست کر رہے ہیں۔ یہ بے جڑ لوگ نہیں۔ ان کی جڑیں ان کے ساتھ ہیں۔ خود وہ ادیب بھی جو پاکستانی پنجاب میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے، پنجاب کی فضا کی بازآفرینی ماقبل تقسیم پنجاب کو بھول کر نہیں کر سکتے۔ احمد ندیم قاسمی ہوں یا غلام عباس، اشفاق احمد ہوں یا جمیلہ ہاشمی، ممتاز مفتی ہوں یا نئے افسانہ نگار کوئی بھی پنجاب کی فضا کی بازآفرینی تقسیم سے پہلے کے پنجاب کو بھول کر نہیں کر سکتا۔ وارث شاہ کی 'ہیر' اتنی ہی ہندوستانی ہے جتنی پاکستانی، امیر خسرو اور انیس اتنے ہی پاکستانی ہیں جتنے ہندوستانی، سرشار سے بیدی اور بلونت سنگھ تک اردو کے غیر مسلم ادیب بھی پاکستانی ادب کا حصہ ہیں۔ یہ جڑوں کا مسئلہ ہے جو علیحدگی کے سیاسی نعروں کی شور میں خود کو فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ پاکستانی ادب میں تہذیبی بازیافت کا عمل اسلامی تاریخ و روایات کے ساتھ نہ موہنجو داڑو اور ہڑپا کو بھول سکتا ہے نہ ہندوستان کے محرم، ۶۰سوں میلوں، رام لیلا اور ہولی دیوالی کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ تہذیبی روایات کسی بھی مذہب کی زمین سے پھوٹیں جب وہ برگ و بار لاتی ہیں تو ان کا کوئی مخصوص مذہب نہیں رہ جاتا برصغیر کی تہذیب کا چھتنار درخت آج بھی سرحد کے دونوں طرف سایہ فگن ہے۔ نظر لاکھ کوفہ و بغداد کی طرف ہو اور اہل نظر لاکھ تازہ بستیاں بسائیں ان کا ماضی، ان کی جڑیں ہر جگہ ان کے ساتھ رہیں گی۔

(۲)

انتظار حسین کا فن اس تہذیبی بازیافت کے مختلف مراحل سے گزرا ہے اور پاکستانی ادب کے اس میلان کی عکاسی کرتا ہے جو اسلامی روایات کے ساتھ برصغیر کی مشترکہ تہذیب میں اپنی جڑیں ڈھونڈ رہا ہے۔ ان کے یہاں اس عمل کے تین مراحل بہت واضح ہیں۔ "کنکری" ہجرت کی نفسیات اور بچھڑے ہوئے وطن کی یادوں کا آئینہ ہے۔ یہاں ان کی فکر نے کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی یا پھر یہ کہ انھوں نے شعوری طور پر کوئی نظریہ تراشنے کی سعی نہیں کی۔ "آخری آدمی" دوسرے مرحلے کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہاں ایک طرف تو وہ موجودہ تہذیبی اور سماجی بحران کی عکاسی کرتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی روایات اور قصص، عقائد اور رسوم کے توسط سے اس فضا کی بازآفرینی کرتے ہیں جو مسلمانوں کی ہندوستانی تہذیب سے مخصوص ہے۔ "شہر افسوس" سمیت ان کے بعد کے دور کے سوا افسانے اسی تصور کی توسیع

کرتے ہیں۔ یہاں ان کی اسلامی تہذیب سے وابستگی عہد حاضر کے مسلمانوں کے سیاسی مقدر کو بھی بحث کے دائرے میں لے آتی ہے ـــ اسی دور کے بعض مضامین میں ادب اور اسلام کو باہم مربوط کرنے کی انھوں نے زیادہ شعوری کوشش کی۔ تیسرا مرحلہ ان کے تازہ ناول "بستی" میں سامنے آتا ہے۔ یہاں ایک بار پھر ان کی تخلیقی جستجو کا رخ ہندوستانی ماضی کی طرف ہے ـــ ان تین مراحل کا یہ اجمالی اشاریہ تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔

"کنکری" کے افسانوں کے کردار راہ بھولے ہوئے مجمع کے متلاشی بچے ہیں، جو اپنے مقام سے کٹ کر ادھر ادھر الجھے ہوئے ہیں۔ ان کرداروں میں افسانہ نگار کے بچپن اور ہندوستانی ماضی کی وہ تصویریں ہیں جو رہ رہ کر اسے ستاتی ہیں۔ اس انفرادی تجربے میں اجتماعی شعور کی بھی کارفرمائی ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، شاید ترقی پسندی کے اجتماعی شعور پر از حد اصرار کی ضد میں انتظار حسین اجتماعی شعور سے اپنی برأت بار بار ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں (دیکھئے انجہاری کی گھریا) حالانکہ وہ مانتے ہیں کہ تنہائی کا احساس اور خوف ہی سماج اور اجتماع کے بحران کا سبب بنا۔ وہ سماج و اجتماع کے سیاق و سباق ہی میں اس احساس تنہائی کی تصویر کشی کرتے ہیں "جو کسی بھی لمحہ اجتماعی شعور کے غلاف کو چیر کر سطح پر آسکتا ہے۔ لیکن تنہائی کا یہ احساس بھی خالص ذاتی معاملہ نہیں، ایک تہذیب اور ایک نسل کی زندگی کا نازک ترین مسئلہ ہے:

> "یہ تنہائی کا اجتماعی احساس اس نسل کے لیے قطعی طور پر اجنبی چیز ہے جس نے سیاسی جلسوں اور نعروں کی فضا میں پرورش پائی ہے۔ ہماری قوم پر اس ملک کے قائم ہونے کے ساتھ یہ احساس بیتا ہے اور ابھی تک وہ اس سے نجات نہیں پاسکی ہے۔" (انجہاری کی گھریا)

ہند اسلامی تہذیب کی جس دھارا سے انتظار حسین کا مخصوص جذباتی تعلق ہے اس کے استعارے افسانے کے بارے میں ان کی اس عبارت میں بکھرے ہوئے ہیں:

> "افسانہ مٹی سے پیدا ہوتا ہے، اگتا ہے، مگر اسے ایک منزل پر اتنا تناور درخت بن جانا چاہیے کہ اس کی جڑیں آس پاس کی ساری زمین کی ساری تری کھینچ کر صرف اپنے کام میں لائیں۔ افسانہ نگار میں اتنی 'بوترابیت' تو ضرور ہونی چاہیے کہ پتھر پہ اپنا علم گاڑ سکے۔ میں نے مٹی کے اتنے رنگ گنا ڈالے مگر یہ سوچ رہا ہوں کہ اس رنگ رنگ کی مٹی کو ایسے سانچے میں کس طرح ڈھالوں کہ اس پر میرا رنگ غالب رہے۔ جو

تسبیح میں پروتا ہوں اس میں بنانے والے کا خون اس شان سے کب داخل ہوگا کہ خونِ حسینؑ کی طرح تہہ میں پنہاں بھی رہے اور عیاں ہو کر اپنا اعلان بھی کر سکے۔" (انجہانی کی گھریا)

بوترابیت، بہتر یہ علم دین کا گاڑا کس نے؟ تسبیح خاکِ شفا، خونِ حسین، یہ چاروں استعارے مخصوص شیعہ ذہن کے نمائندے اور اس تہذیب کی تشکیل کے عوامل ہیں جو آخری موم بتی میں اپنے زوال کا نوحہ عزا کی فضا کی زبان سے پڑھ رہی ہے۔ قرۃ العین کو بھی اودھ کی پرتکلف تہذیب کے زوال کا مرثیہ لکھنے کے لئے عزاداری ہی کا وسیلہ ملا۔ ان کی مشہور کہانی جلاوطن کا خاتمہ چاندرات کی مجلس کے بیان پر ہی ہوتا ہے:

"دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے...

عاشور کی شب لیلیٰ بوا مدن نے جو حسبِ معمول عینک گھر بھول آئی تھیں، دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا لیکن سب پر ایسی اداسی اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگن نے آواز ملائی ــــ چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اجالا بکھیرتی رہیں۔ آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔" (جلاوطن)

اس فضا میں کشوری سرنیوڑھائے ماضی اور حال کے تانے بانے ملا رہی ہے۔ عہد حاضر سے کربلا تک اور کربلا سے عزاداری تک تقسیم اور ہجرت کے سلسلے نے جس 'بزمِ عزا' کو ویران کر دیا اس کی تصویر اسی انداز میں انتظار حسین نے "آخری موم بتی" میں کھینچی ہے۔ پھوپھی جو محض عزاداری کو قائم رکھنے کے لئے پاکستان نہیں گئیں، اپنی روز بروز بڑھتی ہوئی عمر اور نقاہت اور گھٹتی ہوئی معاشی استطاعت اور عزاداروں کی تعداد کے باوجود مجلس کا اہتمام کر رہی ہیں۔ اس اہتمام میں مفلسی و بےبسی بھی ہے اور ایک طبقے کا المیہ بھی۔ محرم کے چاند کی زیارت کے ساتھ جو جلوس نکلا وہ بہت مختصر تھا۔ بجائے اس کے کہ جوق در جوق عزادار نکلتے "ایک بڑے میاں کہیں باہر سے لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ رہے تھے۔ تاشوں کو سن کے رکے۔ پوچھا "بھائی! محرم کا چاند دکھ گیا؟" "ہاں جی دیکھ گیا" ایک چھوٹے سے لڑکے نے جواب دیا۔ بڑے میاں نے عینک ماتھے پر بلند کی، چند منٹ تک تاشے والوں کو تکتے رہے اور پھر لاٹھی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور گھر میں داخل ہو گئے۔" عزاداری کے لوازم وہی ہیں، مگر سب

بسیدہ اور مضمحل و افسردہ ہیں۔

"امام باڑے میں روشنی ہو رہی تھی۔ جھاڑ فانوس اپنے اسی پرانے اہتمام سے جگہ جگہ کر رہے تھے۔ فرش پر جا جم بچھی تھی جس پر جا بجا سوراخ ہو رہے تھے۔ ممبر پر چڑھا ہوا سیہ غلاف بھی خاصا بوسیدہ نظر آرہا تھا۔ اس کے بائیں سمت جو قالین بچھا ہوا تھا وہ بوسیدہ تو نہیں ہاں میلا ضرور ہو گیا تھا۔"

"بارہ بجے کے قریب پھر آنکھ کھل گئی۔ نیچے امام باڑے میں مجلس جاری تھی اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک مصرعہ ضرور سنائی دے جاتا تھا ع عالم میں جو تھے فیض کے دریا وہ کہاں ہیں؟"

"شاید کسی امام باڑے میں ماتم ہو رہا تھا۔ نیچے ہمارے امام باڑے میں بھی سکوت ٹوٹ چکا تھا اور عورتوں کے آہستہ آہستہ ماتم کرنے اور آنسوؤں سے ڈھلی ہوئی آوازوں میں "حسین حسین" کا سلسلہ شروع ہو چلا تھا۔"

(آخری موم بتی)

عالم میں جو تھے فیض کے دریا وہ کہاں ہیں؟ — وہ فیض کے دریا پاکستان چلے گئے اور انھوں نے اپنے ہندوستانی پسماندگان کی طرف سے منہ موڑ لیا:

"بھیا اب تمھارے امام باڑے میں تالا پڑے گا۔"

"آخر کیوں تالا پڑے گا؟ آپ جو یہاں ہیں۔"

"میں رانڈ دکھیا کیا کروں؟" پھوپھی جان بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔

"مردانی مجلس بند ہو گئی۔ نہ کوئی انتظام کرنے والا تھا نہ کوئی مجلس میں آتا تھا... اور بھیا برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ پاکستان والوں نے ایسا غضب کیا ہے کہ جب سے سکہ بدلا ہے کسی نے پھوٹی کوڑی جو محرموں کے لئے بھیجی ہو۔"

اور اب پھوپھی جان بھی پاکستان جانے کے لئے پر تول رہی ہیں۔ "آخری موم بتی" کی شمیم اور "جلاوطن" کی کشوری دونوں ہاری تھکی ہوئی روحیں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ شمیم ماں کی شکست خوردگی اور اپنے کنوارپن کا بوجھ اٹھائے خوابوں کے شہزادے کی تلاش میں پاکستان کی طرف جا رہی ہے اور کشوری ساری دنیا کی خاک چھان کر اپنے عزا خانے کی دہلیز پر پھر آ بیٹھی ہے۔ کشوری کی طرح قرۃ العین ہندوستان واپس آ گئیں۔ انتظار حسین کے اس افسانے کا کردار چاندرات کی صبح ہوتے ہوتے پاکستان مراجعت

کر جاتا ہے۔۔۔ ایک احساس ہوتا ہے کہ شاید انتظار حسین یہ سمجھ رہے ہوں کہ اب اس تہذیب پر ہندوستان میں وہ وقت آپڑا ہے کہ "پتھر پہ علم گاڑنا" اور "تسبیح کے دانوں میں خون حسین کا جھلکنا" ممکن نہیں۔۔۔ لیکن حالات نے بتایا کہ کشوری کے ہندوستان واپس آنے کے بعد چند برسوں ہی میں تقسیم کی ہزیمت خوردگی کے بوجھ تلے دبی ہوئی تہذیب نے جب اس بوجھ کو جھٹک دیا اور نئی معاشی آسودگی کی فضا میں سانس لی تو عزاداری، اپنے سارے تام جھام اور طمطراق کے ساتھ بلکہ بعض شہروں اور قصبوں میں کچھ زیادہ ہی دھوم دھام سے واپس آگئی۔ قرۃ العین اور انتظار حسین دونوں کی تخلیقی حسیت کی تشکیل عزاداری کے استعاروں اور کربلا کی روایت کے وسیلے سے ہوتی ہے لیکن قرۃ العین 'آگ کے دریا' سے گذر کر 'کارِ جہاں دراز ہے' لکھ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں ابھی میرا انتظار کر اور انتظار حسین نے 'آخری موم بتی' کے المیے کو وسعت دے کر 'آخری آدمی' اور 'شہر افسوس' کے افسانے کو شرم الحرام تک پھیلا دیا۔ ایک نے اپنی تہذیب کا رزمیہ لکھنے کی ٹھانی اور دوسرے نے رزمیہ کو مسلسل مرثیہ بنا دیا۔۔۔ ایک ہی تہذیب سے وابستگی نے یہ دو رخ کیوں اختیار کئے۔ کہیں تہذیبی بازیافت کے عمل میں کچھ پھیر تو نہیں پڑ گیا؟ کہیں ماضی کو حال سے منقطع تو نہیں کر دیا گیا۔ اور زماں کے تسلسل میں ایک تہذیب کی تخلیقیت کو پارہ پارہ تو نہیں کر دیا گیا؟ میں اس جملۂ معترضہ کو بے جواب چھوڑتا ہوں۔

انتظار حسین کے 'فیض کے دریا' پاکستان جا کر خشک ہو گئے۔ اس کا ثبوت 'محل والے' ہیں۔۔۔ لیکن ان کے ماضی کے دیار میں 'کیلا' اب بھی 'دیولا' جلا رہی ہے۔ پسماندگان کے علی ریاض اور باقر رضا نی اب بھی انیس و دبیر کے مراثی پر بحث کر رہے ہیں۔ یہ اس تہذیب کے دو رخ ہیں جس کی بازیافت انتظار حسین کا مقصود ہے۔ مگر ایک مرحلے پر وہ ایک رخ کو نظر انداز کر کے دوسرے رخ ہی کو دیکھتے رہے "آخری آدمی" اس دوسرے رخ ہی کی تصویر ہے جس میں حال، ماضی اور مستقبل دونوں پر آسیب کی طرح یوں مسلط ہو گیا ہے کہ یہ دونوں سرے دھندلا گئے ہیں۔

"کنکری" ماضی کی طرف حال کی نگاہ بازپسیں ہے۔ بچپن کی یادوں کی بازگشت ہے تو "آخری آدمی" حال پر حال کی نگاہِ انتقاد ہے جس کا ماحصل مایوسی ہے۔ سجاد باقر رضوی کے دیباچے کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے اس مرحلۂ بازیافت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

> "جو لکھنے لگے انھوں نے برصغیر کی پوری تاریخ کو ذہن میں رکھا اور اس تاریخ کے بڑے احاطے میں مسلمانوں کی تاریخ کو دیکھا اور پاکستان کے وجود میں خارجی تاریخ کے عوامل کے ساتھ روحانی تاریخ کے جذباتی اور تہذیبی محرکات کو بھی سمجھا۔"

"پاکستان ان کے لئے ایک روحانی واردات بھی تھا۔ وہ ماضی کی جڑیں ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی اور روحانی سرزمین میں اور مستقبل کے رویوں کو ملتِ اسلامیہ کی امنگوں کے ساتھ وابستہ دیکھتے تھے اور ملتِ اسلامیہ کے حوالے سے نوآبادیاتی نظام، سامراجی گٹھ جوڑ اور افریشیائی ممالک کے استحصال اور غلامی کی سازش کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اب وہ دور تھا کہ ہندی مسلمانوں کے وہ خواب جو ایک عرصۂ دراز سے دیکھتے آئے ہیں، اب اپنی تعبیر پائیں"

(دیباچہ "آخری آدمی")

سجاد باقر رضوی کو برصغیر کے مسلمانوں کی ایک ہزار برس پرانی روایت کی اہمیت تسلیم ہے اور وہ اسے پاکستانی ادب کی نئی روایت کا تخلیقی محرک مانتے ہیں۔ اس محرک نے انتظار حسین کو پرانے موضوعات و معتقدات کے لئے نئے اسالیب اظہار اختیار کرنے پر اکسایا۔ "کنکری" کے افسانوں کا محرک محض ماضی ہے، حال کا شعور ان میں ہے بھی تو بہت مبہم۔ "آخری آدمی" حال کا شعور ہے۔ انتظار حسین اس مرحلے پر اپنے دیباچہ نگار ہی کے لفظوں میں دو موضوعات سے دوچار ہوئے (۱) انسانوں کا روحانی و اخلاقی زوال اور (۲) اپنی تہذیبی شخصیت کی تلاش ــــ ان موضوعات نے انھیں علامتی طرزِ اظہار اپنانے کا راستہ دکھایا۔ اس لئے کہ روحانی زوال کے منظرنامے میں وہ اپنی تہذیبی شناخت کے لئے جن اسلامی روایات و قصص کے تخلیقی امکانات کو برتنا چاہتے تھے ان کا اسلوب علامتی ہی تھا۔ یہ اسلوب ہے پرانے صحائف، احادیثِ رسول و ائمہ اور صوفیاء کے ملفوظات کا جس میں انتظار حسین نے اردو کی داستانوں کے طرزِ اظہار کی آمیزش کرکے اپنا منفرد اسلوب ڈھالا ہے۔ یہ اسلوب پورے تہذیبی شعور اور اجتماعی لاشعور کی ترجمانی کرسکتا ہے۔ اسے پورے تخلیقی امکان کے ساتھ برتنے کا حق اول آخر صرف اور صرف انتظار حسین نے ادا کیا ہے۔

"آخری آدمی" اور "زرد کتا" اس مجموعے کے شاہکار افسانے ہیں۔ اول الذکر انسان کے روحانی و اخلاقی زوال کی کہانی ہے اور ثانی الذکر اس کی اس زوال کے عمل سے ناکام جدوجہد کی داستان۔ پہلے میں داستانی اور صحائفی اسالیب کی آمیزش ہے۔ جو اسلوب بنا ہے وہ دوسرے میں صوفیاء کے ملفوظات کی زبان کے وسیلے سے اس تہذیب کے بنیادی ARCHETYPE کا بھرپور اظہار بن گیا ہے جس کی تعبیروں میں انتظار حسین اپنی تہذیبی شخصیت کھوج رہے ہیں لیکن یہ تہذیب انھیں بتاتی ہے کہ تم جسے کھوج رہے ہو اس کی کایا کلپ ہو چکی ہے، وہ کہیں بندر بن گیا ہے، کہیں زرد کتا، کہیں مکھی، کہیں صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے اور کہیں صرف ٹانگیں، آدمی اور اس کی شخصیت غائب ہے۔ ان افسانوں کے موضوعات کی تکمیل

"شہر افسوس" کے افسانوں سے ہوتی ہے۔" وہ جو کھوئے گئے" اور "شہر افسوس" کی فضا ایک سی ہے، کردار ایک سے ہیں: کھوئے ہوئے لوگ، تاریخ کے گمشدہ اوراق اور ماضی کے شہروں سے بھٹک کر حال کے اس نقطے پر جمع ہیں جہاں وہ اپنی شناخت بھی گم کر چکے ہیں۔ یہ سب زخم خوردہ ہیں۔ یہ نہ اپنے اوپر گواہ بن سکتے ہیں نہ دوسروں کے وجود کی گواہی دے سکتے ہیں۔ ان کا جہان آباد غدر میں کٹا اور یہ قتل ہوئے پھر ان کی دلی ۱۹۴۷ء میں ان سے چھنی اور یہ مجروح و بے وطن ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک غرناطہ یا بیت المقدس یا کسی اور تباہ شدہ مفتوح اسلامی شہر کا مقتول یا مہاجر ہو سکتا ہے۔ ہجرت اور بربادی قتل اور پامالی کی تیرہ سو سالہ داستان ان کی داستان ہے۔ جب یہ اپنے شہروں سے نکلے تو خود کو وہیں چھوڑ کر صرف اپنی جان بچا کر نکلے۔ اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ 'شہر افسوس' میں اسی موضوع کی تکرار ہے مگر ایک طرح سے ۱۹۷۱ء کے فسادات بہیمیت و بربریت اور ہجرت اس کا نقطہ ارتکاز ہے۔ یہ لاپتہ آدمی مر چکے ہیں مگر انھیں اپنی موت کی خبر نہیں۔ یہ اپنے وجود ہی پر نہیں موت پر بھی گواہ نہیں ——— یہ کٹے ہوئے ڈبے کے مسافر ہیں، مشکوک لوگ ہیں، جن میں کا ہر ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہی نہیں یہ اپنے کو دیکھ کر بھی اپنے کو نہیں پہچانتے اور غلط جگہوں پر خود کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں (وہ اور میں) "آخری آدمی کی 'پرچھائیں' کا مرکزی کردار بھی اسی طرح اپنے کو تلاش کرتا پھرتا ہے، وہ دوسروں سے اپنا پتہ پوچھتا ہے اور خود اپنے آپ سے بے خبر ہے اور اپنے پتے سے لاعلم۔

یہاں پھر ایک جملہ معترضہ لکھتا چلوں ——— " وہ جو کھوئے گئے" اور "شہر افسوس" میں جا ثلت اور "پرچھائیں" اور "وہ اور میں" میں مشابہت اس لئے ہو سکتی ہے کہ انتظار حسین کو تہذیبوں کی گمشدگی اور خود بیگانگی کے تھیم پر شاید زور دینا مقصود ہو لیکن ساتھ ہی یہ سوال بھی ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ انتظار حسین اپنے موضوعات کے دام میں خود اسیر ہو کر اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں۔ ایک ہی موضوع پر بالکل ایک سے دو دو افسانے کیوں؟ موضوعات تو ہزاروں کی تعداد میں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔

تہذیب کے ان کھنڈروں میں جہاں انفرادی وجود اور اجتماعی شعور گم ہو کر مسخ ہو گئے ہیں، بقول جناتوں، چڑیلوں، خزانے کے سانپوں، مایا کی آواز اور بھٹکی ہوئی روحوں کا قبضہ ہے۔ پوری فضا آسیب زدہ اور پر اسرار ہے۔ اس فضا میں خواب کی سی بے ترتیبی اور پر اسراریت ہے (سیڑھیاں)۔ انتظار حسین کے افسانوں میں اکثر یاد اور خواب، ماضی اور خواب، عہد رفتہ اور خواب کی حدیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں (دہلیز)۔ اس طرح حال ماضی سے مل جاتا ہے اور ماضی بار بار حال کے آئینے میں اپنا چہرہ دکھاتا ہے۔ اس فضا میں اپنی

تہذیبی شخصیت کی تلاش اس بات کی غماز ہے کہ افسانہ نگار جانتا ہے کہ ماضی گم ہو چکا ہے۔ پرانی روایتیں اور قدریں شکست کھا چکی ہیں۔ اب سبز پوش یا غیر مرئی ملائکہ آسمان سے شکست کھائے ہوئے تہذیبی لشکر کی مدد کو نہیں اتریں گے۔ "شہر الحرام" اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کی شکست کا مرثیہ بھی ہے اور اس ازدحام پر طنز بھی جو خود اپاہج ہے مگر غیبی امداد پر تکیہ کئے ہوتے ہے۔ انتظار حسین کے اس طنز میں یہ گہرا تلخ شعور بھی مخفی ہے کہ نہ عربوں کو بچانے کے لئے ملائکہ آئے نہ بنگلہ دیش کو بچانے کے لئے ساتواں بحری بیڑہ وہ ذہن جو غیبی امداد کے تصور سے بنا تھا اب بھی کسی نہ کسی بیرونی امداد کا منتظر رہتا ہے۔ اسے نہ پتھر پہ علم گاڑنا آتا ہے نہ اپنا خون ٹپکا کر کربلا کو خاک شفا بنانا آتا ہے۔ کیا "آتش رفتہ" اپنی تخلیقی قوت کھو چکی ہے؟

میں علم بوتراب اور کربلا کی خاک شفا کے استعاروں کی طرف اس لئے مراجعت کر رہا ہوں کہ نہیں سے انتظار حسین کی تہذیبی بازیافت کا تخلیقی سفر شروع ہوا تھا اور یہی استعارے ان کے افسانوں میں بار بار دہرائے گئے ہیں ــــ لیکن کربلا ــ مجالس عزا کے نوحوں اور مرثیوں میں اداس کر دینے والی بازگشت بن گیا ہے ـــــ ایسی اداس کرنے والی ماضی کی آواز کے اجالے میں وہ اپنی تہذیب کو ڈھونڈ رہے ہیں ـــــ اس آواز کو تخلیق کا فعال و توانا آہنگ دینے کے لئے وہ حال کے شعور کو مستقبل کے خوابوں سے ملا دیتے ہیں ـــــ لیکن وہ ماضی کو نہ حال میں فراموش کرتے ہیں نہ مستقبل کے امکانات میں۔ ماضی کا غلط تصور حال کی بدحالی کا ذمہ دار ہے اور اس کا صحیح عرفان مستقبل کا معمار بن سکتا ہے۔ ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی نے تشیع کی روح کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: تشیع سیاہ جو کربلا کی ماتم گساری ہے اور تشیع سرخ جو کربلا کی انقلابی روح کی بازیافت ہے۔ انتظار حسین اجتماعی لاشعور کے جس ARCHETYPE کو افسانوں کی سطح پر ابھارتے ہیں، وہ صدیوں سے امام غائب کے غیب سے ظہور میں آنے کا انتظار کر رہا ہے۔ انتظار اس شعور کی تخلیقی حسیت کا بڑا طاقتور عامل ہے۔ یہ انتظار خود اپنی جگہ غیر محدود زماں ہے جو حال سے ماورا "دوران خالص" کی تخلیقیت ہے۔ اگر یہ انتظار بزم عزا کے سوگوار فرش پر سر نیوڑھا کر آنسوؤں سے ڈھلی ہوئی آواز میں آہستہ آہستہ گریہ کرنے کے بجائے اپنی تہذیب کی خاک کو اپنے خون سے گوندھ سکے تو تسبیح روز و شب و ماہ و سال کے دانوں میں اب بھی "خون حسین" جھلک سکتا ہے۔ انتظار حسین غم کی اس انقلابی قوت اور انتظار کی اس تخلیقیت کے رمز شناس ہیں۔ "دوسرا گناہ" اسی انقلابی روح کی صدائے بازگشت ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف حضرت ابوذر کا اعلان حق اس افسانے میں بار بار گونجتا ہے ـــــ اس

صدائے حق کو جلاوطنی کی سزا ملتی ہے جو صحراؤں میں نئی بستیاں بساتا ہے مگر پھر وہاں انسان اور انسان میں تفریق کرنے والا "دوسرا گناہ" سر اٹھاتا ہے ــــ اور اس طرح صدائے حق پھر بغاوت کرتی ہے، پھر جلاوطن ہوتی ہے۔ ہجرتوں کا یہ وہ مستقل سلسلہ ہے جس سے انتظار حسین کی تہذیب بھی گزری ہے۔ ان کے کردار بھی گزر رہے ہیں اور خود ان کا تخلیقی شعور بھی گزرا ہے۔ "شہر افسوس" کے افسانے اس لحاظ سے "آخری آدمی" اور "گلی کوچے" کے افسانوں سے ممتاز ہیں کہ ماضی کے دیاروں میں خود کو کھوجنے والا ذہن اب اپنے تشخص کے مسئلے ہی میں مبتلا نہیں، پوری ایک تہذیب کے تشخص کے لئے متردد ہے۔ "دوسرا گناہ" انتظار حسین کے استعاراتی اسلوب میں تہذیبی بحران کا وہ سیاسی تجزیہ ہے جو معاشی عامل پر مبنی ہے ــــ اس نقطے پر ان کا اجتماعی لاشعور عہد حاضر کے اجتماعی، سیاسی، معاشی شعور کا ترجمان بن جاتا ہے۔

محمد سلیم الرحمٰن کے الفاظ میں "انتظار حسین کے نئے افسانے کا غالب عنصر ہمارے عہد کے سیاسی المیوں کی فکر، وقت کے لگائے ہوئے زخموں کا احساس اور ان کا منطقی انجام؛ عام پستی اور قدروں کا ابتذال؛ ہماری قوتوں کا فشار ــــ ساتویں دہائی اور آٹھویں دہائی کے آغاز سے اسے بہت کچھ ملتا ہے جو ایندھن کا کام کرتا ہے اور اس کے ذہنی آتش دان کو روشن رکھتا ہے؛ ایوب راج کے خلاف بے اطمینانی کا اُبال؛ ۱۹۶۵ء کی جنگ کا دل خراش انجام؛ مشرقی پاکستان میں بھیانک خوں ریزی اور ان سب پر طرّہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی فوجی تاراجی ــــ یہ سب زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں جو اس کے الم انگیز اور خوں فشاں فن کے جسم میں پیوست ہیں۔ یہ نفسانفسی کا جہنم ہے، بے اعتمادی، بے سمتی ہے "انتظار کے افسانے میں قیامت آچکی ہے اب کیا ہوگا؟ ــــ"

میں اس خیال سے متفق نہیں کہ "ان افسانوں میں توازن کا سارا احساس، زمان و مکاں کا سارا احساس ریزہ ریزہ ہے اور جینے کی ہلکی سی خواہش بھی نہیں ... بے نام لوگ تاریخ کے تاریک کوچوں میں مر رہے ہیں" زمان و مکاں کا احساس انتظار حسین کے افسانوں کے کرداروں میں اگر مر چکا ہوتا تو انھیں اپنے مسخ ہونے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ مسخ ہونے کا احساس اسی کو ہو سکتا ہے جو اپنی شخصیت کی سالمیت کو برقرار رکھنا چاہتا ہو اسی طرح جیسے تنہائی کا احساس انھی کو ہوتا ہے جو بہتر معاشرے کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ تاریخ کے تاریک کوچوں میں وہ مر جاتے ہیں جو صرف حال میں جیتے ہیں اور ماضی و مستقبل سے منقطع ہو جاتے ہیں۔ انتظار حسین کے مثالی تاریخی کردار جن کی پرچھائیاں بار بار ان کے افسانوں کے پردے پر متحرک نظر آتی ہیں، مر مر کے زندہ ہوتے رہے ہیں۔ انتظار حسین حال کی بھیانک

تصویر اس لئے بھی کھینچ رہے ہیں کہ اس سے بیزار ہو کر لوگ بہتر معاشرے کے خواب دیکھ سکیں۔ یہ خواب آج نہ سہی کبھی تو حقیقت کے قالب میں ڈھلیں گے۔ انتظار حسین کو ماضی کا عرفان ہے اور حال کا شعور۔ یہی دو چیزیں مستقبل کی تعمیر نو کرتی ہیں۔ انھوں نے افسانوی علامتی اظہار کے ساتھ ساتھ کئی جگہوں پہ سادہ سپاٹ فلسفہ طرازی بھی کی جو اُن کے بعض اچھے افسانوں کے اختتام کو کمزور کر دیتی ہے جیسے "زرد کتا"، کا آخری حصہ۔ ملفوظات کے اسلوب کی اس حد تک تقلید کہ حکایات میں پند و موعظت کا پیوند کا پیوند لگانا بھی ضروری سمجھا جائے افسانوں کی معنویت کو انہی افسانوں کی سطح پر لے آتا ہے جو انتظار حسین کو پسند نہیں کہ ان میں سب کچھ پہلے سے طے ہوتا ہے اور ان کے معانی متعین ہوتے ہیں ——— کہیں کہیں یہ نقص ان کے افسانوں میں بھی در آیا ہے مگر چہ ستے کھونٹ کی نادیدہ وسعتوں کو کھوجنے میں شاید یہ لغزشیں ناگزیر تھیں۔

"بستی" تہذیبی بازیافت کے تیسرے مرحلے کی ترجمان ہے۔ اس میں ان کے کئی افسانے یک جا ہو گئے ہیں اور ان کے تھیم بار بار دہرائے گئے ہیں۔ وہ تہذیب کے عرفان اور "مستقبل کے رویوں کو ملتِ اسلامیہ کی امنگوں کے ساتھ وابستہ دیکھنا چاہتے ہیں مگر انھیں دکھائی دیتے ہیں گم کئے ہوئے مشکوک لوگ ——— ان میں ذاکر بھی ہے جو اپنی ہندوستان میں چھوڑی ہوئی محبوبہ کی خیر خبر ایک ہندو دوست سریندر کے توسط سے معلوم کرتا ہے۔ اس بات میں گہری علامتی معنویت ہے صابرہ گم شدہ محبوبہ نہیں۔ گم شدہ ہندوستانی ماضی ہے جسے وہ ایک ہندوستانی ہندو دوست کے وسیلے سے کھوج رہے ہیں۔——— دراصل انتظار حسین جس تہذیب کی بازیافت چاہتے ہیں اس کے عقیدوں کا سرچشمہ مشرق وسطی ہو تو ہو اس کا خمیر برصغیر کی مٹی سے اٹھا ہے اور وہ اسی خاک سے پھلی پھولی ہے۔ وہ عزاداری اور محرم جو انتظار حسین کے افسانوں کا مستقل موضوع ہے، وہ کردار جو حضرت علی کے معجزات، کربلا کے واقعات اور انیس کے مرثیوں کو دہرا رہے ہیں۔ وہ میلے، وہ تیوہار، وہ رسمیں، وہ توہمات، وہ معتقدات، وہ غیر مرئی مخلوقات، وہ پیڑ پھول پودے، وہ موسم، وہ گلیاں کوچے، سڑکیں، اسکول، کالج جن سے انتظار حسین کے افسانوں کی دنیا آباد ہے، اس کا بڑا حصہ تقسیم کی سرحد کے ادھر ہی رہ گیا اور اس کی خبر انھیں اب بھی دوستوں سے مل سکتی ہے۔ وہ تہذیب ابھی ختم نہیں ہوئی، توانائی میں کمی آگئی ہو گی لیکن اب بھی زندہ ہے ——— انتظار حسین کی "بستی" میں یہی احساس نہ ہوتا تو ناول محض انسان کے روحانی و اخلاقی اقدار کے زوال کا المیہ ہو کر رہ جاتا ——— ایسا ہونے کے بجائے بشارت کی امید پر ختم ہوتا ہے ———

"بشارت؟ اب بشارت کیا ہو گی؟" عرفان نے تلخ مایوس لہجے میں کہا۔

"کاکے، بشارت ایسے ہی وقت میں ہوا کرتی ہے، جب چاروں طرف —" کہتے کہتے رکا۔ پھر سرگوشی میں بولا "یہ بشارت کا وقت ہے۔"

یعنی وہ بستی جو کئی بار آگ میں جلی، خون میں نہائی، اجڑی، لٹی، بے مکین ہوئی، اب بھی آباد ہے اور کسی بشارت کی منتظر ہے۔

"بستی" خلاصہ ہے انتظار حسین کے "چوتھے کھوتٹ" کے تجربوں اور نتائج کا۔ اسی لئے یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ یہ سب تو ہم پہلے بھی انتظار حسین کے یہاں پڑھ چکے ہیں۔ اس کے کردار بے نام تو نہیں مگر اپنی شخصیت کی شناخت ضرور کھو چکے ہیں۔ وہی مشکوک لوگ جو ہر ایک کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور افضال کے لفظوں میں 'چوہے' ہیں — ایک ذاکر ہے جس کی شخصیت سالم ہے مگر وہ بھی کسی وجہ سے اپنی محبت، اپنے ماضی سے روگرداں ہے — مکمل شخصیت ایک ہے 'ابا جان' کی لیکن وہ ماضی کا کردار ہیں اور ناول میں ان کی موت اس تہذیب کے خاتمے کا اشاریہ ہے جس کے وہ نمائندے ہیں' برصغیر کے مسلمانوں کی اس نسل کے ذہن اور شخصیت کی تشکیل ماضی کے عقاید و مسلمات سے ہوئی تھی۔ — اس کی حال سے بے تعلقی اور عقائد میں پناہ گزینی اپنے وجود کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت بھی اس سالمیت کو باقی رکھنے کا آخری حربہ ہے۔ اس نے کہا "میں مرگیا، اور وہ مرگیا" یہ انتظار حسین کا محبوب فقرہ ہے۔ اس کی معنویت یہ ہے کہ پہلے زندگی ہی نہیں موت بھی فرد کے اختیار میں تھی، اب زندگی پر اپنا بس چلتا ہے نہ موت پر — اپنی موت کی خبر دے کر مرنے والا اپنے وارثوں کو خاکِ شفا کی سجدہ گاہ اور خاکِ کربلا کی تسبیح سونپ جاتا ہے — یہ استعارے ماضی کے اس ورثے کی نشاندہی کرتے ہیں جس کے وسیلے سے اس کی بازیافت آج بھی ممکن ہے۔ مسلمان کے لئے اپنی تہذیبی شناخت کا مسئلہ اس وقت ایک نازک مسئلہ ہے، ایک طرف قومیت کا جذبہ ہے' علاقائی کلچر سے وابستگی ہے۔ دوسری طرف اسلامی عقائد و تصورات کا مکمل نظام۔ اس وقت دنیا میں جہاں جہاں بھی اسلامی احیاء کی تحریکیں چل رہی ہیں وہ قومیت و اسلامیت کے اس تضاد و تناقض میں گرفتار ہیں۔ خود ہندوستان میں مسلمان آزادی کے بعد سے تشخص کے بحران سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف اس کا تعلق عقیدے کی جذباتی سطح پر مسلمانوں کی عالمی برادری سے ہے، دوسری طرف اپنے ملک اور علاقائی کلچر میں اس کی جڑیں پیوست ہیں۔ ایک طرف وہ قومیت کے نئے شوالے' تعمیر کر رہا ہے دوسری طرف بین الاقوامیت کے اسلامی تصور کی بنا پر رنگ و نسل و ملک کی حدوں سے ماورا جانا چاہتا ہے۔ بعینہٖ تشخص کا یہی تضاد اشتراکی بین الاقوامیت اور قومیت و علاقائی تہذیب

کے درمیان نمایاں ہے جس طرح اشتراکیت قومی مزاج کے اختلاف کی بنا پر منقسم ہو رہی ہے، اسی طرح اسلامی برادری میں قومیت کے جذبے نے دیواریں اٹھا رکھی ہیں ـــــ یہ دیواریں کبھی کبھی سامراجی استحصال کے خلاف بھی ایک ہی نظریاتی کیمپ سے وابستہ ملکوں کو متحد نہیں ہونے دیتیں۔ انفرادی سطح پر تشخص کا یہ بحران اور منقسم وفاداریاں جس نفسیاتی مسئلے کو جنم دیتی ہیں وہ منقسم شخصیت کا مسئلہ ہے۔ اس پر غلبہ پانے کی مصنوعی کوشش ذاتی ترقی اور معاشی جدوجہد میں اپنی ہی نوع کے دوسرے افراد کے خاتمے پر منتج ہوتی ہے۔ انتظار حسین کے یہاں یہ مسئلہ دونوں سطحوں یعنی سیاسی سطح اور فرد کی نفسیاتی سطح پر کارفرما نظر آتا ہے۔ عرب اسرائیل کشمکش میں مسلمانوں کا افتراق اور کمزوری، پاکستان اور بنگلہ دیش کی کشمکش، خود پاکستان کے اندر مفادات حاملہ اور عوام کی تمناؤں اور خوابوں کے درمیان تضاد، پھر برصغیر کے تہذیبی ورثے اور مجوزہ یا مفروضہ اسلامی تہذیب کے درمیان کسی ایک کو اہمیت دینے کی مشکلات۔ ایک جانب اسلامی تعلیمات کے وہ مینارہ ہائے نور ہیں جن سے انتظار حسین اپنے کرداروں کو روشنی دینا چاہتے ہیں، دوسری طرف اختلافات، ذاتی اغراض اور معاشی ترقی و نفع اندوزی کا مضبوط تر میلان جو مذہبی اور قومی دونوں تشخصات کو پس پشت ڈالتا ہے۔ نتیجتاً شخصیتیں مسخ ہونے لگتی ہیں اور شک و شبہ، خوف و نفرت پورے سماج کو اپنے آسیبی سایے میں لے لیتی ہے کم و بیش یہی صورت حال اور یہی نفسیاتی کیفیت ہندوستان کے اسلامی اداروں میں ملتی ہے۔ زبان کو تو اقدار مذہب اور تہذیبی روایات کی بازیافت و بقا و استحکام کے کلمات روشن کرتے رہتے ہیں، لیکن زبانوں سے آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ یہ اجالا لفظوں میں اس طرح قید ہے کہ دلوں اور ذہنوں اور کرداروں کو منور نہیں کرتا۔ انسانوں کی طرح لفظ بھی بے چہرگی اور تمسیخ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انتظار حسین کے کرداروں کا یہی المیہ ہے اور جس تہذیبی و تاریخی صورت حال کو وہ پیش کرتے ہیں اس کی مایوسناکی کا یہی بنیادی سبب ہے۔ اس کا حل انتظار حسین کے پاس نہیں اسی لئے وہ ماضی میں پناہ گزین ہو کر احادیث و ملفوظات، حکایات و قصص انبیاء اولیاء دُہرا رہے ہیں کہ اسی طرح شاید حال کا کوئی گوشہ منور ہو سکے۔ ان کے کردار موجودہ نسلوں کے لئے جو سجدہ گاہِ خاک کربلا اور تسبیح خاکِ شفا چھوڑ گئے ہیں، وہ طاقوں میں سجی ہوئی ہیں یا لفظوں کے بے روح وِرد کی شہادت کے علاوہ کچھ اور نہیں ـــــ حال میں جب اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو مستقبل کا کوئی خواب کہاں چمک سکتا ہے۔ ایک طرف روشن ماضی ہے درمیان میں حال کا اتھاہ اندھیرا اور دوسری طرف نامعلوم و ناموجود زمانوں کی دنیاؤں کی تاریکی ـــــ فنی سطح پر تو انتظار حسین نے جو تجربے

ھونٹ، کا کھوج لگا لیا ہے لیکن ذہنی اور تہذیبی سطح پر وہ ماضی اور حال سے آگے نہیں بڑھ سکتے ـــــ اسی نیم دائرے میں گردش کے باعث ان کے یہاں مرکزی خیال کرداروں اور تہذیبی صورتِ حال کی تکرار بڑھ گئی ہے۔ وہ مذہبی اور تہذیبی تضاد و تناقض کی آویزش میں ترکیب کا راستہ نکال نہیں پارہے ہیں۔ اس کے لئے تہذیب کے چوتھے کھونٹ کے دشتِ بے اماں کو بھی چھاننا ہوگا۔

نئے افسانے میں انتظار حسین کی اہمیت، مخالفین تک کے نزدیک مسلم ہے۔ اگر انھیں آزادی کے بعد کی نسل کا سب سے اہم اور منفرد فسانہ نگار مانا جائے تو کسی طرح طرفداری کا الزام ناقد پر نہیں آسکتا ـــــ انھیں ہند اسلامی تہذیب کے ورثے کا عرفان حاصل ہے لیکن یہ عرفان اگر حال کی تاریک و مایوس کن صورتِ حال سے ٹکرا کر سمتوں اور منزل کا احساس گم کردے تو وہ تہذیب بھی جو ان کا ملجا و ماویٰ، مقصود و سرچشمۂ تخلیق ہے مستقبل کے اندھیرے ریگ زار میں تخلیقی امکانات سے تہی ہو کر خشک ہو سکتی ہے۔ صدہا سال ذہنی اور روحانی کاوشوں نے برصغیر کی جو تہذیب تشکیل کی تھی کیا وہ حال سے منقطع ہوتی جارہی ہے؟ کیا اس کا مستقبل تاریک اور بانجھ ہے؟ اس تہذیب پر سرحد کے دونوں طرف پیغمبری وقت پڑا ہے۔ علاقائی ذیلی ثقافتیں، لسانی عصبیتیں، خود غرضانہ مفادات، متعصب و تنگ نظر مذہبی احیائیت اس پر مسلسل حملہ آور ہیں۔ اس کی بازیافت کا ایک اور بہت ہی اہم پہلو، انتظار حسین کی تخلیقات کی روح رواں ہے ـــــ دوسرا پہلو جس کا رخ مستقبل کی امنگوں اور خرابوں کی طرف ہونا چاہئے، ہنوز تشنۂ تعبیر اور بے سمت ہے۔

(۳)

اردو، جو انتظار حسین کا واحد وسیلۂ اظہار ہے اور برصغیر کی دونوں ریاستوں میں مشترکہ تہذیب کی واحد آئینہ دار و ورثہ دار، جب تک تعصب و بحران کا شکار رہے گی مستقبل مشکوک و تاریک ہی رہے گا۔ اردو کو نہ تو سرکاری اردو اکیڈیمیاں اس بحران سے بچا سکتی ہیں، نہ درباروں تک ادیبوں، شاعروں کی رسائی اور اعزاز و اکرام اس کی نجات کی سبیل ہیں۔ ایک نہیں کئی عالمی اردو کانفرنسیں برپا کرتے رہئے اور اردو تہذیب سے نابلد و ناآشنا وزراء و اربابِ اقتدار کو اردو کے اسٹیج پر پھولوں کے ہار پہناتے رہئے، کچھ ادیبوں یا نام نہاد خادمانِ اردو کی وقتی واہ واہ تو ہو جائے گی اردو کا حال اور مستقبل روشن نہ ہو سکے گا ـــــ پیغمبری وقت وہ ہوتا ہے جب پیغمبروں کی امت ان کے تصورات

سے سرد درسرد کا کاروبار چلاتی ہے۔ اردو کا پیغمبری وقت وہ ہے جب اس کے نام پہ ذاتی اغراض، معقول شہرت، رسائی سرکار و دربار اور خوشنودی حکام کا کاروبار چلے ـــــ اردو کا بحران ہماری تہذیب کا بحران ہے اور ہماری تہذیب کا بحران اردو تہذیب کی روح کو فراموش کرکے اس کے لباس کی خرید و فروخت کا نتیجہ ہے۔ اردو کے لکھنے والے اور پڑھنے اور بولنے والے جب تک اپنی تہذیب کی بازیافت و بقا کے لئے پورے خلوص اور بے غرضی سے متحد نہ ہوں گے اس بحران پر قابو پانا اور اپنی تہذیبی شناخت پر ثابت قدم رہنا ممکن نہیں ـــــ سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کے کاروبار بے چہرگی کو مصنوعی چہرے، اور ادب ناشناسی کو ادبی نقابیں تو دے سکتے ہیں، تہذیبی بازیافت کے عمل میں معاون نہیں ہو سکتے۔ یہ عمل تو تاریخ کے دھارے کا عمل ہے اور ہم اس دھارے کے خاموش و منفعل تماشائی نہیں رہ سکتے۔ اس کی سمت کا تعین کرنے کے لئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ کوئی زبان یا ادب یا تہذیب سیاست و حکومت کے خانہ زاد اداروں سے نہیں خلاق ذہنوں اور اعلیٰ درجے کی تخلیقی کاوشوں سے زندہ رہتی ہے۔ تخلیق کا احترام ہمارے معاشرے پر واجب ہے۔ اگر ہم تخلیقی کارناموں کو ان کا مقام نہیں دے سکتے اور احترام نہیں کر سکتے تو تہذیب کے نام کا کلمہ پڑھنے کے باوجود اپنے عمل سے ہم اس کی تکذیب کرتے رہیں گے۔ تہذیبیں ایسے ہی عمل سے مر جاتی ہیں۔ جب سے ہماری تہذیب نے تخلیق کا احترام ترک کیا ہے اپنی شناخت کھوتی جا رہی ہے۔ □

---

64 A, VEI 3990,
OSLO - 7
(NORWAY)

ہرچرن چاولہ

پوری بات کی ادھوری کہانی

ظہیر بھائی اب میں تم سے جھوٹ تھوڑی بولوں گا۔ جھوٹ بولنے کی اور جگہیں بہت ہیں۔ بس مجھ میں سننے کا حوصلہ ہے تو سنانے والے بھی دور و نزدیک سے پہنچ ہی جاتے ہیں۔ اب تم ہی کو دیکھو۔ کہاں کہاں سے جوتے گھساتے میرے پاس اپنی تمام بکواس کا ٹوکرا خالی کرنے پہنچ جاتے ہو۔ ظہیر بھائی ناراض مت ہونا۔ تم تو اپنے دوست ہو۔ جو جی میں آتا ہے، کہہ لیتا ہوں۔ باقی سب جگہ تو جی حضوری میں سر ہلانا ہی پڑتا ہے۔ سچ میری اس کمزوری کا لوگ بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب تم ہی کو دیکھو...... میرا سر بھی کھاؤ گے۔ میرا کھانا بھی کھاؤ گے۔

میں اسے بلانے تھوڑی گیا تھا۔ آگیا تو اس کی سننی ہی پڑ گئی۔ اس نے تو بس ذرا سی توجہ مانگی تھی۔ پھر سالہ سارے کا سارا میرے سر میں گھس کے صوفہ بچھا کے اندر بیٹھ گیا۔ تم کھو گئے۔ میں زیادہ بول رہا ہوں اور مقصد کی طرف نہیں آرہا۔ ارے بھئی کیا کروں۔ تم لوگوں کا اثر پڑتا ہی جا رہا ہے مجھ پر۔ خیر سن لو صبر سے۔ مجھے تمہارے لئے بھی تو دماغ کا صوفہ خالی کرنا ہے۔ ورنہ بیٹھو گے کہاں۔ کھڑے کھڑے ٹانگیں دکھاتے رہو گے اپنی۔

میری بیوی نے مجھے رکھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی کو اس نے رکھا ہوا تھا۔ ارے بھئی۔ اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہی کہہ رہا تھا۔ تم بیچ میں مجھے کیوں لے آتے ہو ظہیر بھائی۔ تم جانتے تو ہو۔ بیوی پالنا میرے بس کا روگ نہیں۔ ذرا صبر سے سن لو۔ میں کتنے صبر سے تمہیں روز برداشت کرتا ہوں۔ آج ذرا اپنا بٹن دبا کے نہیں بیٹھ سکتے۔

وہ سالہ ہر ایک پر رعب گانٹھتا تھا۔ کہانی لکھ دوں گا تم پر۔ سالہ دفتر دفتر گلی گلی، محلہ محلہ کہانی کا ڈنڈا ہر ایک کو دکھاتا پھرتا تھا جیسے کہانی نہ ہوئی۔ فسانہ آزاد کے خوجی کی قرولی ہو گئی۔ قرولی بھونک دوں گا۔ پولیس تک کو کہانی کے ڈنڈے سے ہانکتا تھا۔ جانتا ہوں، مانتا ہوں ظہیر بھائی۔ بس ہانکتا تھا۔ مگر میرا کیا بگڑتا تھا، سن لیتا تھا۔ وہ سناتا جاتا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ بیوی نے کہا کہ کہانی کے ڈنڈے سے خوفزدہ تھی۔ وہ کماتی تھی میں بیٹھ کر کھاتا تھا۔ کبھی ڈنڈا تو دکھانا چاہئے۔ مارنا نہیں چاہئے۔ ورنہ سارا رعب بہہ جاتا ہے۔ بس ایک دن ایک آدھ ڈنڈا کہیں چھڑکا دیا۔ اب تم جانو ڈنڈا اس کے پاس تھا محض سرکس کے جوکر سا۔ نہ سر پھاڑے نہ آواز ہی دے کڑاکے دار۔ انگریز بیوی نے دیکھ لیا۔ سالا ایسے ہی رعب گانٹھتا ہے۔ پانچ سال برداشت کر لیا۔ تب

اس اللہ کی بندی کو ساری بات بیچ کی سمجھ میں آگئی اور اس نے اسے نکال دروازے باہر کیا۔ بھئی ظہیر میں کیا کروں۔ کہانیاں دو آپس میں الجھی پڑی ہیں۔ ایک اس کی۔ ایک اس سے آگے کی۔ وہی جو وہ سنا گیا۔ ایک سلجھاتا ہوں تو دوسری الجھ جاتی ہے۔ کیا کروں یار تم لوگوں نے مجھے الجھائے رکھ دیا ہے۔ سسرا دماغ ہے کہ مکسڈ اچار کا مرتبان ہے۔ چمچی سے مرچ پکڑتا ہوں تو ہاتھ لگتا ہے شوربھارا آنچ۔ سالا گول مٹول۔ وہ بھی اِدھر اُدھر سرک جاتا ہے۔ ہاتھ میں خالی چمچی کھڑکتی رہ جاتی ہے۔

ہفتہ بھر وہ دروازے پر پڑا رہا مگر بیوی نے دانہ تک نہ ڈالا۔ دروازہ کھولتی۔ تالا ڈالتی اور دفتر چلی جاتی۔ واپس آتی، دروازہ کھولتی اور غڑاپ اندر۔ وہ معصوم پلّے کی طرح آس اور نراس کی آنکھوں سے بیٹھا دیکھا کرتا مگر یہ سالے انگریز ارادے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ ہاں تو ہاں، نہیں تو نہیں۔ رکھا تو پانچ سال رکھیل کی طرح رکھا، نکالا تو دودھ کی مکھی کی طرح۔ انگلی پر لیا اور پر سوکھنے سے پہلے دور اچھال دیا ایک بار وہ دروازے کے نزدیک پھٹکا تو سسری پولیس بلا لائی۔ اور وہی پولیس جو بقول اس کے اس سے تھرتھر کانپتی تھی، نے ایسے کوچے دیئے کہ اس کے تمام پرزے ڈھیلے کر دیئے۔

میرے پاس تو وہ تین مہینے بعد پہنچا تھا۔ بیوی کے دروازے سے اٹھا۔ ہاں ہاں یار، اٹھا نہیں اٹھایا گیا، سن تو سہی۔ وہاں سے اٹھا تو آگے اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اور وہ تھا غرض مند۔ اس کے اندر ڈال لیا۔ کھلایا پلایا۔ موج کروائی بلکہ ماہواری تک باندھ دی۔ کہا ٹِک کے رہ تو اور بڑھا دوں گا۔ ٹِک کے تو وہ رہ جاتا مگر سودا ذرا مہنگا تھا۔ خوراک خوب تھی۔ محنت تھوڑی سی تھی مگر بولنے کی اجازت نہ تھی۔ بھاگ کھڑا ہوا۔ ظہیر تم تو جانتے ہو۔ خوراک اچھی ہو تو محنت نہیں اکھرتی اور محنت بھی ایسی کہ دوسرے کے دودھ سے دہی بناؤ۔ بلوؤ۔ مکھن نکالو۔ اور چاٹتے رہو، چٹاتے رہو۔ چت بھی تمہاری، پٹ بھی تمہاری۔ مزے ہی مزے مگر وہ جو بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں مار کھا گیا۔ سالا۔ اب وہ بولے نہیں تو ہضم کیسے کرے۔ کہانی لکھے گا نہیں۔ کہانی سوچے گا تو سہی۔ سوچے گا تو سنائے گا بھی۔ بس تین ماہ ہی ٹِک سکا۔ اور رسیاں تڑا کر بھاگ نکلا۔ اور سیدھا میرے دروازے پر آدم لیا۔ وہی میرا سننے کا حوصلہ اور اس کا سنانے کا شوق۔

وہ بڈھا کھوسٹ، وہ جوان گھوڑی۔ تم جانو۔ گھوڑیاں تو مضبوط رانوں تلے ہی ٹِکا کرتی ہیں۔ کوئی پیسے دکھا کر اتھری گھوڑی خرید تو لے مگر رانوں تلے ٹکائے کیسے۔ ہر ایک کے بس کا روگ تو نہیں۔ لاکھوں پتی تھا۔ سوچا کار کی مار دوں گا۔ نوکر چاکر۔ محل ماڑی۔ بہلی رہے گی اور وہ بہلی بھی رہی۔ خود ہی تو دانہ دیکھ کر آئی تھی مگر لالے کے دانے بک چکے تھے۔ گھوڑی بدکنے لگی تو اسے نئے شہسوار کی تلاش ہوئی۔ راجد ھانی کے دروازے پر یہی پہلا مسافر نظر آیا۔ اس نے اِسے ہی شہسوار سمجھ کر اندر اتار لیا۔ سوچا بات گھر کی گھر میں رہے گی۔ گھوڑی پہ کاٹھی میری

سواری اس کی۔ ویسے بھی ایسی گھوڑیوں پہ رنگین اور قیمتی کاٹھی اچھی لگتی ہے۔ ملکیت کس کی ہے۔ ہر کوئی یہ دیکھتا ہے۔ سواری تو نوکر چاکر بھی چوری چھپے کر ہی لیتے ہیں۔ دانہ دنکا ڈالتے وقت یا سیر پر باہر گھمانے لے جانے کے بہانے سے۔

ظہیر بھائی۔ تو کہانی بیچ کی جانتا ہے کہ ایسے ہی ہاں ہوں کئے جاتا ہے۔ کہانی معلوم نہیں تو تیرا سلسلہ خاک بنے گا۔ بیٹا کمسن ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ تو پہلے کہانی سن۔ وہ سالہ۔ انگریزی لالہ۔ پیسے والا۔ بیوی نے بیچ منجدھار چھوڑا اور پرکی راہ لی۔ یہ دمی دم۔ نہ بیٹی نہ بیٹا۔ نہ پیسے کا کوئی غم۔ کچھ دن بیوی کا سوگ مناتا رہا۔ لطیفے سننے سنانے کا شوقین۔ وہ بھی الف ننگے لطیفے۔ بس اپنی ہی مار سے مرگیا سالا۔ کیا سوجھی کہ دیسی نور محل بیاہ لایا۔ چھوری چالاک تھی، کچھ ہی دن میں نور جہاں بن بیٹھی اور سارے جہاں کو اجالا دینے لگی۔ چمک دمک پر آئی تھی پہلے پہل۔ بولی "کار لوں گی۔"

اس نے کہا۔ "مرسیڈیز حاضر ہے۔"

بولی۔ "محل چاہئے۔"

وہ بولا۔ "محل جمع نوکر چاکر جمع دھن دولت جمع بندہ بے دام، غلام بالگام بھی حاضر ہے۔ اور اس نے واقعی اپنی لگامیں اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ تمام بزنس، کام دھام اور گھر باہر کی چابیاں اس کے سامنے دھر دیں۔ بس یہیں مار کھا گیا سالا۔ ارے بھئی آہستہ آہستہ دو۔ پیٹ بھر گیا تو چڑیا اڑ جائے گی۔ کسی نے یہ رائے دی تو تھوڑی عقل آگئی اور چڑیا سے کھایا پیا واپس دھروا لیا یعنی اسے دو بچوں کی ماں بنا دیا۔ ایک چھوری ایک چھورا۔ گورا گورا۔ مگر وہ راہ دیکھ چکی تھی کہ راہ آگے بھی جاتی ہے اور جب آگے کی راہیں نظر آجاتی ہیں تو مسافر ٹکے نہیں رہتے۔

کسی نے پہلی رائے دی تھی کہ کھایا پیا واپس دھروا لو۔ اس کے کسی دوسرے بھائی نے دوسری رائے بھی دے دی کہ دوسرا شہسوار ڈھونڈلو۔ بات گھر کی گھر میں رہے گی۔ اپنا یار، بیمار، بیوی کی کھا کے مار، اس کے اڈے چڑھ گیا۔ دونوں نے اسے گھیرا۔ ٹانگوں میں ڈھنگے ڈالے۔ یہ بھی مجبور، حالات سے معذور۔ وہاں ٹک گیا۔ گھوڑی خوش کہ نیا مالک ملا۔ مالک خوش کہ بات بن گئی اور یہ بات سے بات بنانے کا خواہاں۔ کہانیوں کا بھرا گلستاں۔

ظہیر بھائی۔ برف پگھلتی ہے تو ندی بنتی ہے۔ ندی بنتی ہے تو بڑے بڑے پہاڑ چیر کر راستہ بھی بنا لیتی ہے۔ یہ بھاگ نکلا اور میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا تکلیف تھی؟"

"موج ہی موج تھی۔ تکلیف کے معنی بھول گیا تھا۔"

"کھانا نہیں ملتا تھا۔؟"

"ارے بھئی ڈٹ کے کھاتا تھا۔"

"بھاگا کیوں؟"

"راہ بکاس نہیں تھی۔"

یہ سسری راہ بکاس بھی ایک مصیبت ہے۔ ظہیر بھائی۔ تجھے تو یہ تکلیف نہیں۔"

"بس اللہ کا فضل ہے۔"

میں جانتا ہوں ظہیر بھائی۔ تجھ پر تو اللہ کا خاص ہی فضل ہے۔ اسی لئے کہتا ہوں۔ راجدھانی کے دوار پر پہنچ۔ دروازے بانہیں کھولے تیرے منتظر کھڑے ہیں۔

"سچ۔"

ارے رک تو سہی ظہیر بھائی۔ تجھ میں تو مزید سننے کی ذرا بھی تاب نہیں۔ بھاگا کہاں جاتا ہے۔ فکر نہ کر دروازے اِتنی جلدی کسی اور کو اندر لے کر بند نہیں ہو جائیں گے۔ ارے تو تو مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ تیری مرضی۔ میں تیری ٹانگوں کی مضبوطی کے لئے خدا سے دعا کروں گا۔ □

رشید امجد
۱۸۵۔اے، نانک پورہ
راولپنڈی، پاکستان

طلسمِ بے در

اسی چار دیواری میں، غیر منظم طور پر، کہانی کہیں چھپی بیٹھی ہے اور وہ لفظوں کا جال لئے اسے دیر سے تلاش کر رہا ہے۔ لیکن کہانی بس ایک جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتی ہے۔

لک چھپ جانا۔
مکئی دا دانہ۔
راجے دی بیٹی آئی جے۔

آواز سن کر چوکنا ہوتا ہے لفظوں کی ڈوریاں کھینچ کھینچ کر دیکھتا ہے لیکن کہانی بل کھاتی اس کے پہلو میں سے نکل کر کسی کونے میں جا چھپتی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے خیال آتا ہے کہ کہانی کے بغیر ہی لفظوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر فرضی کہانی بنا لی جائے۔

فرضی کہانی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

لفظ کو دوسرے لفظ سے جوڑتا ہے۔ لفظوں کا مینار اٹھتا چلا جاتا ہے۔ جب آخری لفظ رکھتا ہے تو مینار دھڑام سے نیچے گر پڑتا ہے۔ کونے میں چھپی کہانی کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔

لک چھپ جانا۔
مکئی دا دانہ۔
تو کیا کروں؟
کہانی کو کیسے تلاش کروں ـــــ کہاں سے لاؤں اُسے؟
مان جاؤ ـــــ آجاؤ، دیکھو لفظ تمھارے انتظار میں منہ کھولے بیٹھے ہیں۔
کہانی نہیں مانتی ـــــ نہیں آتی۔
تو کیا کروں؟ کہانی کے بغیر ہی کہانی لکھوں۔

دھوپ اندھی، اندھیرا روشن اور لوگ چوہے۔ چوہے سارے صحن میں، گلیوں اور بازاروں میں دوڑتے ہیں۔ دن روتا ہے، رات ہنستی ہے، اور کہانی کونے میں چھپی چھپی پتھر ہوتی جاتی ہے۔

اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے اور وہ دونوں ہاتھوں کو پھیلا پھیلا کر ہلا ہلا کر اسے تلاش کر رہا ہے۔ کہانی اس کے اِرد گرد ناچتی ہے، کبھی دائیں، کبھی بائیں گدگدی کر کے بھاگ جاتی ہے۔

وہ دوڑ دوڑ کر ہانپ گیا ہے۔ پھولی ہوئی آواز میں کہتا ہے ــــــ "سنو، خدا کے لئے سنو میری بات تو سنو"

کہانی کھلکھلاتی ہے ــــــ "کہو"

"میرے پاس آؤ ــــــ دیکھو لفظ اب سڑنے گلنے لگے ہیں، ان میں بو پڑ گئی ہے ــــــ دیکھو ــــــ"

کہانی لمحہ بھر کو چپ رہتی ہے، پھر کہتی ہے ــــــ "کرداروں کے بغیر میرا وجود کیا؟ جاؤ پہلے کردار تلاش کرو"۔

"کردار ــــــ" وہ بڑبڑاتا ہے ــــــ "لیکن میری آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہے"۔

کہانی کچھ سوچتی ہے پھر چپکے سے اس کی پٹی کھول دیتی ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک لق ودق صحرا ہے، چاروں سو ریت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، اوپر جھونکتا سورج۔

وہ آنکھیں جھپکتا ہے۔

اب کیا دیکھتا ہے کہ بھرا بازار ہے، کھوے سے کھوا چھل رہا ہے، خریداروں کا ہجوم، دکانیں رنگا رنگ اشیاء سے لدی پڑی ہیں۔

کردار ہی کردار۔

سامنے سے گذرتے ایک ادھیڑ عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے ــــــ "جناب ــــــ" لیکن اس سے پہلے کہ کچھ اور کہے کندھے سے باہر نکل کر سڑک پر جا گرتا ہے۔

ادھیڑ عمر غصہ سے کہتا ہے ــــــ "معلوم نہیں میرا بازو مصنوعی ہے"۔

وہ بوکھلا کر بازو اٹھاتا ہے اور جلدی جلدی کندھے پر فٹ کرنے لگتا ہے۔

بازو فٹ ہو جاتا ہے تو وہ شخص مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے ــــــ "ہاں، اب

بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ـــــ کچھ نہیں" وہ جلدی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایک خوبصورت عورت قریب سے گذرتی ہے۔

"سنئے"

وہ جواب نہیں دیتی۔

"سنئے ـــــ سنئے ـــــ سنئے" ـــــ

وہ مڑ کر دیکھتی ہے ـــــ "شاید آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں، افسوس میں سن نہیں سکتی۔ میرے کان مرمت ہونے کے لئے گئے ہوئے ہیں، شام کو ملیں گے۔"

وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

چاروں طرف کردار ہی کردار ہیں، لیکن ـــــ ؟

دفعتاً ایک بچّہ نظر آتا ہے۔

"یہ ضرور اصلی ہوگا ـــــ"

دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہے۔ پیار سے اس کے گال تھپتھپاتا ہے۔ بچّہ فوراً بولنے لگتا ہے ـــــ "میرا نام ثانی ہے، میرے ابّو کا نام .... میری امّی کا نام .... میں .... میں ...."

آواز بند ہو جاتی ہے۔

کیا ہوا؟

چابی ختم ہو گئی ہے۔

وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے ـــــ

"کیا ہوا ـــــ کیا ہوا؟" لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ روتے روتے سر اٹھا کر دیکھتا ہے۔

ٹوٹے بازو ـــــ پتھر کی آنکھیں ـــــ پیوند لگے سر ـــــ لکڑی کے پاؤں ـــــ

وہ کتابوں کے ڈھیر میں اتر جاتا ہے۔

دیمک لگی تاریخ کے ایک ایک واقعہ کو ٹٹولتا ہے، اپنے وقت کے بڑے بڑے کردار تاریخ کے کوڑا گھر میں دھندھلے پڑے ہیں، ہاتھ لگاتا ہے تو بکھر جاتے ہیں۔

وہ پھر اسی چار دیواری میں آجاتا ہے'
کہانی کسی کونے میں چھپی بیٹھی ہے ـــــ اسے دیکھ کر کھکھلاتی ہے ـــــ
"میں کیا کروں ـــــ سارے کردار بے کردار ہیں؟"
کہانی ہنستی چلی جاتی ہے، پھر کہتی ہے ـــــ "کردار تو ماحول کی پیداوار ہیں، جاؤ پہلے ماحول تلاش کرو"۔
وہ سر ہلاتا ہے اور باہر آتا ہے۔
کیا دیکھتا ہے کہ باغ باغیچے ہیں، پھل دار پودے ہیں، رنگارنگ پھول ہیں، بھوک سی محسوس ہوتی ہے، آگے بڑھ کر پھل توڑتا ہے، منہ میں ڈالنے لگتا ہے تو پھل پتھر کا نکلتا ہے۔ بازار میں آتا ہے تو دکانیں چیزوں سے بھری نظر آتی ہیں ـــــ ہاتھ لگاتا ہے تو مٹی ہو جاتی ہیں، ڈبوں کے منہ کھولتا ہے تو اندر سے سڑاند نکلتی ہے ـــــ بھوک باؤلے کتے کی طرح اس کے پیچھے دوڑتی ہے ـــــ
بھوک ـــــ ڈبے، برتن اندر سے خالی ہیں، باہر سے ٹن ٹنا ٹن بجتے ہیں۔
غشی اور کمزوری کے عالم میں تھکن سے چور ڈولتا ہے، ساری چیزیں اڑتی ڈولتی نظر آتی ہیں۔
ایک بڑا سا خلا رہے جس میں وہ بھی ہے، چیزیں بھی، لوگ بھی، اور کہانی بھی۔
لیکن کہانی کہیں چھپی بیٹھتی ہے اور وہ لفظوں کا جال لئے اسے دیر سے تلاش کر رہا ہے، لیکن کہانی بس ایک جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتی ہے۔
لک چھپ جانا۔
مکئی دا دانہ۔
راجے دی بیٹی ـــــ
مگر راجے کی بیٹی تو راجہ مانگتی ہے اور وہ نہ راجا ہے نہ راجاؤں جیسا! ☐

رضیہ فصیح احمد
گلشنِ اقبال
کراچی، پاکستان

رنگ، کینوس اور نقاد

اس کا جی چاہتا تھا وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو قلم کر دے۔

آنکھیں بند کرتا تو لمحہ بھر میں مکمل تصویر، ساری لکیروں اور پورے رنگ و آہنگ کے ساتھ اس کی آنکھوں کے چوکھٹے میں آکر فٹ ہوجاتی۔ چوکھٹا جو بالکل صحیح ناپ کا گولڈن مستطیل ہوتا۔ اس میں کوئی اچھوتا موضوع رنگ اور لکیروں میں ڈھل کر یوں سامنے آتا کہ وہ پھڑک اٹھتا۔ یہ پینٹنگ اگر جوں کی توں بن جائے تو ـــــ کبھی آنکھیں بند کرتا تو اس صحیح ناپ کے سنہری مستطیل پر ایسے خوش رنگ لہریے لہراتے کہ وہ جھوم اٹھتا اور انھیں رنگ بہ رنگ حافظہ میں محفوظ کر لیتا۔ پھر آنکھیں کھول کر چاہتا کہ انھیں جوں کا توں پینٹ کر لے۔ مگر جیسے ہی وہ آنکھیں کھولتا سب کچھ فنا ہوجاتا۔ حافظہ کی مدد سے وہ پینٹ کرتا مگر بات نہ بنتی پینٹنگ کی روح غائب ہوجاتی صرف رنگ رہ جاتے۔ خدا معلوم یہ اس کے ہاتھ دھوکا دے رہے تھے یا ذہن دھوکا دے رہا تھا۔ اسے غصہ ہاتھوں ہی پر آتا تھا۔ یہ ہی غدار ہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جو تصویر اس کی آنکھوں کے پردے پر ابھرتی ہے بالکل اسی شکل میں منتقل نہ ہوسکے۔

اور ابھی بند آنکھوں اور کھلی آنکھوں کی جنگ جاری تھی کہ اس کی نظر بہت تیزی سے زائل ہونے اور رنگوں کی پہچان کھونے لگی۔ اس کی پریشانی کی حد نہ رہی۔ اس نے تو زندگی میں اور کچھ نہ کیا تھا سوائے رنگوں سے کھیلنے کے۔ اس کا کام بھی یہی تھا، اس کی تفریح بھی یہی تھی۔ اگر رنگ اسے دغا دے گئے تو وہ کیا کرے گا ـــــ وہ دن رات پینٹنگ بنانے لگا، وہ وقت سے، خود سے اور خدا سے لڑ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا بینائی ختم ہونے سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ پینٹنگز بنالے وہ آنکھوں کو جس قدر اندھا دھند استعمال کر رہا تھا ان کی روشنی اسی تیزی سے اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کو مکمل آرام دے اور ان پر بالکل زور نہ ڈالے۔ لیکن جس طرح بلانوش شراب کے آخری گلاس

کا آخری قطرہ تک پی جانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی بینائی کی آخری شعاع تک اپنی پینٹنگ میں جذب کر دینا چاہتا تھا۔ اب اس کے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ جو کچھ بنانا چاہتا ہے وہ بن بھی رہا ہے یا نہیں۔ اس نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ کمال کس کو حاصل ہوا ہے۔ اگر اسے کسی حد تک کامیابی ہو جاتی ہے تو یہی بہت ہے۔ اگر لوگ اس کے اسی کام کو سراہتے ہیں تو وہ کیوں بتائے کہ اس کی نظر میں اس کی ہر تصویر ادھوری اور ناکام ہے۔

اور پھر اس نے اپنی آخری نمائش کرنے کا فیصلہ کر لیا جس میں اس کی تیس نئی پینٹنگز رکھی جائیں گی۔ اس نے تیس کینوس تیار کر کے اپنے اسٹوڈیو میں چاروں طرف رکھ دیئے اور پرانا سارا کاٹھ کباڑ نکال ڈالا۔ اب وہ دلچسپی سے کام کرے گا۔ اس کا موضوع آنکھیں ہوں گی۔ بصارت اور بصیرت۔ وہ ملٹن کو پینٹ کرے گا آنکھیں جانے سے پہلے اور آنکھیں جانے کے بعد۔ بینائی کھونے سے پہلے بے چین اور مضطرب اور بینائی کھونے کے بعد مطمئن اور پرسکون۔ مگر کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں۔ جوں جوں اس کی بصارت زائل ہو رہی تھی اس پر اضطراب اور خوف کا ایک عجیب عالم طاری ہو رہا تھا۔ اس کی بھوک، پیاس اور راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ کسی صورت چین نہ آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسیب اس کی تاک میں ہوں۔ وہ رو رو کر دعائیں مانگتا تھا۔ "یا الٰہی رحم کر۔ میری جان لے لے مگر میری آنکھیں نہ لے۔"

اور اس ساری پریشانی، خوف اور آسیبی حملوں سے بچنے کی دوسری صورت یہ تھی کہ وہ پینٹنگ بناتا جائے۔ رونا اور پینٹنگ کرنا دونوں ہی ایسے کام تھے جو اس کی بصارت زائل کرنے میں ان آسیبوں کی مدد کر رہے تھے۔ وہ آسیب اسے یوں لگتا جیسے فضا میں منڈلا رہے ہوں، ان گدھوں کی طرح جو تاک میں رہتے ہیں کہ جیسے ہی زخمی کا دم نکلے اس پر جھپٹ پڑیں۔

جسمانی تھکن، ذہنی کرب اور خوف نے اسے بیمار ڈال دیا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ ذہنی مریضوں کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں پڑا پڑا وہ چیختا رہتا کہ اسے گھر جانے دیا جائے۔ وقت کم ہے اور اسے بہت کام نمٹانا ہے۔ یہ ہسپتال والے جاہل اور بے حس لوگ ذرا نہیں جانتے کہ اس کا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے۔ وہ جان بوجھ کر کتنا قیمتی سرمایہ مٹی میں ملا رہے ہیں۔ ہسپتال والے خود کو جاہل اور بے حس سن کر مسکراتے اور ہنس کر ٹال جاتے کہ باؤلے مریض اس سے بھی زیادہ سخت سست کہا کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کو ہی زہر کے انجکشن لگانے اور کھانے میں زہر ملانے کا الزام ملتا ہے۔ سو ایسے مریضوں کی کیا پرواہ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہسپتال میں پڑا پڑا ہی وہ بصارت سے محروم ہوگیا۔ چند دن تو اس نے آسمان سر پر اٹھائے رکھا۔ پھر آہستہ آہستہ عادی ہونے لگا کہ انسان بڑا سخت جان ہے۔ وہ اس چیز کی کمی کا بھی عادی ہو جاتا ہے جس کے بغیر اسے ایک پل جینا گوارا نہیں ہوتا۔ کچھ اور پرسکون ہوا تو ڈاکٹروں نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

گھر آتے ہی وہ سب سے پہلے اپنے اسٹوڈیو میں گیا۔ سارے کینوس اسی طرح رکھے تھے جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔ اس کا ایزل اسی طرح موجود تھا جس پر ایک نامکمل پینٹنگ دھری تھی۔ اس کے رنگ اور برش سب اپنی جگہ موجود تھے جیسے اتنے عرصے سے اس کے منتظر ہوں۔ مگر اب وہ کیا کرے۔ اس نے جھک کر ہاتھ سے رنگوں کی ٹیوبوں کو چھوا ـــــ سب ٹیوب ایک سی تھیں۔ وہ کیسے اندازہ لگائے کہ سبز کون سی ہے، سرخ کون سی، سیاہ کون سی ہے اور سفید کون سی ـــــ کاش اتنے سال اس نے رنگوں سے مغز مارنے کے بجائے موسیقی میں جان کھپائی ہوتی تو وہ آج بھی اپنی آواز کا جادو جگانے کے قابل ہوتا۔ اگر ان رنگوں کی جگہ ستار کے تار ہوتے تو وہ اس کی انگلیوں کی زبان سمجھتے۔ ہر تار چھوتے ہی بول پڑتا، "یہ میں ہوں۔" اور وہ آنکھیں نہ رکھتے ہوئے بھی انگلیوں کے بل پر ستار بجا سکتا ـــــ مگر اب وہ ان اندھی بہری ٹیوبوں اور بے حس اور بے آواز برشوں کا کیا کرے۔ اسے لگا جیسے وہ اندھا نہیں ہوا ہے اس کا پیلیٹ اندھا ہوگیا ہے۔ اسے بے حد غصہ آیا۔ ساری عمر وہ جس پیلیٹ پر اپنے رنگوں کی بارش کرتا رہا، جن برشوں کو رنگوں کی زبان سکھاتا رہا انھوں نے اتنی مدتیں کچھ بھی نہ سیکھا۔ اس کی ساری عمر کی محنت رائیگاں گئی۔ آخر اس نے اپنے ہاتھوں اور انگلیوں کو اپنے ذہن کے خوابوں کا کچھ حصہ تو دیا تھا یا نہیں۔ کیا یہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ یقیناً نہیں۔ جب وہ ہی نہیں دیکھ سکتا تو وہ کیا کر سکتے ہیں؟ اس نے دوبارہ ٹیوبوں کو چھوا ـــــ کوئی طریقہ تو ہوگا رنگوں کے علم کا۔ نہیں، ساری ٹیوبیں واقعی ایک سی ہیں۔ رنگ اس کے ہاتھوں میں بے بس پرندوں کی طرح چپ چاپ اور سہمے ہوئے تھے۔ غصے میں اس نے اندھا دھند ٹیوبیں کھول کھول کر پیلیٹ پر رنگوں کے انبار لگا دیئے اور پھر برش کا بنڈل اٹھا کر ایزل کے پاس پہنچا اور رنگ کینوس پر پھیلانے شروع کر دیئے، پھینکنے شروع کر دیئے۔ کبھی غصے میں انھیں رگڑ ڈالا، کبھی پیار سے انھیں اچھال دیا۔ کبھی ہمدردی سے انھیں سہلا دیا۔ ایک کے بعد اس نے سارے کینوس رنگ ڈالے۔ جب پیلیٹ پر رنگ ختم ہو جاتے وہ ٹیوبوں سے پیلیٹ پر رنگ انڈیل لیتا اور برش پھر اپنا

کام شروع کر دیتے۔ اور جب اسے معلوم ہوتا کہ کینوس بھر گیا ہے تو وہ دوسرے کی راہ لیتا۔ دن رات وہ اسی کام میں لگا رہا۔ نہ اسے کھانے کا ہوش تھا اور نہ پینے کا ــــ اور جب تینوں کینوس پورے ہو گئے تو دنیا انھیں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ تصویریں کسی اندھے آرٹسٹ نے بنائی ہیں۔ ان میں رنگوں کی جو بصیرت تھی، ہنرمندی کا جو کمال تھا، لکیروں میں جو آہنگ تھا اور مکمل پینٹنگ میں جو موسیقی تھی وہ آج تک کسی آنکھوں والے کے کام میں نہیں دیکھی گئی تھی۔ وہ تمام رنگ جو اس نے بند آنکھوں سے دیکھے تھے اور آنکھیں کھول کر کینوس پر منتقل نہ کر سکا تھا، وہ تمام امنگیں جو اس کے دل میں ڈیرہ ڈالے تھیں، وہ ساری حسرتیں جو پوری نہیں ہوئی تھیں اور کچھ کرنے کا عزم جو اب کچھ نہ کر سکنے کی اتھاہ مایوسی میں ڈوب رہا تھا سب ہی کچھ تو اس کے کینوس پر منتقل ہو گیا تھا۔

اس کی نمائش میں لوگ امڈے چلے آ رہے تھے۔ نوجوان مصور اس کی انگلیوں کے پوروں کو آنکھوں سے لگا رہے تھے۔ شائقین اس کی بے نور آنکھوں کو عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ انٹرویو لینے والے مائک اس کے آگے دھرے بیٹھے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا: "میں آرٹسٹ نہیں ہوں۔ میں ایک کینوس ہوں۔ میں نے چالیس برس رنگ پیا ہے اور اب رنگ خود بخود میرے اندر سے پھوٹ رہے ہیں۔ میں کسی پینٹنگ کی تخلیق نہیں کرتا، وہ تو میری ذات، میری شخصیت، میری سائیکی اور میرے وجود کا حصہ بن گئی ہیں۔ بس میں خوش ہوں کہ میرے پیلٹ نے، میرے برش نے اور میری انگلیوں نے میرے ساتھ غداری نہیں کی۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ یہ سب میری آنکھوں کے تابع نہیں تھے، میرے تابع تھے، میری روح کے۔ یہ آنکھوں کے شاگرد نہیں تھے۔ روح کے شاگرد تھے۔ سچے شاگرد تھے۔

اور آرٹ کے نقاد نے لکھا ــــ "وہ ذہنی طور پر پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے ہیں۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ مثلاً انھوں نے کہا: "وہ آرٹسٹ نہیں بلکہ ایک کینوس ہیں۔" □

انور عظیم

لومڑی

داش بیسن کے ٹھیک اوپر اتنا بڑا آئینہ چپکا دینا اور وہ بھی اس طرح کہ اس سے کترانا مشکل ہو جائے، کہاں کا تک ہے ؟ مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگتی کہ گھر میں گھستے ہی اپنا چہرہ دکھائی دے جائے۔ یہ بھی کوئی چہرہ ہے۔ پھیکا تھکا ہوا چہرہ۔ لیکن مجھے یہ چہرہ دیکھنا پڑتا ہے۔ آنکھوں میں کاجل پھیلے ہوئے۔ ہونٹوں کی سرخی پسیجتی ہوئی جس سے اصلیت کا پھیکا پن جھانکتا ہے اور وہ تل بھی اڑ جاتا ہے جو صبح کو اتنی احتیاط سے جماتی ہوں۔ بچپن کا مذاق اگر تل بن جائے تو زندگی بھر بھگتنا پڑتا ہے۔ اب بھگتو میری ران بھگتو۔

یہاں پہنچتے پہنچتے کبھی کبھی تو سات بج جاتے ہیں۔ اب آج ہی دیکھ لو۔ آج تو سات سے بھی زیادہ بج گئے۔ خیر۔ لیکن اس تھکے ہوئے ویران چہرے میں بھی اپنی ایک بات ہے۔ یہ بات اصل میں ان آنکھوں میں ہے جن میں سارے زمانے کی نیند گھل کے رہ گئی ہے۔ مائی گاڈ! اگر میں لڑکی نہ ہوتی میرا مطلب ہے عورت نہ ہوتی تو ان آنکھوں کے لئے کیا نہ کر چکی ہوتی، اب تک! چپکے چپکے کہانی کہہ کر سلا دینے والی آنکھیں کتنوں کو ملتی ہیں زمانے میں۔ آج کچھ زیادہ ہی گھٹن ہو رہی ہے۔ جب تک میں اس آئینے سے آگے نہ نکل جاؤں یہی حال رہے گا۔

ایسے میں کس کا جی نہیں چاہے گا کہ منہ پر جلدی جلدی صابن ملو اور پنکھے کے نیچے جا کر پانی پیو، نیبو پانی اور اس میں ذرا سا نمک، ذرا سی کالی مرچ۔ ایسے میں تو چائے پر لیفر کرتی ہوں۔ ہاں اگر کوئی اور بنا کر دے دے۔ کوئی اور — ہونہہ!

مگر اب میں اس آئینے سے اوب چکی ہوں۔ اس کو یہاں سے نکلوا دینا چاہئے۔ نکلوا دوں گی۔ باتھ روم جاؤ تو روشنی جلانی پڑتی ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ لائٹ اور شیڈ کی وجہ سے جھریاں اور زیادہ گہری ہو جاتی ہیں اور میرا دل دکھاتی ہیں — ویسے میں، میرا مطلب ہے — دو چار چھینٹے منہ پر مارو اور چلو پنکھے کے نیچے بیٹھو اور اگر میں یہاں بالکنی پر چند منٹ کے لئے کھڑی ہو جاتی ہوں تو اس پر

لوگوں کو الٹی سیدھی ریومر پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔ آدمی کب تک اس بند قلعے میں بند رہے۔ اور سب بھی تو آتے ہیں دن بھر کے تھکے ہارے ___ لیکن میں دیکھتی ہوں۔ سب دیکھتی ہوں۔

دروازہ بند کرنے کے بعد جب میں شاور کے نیچے کھڑی ہوتی ہوں تو جی چاہتا ہے آئینے کا رخ جو ادھر کو مڑ جائے تو میں ذرا اپنے آپ کو دیکھوں تو سہی۔ آخر ایسی کیا بات ہے کہ ...

لگتا ہے سارے عکس جو پیچھے رہ گئے تھے یہاں آگئے ہیں۔ سارے عکس، ساری سانسیں، جھٹپٹا سا ہے۔ پنکھا آہستہ آہستہ گھوم رہا ہے۔ ہوا میں برسات کی نمی ہے اور سانس میں بھی۔ اور وہ مجھ پر بادل کی طرح اتر آیا ہے۔ ایک ایک مسام میں ننھی ننھی برف کی چنگاریاں پگھل رہی ہیں اور میں اس دھند لکے میں بھی اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سا عکس دیکھ رہی ہوں۔ کوئی عکس ہے یا حیرت یا زخمی پرندہ۔ جانے کیا۔ وہ آنکھوں سے مجھے پی رہا ہے۔ ہونٹوں سے دیکھ رہا ہے۔ تلاش اور تلاش، حیرت اور حیرت! اور ایک زخمی پرندہ اور بہت سارے زخمی پرندے۔ وہ مجھ پر چھایا چلا جا رہا ہے۔ وہ اب ایک نہیں ہے ___ بادل ___ اور بادل کے بہت سے ٹکڑے جو ہوا میں تیر رہے ہیں اور میں ان کے ساتھ تیر رہی ہوں۔ وادیوں کے اوپر، جھیل کے سینے پر، درختوں کی پھننگیوں سے الجھتی ہوئی۔ اور اب وہ بادل جو میرے اوپر ٹھہر گیا ہے اور مجھے جس طرح دیکھ رہا ہے، میں بھی اس کی طرح اپنے آپ سے اوپر اٹھ جاؤں اور دیکھوں، جو وہ دیکھ رہا ہے۔ مگر کیا کیا جائے آئینے کا رخ کسی اور طرف ہے۔ میں یہ سب اس لئے نہیں سوچتی ہوں کہ مجھ میں کسی قسم کا کمپلکس ہے۔ بالکل نہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے جھریاں عجیب سی لگتی ہیں۔ مجھے یقین ہے ہومیو پیتھی میں اس کا علاج ہوگا۔ ہومیو پیتھی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔

ہر چیز کی کوالٹی کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ آپس کے رشتے ہی نہیں تولیے تک اپنا رنگ کھو دیتے ہیں۔ اب نہا کر ذرا سا جسم پر ملو اور دیکھو نشان پڑ جائیں گے۔ نہ جانے دھاگوں کی نرمی کہاں چلی گئی۔ دھاگوں کی اور دلوں کی۔ نہیں میں کسی کمپلکس کا شکار نہیں ہوں۔ ہاں ہومیو پیتھی میں بھی ایک مصیبت ہے۔ لگا تو تیر نہیں تو تکا۔ پر یہ بھی سوچو اور جو دوا لگ گئی تو جھریاں صاف ہو جائیں گی اور میں پھر ... پہلے علاج کراؤ اور پھر یہ کھیل کھیلو۔

پوری شام پڑی ہے اور میں ابھی سے الجھ رہی ہوں۔ مگر آج تو اس نے حد ہی کر دی۔ مائی گاڈ! پورے راستے پیچھا کیا اس نے۔ اس دن بس میں وقت پوچھنا غضب ہو گیا۔ کیسے کیسے چپکو مرد ہوتے ہیں۔ کیسی ٹائمنگ کر رکھی ہے۔ ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے آپ ___ پھر غڑاپ سے

ن کے اندر۔ پھر تیس منٹ یا شاید چالیس منٹ اس کی سانس اور اپنی گردن۔ بڑی مصیبت ہے۔
ر میرا ٹرانسفر ہو جائے کسی اور برانچ میں تو جان چھوٹے۔ کل اپنے باس سے بات کروں گی۔ مگر وہ بڑھ
جائے گا پیچھے۔ تاڑ سے گرے اور کھجور میں اٹکے۔ بابا اس مصیبت میں کون پڑے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔
پانی کو کہیں نہ کہیں مرنا ہے۔ سو مرے گا۔ کل جو ہوگا کل دیکھیں گے۔ ابھی تو ڈسٹنگ کر لیں۔ ہر چیز پر
رد جم گئی ہے۔ آج کھانا پکانے کا موڈ نہیں ہے۔ سلائس آملیٹ سے کام چل جائے گا لیکن ابھی سے
س کی کیا فکر ہے۔ مائی گاڈ! مورتی پر، کشن پر، دروازے پر، کھڑکیوں کے پردے پر کتنی گرد ہے۔
اور میں گرد سے الرجک ہوں۔

گرد ہی سے کیوں؟ وہ لوگوں کا سیٹی بجانا اور اٹھلا کر چلنا۔ کیا میں اس سے کم الرجک ہوں۔
بلا وجہ بات کو طول دینا اور دون کی لینا، کیا میں اس سے کم الرجک ہوں۔ اور وہ صاحب، جن پر آئے
دن ملیریا کا دورہ پڑ جاتا ہے ـــــ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ جب وہ آنکھوں آنکھوں میں مجھے چاٹ چاٹ
کر خوش ہوتے ہیں تو میں بس اتنا پوچھ لیتی ہوں ـــــ کیا آپ مچھر دانی میں نہیں سوتے گپتا جی؟
آپ کے چہرے پر مچھر کاٹے کے بہت نشان ہیں اور آپ کی ناک تو بالکل سوج گئی ہے۔ کیا میں ان
صاحب سے کچھ کم الرجک ہوں۔

زندگی ہے کہ انھیں چھوٹی چھوٹی الرجیز میں گزرتی چلی جاتی ہے اور بڑی بڑی چٹانیں جو
راستہ روکے کھڑی ہیں ـــــ ہم ان کی پروا نہیں کرتے، ان سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔ میرا ابھی یہی
حال ہے اور جو میں ماڈل بن جاتی تو اب تک کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ دفتر کی مریل پروموشن بازی
سے تو بچ جاتی۔ پر پہلے دن ہی ہیر ریموور کا اشتہار دینا کچھ جچا نہیں مجھے۔ اور اب سوچتی ہوں تو
لگتا ہے کہ تب میں بہت ستی تھی۔ بازو میرے ویسے اتنے سڈول ہیں کہ اگر ذرا دیدار کے لئے محراب
بن جاتے تو کیا ہو جاتا۔ بغل چکنی اور صاف اور خوشبودار اور ٹانگیں اور سڈول اور چکنی اور خوشبودار۔
چند بار کلک کلک اور بس۔ گریٹا گاربو نے اپنی بغلوں کی اور صوفیا لورین نے اپنی ٹانگوں کی کچھ کم نمائش
کی ہے۔ لیکن کیا ہو گیا۔ مزے میں آرٹسٹ کی آرٹسٹ رہیں اور میں چھوٹے نخروں کے عذاب میں گھر کے
سنہرا موقع کھو بیٹھی۔ مگر اب اس کا رونا کیا ہے؟

ہوا تیز ہے اور بالکنی کی ریلنگ سے لپٹی ہوئی بیلیں لرز رہی ہیں۔ اگر میں بھی بالکنی پر ہوا
میں کھڑی ہو جاؤں تو بال منٹوں میں سوکھ جائیں گے۔ سامنے والے فلیٹ کا نوجوان اڑتے ہوئے بال
دیکھ کر ذرا خوش ہو لے گا۔ اگر اپنا کچھ جاتا نہیں اور کوئی دور سے انگور دیکھ دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے

تو میری بلا سے۔ ہو سکتا ہے کچھ بوندا باندی ہو جائے۔ ہو گی تو کیا ہے۔ اندر آجاؤں گی۔
دستک! نہ جانے کیوں ان لوگوں کو دروازے کی گھنٹی نہیں دکھائی دیتی۔ دستک دیں گے۔
اور یہ کوئی دستک دینے کا وقت ہے۔ کون ہو سکتا ہے؟ کالونی کی مسز تیسچر آئیں گی اور شروع کر
دیں گی اپنے آہنی ارادوں اور نازک فتوحات کی کہانی۔ اور آخر میں کہیں گی آج کی نیوز سنائیے۔
میں گویا اخبار ہوں۔ نیوز سے مطلب ہے سنیما کا اشتہار ــــ دیکھتی ہوں ــــ آج میں ٹکا سا جواب
دے دوں گی۔

اوہ، آپ! جی، میں۔ بس پانچ منٹ کی اجازت چاہتا ہوں۔ مگر آپ کون صاحب ہیں؟
میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔ آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی۔ بہت پیاس
لگ رہی۔ آپ کچھ گھبرا رہی ہیں۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ نہ جانے میری صورت میں کیا
بات ہے۔ مجھے دیکھ کر لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ اچھا کیا جو فریج خرید لیا۔ ہائر اینڈ
پرچیز اسکیم میں لیا ہوگا۔ مڈل کلاس کے لوگ اسی طرح زندہ رہ سکتے ہیں۔ یا تو ہائر ہو جاؤ یا بک
جاؤ۔ کنزیومر سوسائٹی کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ ورنہ کیا زمانہ تھا نانی دادی کا۔ صراحی اور گھڑے سے
کام چل جاتا تھا۔ یہ جینے کا بڑا گھسا پٹا تصور ہے۔ سو تو ہے۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں ٹھیک کہتی
ہوں یا نہیں۔ یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟ پیچھا؟
میں اور پیچھا؟ کچھ سمجھا نہیں۔

کتنا نروس آدمی ہے۔ گردن پر، پیشانی پر پسینہ۔ کم بخت اپنی ٹائی ہی ڈھیلی کر لیتا۔ جوکر کہیں کا۔
ویسے ہی پتلے ہونٹ ہیں۔ اوپر سے ان کو دبا لیتا ہے۔ ایک لکیر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں کہتی ہوں
آپ اپنی ٹائی ڈھیلی کر لیجیے۔ اوہ، جی ہاں۔ واقعی گلا میرا گھٹ رہا ہے۔ آپ کتنی سنسی ٹیو ہیں۔ گلا میرا
گھٹے اور گھٹن آپ کو ہو۔ اسے کہتے ہیں دوسروں کا دکھ بٹانا۔ جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو کامن
سنس کی بات ہے۔ وہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ واقعی کامن سنس بھی کیا چیز ہے۔ ہے تو ٹھیک ہے
اور جو نہ ہوتی تو ــــ تو کیا ہوتا۔ جیسے آپ بغیر سینگ کے جی لیتے ہیں، ویسے ہی بغیر کامن سنس کے
بھی جی لیتے۔ فرق کیا پڑتا ہے۔

اس کا ارادہ ٹلنے کا نہیں معلوم ہوتا۔ پانچ منٹ کو کہا تھا اس نے۔ سامنے والی بالکنی پر
کوئی نیوز سن رہا ہے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ اس کو واپس جانا چاہیے۔ اس کی گردن کی ہڈی کتنی ابھر
آئی ہے۔ ٹائی ڈھیلی کرنے کی وجہ سے اتنا تو ہوا کہ اس کی آنکھیں ابلی نہیں پڑ رہی ہیں لیکن گردن کی

رگیں اس کی آستینوں سے گزرتی ہوئی ہاتھوں پر پہنچ کر پھیل گئی ہیں۔ اور میں دیکھ سکتی ہوں اس کے روئیں بھرے مساموں سے پسینہ رس رہا ہے۔ بار بار جانے کیوں اس کے دانت بج رہے ہیں بھلا یہ کوئی دانت بجنے کا موسم ہے۔ اف، یہ ٹانگیں ہلانے والے مرد۔ بس یہ میں نہیں جھیل سکتی۔ یہ ٹانگیں ہلانے والے مرد! اب اس کو جانا چاہئے۔ یوں ہی کب سے جما ہوا ہے۔ سوچتا ہوگا اس طرح گاڑھی چھن جائے تو کتنا مزا آئے۔ اس چرغے کو کیا معلوم جینا جوکھم ہے۔ میں مزے کے لئے نہیں جیتی۔ میں کچھ پوچھ نہیں رہی ہوں مگر وہ ہانکے چلا جا رہا ہے۔ یکایک اس کی آنکھیں کتنا پھیل گئی ہیں۔ ان آنکھوں میں ذرا بھی تھکن نہیں ہے۔ اب میں زندگی کا پورا لینڈ اسکیپ دیکھ سکتی ہوں۔ اگر میں ان آنکھوں کو پینٹ کروں تو ایک چٹیل میدان دکھائی دے گا۔ اس کے آگے گھنا جنگل جہاں الاؤ جل رہے ہیں۔ دور۔ اور دوری جس کو اندھیرا پی رہا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ کا خیال غلط ہے کہ میں نے آپ کو پہلی بار بس میں دیکھا تھا۔ جی نہیں۔ ایسا تھا کہ اس دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میری چھتری تیز ہوا میں بار بار پھول کر الٹی ہو جاتی تھی اور اس کی کمانیاں مکڑے کی ٹانگوں کی طرح کانپنے لگتی تھیں۔ میری عینک پر پھواریں پڑ رہی تھیں اور میری نگاہیں دھند میں کھو گئی تھیں۔ میں آدھے سے زیادہ بھیگا ہوا تھا۔ آپ نہیں جانتیں میں پانی سے کتنا ڈرتا ہوں۔ تب بھی میں ڈر رہا تھا۔ جی نہیں مجھے ہائڈروفوبیا نہیں ہے۔ نہیں مجھے کتے نے نہیں کاٹا۔ نہیں میں نے کبھی نہیں کاٹا ہے۔ میری بات چیت کا انداز ایسا ہے کہ لوگوں کو بعض مرتبہ ایسا دھوکا ہوتا ہے۔ مگر آپ جانتی ہیں دھوکا دھوکا ہے۔ آپ اس وقت جس طرح منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکرا رہی ہیں۔ اس وقت بھی آپ اسی طرح لفٹ کے سامنے کیوں کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ میں سرکس کا جوکر ہوں۔ اور مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میرا جی چاہا میں کیو توڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں اور آپ کے کان میں کوئی ایسی بات کہوں کہ آپ کا منہ سرخ ہو جائے۔ لیکن اسی وقت لفٹ کا منہ کھلا اور آپ کو کھا گیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میں غلط بلڈنگ میں گھس گیا ہوں۔ میرے دفتر کی بلڈنگ دو بلڈنگ پرے تھی۔ میں جب اپنے دفتر واپس گیا تو میری چھتری کو ہوا نے نوچ کر ایک عجیب قسم کا گھونسلہ بنا دیا تھا جس میں چڑیاں نہیں رہ سکتی تھیں۔ میں بار بار سگریٹ جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن تیلی سیلی ہوئی تھی۔ سالی نے کسی طرح جل کے نہ دی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اور وہ ہنس رہا ہے۔ وہ؟ وہی جو میرے پاس والی میز پر ٹانگیں رکھ کر اخبار پڑھتا ہے۔ سیاسی آدمی ہے۔ سیاسی آدمی خطرناک ہوتے ہیں۔ خطرناک؟ ہاں۔ کیوں؟ کیوں کہ وہ رومانٹک

ہوتے ہیں۔ رومانٹک ہونے میں خطرناک کیا ہے ـــــ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہی کہ جو ہے اس کی طرف سے آنکھ بند کرلیں گے اور جو نہیں ہے اس کے لیے تصویر بناتے رہیں گے GOOD FOR NOTHING میرے ہاتھ اب بھی کانپ رہے ہیں اور ٹانگیں بھی۔ جی ہاں ٹانگیں بھی۔ تو ہوا یہ کہ شام تک میری میز پر فائلوں کا ستون سا بن گیا۔ میں بار بار گھڑی دیکھتا رہا اور وقت سے بہت پہلے اپنی بلڈنگ سے باہر آگیا اور آپ کی بلڈنگ کے پاس والے لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ سیاسی آدمی کی آواز اب بھی میرا پیچھا کر رہی تھی: "جانتا ہوں کہاں جا رہا ہے ـــــ ایڈیٹ!" آپ نکلیں تو آپ کے آگے آگے دفتر میں کام کرنے والوں کی پوری بھیڑ تھی۔ آپ نے لیمپ پوسٹ کو نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ شاید مجھے بھی لیمپ پوسٹ سمجھی ہوں گی۔ میں نے دیکھ لیا کہ آپ کی بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ اتنی بڑی بڑی آنکھیں کہ دلوں کے بڑے بڑے شہر ڈوب جائیں اور کوئی سانس نہ لے۔ جی نہیں میں رومانٹک باتیں نہیں کرتا۔ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ میرا اتر ہے کھڑا کھیل فرخ آبادی۔ آپ آگے آگے چل رہی تھیں اور میں پیچھے پیچھے۔ تھوڑی دور رہا کہ آپ نے آئس کریم خریدی اور کیو میں کھڑی ہو گئیں۔ تب میں نے دیکھا کہ آپ کا منہ چھوٹا ہے، بہت چھوٹا اور جب آپ آئس کریم کے لئے منہ کھولتی ہیں تو آپ کے ہونٹ نکیلے ہو جاتے ہیں۔ میں دیر تک آپ کو واچ کرتا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ آئس کریم ختم ہو گئی اور بس آگئی اور میں کیو میں اکیلا رہ گیا۔ نہیں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر ایسا ہوا ہے۔ آخر میں کیو میں اکیلا رہ جاتا ہوں۔ پسینہ پونچھنے کے بہانے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں سب سمجھتا ہوں۔

میں بھی سب سمجھتی ہوں۔ کافی بھی ہو گئی۔ کولڈ ڈرنک سے بھی نپٹ لئے۔ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہو گئیں۔ کتنے بھی بھونک بھونک کر سو گئے۔ لیکن ـــــ

اچھا یہ بتایئے اب واپس جانے کے لئے بس مل سکتی ہے؟ نہیں دیر بہت ہو گئی۔ کوئی اسکوٹر یا ٹیکسی؟ نہیں یہاں کوئی ٹیکسی اسٹینڈ نہیں ہے۔ اسکوٹر اتنی رات گئے بھاگتی ہوئی مل جائے تو بات دوسری ہے ورنہ ـــــ سمجھ گیا سمجھ گیا۔ صاحب اس شہر میں ٹرانسپورٹ کا بڑا پرابلم ہے۔ رات کا سفر مائی گاڈ! آخر آپ نے اتنا دور، ویرانے میں فلیٹ کیوں لیا ہے۔ ایک کمرہ ہی تو ہے۔ کہیں بھی مل سکتا ہے شہر سے قریب۔ نہیں مجھے شہر سے دوری اچھی لگتی ہے۔ اجنبیوں کی بھیڑ میں جینا، یہ بھی کوئی جینا ہے۔ ہاں یہاں فلیٹ کا کرایہ کم ہو گا۔ سوال کرائے کا اتنا نہیں جتنا دوری کا ہے۔ آتے جاتے کافی وقت کٹ جاتا ہے۔ دفتر میں فائلوں پر نوٹ دینے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ لیکن آپ اپنا

اکیلا پن کیسے دور کرتی ہیں ۔ میں اکیلی تو نہیں ہوں ۔ کہیں بھی ہوں وقت میرے ساتھ ہوتا ہے ۔ اور پھر اتنی ساری کتابیں ۔ ہاں آپ کے یہاں کتابوں کا بڑا زور ہے ۔ کیا کتابوں سے زندگی کا سناٹا دور ہو جاتا ہے ۔ ہو جاتا ہو گا ۔ ضرور ہو جاتا ہو گا ۔ دیکھئے پھر آپ ٹانگیں ہلانے لگے ۔ کیا آپ نے یہ ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں ۔ نہیں ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جو میں پڑھ نہ سکی ۔ کچھ کتابیں بور کرتی ہیں لوگوں کی طرح ۔ کچھ منہ چڑاتی ہیں ۔ کچھ پرچم بن جاتی ہیں ۔ ایسی کتابیں پڑھی نہیں جاتیں ۔ آپ اپنا وقت کس طرح کاٹتے ہیں (آگئی داؤں پر!) لو اس نے ٹانگیں پھیلا دیں ۔ بے ہنگم اتنی پلپلی ٹانگیں ۔ ضرور ان ٹانگوں پر گھنے بال ہوں گے ۔ لازمی! میں اپنا وقت کاٹ لیتا ہوں ۔ بلکہ دوسروں کا بھی کاٹ دیتا ہوں ۔ وہی دفتر آنے جانے میں جس طرح آپ کاٹتی ہیں ۔ لیکن میں کتابوں کا دشمن ہوں ۔ میں نے کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی ۔ میں سگار خریدتا ہوں ۔ سگریٹ خریدتا ہوں ۔ پھر ان کتابوں میں ہوتا کیا ہے ۔ میں دوسروں کی باتیں سننا نہیں چاہتا ۔ میں خود بات کرنا چاہتا ہوں ۔ میں بات کروں اور دوسرے سنیں ۔ میں فلم بھی اسی لئے نہیں دیکھتا ۔ دوسروں کے عشق اور گھوڑ سواری سے مجھے کیا میں خود ہی عشق کرنا چاہتا ہوں اور گھوڑ سواری بھی ۔

پھر ٹانگیں ہلانے لگا ۔ الو کا پٹھا!

اف ، اس کے جبڑوں کی ہڈیاں کھال چیر کر باہر آجائیں گی ۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئی ہیں اور نتھنے پھڑک رہے ہیں ۔ مروت ایگو پر گہری چوٹ ہے ۔ بلبلا رہا ہے ۔ کھا جائے گا ۔ شاید مجھے کھانے والا کوئی پیدا نہیں ہوا ہے ۔ اگر اس کے سر کے بال نہ اڑتے اور یہ ٹانگیں نہ ہلاتا تو اس میں ایک بات پیدا ہو جاتی ۔ دانت پیس کر وہ کچھ کہہ رہا ہے ۔ شاید —— تم بہت پیاسی ہو ۔ میں دیکھ رہا ہوں وہ میرے جانے کا انتظار کر رہی ہے ۔ اور اب وقت آگیا ہے ۔ آپ دوپہر کا کھانا کہاں کھاتی ہیں ۔ اچھا وہاں ۔ وہ ریستوراں بڑا مہنگا پڑتا ہو گا ۔ کوئی خاص مہنگا نہیں پڑتا ۔ انٹرٹین مینٹ الاؤنس خاصا موٹا ہوتا ہے ۔ کاروباری باتیں بھی ہو جاتی ہیں اور لنچ بھی ۔ وقت بھی کٹ جاتا ہے ۔ آپ کی جو بات مجھے پسند ہے وہ آپ کا آزاد ہونا ۔ بالکل بے جھجک ۔ اگر آپ دو گلاس لے آئیں تو میں اپنے بریف کیس سے کام کی چیز نکال سکتا ہوں ۔ میں سپاہی کی طرح ہتھیار سے لیس رہتا ہوں لیکن اب رات بہت ہو چکی ہے ۔ یہ کوئی وقت ہے —— ویسے میں گلاس لا دیتی ہوں ۔ میں ساتھ نہیں دوں گی ۔ یہ سب کچھ کتنا عجیب ہے کسی ناول کا ایپی سوڈ! ساتھ تو آپ دیں گی ۔ کسی ناول کا ایپی سوڈ ہی تو ہے ۔

دیکھئے، دور جہاں ہوائی جہاز ایرپورٹ پر اتر رہا ہے۔ کنٹرول ٹاور کے اوپر ٹھنڈا چاند پھیکا پڑ رہا ہے۔ ہر بار جب میں گلاس اٹھاتا ہوں تو چاند ٹوٹ کر میرے گلاس میں گر جاتا ہے اور جب میں پیتا ہوں تو میرے ہونٹ زخم کی طرح جلتے ہیں۔ آئس کیوب بھی جلتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں۔ کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ آپ ان کی پروا نہ کیجئے۔ میری آنکھیں یوں ہی بھیگ جاتی ہیں۔ ستارے جھلملا رہے ہیں اور مجھے گلاس میں چھلکتے ہوئے کیوب بھی دھندلے دھندلے نظر آ رہے ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کی جو کہانی سنائی ہے اس میں عجیب خزاں کا رنگ ہے۔ ٹیلے پر کھڑا درخت اور دور دور، چاروں طرف اڑتی ہوئی شام کی دھوپ۔ ریت کی طرح۔ اور یہ صرف اس لئے کہ میں اوروں کی طرح جی نہیں سکتا۔ صرف اس لئے کہ میں اوروں کی طرح لومڑی نہیں بن سکتا۔ اچھا کہا ــــ لومڑی۔ دیکھئے آپ کی ہنسی بھی چاند کی طرح آپ کے ہونٹوں سے ٹپک کر گلاس میں گر رہی ہے۔ کیوب کا رنگ سنہرا ہو گیا ہے۔ ویسی ہی روشنی آپ کی آنکھوں میں جل رہی ہے۔

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ جی ہاں، کچھ راتیں ایسی ہوتی ہیں جو آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں ــــ اور کیسی آنکھیں!

آپ کا ہاتھ بہت ٹھنڈا ہے اور کانپ رہا ہے۔

تھوڑی دیر اور، اور کمرے میں دھوپ بھر جائے گی۔

میں تو کہتی ہوں تھوڑی دیر اور ابھی ستارے اسی طرح جھلملاتے رہیں اور میں اپنے آپ سے بھاگتی رہوں۔

ہم زندگی بھر اپنے آپ سے، بیتے وقتوں کی یادوں سے بھاگتے رہتے ہیں۔ لیکن سچ بتاؤ ہم بھاگ کر کتنی دور جا سکتے ہیں۔ آنکھوں پر سے الجھے بال ہٹاؤ اور بتاؤ۔

چھوڑو!

جاؤ!

جانے سے پہلے ایک پیالی کافی تو بلا ہی دوں۔ بچارے کو۔ عجیب آدمی ہے۔ کانچ کی طرح ٹکڑے ٹکڑے۔ جب تک جب تک پانی کھولے میں منہ تو دھو لوں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ جھریاں دکھائی نہیں دیتیں۔ پانی کتنا ٹھنڈا ہے۔ کیوں نہ فوارے کے نیچے کھڑی ہو جاؤں اور پانی کو بہنے دوں۔ ہر دھار کے ساتھ درد بہہ رہا ہے ٹوٹ ٹوٹ کر۔

لو کافی تیار ہے۔ گرم گرم خوشبو سے کمرہ بھر گیا ہے۔ تم کہاں ہو؟

موزے، جوتے، ٹائی، بریف کیس کہاں گئے؟

بس ایک خالی بوتل ــــ

اور کچھ نہیں۔ □

احمد داؤد
۳۶۱۔اے، موہن پورہ
راولپنڈی، پاکستان

دشمن دار آدمی

پل پار کر کے جب میں قبرستان کو جانے والی کچی سڑک پہ اترا تو انھیں دیکھا۔ روز کس طرح وہ دونوں سورج کی طرف منہ کئے کھڑے تھے ان میں سے ایک نے ہاتھ میں لالٹین پکڑ رکھی تھی اور دوسرا کتاب بغل میں دبائے شام کے طشت پہ پھیلتی راکھ میں ڈوب رہا تھا۔

میں نے کنکھیوں سے انھیں تاڑا اور جھاڑ کی اوٹ میں چلا گیا وہ دونوں غروب کی آخری کرن تھامے شام کے منظر میں بے حاصل دھبے کی طرح لگ رہے تھے۔

" آج اسے بھی بلا لو۔" ان میں سے ایک نے کسی تیسرے کے بارے میں سرگوشی کی۔

" راز ــــ دوسرے آدمی تک نہیں پہنچنا چاہئے۔"

" دوسرا آدمی ...... ؟" دونوں کے لبوں سے نکلی آواز دیر تک میرے گرد گونجتی رہی اور پھر شاخوں میں اٹک گئی۔

میں نے تیسرے آدمی کو ڈھونڈنے کے لئے چاروں طرف دیکھا اس لمحے ایک سیاہ بدلی سورج کے غروب پہ طلوع ہو رہی تھی۔ پل کے آخری سرے پہ جہاں لوہے کا جنگلہ ٹوٹ کر جھول رہا تھا، آک کے بوٹے، جنگلی، جھاڑ اور پھلاہی کے درختوں پہ بے شمار چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

میں روز شام سمے ان کی چہکار کے سائبان تلے سے گزر کر جاتا ہوں۔ سورج جھکتے ہی پرندے اپنے آلنوں کا رخ کرتے ہیں۔ اس وقت آسمان پر کوؤں کی ڈاریں جنوب سے ایک بے ترتیب توازن کے ساتھ پہاڑیوں کی جانب اڑتی نظر آتی ہیں...... یہ روز کا معمول ہے... مگر اس دن جب انھیں دیکھنے کے لئے درخت کی آڑ میں چھپا یہ معمول ٹوٹ گیا۔ آسمان کوؤں سے صاف تھا اور درختوں پہ چہکار کی جگہ سناٹا۔ ان کا آخری مکالمہ جو اس منظر کے ظہور سے قبل مجھ تک پہنچا تھا، میرے کان کے گرد گونجنے کے بعد جنگلی جھاڑ کی شاخوں میں الجھ گیا تھا۔

" اسے جانے دو...."

"روز ہی جاتا ہے اور خوش واپس آتا ہے۔"

میں جلدی سے آگے بڑھ کر پھیلاؤ کے کھردرے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اوپر شاخوں پہ پھیلی پور چپ کے جال میں پھنسی چڑیاں پروں میں چونچ دبائے گم سم تھیں۔

"تو شروع کرو ـــــ"

"ابھی سورج نہیں ڈوبا....."

"ڈوب چکا ہے کب کا..... یہ تو ہمارا احساس ہے جو اسے افق پہ ٹنکا دیکھ رہا ہے۔"

"تو پھر لالٹین جلاؤ۔"

ایک کہ جس نے ہاتھ میں لالٹین پکڑی ہوئی تھی۔ ماچس جلا کر باتی کو شعلے کا اسیر کیا چمنی کے چمکیلے شیشے سے روشنی کا طویل ہاتھ نکل کر ان کے سامنے دور تک پھیل گیا۔

دوسرا کہ جس نے بغل میں کتاب دبا کر رکھی تھی، زمین پر بیٹھ گیا اور اس کے صفحے الٹے۔

پہلا ـــــ دوسرا ـــــ تیسرا ـــــ پانچواں ـــــ نواں ـــــ گیارھواں ـــــ بارھواں ـــــ اٹھارہواں ـــــ ایک سو اٹھارھواں ـــــ

"کل کا سبق کہاں چھوڑا تھا؟"

"کہاں چھوڑا تھا ـــــ" ایک ہی آواز ان کے لبوں سے نکلی۔

"تمھیں پتہ ہوگا۔ تمھاری باری تھی۔"

"میں ـــــ نہیں ـــــ میں تو کھدائی کر رہا تھا ـــــ"

"تمھیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ کل تم پڑھ رہے تھے اور میں تمھاری آواز کی کدالی سے زمین۔"

"اچھا دیکھو صفحے کے اندر تنکا رکھا تھا۔"

کتاب پڑھنے والا جلدی سے ورق الٹنے لگا۔ خاموش رات کے سینے میں صفحوں کی کھڑکھڑاہٹ تالیاں بجاتی۔ ان کے گرد ناچنے لگی۔ تنکا تلاش کرتے کرتے تھک گیا تو مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ اس کے ہلتے سر کا سایہ رات کے ماتھے پر پھٹے پرچم کی طرح لہرا رہا تھا۔

"تو نے کتاب کہاں رکھی تھی؟" دوسرے نے اس کے ہلتے سر کے پرچھاویں کو اپنی مشکوک آواز سے دبوچ لیا۔

"گھر پہ۔"

"مگر کہاں؟"

"الماری میں۔"

"کسی نے کھولی تو نہیں"؟؟

"ہرگز نہیں۔ الماری کو تالا لگایا تھا۔ ویسے اگر کوئی کھولے بھی تو الٹے لکھے ہوئے لفظ نہیں پڑھ سکتا۔"

"تو پھر تنکا؟"

"پھر کیا کریں"؟؟؟

دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور شک میں ڈوب گئے۔ لالٹین کے گول شیشے سے باہر پھیلی روشنی کا فاصلہ کم ہو رہا تھا۔

"تو پھر پہلے صفحہ سے شروع کرو۔"

"پہلا صفحہ......؟

میرا مطلب ہے آخری صفحہ۔ آخری لفظ۔"

"الٹی طرف سے۔"

"ہاں۔ تو پھر شروع کرو۔"

ایک کہ جس کے ہاتھ میں کتاب تھی گوٹھ مار کے بیٹھ گیا اور آخری صفحے کا آخری لفظ گنگناتے ہوئے پیچھے کو صفحے الٹنے لگا۔ دوسرا اس کے قدموں کے پاس سے مٹھیاں بھر بھر کے مٹی پرے پھینکنے لگا۔

درخت کے اوپر شاخوں پہ گہری خاموشی کے درمیان الٹی لٹکی چڑیا اور خالی آسمان کے ستارے سورج کے غروب ہوتے ہی ایک سیاہ بدلی کی گرفت میں آگئے تھے چاروں اور پھیلے تناؤ میں میرے عقب میں پل پر وہ بھکاری آ کھڑا ہوا تھا جو ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑا ایک ہاتھ پھیلائے بھیک کا منتظر رہتا ہے اور جب فجر کی اذان رات کی سیاہ دیوار میں شگاف کرتی ہے تو وہ ہتھیلی پہ رات بھر گرتی شبنم زبان سے چاٹ کر شہر کی جانب چل دیتا ہے۔

جب سے پل پار کا علاقہ قبرستان کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ راہ گیر اس راستے سے روٹھ گئے ہیں اور دوسری طرف سے چکر لگا کر شہر جاتے ہیں اور میں جو اپنے باپ کی لاش کی حفاظت کے لئے پچھلی کئی راتوں سے جاگ رہا ہوں، اکیلا آدمی ہوں جو اس پل پہ سے گزر کر ادھر آتا ہوں۔ جب تک میرے باپ کا جسم گل نہیں جاتا مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے کہ میں ایک دشمن دار آدمی ہوں۔ میرے باپ کو ہل کا پھالہ، مگدر، مشکی گھوڑی، دو دھاری تلوار اور رنگین تنکوں کی آبائی چنگیر کے ساتھ دشمنی بھی ورا ثت میں ملی تھی۔ ہل کا

پھالے، تلوار اور چنگیز قومی عجائب گھر میں محفوظ کر لی گئی تھی۔ رنگین تنکوں کی چنگیر شہر کے ایک مہنگے شخص کی بیٹھک میں سجی ہے اور مشکی گھوڑی کو چور کھول کر لے گئے ہیں میرے حصے میں صرف باپ کی دشمنی آئی ہے جسے میں نبھا رہا ہوں مجھے خطرہ ہے کہ کہیں رات کے اندھیرے میں دشمن میرے باپ کی تازہ لاش نکال کر نہ لے جائیں یا چور راہے میں اس کی بے حرمتی نہ کریں لہٰذا جب تک پاتال کی مخلوق اس کا ماس نہیں کھا جاتی مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے روز رات کے وقت میں مٹی ہٹا کے سلوں کے جوڑ اکھاڑ کر قبر میں جھانکتا ہوں..... کل تک کیڑوں نے ماس میں سوراخ کر دیئے تھے ابھی چند دن اور لگیں گے۔

پچھلے کئی دنوں سے میں ادھر جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے وقت پل پہ بھکاری آکھڑا ہوتا ہے اور وہ دونوں بھی کہیں سے نکل کر راستے میں آجاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی کسی کو قطعاً نہیں دیکھتا بس اپنا کام کرتا ہے۔ لیکن اس روز میں انھیں دیکھنے کے لئے کہ وہ کیا کرتے ہیں، وہاں چھپ گیا۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں کہ قبر میں کیڑوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اگر میں دیر سے بھی جاتا تو دشمنوں کو اس سے فائدہ نہ پہنچتا کہ وار کرنے کا موقع نکل چکا تھا۔ لاش گل سڑ رہی تھی اور میں کئی دنوں بعد اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ طمانیت کے اس احساس سے شرابور میں تنے سے لگ کر انھیں تکنے لگا۔ ہمارے پیچھے پل اور پرے شہر کی آوازیں تنگ گلیوں، تاریک ڈیوڑھیوں میں سکڑ گئی تھیں۔

"لو اونچی کر دو۔"

کتاب پڑھنے والے نے رکے بغیر ہاتھ بڑھا کر باتی اونچی کر دی۔ دوسرا اور شدت کے ساتھ زمین کھودنے لگا۔

"روشنی کم ہے۔"

"باتیں کم کرو۔ وقت کم ہے۔"

"ابھی تو بہت سی کھدائی باقی ہے۔"

مٹی کی ڈھلوان ان کے گرد بلند ہوتی رہی۔

کتاب پڑھنے والے کے لفظوں میں پوشیدہ قوت کھدائی کرنے والے ہاتھوں میں حلول کر کے زمین کا سینہ چیرتی رہی۔ دھیرے دھیرے ان کے سائے مٹی کے بلند ہوتے ڈھیر میں غائب ہونے لگے اب صرف انسانی آواز کی سرسراہٹ تھی جو الٹے حروف کے سحر کی اسیر ہو کر سازش کی تکمیل کر رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ لالٹین کا تیل اور الٹی پڑھی جانے والی کتاب کے صفحات ختم ہو گئے۔

پل پہ کھڑے بھکاری نے اپنا رات بھر سے اٹھایا ہوا پاؤں زمین پہ رکھا تو فضا دھمک سے لرز

گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اپنی جلتی بجھتی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں درخت کے تنے سے ہٹ کر آگے بڑھا تو اس نے قہقہہ لگا کر اپنی ہتھیلی پہ بچی شبنم چاٹی اور شہر کی طرف چل دیا۔

میں نے قبرستان کی راہ میں پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ مٹی کے ڈھیر سے ایک ہیولا ابھرا جس نے ساری فضا کو اپنی ہنہناہٹ سے نوچ ڈالا۔ ہماری آبائی مشکی گھوڑی پر سوار، ہاتھ میں لالٹین، بغل میں کتاب اور گھوڑی کی دم سے بندھا لاشہ۔

چاروں طرف گرتی شمعوں کی بجلیاں آگ کے بوٹوں کو راکھ کر گئیں۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ نصف یا آخری، یہ سورج کا غروب تھا یا طلوع۔ پرندوں کا گھونسلوں کی طرف آنے کا وقت تھا یا دانے کی تلاش میں دور دیس کو جانے کی گھڑی، میں نہ جان سکا......

مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ اس رات جب میں واپس آرہا تھا تو چڑیاں دہشت سے چیخ رہی تھیں اور آسمان کوؤں سے بھرا ہوا تھا لیکن قبر خالی تھی۔ اگلی صبح میں نے باپ کی بچی کچھی وراثت بیٹے کو سونپ دی کہ یہی ہماری آبائی روایت ہے۔ ☐

امراؤ طارق — کراچی، پاکستان

فردِ جرم

اچانک منحرف گواہ عدالت میں موجود لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اول تو عدالت میں گواہ کی حیثیت سے پیش ہونا ہی کوئی بڑے فخر کی بات نہیں اور پھر عدالت میں بیان دیتے وقت اپنی سابقہ بیان سے پھر جانا بھرے بازار میں جسم سے سارے کپڑے اتار دینے کی طرح ہے۔ گواہ کے کٹہرے میں کھڑے گواہ نے جسم کے سارے کپڑے اتار دیئے تھے اور پراسی کیوٹر کی جارحانہ جرح جاری تھی۔ اپنے آپ ہی میرے دل سے عدالت گواہ اور انصاف کا احترام جاتا رہا اور میرا دم گھٹنے لگا عدالت کے اس کمرے میں جہاں انصاف کی کرسی پر جج بیٹھتا ہے، جہاں ملزم کے کٹہرے میں ملزم کھڑا ہوتا ہے۔ جہاں گواہ کے کٹہرے میں اپنا بیان دینے سے قبل حلف لیتا ہے اور جہاں فردِ جرم سنائی جاتی ہے سب کچھ اسٹیج ڈرامے کی طرح اصل کی نقل دکھائی دے رہا تھا۔

"حلف لے کر جھوٹ بولنے والا گواہ ہم میں سے ایک ہے۔"

کسی نے سرگوشی کی۔

"الم نشرح سے ان کی دونوں آنکھوں نے سرمہ پایا وہ دیکھ لیا جس کو جبرئیل نے برداشت نہ کیا۔ جس یتیم کے اللہ تعالیٰ سرمہ لگا دے وہ یکتا موتی ہدایت یافتہ بن جائے اس کا نور ذروں پر غالب ہو جائے وہ ایسے مطلوب کا طالب بن جائے۔ اس کی نظر میں بندوں کے مقامات تھے لامحالہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام شاہد رکھ دیا۔ گواہ کا آلہ زبان اور تیز نگاہ ہے کیوں کہ آپ کے رات کو بیدار رہنے والے قلب سے کوئی راز گریز نہیں کرتا"

(مولانا روم جلد ششم صفحہ ۲۷۶)

میں اس ایک بات کو گتھی کی طرح الجھا بیٹھا ہوں اور ذہن میں الجھی ہوئی ڈور کے گمشدہ سرے کیچوے کی طرح رینگنے لگتے ہیں۔ الجھی ہوئی ڈور سامنے ہے مگر سرے نظر نہیں آتے میری بینائی کمزور ہے، گتھی سلجھ نہیں پاتی عقل کی گرفت سے باہر ہے۔ میں کمزور بینائی کے باوجود اس معزز عدالت کی دیواروں

اور چھت میں لگے ہوئے جالوں کو دیکھتا ہوں جو مجھے دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں اور پھیلتے پھیلتے عدالت کے کمرے میں موجود ہر ذہن میں الجھ جاتے ہیں۔ میں ہر چہرے کو باری باری دیکھتا ہوں ہر چہرہ اپنا شناسا لگتا ہے اور گواہ کے کٹہرے میں کھڑا ایک منحرف گواہ ہے۔

میں ادھر سے نظریں ہٹا کر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے چہروں کو دیکھتا ہوں لیکن ان کی شناخت ممکن نہیں رہی۔ اس کٹہرے میں کھڑے لوگوں نے ایک دوسرے کے چہرے لہولہان کر دیئے ہیں اور اتنی خراشیں ڈال دی ہیں کہ اصل چہرہ غائب ہو گیا ہے۔ مگر میں ان کو ان دستاویزوں سے پہچان لیتا ہوں جو وہ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے یہ سب اپنی تخلیقات اپنے اعمال ناموں کی طرح ہاتھوں میں اٹھائے حشر کے میدان میں اپنی باری کے منتظر ہیں۔

منحرف گواہ اپنے زخموں کو چاٹتا ہوا عدالت سے باہر نکل گیا ہے۔ جج صاحب اپنے چیمبر میں تشریف لے گئے ہیں۔ اپنے کمرے میں مدعی نظر آتے ہیں۔

> "مدعی گواہ ہزار سر پٹخے۔ قاضی کان گواہوں کی طرف کرتا ہے۔ قاضیوں کا فیصلہ کرنے میں یہ ہی فن ہے ان کی گواہ دو روشن آنکھیں ہیں۔ گواہ کی بات اسی وجہ سے آنکھ کی قائم مقام ہے کیوں کہ اس نے بے غرض آنکھ سے حقیقت کو دیکھا ہے۔ مدعی نے دیکھا ہے لیکن غرض کے ساتھ۔ غرض دل کی آنکھ کے لئے پردہ ہو جاتی ہے۔"

(مثنوی ۲)

جج صاحب کے چیمبر میں جاتے ہی عدالت کے کمرے کا حبس ایک دم ختم ہو جاتا ہے۔ میں اس لمحے سے فائدہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور اپنے موکلوں کی وکالت کرنے آئے ہیں اور میں ان موکلوں کو دیکھتا ہوں جو سب سے پیچھے بنچوں پر بیٹھے ہیں اور میں خدا بخش پیٹے والے کو دیکھتا ہوں جس نے خاکی رنگ کا لمبا کوٹ اور کلف لگے طرے والی پگڑی پہن رکھی ہے اور میں ان اخلاقی قیدیوں کو دیکھتا ہوں جن میں سے کچھ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہیں اور کچھ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں ڈنڈا بیڑی بھی پڑی ہوئی ہے اور جنھیں ڈنڈا بیڑی اس لئے پہنائی گئی ہے کہ وہ سرکش ہیں اور جیل میں رہنے کے باوجود جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور جو ڈنڈے بیڑی کی بے آرامی کی وجہ سے اپنے گھٹنے موڑ نہیں سکتے اور ٹانگیں پھیلا کر چلتے ہیں اور میں ان سپاہیوں کو دیکھتا ہوں جو قیدیوں کی زنجیریں پکڑے ہوئے سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ پھر بیٹھ کار نظر آتا ہے جو ڈائس پر جج صاحب کے ساتھ بیٹھتا ہے اور سیدھے منہ بات نہیں کرتا اور سب

آخر میں، میں اس کرسی کو دیکھتا ہوں۔ جو عدل کا ماخذ ہے اور خالی ہے۔

عدالت کے کمرے میں فرش پر جوتوں سے مسلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے اور گرد ہر طرف نظر آتی ہے اور وہاں موجود لوگوں کے چہرے پر نمی اور ذہنوں میں جالے ہیں صرف خدا بخش پٹے والا اترایا ہوا اور تروتازہ دکھائی دیتا ہے وہ جج کے چیمبر میں بے دھڑک چلا جاتا ہے اور گزرتے ہوئے ہر بار کسی نہ کسی کو ڈانٹ دیتا ہے۔

"پاؤں کرسی سے نیچے کر کے بیٹھو"

"شور نہ کرو۔ تم کو معلوم نہیں عدالت ہے۔"

"منشی بابو کو اُدھر دے دو۔"

"صاحب ابھی چیمبر میں ہے۔"

وہ ہر شخص کو بن مانگے مشورے دیتا ہے اور بخشش مانگ کر لیتا ہے لیکن لہجہ ہمیشہ اکھڑا اکھڑا رہتا ہے۔

خدا بخش پٹے والا عدالت کی روح ہے۔

سارے چہرے پسینے سے بھیگے ہوئے ہیں اور ان پر بھوک اگی ہوئی صاف نظر آرہی ہے جس کی جڑیں ذہنوں میں ہیں یہ پیٹ سے اگنے والی بھوک سے زیادہ شدید ہے۔ پیٹ سے اگنے والی بھوک کی کونپلیں آنکھوں میں پھوٹتی ہیں مگر ذہن کی بھوک کے آکرے سارے جسم پر چیچک کے دانوں کی طرح نکلتے ہیں اور دائمی نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

ڈور ابھی تک الجھی ہوئی ہے سرا ہاتھ نہیں آیا ہے عدالت کی روح عدالت کے جسم میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے اور کلف لگا طرہ تنا ہوا ہے۔

خدا بخش نے چیمبر سے نکلتے ہی آواز لگائی۔

"جج صاحب عدالت میں آتے ہیں۔ ہوشیار"

خدا بخش پٹے والے کا اعلان عدالت کے کمرے میں حکم کی طرح سنا گیا سارے ایک جیسے چہروں نے ایک طرح سنا۔ ہاتھوں میں سگریٹ میکانکی انداز میں ایک ساتھ پیروں کے نیچے مسلے گئے اور منہ اور نتھنوں سے نکل کر منڈلانے والا دھواں ہاتھوں کے پنکھوں سے چہرے کے سامنے سے اڑایا گیا اور سب ایک ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔ پیچھے بنچ پر بیٹھے لوگوں نے عید کی نماز کی طرح سامنے والوں کی نقل کی۔

خدا بخش نے جج صاحب کا اونچی پشت والی کرسی پر بیٹھنا، حاضرین کا ایک ساتھ کھڑا ہونا اور چاروں طرف خاموشی چھا جانا پورے اطمینان سے دیکھا اور اس چوبی کٹہرے سے لگ کر کھڑا ہو گیا جس میں بیان دینے کے لئے گواہ کو لایا جاتا ہے۔

"یہ بیان کے لئے گواہ کے کٹہرے میں آنے والے گواہ کھڑے کھڑے بیان دیتے ہیں۔ خواہ بیان کتنا ہی

طویل کیوں نہ ہو۔ گواہ کو عدالت میں عزت و احترام نہیں ملتا؟ میں نے سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ گواہ ہونا کوئی بڑے فخر کی بات نہیں۔

جج صاحب نے اونچی کرسی پر بیٹھ کر نیچے بیٹھے لوگوں کو ایک نظر دیکھا اور چہرے پر اطمینان اور آسودگی کی لہر دوڑ گئی اور پھر چہرے پر سنجیدگی آ گئی جیسے کسی نیند کے ماتے نے سونے سے قبل سر سے پاؤں تک چادر تان لی ہو۔

سب خاموش تھے، چادر تنی ہوئی تھی خدا بخش پٹے والا تیز نظروں سے عدالت کا اس طرح جائزہ لے رہا تھا جیسے مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر کو تنقیدی نظروں سے آخری لکیروں کے لئے دیکھ رہا ہو۔

پیش کار نے فائل اٹھا کر جج صاحب کے روبرو رکھی اور جج صاحب کی کرسی کے ساتھ اس طرح لگ کر کھڑا ہو گیا جیسے ان کا مقرب خاص ہو پھر اس نے اس فائل سے انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا ایک کاغذ نکال کر سامنے رکھتے ہوئے فرد جرم اتنے آہستہ سے کہا کہ عدالت کے کمرے میں موجود ہر شخص تک اس کی آواز پہنچ سکے پھر اس نے کمرے میں بیٹھے لوگوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"میں ہی تو صاحب کو سب کچھ بتاتا ہوں ورنہ ان کو تو کچھ پتہ نہیں"

"ساحرہ خانم کو آواز دو" پیش کار نے جج صاحب کے بولنے سے قبل ہی خدا بخش پٹے والے کو حکم دیا اور اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عدالت کی خاموشی میں خدا بخش پٹے والے کی آواز گونجی۔

"ساحرہ خانم"

"ساحرہ خانام"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خدا بخش پٹے والا ساحرہ خانم کو بلا نہ رہا ہو بیچ رہا ہو۔

ساحرہ خانم ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے مہندی کے رنگ کے بالوں کو سر کی جنبش سے جھٹک کر اس طرح برابر کیا جیسے عدالت میں پیش آنے والے آزار کے تصور کو ذہن سے نکال کر پھینک دینا چاہتی ہو اس کے مہندی کے رنگ کے بال اس کے شانوں پر اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی ساری پر، اس کی پیشانی پر اس کے چہرے اور اس کے سینے پر اس طرح اڑ رہے تھے جیسے سارے میں مہندی رنگ اور ریشم بکھرا ہوا ہو۔ ساحرہ خانم کے اٹھتے ہی عدالت کے کمرے میں پھیلی ہوئی سنجیدگی اور چھنتی ہوئی خاموشی میں کہیں کوئی رخنہ پڑ گیا جیسے ہزاروں ابابیلیں فضا میں اڑ رہی ہوں اور ان کی آوازیں اور کہیں سے سنائی دے رہی ہوں۔ ذہنوں میں پراگندہ خیالی کی گونج سماعت کے روزنوں میں بوند بوند ٹپک گئی ساحرہ شاید سر چڑھ کر بولنے والا جادو بھی عدالت کے کمرے میں ساتھ لائی تھی یہ ہی کے عہد کا مسمریزم تھا یہ مقصد سے لگن کا اسم اعظم تھا۔ وہ جوں ہی

سر جھٹک کر ساری کا پلو سنبھال چکی جج صاحب نے انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی فردِ جرم کا ترجمہ بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

"ساحرہ خانم زوجہ صابر کلیم تم نے بغرض مشترک اپنے دیگر ساتھیوں نام و پتہ نامعلوم سے مل کر شعر و شاعری، افسانہ نگاری، مصوری اور موسیقی جیسی ناکارہ سرگرمیوں کو عامہ خلائق کی ذہنی نشو و نما اور ان کے اخلاق کے لئے مضر جانتے ہوئے عام کرتے ہیں نہ صرف بھرپور حصہ لیا بلکہ عملی طور پر غزلیں، نظمیں، اور افسانے تخلیق کئے اور ایسی مخرب اخلاق پینٹنگز بنائیں جن میں جوان عورتوں کے سر اور بازو اور گداگری کرتی ہوئی عورتوں کے پیٹ برہنہ دکھائے گئے تھے جس کے نتیجے میں عوام میں نہ صرف شعر و شاعری، افسانہ نگاری، مصوری اور موسیقی کا ذوق عام ہوا بلکہ نئی نسل جو کرکٹ اور ہاکی جیسے صحت مند اور قوالی جیسی روح پرور سرگرمیوں میں زائد وقت کے علاوہ کالج اور اسکول کا وقت بھی صرف کیا کرتی تھی کھیلوں اور قوالیوں کو تضیع اوقات سمجھنے لگی اور اسٹیڈیم میں داخلے کے ٹکٹ سرکاری عمال سے فروخت کرانے پڑے اور قوالیوں کے کیسٹ کی فروخت ختم ہوگئی حتیٰ کہ کیسٹ سازی کی صنعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور صنعت بحران میں پھنس گئی چنانچہ تمہارا یہ فعل تعزیرات کی ناگفتنی دفعات کی حد کو پہنچتا ہے اور اس عدالت کو اس مقدمہ کی سماعت کا اختیار ہے۔ جواب دو کہ کیا تم اقبالِ جرم کرتی ہو یا تمہیں اپنے جرم سے انکار ہے۔"

ساحرہ خانم خالی خالی نظروں سے دیوار کو دیکھنے لگی خدابخش پٹے والے نے ساحرہ خانم کی خاموشی کو گستاخی پر محمول کیا اور پینترا بدلنے کے انداز میں اپنے پیروں کو ایک دو مرتبہ آگے پیچھے حرکت دی۔ پیش کار نے خاموشی کے ان لمحوں میں باری باری کبھی ساحرہ خانم اور کبھی جج صاحب کو دیکھ کر ناگواری کا اظہار کیا۔ عدالت کے کمرے میں موجود ہر چہرے نے اس اجنبی چہرے کو غور سے دیکھا۔

جب خاموشی زیادہ طویل ہوگئی تو جج صاحب نے پھر ساحرہ خانم کو مخاطب کیا اب کے ان کا لہجہ سخت تھا۔

"ACCUSED SAHERA KHANAM ! DO YOU HEAR ?

DO YOU UNDERSTAND ?

DO YOU PLEAD GUILTY OR NOT GUILTY ?

ساحرہ نے جواب تک فردِ جرم کی نوعیت کو سمجھنے اور عدالت کے ماحول سے اپنے آپ کو مانوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی اچانک انتہائی دلیری سے گردن اکڑائی اور سر کی جنبش سے بکھرے ہوئے بالوں کو منظم کرکے آواز کی سمت دیکھا۔

"جناب والا۔ میں نے پہلی بار ہی آپ کا سوال سمجھ لیا تھا اور میں نے انصاف کو اور آپ کو اپنے آپ سے

بہت قریب محسوس کیا تھا۔ بہت قریب۔ بہت ہی قریب۔ اپنی مٹی سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی یگانہ خوشبو کی طرح ـــــــ اور جناب والا میں غور کر رہی تھی کہ میں آپ کو کس لہجہ میں جواب دوں کیوں کہ میرا مسئلہ اقبال یا انکار جرم تو ہے ہی نہیں لیکن شاید یہ معزز عدالت بھی ہمارے سارے قریوں ساری گلیوں، گاؤں اور شہروں کی طرح ایک اَن جانی عجلت میں ہے اور سوچنے اور غور کرنے کی مہلت دینے کے حق میں نہیں ۔ جناب والا! میں آداب عدالت سے پوری طرح واقف نہیں اور نہیں جانتی کہ میرا کوئی جملہ کب توہین عدالت کا موجب بن جائے گا اور میری عدالت کے آداب سے ناواقفیت معذرت نہیں بن سکتی اور میں بھی جانتی ہوں کہ عدالت کا وقار ہم نے کانچ کے اس کھلونے کی طرح نازک اور غیر یقینی بنا دیا ہے جو ایک شریر اور ضدی بچے کے ہاتھ میں ہے اس لئے جناب والا میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے قبل پوری طرح غور کر لینا چاہتی تھی ۔ جب پہلی بار آپ نے میری اور اپنی زبان میں مجھ سے سوال کیا تھا اس وقت میں نے اس کمرے کو، ان کٹہروں کو، اس اونچے ڈائس کو، ڈائس پر رکھی ہوئی پرشکوہ کرسی کو اور اس عدالت میں موجود ہر شخص کو اپنا سمجھا تھا میں نے سمجھا تھا کہ یہ میرے ہیں اور میں نے جناب والا آپ کو اور انصاف کو بہت قریب محسوس کیا تھا لیکن جب آپ نے وہی سوال بدیسی زبان میں اور غیروں کے لہجے میں دہرایا تو وہ سب کچھ جو مجھے اپنا محسوس ہو رہا تھا اجنبی ہو گیا آپ کا چہرہ اجنبی محسوس ہونے لگا، یقین متوہم ہو گیا اور آپ کے اور میرے درمیان فاصلہ اتنا طویل ہو گیا کہ اس کمرے میں ڈائس پر رکھی ہوئی یہ کرسی ساتویں آسمان جیسی بلندی پر نظر آنے لگی ۔"

"جناب والا ملزمہ اس معزز عدالت کے اس قیمتی وقت کا لحاظ کیے بغیر عدالت میں شاعری اور افسانے کی زبان بول رہی ہے ۔" بیرسٹر اسی کیوٹر نے اعتراض کیا ۔

"لائق وکیل استغاثہ کا اعتراض درست سہی ۔" جج صاحب نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا ۔ "مگر میرے خیال میں ملزمہ کا صرف اقبال جرم یا انکار جرم کافی نہیں ہے ۔ فوجداری مقدمات میں ملزم کو اپنی بات براہ راست کہنے کا موقعہ نہ ملنے کے برابر ملتا ہے ۔ لیکن کیا ہمیں قانون جیسا کہ ہے پر تکیہ کر لینا چاہئے یا اس بات پر بھی توجہ دینی چاہئے کہ قانون جیسا کہ ہونا چاہئے ۔ جب ہم قانون جیسا کہ اسے ہونا چاہئے پر غور کرتے ہیں تو دوسرے لفظوں میں ہم قانون سازی بھی کر رہے ہوتے ہیں اور ایسے قانون کو ججوں کے بنائے ہوئے قانون کہا جاتا ہے اس لئے میں ملزمہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے سنوں گا ۔"

"جی ۔" جج صاحب نے ساحرہ خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

"اور مجھے یوں لگا جیسے ہمارے درمیان ان دیکھی دیوار حائل ہو گئی ہے اور ہم اس دیوار سے سر ٹکرا رہے ہیں اور آس پاس گونگے اور بہرے کھڑے ہمارا منہ چڑا رہے ہیں ۔"

ساحرہ کی گرفت کٹہرے پر اس قدر مضبوط تھی کہ اس کی انگلیاں زرد ہو گئی تھیں۔

"میں آج خود سے ہم کلام ہوں۔ میرے اِرد گرد جانے پہچانے گرہو لہان اور اجنبی چہرے ہیں اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے چاروں طرف تازہ گر جھلسے ہوئے پھول ہیں اور بے مجھی خواہشوں سے آلودہ خوشبوئیں ہیں اور میں ان لہولہان چہروں میں گھری، جھلسے پھولوں سے دبی اور بے مجھی خواہش خوشبوؤں میں جس مٹی سے اُگی ہوں اسی میں نمو پا رہی ہوں اور یہی میرا مقدر ہے اور میں جو کچھ کہتی ہوں اس پر سماعتوں کے دریچے بند ہیں۔ اِن دریچوں پر پوری قوت سے دستک دے کر لوٹ آئی ہوں میرے اِرد گرد مصلحتوں کی اتنی بلند دیواریں ہیں کہ میری آواز ان پر سفر کرتے کرتے مر جاتی ہے پھر میں دیواروں سے بات کرتی ہوں وہ پتھر ہو جاتی ہیں۔

"پتھر دیواریں مجھے پیس رہی ہیں۔"

"سماعتیں مفلوج ہیں۔"

"گواہ بِک جاتے ہیں۔"

"انصاف وقت کے سینے میں تیر کی طرح ترازو ہے۔"

اس تنہائی کے صحرا میں کوئی مجھ سے پوچھتا ہے تم کون ہو۔ میں سوال صلیب کی طرح اپنے کاندھوں پر اٹھا کر آگے بڑھتی ہوں آوازیں تند بگولوں کی طرح میرا تعاقب کرتی ہیں۔ پیاس میرے خشک ہونٹوں کو بوسہ دیتی ہے کانٹے میرے تلوؤں کے زخموں کو تھپکیاں دے کر سلا دیتے ہیں اور صحرا کا تپتا ہوا سورج میرے سر پر سائے کا سائبان بنا دیتا ہے میں اپنے تعاقب میں آنے والی آوازوں کو دیکھتی ہوں اور پتھر ہو جاتی ہوں اور میں شہزادے کا انتظار شروع کر دیتی ہوں اور میرے انتظار کا پہلا دن مر جاتا ہے اور شہزادہ میرے پتھر جسم پر پانی کے چند چھینٹے مارنے نہیں آیا تا۔ اور جناب والا میرا مقدمہ آپ پر ہے آپ نے جس فریم ورک میں انصاف کے تقاضے پورے کئے ہیں اس میں حلف لے کر گواہ نے دروغ گوئی کی ہے اور آپ نے اس جھوٹ کو سچ کی طرح قبول کیا ہے۔ اور آپ نے مدعی کی طرف کان لگائے اور مدعی کی غرض کے ساتھ دیکھے ہوئے جھوٹ کو قبول کیا اور آپ نے قانون جیسا کہ ہے کے نظریے کی بنیاد پر فیصلہ کا پہلا حرف لکھا اور آپ نے ایک بے گناہ شخص کو سزا نہ ہونے پائے خواہ دس گنہگار سزا سے بچ جائیں کے نظریے کے تحت دس گناہ گاروں کو آزاد کیا اور اب میرا مقدمہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو کتنے بار مجبور محسوس کیا اور اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف فیصلہ دیا۔ میں آپ کے سامنے اس لئے لائی گئی ہوں کہ آپ مجھ پر اپنی پسند کا انصاف مسلط کریں خواہ میں چاہوں یا نہ چاہوں تو پھر آپ انصاف کریں۔ انصاف جو علیم ہو انصاف جو بصیر ہو ——— اور میں جرم سے انکار کرتی ہوں ———"

جج صاحب نے فائل بند کر دی۔ اشارے سے ساحرہ خانم کو خاموش ہونے کے لئے کہا۔

"پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے زمین اپنے رب سے نور سے چمکنے لگے گی کتاب اعمال لاکر رکھ دی جائے گی۔ لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔" (ت ق جلد چار ص ۳۸۳)

ساحرہ خانم خاموش ہو گئی۔

جج صاحب گردن جھکا کر تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ جیسے منتظر ہوں کہ صور پھونکا جانے والا ہے۔ پھر انھوں نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور ان کا سر کرسی کی پشت پر لڑھک گیا۔ ان کا چہرہ زرد تھا آواز صرف ساحرہ خانم تک پہنچ رہی تھی۔

"میں اب مقدمے کی سماعت کا مجاز نہیں ہوں اور آئندہ بھی کسی مقدمے کی سماعت نہ کروں گا۔ اس لئے کہ میں خود اپنے ضمیر کی عدالت میں ہوں اور فرد جرم سن رہا ہوں۔"

اور صبح کے ستارے جیسا ایک آنسو آنکھ سے ٹوٹ کر گر گیا۔ □

دیویندر اسر
۳/۱۵۴ بی، جنگ پوری، نئی دہلی

نیا اردو افسانہ — جبر بنام اختیار

پنچ تنتر، چندر کانتا سنتتی، قصہ گل بکاؤلی، الف لیلہ، داستانِ امیر حمزہ، فسانۂ آزاد طلسم ہوشربا۔

"... پریم چند اردو افسانے کے موجد تھے۔"

"... اردو (افسانے) کو سب سے زیادہ نقصان پریم چند نے پہنچایا ہے۔" (قمر احسن)

اور پریم چند نے اردو کو "کفن" جیسا افسانہ دیا جسے ترقی پسند بھی تسلیم کرتے ہیں اور جدیدیت پرست بھی اور آٹھویں دہائی کے نئے افسانہ نگار بھی۔

۱۹۳۶ء میں پریم چند کی وفات ہوئی۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا جنم ہوا۔

جہاں "کفن" ختم ہوا وہاں سے "انگارے" پیدا ہوئے۔

تخریب، تعمیر، تخریب، یاس، امید، پروٹسٹ، انقلاب۔

"کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب"

ادب برائے زندگی، ادب برائے انقلاب، ادب اور بغاوت۔

آئیڈیولوجی، پرولتاری ادب، پارٹی ادب زندہ باد، غیر پارٹی ادب مردہ باد، کمٹ منٹ، سماجی حقیقت نگاری آدرش حقیقت نگاری نہیں۔

اسٹالن اعظم، لال سلام، سرخ سویرا۔

پرجیسس، تودیں کانگریس (سی۔پی۔ ایس۔یو)، خروشچیت، پولینڈ، ہنگری، زیکوسلواکیہ۔

ازالۂ سحر، پتھر کے صنم، خدا جو نا کام رہا۔

سب اقدار کا بھرم کھل چکا ہے، اب کوئی نصب العین نہیں۔ انقلاب کا نعرہ بے سود ہے۔

"جسم کی بے سود تڑپ۔ دل کی مایوس پکار۔"

انٹی ہیرو

ہم سب اجنبی ہیں، جلاوطن، تنہا، بے یارومددگار، دہشت زدہ

"خدا مرگیا۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں"۔ (نطشے)

"انسان مرگیا۔ ہم سب اس کے گواہ ہیں"۔ (بریخت)

زندگی بے معنی ہے، لغو ہے، ابسرڈ۔

"اب ہمارا سفر داخلی ہونا چاہئے اور ہماری ساری تلاش روحانی ہوسکتی ہے"۔

"میں ایک ایسی کال کوٹھری میں بند دیواروں سے ٹکراتا ہوں جس کے نہ دروازے ہیں اور نہ کھڑکیاں"۔

(کافکا ۱۹۱۲ء)۔

گم شدہ فرد کی تلاش، ذات کا کرائسیس۔

خودکشی، خودسپردگی، شکست۔

مستند زندگی کی تلاش۔

"میں کون ہوں! ہم کدھر جارہے ہیں"۔

کون دے گا اس کا جواب۔

گھیسو یا رامو یا کالو بھنگی۔ سوگندھی یا سکینہ، سہائے یا بابو گوپی ناتھ۔

"منٹو جدیدیت پسند ادیب تھا"۔

نئی دریافت "پھندنے"۔

نئے افسانے کی ابتدا "پھندنے" سے ہوئی ہے۔" یہ ایک نیا لسانی تجربہ ہے"۔ (افتخار جالب)

"اس میں کسی نئے لسانی تجربے کی تلاش بے معنی ہوگی"۔ (کمار پاشی)

منٹو بت شکن تھا روایت شکن نہیں۔

۱۹۵۳ء بدریی کانگرس، ترقی پسند تحریک کا زوال۔

۱۹۵۵ء منٹو کی وفات۔

۱۹۵۵ء جدید افسانے کی ابتدا۔

ویت نام، چی گوارا ——

۱۹۶۸ء فرانس کے طلبا کی بغاوت۔ کارنل یونیورسٹی پر کالے طلبا کا قبضہ۔ ڈیموکریٹک کانگرس میں ویت نام کی جنگ کے خلاف مظاہریوں پر پولیس کا تشدد، اور عدم تشدد کے حامی مارٹن لوتھر کنگ کا قتل۔

نئے افسانے کی آمد آمد۔

نہ پیغمبر، نہ کلیسا، نہ فرمان۔

نہ منشور، نہ نعرہ بس "کوّوں سے ڈھکا آسمان"۔

"... آسمان ان گنت سیاہ بھجنگ کوّوں سے ڈھکا تھا اور تیز سرد ہوا ایامیوری چاقو کی طرح ہڈیوں میں اترتی ہے۔ اطراف کی بلند عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور وہ دہرا رہے تھے، گلابی صبح، ہنستا بچہ، شرماتی لڑکی، پیونس کے مکان مٹھی بھر چاول، مچھلی کا شوربہ، کافی کا پیالہ، روئی کی رلائی ...... اس کے بعد کارپوریشن کی گاڑی آئی اور سڑک کے موڑ پر رک گئی۔ وہاں چند لوگ برہنہ اکڑے پڑے تھے۔ کچھ لوگ گاڑی سے اترے۔ آدمیوں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور گاڑی چل دی۔"

(انور خاں "کوّوں سے ڈھکا آسمان)

"... انسان ہونے کے کیا معنی ہیں۔ ایک شہر میں، ایک صدی میں، ایک تغیر میں، ایک ہجوم میں، جسے سائنس نے شے میں بدل دیا ہے، ایک منظم قوت کے تحت، جس پر کئی طرح کی پابندیاں ہیں ایک ایسی صورتِ حال میں جو میکانکی عمل سے وجود میں آئی ہے۔ ایک ایسے سماج میں جس میں اخوت نہیں اور فرد کی حیثیت ختم ہو رہی ہے۔

(سال بیلو "ہگر زدت")

جدلیاتی مادیت، جنس، لاشعور اور تحلیل نفسی اور وجودیت کے دائرے سے باہر اور پرے نئے افسانے نے نہ صرف اپنے آپ کو تلاش کیا ہے بلکہ اپنے خالق کو بھی اور اپنے قاری کو بھی۔

اور اس تلاش کے عمل میں کچھ کہانی پن' کی تلاش میں دادی اماں کی گود میں جا بیٹھے اور کچھ الاؤ کے گرد جمع ہو گئے۔ قصے، کہانیاں، داستانیں ...

اور کچھ جبر سے نبرد آزما ہونے کے لئے اختیار اور احتجاج کی راہ پر گامزن ہو گئے۔

آٹھویں دہائی کا افسانہ جبر و اختیار کی ایک کش مکش کا افسانہ ہے۔

جدید افسانے کا کردار سی سی فس کیوں ہے۔ پرومتھیس کیوں نہیں۔

آٹھویں دہائی کے افسانے نے اپنے پرومتھیس کی تلاش کی۔

"... آگ کا کیا ہے۔ پھر کہیں مل جائے گی اور نہ بھی ملے گی تو دو آدمیوں کی یک جائی خود ایک آگ سے کم ہے کیا؟ آنا کچھ سوچ کر میں نے اپنے اندر تہہ بہ تہہ رکھی ہوئی آگ

نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ آگ پاکر وہ بے حد خوش ہوا اور میرا بے حد شکریہ ادا کرنے لگا۔
میں نے اس سے کہا کہ وہ تمام کام چھوڑ کر پہلے وہ کام کرے جو اسے کرنا چاہئے۔ چنانچہ وہ
آگ لے کر اپنی کشتی کے پاس گیا۔ لیکن بجائے کشتی جلانے کے وہ اس میں سوار ہو گیا اور چپو
چلاتا ہوا دور ہٹ کر مجھ سے بولا کہ بھیا معاف کرنا، اتنی سی آگ کے لئے میں نے کہاں
کہاں نہیں سر پھوڑا، وہ آگ تم سے ملی۔ اگرچہ تم اسے دھوکا کہوگے لیکن میرا کام بن گیا۔
اب دیکھتا ہوں وہ کمبخت دریا میرا کیا بگاڑ لیتا ہے؟

(عبدالصمد۔ "جانی انجانی راہوں کے مسافر")

تو ہاں جب اس سوال کے جواب کی تلاش کی گئی کہ جدید افسانے کا کردار سسی فس (انٹی ہیرو) کیوں ہے پرومیتھیس کیوں نہیں تو معلوم ہوا کہ ہم نے وجودیت پرستی کے خلاف ایک پہلو کو ہی مقدم سمجھا۔ لغویت کے پہلو کو اور اس کے آزادیٔ عمل اور انقلابی پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ (دنیا کے زیادہ تر آدمی اپنی آزادی سے فرار کرتے ہیں اور نقلی وجود میں پناہ لے کر تسکین محسوس کرتے ہیں۔ اپنی آگہی سے پیدا فکر یا خوف سے بھاگنے کی ذہنیت خود فریبی ہے۔" سارتر) اور پھر ہم نے فرائیڈ کے ابتدائی نظریات جنس اور لاشعور پر ہی اپنے ادب کی بنیاد رکھی اور اس کے سیاسی اور سماجی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔ (بار بار ہم اس حقیقت پر زور دے سکتے ہیں کہ انسانی شعور اس کی فطری جبلتوں کے مقابلے کمزور ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم صحیح ہوں گے کہ اس کمزوری میں ایک خصوصیت ہے۔ شعور کی آواز نرم ہے لیکن سنائی دینے سے پہلے بند نہیں ہوتی۔ فرائیڈ) اس طرح مارکس کے ان نظریات سے خائف ہو گئے جن میں آمریت اور جبریت پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن جدلیاتی عمل کو نظر انداز کر دیا۔

جس طرح ترقی پسندی کے خلاف جدیدیت ایک تخلیقی ردِ عمل کی صورت میں رونما ہوئی اسی طرح جدیدیت کا بھی تنقیدی جائزہ لیا جانے لگا۔ ترقی پسندوں کی نظریاتی وابستگی اب نئے افسانے سے قریب قریب غائب ہو چکی ہے لیکن احتجاج کا عنصر اور سماجی دباؤ کے پس منظر میں فرد کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش ایک زیادہ گہری اور وسیع سطح پر جاری ہے۔ جہاں تک جدیدیت کا سوال ہے نئے افسانہ نگار اس کے سماجی تجزیئے کو بڑی حد تک تسلیم کرتے ہیں لیکن اس سے ماخوذ فلسفے کو زیادہ مستند نہیں سمجھتے۔ جدیدیت نے فرد کو مرکزی حیثیت دی لیکن اس میں ذاتی احساس اور تجربے کے سماجی عوامل کا بہت کم دخل تھا۔ اس لئے اس کا اسلوب اور بیان اکثر تجریدی / علامتی / تمثیلی اور اساطیری رہا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں نے علامتی یا تجریدی اسلوب کو ایک خارجی اسلوب نہ سمجھ کر تمثیلات اور علامات کو افسانے کے تانے بانے میں تخلیقی حقیقت کے پس منظر میں بُننے کی کوشش کی ہے۔

"تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔"

"تم ہی بتاؤ تم سب کہاں جانا چاہتے ہو؟" اس نے وہی سوال ان سے کر دیا۔

"ہم کہاں جانا چاہتے ہیں... ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

" وہ سب ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے۔

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے قہقہہ لگایا ہا۔ہا۔ہا۔

" جب تمھیں خود ہی نہیں معلوم اور تم سبھوں کو نہیں معلوم کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو

تو یہ سوال تم نے مجھ سے کیوں کیا؟ اپنے آپ سے ہی پوچھ لیتے۔"

"تم مہان ہو۔" وہ سب بولے

" اس لئے کہ میں چوراہے پر لٹک رہا ہوں۔"

(انور قمر۔ "چوراہے پر ٹنگا آدمی")

" سماجی فرد کی انا کو جن مختلف نہجوں پر چیلنجز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور جن اذیت ناک نا آہنگیوں کے مابین ان کی بصیرت صدموں سے دوچار ہے اس نسل نے اپنے فن میں اسی کو موضوع بنایا۔ نظریاتی وابستگی سے ہی زندگی کا ایک خاص شعور ایک خاص فہم، ایک خاص نقطۂ نظر ان کی پہچان میں ضرور شامل ہے۔"

(عتیق اللہ۔ "آٹھویں دہائی میں اردو افسانے کا کردار")

نئے افسانے میں بے حد تنوع ہے اور زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی ادیب کی انفرادی صلاحیت میں رس بس کر سامنے آئی ہے۔

" نیا اردو افسانہ اپنے پیش رو جدید علامتی / استعاراتی / تمثیلی افسانے کے مختلف رجحانات و رویوں کی توسیعی شکل ہے۔ پرانے اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی ضابطوں کی نفی کرتا ہے اور موجودہ صورتحال میں نئے ضوابط کی تشکیل کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ فنی سطح پر کہیں کہیں یہ روایتی ڈھانچے سے دور اپنا ایک الگ سٹرکچر بناتا ہوا بھی نظر آتا ہے اور اس کے سنجیدہ مطالعے سے معنی کی مختلف سطحوں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

(کمار پاشی۔ "نیا اردو افسانہ" سطور۔ مارچ، اپریل، مئی ۱۹۸۰ء)

آج کے افسانے میں جدید افسانے کے مقابلے میں انسان کی مکمل ذات کی اکائی کو بحال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور سماجی زندگی کی تہہ در تہہ حقیقت کے چیلنج کو تسلیم کرنے کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ نیا افسانہ

انسانی زندگی کے تناؤ اور کشمکش اور نیوراتی پہلو کی ہی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف جاری جدوجہد کو بھی پیش کرتا ہے۔ نیا افسانہ زندگی سے فرار کے بجائے زندگی کی جانب واپس قدم ہے اور زندگی کو جینے کے قابل بنانے کے لئے خود وابستگی کا ثبوت دے رہا ہے لیکن یہ افسانہ نگار اس بات میں کافی احتیاط برت رہے ہیں کہ ان کا فلسفۂ حیات کہیں ترقی پسندی کی بازگشت بن کر نہ رہ جائے۔ اس لئے اسے زندگی کے وسیع اور جامع دائرے میں زندہ رہنے کے لئے مجبور ہونا پڑا ہے۔ خطرہ صرف یہی ہے کہ اس نئی تحریک میں وہ افسانہ نگار بھی شامل نہ ہو جائیں جنھیں کسی نئے فلسفۂ حیات کی نہیں نئے لیبل کی تلاش ہے۔

نئے افسانے کے جس ایک پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ہے 'جبر'۔ جبر کے بارے میں ان کی تشویش ـــ جبر کی شناخت، جبر کی مختلف اشکال۔ جدیدیت، لغویت اور کسی حد تک وجودیت کے فلسفے سے انحراف، انکار اور احتجاج ـــ اور 'کرم' کے فلسفے کی از سرِ نو نمو "کرمنڑیو ادھیکار ستے" (कर्मण्येव अधिकारस्ते) کرم پر ہی آپ کا اختیار ہے۔ (بھگوت گیتا)

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی" (اقبال)

سب سے پہلے **جبر کی شناخت** کو ہی لیجئے۔

"باسی کھانے، بدمزہ کھانے، بادی پیدا کر دینے والے کھانے اسے پسند آنے لگے تھے۔ اس نے داڑھی چھوڑ دی تھی۔ زیر بازو اور زیر ناف بال بھی وہ نہیں تراشتا تھا۔ ناک میں دیر تک انگلی کرنا اور اسے کام پر سے لوٹنے کے بعد کینوس کے جوتے اور نائیلون کے موزے سونگھنا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔

یعنی اس کچرا گاڑی کی سات سالہ ملازمت نے چست و چالاک، ذہین و صحت مند، نفاست پرست اور سلیقہ مند کلو رام کو غبی، سست، کند ذہن، بیمار، بدذوق، کاہل اور کلوا بنا دیا تھا۔"

(انور قمر: "چاندنی کے سپرد")

جبر کی مختلف اشکال ہیں جس کی تخلیقی عکاسی کے کئی نمونے نئے افسانے میں ملتے ہیں:

"جہاں تک لاش کے تیس سال تک نہ سڑنے کا سوال تھا تو اس کا کریڈٹ تو اس گھر کے ان افراد کو دیا جا رہا تھا جو چند دن پہلے تک اس گھر میں تھے اور سچ بھی یہی ہے کہ یہ ان کا ہی جگر تھا کہ انھوں نے تیس سال تک ایک لاش کو نہ صرف یہ کہ سڑنے سے بچایا بلکہ ہر آنے جانے والے کو یہ یقین دلاتے رہے کہ یہ مردہ نہیں ہے بلکہ کمزور ہو گیا

ہے اور اسی لئے آرام کر رہا ہے تاکہ صحت یاب ہو جائے تو دوبارہ زندگی کی دوڑ میں پوری تندہی کے ساتھ حصہ لے۔ مگر لگتا ہے کہ جب ان کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ اب اس لاش کو سڑنے سے نہیں بچایا جا سکتا تو رات کی تاریکی میں چپکے سے فرار ہو گئے ... اور اب صورت حال یہ ہے کہ لوگ بھاگ رہے ہیں اور دو حصوں میں بٹی ہوئی سڑی ہوئی لاش یا لاشیں ان کا پیچھا کر رہی ہیں اور درود و وظائف، بھجن، کیرتن اور دعاؤں کی محفل گرم ہے۔ لوگ بھاگ رہے ہیں اور اسباب و علل کے بارے میں بے پر کی ہانک رہے ہیں ـــ اور آہستہ آہستہ سب دو حصوں میں بٹی سڑی ہوئی لاش جیسے بنتے جا رہے ہیں اور انھیں گالیاں دے رہے ہیں جنھوں نے تیس برس تک دھوکے میں رکھا اور اپنا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں جو خود سڑتا جا رہا ہے ...''

(حسین الحق ''وَقِنا عذابَ النّار'')

اس طرح جبر کی اس شکل کو ایک دوسرے انداز میں سید محمد اشرف نے ''گدھ'' میں پیش کیا ہے۔

'' اب گدھ ان معصوموں کے گوشت کا ایک ایک ریشہ کھا چکا ہے اور اب وہ اپنے شہپروں کی مدد سے پھڑ پھڑاتا ہوا فضا میں اڑان بھی بھر چکا ہے۔ جبلّت اور ایک عمر کے تجربے نے اسے یہ بات بتا دی ہے کہ اسے روز غذا ملے گی ...''

جدیدیت کے فلسفے سے انحراف

لیکن نئے افسانہ نگار جدیدیت کے خلاف اختیار کی آزاد قوت کی نمو کے خواہش مند ہیں۔ وہ نہ تو مارکسی جبریت کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی ان کا اعتقاد فرائیڈین جبریت پر ہے۔ یہ انحراف و انکار اب احتجاج اور وارننگ کی صورت میں رونما ہوا ہے۔

'' میں نے کہا تھا نا حرامزادو ... بانگ کے بہانے جب تک ان کو مار رہے ہو، مارتے جاؤ ... جب تک انھیں بانٹ رہے ہو بانٹو ... ایک دن آئے گا جب یہ تمام خانوں کو توڑتے ہوئے ایک جھنڈ ہو کر زمین دوز تہ خانوں میں چھپ جائیں گے اور جنگلی چوزوں کے ساتھ برآمد ہو کر ہواؤں میں اڑ جائیں گے ... پھیل جائیں گے ... قاتلو ... اڑ جائیں گے ... پھیل جائیں گے ... قاتلو ... ہوائیں بدل جائیں گے ... ایسی بانگ دیں گے کہ ...''

(شوکت حیات ''بانگ'')

'کرم' کے فلسفے کی ازسرنونمو

جب جبر کی شناخت ہو جاتی ہے، اس کے مختلف چہرے پہچانے جاتے ہیں اور اس کے پیچھے کارفرما نظریے کا تجزیہ ہو جاتا ہے تو پھر اسے توڑنے کے لئے کرم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا کرم (عمل)، جو شاید کسی ایک فرد سے شروع ہوتا ہے لیکن جس کی کامیابی میں دوسرے افراد بھی شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

"... اس نے غور سے مٹی کے بدلے ہوئے رنگ کو دیکھ کر رام بتی سے کہا تھا اگر دنیا کے ہر کنویں کھودنے والے کی انگلیوں سے خون کے قطرے ٹپک کر اس دھرتی پر جم جائیں تو اس دھرتی کا رنگ کیسا ہو جائے گا۔ رام بتی نے اسی وقت کہا تھا کہ صرف خون ٹپکنے سے کیا ہوتا ہے۔ قطرے جب تک الگ الگ ٹپکیں گے ہر قطرہ دوسرے سے اجنبی ہوگا۔ خونی قطروں کے ساتھ وہ ڈور بھی چاہئے جو ان قطروں کو ایک مالا میں پرو دے۔"

(انیس رفیع: "ریڑھ کی ہڈی")

کامو نے کہا تھا: "بغاوت کا عمل کتنا ہی اکیلا کیوں نہ ہو دراصل ایک اجتماعی عمل ہے۔ میں بغاوت کرتا ہوں اس لئے ہم وجود رکھتے ہیں۔"

نئے افسانے نے لفظ کی ماہیت کو ہی نہیں اس کی اہمیت کو بھی پوری طرح سمجھ لیا ہے۔ وہ جدیدیت پرست ادیب کی مانند یہ تسلیم نہیں کرتے کہ لفظ اور معنی کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے بلکہ وہ یہ مانتے ہیں کہ یہ رویہ اہلِ دانش کا نہیں ہو سکتا، یہ رویہ سراسر اہلِ سازش کا ہے۔ وہ الفاظ کو کثرتِ استعمال اور ان کی آزادانہ مباشرت سے انھیں جبر کے حربے کے روپ میں معنی کے قتل کے لئے صفحۂ قرطاس پر لاتے ہیں۔ ورنہ آتشیں تیزاب شیتل گنگا جل کا نام کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ نئے افسانہ نگار عام طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کے تجربات اور احساسات کی ترجمانی کے لئے الفاظ ناکافی ہیں۔ کم از کم معنویت کی رو سے ان افسانہ نگاروں کے لئے محض ذات یا اقدار کا بحران ہی نہیں بلکہ الفاظ کا بحران بھی ہے کیوں کہ لفظ کی ابلاغی قوت مضمحل ہو چکی ہے۔ الفاظ اور معانی کا باہمی رشتہ منقطع نہیں ہوا بلکہ الفاظ بزدل، کرپٹ اور نامرد ہو چکے ہیں۔ انسان کے تجربات اور احساسات کو منظر کرنے میں لفظ کی قوت کی صورت کو انسانی فکر کی موجودہ صورتِ حال میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

"بابا الفاظ کے مفہوم سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میں بہت کچھ سن رہا ہوں لیکن الفاظ میرا ساتھ نہیں دیتے ہیں۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ الفاظ سے مفر بھی ممکن نہیں۔ میری گویائی شاید دھیرے دھیرے گھڑی کی ٹک ٹک میں تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔ میں منظروں اور صداؤں کو الفاظ کا جامہ کیوں

نہیں پہنا سکتا۔ تعجب ہے کہ ہم نے ہی انھیں ایجاد کیا۔ میرے ذہن میں الفاظ گتھم
گتھا ہو رہے ہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ہم کون کون
سی باتوں کو صاف، سیدھے اور صریح انداز میں کہتے چلے جائیں "۔

(حمید سہروردی "نہیں کا سلسلہ ہاں ہے")

ہندوستان کی معیشت، سیاست، نظام اور نوکر شاہی نے مل کر جبر کو وحشت اور دہشت کی جس پاتال گہرائیوں میں لا پھینکا ہے اس سے مفر ہونے کا یہی رویہ صحیح ہے۔ آج مسئلہ نہ آدرش (پریم چند) کا ہے نہ انقلاب (ترقی پسندی) کا نہ جنسی دباؤ اور اقدار کے خلاف فنا کا ہے اور نہ ہی نام نہاد عصری آگہی کا۔ یعنی جدیدیت اور زنگ خوردہ ترقی پسندی کے احیاء کا ___ بلکہ نئے دور کے حقائق میں بصارت عطا کرنے کا ہے اور جو صداقت آشکار ہوا سے تخلیقی عمل کی راہ سے گذارتے ہوئے اس طرح پیش کرنے کا ہے کہ کسی نقاد/قاری کو ترسیل کی ناکامی کا مرثیہ پڑھنے کی ضرورت در پیش نہ آئے۔

آٹھویں دہائی کے بیشتر افسانے اپنے عہد سے براہ راست برسرِ پیکار رہیں۔ صرف شکایت (ذاتی) یہ ہے کہ وہ ابھی علامتی/تمثیلی جال سے باہر نکلنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے ان میں جوش مارتے ہوئے خون کی کمی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جب کہ کردار اور واقعات تجریدیت سے ابھر کر اپنا جسم، اپنے خدوخال، اپنا چہرہ، دل، دماغ، فکر اور احساس حاصل کر لیں گے تو وہ زندہ افسانوں کے روپ میں پیش کئے جائیں گے کیوں کہ:

"... بہرکیف کوئی بھی ہو۔ دروازہ تو کھولنا ہی ہوگا۔ کوئی ہمارے دروازے کی زنجیر
ہلا جائے اور ہم بے حس بیٹھے رہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں... آخر کب تک ہم اس
اندھیرے میں ڈرے سہمے بیٹھے رہیں گے "۔

(سلام بن رزاق "زنجیر ہلانے والے")

"بچہ آنکھیں واپس کر، بڑا شکٹ کا سمے ہے۔ آدمی اور کتے کی پہچان مشکل ہوگئی ہے
___ اور تب ایسے ہی سمے میں شنکر اپنا کمنڈل بجاتے، ترشول لہراتے اور مسکراتے
ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "بچہ اس سارے چھل، کھوٹ، کپٹ اور جھوٹ سے
اگر مکتی چاہتا ہے تو وحشی پی کر امر ہو جاؤ ___ ورنہ کتے تیرا جینا مشکل کر دیں گے "۔

(حسین الحق "آتم کتھا")

جب فرانز کافکا نے اپنے دوستوں کے سامنے اپنا ناول "ٹرائیل" پڑھ کر سنایا تو انھوں نے اُسے

ہنسی میں اڑا دیا لیکن آج کنسنٹریشن کیمپوں، ہیروشیما اور ناگاساکی کے ایٹمی فضا، بیلسن اور ویت نام
افغانستان کی دہشت و وحشت سے گذرنے کے بعد" وڑا ئیل" پہ کون ہنس سکتا ہے۔ اور جو کچھ
بدنصیب دیش پر بیت رہی ہے۔ بیلچی سے باغپت تک اور مرادآباد سے بھاگلپور تک اس کو دیکھتے ہو
ابابیل (قمر احسن)، تقیہ بردار (اکرام باگ)، ڈوبتا ابھرتا ساحل (شفق)، شہرگل خوں (انیس اشفا
کنواں (انور خاں)، پرندے اور انقلاب (مومن اشفاق یوسفی)، خوابوں کا قیدی (عشرت ظہیر)، کھویا
ہاتھ (سلطان سبحانی)، تہذیب (مہدی ٹونکی)، گلیشیا اٹرینہ (کنور سین)، ریت گھڑی (ساجد رشید)، ز
میں گڑے ہوئے پانو (اختر واصف) اور سر بریدہ آخری آدمی (انیس اشفاق) پہ کون ہنس سکتا ہے۔
"بچہ آنکھیں واپس کر، بڑا سنکٹ کا سمے ہے"۔ ☐

احمد ھمیش
کراچی، پاکستان

اقوام متحدہ سے ایک مکالمہ

بہت دن ہوئے میں اپنی سوانح بیان کرنے کے بہانے برصغیر کی تمام بدنصیبیوں کو جمع کر رہا تھا اور انھیں بطور دستاویز مجھے ایک سیل بند پیکٹ میں اقوام متحدہ کو ارسال کرنا تھا۔ مگر اس میں دیر اس لیے ہو رہی تھی کہ کچھ انتہائی اہم بدنصیبیوں تک میرا پہنچنا آسان نہ تھا۔ جب کہ برصغیر سے ہی الگ کئے گئے ملک میں میں نے بھی سکونت اختیار کی۔ ان بدنصیبیوں کے آس پاس اور درمیان رہتے ہوئے جو مجھ سے کئی سال پہلے آباد ہوئیں بلکہ جو ان سے بھی پہلے شروع سے آباد تھیں مگر وہ بھی الگ کئے گئے ملک کے الگ کئے گئے عرصہ میں نئے سرے سے آباد کی گئیں یا انھیں ان کا آباد ہونا باور کرایا گیا۔ جو بھی ہو، میرے لئے ان تک پہنچ کر انھیں جمع کرنا دشوار ہوا۔ کیونکہ وہ میرے آس پاس اور درمیان کچھ اس تکنک سے بے اہمیت بنا دی گئیں کہ فوکس سے باہر ہی ہوتیں۔ گو میں نے کئی سال لگاتار اینگل بدل بدل کر انھیں فوکس کے اندر لانے کی کوشش کی مگر میری انگلیوں اور آنکھوں پر بیک وقت کوئی ناقابلِ فہم تنزیہی دباؤ پڑتا۔ یہاں تک کہ میرے ورثہ میں ملے ہوئے متعدد قیمتی لینس ٹوٹ گئے۔ آخر میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ٹوٹل پرفارمینس سے پہلے اقوام متحدہ سے مزید مہلت لے لوں۔ دراصل شروع ہی سے مجھے کسی نے باور کرایا تھا (شاید خود بدنصیب ہونے کے ردعمل نے) کہ اقوام متحدہ میں کوئی انسانی مسئلہ حل ہو یا نہ ہو، اس کی نوٹس ضرور لی جاتی ہے۔ اور اپنی سوانح بیان کرنے کا بہانہ اس لئے تھا کہ میری اپنی کوئی سوانح تھی ہی نہیں۔ وہ تو برصغیر کے آدمی کے بھوکے ننگے، ٹھکرائے ہوئے، طرح طرح سے ترسائے گئے محروم اور بیمار جسمانی اعضا تھے اور اس سے بڑھ کر بدنصیبی یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی عضو اپنی ٹھوس ضرورت آدمی کے لہجہ میں بیان کرنے کا اہل نہیں ملا۔ میں نے ایک ایسے اذیت زدہ عضو کو دیکھا، جو لکڑی اور لوہے کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا مگر اسے نکالنے والا کوئی نہ تھا نہ عورت نہ سیاست! ۔ یہ انتہائی دکھ کی بات

تھی کہ میں نے انتہائی گہری سانس لی اور خود بھی ڈرا کہ مبادا میں ایسا نہ ہو جاؤں۔ یہ وہی عرصہ تھا، جب لینس ٹوٹ گئے تھے۔ بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں ریگستان میں مرتے مرتے بھی نہیں مرا۔ میری آنکھیں بچ گئیں یا میں آنکھوں کے ریفرینس سے زندہ رہ گیا۔ یا یوں سمجھ لیا جائے کہ کسی طور مجھے اقوامِ متحدہ کے لئے کام پورا کرنا تھا۔ ▢

قمر احسن

موریہ ونش کا زوال

شہروں اور قصبات میں مچی ہاہاکار، بدامنی اور انتشار کی خبریں سن سن کر اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات اور تمنائیں سر ابھارنے لگی تھیں۔ چاروں طرف موریہ ونش کے اچانک زوال کے اسباب اور اس کے نتائج پر بھی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایسے میں بیٹا باپ کی طرف سے اور ماں بیٹیوں کی طرف سے زیادہ مشکوک اور حساس ہوئے جا رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکنے کا اس سے بہتر کوئی اور وقت نہ آئے گا۔

دکن کے چھوٹے سے گاؤں سے وہ یہی سب سوچ کر نکل کھڑی ہوئی تھی اور جہاں جب بھی پہنچی اسے [illegible] تلاش کر لینے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اس نے سوچا کہ معمولی تیریا بن کر تو کوئی بھی جی سکتا ہے [illegible] مدت میں مٹانے کے لئے تو کوئی بھی دیوداسی سی بن سکتا ہے۔ شہروں کی تو بات ہی کچھ اور ہوگی۔

جب وہ شہر پہنچی تو سارا شہر موریہ ونش کے زوال کے اسباب پر غور کر رہا تھا۔ چاروں طرف غیر محسوس تھرتھراہٹ ہچکولے لے رہی تھی اور شہر والے عجیب بے چینی اور اعصابی کشیدگی کے شکار تھے۔ کچھ ہو چکنے کا احساس اور کچھ ہونے کا احساس دونوں مل کر ایک عجیب ناقابلِ بیان کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ دیکھنے میں سارا شہر نارمل نظر آ رہا تھا۔ لیکن اندر سے اس کا ایسا ہی حال تھا جیسے شادی کی پہلی رات آ چکی ہو۔ لیکن سہاگ رات کی نوبت نہ آئی ہو۔ ایسے میں پدمانے بہت سوچ سمجھ کر ہنگاموں کے عین بیچ اپنا کٹیر تلاش کیا۔ اور مزے لے لے کر وہ بھی موریہ ونش کے زوال کے سبب پر غور کرنے لگی۔

گھر میں دو بڑے کمرے تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا حوض تھا۔ مہندی، ہارسنگھار، کیلے اور انجیر کے درخت چہار دیواری کے چاروں طرف پھیلے تھے۔ بیچ میں نہ جانے کیسے ایک کھجور کا درخت بھی اگ آیا تھا۔ پہلے اس نے چاہا کہ اس درخت کو نکلوا دے پھر بعد میں یہ سوچ کر کہ کہاں اسے بہت دن رکنا ہے اس خیال کو چھوڑ دیا۔

دوسرے دن سے ہی ایک کہارن کا انتظام کر کے وہ مطمئن ہو گئی۔ اوپر کا کام کرنے والے تو اپنے آپ آجائیں گے پھر بھلا اوپر کا کام ہی کیا ہوگا۔ کہاں سب بالائی کھانے والے ہیں اور کون اتنی دیر ٹھہر سکے گا کہ دھوبی کو کپڑے بھجوا سکے۔ دو تین راتیں تو اس نے آرام سے بستر پر لیٹ کر موریہ ونش کے زوال کے اسباب پہ سوچا اور

اپنے کام کی روپ ریکھا تیار کی گلیوں کوچوں کوٹھوں چوباروں اور مندروں کے نقشے کمارن نے اس سے پہلے ہی بتلا دیئے تھے۔ بلکہ اس نے تو اپنے مشکوک بیانات سے لوگوں کے تجسس کو ابھار کے اس کے کام کو اور آسان بنا دیا تھا۔

جب کبھی وہ گزرنے والوں کو اس مکان کے پاس آتے ہی چوکنا سا دیکھتی تو ہلکے سے مسکرا دیتی اور زور سے کمارن کو کسی کام کے لئے آواز ضرور دیتی۔ پھر چپ سی لے کر بیٹھ جاتی لیکن دماغ باہر ہی لگا رہتا۔

اسے ہنسی آتی کہ شہر اتنا ہراساں اور اعصاب زدہ ہے کہ اس کے اجنبی وجود کو نظر انداز کر کے اب بھی موریہ ونش کے زوال کے اسباب پر ہی غور کئے جارہا تھا اور شہر، شہر اچانک اتنا تیز رفتار ہو گیا تھا کہ جو لوگ ایک گھڑی کھڑے ہو کر کچھ بات کر تے۔ کوئی سوال یا کوئی پتہ پوچھتے۔ پدما محسوس کرتی کہ وہ تو ٹھہرے ہیں لیکن ان کے چہرے اب بھی چل رہے ہیں اور دوڑ سے باہر نہیں ہوئے ہیں۔ تیز رفتار ہوائیں تیز رفتار سواریاں زیادہ پُرشور اور سہما ہوا اعصاب کشیدہ شہر صبح سے ہی جاگ کر موریہ ونش کے اچانک زوال پر غور کرنے لگتا اور کئی کئی رات تک گردن اٹھا اٹھا کر غور کرتا رہتا۔

کچھ دنوں تجسس پیدا کرنے کی ناکام کوشش کے بعد پدما نے گھر سے باہر نکلنا شروع کیا اور کمارن کو ساتھ لے کر سارا سارا دن شہر کا چکر لگاتی رہی۔ بلا سبب پُر ہجوم بازاروں۔ سکڑی گلیوں اور بکھرے پڑے چوراہوں سے گزرتی لیکن واپسی پر نڈھال سی آکر گر پڑتی اور اکتاہٹ سے کمارن سے پوچھ بیٹھتی "ارے میں نے تو سنا تھا کہ شہروں میں دن دہاڑے لوگ، باگ لڑکیاں اٹھالے جاتے ہیں۔ کسی کی بہو بیٹی کی عزت ہی محفوظ نہیں رہتی۔ اور ...." کمارن چپ چاپ اسے دیکھا کرتی پھر بول اٹھتی "بائی موریہ ونش کا زوال ہو گیا ہے نا۔"

پدما جھلا کر کھڑی ہو جاتی "نرک میں جائے موریہ ونش اور اس کا زوال یہاں گھومتے گھومتے پیر سوج گئے ہیں۔ سارا شہر رشی منی ہو جاتا تو بھی ٹھیک تھا۔ نہ کہیں لڑکی اٹھتی ہے نہ چوری چکاری ہے۔" کمارن دونوں ہاتھوں پر چہرہ ٹکا کر انتہائی متفکرانہ لہجہ میں سوال کرتی "لیکن بائی جی۔ موریہ ونش کے بعد اب ہو گا کیا۔؟"

"وہی جو موریہ ونش کے زوال کے پہلے ہوتا تھا:"

" یعنی صبح ہوتے ہی شریف لوگ اپنی شریف بیویوں کے نم اور ٹھنڈے پہلوؤں سے اٹھ کر اشنان کریں گے۔ سبزی ترکاری کھا کر کام پر نکل جائیں گے۔ شام کو نیواڑی سے میٹھا پتہ کھا کر پتیل جیسے پیلے مکانوں میں گھس کر بیٹھ جائیں گے۔ میری تو مت ماری گئی تھی کہ یہاں چلی آئی۔ ہر شخص دوسرے سے اتنا خوف زدہ کیوں

ہے۔ ؟ ایسی شک بھری نگاہ سے دوسرے کو دیکھتا ہے مانو.... مانو اس کے اپنے ہی اندر کچھ نہ رہ گیا ہو۔ یا سب نامرد ہو گئے ہیں۔ اتنے بھرے پرے بازار میں بھی میں نے نہ کسی دوکان دار کو گاہک کی طرف دیکھتے پایا نہ گاہک کو دوکاندار سے آنکھ ملاتے دیکھا۔ پاس سے کوئی گزر جاتا ہے تو ایسا چونک کر اسے دیکھتے ہیں۔ جیسے جیسے —— ارے کہارن تو بھی مجھے اتنی شک بھری آنکھ سے دیکھ رہی ہے۔ ؟"

"نن نہیں۔ بائی موریہ ونش کا زوال ——"

ایسے میں جب کہ سارا شہر موریہ ونش کے زوال کے اسباب پر غور کر رہا تھا پدما سارا سارا دن بازاروں اور چوراہوں کے چکر لگایا کرتی۔ نت نئے چہروں کو بڑے غور سے دیکھتی۔ چوپال اور چوک کی طرف سے عمداً گزرتی لیکن کوئی اس نگاہ سے اسے نہ دیکھتا جس کی یہ عادی اور متلاشی تھی۔ تھک کر گھر لوٹتی تو شہر اور شہر والوں کو کوستی ہوئی بستر پر گر پڑتی اور پھر کا زہر دھیرے دھیرے سارے جسم میں تیرنے لگتا۔

ایسے میں ہی ایک دن اسے بھرے پُرے بازار میں بہت سے نسبتاً نئے اور اجنبی چہرے نظر آئے تو یہ جان بوجھ کر ان کے بیچ میں گھس گئی اور کترا کترا کر ان کے بیچ سے لاپرواہی سے گزرتی رہی۔ شام تک وہ اور یہ سارے شہر کا چکر لگاتے رہے شام ہوئی تو تھک کر اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئے۔ پھر پدما کا روز کا معمول بن گیا کہ پہلے تو ان کی تلاش میں بھٹکتی پھر انہیں پاکر ان سے ساتھ ٹھوکر کھاتی۔

ویسے بھی اب تک جو اثاثہ اس کے پاس تھا وہ ختم کرنے کے قریب تھا۔ لہٰذا اسے کام میں تیزی کرنا ہی تھا اور ادھر کا یہ عالم تھا کہ شاید ہی کوئی دوکان خالی جاتی رہی ہو جس پر سے —— ان میں سے کوئی کچھ خریدتا نہ ہو۔ پدما کو لگا جیسے یا تو وہ اپنے دھن کو دکھا رہے ہیں یا پھر اتنا افراط ہے کہ لٹا رہے ہیں۔ اس کے جی میں کئی بار آئی کہ آگے بڑھ کر ان میں سے کسی کا ہاتھ پکڑ کر روک لے اور کہے کہ ارے اتنی بچیلی دوکان بھی ہے۔ سارا بساط خانہ ہی میں دکن سے اٹھا لائی ہوں۔

ایسے میں ایک دن اسے محسوس ہوا کہ ان میں سے ایک جو دوسروں سے زیادہ فضول خرچ واقع ہوا تھا اور شاید ان میں کوئی اہمیت بھی رکھتا تھا اسے بار بار دیکھ کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ پھر رک جاتا ہے۔ دوسری طرف اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اب بہت سی عورتیں اور لڑکیاں جن کے لباس اور چہروں سے ہی امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ اب ان کے چاروں طرف نہ صرف منڈلا رہی ہیں بلکہ وہ سب بھی وقتاً فوقتاً ان کے ہمراہ علیحدہ علیحدہ نظر آنے لگے ہیں۔ پدما کو لگا جیسے وہ دوڑ میں پیچھے رہ گئی ہو —— یا پھر یہاں کی ریت و رواج ہی کچھ الٹے ہوں۔ وہ خود سے آگے بڑھنا بھی چاہتی تھی لیکن ایک عجیب سی جھجک اسے روک بھی رہی تھی اور آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں پہل تم کرو۔ پہل تم کرو۔

آخر جب پدما نے محسوس کیا کہ اب بازاروں میں ان کا رش کم ہوتا جا رہا ہے اور اب اکا دکا ہی کہیں نظر آتے ہیں اور تھوڑے ہی دیر بعد کہیں سے کوئی سواری آکر رکتی ہے اور وہ اطمینان سے مسکراتے ہوئے اس میں بیٹھ کر چل دیتے ہیں تو اسے اور بھی مایوسی ہوئی اور ایک دن جیسے ہی ان میں کا ایک خوش لباس و خرانج فرد نظر آیا۔ پدما جھجکتی ہوئی اس سے مخاطب ہی ہو گئی۔

"کیا آپ لوگ اس شہر میں اجنبی ہیں؟"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں" اس نے بہت شائستگی سے جواب دیتے ہوئے کہا "میرے لائق کوئی خدمت۔"

"میں یہی سمجھی تھی اس لئے دل چاہا کہ دو گھڑی آپ سے مل بیٹھوں میں بھی دکن سے ابھی حال ہی میں آئی ہوں۔"

"آئیے چلیں۔ میں تو ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ کیا آپ کے پاس اپنی سواری ہے۔"

"ہے تو لیکن شاید آپ کے لائق نہ ہو۔ آئیے!"

پدما اسے لے کر گھر آئی تو دل ہی دل میں آج کی پہلی آمدنی کا سارا حساب جوڑ ڈالا۔ اور کمارن کو سمجھا کر اس سے الگ کر بیٹھ رہی۔ کئی رات تک دونوں موریہ ونش کے زوال کے اسباب پر باتیں کرتے رہے پھر ایک ایک کر کے تمام مسئلوں کی گرہیں کھلتی گئیں۔

صبح پدما اس کی شائستگی۔ مہارت اور باتوں کے انداز پر دل ہی دل میں مسرور دکن کا لوک گیت گنگناتی حمام میں داخل ہوئی تو موریہ ونش کے زوال کے تمام اسباب اسے جھوٹے لگنے لگے۔ باہر آئی تو دیکھا کہ وہ تیار ہو کر باہر برآمدے میں آچکا ہے پدما نے اپنائیت بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ تو اس نے آگے بڑھ کر انتہائی شائستگی سے کہا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو مجھ سے کس قسم کی مایوسی ہوئی ہو گی بہرحال اب مجھے حکم دیں کہ مجھے ابھی اور آپ کے ساتھ قیام کرنا ہے یا آج ہی چلا جانا ہے۔" پدما کچھ سمجھ نہ پائی پھر بھی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ "یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا تھا۔ کہ آپ کو کوئی تکلیف یا الجھن تو نہیں ہوئی۔۔۔۔۔"

"جی آپ لوگوں کی خدمت تو میرا فرض ہے۔" اس نے درمیان سے ہی ٹکڑا لگایا۔

"ویسے آپ کی مرضی۔ اگر آپ قیام کرنا چاہیں تو میں آج کہیں نہ جاؤں۔" پدما نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"وہ تو آپ پر منحصر ہے ویسے ایک رات کا ہم لوگ پانچ سو کا شا بھل لیتے ہیں لیکن کچھ تو آپ کی ذہانت

وخلوص کی وجہ سے اور کچھ سوریہ ونش کے زوال کی وجہ سے اب ہم اپنی مانگ پہ اصرار نہیں کر سکتے۔ آپ جتنی راہیں کبھی مجھے روکیں گی چار کا شا پھل کے حساب سے دے دیجئے گا۔ ہم جگولا (GAGULA) لوگ یوں بھی اب نا سے پریشان ہیں۔"

بابا کو ایسا لگا جیسے زمین سرکتی جا رہی ہو۔ اور سارا شہر سوریہ ونش کے زوال کے اسباب پر غور کر رہا ہو۔ □

اسد محمد خاں
فیڈرل بی ایریا
کراچی، پاکستان

آکٹوپس — ایک منظر

میں جس منظر میں تمھیں شریک کر رہا ہوں وہ ایک پل کا منظر ہے۔ یہ پل دو ناممکنات کے درمیان کھنچا ہوا ہے۔ یہ سارا منظر ہی غیر معمولی ہے۔ بس ایک بات غیر معمولی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ پل کا ایک پہلا پایہ ریت میں دھنس گیا ہے۔ میں اسے پہلا پایہ ہی کہوں گا۔ کیونکہ ایک نظر میں یہ پہلا پایہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اصل میں یہ ٹین کا بنا ہوا ایک آکٹوپس ہے اور اپنے زنگ خوردہ بدن کے ساتھ ریت میں دھنسا ہوا ہے۔ بس اس کی سونڈیں آزاد ہیں۔ یہ آکٹوپس پل، گھی کے پرانے کنستروں کو چیر کر بنایا گیا ہے۔

آکٹوپس عام تین منزلہ عمارت جتنا اونچا ہے اور عین مین اس آکٹوپس کی طرح ہے۔ جسے ہم اپنے دہشت ناک خوابوں میں دیکھتے ہیں۔ مگر خواب کا آکٹوپس بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ ٹین کے اس آکٹوپس کی آٹھوں سونڈیں ایک دوسرے سے جفتی کھاتی ہوئی اس طرح پھیل گئی ہیں کہ کچھ سونڈیں پل کی دائیں محراب بناتی ہیں اور کچھ بائیں۔ ایک دو سونڈیں پیش منظر میں تمھاری میری طرف بڑھ آئی ہیں۔ اگر تم غور سے دیکھو تو ان کا مہیب سایہ ہمارے اوپر پڑتا دکھائی دے گا۔ ویسے وہ ہمارے اوپر اتنی بلندی پر معلق ہیں کہ بے موسم کے بادلوں کی طرح ان سے کوئی فوری خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ آکٹوپس کی ایک سونڈ منظر کے عقب میں اُفقی پٹی کی طرف بڑھ گئی ہے مگر اس سونڈ کو ہم تم سب نہیں دیکھ سکتے —— یہ سونڈ ہمارا تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم صرف محرابیں بنانے والی سونڈیں اور اپنی طرف امڈ آنے والی سونڈیں ہی دیکھ سکتے ہیں جن کی مجموعی تعداد سات ہے۔ جس سونڈ کا رخ اُفقی پٹی کی طرف ہے وہ آٹھویں ہے۔

آکٹوپس پر ایک مکمل سیاہ پینٹ لگایا گیا ہے جس میں سیاہی کے سوا کسی دوسرے امکان کو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ مکمل سیاہ پینٹ اس درجہ سیاہ ہے کہ تمام کی تمام روشنی جذب کر لیتا ہے، ایک کرن بھی منعکس نہیں ہونے دیتا۔ اسے کچھ دیر غور سے دیکھنے کی کوشش کرو تو یوں لگے گا

جیسے بینائی کے ساتھ تمھاری آنکھوں کے ڈھیلے بھی کھنچے جا رہے ہوں۔ سیاہی کو دوہرا گھناؤنا بنانے کے لئے سونڈوں کے پیٹ پر پوری لمبائی میں سکرز کی چار قطاریں لگائی گئی ہیں۔ عام روزمرہ کے آکٹوپس اپنی سونڈوں کے پیٹ پر دھڑکتے اور کھلتے بند ہوتے ہوئے سکرز کی قطاریں پہنے رہتے ہیں۔ یہ قطاریں آکٹوپس کا سب سے دہشت ناک حصہ ہوتی ہیں۔ ٹین کے اس آکٹوپس پر سستے پلاسٹک کے جلیبی سکرز لگے ہوئے ہیں جو کسی اندرونی برقی میکانیکی نظام کے تحت بہت فحش انداز میں دھڑکتے اور کھلتے بند ہوتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان میں سے بعض سکرز پورے ہولناک بلاسٹ کے ساتھ زمین چیر دینے والی آوازیں چنختے ہیں۔ ان میں بسوں کے پریشر ہارن نصب ہیں۔ جو سکرز پریشر ہارنوں سے خالی ہیں بہ ظاہر بے ضرر دکھائی پڑتے ہیں مگر ان میں ایسے آلات لگے ہیں جو ننگے کانوں سے نہ سنائی دینے والی الٹرا سونگ آواز پیدا کرتے ہیں۔ اور جب وہ اپنی بے آواز آوازیں چنختے ہیں تو اعصاب کے چیتھڑے اڑا دیتے ہیں۔ باقی سکرز سے اندھا کر دینے والی تیز سفید روشنی اترتی ہے۔ یہ دھڑکتے نہیں ہیں بس ان کی روشنی جھپکتی رہتی ہے اور اس جھپک کی تال میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ روشنی کی سفیدی، کافور کی سفیدی کی طرح ٹھنڈی اور مردہ ہے اور ایک غیر شخصی سوگواری سے تر بہ تر ہے۔ یہ روشنی ٹین کی سونڈوں پر لگے مکمل سیاہ پینٹ کی وجہ سے اپنی قطعی اور طے شدہ حدوں میں رہتی ہے۔ آکٹوپس کی سونڈوں کو یا اس کی سیاہ دہشت کو روشن نہیں کر سکتی۔ وجہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔

یہ پل، جیسا کہ میں نے بتایا، دو نا ممکنات کے درمیان کھنچا ہوا ہے اور ہر اعتبار سے مردہ ہے۔ اس میں بڑھ کر پھیلنے یا کسی بھی طرح اپنی شکل بدلنے یا حرکت کرنے کا امکان موجود نہیں ہے۔ البتہ آکٹوپس کے اصل بدن کو ریت کا جو تودہ ڈھنکے ہوئے ہے وہ تودہ زندہ ہے مگر یہ زندگی جانوروں اور پودوں اور پتھروں کی زندگی سے مختلف ہے کیونکہ تودہ بھی اپنی طے شدہ حدوں سے بڑھ کر پھیلنے اور شکل بدلنے، حرکت کرنے پر قادر نہیں ہے۔ بس اس کی ریت ننھے ننھے چمکدار گول کیڑوں کی طرح کلبلاتی رہتی ہے۔ اس ریت کے کسی ایک ذرے کو کبھی غور سے دیکھنا۔ وجہ سمجھ میں آجائے گی۔ مٹ میلی گیلی چمک میں لتھڑا ہر ذرہ کہیں نہ کہیں پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ سب کہیں پہنچنا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں برابر ایک دوسرے کو ٹھیلتے ڈھکیلتے رہتے ہیں۔ سماعت پر بہت زور دے کر سننا چاہو تو کبھی کبھی ننھی فحش آوازیں سننے کی کوشش کرنا وہ سب ایک بے ضابطہ ردم میں یکساں پیچ پر

ہیں ۔ "چل بھئی! چل بھئی! چل بھئی" ! جیسے کوہ ندا کے مسافر کسی مقدر کی سفاک ڈور سے بندھے کھنچے چلے جا رہے ہوں ۔ "چل بھئی! چل بھئی! چل بھئی!" مگر یہ گیلی چمک والے ننھے گول کیڑے اصل میں جاتے کہیں نہیں ، تودے ہی میں گردش کرتے رہتے ہیں اور اپنی مکروہ آوازوں سے مٹ میلی چمک پھیلاتے رہتے ہیں۔ تو وہ ابھی تک اتنا ہی ہے ، اور رہیں ہے جہاں تھا اور اتنا ہی اور وہیں رہے گا جہاں ہے ـــــ بس یہ کلبلاہٹ چلتی رہے گی ۔

ریت کے تودے کے علاوہ اس منظر کے فرش پر دور تک متحجر (FOSSILIZED) لہروں کا جال بچھا ہوا ہے ۔ روشنیوں والے سکر زسے اندھا کر دینے والی جو تیز سفید روشنی نکلتی ہے وہ ان لہروں پر اتر کر بڑے من موہنے انداز میں جھلملانے لگتی ہے ۔ پورے منظر میں بس یہی ایک بات دلاسہ دینے والی ہے ۔ لگتا ہے یہ بے جان متحجر لہریں نہ ہوں سانس لیتا ہوا پانی ہو جس کی سطح کے نیچے زندہ چیزیں حرکت کر رہی ہوں ، اگ رہی ہوں ۔

میں ان متحجر لہروں کے بصری دھوکے میں آکر پہلی بار اس منظر کے فرش پر دور تک دوڑتا چلا گیا تھا اور پشیمان ہوا تھا اور یقین کر کتنی ہی بار اپنی روحِ زندہ کا بوجھ اٹھائے اس منظر کے بے زندگی فرش پر دوڑا ہوں کہ شاید میرے پیروں کی دھمک سے چیزیں پیدا ہو جائیں اور سانس لینے لگیں ۔

میں بار بار اپنا بوجھ اٹھائے اس منظر کے سفاک فرش پر دوڑتا ہوا گیا ہوں اور اپنے تلوے لہولہان کر لئے ہیں مگر زندگی پیدا نہیں کر سکا ۔ حالانکہ میں سروں کی نارنجی لپٹ میں گھرا ہوا دوڑا ہوں اور ان دونوں آکٹوپس محرابوں سے پیاسی ابابیل کی طرح سنسناتا ہوا گزرا ہوں ۔ پکارتا ہوا گزرا ہوں ۔ ☐

عابد سہیل
کیسوری مارکیٹ، لکھنؤ

رگ سنگ

(لکھنؤ کے نام تیسری کہانی)

آسمان میں بجلی ایک دم سے کڑکی تو سامنے والے مکان کی دوسری منزل سے کسی نے چیخ کے پوچھا۔

"یہ کیا تھا؟"

سڑک کے اس پار کوئی پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے سے جو اس وقت پچاس ساٹھ کوس کا فاصلہ بن گیا تھا، دوکان کے برآمدے میں اتوار کے بازار کے لئے لائی ہوئی بنچوں پر بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی نے، جس کے ہاتھ میں بندوق تھی، جواب دیا۔

'بادل کڑکا ہے، میں بھی پہلے سمجھا تھا کہ فیر ہوا"

بندوق ہاتھ میں لئے سپاہی کے منہ سے بجلی کڑکنے کی اطلاع پا کر سوال پوچھنے والا کھڑا تو تعجب پر ہی رہا لیکن اس کے چہرہ کی پریشانی غائب ہو گئی ——— لیکن ذرا فاصلہ پر ڈوائڈر کی دوسری طرف، راتوں اور دن کو بھی بے روک ٹوک پھرنے والی گایوں اور بھینسوں کے گوبر میں سے جو پانی برسنے سے ذرا پھیل گیا تھا دانے چننے والی فاختہ کا دل نہ فائر کی آواز سے دھڑکا نہ بجلی کے کڑکنے سے، ہاں جب پاس سے پی۔ اے۔ سی۔ کی ایک گاڑی گزری تو وہ ذرا سی کھسک گئی لیکن انداز کچھ ایسا تھا کہ ٹرک نہ ٹوٹ پھوٹ جائے اس لئے کھسکی جا رہی ہوں۔ دوسری فاختہ تھوڑی دور پر بیٹھی دانہ چگتی فاختہ کو اسی طرح دیکھتی رہی۔ ٹرک گزرنے کا اس نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ پھر گلی سے دو سپاہی نکلے تو دونوں اڑ کر بجلی کے تار پر بیٹھ گئیں۔ سپاہی جب ذرا دور نکل گئے تو وہ دونوں پھر گوبر کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

جس گلی سے تھوڑی دیر پہلے سپاہی نکلے تھے اسی گلی کے کونے سے ٹنکو نے تھوڑا سا چہرہ، تھوڑا سا بدن نکال کر دونوں طرف دور دور تک سنسان پڑی ہوئی سڑک پر نظر دوڑائی اور سامنے بیٹھے ہوئے سپاہی کو دیکھتے ہی تیز تیز قدموں سے گلی میں لوٹ گئی۔ ٹنکو صبح دودھ لینے آتی اور برتنوں کی قطار میں اپنی پیالی رکھتی تو ننھا دودھ والا کہتا۔

"نہیں دینا دودھ، جا فضلو کے ہاں سے لے لے"

ٹنکو مسکراتی "دے دے چار آنے کا دودھ"

"کہہ تو دیا نہیں دینا" دودھ والا غصہ سے کہتا۔

ٹنکو ہنس دیتی۔

ٹنکو کی ہنسی ایسی تھی جیسے کوئی تھوڑے سے گڑ میں بہت سا نمک گھول دے۔ ایک تو خدا نے اسے بدصورت بنانے میں یونہی فیاضی سے کام لیا تھا، اس پر جب وہ ہنستی تو اس میں انسان کی فیاضی بھی شامل ہو جاتی۔ رنگ کالا تھا تو ہوا کرے، نخاس کے بازار میں پاوڈر کے پرانے ڈبوں میں تھوڑا سا سنگ جراحت، تھوڑا سا میدہ، تھوڑی سی خوشبو اور تھوڑا سا پاوڈر ملا کے کس کے لئے بکتا تھا۔ بارہ آنے کا یہ ڈبہ کئی کئی مہینوں کے لئے کافی ہوتا۔ چہرہ کا کالا رنگ تو کچھ اس طرح چھپ جاتا لیکن گردن اور اس بلاؤز سے جو کبھی نہ جانے کس کے لئے سیا گیا تھا لمبے لمبے ہاتھ اور ٹنکو کا پیٹ بہت اوپر تک دکھتا تو ــــــ آخر کوئی پاؤڈر پورے بدن پے پوتے تو سارا ڈبہ ایک ہی دن میں ختم نہ ہو جاتے۔ لیکن وہ یہ بھی تو کر سکتی تھی کہ دھوتی کو پیٹ کے اوپر ذرا پھیلا لیتی اور پیٹھ پر چوڑائی میں لے جا کر ہاتھوں کو اس طرح ڈھک لیتی، اور وہ یہی کرتی بھی تھی لیکن جب ایک دم ہنسی آ جائے، یا جان بوجھ کر مسکرانا پڑے تو دانت لاکھ پان چبا چبا کر پیلے پڑ چکے ہوں کالے تو نہ ہوئے ہوں گے اور وہ ہنستی تو یہ کمبخت دانت جو اب بھی اس کے بلاؤز سے زیادہ سفید تھے اس طرح باہر نکل آتے کہ آگے والے دو اس کے نیچے کے ہونٹ پر براجمان ہو جاتے۔ لیکن ہنسی کے علاوہ اب اس کے پاس اور ہتھیار ہی کون سا بچا تھا۔ جس کے پاس جو ہتھیار ہوتا ہے وہ اسے استعمال کرتا ہی ہے، توپ والا توپ، بندوق والا بندوق اور پستول والا پستول اور خوب صورت مسکراہٹ والا خوب صورت مسکراہٹ ـــــ تو وہ بھی اپنا ہتھیار استعمال کرتی۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس ہتھیار کے استعمال سے وہ اب کچھ اور زیادہ بدصورت لگنے لگی تھی۔

"کہہ جو دیا چار آنے کا دودھ نہیں دوں گا" ننھے نے اس کی پیالی برتنوں کی لائن سے ہٹا دی تو دوسرے گاہک بھی لطف لینے لگے۔

"ٹنکو تیرا دولہا کب لوٹ کے آئے گا؟" کسی نے مسکرا کر پوچھا۔

گندے مذاق، بھدی گالیاں، چٹکیاں اور سر راہ اس سے بھی زیادہ چھیڑ خانی تو ٹنکو برداشت کر لیتی لیکن اپنے دولہا کے بارے میں کوئی مذاق یا جملہ وہ نہ جھیل پاتی۔

" تیری مہریا تو لوٹ آئی ـــــ تو دودھ لینے آیا ہے۔ آدھے گھنٹہ بعد لوٹے گا تو اس کا یارجمیت ہو چکا ہو گا۔ ابھی جا کر دیکھ تو کنڈی اندر سے بند ملے گی "

اس کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ کنڈا ٹوٹی پیالی برتنوں کی لائن میں لگا دیتی تو اب اسے کوئی نہ ہٹاتا اور جب اس کا نمبر آتا اور تھا پچیس پیسہ کا دودھ پیالی میں ڈال دیتا تو وہ بلاؤز کے اندر سے ایک گندا سا رومال نکالتی، پھر اس میں لگی ہوئی دو گرہیں کھولتی اور بیس پیسے نکال کر تنہا کی ہتھیلی میں رکھ دیتی۔

" آج اتنے ہی ہیں "

یہ "آج" کئی مہینوں بلکہ برسوں سے چل رہا تھا۔ معلوم نہیں دودھ والا ہر روز دھوکا کھاتا تھا یا دودھ ہی بیس پیسوں کا دیتا تھا۔

یہ جو سامنے والی گلی ہے اس میں تھوڑی دور چلنے کے بعد پہلے دو بار بائیں پھر ایک بار دائیں مڑنے پر شکو کا کمرہ آتا ہے۔ دس فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا پرانا سا بے مرمت کمرہ۔ کوئی پندرہ بیس سال ادھر وہ کہیں سے آکر یہاں ٹک گئی تھی۔ پانچ چھ سال تو ایسے گزر گئے کہ کسی نوکری ووکری کی ضرورت ہی نہیں پڑی پھر گھروں میں جھاڑ پونچھ اور اوپر کے کام کرنے لگی لیکن جانے کیا بات تھی ہر جگہ دو چار مہینوں میں چھڑا دی جاتی نام شاید شکیلہ تھا لیکن اب شکو لوگوں کی زبان پر اس طرح چڑھ گیا تھا کہ کسی کو اس کا اصلی نام یاد بھی نہیں رہ گیا تھا۔

شکو کے اس کمرہ میں آنے کے کچھ دنوں بعد شہر کی میونسپلٹی والوں کو جانے کیسے گلیوں کا اندھیرا دور کرنے کا خیال آیا تو ایک بریکٹ لگا کر اس کے گھر کے پاس کی دیوار پر ایک بلب لگا دیا گیا۔ جس دن پہلے پہل بلب جلا تو شکو خوب خوش ہوئی " اب چراغ کا ہے کو جلاؤں، آٹھ آنے مہینہ کا تیل پھنک جاتے ہے "۔ اس نے کہا۔

لیکن دو تین دن بعد شام ہوئی اور اس کے گھر کے پاس روشنی نہ ہوئی تو لوگوں کو اندھیرے کا احساس ہوا۔ اگلے دن دیکھا تو ایسا لگا کہ کسی نے غلیل سے بلب توڑ دیا تھا۔ بلب کے نیچے کا پیتل کا کٹورا لگا ہوا تھا اور وہ جو شیشے کی ایک گھنڈی ہوتی ہے اس پر دو تار الگ الگ اب بھی جھول رہے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد میونسپلٹی والے دوسرا بلب لگا گئے لیکن تین چار دن بعد بلب پھر اسی طرح ٹوٹ گیا۔ اور اب جو گلی اندھیرے میں ڈوبی تو پانچ چھ سال بعد جب روشنی ہوئی تو کسی کو بلب توڑنے کا خیال بھی نہ آیا۔ لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب شکو گھر گھر جا کر کام کرنے لگی تھی۔ اسے بھی اب دس بارہ سال ہو چکے ہیں۔

شروع شروع میں جب شکو گلی سے نکلتی، بے پروائی کی چال چلتی ہوئی، نہ پاؤڈر نہ دانتوں کو چمکانے

کی کوشش، نہ کپڑوں کا ہوش تو لوگ رک رک کر اس کی طرف دیکھتے اور اب شکو کبھی کبھی خوب میک اپ کرتی خوب کھینچے ہوئے نیلے بلاوز پر لال ساڑی باندھ کر جو ٹخنوں سے کم سے کم چھ سات انگل اوپر رہتی، کچھ چھپاتی کچھ دکھاتی بھی تو نہ کوئی رکتا نہ اس کی طرف ان نظروں سے دیکھتا جو اسے کبھی چبھی نہ تھیں۔ لیکن اب بھی کوئی مسکرائے بغیر سادگی سے اس سے پوچھتا "شکو تیرا دولہا ابھی لوٹ کے نہیں آیا تو وہ بڑی جھلاہٹ سے جواب دیتی۔

"بس اب آیا ہی چاہتا ہے۔ اگلے مہینہ ضرور آجائے گا۔"

اپنے جملہ کا اثر دیکھنے کے لئے وہ سوال کرنے والے کے چہرہ پر نظر ڈالتی اور وہاں اسے وہی سادگی ملتی جو سوال کرتے وقت تھی وہ بات آگے بڑھاتی۔

"ایسے خالی ہاتھ کیسے آجائے۔ سونے کے کڑوں، ہیرے کی کیل اور کانوں کے جھالوں کا انتظام کرکے تو آجائے گا۔ کھت میں لکھا تھا اس مہینہ کے آخر تک سب انتظام ہو جائے گا۔ بس اگلے مہینہ ضرور آؤں گا۔"

اب سوال پوچھنے والے کے لئے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو جاتی اور وہ ہنس دیتا تو شکو کو ایک دم غصہ آجاتا۔

"گھر میں یار نہیں پاتا ــــــ مجھ سے مذاق کرنے چلا ہے۔" پھر سوال کرنے والے کی ماں کی نوبت آتی، پھر اس کی ماں کی، پھر باپ کی، پھر، پھر ــــــ

لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اگر کوئی دوسرا اسی سادگی سے وہی سوال پوچھ لیتا تو وہ اسی خلوص سے وہی جملہ دوہرا دیتی۔ "اس مہینہ کے آخر تک سب انتظام ہو جائے گا۔ بس اگلے مہینہ ضرور آئے گا۔"

لیکن اب تو لوگوں نے اس سے یہ پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ شکو تیرا دولہا کب آئے گا۔ اسے لوگوں کی یہ بے رخی کبھی کبھی بے حد کھلتی۔ کوئی دودھ کا برتن لائن سے ہٹا دیتا تو وہ سچ مچ غصہ ہو کر کہتی۔

"بس اب دو چار ہی دن کی کسر ہے۔ اس کا رکھا ہوا برتن کوئی ہٹائے گا تو ایک ہی تھپڑ میں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

لوگ ہنس پڑتے ہیں تو اس کا پارہ اور چڑھ جاتا ہے۔ پہلے کچھ صلواتیں چھیڑنے والوں کے حصہ میں آئیں ہیں پھر ان کی بیویوں کے حصہ میں، اس کے بعد ان کی ماؤں بہنوں کا نمبر آتا ہے۔

اس بیچ کوئی صلح صفائی کرانے کے لئے کہتا ہے۔

"اب بس بھی کرو شکو اماں" تو وہ ایک دم بھڑک اٹھتی ہے۔

"اے ہے اپنی تو دیکھو، مجھے شکو اماں کہتے ہیں۔ ابھی تو بے چارے کے دودھ کے دانت بھی نہیں

ٹوٹے۔ ایک۔ چانٹے ماردوں تو ساری بتیسی باہر نکل آئے گی۔"

شکو پر جملے کسنے والوں، اس کا مذاق اڑانے اور اسے چھیڑنے والوں میں وہ بھی ہیں جن کی غلیلوں نے اس کے دروازے کے بلب توڑ دیئے تھے۔ لیکن وہ بات شکو زبان پر کبھی نہیں لائی۔ بری سے بری بات کہہ لے گی، گندی سے گندی گالی دے ڈالے گی لیکن وہ بات اس کی زبان پر نہ آئے گی اور آئے بھی کیسے اس کا دولہا جو اگلے مہینہ آنے والا ہے ——— "ہیرے کی کیل، سونے کے کڑے اور کانوں میں جھالے لے کر!"

اب جب سورج ڈوبا اور روشنی کے علاوہ رات اور دن میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تو اور اس کے مکان کے پاس کے بریکٹ پر بلب جلا تو اس نے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا اور ہیرے کی کیل، سونے کے کڑوں اور کانوں کے جھالوں کے خواب آنکھوں میں لئے جانے کب اسے نیند آ گئی۔ اور رات کے نہ جانے کتنے بجے تھے کہ کسی نے دروازہ بھڑ بھڑایا۔

"کون ہے؟" جب دروازہ شاید تیسری بار بھڑ بھڑایا گیا تو اس نے کہا۔

"کسی نے دروازہ پھر بھڑ بھڑایا۔

"کون ہے رے؟" اب اس نے 'رے' کا بھی اضافہ کر دیا۔

"شکو دروازہ کھول ——— میں ہوں فقیرے" ——— کھول دروازہ نہیں تو پولیس والے پکڑے جائیں گے۔ ساری گلی میں گھوم رہے ہیں۔"

شکو نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

"تو تو بڑا بہادر تھا" اس نے فقیرے کو کمرہ میں گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "کہاں اب نکل گئی ساری بہادری"

فقیرے نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور سانسیں برابر کرنے لگا۔ پھر دو منٹ بعد بولا۔

"پولیس والے کہتے ہیں کرفیو ہے۔ گھر کے باہر مت لیٹو ——— میں نے لاکھ کہا کہ میرا کوئی گھر ہے نہ دوار لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔"

"تو تو پرسوں گاؤں جانے کو کہہ رہا تھا" شکو نے پوچھا۔

"یہ جھنجھٹ جو پڑ گئی۔ ایک دن اور گڑبڑ نہ ہوتی تو میں پار ہو گیا ہوتا"

اب فقیرے نے اپنی چھوٹی سی پوٹلی ایک کونے میں رکھ دی اور کرتے کے جیب سے ایک پڑیا نکال کر شکو کے میلے چکٹ تکیہ کے نیچے رکھنے لگا تو اس نے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

" تھوڑے زیور ہیں۔ میں نے سوچا ڈیڑھ سال بعد گھر لوٹ رہا ہوں خالی ہاتھ کیا جاؤں ۔"
فقیرے نے کہا۔

" میں دیکھوں ؟" شکو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

فقیرے نے شکو کی رال ٹپکتی دیکھی تو پڑیا کھول دی۔ سونے کی طرح چمکتے ہوئے پیتل کے دو جھمکے ہیروں کی چمک والے شیشہ لگی کان کی کیل اور جھما جھم کڑے شکو انھیں اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگی۔ دروازہ کی جھری سے آنے والی بلب کی روشنی میں یہ نقلی زیور اور بھی چمک اٹھے۔ اس نے اس ہتھیلی پر جس پر زیور رکھے تھے اپنی دوسری ہتھیلی رکھ دی جیسے ان کی چمک کو باہر کی دنیا سے چھپا کر اپنے دل میں اتار رہی ہو۔ پھر فقیرے سے بولی۔

" اسی بسولے پر سو رہو ـــــ میں بھی ایک کونے میں پڑ رہوں گی۔"

اندھیرے سے روشنی کی جنگ بس شروع ہی ہوئی تھی کہ سامنے والی گلی سے ایک سایہ سا ابھرا۔ اس سایہ کو دیکھتے ہی سڑک پار سامنے والی دوکان کے برآمدہ میں بیٹھے ہوئے سپاہی ایک دم چیخے۔

" ہو ـــــ ہو "

لیکن اس سائے پر کوئی اثر نہ ہوا ـــــ اتنے میں ایک سپاہی جس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی ہوشیار ہو کے بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن دھندلکے میں بس ایک سایہ سے زیادہ اسے کچھ دکھائی نہ دیا تو اس نے چلا کر کہا۔

" چل بھاگ گلی میں، کرفیو ہے "

لیکن سائے نے اب بھی جیسے کچھ نہ سنا تو سپاہیوں کو پریشانی ہونے لگی۔

" کچھ گڑبڑ ہے "۔ ایک سپاہی نے دوسرے سے کہا۔

بندوق دکھاؤ، بھاگ جائے گا " وہ اتنی دور سے یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ گلی سے نکلنے والا مرد ہے یا عورت۔

ایک سپاہی نے ڈرانے کے لئے بندوق کندھے سے لگائی، سامنے والے سایہ کو للکارا اور غصہ میں دانت بھینچے تو بندوق کی لبلبی پر رکھی ہوئی انگلی بھی غصہ میں تن گئی اور ایک شعلہ لپکا۔ سامنے ایک

سایہ ہوا میں لہرایا، کچھ جھولا اور پھر سڑک پر گر پڑا۔

بالوں میں افشاں، کانوں میں جھالے، ہاتھوں میں کڑے، ناک میں کیل۔ خون سے اس کا چہرہ اور آس پاس کی زمین گل نار ہوگئی۔ لیکن کسی نے یہ بھی نہ پوچھا۔

یہ کیا تھا؟

بادل کڑکا تھا کہ فیر ہوا تھا ـــــ کہ اس کا دولہا زیور لے کر آگیا تھا؟ ☐

حمید سہروردی*

صدر شعبۂ اردو
سنترکے۔ ایس۔ کے۔ کالج، بیڑ
۴۳۱۱۲۲

اِدھر اُدھر

اس کے ٹیبل پر کاغذات بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ کچھ کتابیں کھلی ہوئی تھیں۔ اور کچھ ادھر ادھر رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے سر کے اوپر ٹیوب لائٹ اپنی زندگی جی رہا تھا۔ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کے لئے زندگی کے انکشافات کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا لکھ رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے بائیں ہاتھ کی طرف رکھا ہوا، گلاس جس میں دودھ رکھا ہوا تھا اپنا بائیں ہاتھ بڑھایا۔ گلاس ہاتھ میں نہیں آیا بلکہ ٹیبل پر سے نیچے زمین پر گر گیا۔ اور اس کے ٹکڑے زمین پر پھیل گئے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر نیچے گلاس کے ٹکڑے اور کرچیاں ڈھونڈنے لگا۔ پنکھا اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا۔ چونکہ اس کی پشت پنکھے کی طرف تھی۔ ٹیبل پر رکھے ہوئے کاغذات محفوظ تھے۔ جب وہ کرسی پر سے اٹھا تو کاغذات پنکھے کی ہوا سے ادھر ادھر سارے کمرہ میں پھیل گئے۔ اس نے گلاس کے ٹکڑے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔ اور دودھ سے بھرے ہوئے فرش کو کپڑے سے صاف کر کے پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

پتہ نہیں اس نے آج کیوں اپنے روزانہ ملنے والے دوست سے روکھے پھیکے انداز میں بات کی تھی۔ روزانہ ملنے والے دوست نے اس کے رویہ سے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ وہ ان دنوں بہت مصروف ہو گیا ہے۔ یا اپنی گھریلو زندگی کے بہت سے معاملات سے ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔ دوست نے زیادہ باتیں کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اور وہ جلدی ہی اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے اس نے سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس اٹھائی اور اس کی نظریں سامنے دیوار پر لگے ہوئے عمر خیام کی رباعی کی تشریح کیے ہوئے کیلنڈر کی طرف اٹھیں۔ ٹھیک ہے ــــــ کہہ کر تاریخ دیکھنے لگا۔ بارہ تاریخ کو یہاں سے جانا ہوگا۔ سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے اس نے کرسی سے پشت لگا دی۔ اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

"سب کچھ لمحوں میں بدلتا ہے۔ اور لمحوں ہی میں سنورتا ہے۔ کوئی کب تک جتن کر کے اس کے حوالے کرتا رہے گا۔"

سگریٹ کا ایک اور گہرا کش لے کر اس نے پین ہاتھ میں اٹھالیا پین بہت دیر سے کھلا پڑا ہوا تھا اور پنکھے کی ہوا بھی چل رہی تھی۔ پین کی نب پہ انک سوکھ گئی تھی۔ کچھ نہیں لکھا گیا۔ شاید تساہلی تھی یا کہ بیزاری اس نے پین کو جھٹک کر لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

کیوں اس نے اچانک روتے ہوئے کہا تھا کہ تم میری طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ مجھے تمھارے پاس آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا ہے۔ ہر وقت کام کام کی رٹ لگائے رہتے ہو ـــــ آخر میں تمھارے پاس آئی ہوں کہ تم سے باتیں کروں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ادھر دو ماہ سے تمھاری طبیعت خراب ہے۔ یہاں آکر میں نے یہ تو دیکھا کہ تم روزانہ دوا کھاتے رہتے ہو وہ بھی بھابی کے کہنے پر۔ کیا تم اپنے آپ کے دشمن ہو۔ ایسا کیوں کرتے ہو بھیا ـــــ اپنی صحت کا خیال رکھو وہ روتی ہی رہی ـــــ

اس نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ تم روتی کیوں ہو۔ کیا میں مرجاؤں گا۔ تم روتی کیوں ہو ـــــ اور کیا تمھارے آنسو میری بیماری کو یا میرے کام کو کم کرسکتے ہیں۔ دور کرسکتے ہیں۔ تم روؤ نہیں میری بہنا ـــــ اتنا کہہ کر اس نے ٹیبل پر رکھی ہوئی چائے کی پیالی اٹھا کر اپنی بہن کو دی تھی۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کرتا تھا۔

تم روتی ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بہن چائے کی پیالی لینے کے بجائے اس کی گود میں سر رکھ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اس نے رونے کی آواز سن کر اس کے بچے آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اپنی ممی اور ماما کے قریب آئے۔ اور ممی کو روتے ہوئے دیکھ کر دونوں لڑکیاں اور لڑکا زور زور سے رونے لگے۔

اس نے کرسی پر سے اٹھ کر دونوں لڑکیوں اور لڑکے کو اپنے پاس بلالیا۔ دونوں لڑکیوں کو ٹیبل پر بٹھادیا اور لڑکے کو گود میں لے کر کہنے لگا ـــــ پیارے بچو! روتے کیوں ہو۔ کیا میں مرنے والا ہوں۔ ارے ارے تمھیں دیکھ کر میں کتنا خوش ہوتا ہوں۔ کتنا خوش ہوتا ہوں۔ مگر بچے اپنی ماں کو روتا دیکھ کر ماما کی باتوں سے بے اثر ہی رہے۔

ٹیبل پر رکھی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی بچی کو آواز دی۔ دیکھو بیٹا یہ چائے لے جاؤ۔ اور دوسری گرم چائے لے آؤ۔ کیوں بہنا تم گرم چائے پیوگی نا ـــــ ارے تم ہنستی کیوں نہیں ـــــ میری پیاری بہنا ـــــ

بہن نے ایک ہچکی لی۔ اور زور سے رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر اس کی ماں بھی دیوان خانے میں چلی آئی۔ کیوں کیا ہو رہا ہے؟ کیوں رو رہی ہو بیٹی ـــــ؟ بہن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ساڑی کے پلّو سے آنکھیں پوچھنے لگی۔ اور اس کی دونوں لڑکیاں اور لڑکا حیرت زدہ کبھی وہ اپنی ممی کو، کبھی

اپنی نانی کو اور کبھی ماما کو دیکھ کر وقفہ وقفہ سے رونے لگے۔

اس کی نظریں زمین میں دھنسی ہوئی تھیں۔ماں، بھنا کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اور بار بار ایک ہی سوال کر رہی تھی کہ بیٹی کیوں رو رہی ہو۔اور بھنا ہے کہ بت بنی بیٹھی ہوئی ہے۔تینوں خاموش ہیں۔ماں بیٹا اور بیٹی۔اور تینوں بچے بھی بڑوں کی خاموشی کو گمبھیر بنائے ہوئے ہیں۔اچانک ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔اور وہ خاموش چہرہ متفکر پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔بھنا نے اپنی دونوں لڑکیوں سے کہا کہ بچیو تم جاکر باہر آنگن میں کھیلو۔دیکھتے نہیں کہ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔پھر اپنے لڑکے سے کہا۔جاؤ بیٹا تم بھی۔باجی کے ساتھ کھیلو——لڑکا ماما کی گود سے اترا۔اور اپنے کرتے سے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔پھر اپنی بہنوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

ماں نے روتے ہوئے کہا۔کیوں بیٹے تمھیں کون سا روگ لگا ہوا ہے کہ تمھاری بیوی ہر خط میں یہی لکھتی ہے۔تمھاری اس سال طبیعت گرتی جارہی ہے۔اور ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہتے ہو کہیں کسی آسیب کا سایہ تو نہیں ہوا——تم بہت چھوٹی عمر سے راتوں کے جاگنے اور سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرنے کے عادی رہے ہو۔بہو کہہ رہی تھی کہ تم یہاں بھی یہی سب کچھ کرتے رہتے ہو۔تم کسی عامل سے ملتے تھے یا نہیں؟ وہ خاموش ہی رہا——

ماں نے پھر کہا——تم کچھ کہتے کیوں نہیں——؟

ماں میں کیا کہوں——میں خود نہیں جانتا کیا کچھ ہو رہا ہے۔میں کیوں موم کی طرح پگھلتا جا رہا ہوں——اس نے دھیرے دھیرے کہا۔

اسی لئے تو میں کہتی ہوں تم کسی عامل کو بتاؤ۔تمھیں ضرور کسی آسیب کا سایہ ہوا ہے۔

تم نہیں جانتی ہو۔میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا——

ہاں میں جانتی ہوں۔ماں نے روتے ہوئے کہا۔تمھارا اگر بس چلے تو تم مجھ پر بھی یقین نہیں رکھوگے۔

ماں تم سمجھتی کیوں نہیں۔وہ جھنجھلا گیا۔آسیب واسیب سب ہماری سمجھ کا پھیر ہے۔میں تم بن کر اپنے آپ کو نہیں سوچ سکتا۔

ماں ہاں میں جانتی ہوں۔تم نہیں مانوگے مگر.....

ایسی بات نہیں ہے ماں۔تم میری بات کو سمجھو۔بیماری معمولی ہے تم سب اتنے پریشان کیوں ہو۔ دیکھو میں بھلا چنگا ہوں تم فکر مت کرو۔

پلنگ پر لیٹی ہوئی، اس کی بیوی نے اندر کمرہ میں سے کہا میں ہر وقت کہتی ہوں کہ رات دیر تک

نہ جاگا کرو۔ مگر یہ کسی کی بات مانیں تب نا۔۔۔۔۔ ارے تم کیا کہہ رہی ہو۔ خاموش لیٹی رہو۔ دیکھو تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر نے تمھیں آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔

ماں اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ چپ رہو چپ تمھاری وجہ سے میری بہو بھی بیمار ہو گئی۔

کیا کہہ رہی ہو ماں۔۔۔۔ ایسا نہ کہو۔۔۔۔ میری وجہ سے۔ کیوں ثمینہ ماں جو کہہ رہی ہے کیا یہ سچ ہے۔۔۔۔؟

میں کیا کہوں۔۔۔۔

تم بھی ان کے ساتھ ہو گئی ہو۔۔۔۔!

بہنا پھر رونے لگی۔۔۔۔ بھیا تم گھر چلو۔۔۔۔

کیا یہ گھر نہیں ہے۔۔۔۔ تم.......

ماں نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تم دونوں بیمار ہو۔ تم دونوں کی یہ حالت دیکھ کر تمھارا لڑکا پریشان نہ ہو جائے۔ اور وہ اپنے پوتے کو گود میں لئے میرا لاڈلا میرا پیارا کہتے ہوئے اس کے گالوں پر چٹ چٹ پیار کرنے لگی۔

لڑکا کھلونے دیکھ کر دادی سے کہنے لگا۔ پپا لائے ہیں۔۔۔۔

اچھا تمھارے پپا کھلونے بھی لائے ہیں۔ تمھارے پپا کو کیا ہوا ہے بیٹا؟ لڑکے کے لئے دادی کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لڑکا دادی کی گود سے اٹھ کر اس کی بہنا کے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔۔۔۔

بہنا بدستور رو رہی ہے۔۔۔۔

ماں نے بہنا سے پوچھا۔ بیٹی تو اتنا کیوں رو رہی ہے۔ تیرا بھیا اچھا ہو جائے گا۔

پیاری بہنا تمھیں رونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے میں بیمار نہیں ہوں خدا کے واسطے تم رونا بند کر دو۔۔۔۔

بہنا اور زور زور سے رونے لگی۔

ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ تم نے وطن سے آتے وقت بار بار کیوں بھیا کے پاس آنے کے لئے کہا تھا۔ اسی لئے کہ تم یہاں آکر روتی رہوگی۔ دیکھو بیٹا تمھارے پاس آنے کے لئے یہ بے چین تھی۔ اور جس رات یہاں آنے کا ارادہ تھا۔ تمھاری بہنا سوئی ہی نہیں تھی۔۔۔۔

اس نے کرسی پر سے اٹھ کر اپنی بہنا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور بڑی شفقت سے کہنے لگا۔ بہنا تم

رو رہی ہو ۔ ارے کیا تمھارا بھیا مر جائے گا چل چل میری پیاری بہنا نہ رو نہ رو ـــــ دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں ـــــ نہیں بھیا مجھے کچھ نہیں چاہئے ـــــ وہ بدستور روتی رہی ـــــ

وہ وہیں فرش پر بہنا کے بازو بیٹھا۔ چھوڑو تم میری بیماری کو میں بیمار نہیں ہوں ۔ بھیا بھیا بھیا پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔ تم سمجھتے کیوں نہیں بھیا ـــــ

مگر میں کیا سمجھوں ـــــ

ہاں بیٹی تم اتنا کیوں رو رہی ہو اور خود ماں بھی رونے لگی ۔

اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چہرے کو بھی صاف کیا۔ اور اندر کمرہ میں جہاں اس کی بیوی پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی پوچھا۔ کیا تم نے ان سے کچھ کہا تھا۔ بہنا مسلسل کیوں رو رہی ہے ؟

نہیں میں نے ان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ بیوی نے تعجب کرتے ہوئے کہا ـــــ پھر بہنا کو کیا ہو گیا ہے ـــــ !

باہر سے اس کا لڑکا روتے ہوئے اندر کمرے میں چلا آیا۔ پپا پپا وہ پم پم نہیں دے رہی ہے

اچھا اچھا ہم تمھیں اور ایک پم پم لا کر دیں گے ۔ تم چپ رہو ـــــ اس کا لڑکا اس کے پیروں سے لپٹ گیا ـــــ اور پم پم کی رٹ لگا رکھی ـــــ

ادھر دیوان خانہ میں دونوں ماں اور بیٹی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں۔ بہنا بدستور روتے ہوئے اپنی بات کہہ رہی تھی۔

وہ آنگن میں رکھے ہوئے پانی کے مٹکے سے پانی لے کر پینے لگا۔ اسے راحت سی محسوس ہوئی . اس نے نل کے قریب جا کر ٹونٹی کھول دی پانی نل سے گرنے لگا۔ اس نے نل کی ٹونٹی بند کر دی ۔ اور ٹنکی کے نل کی ٹونٹی کھول دی۔ پانی ٹنکی میں آواز کے ساتھ گرنے لگا۔

ماں بیٹی سے کہنے لگی۔ تم کچھ بھی کہو۔ اسے ضرور کسی آسیب کا سایہ ہوا ہے خاموش خاموش رہتا ہے ۔ دیکھو تو جب پچھلی چھٹیوں میں گھر آیا تھا تو اس کی صحت کتنی اچھی تھی۔ مگر اب تو آدھا اتر گیا ہے ۔

اس کے اور بہنا کے بچے نل کی ٹونٹی کھول کر پانی میں کھیلنے لگے ۔ بچوں کے کپڑے گیلے ہو گئے اس کی بیوی پلنگ پر لیٹے لیٹے بچوں سے کہنے لگی۔ وہاں سے ہٹ جاؤ سردی لگ جائے گی۔

وہ بیوی کے پلنگ کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بچوں سے کچھ بھی نہ کہا ـــــ

ہاں ماں بھیا کو کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے ۔ وہ اتنے خاموش نہیں رہتے تھے ، پہلے ـــــ دیکھو آٹھ دن سے گم سم ہیں ۔

ہاں بیٹی ضرور کوئی آسیب کا سایہ ہوا ہے۔
ماں ایک بات کہوں تم برا تو نہ مانو گی ــــــ
میں تیری بات کا برا کیوں مانوں گی بیٹی ــــــ
ماں جب ہم یہاں آرہے تھے نا ــــ اس رات میں سو نہیں سکی تھی۔ ایسا نہیں ہے۔ ماں میری آنکھ کچھ دیر کے لئے لگ گئی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔
کیوں کیا ہوا تھا بیٹی۔ تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا تھا ــــــ
ماں مجھے ڈر لگ رہا تھا ــــ
ڈر کس بات کا ــــ؟
ماں کیا کہوں ــــ کیسے کہوں ــــ اب بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔
مگر کیوں ــــ
کیا کہوں ماں ــــ بھیا بھیا کو میں نے ......
کیا ہوا ــــ ایسا کیوں کر رہی ہو بیٹی کہو ــــ کیا کہنا چاہتی ہو ــــ
نہیں ماں میں بھیا کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکتی۔ میں نہیں کچھ کہوں گی۔ بہنا پھر رونے لگی ــــ
کہتی کیوں نہیں بیٹی، رو کیوں رہی ہو ــــ
وہ بھیا ــــ میری آنکھ لگی تھی نا ــــ جب ..... جب میں نے دیکھا بھیا کے ٹیبل پر رکھا ہوا دودھ ــــ نہیں ماں ــــ میں نہیں کہوں گی۔ کہہ بھی دے بیٹی کیا آسیب کو دیکھا تھا ــــ
نہیں ماں ــــ وہ دودھ ...... دودھ ٹیبل پر رکھا ہوا ــــ بلی نے پی لیا۔ بھیا باہر دالان میں پانی پینے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اور بلی دیکھتے ہی دیکھتے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔
بہنا بدستور رونے لگی ہے۔
پلنگ پر لیٹی ہوئی اس کی بیوی زور سے چیخی ــــ اور اٹھ بیٹھی ــــ نہیں ــــ ایسا ہرگز نہ کہو ــــ
اس نے بہنا کے قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور زیر لب مسکرا دیا۔ □

ڈاکٹر جمیل جالبی
کراچی ، پاکستان

جدید اردو افسانے کے رجحانات

خدا نے جس دن انسان کو پیدا کیا اور شیطان سے سجدہ کرنے کے لئے کہا اسی دن ایک افسانہ پیدا ہو گیا شیطان نے جب انکار کیا تو اسی کے ساتھ "کشمکش" کا عمل اور تصور بھی وجود میں آگیا۔ یہ کشمکش اس وقت اور نمایاں ہوئی جب شیطان نے ماں حوا کو ورغلایا اور ماں حوا نے وہ کام کیا جس کے لئے انھیں منع کیا گیا تھا۔ حوا کی بیٹیاں بفضلِ تعالیٰ آج تک یہی کام کر رہی ہیں۔ شاید پہلا افسانہ وہ تھا جو ماں حوا نے گندم کھانے کے بعد باوا آدم کو سنایا اور بتایا کہ کیسے ایک سانپ نے انھیں گندم کھانے پر آمادہ کیا اور وہ گندم سمر غزیز کی قسم کیا مزیدار تھا۔ ماں حوا اسے باوا آدم کے پاس لے کر آئیں اور غمزوں، عشووں اور اداؤں کے ساتھ کہا کہ وہ بھی اسے کھائیں۔ یہ انسان کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ اس دن سے لے کر آج تک اولادِ آدم جن نتائج تک پہنچی ہے انھیں ماں حوا کی طرح بیان کر دیتی ہے اور اولادِ آدم کا یہ بیان افسانہ ہو جاتا ہے۔

زندگی واقعات اور کشمکش سے معمور ہے اور ان کا بیان افسانہ نگاری ہے۔ اسی لئے افسانہ انسانی فطرت اور اس کی زندگی کا اہم جزو ہے۔ ہر ملک، ہر قوم، ہر زبان میں کسی نہ کسی شکل میں یہ موجود ہے اور ہر شخص افسانے، کہانی میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ لوگ بچوں کی طرح ہیں اور کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے کے ساتھ ساتھ کہانی کی شکل اور نوعیت بدلتی گئی ہے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پہلے پہلے افسانے محض واقعات ہوں گے مگر بعد میں، انسان اپنی مشکلات، اپنے مصائب اور مسائل کو دیکھ کر، ان کہانیوں میں دل خوش کرنے والے خواب بھی دیکھنے لگا ہوگا اور اس طرح وہ "جو کچھ ہوا" کی منزل سے گزر کر "جو کچھ ہونا چاہئے" کی منزل تک آگیا۔ "جو کچھ ہونا چاہئے" کی خواہش نے مافوق الفطرت باتوں اور افراد کو جنم دیا۔ آگے چل کر بعد کے ادوار میں مذہب و اخلاق کے اثر نے ان کہانیوں میں تمثیل کا رنگ بھرا اور اس طرح انسان کا یہ فطری رجحان "فن" کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جسے ہم "عقل کا دور" کہتے ہیں۔ اس دور میں اس بات پر زور دیا گیا کہ "حقیقت" افسانے سے زیادہ پُر اثر اور دیرپا ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ رجحان پیدا ہوا کہ ایسے قصے بیان کئے جائیں جن میں حقیقت اور صرف حقیقت ہو۔ یہی رجحان ناول کی پیدائش کا سبب بنا۔ لفظ "ناول" کے لغوی معنی نئے کے ہیں۔ یعنی ایسا نیا جو پرانے سے مختلف ہو۔ اس طرح ناول میں مافوق الفطرت یا تمثیلی افراد کے بجائے حقیقی افراد و واقعات کے قصے بیان کئے جانے لگے۔ انھیں قصوں کے اندر چھوٹے چھوٹے قصے بھی آجاتے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے قصے مختصر افسانے کی ابتدائی شکلیں ہیں۔ چنانچہ مختصر افسانے کی اولین مثالیں کسی بڑے ناول سے لئے ہوئے وہ چھوٹے قصے ہیں جو ناول کے قصے سے الگ ہیں اسی قسم کے قصے ہماری "داستانوں" میں بھی ملتے ہیں جن کا داستان کے مرکزی حصے سے بظاہر یا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اگر انہیں داستان سے الگ کر دیا جائے تو داستان کے مرکزی قصے پر کوئی خاص اثر بھی نہیں پڑتا۔ ان قصوں کو ہم افسانوں کی ذیل میں لا سکتے ہیں۔ یہی افسانے کی ابتدا ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کے "ریڈ گانٹ لٹ" (RED GAUNTLET) میں ایک شخص 'ولی' ایک قصہ سناتا تھا۔ یہ قصہ انگریزی ادب میں مختصر افسانے کی ابتدائی مثال ہے۔

ایسے ہی چھوٹے چھوٹے قصوں کو دیکھ کر "ایڈگر ایلن پو" کو یہ خیال آیا کہ مختصر افسانے کو ایک الگ فن بنایا جا سکتا ہے۔ ایڈگر ایلن پو کے افسانوں کا مجموعہ اس اعتبار سے جدید افسانے کا پہلا مجموعہ ہے۔ اسی کے ساتھ یہ فن مقبول ہو گیا اور جلد ہی اس میں موپاساں اور چیخوف جیسے بڑے نام نظر آنے لگے۔ اب تو افسانہ ایک ایسی صنف ادب بن گیا ہے کہ شاید ہی کوئی مقبول یا نامقبول رسالہ ایسا ہو جس میں اسے اہمیت نہ دی جاتی ہو۔ ہمارے ہاں پریم چند نے اس صنف ادب کو اپنایا اور اپنی صلاحیتوں سے اسے ایسا مقبول بنایا کہ لکھنے والوں کی نئی نسل اسے لے اڑی اور اس منزل پر اسے پہنچا دیا جہاں آج یہ نظر آتی ہے۔ اگر شاعر حضرات برا نہ مانیں تو میں بلا تامل یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اس وقت افسانہ غزل سے بھی زیادہ مقبول صنف ادب ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ عام انسانوں کو دوسرے کے تجربات میں شامل ہونے اور دوسروں کی کہانیاں سننے کا شوق ازل سے ودیعت ہوا ہے۔ اس دلچسپی اور صنف ادب کی مقبولیت نے افسانے میں ایسا تنوع پیدا کیا کہ آج اتنی قسم اور اتنے رنگ کے افسانے نظر آتے ہیں کہ اب ان کی درجہ بندی بھی ممکن نہیں رہی ہے لیکن اس تنوع اور رنگا رنگی کے باوجود اچھے افسانوں میں ایک بات مشترک اور ضرور نظر آتی ہے اور وہ ہے "اتحادِ اثر"۔ اتحادِ اثر کے معنی یہ ہیں کہ مختصر افسانے میں ایک ہی واقعہ ہو، ایک ہی کردار آئے قصے کا رخ اور موڑ بھی ایک ہی ہو۔

یہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ متعدد اچھے افسانے ایسے ہیں جن میں ایک کردار نہیں بلکہ بہت سے یا کئی کردار ملتے ہیں۔ مثلاً غلام عباس کے افسانے "آنندی" میں، احمد علی کے افسانے "ہماری گلی" میں، حسن عسکری

کے افسانے "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" میں، احسن فاروقی کے "برقع والیاں" میں یا اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے "شمن ہیرا" میں سات آٹھ تاثرات بیان کئے گئے ہیں۔ عزیز احمد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ابوالفضل صدیقی، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، صادق حسین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، بانو قدسیہ، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی، قاضی عبدالستار، شوکت صدیقی، واجدہ تبسم، رام لعل، جوگندر پال اور دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی ایک ہی افسانے میں کردار اور تاثرات کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ گورکی کے افسانے "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" موپاساں کے افسانے "اُن وی (UNE VIE) میں بھی یہی عمل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سارے کردار بنیادی طور پر ایک ہی کردار کا حصّہ ہوتے ہیں۔ گورکی کے افسانے میں چھبیس کے چھبیس مرد ایک لڑکی کی بدلتی زندگی کو دیکھنے کے سوا کچھ کر ہی نہیں رہے ہیں۔ مختلف ہاتھورن کی کہانی "تھری فولڈ ڈیسٹینی" میں ساری زندگی کا قصّہ آگیا ہے مگر قسمت کے وہی تین پہلو جو شروع میں سامنے آتے ہیں، ہر جگہ ساری کہانی میں موجود رہتے ہیں اور مرکزی کردار ایک ہی رہتا ہے۔ غرض کہ اتحادِ اثر، ہمیشہ کی طرح، آج بھی مختصر افسانے کی بنیادی و مشترک خصوصیت ہے۔ چیخوف نے تو اتحادِ اثر کو اس درجہ اہمیت دی کہ اس کے افسانوں میں کردار اور قصّہ دونوں غائب ہوگئے اور صرف تاثر ہی تاثر باقی رہ گیا۔ اسی اثر کو ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں استعمال کیا۔ مثلاً کرشن چندر نے جتنے افسانے لکھے ان میں مخصوص تاثر کو ابھارنے کے لئے ایسے نقشے جمائے کہ آخر میں سرمایہ دار سے نفرت اور مزدور سے ہمدردی کا اثر قایم ہو۔

تاثر کا یہ سلسلہ جب اور آگے چلا تو پھر افسانے کو ہر قسم کے نفسیاتی اور سماجی نظریات کے تجربوں کا آلۂ کار بنایا گیا۔ یہ کام اردو افسانے میں بھی ہوا اور مغرب کے افسانے میں بھی۔ اس رجحان کے ساتھ وہ لوگ سامنے آئے جو فرائڈ کی نفسیات کا سہارا لے کر اپنے افسانوں میں نفسیاتی الجھنوں کا تاثر پیش کرتے تھے۔ مثلاً انگریزی میں ڈی ایچ لارنس اور اردو میں منٹو، عصمت چغتائی، اور ممتاز مفتی کے نام اس سلسلے میں لئے جاسکتے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ "شعور کی رو" (STREAM OF CONSCIOUSNESS) والے افسانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انگریزی ادب میں اس کی ممتاز نمائندہ ورجینیا وولف اور اردو میں محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور ڈاکٹر احسن فاروقی ہیں۔ عسکری کے افسانے "چائے کی پیالی" اور "حرامجادی" قرۃ العین حیدر کے افسانے "جلاوطن" اور "ہاؤسنگ سوسائٹی" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

اردو افسانے نے ۵۰ سال کے عرصے میں بہت ترقی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت عرصے تک زندہ رہنے

والے متعدد افسانے وجود میں آگئے لیکن ہمارے دور میں افسانے کو سب سے زیادہ نقصان دو چیزوں سے پہنچا۔ ایک تو اس بات سے کہ اچھے ادبی رسالے تیزی سے غائب ہوگئے اور دوسرے اس بات سے کہ ڈائجسٹوں نے پست مذاق کو اتنا عام کیا، سنسنی خیزی، جرائم، فراریت، بیمار جذباتیت، جھوٹی رومانیت، جاسوسی، فرضی واقعات کی کہانیاں اتنی کثرت سے چھاپیں اور لکھنے والوں کو ایسا معقول معاوضہ دیا کہ سنجیدہ اور اچھے افسانہ نگار بھی اسی قسم کی کہانیاں لکھنے لگے۔ ادھر اخباروں نے اپنی اشاعت بڑھانے اور ادبی رسالوں کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لئے یہ کیا کہ وہ بھی ادب چھاپنے لگے۔ ظاہر ہے کہ وہ ادب جو اخباروں میں چھپتا ہے صحافت کی سطح سے بلند نہیں ہو سکتا۔ لکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اسے ایسی ہلکی پھلکی چلتی ہوئی سرسری چیز اخبار کے لئے لکھ کر دینی چاہئے جو اخبار کے قاری کے لئے مناسب ہو اور جسے وہ چلتے پھرتے پڑھ سکے۔ اسی کے ساتھ امپوسٹر (IMPOSTER)۔ اخباری ادیبوں کی ایک پلٹن تیار ہوگئی جو اخباروں کے کالم نویس بن کر داد لینے اور شہرت بٹورنے لگے۔ اب ادیب اور افسانہ نگار وہی لوگ رہ گئے جو باقاعدگی سے اخباروں میں چھپتے ہیں اور دوسرے لکھنے والے پبلک کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اس طرح ادب کے ابلاغ کے سارے ذرائع امپوسٹرز اور سوڈو انٹیلیکول کے ہاتھ میں آگئے جو اخباری پالیسی کے مطابق وقت پڑنے پر کبھی "بائیں" بن گئے اور کبھی "دائیں"۔ ان سب چیزوں نے بحیثیت مجموعی ادب کو شدید نقصان پہنچایا اور ادبی مذاق کو پست سے پست کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اور جب زوال آتا ہے تو پھر ادب اور صحافت میں، انتشار اور اتحاد میں، ترقی اور تنزل میں، دانش اور حماقت میں، انٹیلیکول اور سوڈو انٹیلیکول میں، اچھے اور برے میں، نیکی اور بدی میں، خود غرضی اور بے لوثی میں نفرت اور محبت میں، تعصب اور فراخدلی میں، حب الوطنی اور غداری میں، علاقہ پرستی اور قوم پرستی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور منفی قوتیں مثبت قوتوں پر حاوی آجاتی ہیں۔

بہرحال پریم چند کے بعد ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کے اردو افسانے پر نظر ڈالی جائے تو یہ تین رجحانات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

(۱) افسانے میں نئے نئے تجربے کئے گئے۔ قصہ یا قصہ پن کو افسانے کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ یہ جدید افسانہ ہے، داستان نہیں ہے، کہانی کو ایسا ہی ہونا چاہئے کہ اس میں کہانی نہ ہو۔

(۲) افسانے میں واقعیت یا ریئلزم کو حد درجہ برتا گیا اور اس میں نظریات کو ہر چیز سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ کبھی اشتراکیت کے نظریے سے زندگی کو دیکھا اور پیش کیا اور کبھی نفسیاتی تحلیل اور خاص طور

پر جنسی محرکات کے کرشموں کو رنگارنگ طریقوں سے پیش کیا۔ وہ تصورات، جو جنسی نفسیات کے ماہرین نے پیش کئے تھے، انھیں افسانے کا مواد بنایا گیا اور اس بات کو بھلادیا گیا کہ خود یہ تجربے زندگی سے قریب بھی تھے یا نہیں۔

(۳) افسانہ لکھنے میں سیدھے سادے افسانوی طریقے کے بجائے شعور کی رو، تاثراتی طریقے اور فلسفۂ وجودیت سے کام لیا گیا اور تکنیک کو خاص اہمیت دی گئی۔

پہلے رجحان سے یہ فائدہ ہوا کہ محض فرضی واقعات کی جگہ ایسی واقعیت نے لے لی جو علم پر مبنی تھی اور اسی لئے دعوتِ فکر دیتی تھی۔ تیسرے رجحان سے یہ فائدہ ہوا کہ بیان کے نئے طریقوں نے سیدھے اور سپاٹ بیانیہ انداز کے بجائے جدید معنی میں فن کو پیدا کیا۔ ان تینوں رجحان نے اردو افسانے کو بہت آگے بڑھایا لیکن ۱۹۶۵ء کے بعد اردو افسانے میں جو رجحان پائے جاتے ہیں ان کی درجہ بندی اس طرح کی جاسکتی ہے۔

(۱) اب ایسے افسانے لکھے جارہے ہیں جن میں واقعیت کے بجائے، جس کو اب تک افسانے کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا تھا، زیادہ تر زور ما فوق الفطرت، تخئیلی اور جذباتی عناصر پر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اور افسانے کو ملا کر ایک کیا جارہا ہے۔

(۲) علامت کے ذریعے پرانی کہانیوں کو زندہ کیا جارہا ہے اور پرانی کہانیوں کو نئے معنی دیئے جارہے ہیں۔ ایسے افسانوں میں ابہام، رومانیت، پراسراریت اور تکرار کے عمل سے افسانے اور شاعری کی سرحدیں ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ انتظار حسین کے علامتی افسانے "شہرافسوس" "زرد کتا" اور "آخری آدمی" اسی ذیل میں آتے ہیں۔ انتظار حسین کی اشاریت تمثیلی نوعیت کی ہے جن میں پرانے قصوں کو نئے معنی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ "آخری آدمی" میں اساطیری علامتوں کو دورِ حاضر کے اخلاقی زوال کی داستان بیان کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ "شہرافسوس" میں بھی داخلی عمل یہی ہے۔ شہرافسوس کی کہانی کے کردار ایک دوسرے پر ہر دم شک کرتے اور خود کو معصوم سمجھتے ہوئے لوگ اسے اخلاقی زوال کا اظہار کرتے ہیں۔ انور سجاد نے اپنے مجموعے "استعارے" میں بھی پرانی علامتوں کو نئے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً سنڈریلا اور پرومیتھیس تو یوروپ کے ادب کی جانی پہچانی علامتیں ہیں۔ سنڈریلا عورت کی جنسی خواہش کی اور پرومیتھیس فنکار کی انقلابی قوتوں کی۔ اسی طرح بعض نئی علامات بھی استعمال کی ہیں اور ان میں واقعاتی رنگ بھی ہے۔ انور سجاد نے انھیں اپنے دور سے ملانے کی بھی کوشش کی ہے ان علامتی افسانوں میں ایک بات تو یہ مشترک ہے کہ ان میں شاعری اور افسانے کو تخئیل کی سطح پر ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انتظار حسین نے اپنے علامتی افسانوں میں غزل کے مزاج کو اور انور سجاد نے شاعری اور مصوری کے مزاج کو تخئیل کی سطح پر افسانے

میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اظہار، تیکنیک اور کہانی کو جما کر پیش کرنے کی قوت کے اعتبار سے انتظار حسین نہ صرف علامتی افسانے کے پیش رو ہیں بلکہ انور سجاد سے زیادہ پر اثر ہیں۔

(۳) ایسے افسانے کثرت سے لکھے جا رہے ہیں جن میں سماج کے زخموں کو چیر کر مرہم لگائے بغیر یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ آخر زندگی کا حاصل موت ہے۔ ایسے افسانوں کے ذریعے فن انتشار پیدا کر رہا ہے اور منفی قوتوں کو ابھار رہا ہے۔ ادب کا وہ دائمی معیار کہ ادب کا اثر تزکیاتی (کیتھارسس) ہوتا ہے ان افسانوں میں نظر نہیں آتا۔ تزکیاتی اثر ادب کا مثبت رجحان ہے۔ ادب میں کیتھارسس کے عمل سے ارسطو کی مراد یہ تھی کہ ٹریجیڈی موت اور دہشت کے منظر ہی نہ پیش کرے بلکہ انسان کو ان سے بالاتر محسوس کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرے چنانچہ ٹریجیڈی موت کا مظاہرہ ہی نہیں بلکہ زندگی کو موت سے بالاتر اور فاتح کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔

(۴) ایک قسم کے افسانے وہ ہیں جو واقعیت سے تو نہیں ہٹے مگر اس واقعیت پر جذباتیت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ یہ افسانے وقتی اور عارضی سنسنی سی پیدا کر کے رہ جاتے ہیں اور جس کا اثر پڑھنے والے پر منفی ہوتا ہے۔ اس رجحان میں صرف کلبیت ہی نہیں ہے بلکہ بزدلی اور زندگی سے فرار کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں تاثر سے رنگ بھرا جاتا ہے اور غم کی دلدل میں دھنس کر لذت حاصل کی جاتی ہے۔

(۵) ایک قسم کے افسانے وہ ہیں جنھیں ہم تجریدی افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ افسانے علامتی افسانے سے آگے بڑھ کر تجریدی مصوری کی تکنیک کو افسانے میں استعمال کر رہے ہیں۔ اب تک جتنے افسانے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں بے معنویت کے گہرے ابہام کا انتشار موجود ہے اور "وحدت تاثر" کی جگہ "انتشارِ تاثر" کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں علامتیں ٹوٹی ہوئی نظر آئیں گی۔ شاعری کو افسانے سے ملانے کا عمل بھی نظر آئے گا اور واقعات کے بیان میں فوق الفطرت ماورائی عناصر غالب ہوں گے اور ایسا معلوم ہوگا جیسے مکان کی چھت گر گئی ہے۔ اس نوع کے افسانوں میں بیمار رومانیت کا ایسا ابہام نظر آتا ہے جس میں حقیقی دنیا کا عکس یا اس کی روح کا دور دور پتہ نہیں چلتا۔

(۶) ایک اور قسم کے افسانے وہ ہیں جن میں لمحوں کی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں نہ کوئی ہیئت ہے اور تجربہ بھی خام اور ادھورا ہے۔ امریکی افسانہ نگار ولیم سرویاں نے بھی ایک طرح سے ایک لمحے کے افسانے لکھے ہیں لیکن ان میں افسانے کا بنیادی فن یعنی وحدتِ تاثر موجود ہے۔ لمحہ کے افسانوں میں تذبذب اور پریشانی و کرب کی سنسنی تو موجود ہے لیکن ان افسانوں کے گنبدِ بے در سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہاں اس ذہنی کیفیت کا پتہ چلتا ہے جسے ژاں پال سارتر "جہنم" سے تعبیر کرتا ہے۔ سارتر کے افسانوں میں اس کیفیت کو

ہمت اور احساس ذمہ داری سے توڑنے کی تلقین بھی ملتی ہے لیکن لگے کہ افسانے لکھنے والے، پڑھنے والوں کو ہلکان کرنا چاہتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اخلاقی طور پر بزدل اور نفسیاتی طور پر مذبذب ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر انسان تھک جاتا ہے اور زندگی کے مثبت پہلوؤں سے نظریں چرانے لگتا ہے۔ وجودیت میں تذبذب اور کرب (ANGUISH AND DISGUST) ضرور موجود ہے لیکن ساتھ ساتھ انتخاب (CHOICE) بھی موجود ہے۔ سارتر کے ہیرو اس انتخاب (CHOICE) تک ضرور پہنچتے ہیں۔

(۷) ایک قسم افسانوں کی وہ ہے جن میں چٹکلوں پر افسانہ لکھا جاتا ہے۔ یہ افسانہ تو چند سطروں میں ختم ہو جاتا ہے یا پھر ایک آدھ صفحے میں بیان کر دیا جاتا ہے لیکن ان میں کسی ہلکے یا گہرے تجربے کا پتہ نہیں چلتا۔ جوگندر پال نے اس قسم کے افسانے لکھے تھے لیکن اگر افسانے میں زندگی کا تجربہ شامل نہ ہو تو وہ پڑھنے والے کی زندگی میں کیسے شامل ہو سکتا ہے؟ یہ رجحان دیکھتے ہی دیکھتے مر گیا۔

افسانے کے ان سب جدید رجحانات کو دیکھ کر ہمیں اردو افسانے سے مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کوڑے میں کچھ ایسے پھول بھی کھلے ہیں جن میں رنگ و بو اور ہیئت کے مخصوص توازن کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ ان میں تجربہ پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ قصے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکا ہے۔ مختلف نظریات بھی حسب ضرورت استعمال میں لائے گئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو افسانے میں اب تک جو تجربات ہوئے ہیں۔ ان کو ایک نئی مرکزیت حاصل ہو رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ اب اردو افسانے کے ایک نئے دور کے آغاز میں بہت دیر نہیں ہے۔

یہاں میں نے آپ کے سامنے صرف چند نمایاں رجحانات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں چند رجحانات کا اور اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے اور افسانہ نگاروں کے افسانوں کے حوالے سے ان رجحانات کی مثالیں دے کر ان کی وضاحت کی جا سکتی ہے، لیکن یہ کام پھر سہی۔ □

ظفر اوگانوی
۲۵ اے، شمس الہدیٰ روڈ
کلکتہ ۷۰۰۰۱۷

زہر

سب کے سب چائے کی پیالیوں پر جھکے بہت ہی مایوسی کے ساتھ ایک سو ایک پھن والے ناگ کی چرچا کر رہے تھے کہ سینٹرل ایونیو کے کافی ہاؤس میں ہر طرح کے دانشور دسمبر کے آخری دنوں کی ٹھنڈ کو گھر جانے سے پہلے کافی یا چائے میں گھول کر پی جانا چاہتے تھے ــــ سارے ٹیبل بھرے ہوئے تھے لیکن اس ٹیبل کے گرد آٹھ کرسیاں تھیں اور ان میں سے ایک ابھی بھی خالی تھی۔ بغل کے ٹیبل پر سے ایک شخص اٹھ کر آیا۔ کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ اور مسکراتے ہوئے بہت ہی رازدارانہ انداز میں اس نے خبر دی کہ چڑیا خانہ سے بھاگا ہوا سانپ مار ڈالا گیا ہے۔ اس نے وضاحت کی ــــ سانپ سڑک پار کر کے دوسرے کمپاؤنڈ میں چلا گیا تھا۔ وہاں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان کی نظر اس سانپ پر پڑ گئی۔ بھاگا ہوا سانپ بچوں کو دیکھ کر ڈرا اور تیزی کے ساتھ رینگنے لگا کہ کہیں چھپ کر اپنی جان بچا سکے۔ مگر وہ بچے کھیل رہے تھے۔ پہلے وہ سانپ کو دیکھ کر ڈرے۔ پھر ان میں ایک ذرا بہادر لڑکے نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور بھاگتے ہوئے سانپ کے سر کو نشانہ بنا ڈالا۔ سر کچل گیا اور وہ سانپ دیکھتے دیکھتے بل کھاتا ہوا، لہراتا ہوا سیدھا رستی ہو گیا ــــ وہ ایک لمحہ خاموش رہا۔ کسی کے چہرے پر کوئی ردِ عمل نہیں تھا۔ نہ غم۔ نہ غصہ۔ اور نہ خوشی ــــ وہ اٹھا اور چہرے پر مسکراہٹ لئے اپنے ٹیبل پر واپس چلا گیا۔ اب ان میں سے ایک کے چہرے پر ردِ عمل جیسی کیفیت طاری ہوئی۔ اس نے چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگائی۔ پھر سگریٹ سلگائی اور تقریباً پھٹ پڑا۔

"یہ کیا خبر ہوئی۔ اس بیچارے کو۔ او بھائی سنو۔"

وہ چلا کر اس کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا:

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ سانپ جو مر گیا صرف ایک پھن کا تھا۔ ایک پھن کا۔"
سارا کا سارا کافی ہاؤس قہقہوں سے گونج اٹھا۔ وہ جھینپ گیا۔ شاید دونوں ہی فوری طور پر جھینپے تھے۔ لیکن اس نے خود کو سمیٹا اور اپنی کرسی پر سے اٹھ کر اس ٹیبل کے قریب پھر آ گیا اور خالی کرسی

کی پشت پر ایک ہاتھ رکھ کر اس سے براہِ راست مخاطب ہو گیا: —

"بہت قابل بنتے ہو۔ بقراط کی اولاد تمھیں اپنی کتابوں کے نیچے دفن کر دوں گا سمجھے؟"

"بھئی اس میں غصہ کی کیا بات ہو سکتی ہے — بیٹھ جاؤ اور چائے پیو۔"

وہ بیٹھ گیا اور چائے کی پہلی چسکی لیتے ہی ان میں سے ایک ہو گیا۔"

پھر سب کے سب چائے کی پیالیوں پر جھکے بہت ہی مایوسی کے ساتھ ایک سو ایک پھن والے ناگ کی بات کرتے رہے۔

"قصور اپنا ہے۔ ہم نے خود اس کو آتی شکتی دے رکھی ہے اور ہمیں اب محسوس ہو رہا ہے کہ ہم شاخوں کے اگلے چھور پر بیٹھ کے پچھلے حصہ کو کاٹنے میں لگے ہیں —"

"اور اب کیا ہوگا کہ ہم تباہی کے دہانے پر آچکے ہیں؟"

"چائے کی یہ بے کیف پیالیاں نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتی ہیں۔"

لیکن ان میں سے ایک نے ٹھنڈی پیالی سے خود کو نجات دلائی۔ اپنا سر اٹھایا۔ ان سبھوں کو دیکھا سب کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ساری نگاہیں چائے کی پیالیوں سے چپکی پڑی تھیں۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی چائے اور ٹھنڈی نگاہیں۔ سب کچھ منجمد تھا۔

"بس ایک یہ ممکن ہے کہ وہ آجائے اور شاید اب پہنچنے والا ہی ہو۔ وہ کوئی روشنی دے سکے گا کہ اس کے پاس ریفرنسز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ ہم سبھوں سے زیادہ قابل اور تجربہ کار ہے۔"

لگا کہ ٹھنڈی چائے اچانک کھول گئی ہو۔ پیالیوں پر کرنٹ آگیا ہو۔ سبھی انگلیاں ایک جھٹکے کے ساتھ الگ ہو گئیں۔ سبھی سر اٹھ گئے۔ سبھی گردنیں تن گئیں اور سبھی آنکھوں میں خوف جھانکنے لگا اور سبھی زبانوں پر لگے تالے ٹوٹ گئے۔

"ہم اپنی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ سارے حوالے پہلے ہی سے ہمارے پاس موجود ہیں۔ وہ ہم سے قابل کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس کو ہم پر فوقیت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ ابھی تک وہ اس حوالے کی صداقت کے لئے سرگرداں ہے جس سے ہم بہت پہلے ہی سرشار ہو چکے ہیں تمھیں اپنی بات واپس لینی ہوگی یا اپنے دعوے کو ثابت کرنا ہوگا۔"

وہ گڑبڑا گیا اور اس نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی پھر ایک ذرا جھک کر اس نے اپنی چوتڑ کے نیچے رکھی کتاب نکال لی اور خنجر کی طرح اس کتاب کو ان کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور پُرجوش انداز میں بولا۔

"یہ کتاب تم سبھوں نے یا تم میں سے کسی ایک نے دیکھی ہے۔"
یہ دیکھتے ہی دوسرا ذرا جھکا اور اس نے بھی اپنے نیچے سے کتاب نکال لی۔
"تم نے یہ دیکھی ہے۔"
پھر سبھوں کے ہاتھوں میں ایک ایک کتاب تھی۔
اس کے بعد ہی سب زبانیں پھر خاموش۔ سب گردنیں پھر خم۔ سب انگلیاں پیالوں سے چپک کر پھر منجمد۔

"تو یوں ہے کہ تم سب ان ایڈیشنوں اور ریفرنسوں کے بھکاری بنے ایک دوسرے سے خراج کی توقع میں متحرک ہو۔"

وہ آیا۔ ان سبھوں کو۔ ان سبھوں کی کھنسی انگلیوں میں خوبصورت جلدوں والی اور دیمک کھائی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر مسکرایا۔

"اور ایک میں ہوں۔ خالی۔ بالکل تنہا۔ غیر مسلم۔ کسی ریفرنس کے بغیر۔"

اور جس نے سبھوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ آنے والے کے پاس ریفرنس کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ کوئی روشنی دے گا وہ ہمیں بتائے گا کہ ایک سو ایک پھن کی تنکتی ہم نے اس کو کیوں دی اور اس زہر کی اب کیا کاٹ کی جا سکتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے نمایاں ہو گئے۔ پہلے تو اس نے اپنے سوٹ کا جائزہ لیا پھر ٹائی کی گرہ کو انگلیوں سے مس کیا۔ اور بہت ہی اطمینان کے ساتھ کوٹ اتار کر کرسی کے دستہ پر ڈالا۔ کف نہیں کھولے۔ دونوں آستینیں چڑھائیں اور پھر ایسا لگا کہ زبان اور گھونسے ایک ساتھ چلنے لگے ہوں۔

تم حرام...... ڈچ۔ تمھیں یہاں کس نے ترانخ ___ مادرہیں ڈھش۔ تمھارا انتظار کب تھا۔ بچاؤ۔ بچاؤ کی آواز سے کافی ہاؤس کی بھانت بھانت کی بولیوں سے بوجھل فضا اچانک بدل گئی کچھ اپنی اپنی سیٹوں پر کھڑے ہوئے، بیٹھے اور سناٹے میں گم ہو گئے۔ کچھ اندر سے باہر بھاگے۔ کچھ باہر سے اندر تماشا دیکھنے کے لئے جھانکنے لگے۔ اور وہ اپنی اپنی مٹھیوں میں کتابیں دبائے مورتیں بنے کھڑے دیکھتے رہے لیکن وہ تنہا اور غیر مسلم آدمی اپنے جبڑوں سے رستے ہوئے خون کو محسوس کر کے غش کھا گیا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا ___ منیجر آیا اور چار فٹ کے فاصلہ پر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے بیروں کی صف تھی سفید چہرے سفید یونیفارم، اور نیوڑھائے ہوئے سر۔

اس نے دور کھڑے ہوئے منیجر کو دیکھا اور آگے بڑھا تو لگا کہ موت کا فرشتہ منیجر کے قریب جا رہا ہو۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا مگر اس نے منیجر کے کاندھے پر ہاتھ کچھ اس طرح رکھا کہ جیسے وہ اس کو ہوش میں لانا چاہ رہا ہو

"تم اطمینان رکھو۔ وہ مرا نہیں ہے اور اگر مر بھی جاتا تو تمھاری ملازمت پر کوئی حرف نہ آتا۔ میں اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہوں۔"

اور پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا جن کی مٹھیوں میں خوبصورت جلدوں والی کتابیں تھیں:

"آپ سبھوں کو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ غلط آدمی تھا۔ اور ہم سب جاہل آدمی کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔"

اب ان سبھوں میں کچھ زندگی کی علامت پائی گئی اور ان کے منہ سے کچھ لفظ جیسی کوئی چیز نکلی:

"مگر ہم کیا کریں اور اس شخص کا کیا ہوگا۔"

"آپ یہ سب کتابیں میرے حوالے کر دیجئے اور اس زخمی کو کسی قریب کے نرسنگ ہوم میں لے جا کر فرسٹ ایڈ دیجئے۔ اس کے بعد وہ جہاں کہے پہنچا دیجئے۔ اور ہاں کل ٹھیک شام آٹھ بجے میں بلو نوٹس میں آپ تمام دوستوں کا انتظار کروں گا۔ اور وہ جو سب سے زیادہ قابل ہے اور جس کے پاس سب سے زیادہ ریفرنسز ہیں، سب سے زیادہ ہوش مند اور تجربہ کار ہے کل وہیں ہم سبھوں سے ملاقات کرے گا۔"

انھوں نے اپنی اپنی کتابیں اس کے حوالے کر دیں۔ وہ ہر ایک کتاب کو ٹیبل پر کچھ اس طرح پٹختا رہا کہ اس سے خوامخواہ ایک رعب پیدا ہو۔ اسی پٹخنے میں ایک بار ایک کتاب ٹی پوٹ سے لگی۔ پوٹ ٹیبل کے نیچے لڑھک گئی۔ ایک چھناکہ ہوا۔ منیجر پھرکا نیا۔ تماشہ دیکھنے والوں میں کچھ پھر کم ہو گئے۔ اس نے ایک بیرے کو قریب بلایا۔ کتابیں اٹھانے کو کہا۔ پھر اس نے کرسی پر سے اپنا کوٹ لیا۔ بے نیازی کے ساتھ کندھے پر ڈالا۔ بیرے کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کو آگے بڑھتے دیکھ کر منیجر اور بیرے دورویہ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ دروازے پر تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ وہ بہت ہی تمکنت سے ان سبھوں پر ایک فاتحانہ نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اور ان سبھوں نے اس کے سارے احکامات کی پابندی کی۔ زخمی کے منہ پر پانی کا چھینٹا ڈالا۔ درد سے کراہتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"میں کہاں ہوں۔"

اتفاق سے فرسٹ ایڈ کا سامان کافی ہاؤس میں ہی موجود تھا۔ اس کے زخم صاف کر کے پٹی باندھی گئی۔ کافی منگائی گئی۔ اس نے گرم کافی کے دو ایک گھونٹ لئے۔ تازہ دم ہو کر اپنے حواس جمع کئے ان سبھوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور پوچھا کہ وہ کہاں گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سبھوں کی کتابیں لے کر چلتا بنا ہے۔ یہ سن کر وہ ایک لمحہ کو خاموش رہا پھر بولا:

"میں دراصل وہی شخص ہوں جس کے پاس ہوش مندی سبھوں سے زیادہ ہے۔ ریفرنسز کی بتات ہے سبھوں سے زیادہ قابل ہے یعنی کہ میں۔ میں آپ کو روشنی دے سکتا ہوں۔"

اب جب کہ سب کے سب غیر مسلم تھے، ہنستے تھے۔ اور خونیں منظر سے دوچار ہو چکے تھے۔ اس کی باتوں سے وہ پھر نئی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے پھر بھی ان میں سے ایک نے اس سے پوچھا کہ تمھاری اطلاع کیا ہے۔

جواب میں اس نے اپنے پینٹ کا بیلٹ کھولا۔ زیپ اوپر سے نیچے کھسکائی اور ایک ہاتھ پیچھے کی اور سے پینٹ میں لے جا کر باہر نکالا۔ ہاتھ جب باہر نکلا تو اس میں ایک پاکٹ سائز کی کتاب پھنسی ہوئی تھی۔ وہ سب اس کی اس ساری کارروائی کو کچھ اس طرح دیکھتے رہے تھے جیسے بچے تھالی بجانے کے بعد مداری کے خالی پٹارے سے خرگوش یا سفید چوہے کے نکلنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ اس نے کتاب کھولی، کچھ صفحات الٹے اور ان کی طرف فتح مندی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

"اس ناگ کے زہر سے تالاب کا پانی۔ تالاب کے اوپر کی فضا تک زہریلی ہو چکی تھی۔ کرشن پر کالیا ناگ نے اپنے ایک سو ایک پھنوں سے حملہ کرنا چاہا۔"

وہ سب مرعوب تھے کہ ان کے علم و فضل کے خزانہ میں اس ریفرنس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

"پھر کیا ہوا۔"

ان سبھوں نے ایک زبان ہو کر سوال کیا۔

"اس نے بھگوان کرشن پر ایک سو ایک پھنوں سے حملہ کرنا چاہا تھا۔"

جب اس نے پھر وہی پرانی اطلاع دی تو سب کے سب سوال بن کر پھٹ پڑے:

"ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اور اس سے کس طرح نجات حاصل کی گئی۔"

اس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ زبان پر کانٹے اگ آئے۔ حلق خشک ہو گیا۔

"نجات فرار سے حاصل ہوتی ہے اور اس کی انتہا موت ہے۔"

"یہ زبردست فراڈ ہے۔"

وہ سب ایک ساتھ چیخے۔

"ہم تمھیں نجات دلائیں گے۔"

اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس پر بے ہوش کر دینے کے بعد جب وہ سب ہوش میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ تیجر تین فٹ کے فاصلہ پر سینہ پر ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ اس کے پیچھے بیروں کی

صف ہے۔ سفید چہرے، سفید یونیفارم اور نیوڑھائے ہوئے سر۔

کافی ہاؤس خالی ہو چکا تھا گرچہ ابھی آٹھ بجے تھے اور آدھ گھنٹہ کے بعد معمول کے مطابق اس کو بند ہونا تھا۔ رات سرد تھی اور دسمبر کی آخری راتوں کی سردی کے باوجود ان سبھوں کا خون گرم تھا۔ تماشائی منتشر ہو چکے تھے۔

ان میں ایک آگے بڑھا۔ اپنے ہاتھ جھاڑے اور اس کی پاکٹ سائز کتاب زمین پر سے اٹھائی۔ اس کو ٹیبل پر رکھا۔ ورق ورق الگ کئے۔ اور ایک سے ماچس مانگ کر آگ لگا دی۔ اس کے بعد اس نے ایک لمحہ کو غور سے اس آگ کو دیکھا۔ اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ پھر پہلے وہ اور اس کے بعد وہ سب کے سب اس زخمی بے ہوش قابل آدمی کو چھوڑ کر کافی ہاؤس سے باہر نکل آئے۔ اور سینٹرل ایونیو کی شاہ راہ کے کشادہ فٹ پاتھ پر ایک سکنڈ سب ایک دائرے میں کھڑے ہوئے۔ اس نے سبھوں کو رازدارانہ انداز میں حکم دیا کہ کل بلو فوکس کوئی نہیں جائے گا۔ سبھوں نے گردنیں خم کیں اور منتشر ہو گئے۔ ☐

آغا سہیل
لاہور

روشنی

اس کا جسم گداز ہے جلد مکھن کی طرح ملایم اور چکنی کہ ہاتھ پھسل پھسل جاتا ہے لیکن اس کی رنگت کیسی ہے، مجھے نہیں معلوم، ہاں نرم اور چکنی جلد کی تہہ میں ہلکی ہلکی آنچ سی چھپی ہوئی ہے جو میرے جسم کے رگ وپئے میں سرایت کر جاتی ہے اور اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں اندھا ہوں، دیکھ نہیں سکتا اور وہ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتی کیوں کہ شاید وہ گونگی ہے بول نہیں سکتی۔

میری دنیا کتنی محدود ہے۔ کتنی تاریک ہے، میری دنیا میں ہر چیز کا تعارف آوازوں کے ذریعے قایم ہوتا ہے اور آوازیں مجھ سے روز بروز دور ہوتی جاتی ہیں۔ ماں باپ جو بچپن میں بچھڑ گئے ان کی تو صورتیں مجھے یاد ہیں کیونکہ اس وقت میری آنکھوں میں روشنی موجود تھی، میں دیکھ سکتا تھا، کیف اور رنگ کی دنیا میں کھویا رہتا تھا، نیلا دھلا ہوا صاف اور شفاف آسمان، لہریں لیتا ہوا پانی، موجیں مارتا ہوا دریا، اڑتے ہوئے پرندے، رنگ برنگے پھول ہرے بھرے گلزار سرسبز کھیت، شاداب مرغزار سب میری دنیا میں داخل تھے ان سے میری دنیا میں روشنی ہی روشنی تھی، اجالا ہی اجالا تھا، لیکن جب سے میری آنکھیں گئیں میری دنیا میں صرف آوازیں ہی آوازیں رہ گئیں ہیں جن کے سہارے ہر چیز کی شناخت ہوتی ہے۔ میری دنیا میں بھلا اب کیا رہ گیا تھا، مگر وہ کہ جو میرے پاس راتوں کے سناٹے میں آتی ہے خاموشی سے میرے رگ وپے میں میرے لہو میں ترنگ بن کر دوڑ جاتی ہے میرے وجود میں گہرائی، احساس سب رعنائی بھر دیتی ہے۔ کہ اس کا جسم گداز ہے جلد مکھن کی طرح ملایم اور چکنی ہے۔ نرم اور چکنی جلد تہہ میں ہلکی ہلکی آنچ سی چھپی ہوئی ہے جو میرے روئیں روئیں میں حرارت اور تمازت کا نیا احساس جگاتا ہے میرے اندر ہزار ہا قطار اندر قطار شمعیں سی فروزاں ہو جاتی ہیں اور میرے وجود کا

ذرّہ ذرّہ منور ہو جاتا ہے اور میرے اندر زندہ رہنے کی خواہش پوری شدّت سے بیدار ہو جاتی ہے ورنہ سچ پوچھئے تو اندھے کی زندگی میں اور کیا رکھا ہے۔ صرف آوازیں ہی آوازیں جو روز بروز مجھ سے دور ہوتی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے صبح صبح ایک کرخت آواز مجھے بیدار کراتی ہے اور مجھے سخت سست سناتی ہے دو چار صلواتیں دس پندرہ گالیاں کوسنے اور میرے معذور ہونے کو ایک لعنت قرار دینے والی میری بھاوج کی آواز جس کے نزدیک میں عضو معطل اور فضول سی شے ہوں۔ پھر ایک نرم نرم لطیف سی میٹھی میٹھی آواز میرے کانوں میں رس گھولتی ہوئی میرے قلب کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یہ میرے بھتیجے کی آواز ہے جو مجھ سے پیار کرتا ہے۔ مجھے چاہتا ہے اپنی پیاری پیاری باتوں سے مجھے بہلاتا ہے۔ مجھ سے کہانیاں سنتا اور مجھے چوری چھپے بعض ایسی چیزیں کھلاتا ہے جس کی میری ظالم بھاوج رسید تک نہیں دیتی وہ مجھے اکثر گھر کے دروازے کی دہلیز پر لاکر بٹھا دیتا ہے اور آہستہ آہستہ چپکے چپکے مجھے گذرنے والے راہ گیروں، دکانداروں، کلرکوں، مزدوروں، سواریوں، چوراہوں کی سرخ پیلی اور ہری بتیوں کے جلنے اور بجھنے کے بارے میں بتاتا رہتا ہے۔ اس نے بعض دوسری شفیق اور مہربان آوازوں سے بھی میرا تعارف کرا دیا ہے کوئی ایک بوڑھی مائی ہے جو مجھے ہمیشہ دعائیں دیتی ہے کہ میری آنکھوں میں روشنی لوٹ آئے۔ بوڑھی مائی کا کمزور دبلا پتلا جھریوں سے بھرا ہوا ہاتھ اکثر میرے سر پر بھی پہنچا ہے۔ جسے اپنے ہاتھ میں لے کر میں نے اکثر چوم چوم لیا ہے بعض ناخوشگوار اور سنگ دل آوازیں بھی میری سماعت پر بھاری پتھر کی سل بن کر گری ہیں۔ بندر والا ڈگ ڈگی بجاتا ہے میں سنتا ہوں، بازار میں لتا، نور جہاں، رفیع، مکیش اور مرشدی کے کیسٹ بجتے ہیں میں سنتا ہوں۔ میرے گھر کے بالکل سامنے ایک اجڈ گنوار لٹھ مار ریٹائرڈ پولیس کانسٹیبل رہتا ہے جو ہمہ وقت چیختا چنگھاڑتا اور زمین پر ڈنڈا مار مار کر اپنی گونگی بیوی کو کوستا رہتا ہے۔ میرے بھتیجے نے بتایا ہے کہ گونگی کا یہ تیسرا شوہر ہے۔ تینوں آپس میں بھائی بھائی ہیں جب ایک مرا تو دوسرے نے گونگی کو اپنی جاگیر بنا لیا، دوسرا مرا تو تیسرے نے بنا لیا۔ تینوں کا غصہ قیامت کا ہے تینوں نے بے چاری گونگی کو مار مار کر ادھیڑ دیا ہے بلکہ تیسرے ہی نے اسے گونگا بنا دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ گونگی اپنے شوہر سے کسی بات پر لڑ جھگڑ رہی تھی کہ اس کے تیسرے شوہر نے دہکتا ہوا انگارہ اس کی زبان پر رکھ دیا۔

میرے بھتیجے نے بتایا ہے کہ گونگی کا شوہر رات دن چیختا چنگھاڑتا اور زمین پر ڈنڈے بجا بجا کر گونگی کو دھمکاتا رہتا ہے۔ گونگی اپنے کام میں لگی رہتی ہے۔ کام سے فرصت پاتی ہے تو کبھی اپنے دروازے سے

لگ کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ جیسے کسی کی راہ تک رہی ہو، کبھی پنجرے میں بند سپید رنگ کے آسٹریلین
طوطے کو گھنٹوں اور پہروں تکا کرتی ہے اور میرے بھتیجے نے ڈرتے ڈرتے یہ بھی بتایا کہ کبھی کبھار
چوری چھپے وہ مجھے بھی دیکھ لیتی ہے۔ میرا بھتیجا کہتا ہے کہ گونگی کے خاوند کا اب کوئی اور بھائی موجود
نہیں ہے، یہ سوچ کر ——— یہ سوچ کر میں اندر ہی اندر خوش ہوجاتا ہوں کیونکہ یہ بات میرے
بھتیجے کو بھی معلوم نہیں ہے کہ شاید گونگی کا چوتھا شوہر .... خیر یہ ایک موہوم سا خیال ہے
مگر کتنا امید افزا اور روشن روشن، کیونکہ اس کا جسم گداز ہے جلد مکھن کی طرح نرم ملایم اور چکنی ہے
ہاتھ پھسل پھسل جاتا ہے اور اس کی جلد کی تہہ میں ہلکی ہلکی تمازت اور آنچ سے میں پگھل پگھل جاتا
ہوں۔ میرا بھتیجا کہتا ہے کہ گونگی بہت خوبصورت ہے۔ چندا جیسا رنگ، تیکھا ناک نقشہ کمان سے
ابرو کالی گھٹا کی طرح گھنے سیاہ بال اور گونگی کے تینوں شوہر کالے سیاہ فام اجڈ گنوار اور لٹھ مار تھے۔

شہر میں کوئی جشن تھا پورا دن ہنگامے میں گذرا، رات میرے بھتیجے نے بتایا کہ شہر میں چراغاں
ہے اور آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا کہ میں اندھا ہوں آج کی رات میں نے دہلیز
پر بیٹھے بیٹھے گذار دی، وہ نہیں آئی، آجاتی تو میری روح کی تاریکی دور ہوجاتی، یہ کیسا جشن ہے
کیسی دیوالی ہے کہ گھر گھر چراغاں ہے مگر میری روشنی گم ہے۔ میں اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہوں
اور اپنی دہلیز پر بیٹھا روشنی کی راہ تک رہا ہوں۔ □

پاکستان
حیدر قریشی

پتھر ہوتے وجود کا دکھ

میں "جادو کے کھیل" کتاب سے ایک کھیل پڑھ کر اس کا عملی تجربہ کرنے کے لئے اباجی کی صندوق سے مشک کافور کی ٹکیاں نکال کر لاتا ہوں تب ہی ہمارے گھر کے عین سامنے والے گھر کی خوبصورت آنکھوں والی بچی آجاتی ہے۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں پانی میں آگ لگا سکتا ہوں۔ وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتی ہے۔ پھر جب میں مشک کافور کی ٹکیوں کو آگ لگا کر پانی میں آگ کا منظر دکھاتا ہوں تو وہ بے حد حیران ہوتی ہے۔ اس کی خوبصورت اور حیران حیران آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوتی ہے۔ اپنی آنکھیں موند کر میں اس چمک کو اپنی روح میں اتارنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں —— جب آنکھیں کھولتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ پانی میں آگ کے کھیل کی بجائے مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ اس حیرت میں محبت کی مدھم مدھم پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ سحر انگیز پرچھائیاں!

میں ابھی تک اس کے بچپن کے اس سحر سے ہی نہیں نکل پایا۔ مجھے معلوم ہے جونہی میں اس کے بچپن کے سحر سے نکلا اس کی جوانی کا طلسم مجھے پتھر بنا دے گا۔ اور تب جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی رسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا —— وہ مختلف موضوعات پر بے تکان بولے جارہی ہے۔ اور میں اس سے آنکھیں چار کرنے کی بجائے اپنی لائبریری کی بڑی ٹیبل پر نظریں گاڑے اس کی باتیں سن رہا ہوں اور صرف "ہوں ہاں" کر کے اپنا اخلاقی فرض پورا کر رہا ہوں —— گرمیاں آگئی ہیں، شاید اس وجہ سے چھت پہ لگے ہوئے ٹیوب بلب کی روشنی میں روشنی کے ڈھیر سارے کیڑے میری ٹیبل پر گر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے کیڑے کی ہلکی سی پھونک سے اڑ جائیں۔ میں ایک کیڑے کو پنسل کے ہلکے سے دباؤ کے ساتھ مسل دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کیڑا مر چکا ہے۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں مرے ہوئے کیڑے کو کچھ متحرک دیکھتا ہوں —— میں آنکھیں جھکائے جھکائے اسے متوجہ کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ کیڑا مرنے کے باوجود حرکت کر رہا ہے۔ وہ تھوڑا غور سے کیڑے کو دیکھتی ہے اور پھر ایک کھنکتا ہوا قہقہہ گونجتا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھنے کے لئے سر اٹھاتا ہوں مگر پھر گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ میں اس کے بچپن کے خوبصورت سحر میں

ہی گھرا رہنا چاہتا ہوں۔ اس کی جوانی کا طلسم مجھے پتھر بنا دے گا اور پھر جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا ـــــ اس کے کھنکتے قہقہے کی گونج ابھی تک کمرے میں موجود ہے اور پھر اس گونج میں سے اس کی آواز سرسراتی ہے ـــــ وہ کہتی ہے! "چھت پر لگے ہوئے پنکھے کی ہوا سے کیڑا متحرک نظر آتا ہے۔ وگرنہ کیڑا تو بے چارہ مرہی چکا ہے۔"

میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں اور پھر اس مردہ کیڑے کو دیکھتا ہوں جو پنکھے کی ہوا سے متحرک نظر آتا ہے۔ وہ پھر کہتی ہے! "لیکن جن کیڑوں کو تم نے نہیں مسلا وہ بھی مردہ ہی ہیں۔ یہ سارے کیڑے مردہ ہیں صرف پنکھے کی ہوا سے زندہ معلوم پڑتے ہیں۔ یہ بھی جادو کے کھیل ہیں، قسمت کے کھیل ہیں، ہم جو زندہ ہیں کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟"

وہ میرے بے حد قریب آجاتی ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں موند لیتا ہوں۔

وہ کہے جا رہی ہے! "کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟ ـــــ نہیں ـــــ ہم بھی قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں۔ جو صرف ہوا کے دباؤ سے متحرک ہو کر زندہ معلوم پڑتے ہیں۔"

وہ میرے بالکل قریب آکر میرا چہرہ اپنے تصور میں تھام لیتی ہے۔ میں خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں موند لیتا ہوں۔

وہ کہتی ہے! "میری طرف دیکھو! میں بھی ایک مردہ کیڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور تم بھی ..... مگر یہ تم نے آنکھیں کیوں موند رکھی ہیں؟"

(......... پھر جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا)

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ہم سب قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں۔" اور میں پتھرا جانے کے خوف سے بند آنکھوں پر ہاتھ بھی رکھ لیتا ہوں۔

وہ بڑی ملائمت سے میرے ہاتھ میری آنکھوں سے ہٹاتی ہے اور تب ہی میری اس سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ اس کی غزالی آنکھوں سے روشنیاں طلوع ہوتی ہیں ـــــ میں پتھر نہیں ہوتا بلکہ میں تو مسلسل پگھلتا جاتا ہوں ـــــ خوشبوئیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ ایک عجیب سی لذت کا احساس جاگتا ہے ـــــ میں بے سبب اس سے خائف رہا ـــــ میں بھرپور نظروں سے اسے دیکھتا ہوں اور روشنیاں اور خوشبوئیں اس کے جسم سے میری روح میں اتر کر رقص کرنے لگتی ہیں۔ میں اس نئے تجربے کی لذت میں گم ہوں ـــــ مجھے زندگی کا یقین ہونے لگتا ہے۔ وہ بھی خوش ہے مگر اس کی خوبصورت آنکھوں سے ایک انجانی اداسی جھلک رہی ہے۔

—

"ہم مردہ کیڑے نہیں ہیں، ہم زندگی کے گواہ ہیں، کم از کم تم اور میں۔"
میری بات سن کر وہ کچھ اور اداس ہو جاتی ہے۔

شہنائیوں کا ماتمی دھن سے میرا وجود سن ہوتا جا رہا ہے۔ چہرے کے علاوہ میرا باقی سارا جسم پتھر ہو گیا ہے۔ میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جس میں میں نے اپنے اور اس کے بچپن میں پانی میں آگ کا کھیل کھیلا تھا۔ وہ ابھی تک پانی میں آگ کو دیکھنے کے بعد مجھے حیرت سے دیکھ رہی ہے ـــــــ میری بائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جب روشنیاں اور خوشبوئیں اس کے جسم سے اتر کر میری روح میں رقص کرنے لگی تھیں۔

اس کی ڈولی روانہ ہونے والی ہے ـــــــ اور میں اپنے کہے لفظوں کی تردید کرتا ہوں۔

"اس نے سچ کہا تھا۔ ہم سب مردہ کیڑے ہیں جو قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں متحرک ہونے کے سبب زندہ معلوم پڑتے ہیں" ـــــــ اب مجھے اس کی انجانی اداسی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔

میرا چہرہ بھی پتھر ہونے لگتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میرا سارا چہرہ بھی پتھر ہو جائے۔ اس کے جسم سے میری روح میں اترنے والی خوشبوئیں میری سانسوں میں جم کر مشک کافور کی ٹکیاں سی بن جاتی ہیں۔ اس کی غزالی آنکھوں سے طلوع ہونے والی روشنیوں سے ان میں آگ لگتی ہے اور پھر میری آنکھوں کے پانی میں آگ تیرنے لگتی ہے اور میں اس پانی میں ڈوب کر اور اس آگ میں جل کر خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی آخری کوشش کرنے لگتا ہوں۔ تاکہ زندگی کا کچھ تو بھرم رہ جائے! □

ادبی انعامات

* اس سال کا مخدوم انعام اردو کی ممتاز افسانہ نگار عصمت چغتائیؒ کو ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی حیدرآباد نے عطا کیا۔
* اس سال کا بنگال اردو اکیڈیمی کا سب سے بڑا انعام اردو کے ممتاز مصنف اور انشاء پرداز ظ۔ انصاری کو عطا کیا گیا۔
* اس سال بنگال اردو اکیڈیمی نے عمدہ تصنیف و تالیف کا انعام "الفاظ" دو ماہی کے ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ کو دیا۔

ادارۂ "الفاظ" ان سب کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

مجلس ادارت
"الفاظ" علی گڑھ

زاہدہ حنا۔
۵۴/اے، بلاک ۱، گلشن اقبال
کراچی ۔ ۴۷، پاکستان

زرد ہوائیں، زرد آوازیں

ہوا سے جھولتی ہوئی خوش نما اور مزین گھڑی کے وسط میں بیٹھی کوئل اپنی چونچ کھولتی ہے اور کوکنے لگتی ہے، ایک، دو، تین ـــــ وہ گیارہ مرتبہ کوکتی ہے اور پھر خاموش ہو جاتی ہے۔ میں اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر اسے دیکھتی ہوں۔ یہ جو ابھی لمحہ بھر پہلے زندہ ہوئی تھی اب پھر خاموش ہو گئی ہے۔ ساکت و صامت، منجمد ـــــ

رات کے گیارہ بج گئے حالانکہ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے شام نے ابھی چند ساعت پہلے آنکھ کھولی ہو۔ دور سے پٹاخوں کی آواز آ رہی ہے۔ لڑکے شب برات منانے میں مصروف ہیں۔ چند گھنٹوں پہلے جب میں یہاں آ رہی تھی تو شہر میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی، پھلجھڑیاں، پٹاخے، انار ـــــ آگ کے پھول ہنستے ہوئے بلند ہو رہے تھے اور پھر بجھ کر زمین پر گر رہے تھے یوں جیسے انسان کے اندر آگ کے پھول کھلتے ہیں پھر سب کچھ جل جاتا ہے، خاکستر ہو جاتا ہے اور انسان اپنے اندر تنہا ہو جاتا ہے ـــــ اور انسان کب تنہا نہیں، ہجوم تو محض دل بہلاوا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

انسانوں کا، آوازوں کا، قہقہوں کا اور مداراتوں کا ہجوم ہے پھر بھی کیسی تنہائی ہے جیسے ہو کا عالم ہو، جیسے یہاں کوئی سانس بھی نہ لیتا ہو ـــــ

کھانا ختم ہوئے دیر ہو چکی اور اب کونیک کا دور چل رہا ہے، بلوریں پیمانوں میں ارغوانی شراب چھلک رہی ہے۔ سر شام سے ہی دوستی کے نام پر، محبت کے نام پر اور زندگی کے نام پہ پیمانے خالی ہو رہے ہیں۔ دھیمی آواز میں روی شنکر کی انگلیوں کا جادو جاگ رہا ہے۔ ستار کی جان لیوا آواز سارے کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ قہقہوں، باتوں اور پیمانوں کی کھنک پر اس آواز کا سایہ ہے۔ طبلے کی آواز سے دل پر چوٹ لگتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کوئی آواز نہ ہو، وحشی را ہوار ہو جو دل کو اپنے پاپوں سے روند رہا ہو۔

رات کے سناٹے میں ریل کی سیٹی کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہے اور میرا دل ڈوب جاتا ہے۔

ریل کی آواز ہمیشہ مجھے بہت اداس کرتی ہے۔ دور جاتی ہوئی، معدوم ہوتی ہوئی آواز۔ بچپن کی عجب سرہت آمیز اور دل گرفتہ یادیں ہیں جو اس کے آواز کے ساتھ لپٹی چلی آتی ہیں۔

ریل قبرستان کے پہلو سے گذرتی ہے اور میں ان شکستہ اور پختہ قبروں کو دیکھ رہی ہوں جو ریل کے پٹری کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دھنسی ہوئی بے چراغ قبریں۔ شام ان قبروں کے کتبوں پر بسیرا کر رہی ہے، جا بجا اگے ہوئے بیری کے درختوں پر بیٹھی چڑیاں ریل کی آواز سے دہشت زدہ ہو کر اڑ رہی ہیں۔

"اماں ریل کی آواز سے ان لوگوں کو کتنا ڈر لگتا ہوگا؟ قبر میں تو یوں بھی ڈر لگتا ہے نا؟" میں اماں سے کہتی ہوں۔

"تمھارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جانے کہاں کہاں کی واہیات باتیں تمھارے دماغ میں بھر گئی ہیں"۔ اماں مجھے جھڑک دیتی ہیں اور میں کھڑکی سے سر باہر نکال کر پیچھے رہ جانے والی قبروں کو دیکھتی ہوں، یہ لوگ قبریں اتنی تنگ کیوں بناتے ہیں کہ آدمی کروٹ بھی نہ لے سکے، میں سوچتی رہتی ہوں اور پھر ریل کی مسلسل حرکت سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔

ریل گڑ مکٹیشر کے پل سے گذرنے والی ہے۔ لوگ اٹھنیاں، چونیاں اور دونیاں ہاتھوں میں دبائے بیٹھے ہیں۔ ابھی ریل شور مچاتی ہوئی گڑ مکٹیشر کے پل پر چڑھے گی تب بہت سے ہاتھ کھڑکیوں سے نکلیں گے اور اپنی اپنی آرزوؤں اور مرادوں کو ان سکوں سے متعلق کر کے گنگا میا میں پھینک دیں گے۔ گنگا جی ہماری نذر لو اور ہمیں بامراد کرو۔

گڑ مکٹیشر کا پل ریل کے نیچے سے گذرا جا رہا ہے۔ سکے اچھل رہے ہیں۔ سکے لوہے کے شہتیروں سے ٹکرا کر پل پر گر رہے ہیں۔ سکے گنگا کے چوڑے سینے میں اتر رہے ہیں۔ میں لوگوں کو سکے پھینکتے دیکھتی ہوں تو بے تاب ہو جاتی ہوں۔

"اماں میں بھی پیسہ پھینکوں گی، مجھے ایک گڑیا چاہئے۔ اماں صرف ایک دونی"۔ بہت دنوں سے میں ایک سوتی جاگتی گڑیا کے خواب دیکھ رہی ہوں اور اس لیے مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے گنگا میا میں ایک دونی بھی پھینک دی تو مجھے سوتی جاگتی گڑیا مل جائے گی۔ میں اماں کے سامنے مچلنے لگتی ہوں اور اماں مجھے جھڑک دیتی ہیں۔ "تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ یہ سب ہندوؤں کی خرافات ہے"۔ وہ بہت حقارت سے اس ہندو لڑکی کو دیکھتی ہیں جس نے چند لمحوں پہلے سکہ پھینکا ہے اور بہت خوش نظر آ رہی ہے ــــ

"اماں میں مسلمان گڑیا کے لئے پیسہ پھینکوں گی۔" میں انھیں یقین دلاتی ہوں۔ لیکن وہ میری بات کا یقین نہیں کرتیں، مجھے ایک بار پھر بری طرح گھور کے دیتی ہیں۔

گڑ مکتیشر کا پل پیچھے رہ جاتا ہے، گنگا پیچھے رہ جاتی ہے اور میں ریل کی کھڑکی سے سر ٹکا کر رونے لگتی ہوں۔ آنسو میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں اور زنگ آلود کھڑکی کی درز میں گم ہو رہے ہیں۔ کاش گنگا میا کو آنسو بھینٹ کیے جا سکتے، پھر میں کتنے مزے سے بہت سے آنسوؤں کی بھینٹ کرتی، گڑیا سوتی جاگتی ہوئی، رنگیں چڑیاں نئے پنجرے میں چہچہاتی ہوئی، ستاروں ٹنکی اوڑھنی جھلمل کرتی ہوئی ــــــ کتنی بہت سی چیزیں مجھے مل جاتیں، کتنی بہت سی چیزیں۔

ڈرائنگ روم قہقہوں کی آواز سے گونجنے لگتا ہے، میں پلٹ کر دیکھتی ہوں۔ کاظم کی ہتھیلی پر ایک سکہ چمک رہا ہے اس کے چہرے پر شراب اور سرخوشی کی دمک ہے سب لوگ اس کے قریب کھڑے ہنس رہے ہیں۔

"کاظم نے کون سا معرکہ سر کر لیا ہے؟" میں پوچھتی ہوں۔

"رحمٰن اور کاظم دونوں ہی سلمیٰ کو اس کے گھر چھوڑنا چاہتے تھے۔ فیصلے کے لئے ٹاس ہوا تو کاظم جیت گیا۔" مسز مائیکل ہنس کر بتاتی ہیں۔

سلمیٰ کے چہرے پر فتح مندی کا غرور ہے۔ اس کا وجود، دو مردوں کے درمیان کشمکش کا سبب ہے۔ اس سے خوبصورت بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ ہنستی ہے اور ہاتھ ہلاتی ہوئی کاظم کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے۔

رحمٰن کے چہرے پر شکست کی دھند ہے لیکن اس دھند کی خبر اس سکے کو نہیں جس سے دو انسانوں کی مراد متعلق تھی۔ جس نے ایک کو بامراد کیا اور دوسرے کو نامراد۔ لیکن بامرادیوں اور نامرادیوں کا قصہ بہت طویل ہے۔ ہم کسی ایک سکے کو بھلا کیا دوش دیں۔ کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ سکہ موجود ہوتا ہے لیکن وہ سکہ رائج الوقت نہیں ہوتا، بازار میں نہیں چلتا ــــــ وہ جو صدیوں سوتے رہے تھے اور اٹھے تھے تو یہ سمجھ کر کہ شاید ایک دن اور ایک رات سوتے رہے ہیں جیب میں کھنکتے ہوئے سکے لے کر بازار چلے گئے تھے جن پر شہنشاہ دقیانوس کی ضرب تھی لیکن شہنشاہ دقیانوس کا ذکر تو بس کتابوں میں رہ گیا تھا اور اس کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکوں سے اب کچھ بھی نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ اس لمحے ان سونے والوں نے اپنے آپ کو کتنا نادار محسوس کیا ہوگا تہی دامن، تہی دست اور مفلس۔

لیکن میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں۔ میرے پاس تو وہ سکہ ہی نہیں جس سے

اپنی ایک آرزو متعلق کر سکوں۔

کچھ لوگ چلے گئے ہیں، پھر بھی ڈرائینگ روم میں ابھی خاصے لوگ موجود ہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس پینٹنگ کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہوں جس نے اس کشادہ ڈرائینگ روم کی ایک دیوار کو زیب و زینت بخشی ہے۔ یہ لورینزو لوٹو (LORENZO LOTO) کی مشہور پینٹنگ آندریا اوڈرنی (ANDREA ODONI) کا رِی پرنٹ ہے۔ ساڑھے چارسو برس پرانی اس پورٹریٹ میں ایک عجیب سحریت ہے۔ پس منظر میں توانا مردوں کے بدن ہیں، سنگ مرمر میں ڈھلے ہوئے، کسی کا دھڑ نہیں ہے اور کسی کا سر غائب ہے۔ دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے اپنی طرف بلاتے ہوئے۔ پیش منظر میں اوڈرنی ہے۔ اوڈرنی کا ہاتھ جس میں کسی دیوی کی شبیہہ کا طلائی عطردان ہے آگے بڑھ رہا ہے، یوں جیسے وہ اس طلائی عطردان کو دینے کا خواہاں ہو اور آنکھوں میں سوال ہے، بولو، بتاؤ، اس عطردان کے عوض کیا دو گے؟ کتنے لیرا؟ کتنے پیستا؟ کتنے درہم و دینار؟ کتنے روپے؟ اوڈرنی کا دوسرا ہاتھ میز پر ٹکا ہوا ہے، میز پر سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہے۔ اس کپڑے پر طلائی سکے بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ سکے جو کینوس کی گُنت میں اور رنگوں کی آمیزش میں مقید ہیں، یہ جب موجود ہوں گے تو جانے کن کن ہاتھوں سے گندے ہوں گے۔ ان سکوں سے کیا کیا نہ خریدا گیا ہوگا؟ آرزوئیں، مرادیں، خواہشیں ـــــ وہ خوشبو کی شکل میں ہوں، رس بھرے پھلوں کی شکل میں یا حسین اور نوجوان کنواریوں کی شکل میں۔

آرزو ـــــ تمنا ـــــ مراد ـــــ

یہ کتنے سادہ اور چند حرفی لفظ ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ کثیر المعنی لفظ بھلا اور کیا ہوں گے ـــــ سوتی جاگتی گڑیا، شراب کا جرعہ، خوشبو، مرد، عورت، ریشم، کتابیں، زیور، رنگین پرندے، مجسمے، موسیقی کے مجموعے، وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارتیں، یہ سب اور دوسری ہزاروں لاکھوں چیزیں جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی آرزو، تمنا اور مراد ہیں۔ یہ سب چیزیں جو سکوں سے خریدی جاتی ہیں۔ سکے جو کبھی بامراد کرتے ہیں اور کبھی نامراد ـــــ لیکن کبھی کوئی ایسی آرزو بھی ہوتی ہے جو خریدی نہیں جا سکتی اس مراد کو برلانے کے لئے گنگا میّا میں سکہ پھینکنے کی ہمت بھی نہیں کی جا سکتی۔

میں پلٹ کر کافی ٹیبل تک جاتی ہوں اور اپنا گلاس اٹھا کر کونیاک کا ایک گھونٹ بھرتی ہوں اور مجھے اماں کا خیال آتا ہے۔ اگر اس لمحے اماں مجھے دیکھ لیں، شاید اماں کا کلیجہ پھٹ جائے۔

وہ مرجائیں۔ وہ جنھیں اپنے خون کی نجابت اور شرافت پر اندھا یقین ہے، وہ جنھوں نے جوانی میں بیوگی کا لباس پہنا تو اس پر ذرہ برابر بھی کوئی دھبہ نہ آنے دیا۔ وہ اماں جنھوں نے گرا مکلیشر کے پل سے گذرتے ہوئے مجھے ایک دونی تک نہ دی تھی۔ آخر سوتی جاگتی گڑیا کی آرزو کیوں کی جائے؟ دھنک رنگ خواب کیوں دیکھے جائیں؟ وہ اماں جو مجھے ہر بات پر جھڑک دیتی تھیں، ان کا خیال تھا کہ بیٹیوں کا دل مار کر رکھنا چاہیئے، ان کی کوئی خواہش پوری نہیں کرنی چاہیئے، جانے کس گھر جائیں، جانے کس کے پلے بندھیں ــــ اماں کا فلسفہ بھی کیسا نرالا تھا لیکن اس فلسفے کے سہارے انھوں نے اپنی زندگی کس قدر سکون اور دھیرج کے ساتھ گذار دی۔

اماں کے اور میرے درمیان جو پل تھا اس پل کے نیچے سے بہت سا وقت لمحہ لمحہ کرکے بہہ گیا ہے اور اب میں چاہوں بھی تو اس پل کو عبور کرکے اماں تک نہیں پہنچ سکتی ــــ مجھے جب اسکالرشپ ملی اور اماں نے مجھے اپنے سے جدا کیا تو اس وقت انھیں معلوم نہ تھا اور میں بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ دائمی جدائی ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں کئی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے لیکن ہمارے درمیان جدائی بڑھتی رہی، ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے رہے ــــ اماں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

ٹورنٹو، مانٹریال، لندن، روم، میڈرڈ ــــ یونی ورسٹیاں میوزیم لائبریریاں بُل فائٹنگ، مجسمے، رقص، زندگی، رعنائیاں ــــ میں نے دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا، میں نے کتابوں کو اپنے نقطۂ نظر سے پڑھا، میں نے زندگی گذارنے کے لیے اپنے اصول بنائے اور شاید مجھ میں اماں کی نجابت، اماں کے خون کا بس اتنا ہی اثر رہ گیا تھا کہ میں نے پھر وہ اصول نہ توڑے۔

کیسی وحشت ہے، کتنی رونق ہے، کیسی تنہائی ہے، کتنا ہجوم ہے یادیں حلقہ باندھتی ہیں۔ ہم تمھیں یوں نہیں جانے دیں گے، ہماری زنجیر زنی دیکھو، ہمارے وجود سے رستا ہوا لہو دیکھو ــــ

میری آنکھوں میں سرخ رنگ پھیلنے لگتا ہے، سرخ رنگ، وصال کا رنگ ــــ سرخ رنگ، ہلاکت کا رنگ۔ میں بے تاب ہو کر اٹھتی ہوں اور کئی جاننے والوں کے جملوں کو مسکراہٹ سے ٹالتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل آتی ہوں۔ برابر میں مسٹر مارسل کی اسٹڈی ہے۔ دن کی روشنی میں کئی مرتبہ میں اس اسٹڈی میں آئی ہوں، بیٹھی ہوں، باتیں کی ہیں کتابیں

دیکھی ہیں لیکن رات میں اس کمرے کی عجیب ادا ہے، کتابوں، صوفوں، پردوں، قالین اور AIR FRESHNER کی ملی جلی خوشبو ہے۔

میں اسٹڈی کا دوسرا دروازہ کھولتی ہوں اور ٹیرس پر نکل آتی ہوں۔ ٹیرس پر بڑے بڑے گملوں میں پودوں کی نہ جانے کتنی قسمیں ہیں کیکٹس، کروٹن، ربر پلانٹ ــــــ چاندنی پتوں پر بھی ہے، فرش پر سوئی ہوئی ہے۔ کچھ دور پر بحیرۂ عرب کا جھاگ اڑاتا سرپٹکتا پانی ہے، چاندنی لہروں میں گھل گئی ہے اور سیال ہو کر بہہ رہی ہے سمندر کی خوشبو بڑھی چلی آتی ہے، یوں جیسے امیت بڑھا چلا آتا ہو۔ میں سمندر کی خوشبو سے امیت کے خیال کو کبھی جدا نہ کر سکی شاید اس لئے کہ ہم دونوں پہلی مرتبہ سمندر کے کنارے ملے تھے۔

میں اپنے گروپ کے ساتھ چھٹیاں گذارنے روڈز (RHODES) گئی ہوئی تھی ہم اسی صبح وہاں پہنچے تھے اور پلیس سو نو کلینز پر بنشن شیو طلیس میں ٹھہرے تھے۔ وہ جولائی کی ایک گرم دوپہر تھی اور میرے تمام ساتھی RODINI WINE FESTIVAL میں شرکت کے لئے بے تاب تھے۔ میری طبیعت روڈز پہنچتے ہی خراب ہو گئی تھی اور سفر کی تھکن بھی بہت تھی اس لئے میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ سب لوگ چلے گئے۔ وہ پہلے شہر میں گھومنے کا ارادہ رکھتے تھے پھر فیسٹیول میں شریک ہونے کا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں پڑی سوتی رہی جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ میں نہا کر نکلی تو طبیعت بہت بہتر تھی۔ میں نے اپنا پرس اٹھایا اور تنہا نکل کھڑی ہوئی۔

شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے PALACE OF THE KNIGHTS کی فصیلوں اور برجیوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پریوں کی کہانیوں سے کوئی قلعہ نکل کر سامنے آگیا ہو۔ میں اپنے خیالوں میں مگن چلتی رہی۔ اجنبی لوگ سائے کی طرح میرے برابر سے گذر رہے تھے، اجنبی زبانوں میں گفتگو کرتے ہوئے۔ ایک لڑکی پیڑ سے ٹکی کھڑی تھی اور لڑکا اس پر جھکا ہوا تھا، ان دونوں کے درمیان ایک گہرا اور گرم بوسہ نمو پذیر تھا۔ ایک میدان میں کچھ ٹورسٹوں نے چھوٹے چھوٹے دو خیمے لگا رکھے تھے، ان کی وین بھی برابر میں کھڑی تھی اب وہ لوگ خیموں سے ذرا فصل پر آگ جلا کر کھانے پکانے میں مصروف تھے۔ حسین لڑکیاں خوش قامت لڑکے، مچھلی کی طرح تڑپتی پنڈلیاں، سونے کی تاروں کی طرح چمکتے بال، گاتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، مست الست۔

چلتے چلتے میں سمندر کے کنارے پہنچ گئی، وہاں قدرے سناٹا تھا اور لوگ بھی کم کم تھے۔

مجھے احساس ہوا کہ شاید تنہا اس طرح انجان جگہ پر بھٹکتے پھرنا مناسب نہیں ۔ میں پلٹنا چاہ رہی تھی لیکن سمندر کی خوشبو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی ۔ میڈیٹیرین کے نیلگوں پانی پر رات کا اندھیرا اتر آیا تھا اور تاروں کی جھلمل لہروں پر چاندی کی لکیریں کھینچ رہی تھی ۔

اس لمحے میرے کانوں میں ایک آشنا آواز آئی ۔ جل تھل ناچے ، جنگل ناچے ، ناچے من کا مورا ، جیون کا سکھ آج پرسو ، موہے جیون کا سکھ آج ۔

میں نے اس آواز کو سنا اور ٹھٹھک کر رہ گئی ، تنہائی کا خوف جیسے بھاپ بن کر اڑ گیا ۔ ہم زبانی کی خوشبو سمندر کی خوشبو میں گھل گئی ، تنہائی کیسی ، خوف کس کا ۔ میری مٹی کی خوشبو الفاظ میں ڈھل کر فضا میں پھیل رہی تھی ۔ میں آواز کی سمت بڑھی ۔

وہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے دلی سینٹر میں لائبریرین تھا اور لائبریری سائنس کے ایک مختصر کورس کے سلسلے میں انگلینڈ آیا ہوا تھا اور اب چھٹیاں گذارتے روڈز چلا آیا تھا ۔ ہم زبانی اور ہم وطنی کے احساس نے ہم دونوں کو خوشی سے معمور کر دیا تھا ۔ ہم دونوں ریت پر بیٹھے اپنے اپنے شہروں کی باتیں کرتے رہے ۔ سمندر کی جھاگ اڑاتی موجیں ہم دونوں کو شرابور کرتی گذرتی رہیں ، سمندر ہمارے سامنے تھا اور ہم اس سے بے نیاز رہے ۔ کتابیں ، موسم ، گیت ، شاعری ، ایتھنز ایپی تھیٹر ، سوفوکلیز ، ایکروپولس ، پارتھینان ، دیویاں دیوتا ، تہوار ـــــ یونانی تہواروں کے ذکر پر ہم دونوں کو بیک وقت یاد آیا کہ اس وقت RODINI WINE FESTIVAL اپنے عروج پر ہوگا ۔ ہم جب وہاں پہنچے تو رات نے اور موسم نے ہر شخص کو اپنے سحر میں اسیر کر رکھا تھا ۔ وہ رات جو چھلکتے ہوئے پیمانوں ، کوئلے کی آنچ پر سنکتے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو ، قہقہوں ، تیز موسیقی ، بے تکان رقص اور مستی سے عبارت تھی ۔

وہ ہماری دوستی کا آغاز تھا ، ایسا آغاز جس نے ہم دونوں کو برباد کیا ۔ امیت کی شادی ہو چکی تھی ، اس کے دو بچے تھے اور مجھ سے ملاقات کے لمحے تک اسے اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ محسوس ہوئی تھی ۔ لیکن بقول اماں میں تو پیدائشی سبز قدم تھی ۔ پیدا ہوئی تو باپ کو کھا گئی ۔ بڑی ہوئی اور پڑھنے الہ آباد گئی ۔ دیالو اور دیوتا ماموں کے ہاں ٹھہری تو وہ دنوں میں چٹ پٹ ہوئے ۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میرے سبز قدم امیت کی پرسکون زندگی کو تہ و بالا نہ کرتے ۔

مجھ سے ملاقات کے لمحے تک امیت کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کی

بیوی ایک گھریلو لڑکی ہے ۔ اور وہ تاریخ ، کلچر، دیو مالا، ادب اور فلسفے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ ہمارے سینے میں خواہشیں سوتی رہتی ہیں، آئیڈیل چہرے سوتے رہتے ہیں اور ہم ان کے بارے میں نہیں جانتے۔ پھر ایک دم جب تمام خواہشیں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھتی ہیں ، آئیڈیل چہرے کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں اور ہم پر حملہ آور ہوتی ہیں تو ہم سنبھل نہیں پاتے ۔ ان کے سامنے ہار جاتے ہیں امیت کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا۔

ہم دونوں دنیا کی اونچ نیچ سے آگاہ تھے ۔ اس سے پہلے دو تین مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں محبت کے مرحلے سے گذر رہی ہوں لیکن ہر مرتبہ یہ احساس چند مہینوں میں ہی زائل ہو گیا تھا —— دوسری طرف امیت تھا۔ جس کی زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئیں تھیں ، حسین بدن ، سرشار ہوتے اور سرشار کرتے بدن —— لیکن یہ جو دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی کیفیت تھی یہ نہ کبھی اس نے محسوس کی تھی ، نہ میں نے ۔ ہم جب سرشاری کی انتہا پر ہوتے اس لمحے بھی دل مزید قرب کے لئے تڑپتا۔ ہمارے دل جانے کس ملن کے طلب گار تھے ۔ ہم نے سنا تھا اور ہم نے دیکھا تھا کہ بدن کی پیاس بجھ جائے تو دل بھر جاتا اور پھر بھلانے کا عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن ہم دونوں کے اندر جانے کون سی پیاس بھڑکی تھی کہ وصال سے بھی نہیں بجھتی تھی ۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ عشق کسے کہتے ہیں اور یہ بھی کہ عشق میں ہجر اور وصال کتنے بے معنی لفظ ہیں ۔ کیسی دوری ، کیسی حضوری ، کیسا وصال اور کیسی مجبوری ہر ساعت کی اپنی لذت تھی ، ہر لمحے کا اپنا کرب تھا۔

امیت کا کورس چند مہینوں میں ختم ہو گیا اور وہ ہندوستان لوٹ گیا ، میرا ایم ایس مکمل ہونے میں ایک برس باقی تھا۔ اس ایک برس میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو جتنے خط لکھے وہ شاید ہی کبھی دو افراد نے ایک دوسرے کو لکھے ہوں گے ۔ میں نے ایم ۔ ایس مکمل کیا تو سیدھی دلی پہنچی ۔ امیت دلی میں تھا ۔ ہم دونوں کا ملنا ایسا ہی تھا جیسے دو پاگل سمندروں کا ملنا۔ لیکن اپنی تمام دیوانگی کے باوجود مجھے اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ مجھ سے کسی دوسری عورت کو اتنا بڑا نقصان نہیں پہنچنا چاہئے کہ پھر اس کی تلافی ممکن نہ ہو ۔ امیت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی ، وہ مجھے ہر لمحہ اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ اتنی خوبصورت بات تھی کہ اس خوبصورتی سے مستقل جنگ کرتے رہنا اور امیت کی خواہش کو رد کرتے رہنا میرے بس کی بات نہ تھی ۔ میں برسر پیکار تھی ، اپنی خواہشوں سے ، امیت کی آرزوؤں سے ۔ میں بہت کمزور تھی ، میں

خواہشوں کے سمندر میں کائی لگے پتھر پر کھڑی تھی اور جانتی تھی کہ کسی بھی لمحے کوئی تند لہر آئے گی اور مجھے بہاکر اپنے ساتھ لے جائے گی۔

امیت کی بیوی پدمنی بہت اچھی لڑکی تھی، اپنے بچوں دیجے اور پردیپ میں مگن، امیت اس کا پتی تھا اور پدمنی کو اس سے اسی نوعیت کی محبت تھی جیسی بیویوں کو شوہروں سے ہوتی ہے۔ وہ اس کے سر پر شجر سایہ دار کی طرح قایم تھا۔ اس گھنے سائے میں دیجے اور پردیپ دبلے تھے، وہ خود تھی۔ کیا میں یہ سایہ ان تینوں سے چھین لوں؟ یہ سوال میرے اعصاب کو شکستہ کئے دے رہا تھا۔ میں پدمنی سے ملی اور دل ہی دل میں اپنے آپ پر نفریں کرتی رہی۔

کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے امیت سے دوری ضروری تھی میں نے اپنا سامان اٹھایا اور اماں سے ملنے گھر چلی گئی۔ اماں بہت بوڑھی ہوگئی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں کہ ان کی بٹیا ولایت سے پڑھ کر ڈگری لے کر آئی ہے لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ اپنی بٹیا کو وہ ہار چکی ہیں۔ گھر میں میرا جی نہ لگا، گھر کے ماحول اور میری اپنی زندگی میں اب زمین آسمان کا فرق تھا۔ امیت کے خط روزانہ آتے تھے لیکن میں نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ میں سوچتی رہی، میں اماں کو دیکھتی رہی۔ اماں نے اپنی ذات سے کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا تھا، میں بھی انہی کی بیٹی تھی ــــــ

پدمنی تو بھرے پرے پریوار میں پلی بڑھی تھی۔ اس کے ہر طرف شجر سایہ دار ہی رہے تھے، ان کے خنک سائے پروان چڑھنے والی لڑکی تو امیت کے بغیر بہت بے آسرا ہو جائے گی، لیکن میرے لئے تو کبھی کوئی مرد شجر سایہ دار نہیں رہا تھا۔ نہ باپ، نہ بھائی، نہ ماموں، نہ چچا ــــــ مجھے تو زندگی کی دھوپ میں تنہا چلنے اور جلنے کی عادت تھی۔ آدھی زندگی گذر گئی تھی جو رہ گئی تھی وہ بھی گذر ہی جائے گی، بھلا کیا فرق پڑتا ہے، ہاں واقعی بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک صبح ناشتے پر میں نے اماں کو بتایا کہ میں پاکستان جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لئے۔ اماں کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا "بٹیا، وہاں تو ہمارا کوئی بھی نہیں"۔ انھوں نے دہل کر کہا۔

"اماں، سنا ہے جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا خدا ہوتا ہے"۔ میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور اٹھ گئی۔

ہفتے بھر بعد اماں نے مجھے پاکستان کے لئے رخصت کیا تو آنگن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ آنسو، سسکیاں، ہچکیاں، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گھر سے جنازہ جا رہا ہو۔ اماں ڈیوڑھی تک آئیں، پھوپھی اماں نے ماش ٹکے سے صدقہ اتارا، اماں نے میرے بازو پر جھلملاتا امام ضامن باندھا۔

میں نے دروازے سے باہر پہلا قدم رکھا تو ممانی جان نے باآواز بلند مولا مدد کہا اور دعائیں مانگنے لگیں۔ میرا رکشہ گلی سے نکلا تو رونے کی آواز دور تک مجھے رخصت کرنے آئی۔ ان آوازوں نے مجھے ایک ایسے سفر کے لئے رخصت کیا جس کا کوئی اختتام نہ تھا۔ یہ وہ لوگ بھی جانتے تھے جو مجھے رخصت کر رہے تھے اور یہ میں بھی جانتی تھی، میں کہ رخصت ہو رہی تھی۔ انگنا تو پربت بھیا اور دہلی بھئی بدیس ــــــ

اس آخری سفر میں جب ریل گرڈ ملکیشر کے پل کے قریب پہنچی تو میں نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا لیکن ریزگاری کے نام پر میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ مجھے یاد آیا کہ دراسٹیشن پہلے ساری ریزگاری میں نے ایک نابینا فقیر کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔ اس لمحے میری انگلیوں نے اماں والے امام ضامن کو چھوا جسے میں نے دوسرے امام ضامنوں کی طرح بازو سے کھول کر پرس میں رکھ لیا تھا۔ چاندی کا روپیہ ریشم کے اندر جگ جگ کر رہا ہوگا۔ میں نے سوچا اور لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے خیال آیا کہ اس روپے کو نکال لوں اور گذرے ہوئے لمحے برق رفتاری سے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے ــــــ

"اماں میں بھی پیسہ پھینکوں گی، مجھے ایک گڑیا چاہئے، اماں صرف ایک دوّنی۔" نرملا کی بچی نے لہک کر کہا۔

"تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ یہ سب ہندوؤں کی خرافات ہے۔" ماں نے بچی کو جھڑکا۔

"اماں میں مسلمان گڑیا کے لئے پیسہ پھینکوں گی"۔ بچی نے بلک کر یقین دلایا۔

لمحے دور ہو گئے، برسوں پیچھے چلے گئے اور میری ہاتھ کی گرفت سے ریشمی امام ضامن چھوٹ گیا۔ میں نے کھڑکی پر سر رکھا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اماں نے تو مجھے مسلمان گڑیا کی آرزو کے لئے پیسے نہ دیئے تھے پھر امیت کی آرزو کے لئے اماں کے پیسے؟

میں کھڑکی پر سر رکھے بلک بلک کر روتی رہی، آنسو میری آنکھوں سے بہہ کر زنگ آلود کھڑکی کی درز میں غائب ہوتے رہے۔ گرڈ ملکیشر کا پل آیا اور گذر گیا۔ میرے ہاتھوں نے گنگا میا کو کوئی سکہ نذر نہ کیا ــــــ اور تب میں نے تہیہ کر لیا کہ اپنے اور امیت کے لئے کوئی دعا نہیں کروں گی، کوئی آرزو نہیں کروں گی۔ وقت جتنے خوبصورت لمحوں کی خیرات مجھے دے دے، لے لوں گی، لیکن خود وقت سے کچھ نہیں مانگوں گی، کبھی نہیں مانگوں گی۔

میرا گلاس خالی ہو گیا ہے، میں ٹیرس کی ریلنگ سے ٹک کر کھڑی ہو جاتی ہوں سمندر کی خوشبو ہر طرف سے امڈ رہی ہے۔ یہ خوشبو مجھے اپنی طرف بلاتی ہے۔ آؤ اور مجھے دیکھو، آؤ اور مجھے برتو، میں ازل ہوں، میں ابد ہوں، میں زندگی ہوں۔ لیکن زندگی کہاں ہے؟ زندگی تو بہت دور رہ گئی ہے اسے ہاتھ بڑھا کر کس طرح چھوا جائے۔

دلّی میں امیت نے مجھے اپنے فیصلے سے پھرانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سب بیکار تھا۔ میں جانتی تھی کہ دنیا میں کہیں بھی جاؤں، امیت میرے تعاقب میں چلا آئے گا لیکن پاکستان وہ واحد جگہ تھی جہاں شدید خواہش کے باوجود اس کا پہنچنا ہفت خواں طے کرنے کے برابر تھا۔ اس کے گھر کو بربادی سے محفوظ رکھنے کے لئے میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا، اپنی مکمل تباہی و بربادی کا راستہ ــــــ سو وہ میں نے اختیار کیا۔

امیت سے آخری ملاقات آج بھی اپنی تمام جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے کھنچی ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑی پینٹنگ ہو اور اسے میں محدب شیشے سے دیکھ رہی ہوں جیسے کوئی فریم شدہ TAPESTRY ہو جس کے ریشم کا ہر شیڈ اپنی جگہ واضح ہو۔ کہیں ہلکا سبز، کہیں گہرا، کہیں کاہی اور کہیں سیاہ، بھورا، عنابی، گلابی ــــ لیکن کیا وہ آخری ملاقات تھی؟

ہم دونوں قطب کے سائے میں ڈھلتی ہوئی زرد دھوپ کی چادر تانے، زرد گھاس پر لیٹے تھے۔ ہونٹ گنگ، آنکھیں بولتی ہوئی، موتی رولتی ہوئی۔ انگلیاں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی، بدن کا ختم نہ ہونے والا عذاب، اعصاب کا تشنج، ہر شے جیسے ٹھہری ہوئی، ہوا جیسے تھمی ہوئی ــــ لوگ گذر رہے تھے۔ قہقہے، کیمرے، ٹورسٹ اور ان کے گائیڈ ــــ اشوک کی لاٹ کی طرف جاتے ہوئے، قطب کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے۔ سب کچھ تھا اور کچھ بھی نہ تھا ــــ امیتابھ نہ تھا، میں نہ تھی، ہر طرف آگ تھی، ماضی تھا جو راکھ کے سوا کچھ نہ تھا، مستقبل تھا جس پر اس راکھ کے بکھرنے کی دھند تھی۔

"اس طرح مت جاؤ۔ اپنے آپ کو اور مجھے یوں نہ برباد کرو"۔ امیت نے نہ جانے سویں مرتبہ کہا یا ہزارویں مرتبہ۔ میں گنتی بھول گئی تھی۔ دن، مہینے اور سال بھول گئی تھی۔ وہ شخص جس کا نام میرے بدن کی پور پور پر لکھا تھا جس کی خواہش لہو میں تحلیل ہو کر بدن میں گردش کرتی تھی، وہی شخص شاید آخری مرتبہ میرے سامنے تھا۔ وقت نے جھک کر ہم دونوں سے کہا۔ یہ لمحے پھر نہ لوٹیں گے، یہ ساعت پھر نہ آئے گی۔

آخری ملاقات وہ تھی ؟ یا میں اسے آخری ملاقات کہوں جو پالم ایر پورٹ پر ہوئی۔ ہاتھوں کا لمس گم ہوتا ہوا، چہرے آنسوؤں کی دھند میں لپٹے ہوئے، ہونٹوں کی کپکپاہٹ رائیگاں جاتی ہوئی سب کچھ بکھر رہا تھا، وقت کا آبدار خنجر TAPESTRY کا ایک ایک ٹانکا ادھیڑ رہا تھا۔ ریشم کٹ کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا۔ زندگی گرم موم کی طرح پگھل رہی تھی۔ ڈھیر ہو رہی تھی۔ خاک، باد، آب، آتش ـــــ بدن جوان چار چیزوں کا مجموعہ تھا، کیا وہ مجموعہ رہ گیا تھا ؟ کیا واقعی وہ باقی تھا ؟ میں کہاں رہی تھی ؟ وہ کہاں رہا تھا ؟ ہر طرف ہجر کی آگ کا سمندر تھا ـــــ

میں لاؤنج سے نکل کر رن وے پر آئی، سامنے ہی انڈین ایر لائنز کا طیارہ گرج رہا تھا۔ دلی پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی طیارے تک پہنچی، میں نے سیڑھی پر پہلا قدم رکھا، پھر دوسرا، پھر تیسرا پھر سب کچھ ختم ہو گیا ـــــ طیارے نے چنگھاڑتے ہوئے دوڑنا شروع کیا۔ زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی جا رہی تھی، تیز اور تیز۔ پھر ایک جھٹکے سے زمین سے ناطہ ٹوٹ گیا۔ وقت کے خنجر آبدار نے TAPESTRY کا آخری ٹانکا بھی ادھیڑ دیا۔ نیچے دلی کی روشنیاں جاگ رہی تھیں اور اوپر دلِ وحشی کا نصیبہ سو رہا تھا۔

سر میں اس وقت بھی جیسے کوئی چیز گرج رہی ہے۔ ایک بھاری پن ہے، آنکھوں میں جلن ہے۔ ہونٹوں پر شراب کے ذائقے کو سگریٹ کی تلخی نے تلخ کر دیا ہے۔ حلق میں کانٹے سے چبھے ہیں اور پور پور میں پیاس رچی ہے۔ مسٹر مارسل مجھے ڈھونڈتے ہوئے ٹیرس پر آجاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کونیاک کی بوتل ہے وہ میرا گلاس خالی دیکھتے ہیں تو اسے بھر دیتے ہیں اور مجھ سے ڈرائینگ روم میں چلنے کو کہتے ہیں۔ میں ان سے معذرت کر لیتی ہوں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ انھیں معلوم ہے کہ گوشہ گیری میرے مزاج کا بنیادی عنصر ہے وہ اصرار نہیں کرتے واپس چلے جاتے ہیں ـــــ

میں کونیاک کا گھونٹ بھرتی ہوں۔ مجھے بڑی شدت سے روڈز (RHODES) کی وہ رات یاد آرہی ہے جب ہم دونوں نے RODINI WINE FESTIVAL میں طرح طرح کی مقامی شرابیں پی تھیں اور اپنے حواسوں میں نہ رہے تھے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ جتنی بھی پی لوں۔ حواس قایم رہتے ہیں۔

زندگی محض رائیگانی ہو کر رہ گئی ہے۔ امیت کے خط ہر دوسرے تیسرے آتے رہتے ہیں

دہاں وہ دھواں دھواں ہے یہاں میں راکھ ہوں۔ میں جب مسٹر مارسل کے ہاں آنے کے لئے نکل رہی تھی تو شام کی ڈاک سے اس کا خط آیا تھا۔ وہ خط میں نے پرس میں رکھ لیا تھا اور راستے میں پڑھا تھا میں اب خط کو نکالتی ہوں اور ایک بار پھر اسے پڑھنے لگتی ہوں۔

"جانم ــــ ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے بمبئی جا رہا ہوں، میرا جہاز ابھی زمین سے اٹھ کر LEVEL پر آیا ہے اور تمہاری دلّی کے اوپر اڑ رہا ہے، وہ دلّی جو تمھیں بہت عزیز ہے، وہ دلی جس میں تمھیں سب سے زیادہ جاننے والا رہتا ہے، وہ دلّی جس سے تم نے سب ناطے توڑ لئے ــــ

لو اتنی دیر میں ہی جہاز بادلوں سے بہت اوپر آ گیا اور اب مجھے تمہاری دلّی نہیں نظر آ رہی۔ میری جان کئی دن سے تمہارا خط نہیں آیا ہے۔ تمہارے خط میری زندگی کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے اور تمہارے خیال کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ خیالوں میں تم سے باتیں کرتا ہوں، خوابوں میں تمھیں دیکھتا ہوں اور تم مجھ سے اتنی دور ہو کہ تصور میں بھی دھندلا کر رہ جاتی ہو۔

ایر ہوسٹس نے تازہ اورنج جوس دیا ہے اور میں اسے تنہا پی رہا ہوں۔ اس کی مٹھاس تمہارے ہونٹوں کی مٹھاس سے بہت کم ہے اور اس کی ترشی میں تمہارے نمکین پسینے کی خوشبو ہے۔ میں اس گلاس کو تھوڑی دیر تھامے رہتا ہوں اور یہ سوچ رہا ہوں کہ اسی گلاس سے تم بھی پی رہی ہو ــــ اس طرح مجھے تمہارے ہونٹوں کی خوشبو کا احساس ہو رہا ہے۔

ابھی تھوڑی دیر کے لئے جہاز طوفان میں پھنس گیا تھا اور تمھیں کچھ لکھنا محال ہو گیا تھا لیکن اب جہاز بادلوں سے اور طوفان سے نکل آیا ہے۔ بمبئی پہنچنے کا اعلان ہو گیا ہے۔ نیچے بارش ہو رہی ہے اور دھند میں لپٹی ہوئی بے شمار اونچی اونچی عمارتیں نظر آ رہی ہیں اب میں دور تک پھیلے ہوئے سمندر پر ہوں، جہاز چکر کاٹ رہا ہے دور دور تک پانی ہے اور یہی سمندر تمہارے شہر سے بھی جا کر ملتا ہے میں دل ہی دل میں سمندر کے پانی سے کہہ رہا ہوں کہ وہ تمھیں میرا پیار پہنچا دے جب تم اپنے شہر کے ساحل پر جانا تو مجھے یاد کرنا اور یہ بھی سوچنا کہ اسی پانی کی کوئی لہر بمبئی تک آتی ہو گی۔ اسی بمبئی تک جس کے ساحل پر میں ایک ہفتے تک بلا ناغہ جاؤں گا اور جہاں بیٹھ کر تمھیں یاد کروں گا" ــــ

میری آنکھیں پرآب ہو جاتی ہیں۔ امیت جانم ــــ! میرے پاس یادوں کے علاوہ اور رکھا بھی کیا ہے۔ سامنے سمندر ہے لہریں آزاد ہیں، کہیں بھی چلی جاتی ہیں، کسی ساحل کو بھی چوم کر آجاتی ہیں لیکن میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں ــــ

اب میں کئی مہینوں سے کراچی میں ہوں۔ یہاں کچھ لوگوں سے شناسائی ہوگئی ہے، کچھ سے انگلینڈ اور کینیڈا کے زمانے کی جان پہچان نکل آئی ہے۔ مسٹر مارسل بھی انہی لوگوں میں ہیں ان کی ایک بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے، وقت گذاری کے لئے میں اس ایجنسی میں کام کر رہی ہوں۔ دونوں میاں بیوی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ سیٹزن شپ کے لئے سفارشوں کا چکر چل رہا ہے۔ نو آبجکشن سرٹیفیکیٹ، پولیس رپورٹ، انڈین نیشنل، پاکستان نیشنل، سن آف دی سوائل۔

"اچھا تو اب آپ MIGRATE کر رہی ہیں؟ بہت دیر کردی آپ نے، ہاں صاحب جن سنگھ والے بھارتی مسلمانوں کو بھلا کب چین سے بیٹھنے دیتے ہیں"۔ ایک مقامی شناسا کہتے ہیں۔

"بھئی ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا، اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی، ملازمتوں کا ملنا محال ہوگیا ہے۔ یا تو مقامیوں کو اچھی ملازمت ملتی ہے یا پھر کوئی بڑی سفارش ہو، ویسے تم تو سنا ہے بڑی کٹر نیشنلسٹ تھیں"۔ یو۔پی کے ایک سینیئر بیوروکریٹ کہتے ہیں جنھوں نے ۴۷ء میں پاکستان کے لئے OPT کیا تھا۔

"عمر بھی تو خاصی ہوگئی ہے بیچاری کی، اب وہاں اچھے رشتے بھلا جڑتے کہاں ہیں۔ شاید اسی چکر میں"۔ ایک شناسا خاتون بہ آوازِ بلند سرگوشی کرتے ہوئے دوسری خاتون سے کہہ رہی ہیں۔

جملے تیرتے ہوئے، کانوں کو برماتے ہوئے، دل کو سوختہ کرتے ہوئے۔ امیت میری جان، آنے لگے ہیں تیر مری خیمہ گاہ تک ——

میں سمندر پہ کروٹیں بدلتی چاندنی کو ایک نظر دیکھتی ہوں اور مڑکر ڈرائینگ روم میں چلی جاتی ہوں۔ آخری مہمان رخصت ہو رہے ہیں۔ میں بھی مسٹر اور مسز مارسل سے اجازت طلب کرتی ہوں تو وہ دونوں ملازموں کو ہدایتیں دیتے ہوئے میرے ساتھ نیچے آتے ہیں اور پھر حسب وعدہ مجھے گھر چھوڑنے کے لئے اپنی گاڑی نکالتے ہیں۔

ہم کلفٹن برج کے پاس پہنچتے ہیں تو بہت سے لڑکے سائیکلوں اسکوٹروں پر سوار جتھے بنائے ہوئے سمندر کا رخ کر رہے ہیں ہم اور آگے بڑھتے ہیں تو ایک ٹکڑی ہمیں انٹرکانٹی نینٹل سے لورز برج کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ٹیڈی جیٹی جا رہے ہیں ——

"یہ اتنے بہت سے لڑکے اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟" مسز مارسل حیرت سے

پوچھتی ہیں۔

آج ان لوگوں کا ایک تہوار ہے اس میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں"۔ میں مسز مارسل کو دو جملوں میں ٹال دیتی ہوں۔ میں انھیں اپنا اور اپنے لوگوں کا قصہ کیسے سمجھا سکتی ہوں انھیں کیسے بتاؤں کہ آج صاحب العصر والزماں کی ولادت کی شب ہے۔ یہ لوگ اور ان جیسے بہت سے دوسرے سمندر میں عریضے ڈالنے جا رہے ہیں۔

دعائیں، منتیں، مرادیں، آرزوئیں —— دنیا اور دنیا کی خواہشیں جن کا کوئی اختتام نہیں ہے۔

آج کی رات خواہشوں کی، منتوں کی، مرادوں کی رات ہے۔ آج کی رات عریضے لکھو، پھر ان عریضوں کو سمندر میں بہا دو، حسین ابن روح کے سپرد کر دو ——

میرا جی چاہتا ہے کہ مسٹر مارسل سے کہوں گاڑی نیٹی جیٹی کی طرف لے چلو ایک عریضہ میں بھی ڈالنا چاہتی ہوں۔ لیکن کیسا عریضہ؟ کاہے کی آرزو؟ میں نے اپنا معاملہ وقت کے حوالے کیا۔ یا صاحب العصر والزماں، الاماں، الاماں —— □
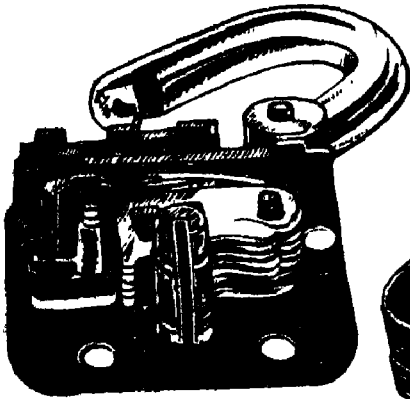
معیاری
تالے
کی
پہچان
صرف اپنی چابی سے کُھلے
کسی اور چابی سے نہ کُھل پائے
لنک تالوں کا
یہی ہے امتیاز
Link
Link LOCK
نروی لاکس
7 C انڈسٹریل اسٹیٹ - علی گڑھ

انیس رفیع
آل انڈیا ریڈیو، کلکتہ

بوجھ

ڈبے کے سارے مسافر سو رہے تھے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر آنکھیں! سفر میں آئی ہوئی نیند بڑی انمول ہوتی ہے۔ کھلی کھڑکیاں شاید نیند کو اور بھی گہری اور مزے دار بنا رہی تھیں۔ مگر میری آنکھوں نے نہ جانے کیوں نیند کی مخالفت میں ایک لمبی رات کے تین پہر کاٹ دیئے تھے۔

اور یہ رات کا آخری پہر تھا ـــــ

جب کھلی کھڑکیوں سے ہوائیں شائیں شائیں کرتی آنکھوں سے ٹکرا رہی تھیں اور نیند کے آنے کی بچی کچی امید کی کائی بھی پگھل کر بہی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کئی اسٹیشن گزر گئے مگر اتنی تیز ہوا کھڑکیوں سے نہیں آئی۔ لگتا ہے پچھلا اسٹیشن کوئی جنکشن تھا اور کوئلے والا انجن وہیں بدل گیا۔ کیوں کہ اب نہ وہ بھک بھک کرتی لے تھی اور نہ رفتار میں دھیما پن۔ غیر معمولی رفتار سے بھگالے جانے والا انجن بالکل بے آواز لگ رہا تھا۔ البتہ تیزی سے کٹتی ہوئی پٹریوں کی آواز کانوں پر حملہ آور تھی۔ میں نے اٹھ کر دو تین کھڑکیوں کے شیشے گرا دیئے باقی سب ویسے ہی چھوڑ دیئے۔ ممکن ہے دوسرے مسافروں کی نیند شیشوں کی وجہ سے متاثر ہوتی کہ ٹوٹی ہوئی نیند اور چھوٹے ہوئے دوست کا کوئی ٹھکانہ نہیں پھر لوٹے یا نہ لوٹے!

کتابوں کے اوراق کے درمیان کسی الٹ پلٹ کے کارن زندگی کے اوراق آ جائیں تو جیسے آنکھیں کیچ سے آلودہ ہو جاتی ہیں۔ اور جاگی ہوئی آنکھوں پر کچنے کی مہر لگ جاتی ہے۔ پھر سامنے کا سب کچھ بیکار ہو جاتا ہے۔ اور ٹٹول ٹٹول کر سب کچھ جاننے کا آرٹ لاچاری اور بے بسی کی دلیل ہے۔ میری بے بسی اور لاچاری تو بس اپنی نشست سے اٹھ کر TOILET تک جانے کے بیچ کی تھی۔ اور اگر TOILET تک پہنچ جاؤں تو کیچ چپکے سے انگلیوں کی پور پہ آ اتر آئے۔

مگر ایک خدشہ ـــــ انگلیوں کی پور پہ پسری ہوئی کیچ کہیں اتر کر سارے ڈبے میں نہ پھیل جائے کہیں ایسا ہو گیا تو ہم سب کتنے لت پت، لت پت سے لگیں گے۔

ہوں، تو جو کچھ میری سوچ میں داخل ہو جائے وہی ہوتا ہے کیا؟ کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہاں وہی ہوتا

ہے۔ اور کبھی جیسے وہ سب کچھ ہوتا ہی نہیں جو میری سطح میں داخل ہے، اب یہ ڈبہ، یہ مسافر، کھڑکیاں ڈبو کے بھاگنے کی رفتار سب ہی میری سوچ کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔ پر کیا یہ واقعی؟ اس سوال کے ساتھ ہی کچے پکے دھاگے ٹوٹنے لگتے ہیں۔

ان کھڑکیوں سے باہر جھانکا نہیں جا سکتا۔ ہواؤں کی سنسناہٹ، پہیوں کی خطرناک پھسلن، برتھ پر سو جاؤ تو پورے سفر کا دباؤ تلووں، گھٹنوں، کمر پیٹھ سب سے گزرتا ہوا دماغ کے اندر جیسے گولے کی طرح گھس جاتا۔ اور پھر برتھ پر عجیب سی چھٹپٹاہٹ اور بے چینی۔ پر شاید یہ گولہ بننے کے پہلے ہی پھوٹ جاتا ہے۔ اس کی کوئی ANALYSIS نہیں۔ دوسری طرف سے آنے والی ریل اس دباؤ کو تناؤ میں بدل دیتی ہے SINGLE-TRACK کا زمانہ کتنا اچھا رہا ہوگا۔ دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کا کوئی خطرہ دماغ میں گولے نہیں بناتا رہا ہوگا۔ مگر اب تو سب کچھ ڈبل ٹریک (DOUBLE-TRACK) پر دوڑ رہا ہے۔ ریل، آدمی اور اس کا چہرہ۔

شاید دوسری طرف سے ریل آنے والی ہے —

اب فیصلہ یہی ہے جو اگلا اسٹیشن ہو وہیں اتر جایا جائے۔ دوسری طرف سے آنے والی ریل گزر رہی تھی۔ گھڑی کو کان کی طرف لے گیا۔ ٹک ٹک کی آواز بھی کم تھی۔ مگر تیا سا گیہ وقت ریل سے اترنے کا نہیں لوگ ریل ایسی پکڑتے ہیں کہ انھیں رات بھر اترنا نہ پڑے اور صبح کے ساتھ منزل بھی سامنے آجائے۔

بریک کا دباؤ پہیوں پر ایسا پڑا کہ ہر شے رک گئی۔ جیسے ایک کال ٹھہر گیا ہو۔ اور میں اپنے کئے ہوئے فیصلے کے مطابق وہیں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ گرچہ صبح قریب تھی مگر تاریکی کا پڑاؤ اب بھی باقی تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے قبل ہی مجھے لانے والی تیز رفتار گاڑی پلیٹ فارم سے سرک گئی۔ جب پیچھے مڑا تو اس کی چھوڑی ہوئی سنسناہٹ سے کنپٹیاں گرم ہو چکی تھیں۔ دیکھنے کی جو بھی حد ہو سکتی تھی اس کے پاس یا دور پلیٹ فارم ہی پلیٹ فارم دکھائی پڑ رہا تھا۔ کئی بار آنکھیں ملیں کہ شاید پلیٹ فارم کے علاوہ بھی کچھ نظر آجائے۔ پلیٹ فارم پر لگے کئی SHEDS نظر آئے۔ میں نے سوچا تاریکی کے چھٹنے تک کسی SHED کے نیچے میز پر اپنا بوجھ اتارا جائے اور خود کو کھول کر پھیلایا جائے۔

ایک بوڑھا قلی جسے نیند نہ آنے کا مرض تھا۔ میرے بوجھ کے پیچھے لگ گیا۔ قلی پر پیسے خرچ کرنے کا ارادہ بالکل ہی نہ تھا کہ یہاں تو بس یونہی اتر گیا تھا۔ تناؤ سے بچنے کے لئے۔ لیکن پھر میں نے سوچا یہ قلی اپنے پلیٹ فارم کی ہر اینٹ پہچانتا ہوگا۔ اس سے بڑی مدد ملے گی اگر معمولی اجرت پہ تیار ہو جائے۔ بہر حال اس کی ضرورتوں نے میرے اندر کا بیوپاری پہچان لیا۔ بات طے ہو گئی۔ وہ میرا آدھا بوجھ ڈھوئے گا اور دو روپے

کی جگہ محض ایک روپیہ لے گا۔ وہ ایسا اس لئے کہہ رہا ہے کہ اس کے دوسرے ساتھی ابھی سوئے ہوئے ہیں۔ اور جب سوئے ہوئے ہوں تو بند مٹھی کھلوا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہم دونوں سامان کے ساتھ قریب دکھنے والے شیڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ایک بنچ کے قریب پہنچے تو کسی کے پھنکارنے کی آواز آئی۔ میں سہم گیا بوڑھا قلی مسکرایا۔ "یہ اژدھے کی پھنکار نہیں ہے۔ سوری بابو کا خراٹا ہے۔"

"کون ہیں یہ سوری بابو؟"

یہ یہاں کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ کسی گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں۔ بہت دنوں سے وہ گاڑی نہیں آئی ہے۔ اس انتظار میں وہ اپنا گھر بار، کھیت کھلیان سب کچھ چھوڑ چکے ہیں۔ اب مستقل پلیٹ فارم پر رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا پالتو ہاتھی انھیں آکر دیکھ جاتا ہے پر یہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے۔

"کیوں؟"

یہ راز ان کے اور ہاتھی کے درمیان ہے۔ وجہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ ہاتھی کا مہاوت بھی۔

"تو کیا اس بنچ پر بیٹھنے کی اجازت دیں گے زمیندار صاحب؟"

کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آیئے دوسرے شیڈ میں چلتے ہیں ——— یہ بنچ بھی دخل ہے ——— اس پر بانسری بابا براجمان ہیں اب تھوڑی ہی دیر میں اٹھ کر یہ بانسری بجائیں گے۔ سورج اپنے پاؤں چادر سے باہر کرے گا اور بھور ہو جائے گی۔ جب تک بابا کی بانسری نہیں بجتی کوئل نہیں کوکتی۔ ہاریل اپنے پر نہیں جھاڑتے، ساہل اپنے کانٹے نہیں کھولتے، سورج پاؤں نہیں پسارتا، بھور نہیں ہوتی۔ بابا کی آنکھیں بند ہیں، بہت بڑے کلاکار ہیں۔ مگر اس پلیٹ فارم کو نہیں چھوڑتے۔ شاید بابا سے کسی نے ربر اسٹامپ پر لکھوا لیا ہے کہ وہ دو چیز نہیں چھوڑیں گے۔ یہ پلیٹ فارم اور بانسری۔ اور اگر بابا نے یہ پلیٹ فارم چھوڑ دیا تو پھر دن و رات کا کیا ہوگا۔ سنا ہے کہ ان کے پہلے بھی ایک بابا تھے۔ 'اِک تارا والے بابا'۔ وہ بھی اس پلیٹ فارم پر رہا کرتے تھے مگر شاید ایک صبح ان کی گاڑی آگئی۔ وہ چلے گئے۔ پربھگوان کی لیلا اپرم پار شام کی گاڑی سے بانسری والے بابا اتر پڑے۔ بہت بڑے بانسری وادک ہیں بابا۔ ان کو تکلیف دینا مناسب نہیں۔ حالانکہ قانوناً اس بنچ پر چار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ مگر آیئے آگے والے شیڈ کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں کوئی بنچ خالی ہو۔

آگے والے شیڈ میں بھی بنچ خالی نہ تھا۔ چار پانچ بکسوں سمیت ایک موٹا سا آدمی اس پر پڑا ہوا تھا۔ قلی اسے دیکھ کر جیسے کانپ گیا۔ بولا: "صاحب یہاں بات نہ کرو۔ کہیں نیند ٹوٹ گئی تو آفت ہو جائے گی۔ دو بار اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ دونوں بار دو اسٹیشن ماسٹروں کی بدلی ہو گئی۔ پتہ نہیں اس کے بکسوں میں کیا

ہے۔ جب بھی اس کی نیند ٹوٹتی ہے کچھ نہ کچھ بدل دیتا ہے۔ یہ ہمیشہ گاڑی کا انتظار کرتا ہے۔ مگر اسے گاڑی کبھی نہیں ملتی۔ چھوٹ جاتی ہے اور پھر رات کو یہیں پلیٹ فارم پر سو جاتا ہے۔ اسے کوئی جگاتا نہیں بس بانسری بابا کی تان ہی اسے اٹھاتی ہے۔ یہ بہت بڑا ہے صاحب۔ یہاں سے کھل چلئے۔ دو ایک شیڈ اور بھی دیکھ لیں۔

اس شیڈ میں کچھ امید تھی وہ بھی جاتی رہی۔ کنگالیوں کے دخل میں ہے یہ بنچ۔ یہ سب بے تاج بادشاہ ہیں۔ یہ کسی کی نہیں سنتے۔ اپنی کرتے ہیں۔ سننے پر ان کا وشواش نہیں۔ جو چاہا کرتے ہیں۔ کرتے ہی جاتے ہیں۔ دھڑ پکڑ ہوتی ہے تو دو ایک روز ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ بنچ مسافروں کے قبضے میں شاید ہی آتا ہے کہ ان کی برسوں کی بیٹھک سے میل کی اتنی تہیں جم چکی ہیں کہ اب بنچ کی جگہ میل ہی میل ہے۔ دوسرے مسافر اس پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ میں نے سوچا اگر خالی ہو تو شاید آپ اس پر بیٹھنا پسند کریں۔

"کیوں ــــــ؟"

وہ اس لئے کہ آپ کو بیٹھ جانے کی شدید خواہش ہے۔

"سوال یہ ہے کہ یہ لوگ آخر پلیٹ فارم پر ہی کیوں؟"

سوال بہت گمبھیر ہے۔ میں بھی کبھی کبھی یہی سوچتا ہوں۔ اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں خود کب سے پلیٹ فارم پر ہوں۔ کب آیا تھا، کیسے آیا تھا یہاں۔ ایک ہی چیز یاد رہ جاتی ہے بوجھ اور اس کے عوض چند سکے، پیٹ اور پھر وہی بوجھ۔ سبھی چھوڑ جانے والے یہ لوگ بھی نہ جانے کب سے اس لمبے پلیٹ فارم کی کہانی میں شامل ہیں۔ آج تیس تینیس سال سے ہر رات حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ کہانی کہیں ٹھہرتی نہیں ہر رات کچھ اور ہی لمبی ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی پکڑ ہی نہیں پاتا۔ بانسری بابا کو ہی لیجئے۔ ان کے آنے سے لگا کہ شاید کہانی ٹھہر جائے گی۔ مگر رات کے آنے تک کہانی نے پھر بڑھنا شروع کیا اور پھر پھیلتی ہی چلی گئی۔

"تو تمہاری اس کہانی میں ریل کی پٹریاں، ڈبے اور انجن شامل نہیں ہیں؟"

نہیں کہانی میں یہ شامل نہیں ہے بلکہ کہانی ان کا انتظار کرتی ہے کہ وہ خود اس میں شامل ہو جائیں۔

"بات بہت دلچسپ کرتے ہو۔"

بات نہیں، کہانی بہت دلچسپ ہے۔

"میرا سوال تو وہیں رہ گیا۔ یہ لوگ پلیٹ فارم پر ہی کیوں؟"

وہ اس لئے کہ یہ سب [illegible] ہیں۔ انہیں کبھی کوئی

ٹرین نہیں ملنے والی۔ بس چمکتی پٹریوں پر اپنی آنکھیں جلا کر تشفی کر لیتے ہیں۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو اب آخری شیڈ بھی دیکھ لیا جائے۔ چلئے۔

قلی، بوجھ سے تمھاری کمر اتنی جھک جائے گی۔ معاف کرنا تمھیں خواہ مخواہ تکلیف دی۔

نہیں کوئی بات نہیں۔ کام تو کرنا ہے۔ دن میں بوجھ تو جوان قلیوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس لئے رات کے مسافروں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

"یہ چلتے چلتے رک کیوں گئے؟"

اب مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ روشنی بھی کچھ کم ہے۔

"تو پھر اتار دو سامان!"

نہیں نہیں اپنا باقی بوجھ بھی مجھے دے دیجئے۔

"لیکن ——"

لیکن ویکن کچھ نہیں۔ پیسے کی فکر مت کیجئے۔ ایک ہی روپیہ لوں گا۔

"پر ایک روپے میں پورا بوجھ ڈھونا —— وہ بھی جب کہ تمھاری کمر۔ . . . آخر کیوں؟"

جواب نہ دے کر اس نے بڑی تیزی سے میرا بوجھ جھپٹ لیا اور پھر اسے سر پر رکھ کر چلنے لگا۔ اور جب آخری شیڈ کی روشنی بہت قریب آگئی تو میں نے دیکھا جھکی کمر والے بوڑھے قلی کی کمر سیدھی ہو چکی تھی۔ میں نے متعجب نظروں سے اسے گھورا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا وہ خود ہی بول پڑا ——

—— اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نصف بوجھ ڈھونے کا عادی نہیں!! ☐

فردوس حیدر
۱۰ سی، ڈیفنس کمرشیل ایریا
کورنگی روڈ، کراچی، پاکستان

گائے

اس نے چونک کر اپنے مہندی والے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا اور کلائی میں بندھے موتیے کے گجروں کو ناک تک لے جا کر سونگھا۔ پھر اپنی مانگ میں لگی افشاں کو چھوا تو اسے اپنی ہتھیلی میں شعلہ رنگ مہندی اور کلائی کے گجروں کی آغوش صفت مہک نے بے چین کر دیا۔

مہندی کا رنگ نکھرنے کے لئے اور مانگ کا سیندور بوسہ نمی کے لئے اور ہونٹوں کی ادھ کھلی کلیاں پھول بننے کے لئے بے تاب تھیں۔ لیکن سب کچھ جوں کا توں تھا۔

سب کچھ گرمیوں کی حبس زدہ رات کی طرح یوں تھا جب پیڑوں پر پتے دم سادھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہوا کی سرگوشیاں کہیں گم ہو جاتی ہیں اور وقت کے ٹھہر جانے کا کرب ہر چیز پر نظر آنے لگتا ہے۔

وہ رات بھی اسی طرح کی ایک دم سادھے، سہمی ہوئی اور گم سرگوشیوں والی اور ٹھہرے ہوئے کرب کے بوجھ سے دبی ہوئی ایک رات تھی۔

وہ رات جو انتظار میں پل پل، لمحہ بہ لمحہ کٹی کئی راتوں کے بعد آئی تو اس کا مہکتا بدن کسی دستک کے انتظار میں سراپا کان بن گیا۔

پل پل وقت گذرنے لگا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن گیا اور پھر جیسے صدیاں بیت گئیں۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ مگر سکوت، تنہائی اور بے چینی میں اضافہ ہوتا رہا۔

بے صدا گلی میں گائے کے ڈکارنے سے سکوت کے گہرے کنوئیں میں آواز کے پتھر نے ہلچل مچادی جیسے وہ بھی لمحوں کے ٹھہراؤ اور وقت کی ویران یک رنگی اور اکیلے پن کا دکھ سہتے ہوئے تنگ آ چکی تھی اور اب ڈکارتے ہوئے رسی تڑا کر دوسرا تھ کی خوشبو کی تلاش میں چل نکلی تھی کہ چاہت کا موہ شدید ہو گیا تھا۔

لوگوں نے اپنی اپنی کھڑکیوں اور دروازوں سے اپنے حیران تھکے۔ مضمحل. ناآسودہ چہروں

سے باہر جھانک کر بیزاری سے گائے کو دیکھا مگر جوان بن بیاہی اور شوروں سے بچھڑی اور فرقت کے غم سے نڈھال ہو جانے والیوں نے سوچا کہ گائے رستہ تڑا کر گابھن ہونے جا رہی ہے اور رشک کے ننھے منے جگنو ان کی آنکھوں میں چمکنے لگے۔ اور انھوں نے جان لیا کہ یہ گائے کا حق ہے اگر وہ کھونٹے سے بندھی ڈکارتی رہتی تو یہ حق اسے کبھی نہ ملتا کہ ہر وہ گائے جو کھونٹے سے بندھی ڈکارتی رہتی ہے۔ اس کا استحصال صرف اس وقت اپنا دم توڑتا ہے۔ جب گائے کے اندر رستہ تڑانے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ قوت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب تخلیقی عمل کا جوالا مکھی پھوٹ نکلتا ہے۔

وہ رات جو تمام راتوں کی ماں رات تھی۔ جس کی کوکھ سے لمحے، پل اور گھڑیاں جنم لیتی ہیں اور دوسرا تھ کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور سپردگی کی خوشبو پھیلتی ہے۔ جب جوں کی توں گزرنے لگی تو اس نے اپنی جھکی ہوئی نظریں اوپر اٹھا کر دیکھا۔

وہ سامنے تھا۔

پورے وجود کے ساتھ حاضر۔ یقین کی حدوں کے ساتھ موجود۔ لیکن وجود حاضر ہوتے ہوئے بھی غائب تھا اور یقین ہوتے ہوئے بھی بے یقینی تھی۔ اس کی جھکی نظریں جو اٹھی تھیں پھر جھک گئیں۔ سب کچھ بلندیوں سے پستی کی طرف چلا گیا۔ جس انتخاب میں اس کا دخل نہ تھا۔ پھر بھی اس نے قبول کر لیا تھا۔ جسے اوروں نے اسے دیا تھا اور اس نے اپنا لیا تھا۔ وہ سب کچھ اپنانا چاہتی تھی۔ ایمان لانا چاہتی تھی۔ عبادت کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی جھکی ہوئی نظریں لرز رہی تھیں۔ ماں رات کی ممتا قتل ہو گئی۔ اس کی کوکھ سے جنم لینے والی گھڑیاں دفن ہو گئیں اور اس کی پسلیوں سے پیدا ہونے والے لمحے مصلوب ہو گئے۔

وہ اس کے سامنے تو تھا لیکن تخلیقی قوت سے محروم۔

وہ جو اس کے سامنے تھا۔ اپنے آپ کو خدا کہلانے پر مصر تھا۔ نیائے انیائے دھرم ادھرم۔ سارے جھوٹے اپدیش۔ وہ وہاں اڑا کھڑا تھا اور جو اس کے پاس نہیں تھا اس کی تصدیق چاہتا تھا۔ تم مجھے چاہو گی۔ سجدہ کرو گی۔ مجھے پوجو گی کہ میں تمھارا خدا ہوں۔ تمھارے لئے اس گھر میں راتب ہے۔ سایہ ہے۔ موسموں کی شدت سے تحفظ ہے لہٰذا کھاؤ پیو اور ڈکارو مگر کھونٹے سے بندھی رہو۔"

حکم سنایا گیا۔

وہ سنتی رہی اور اسے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے پر غور کرتی رہی۔ راتب کے معاوضے میں سجدے کو اس کی پیشانی جھک نہ سکی۔ عبدیت تو اندر ہوتی ہے جو روشنی کی کرنیں بن کے سامنے آتی ہے۔ مگر یہاں تو باہر سے اندر تک سب کچھ خالی۔ ویران اور سنسان تھا اور اس کا دل سجدہ کرنے پر مائل نہ ہو سکتا تھا۔

سائے کے عوض بندگی اور تحفظ کے بدلے بلیدان سب سے بڑا ایمان تھا۔ ناانصافی تھی اسے چھان بین کئے بغیر ایک ایسے کھونٹے سے باندھ دیا گیا تھا جہاں دنیا کی تمام نعمتیں تو میسر تھیں لیکن وہ کچھ نہ تھا جس کی اسے فطری ضرورت تھی۔

ایسی خواہش، ایسی چاہ، ایسی قوت جو اسے تخلیق کے مقدس مرحلے سے گذار کر ماں کا رتبہ دیتی اور اس کے سینے میں ممتا کا سمندر شہد رس بھر دیتی اور وہ پھل دار پیڑ کی طرح دھرتی پر ہوتے ہوئے لہلہاتی اور جھومتی۔

اس کی آنکھوں پر سنہری پردے تان دیئے گئے اور پاؤں میں گل رنگ نغمہ ریز زنجیریں پہنا کر سجدے پر مجبور کیا گیا۔

وہ رات جو تمام راتوں کی ماں رات تھی اور اس کے بعد آنے والی کئی راتیں جب جرن کی توں گزرنے لگیں تو اس کے اندر عورت سیپیوں کے منہ کھل گئے۔ اس سمے یا کسی بھی سمے اس پر گوہر نہ برسا تو اس کے اندر کی عورت سیپی رو دی۔ اور نامرادی کی جھنجھلاہٹ اس کے وجود میں آ گئی اور اس کا رواں رواں بے زاری کی اکتاہٹ سے سلگ اٹھا۔

وہ جو اس کا خدا بنا دیا گیا تھا۔ اور جسے خود بھی اپنی نامرادی کا احساس تھا۔ لیکن اپنے چوڑے چکلے وجود اور آہنی بازوؤں کے سہارے اپنے خالی پن کا بھرم قایم رکھنا چاہتا تھا اور اسی لئے وہ سجدے کا متمنی تھا غیر منصف تھا۔

اس نے تخلیقی صلاحیت سے محروم پتھر کو برتنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ پوجنا چاہا لیکن اس کی باطنی صداقت نے خالی ڈبے کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ قہر تھا، مہر نہ تھا جلال تھا جمال نہ تھا اور اس کے خدا میں ہر دو صفات کا ہونا لازمی ہے۔

وہ کھونٹے سے بندھی رہی۔ اس کا بدن سلگتا رہا۔ اور اسے بے ضمیری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا رہا لیکن اس کے وجود کا جوالا مکھی پگھلتا رہا اور اس کی باطنی آنکھ گہری ہوتی گئی۔

تب اس کی ذات کے کرب نے ایک ایسی صدا سنی جو تمام صداؤں پر محیط تھی جو قطرے

کو سمندر کی طرف اور جزو کو کل کی طرف لے جارہی تھی۔ جیسے

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

کی بازگشت سنائی دی ہو اور اس کی ذات میں ہلچل بڑھتی گئی۔ وہ بانسری کی طرح اپنی لے کے درد میں سرور حاصل کرنے لگی۔ تب اسے یقین ہو گیا کہ جب درد انتہا کو پہنچ جائے گا تو وہ گھڑی آکے رہے گی جس کا اسے انتظار ہے اور یہ ہی یقین اس کی ذات میں امید کی شمعیں روشن کرتا رہا اور اسی امید نے انتظار کے پہاڑ کو اس کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا۔

دنیا والوں نے اس درد کو، اس انتظار کو، اس اعتماد کو محض اعصابی تناؤ سمجھا مگر وہ اپنے اندر ایک ناقابل تسخیر قوت بنتی گئی۔ اور پتھر وجود اس کا خدا اس سے خائف ہو کر اسی پر اپنی گرفت مضبوط کرتا رہا اور ماہر سائنسدانوں کی مدد سے اس کے حلق میں تلخ اور نشہ آور سیال انڈیلتا رہا۔ وہ کسی صورت بھی گائے سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا کہ گائے اس کا سمبل تھی اور اس کے چوڑے چکلے وجود کی تصدیق تھی۔

پیار سے پربت کٹ سکتا ہے اور لوہا لوہے کو کاٹ سکتا ہے مگر کوئی تیشہ تخلیق کی امنگ کو نہیں کاٹ سکتا نہ کوئی اس سرور پر حاوی ہو سکتا ہے جو تخلیق کی تمنا نے بخشا ہو۔

اور پھر

عالم بے خودی میں اس نے محسوس کیا کوئی جھونپڑی چھوٹی نہیں اور کوئی محل بڑا نہیں۔ کوئی ہیرا قیمتی نہیں اور کوئی پتھر ارزاں نہیں اس نے محسوس کیا حاکم محکوم ہو گیا ہے اور آقا غلام بن گیا ہے۔ اس نے دیکھا ایک پہاڑ ہے طور جیسا۔ ایک صدا ہے کلام جیسی ایک تجلی ہے علم جیسی۔

تب بشارت ہوئی ایک قطرے کو۔

ایک قطرہ جو تمام سمندروں کا سمندر ہے۔ صدف میں گوہر ہے۔ جو نایافت ہے۔ نایاب ہے۔ زمین ہے۔ زماں ہے۔ لامکاں ہے۔

بانسری کی لے تیز تر ہوئی۔ سوز اور ساز ایک ہوئے ناز اور نیاز باہم ملے زمین و آسمان سربسجود ہو گئے اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ گھڑی آن پہنچی ہے۔ جس کا اسے انتظار تھا اور جس کے انتظار میں اس کی ذات کرب کی بھٹی میں سلگتی رہتی ہے۔ تب اس نے سنہری پردے چاک کر دیئے اور آہنی زنجیریں توڑ دیں۔

دنیا والوں نے اس سے وہ گھڑی چھین لینا چاہی کہ وہ خود درد کی اس کیفیت سے ناآشنا تھے۔ جو سرشاری اور قلندری کا سرچشمہ ہے۔ اذیت پسندوں نے اسے سنگسار کرنا چاہا مگر اب زنجیریں ٹوٹ چکی تھیں وہ اپنی منزل کی طرف چل نکلی تھی۔ وہ چلتی رہی بھاگتی رہی اور اس کا تعاقب ہوتا رہا۔

اب وہ ایسی قوت بن چکی تھی جو دوسری قوت سے ہم آہنگ ہو کر تخلیقی عمل کا آغاز کرنا چاہتی ہے اور ایسا ہونا فطری تھا لازمی تھا اور وقت کا تقاضا بھی کہ درد انتہا کو پہنچ چکا تھا اور جب جنم کا عمل شروع ہو تو وہ گھڑی ماں گھڑی کہلاتی ہے کہ جس کے وجود سے انکار ناممکن ہے اور جس کے سامنے جھکنا لازمی ہے اور جس کی تصدیق و اعتراف کے لئے کسی اعلان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سنگ سار کرنے کے شوق میں اس کا تعاقب کرنے والے اس مقام پر پہنچے جہاں وہ اٹل فیصلے کی طرح مضبوط کھڑی تھی۔ انھوں نے اس کے وجود سے پھوٹتی پھیلتی اور بکھرتی ہوئی روشنی دیکھی۔ اور اسے ایک ایسی قوت کے سامنے سربسجود دیکھا جو اس پر سایہ کئے ہوئے تھی اور اس پر حاوی تھی اور اس فوقیت کا اعتراف وہ اپنے من مندر کی گھنٹیاں بجا کر رہی تھی۔ انھوں نے روشنی کا ایک سائبان دیکھا جس کے نیچے اس کا وجود ایک چاندی سیال کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

ایک ایسا سیال۔

جو کبھی اس کے ہاتھوں میں لگی مہندی جیسی لال رنگت اختیار کر لیتا۔ کبھی ہونٹوں کی کلیوں کو پھول بنا دیتا اور کبھی گجروں کی خوشبو بن جاتا۔

اب ہونٹ ہونٹ نہ رہے تھے۔ مہندی مہندی نہ تھی۔ گجرے گجرے نہ تھے۔ سب کچھ ایک اکائی بن گیا تھا۔ سائبان کے اندر سائبان کے باہر آسمان کی بلندیوں میں زمین کی وسعتوں میں۔ فضاؤں کی پہنائیوں میں۔ سمندر کی لہروں میں کہیں بھی دوئی کا وجود نہ تھا۔ صرف چاندی کا سیال تھا جو سارے میں موجود تھا اور مسلسل بہہ رہا تھا اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی زد میں تھا۔

اب وہ ایک قوت بن چکی تھی۔ اسے سنگ سار کرنے والوں کا خوف نہ رہا تھا کہ اب وہ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر تھی۔ اور پھر۔

جب سارے تھکے مضمحل ناآسودہ چہرے اپنے بند دروازوں اور اپنی ادھ کھلی کھڑکیوں کے پیچھے پسماندگی اور لاعلمی کے اندھیرے میں بے خبر پڑے تھے۔ اس سمے وہ گائے جو رسی تڑا کر چلی گئی تھی واپس لوٹ آئی۔

اور واپس آکر اس نے گابھن ہونے کا اعلان کر دیا۔ ☐

طارق بشیر
ص۔ب۔ ۸۸۹، الریاض
(سعودی عربیہ)

ایک دو تین

ایک دو تین ——— دھڑام!

اور سب کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کیا کھلی نیند اچٹ گئی۔ اس رات کے بعد بستی میں لوگ چین کی نیند سے محروم ہو گئے۔ مسئلہ نیند ہی کا نہیں تھا بلکہ شہر جانے کا بھی تھا کہ شہر بستی سے کٹ گیا تھا۔ بڑے بڑے تودوں کی شکل میں پل کے سارے ستون پانی میں بہہ کر دوسری بستیوں کی طرف جا چکے تھے اور اس بستی کے ستون اس بستی کو چھوڑ کر کیا گئے کہ پوری بستی ہی کو سانپ سونگھ گیا۔

چار، پانچ، چھ ——— اور پھر دنوں پر دن گزرتے گئے۔ لوگوں نے بہتے دریا سے سمجھوتا کر لیا اور پانی کو بھی راستہ دینے میں عار نہ رہی اور لوگ پھر زندگی کے اسی راستے پر گامزن ہو گئے مگر اب بستی میں زندگی وہ نہ رہی تھی کہ جو پہلے سانس لیا کرتی تھی۔ دھوپ پھیکی پڑ گئی اور لوگ بوجھل نیند لئے گلیوں میں راستہ پوچھتے پھرتے۔ اکثر عجیب و غریب واقعات جنم لینے لگے۔ وہ اچھے رہے جو پانی سے راستہ مانگ کر بستی چھوڑ چکے تھے۔ میں نے بھی ایک رات تھیلے میں سامان باندھا اور پانی کی دہلیز پر جا دستک دی۔

سات آٹھ نو ـــ دروازہ کھل گیا اور میں سمٹی ہوئی بستی کی گلی سے نکل کر شہر کے لمبے چوڑے بازار میں آ پہنچا۔

دس، گیارہ، بارہ، ہر جگہ اسی تعداد میں۔ بالکل اتنے، کہیں بھی نہ کم نہ زیادہ میں نے جسے بلایا، چودہ پندرہ، سولہ آدمیوں نے مڑ کے دیکھا۔ ایک نام سے اتنے آدمی میں نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ اسی وجہ سے تعجب آنکھوں میں مستقل جاگزیں ہو گیا اور میں بات کرتے کرتے چپ ہو جانے لگا۔ مجھے ہر بات پر یوں لگتا کہ میں جس سے مخاطب ہوں، وہ ایک نہیں ہے۔ اور جو مجھ سے مخاطب ہے، وہ بھی ایک نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ میرے سامنے والا بھی مجھ ایک سے مخاطب نہیں بلکہ اس کا لہجہ بہت سارے لوگوں کے لئے ہے جب کہ میں نے اپنے اور اس کے سوا، کسی تیسرے کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا۔

سترہ، اٹھارہ یا انیس ——— سال! ہاں کوئی عمر ہوگی۔ مری ماں کہتی تھی بھلا یہ بھی عمر ہے پردیس جانے کی۔ یہ تو تمہارے کھیلنے کے دن ہیں اور واقعی میں ان دنوں پروین، جمیلہ اور رضیہ سے کھیلا ہی کرتا تھا۔ مگر باپ کا کہنا تھا کہ نہیں، یہ لو کھیس او ر جاؤ مگر میں نے نہ جانا تھا، نہ گیا۔ لیکن جب بستی کا پانی کے سوا کوئی نہیں تھا

میں بن بتائے چپکے سے نکل گیا۔ اور خوشبو مجھے بالکل بھول گئی۔

بیس، اکیس، بائیس نمبر کے سب کمرے اِسی طرح کے لوگوں کے لئے تھے جو گھروں سے چپکے سے نکل آئے تھے اور ایک ایک کمرے میں اتنی اتنی تعداد میں لوگ رہتے تھے۔ آدھے دن کو، آدھے رات کو، دن والے رات کو کام پر جاتے تھے تو رات والے دن کی ڈیوٹی کرتے تھے۔ اِس کے باوجود کمرہ اتنا تنگ تھا کہ حبس بدبو کی شکل میں چاروں پہر منڈلاتا رہتا۔ باقی چار پہر میں گھر سے باہر رہ کر کسی حد تک مطمئن رہتا، حالانکہ کمرے کی بدبو اور کمرے سے باہر کھلے کی بدبو میں زیادہ فرق نہیں تھا اور خوشبو تو میں بالکل بھول ہی چکا تھا نا!

تیئس، چوبیس، پچیس، ـــــ مہینے گزر گئے اور میں شہر میں اپنے آپ کو کھپانے میں کوشاں رہا۔ باقی سب کچھ ٹھیک تھا مگر یہ بدبو مجھے نہیں بھاتی تھی۔ بھاتا گیا، میرے دماغ میں ہر وقت ایک ناگوار خیال بند رہتا جسے نکالنے کے لئے مجھے شہر چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تھا مگر فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ مجھے ہر وقت گھن گھیرے رکھتی کہ لوگ پسینے میں شرابور ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں مجھے بلکہ ایک ساتھ سوتے ہیں اور میری رات کی نیند میں بھی بستی کی نیند جیسی ہونے لگیں۔ مگر کیا کرتا دن میں تو حال اور بھی خراب ہوتا تھا۔ اور پھر شہر میں مجھے تنخواہ کی جگہ سونے کی ڈلی ملتی تھی۔

چھبیس، ستائیس، اٹھائیس سال ـــــ ہوئے جب دادا جان نے بھائی جان اور دوسرے بچوں کی پیدائش پر دھوم دھڑکے اور ڈھول تاشے بند کرا دیئے تھے اور بچوں کو دھوپ سے بچانے کے لئے روئی کے گالوں میں پرورش کرنا شروع کیا۔ میں نے بھی وہاں اسی طرح کے چند سال گزارے۔ جب پہلی جماعت میں داخل کراتے وقت دادا جان سالم تانگہ لے کر گئے تھے اور ایک نوکر روزانہ مجھے اٹھا کر لے جاتا تھا اور اٹھا کر لاتا تھا۔ مگر دادا جان پرائمری سکول کے پہلے ہی چند سالوں کا بوجھ برداشت کر سکے اور پھر پوتوں پوتیوں کی تعداد دن دگنی کے حساب سے بڑھنے لگی۔

اُنتیس، تیس، اکتیس تاریخ ـــــ کو گھر کا حال بہت برا ہوتا تھا۔ قرض خواہوں کے تقاضے اور نئے مہینے سے پہلے مالک مکان کرایہ لینے آدھمکتا۔ اس صورتِ حال نے مجھے بچپن ہی سے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا مگر میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ اور پھر کچھ نہ کچھ ہو جاتا کہ کچھ عرصے کے لئے سب ہوائیں بند ہو جاتیں اور نلکے سے پانی آنا شروع ہو جاتا اور میں بھول جاتا کہ کیا ہوا تھا۔ میں اب بھی بھول جانے کی عادتِ بد میں مبتلا ہوں اور یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ میں خوشبو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

بتیس، تینتیس، چونتیس روپے ـــــ بچا کر میں پورے مہینے میں خرچ کرتا اور باقی سب کچھ گھر بھیج دیتا۔ جس کے جواب میں گھر سے اچھے اچھے خط آتے۔ خط کھولتا تو مجھے ذرا ذرا خوشبو یاد آ جاتی مگر پھر

دن میں میں شامل ہوتا تو دن کی بدبو بھی مجھ پر چھا جاتی۔ اور ایک دن، ہاں وہ دن بہت عجیب تھا۔ جب میں نے ایک دوسری بدبو سونگھی، ایک اشتہار تھا، اس بدبو نے مری آنکھوں کو جلا کر رکھ دیا اور رات بھر پپوٹوں پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتا رہا اور دن شروع ہوا تو میں دوہری مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ دن بھر کام میں جی لگا نہ کچھ کھانے پینے میں، بلکہ جو کچھ کھاتا تے ہو جاتی اور گھن دانتوں تلے کپکپاتی رہتی۔

پینتس، چھتیس، سینتیس گھنٹوں ——— کی کشمکش کے بعد جب میں بازار سے گزرا تو وہ اشتہار پھر نظر پڑا مگر اب اس اشتہار کی جگہ ایک نہ تھی، ہر طرف وہی اشتہار تھا۔ خوبصورت لباس اور رنگ دار جسموں کی بدبو اشتہار سے بھی زیادہ عذاب ناک ثابت ہوئی۔ مرے سب کام چھوٹ گئے اور نکلنا پھر بند ہو گیا۔

اور پھر اڑتیس، پینتالیس، پچپن سب، ساتھ چھوڑ گئے اور اٹھاون، انسٹھ، ساٹھ سبھی ختم ہو گئے۔ اب میں دن رات کمرے میں رہنے لگا۔ دن میں رات کی ڈیوٹی والوں کے ساتھ اور رات کو دن کے کام والوں کے ہمراہ۔ دو وقت کا کرایہ دیتا اور دوہری بدبو سے دوچار رہتا۔ اس میں دو گھنٹے ایسے ہوتے جب میں گھر میں اکیلا ہوتا۔ ایک گھنٹہ صبح، ایک گھنٹہ شام۔ جب رات کی ڈیوٹی والے جا چکے ہوتے اور دن کی ڈیوٹی والے ابھی نہیں لوٹے ہوتے تھے یا صبح والے جا چکے تھے اور رات والوں کو ابھی لوٹنا ہوتا تھا۔ اور یہی دو گھنٹے ہوتے جب تعفن ذرا کم ہوتا تھا۔ مگر چوبیس گھنٹوں میں یہ دو گھنٹے گزرتے دیر نہ لگتی۔

اور ایک دن، ہاں وہ ایک دن بھی بہت عجیب تھا کہ شام کی ڈیوٹی والے جا چکے تھے اور دن کی ڈیوٹی والے ابھی نہیں لوٹے تھے اور میں بدبو کے حصار سے باہر تھا کہ کچھ ڈھونڈتے میں ساتھ والے بستر کا تکیہ الٹ گیا اور دیوار پر چپکا اشتہار مرے سامنے کھل گیا۔ ابھی مرا دوسرا ہاتھ، دوسرے تکیے کے نیچے کچھ ڈھونڈ رہا تھا کہ بازار والے اشتہار کا کچھ حصہ مرے ہاتھ سے مس ہوا اور میں نتھنوں میں گھسنے والی بدبو کو نہ روک سکا۔ پھر ہر تکیے کے نیچے یا تو اشتہار تھا یا پھر خوبصورت جسم کی بدبو تھی۔ کمرے کے سارے بستر ننگے پڑے تھے اور مری آنکھیں، کان، ناک اور دانتوں تلے ننگی بدبوئیں بھپکے اڑانے لگیں جسم پسینے کی بدبو سے ٹپکنے لگا۔ مری رگوں میں سے بال کانٹوں کی طرح اگ آئے اور انگلیاں ناخنوں کے کھجلانے سے خراشوں سے بھر گئیں اور کمرے کا پچھتر، چھتر، اکسٹھ، باسٹھ، ترسٹھ، سینٹی گریڈ ہو گیا ——— اور مری نکسیر پھوٹ نکلی۔

شام اندھیرے کے شگاف میں ڈوب چکی تھی کہ میں نے تھیلے میں سب سامان باندھا اور

بھاگ نکلا۔ میں رات گئے گاؤں پہنچا تو گاؤں نیند کے پاؤں چل رہا تھا۔ ہر چیز خاموشی کی قبر میں دفن تھی اور سکون کا پہرہ سب کو تھپکی دے رہا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا کہ باہر پہرے دار کی چاپ خواب آور تھی اور سب گھروں کے دروازے یونہی چشم براہ تھے۔ ایک چپ کمرہ میں ایک اکیلی چارپائی پر میں دھم سے گرا تو مجھے یک دم پانی کا خیال آگیا۔ آتے وقت مجھے راستے میں پانی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے سوچا تو یاد آیا کہ میں پل پر ہی سے تو گزر کر آیا ہوں ـــــ اور پانی ؟ میں نے نلکا چلا کر دیکھا ـــ ہوں ! تو بستی والوں نے پانی کو نلکے میں بند کر ہی لیا تھا ! □

علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو
سینٹ جانس کالج، آگرہ

نئے افسانے کی شناخت کی ضرورت

گذشتہ دنوں افسانہ سے متعلق بعض تنقیدی مضامین میں براہ راست افسانہ کو لے کر یا تجسیم، علامت اور استعارے وغیرہ کی وساطت سے اکثر و بیشتر افسانے کی شناخت کی بات کی گئی۔ اس سلسلے میں افسانوں کے تجزیاتی سلسلے بھی چلے، سیمینار ہوئے، بحثیں ہوئیں اور پھر رسائل کے اہتمام پر طویل و عریض خطوط بھی شائع ہوئے ان سب میں زیادہ تر افسانہ کی شناخت کی بات اٹھائی گئی اور پہلے اس پر غور کیا جانے لگا کہ حقیقتاً افسانہ کیا ہے؟ اس کی اصل شناخت کیا ہے؟

اس سے قبل کہ اس کی شناخت پر گفتگو کی جسارت کی جائے پہلے اس امر پر توجہ لازمی ہے کہ اس کی ضرورت ہی کیوں آن پڑی؟

افسانے کی پہچان کے کچھ معیار کافی عرصہ قبل فکشن کے بزرگ نقاد وقار عظیم نے اپنی کتاب میں قایم کئے تھے۔ یہ کتاب اگرچہ فرسودہ ہو چکی ہے لیکن افسانے کے فن سے متعلق کتابی شکل میں اب بھی اس کی اہمیت بنیادی ہے اور بنیادی درجہ ہونے کے بنا پر ہی اب اس کی فرسودگی کا کھل کر مذاق اڑایا جانے لگا ہے۔ گذشتہ دنوں دہلی کے ایک سیمینار میں جدید افسانہ نگار انتظار حسین نے اس کی قدامت پر باقاعدہ ایک مقالہ پڑھ ڈالا اور اسے مضحکہ خیز انداز میں آؤٹ ڈیٹیڈ قرار دیا لیکن اس وقت شاید ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ وہ کتاب ان کے افسانوں کے لئے نہیں لکھی گئی بلکہ اس وقت لکھی گئی جب افسانہ پریم چند کے بعد سدرشن، حسینی سہیل عظیم آبادی۔ احمد ندیم قاسمی۔ جیسے قلمکاروں سے نکل کر ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاتھوں میں آ گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر کے اس قسم کے وہ تمام افسانہ نگار جو ان افسانہ نگاروں اور ان کے فن کو للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے آج انھیں کو آؤٹ ڈیٹیڈ قرار دیتے ہیں پھر ایسے میں وقار عظیم کی کیا حیثیت وہ بیچارے تو نقاد ٹھہرے جو پہلے ہی سے معتوب رہتا ہے۔

آج کے سنجیدہ نقادوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ گذشتہ پندرہ بیس برس کا ادبی دور حقیقتاً افسانے کا دور رہا ہے اس کے باوجود افسانہ کے فن اور اس کے تبدیل رجحانات پر مضامین تو ضرور آئے لیکن

باقاعدہ اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں آئی۔ یہ عمل اتفاقی ہو سکتا ہے، اس کی عدم ضرورت یا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی شے پر زیادہ ہنگامے ہوں تو پھر باقاعدہ کوئی کتاب لکھنا اپنے آپ کو آگ کے دریا میں جھونکنے کے مترادف ہوتا ہے اور کون عقلمند ہوگا جو بڑھ کر آگ کے شعلوں کو گلے لگانا پسند کرے گا —— پھر اس دہائی میں اچانک افسانہ کی شناخت کی بات ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ بات ضرورت میں بدل گئی۔ ایسا کیوں؟ کچھ نہ کچھ بات ہے، کوئی ہنگامہ ضرور ہے جو اس پردہ میں کام کر رہا ہے۔ تمام افسانہ نگار حضرات —— افسانے کے شائقین اور قارئین ممکن ہے اس کی وجہ اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

ماضی قریب کے ایام میں افسانے کے بادل کچھ اس انداز سے گرجے، چمکے کہ اس کی ہری بھری کھیتی جو ابتدا میں شادابی کی طرف مائل تھی اچانک کملا سی گئی، اس کی روح کہیں بھٹک گئی اور افسانہ نجانے کس دھند میں کھو گیا کہ بس کبھی کبھی اس کی دھندلی شکل دکھائی دیتی لیکن جلد ہی پھر کسی سرد ہوا کی لپیٹ میں وہ نڈھال ہو جاتا —— ادھر قاری حیران و ششدر۔ شائقین خشک حلق لئے ادھر ادھر بھٹکتے رہے اور دریائے حیرت و استعجاب میں غرق علامت۔ تشبیہہ و استعارے کی گونج سنتے رہے اور ڈوبتے رہے اور اس تنکے کو تلاش کرتے رہے جس کے سہارے وہ دریائے فن افسانہ کو بہ آسانی پار کر جایا کرتے تھے لیکن اس بار ایسا نہ ہوا اور ایسے میں جب افسانہ اور قاری دونوں کی جان پر بن آئے تو ہوگا یہ کہ افسانہ تو بعد میں پڑھا جائے گا پہلے افسانہ پر ہی بات ہوگی، اس کی پہچان۔ نوک و پلک کی بات ہوگی اور ہو رہی ہے لیکن یہاں بھی افسانوی انداز اختیار کیا گیا جو شاید فطری بھی تھا۔ سب اپنے اپنے تئیں ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے افسانے لکھ کر اور پھر افسانہ کی شناخت کی بات سن کر غلطاں و پیچاں ہے۔ معاملہ اگر قاری کی تفہیم کے انجذاب کا ہے تو کام چل گیا اور بالاتر تو پھر ایک نقاد تلاش کیجیے اس میں بھی ناکامی ہوئی تو خود ہی نقاد بن بیٹھے۔ اور یہ سب بھی نہ ہو سکا تو اقبال مجید کی طرح ڈرامے کی طرف مڑ گئے۔ عابد سہیل کی طرح کتاب چھاپنے لگے۔ غیاث احمد گدی کی طرح پریس کھول دیا۔ کلام حیدری کی طرح سیاست کی طرف مڑ گئے۔ بلراج مین را کی طرح مدیر ہو گئے یا پھر بعض دوسروں کی طرح لنگوٹ کھول دیا۔ لیکن یہ سب تو اپنی معصومیت اور شرافت کا شکار ہوئے ان کے بعد کے لوگوں نے جو ان سے زیادہ ہوشیار تھے انھوں نے پہلے خود ہی افسانہ کے بارے فیصلہ کیا اس کے بعد افسانے لکھے افسانویت۔ اسلوب۔ تکنیک۔ علامت۔ استعارہ کے بارے میں اس قسم کے نتائج برآمد کئے جس قسم کے استعمال انھوں نے اپنے افسانوں میں کئے تھے۔ اکثر و بیشتر ایسا بھی ہوا ہے افسانہ کچھ ہے اور تجزیہ کچھ۔ اکثر تجزیوں کے ذریعہ افسانے پہیلی بن گئے ہیں اور ایسا بھی ہوا ہے کہ افسانہ زیادہ اچھا ہے لیکن تجزیہ نے مٹی پلید کر دی۔

اس بھیڑ چال میں رسائل کے نمبر بھی نکلے۔ افسانوں کی بھیڑ نظر آئی۔ چونکا دینے والی بحثیں بھی دیکھنے اور پڑھنے کو ملیں۔ مرعوب کر دینے والے جملوں کے مطالعہ کا شرف بھی حاصل ہوا ــــــ لیکن افسانہ کہاں گیا ــــــ؟ یہ ان قارئین سے پوچھئے جو حقیقتاً افسانے کے قارئین ہیں اور جو افسانہ اور افسانہ نگار دونوں کو دائمی زندگی عطا کرتے ہیں کیونکہ افسانے صرف نقاد، یونیورسٹی کے اساتذہ یا ریسرچ اسکالر کے لئے نہیں لکھے جاتے اور بہتر طور پر صرف انھیں کو گفتگو و تجزیہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے ــــــ تو پھر ایسے گمشدگی کے ماحول میں افسانہ کی شناخت ضروری ہو گئی لیکن اس سے قبل زندگی اور زندگی کے اجزائے لازمی ــــــ یعنی وہ حقیقتیں جو شب و روز ارد گرد رقص کر رہی ہیں ان کی شناخت بھی ضروری ہے اس لئے افسانے کی گمشدگی میں بہرحال ان حقیقتوں کا رول ہے اس لئے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی گمشدگی حقائق پر مبنی ہے لیکن صرف کبھی کبھی ہمیشہ نہیں اور ہوا یہ ہے کہ اس کبھی کبھی کو ہمیشگی کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ایسا کیوں؟ یہاں پر ایک دوسرا سوال ابھرتا ہے۔

تہذیب کی شکست و ریخت۔ اخلاق کی گراوٹ۔ معاشی بدحالی۔ اقتصادی بحران۔ سائنسی ارتقا کی آڑ میں پوشیدہ کوسوں دور ہوتا ہوا سکون و چین۔ ماضی بعید کے اندھیروں میں ڈوبتا ہوا اعتماد و احساس۔ ریزہ ریزہ ہوتی ہوئی ایمان و ایقان کی قدریں۔ خود غرضی و مطلب پرستی کے بڑھتے ہوئے سائے اور ان سب کا مجموعی تاثر ایک بے نام سی چبھن اور تڑپن۔ یہ سب آج کی زندگی کی زندہ اور بیدار حقیقتیں ہیں جن کو ہمارے افسانہ نگار نے جتنی مشکلوں سے اسے جھیلا اور برداشت کیا اتنی ہی مشکل انداز میں پیش کر دینے کی کوشش کی۔ بظاہر یہ ایک اچھا تخلیقی عمل تھا لیکن بباطن یہیں پر ان سے ذرا سی چوک ہو گئی اور یہ چوک آدم اور حوا کی چوک ہو گئی جس نے مصائب اور مسائل کے ڈھیر لگا دیئے۔ اپنی مصیبتوں سے دبے یہ افسانہ نگار بھول گئے کہ افسانہ جو ادب کا خوبصورت حصہ ہے اس کا جزو اعظم ہے آرٹ اور آرٹ کا مقصد اعلیٰ احساس جمال کو ابھارنا۔ انسانی ضمیر کی نفسیاتی رگوں کو خوشگوار انداز میں جھنجھوڑنا۔ روحانی ٹھنڈک پہنچانا اور ایک مخصوص قسم کی بصیرت سے آگاہ کرنا۔ یہ ادب کی ایسی موٹی موٹی باتیں ہیں جو کسی بھی صنف سے وابستہ کی جا سکتی ہیں اور جن سے ہر باشعور واقف ہے اور اس بات سے بھی واقف ہیں کہ زندگی سے لے کر انسانی شعور اور انسانی شعور سے لے کر آرٹ تک ایک نہایت باریک پیچیدہ لیکن خوشگوار سفر طے ہوتا ہے تب جا کر یہ صورتیں نمایاں ہوتی ہیں اور قارئین لمحہ بھر کے لئے ادب کے آئینے میں اپنا اور گرد و پیش کا عکس دیکھ کر ایک ٹھنڈا۔ لطیف اور مسرت آگیں حظ محسوس کرتا ہے۔ بار بار پڑھتا ہے اور اسے دائمی زندگی عطا کرتا ہے۔

اس سے کون انکار کرے گا کہ آج زندہ رہنا ماضی کے مقابلے مشکل اور تکلیف دہ ہے لیکن اسی تکلیف کو اسی انداز میں پیش کرنا ادب کے تئیں عقلمندی نہیں بڑی بھول ہے۔ بلکہ اُن کو قریب سے گہرائی اور سنجیدگی سے دیکھنے

کی ضرورت ہے اور انھیں ادبی شائستگی کے ساتھ آرٹ کے بنیادی اصولوں کا خیال رکھتے ہوئے قدرے آسان طریقے سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندی کے مشہور ادیب و افسانہ نگار نے ایک جگہ اچھی بات لکھی ہے سے

> "تلخ تجربوں، مشکل حادثات کو آسان اور خوبصورت طریقے سے کہہ دینا ہی ادب کی کیمیا گری ہے جس سے مُردہ لفظ جی اٹھتا ہے۔ اس کی تفصیل نہیں پیش کی جا سکتی لیکن ظاہر صورت ہوتی ہے اور بڑے آسان ڈھنگ سے سب کو ہوتی ہے۔"

(ترجمہ از ہندی)

تو ہوا یوں کہ ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے مصائب روزگار. مشکلات زمانہ کو من وعن پیش کر دینے کی ناکام کوشش کی اور اسے ریفع کے اس درد بھرے نغمے کی شکل دینے کی کوشش کی جسے ہیرو زندگی سے عاجز و پریشان ہو کر. تھک ہار کر اکیلے کمرے میں آئینے کے سامنے گاتا ہے لیکن گیت اور کہانی میں فرق ہوتا ہے تو گیت اکیلے گایا جا سکتا ہے لیکن کہانی انفرادی شے نہیں ہوتی ہے کہانی میں تو گیت بھی ہوتا ہے تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ سنگ تراشی بھی فلاسفی اور تصوف بھی کیوں کہ کہانی انسانی زندگی کی نمائندگی کرتی ہے اور انسان ان تمام نیرنگیوں کا ایسا خاکہ ہے جس میں تمام اجزا کی آمیزش ہے اور انسانی زندگی میں ڈوبی ہوئی یہ نیرنگیاں آج بھی جلوہ گر ہیں۔ آج بھی تمام ہزیمتوں کے ساتھ مسرتیں ہیں۔ آلائش کے ساتھ آرائش و آسائش ہے۔ غم کے ساتھ آرام ہے آج بھی لوگ کشمیر جاتے ہیں۔ گنگناتے آبشار آج بھی نظروں کے تار میں قوس قزح بکھیرتے ہیں خوبصورت لڑکیوں سے عشق آج بھی ہوتا ہے۔ کوٹ کے کالر پر خوبصورت گلاب کے پھول آج بھی سجائے جاتے ہیں۔ دن بھر کی تکان کے بعد آج بھی شہروں کی سول لائن میں اور اس کے خوبصورت ریستوران میں عیش ہوتا ہے اور پورے لطف کے ساتھ ـــــ لیکن ان تمام مسرتوں پر بیسویں صدی کا ایک غبار چھایا ہوا ہے، ان تمام خوشگوار اعمال میں ایک مخصوص قسم کی تکان اور بوجھل پن کا احساس نہ صرف حاوی ہے بلکہ کبھی کبھی تشدد بھی ڈھلنے لگتا ہے جس کے ذریعہ یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی کہ زندگی کل کے مقابلے آج زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لیکن افسانہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ـــــ لیکن ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک گمبھیر سوال ہے جس کے جواب کے لئے کم از کم میرے ذہن میں صرف ایک صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ جب بھی قلمکار کے ذریعہ ادب کسی بڑے مقصد کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ قلمکار لاشعوری طور پر ایسے موضوعات کی طرف بڑھے گا جو اس کے اپنے ذاتی ہوں گے۔ اس عمل کی ابتدا کافی عرصہ قبل شروع ہو گئی ہوتی لیکن ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ادب کے لئے نیک فال ثابت ہوا ادیب و شاعر اس سے ہنگامے کے ذریعہ مرتب ہونے والے اثرات کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک بڑا مقصد سامنے آیا وہ تھا آزادی حاصل کرنے کا مقصد اس مقصد نے اتنی تیزی سے منھ پھیلایا کہ ہم اس میں کھو گئے اور اس کے بعد ملک کی تقسیم ہو گئی جس کے بھیانک اثرات نے

ذاتی درد کو گم کر دیا اور اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں صرف جمہوریت ہے اور ہم ہیں۔ جمہوریت کو جمہوری عوام نے جہنم رسید کیا اور صرف ہم ہی ہم رہ گئے۔ پھر جمہوریت کی بھی ایسی خراب شکلیں سامنے آئیں کہ ہم اور ہمارے دکھ درد اور بھی واضح ہوئے اور ہمارے رنج وغم نے "میں" کی تحریک کا روپ اختیار کر لیا۔ اس تحریک نے لسانی طور پر کچھ ایسا زور پکڑا کہ دکھ اور درد کی چادر میں لپٹا ہوا افسانہ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ اپنی شادابی و لطافت کھو بیٹھا۔ اپنا انفرادی تاثر کھو بیٹھا اپنی اصلی شکل کھو بیٹھا اور جب صورت حال کافی سنگین ہو گئی تب نقاد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ابتدا میں نقادوں نے ان تبدیلیوں کے تئیں اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی لیکن جب صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہو گئی تو پھر بنیاد اکھڑنی شروع ہو گئی اور افسانہ کی شناخت کی بات کی جانے لگی اور یہ ضروری بھی تھا۔ عرصہ سے ہم افسانہ پڑھتے چلے آ رہے تھے اور جب اس سے الگ کی شے ملی اور ساتھ ہی دلچسپ توجیہات و توضیحات تو پھر ضروری تھا کہ ایک قدم ایسا بھی اٹھایا جائے جس کا تعلق اس سوال سے ہو کہ افسانہ حقیقتاً کیا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لئے اگر ہم جملہ قدیم تعریفات کو بالائے طاق رکھ دیں لیکن پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہوں گی جن پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔ اردو افسانے سے ہٹ کر اگر ہم عالمی افسانہ پر نظر ڈالیں تو سب سے پہلے افسانہ نگار اور ناقد اڈگر ایلن پونے لکھا ہے کہ ——

> ہم ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ افسانہ نثر میں اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیت کے اظہار کا وسیلہ فراہم کرتا ہے...... دراصل افسانہ میں بنیادی چیز اتحادِ تاثر ہے۔ —— یعنی مجموعی تاثر ——"

اردو افسانے کے بابا آدم پریم چند افسانے کے فن سے متعلق لکھتے ہیں ؎

> "افسانہ تحلیل نفسی اور زندگی کے حقائق کی مصوری کو ہی اپنا مقصود سمجھتا ہے اس میں تخیلی باتیں کم اور تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی نہیں تجربات تخلیقی تخیل سے دلچسپ ہو کر کہانی بن جاتے ہیں:"

(مضامین پریم چند ص ۱۷۹)

دراصل افسانہ اپنے فنی حسن کے ذریعہ اس خوبصورت اور روحانی بصیرت کو بیدار کرتا ہے جو جدید دور کی تمام صورتوں سے یعنی عصری حسیتوں میں جذب ہو کر تعمیر ہوتی ہے۔ خوبصورت احساس کا مقصد روایتی طور پر ہرگز نہ لیجئے بلکہ بقول پروفیسر محمد حسن کہ —— "جمالیات میں محض احساسِ حسن شامل نہیں ہے بلکہ اس میں احساس اور دونوں بصیرت یعنی احساس، فکر اور جذبے سے پیوست ہیں اور بالیدہ شخصیت اور بالیدہ تر عصری حسیت کے بغیر وجود نہیں رکھتیں ——" ان جملوں کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ تخلیق میں آپ کو اپنی دھڑکن سنائی دے جائے اپنی تصویر کا مدھم سا عکس دکھائی دے جائے —— بس اتنی سی بات۔ یہ عکس کس طرح اترا اور کیسے اترا

اس سے زیادہ بحث نہیں۔ حقیقتاً یہ منزل اور مشکل ہے۔ ایسے میں کوئی افسانہ نگار روایتی ڈھانچے سے منحرف ہوکر ___ بغیر واقعہ۔ بغیر کردار یا بغیر گرما گرم مکالموں کے کیفیت پیدا کرتا ہے۔ دل کی دھڑکنوں میں سوزش پیدا کرتا ہے تو بلاشک و شبہ کارنامہ انجام دیتا ہے لیکن یہ خیال رہے کہ وہ کیفیت اور سوزش اصل چیز ہے چاہے کسی شکل میں ہو۔ بیان کرنے یا پیش کرنے کا نیا انداز اتنا اہم نہیں ہوسکتا کیوں کہ ان سب کی حیثیت ذریعہ کی سی ہوتی ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہم اس کا سہرا اس کے اظہار کے سر تھوپ دیتے ہیں اور ان سوتوں کی طرف دھیان نہیں دیتے جہاں سے بیان کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

فن افسانہ کا یہ تاثر۔ یہ عرفان اپنی ذات کے ذریعہ کم اس زندگی کے ذریعہ زیادہ حاصل ہوتا ہے جس میں شرکت کئے بغیر افسانہ نگار آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ صرف زندگی کا عرفان اچھی کہانی کے لئے کافی ہے تو یہ بھی غلط ہوگا۔ زندگی کی یہ پہچان بعض ایسے دوسروں کے مقدر میں آجاتی ہے جو افسانہ نگار نہیں ہوتے اور نہ ہوسکتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ جو زندگی سے بھرپور متعارف ہے اور ادب سے کسی حد تک اجنبیت ہے وہ افسانہ نگار ہوسکتا ہے اور اچھا افسانہ نگار ہوسکتا ہے۔ یہ بات اسی وجہ سے کہی جاسکتی ہے کیوں کہ ادب میں یا اس کی کسی صنف میں تخلیق کے سلسلے میں متشدد قسم کے اصولوں کا تعین در اصل فن اور آرٹ کے ساتھ ظلم نہ سہی تو زیادتی ضرور ہے لیکن پھر بھی اتنی بات تو آسانی سے سوچی جاسکتی ہے کہ افسانہ کے لئے افسانہ نگار کے تجربے۔ مشاہدے۔ قوت شناخت اور ان سب کے بعد انداز پیش کش بہر حال اپنے آپ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ جس طرح سے ہماری روز مرّہ زندگی میں ہماری اپنی صلاحیتیں۔ محنتیں۔ اور سوجھ بوجھ کام آتی ہے اسی طرح افسانہ نگار اپنے جوہر دکھاتا ہے روح عصر پہ گرفت کی صلاحیت۔ تجربے اور مشاہدے کی خوبصورت آمیزش کو افسانے کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ تجربے جتنے عمیق ہوں گے۔ گرفت جتنی مضبوط ہوگی تخلیق اتنی ہی اعلیٰ سطحوں کو مس کرے گی۔

زندگی اور رفتار زمانہ اپنے اندر ایسے غیر معمولی اور پیچیدہ موضوعات پوشیدہ رکھتی ہے کہ ہم آپ اکثر کبھی محسوس کرکے کبھی بغیر محسوس کئے آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن تخلیق کار کی نظر اس کے اندر تخلیق کی ایک ایسی رمق تلاش کر لیتی ہے جس سے ہم آپ محروم ہیں پھر وہی صلاحیت تخلیقی عمل میں مدد کرتی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار موپاساں نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

"EVERY THING WHICH ONE DESERVES TO EXPRESS MUST BE LOOKED AT WITH SUFFICIENT ATTENTION AND DURING A SUFFICIENTLY LONG TIME, TO DISCOVER IN

SOME ASPECT WHICH NO ONE HAS YET SEEN OR DESCRIBED. IN EVERY THING THERE IS STILL SOME PLOT UNEXPLORED, BECAUSE WE ARE ACCUSTOMED ONLY TO USE OUR EYES WITH THE RECOLLECTION OF WHAT OTHERS BEFORE AS HAVE THOUGHT ON THE SUBJECT WHICH WE CONTEMPLATE. THE SMALLEST OBJECT CONTAINS SOME THING UNKNOWN FIND IT."

زندگی کوئی جامد شے نہیں۔ یہ اس کی خرابی کم خوبی زیادہ ہے ظاہر ہے ہم سب اس کے اسیر ہیں اور ہم سے متعلق تمام اشیاء اس کی اسیر ہیں اس لئے جب یہ بدلی تو ساری چیزیں بدل گئیں۔ انسان بدلا۔ انسانی ذہن بدلا۔ سوچ و فکر بدلی تو ادب بدلا اور پھر افسانے کی تعریفیں بدل گئیں۔ اس لئے یہ تو سچ ہے کہ آج افسانے کو پہچاننے کے لئے وقار عظیم کی کہی ہوئی باتوں پر ایمان نہ لایا جائے تو یہ کوئی ایسے جھگڑے کی بات نہیں ہے لیکن جب ہم پرانی تعریفوں کی روشنی میں نئے افسانے کو پرکھ نہیں سکتے تو پھر نئے افسانے کے لئے پرانی تعریفوں کا مذاق کس حد تک جائز ہے؟ یہ بات پرانے اور نئے دونوں کو سوچنی ہے۔ نئے افسانے کی شناخت کرنی ہوگی تو یہ طے کہ سارے معاملات نئے ہوں گے لیکن اس کی تاثراتی روح بہت زیادہ نہیں بدل سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بدل ہی نہیں سکتی تو شاید غلط نہ ہوگا۔ بالکل اسی طرح کہ انسان بدل گیا ہے اور بدلتا چلا جا رہا ہے لیکن اس کی روح وہی ہے جس کا سلسلہ آدم اور حوّا سے شروع ہوا تھا۔ ادب کی ضرورتیں بدل جائیں اس کے معیار بدل جائیں لیکن روحانی حظ نہیں بدل سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم زندگی کی اس روح سے جڑے رہیں جس سے ہم اور آپ واقعی جڑے ہوئے ہیں۔ خواہ مخواہ کی تکرار اور فرار سے کچھ حاصل نہیں یہیں پر چوک ہوتی ہے اور بھٹکنے کا مقام آتا ہے۔ اس چوک اور بھٹکاؤ میں اور بہت سارے عوامل کام کرتے ہیں جن کا تفصیلی ذکر یہاں ممکن نہیں لیکن ان کی عدم صلاحیتیں انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل نے ایک جگہ بہت اچھی بات لکھی ہے ؎

" زندگی کا تجسس اور تحیر۔ اس کی مختلف الالوانی۔ اپنے سماج اور مسئلوں کو چھوڑ کر کہانی کہانی نہیں رہ جاتی۔ راستے چاہے وہ جیسے اپنے پیچ کے اختیار کرے۔ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے الفاظ کی جیسی دنیا چاہے اختیار کرے یا اشاروں کنایوں میں باتیں کرے مگر کہانی میں سے کہانی اسی وقت نکلتی ہے جب وہ قاری کی اپنی کہانی

بن جائے۔ اس کی ماضی کی بھی اور اس کے حال کی بھی۔"

(نیا افسانوی سفر)

آئیے اب دو ایک تخلیق کاروں کی مثالوں پر غور کریں۔ اقبال متین نے لکھا ہے ؎

"بے چہرگی کے اس قیامت خیز دور میں یارانِ نکتہ رس نے فیشن کا برقع اوڑھ کر انسانیت کے چہرے ہی کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔ ایسے میں ادب کی اصناف کا کیا ذکر۔ کسی بھی زاویئے سے جہاں جہاں استحصال نے زندگی کا چہرہ مسخ کیا ہے۔ اسی چہرے کو اصلی مان کر بنسی بجانا اور مجہول ادب پیدا کرنا کسی سچے فنکار کا وصف نہیں ہے۔ سچا فنکار وہی ہے جو زندگی کے مختلف حقائق پر نہ صرف نظر رکھے بلکہ معاشرتی یا معاشی۔ سماجی ہر قسم کے استحصال کے خلاف صف آرا ہو جائے۔ اگر ادب کا سرے سے کوئی فرض نہیں تو آپ اچھے ادب اور برے ادب کے درمیان کوئی خط فاصل کھینچ ہی نہیں سکتے۔ استحصال کنندہ طاقتوں کی دست بریدگی کا فرض صرف ادب ہی ادا کر سکتا ہے۔ زندگی کے اصلی نقوش اجاگر کرنے میں اور اس کا چہرہ سنوارنے میں قلم اور برش سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔"

(افسانہ اور اس کی شناخت)

دو نئے افسانہ نگاروں کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ انور خاں لکھتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ پرانے کہانی کار جو تھے انھوں نے انسانی مسائل اور ان کے دکھ سکھ کو زیادہ بہتر ڈھنگ سے پیش کیا تھا لیکن کچھ سمتیں نئے افسانہ نگاروں نے دی ہیں۔۔۔ ہمارے جذبات، ہمارے احساسات نئے نہیں ہوتے ہر آرٹسٹ اسے FRESHLY محسوس کرتا ہے اور نئے انداز میں برتنے کی کوشش کرتا ہے۔"

سلام بن رزاق کہانی کی شناخت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کہانی کسی بھی شکل میں لکھی جائے لیکن اس میں کہانی پن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کہانی پن سے میری مراد یہ ہے کہ آپ جس مسئلے کو یا جس موضوع کو پیش کرنا چاہتے ہیں وہ مسئلہ یا وہ موضوع جو ہے اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکیں۔ اور پوری دیانت داری کے ساتھ فنکارانہ طور پر اس مسئلے کو پیش کر سکیں۔ نہ یہ کہ ایک مخصوص ڈھرے پر کہانی لکھی جائے اور کہانی کار اس پر مصر ہو کہ کہانی یہی ہے جسے ہیئت

کے تجربے کرنے والے صرف ہیئتی کہانیوں کو کہیں کہ یہی ہمارا خاص اسلوب ہے اسی
میں کہانی لکھنی چاہئے۔"

(تین افسانہ نگاروں سے ایک ملاقات شاعر مئی ۱۹۷۹ء)

ان مثالوں کے بعد مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ یہ نئی نسل کے افسانہ نگاروں کی باتیں ہیں اس کے بعد ایک نسل اور آئی سید محمد اشرف۔ طارق چھتاری۔ غیاث الرحمٰن اور ابن کنول کی نسل ان کے افسانے اس بات کا واضح ثبوت پیش کرتے ہیں کہ افسانے کے مطالعہ کے بعد اس کی شناخت کا اب کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ ایک نئی لہر۔ نئی تازگی اور نئی بصیرت نے انھیں پھر سے ایسے افسانے لکھنے پر مجبور کر دیا ہے جو اپنے آپ میں مسائل کو سمیٹے ہوئے ہیں لیکن ان کو پڑھنے کے بعد کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوتا۔

درمیان میں کچھ دنوں کے لئے ایسی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ زندگی کے سارے معاملات چکرا سے گئے تھے۔ اس قسم کی صورت کا پیدا ہونا حیرت کی بات نہ تھی۔ جب حالات بدلتے ہیں فکر بدلتی ہے تو اپنے آپ دل چاہنے لگتا ہے کہ سب کچھ بدل جائے اور پھر دوسرے مقامات بظاہر کچھ تبدیلیاں اچھی نظر آرہی تھیں تو تیزی سے اپنے آپ کو بدل دینے میں کتنی دیر لگتی ہے تبدیلی ہوئی ——— نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لئے ہمارا جسم ہماری روح سے الگ ہوگیا اور ہم ٹوٹنے لگے۔ بکھرنے لگے ——— لیکن شکر ہے کہ اس تخریب کے پردہ میں تعمیر کے پہلو پوشیدہ تھے جس کی طرف اب ہمارے قدم بڑھ چلے ہیں۔ ماضی کے تجربات کی روشنی ہمیں ہمیشہ آگے لے جاتی ہے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ ایک صحت مند علامت ہے۔ ☐

۳۱۔ میکڈانل ہوسٹل
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید محمد اشرف

منظر
(عرفان صدیقی کے نام)

ہم لوگ ظہر کے بعد گھر سے نکل پڑے تھے اور اب پل پر پہنچ چکے ہیں۔

بالکل اسی جگہ اسی پل پر کھڑے ہو کر میں نے اس دن سوچا تھا کہ خاموش اونٹوں کی قطار کے ساتھ رمضان کا قافلہ تھوڑی ہی دیر میں رخصت ہونے والا ہے۔ تین میل دور قصبے کی پرانی مسجدوں سے مغرب کی اذان کی آواز، راستے کی دھند میں لپٹے ہوئے گھنے درختوں میں کھوتی ہوئی ہم تک آئے گی اور ہم آخری روزہ افطار کریں گے پھر لڑکپن سے لے کر اب تک بیتے ہوئے ہر برس کی طرح اس پل سے اتر کر بے داڑھی کے غلام ماموں کو امام بنا کر رمضان کی آخری مغرب ادا کریں گے اور ٹیلے پر چڑھ کر نہر کے اُس پار کھڑے شیشم کے درختوں کے اوپر عید کا چاند دیکھیں گے اور چاند دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اپنی اپنی بندوق سے ایک ایک فائر کر کے عید کا استقبال کریں گے پھر ذبح کئے ہوئے پرندوں کے تھیلوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے، ٹھنڈی بندوقیں تھامے ہم لوگ واپس ہوں گے۔
واپسی پر ریتیلے دگڑے پر چلتے چلتے حامد اپنے کمزور ہاتھوں سے غلام ماموں کو بندوق تھما کر مجھ سے لپٹ کر خوشامد لہجے میں کہے گا ــــ

"کل آپ نے عیدی میں پورا ایک روپیہ نہیں دیا تو آپ میرے سب سے اچھے بھائی جان نہیں ہوں گے ـــــ"

میں اس کی پتلی مریل گردن کو آہستہ سے پنجے میں دبا کر مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے کہوں گا ـــ

"تم اتنے تو کمزور ہو۔ اتنی سردی میں شکار کھیلنے کیوں آئے ہو؟"

"آپ بھی تو آتے ہیں ـــــ" وہ ضدی لہجے میں جواب دے گا۔

"ہم..... ہم تو بڑے ہیں بھئی۔ پھر ہم تو عید بقر عید سے ایک دن پہلے شکار ضرور کھیلتے ہیں مگر آپ کو یہ شوق ابھی سے کیوں سوار ہوا ہے۔ پہلے ذرا بڑے تو ہو جاؤ۔ کیوں؟ ـــــ"

"نہیں بھائی جان! بس مجھے اچھا لگتا ہے..... دھائیں سے بندوق بولتی ہے۔ ہریل پھڑپھڑاتا ہوا نیچے گرتا ہے۔ ایں بھائی جان! اس کا وزن سچ مچ کم ہو جاتا ہے اگر زمین پر گرنے سے پہلے نہ پکڑو تو؟"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر میری آنکھوں میں حیرت سے جھانکتے ہوئے پوچھے گا ——
لیکن ..... اس دن یہ سب کہاں ہوا تھا۔ میں جیسے ایک دم جاگ پڑا ——
میں نے سوچا ——

اس دن بس سورج غروب ہی ہونے والا تھا اور پل کی کمر بھر اونچی فصیل پر سب نے تھیلوں سے افطاری نکال کر رکھ لی تھی ——

اور نماز کے بعد سب سے پہلے حامد نے دعا ختم کی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا، ریت اڑاتا جھاڑیوں سے الجھتا ہوا ٹیلے پر چڑھ گیا تھا۔ ہم لوگ بھی تیز تیز سانسوں کے ساتھ ٹیلے پر چڑھ گئے تھے۔ موسم صاف تھا۔ غلام ماموں سب سے آخر میں چڑھ پائے۔ تیس روزوں کے بعد عید تو یقینی تھی لیکن چاند دیکھنے کے شوق میں غلام ماموں نے اپنے بھاری بدن کی پرواہ بھی نہیں کی تھی۔ پھولتی ہوئی سانسوں کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ڈال کر انھوں نے پوچھا تھا

"پچھلے سال کدھر دیکھا تھا؟"

"ادھر" —— عزیز بھائی کی آواز سن کر ہم سب کی نگاہیں ان کی انگلی کی سیدھ میں نہر کے اُس پار کھڑے شیشم کے درختوں کے اوپر آسمان پر دوڑائیں۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا!!!!!

نہر کے اس پار، شیشموں کے اوپر آسمان میں کچھ بھی نہیں تھا!! کچھ پرندے واپسی کی پرواز کرتے ہوئے ہمارے سامنے سے ہو کر نکلے۔ وہ پرندوں کی آخری قطار تھی کیوں کہ آسمان اب مٹیالا ہونے لگا تھا اور نہر کے پانی کی آوازیں گہری بے چین سرسراہٹیں بولنے لگی تھیں۔

"موسم تو بالکل صاف ہے۔ چاند کیوں نہیں دکھائی دیتا؟" غلام ماموں نے بہت عجیب سی آواز میں کہا۔

"چاند.... کدھر ہے بھائی جان؟" حامد میری کمر پکڑ کر مجھ سے قریب ہو گیا۔

"عید تو کل ہونا ہی ہے۔ آج کا چاند تو تیسا تھا ——" جمال نے ہولے سے کہا تھا۔

"تھا" سن کر میں نے اپنی ٹانگوں میں کپکپاہٹ محسوس کی جیسے آج کا چاند ماضی کے گہرے پانیوں میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا ہو ——

چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑے ہم پانچوں انسانوں کو مجید بھیا کی آواز نے سہارا دیا ——
"ادھر بھی تو دیکھو —— چاند ہر سال جگہ بدل دیتا ہے ——"
مجید بھیا اوپر نہیں آئے تھے ——

ٹیلے پر کھڑے کھڑے ہم نے حد نظر تک پھیلے ہوئے منظر کو دیکھا۔ دور کھیتوں میں دھواں سا اٹھ رہا تھا اور ان کے پیچھے اندھیرے میں سماتے ہوئے آم کے باغات تاریک ہوتے جا رہے تھے۔ درختوں کے سائے میں آہستہ آہستہ نہر بہہ رہی تھی افق دھندلا ہو چکا تھا اور شیشموں کے اوپر آسمان میں کچھ بھی نہیں تھا۔

اور کسی بھی طرف آسمان میں کچھ نہیں تھا۔

"کیا نہیں دکھائی دیا؟" —— مجید بھیا نے پوچھا تھا۔

اوپر کھڑے پانچوں انسانوں نے خوف کی لہروں کو اپنے بدن پر مکڑی کے جالوں کی طرح لپٹتا ہوا محسوس کیا۔ ہم سب کے دل بہت زور زور سے دھڑک رہے تھے جیسے کچھ ہونے والا ہے اور اسی لمحے سب نے سوچا کہ جس نے بھی مجید بھیا کی بات کا جواب دیا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ ہم سب خاموش تھے کہ غلام ماموں نے بڑی ہمت کر کے کہا ——

"ایسا تو کبھی نہیں ہوتا تھا۔ کیا..... ہمارے یہاں بھی کچھ ہونے والا ہے؟"

حامد نے میری کمر مضبوطی سے پکڑ لی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"ایسی باتیں مت کیجئے غلام ماموں.... ہمارے ساتھ بچہ ہے ڈر جائے گا۔ ہم لوگ گھر سے دور ہیں۔ گھر واپس چلئے ——"

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

اسی وقت ہوا ایک دم سے چل پڑی اور ہم لوگ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔

اسی وقت جمال بولے تھے۔

"میاں نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ رمضانوں میں شکار مت جایا کرو ——"

پھر جیسے انھیں خیال آیا کہ اس جملے سے سب پر ان کا خوف ظاہر ہو گیا ہے ——

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انطار کرنے کے بعد پیاس کی شدت سے کوئی ایک دم نہر کی طرف بھاگے اور لڑکھڑا کر نہر میں گر پڑے اور ڈوب جائے۔ معلوم ہے کتنی گہری ہے نہر ——؟"

مجید بھیا نیچے سے اوپر آتے ہوئے مسلسل ہمیں تک رہے تھے جیسے ہماری تلاش کرتی ہوئی آنکھوں میں انھوں نے ساری تحریر پڑھ لی ہو۔

میں نے حامد کو مضبوطی سے پکڑ کر اس کی پیٹھ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھپتھپائی تھی اور مجید بھیا نے سیدھے کھڑے ہو کر شیشموں کے اوپر دیکھا تھا۔ دیکھتے رہے تھے۔ پھر انھوں نے ہم سب کو دیکھا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کو دیر تک دیکھتے رہے تھے۔

اور اسی وقت نہر کے پانی میں کوئی مچھلی تڑپ کر اچھلی تھی۔ حامد اور زیادہ سہم گیا تھا اور پھر..... اچانک چلایا تھا ——

"وہ کیا..... ارے..... ارے..."

"کیا بات ہے حامد میاں..... کیا ہے..... بولو بیٹے —— " غلام ماموں گھبرا کر بولے تھے ——

"کیا چاند دکھائی دیا؟"

"نہیں..... نہیں..... اوپر نہیں۔ نہر کے اُدھر شیشموں کے نیچے دیکھئے دو پیڑوں کے بیچ میں ایک گھر سا بنا ہوا ہے —— " حامد بھرائی ہوئی آواز میں چلایا تھا ——

ہم نے ادھر دیکھا..... اور جب..... ہم نے حامد کی بتائی ہوئی جگہ پر غور سے دیکھا تھا..... تو..... وہ منظر..... اُف.....

اس وقت ہوائیں تیز ہوئیں اور ہمارے ڈھانچوں سے ٹکرائیں۔ ہمارے ڈھانچے ساکت کھڑے رہے اور ہڈیاں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر بجنے لگیں۔ آنکھوں کے حلقے اتنے پھیل گئے کہ آنکھیں بند ہونا بھول گئیں۔ سانسیں خاموش ہوگئیں۔ پورے ماحول پر اندھیرے میں لپٹا ہوا وہ خوف مسلط ہوگیا تھا جو زندگی کے کئی برس ایک ساتھ کھا گیا۔

پھر بے ہوش حامد کو کاندھے پر لادے ہوئے جب ہم قصبے میں داخل ہوئے تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ سڑک کی لالٹین کی دھندلی روشنی میں دو دو چار چار کی ٹکڑیوں کھڑے ہوئے لوگ بڑے فکر مند لگ رہے تھے وہ سب ہمیں بہت اجنبی لگ رہے تھے۔ پورا قصبہ ایک بے سکون اداسی میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہا تھا۔

ایک لالٹین کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم نے سنا تھا ——

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ تیسا بھی نظر نہ آیا ہو —— "

"کل عید تو ہوگی کہ نہیں؟"

"وہ تو ہوگی ہی —— لیکن ذرا سوچو..... کیسی عجیب بات ہے کہ....."

چھوٹی بازار کے نکڑ پر کھڑے شریف چچا لوگوں کو آہستہ آہستہ ایک ایسی آواز میں بتا رہے تھے جو ان کی اپنی آواز نہیں تھی ——

"ایک بار تو انھوں نے چاند کے دو ٹکڑے کئے۔ پھر ایک دن جب مولا علی کی نماز قضا ہوگئی تو سورج....."

"پر چچا! مجھے تو لگے کہ آج پہ جو خون بہا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے —— "

"ابھی ہم سب آپس میں ہی کٹے پڑ رہے ہیں —— "

سب کی آوازیں جاڑے کی ہواؤں کے ساتھ بکھر رہی تھیں۔ لوٹ رہی تھیں ——

ہم اندھیری سڑکوں پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ تکان سے ہم سب لوگ بوجھل ہو چکے تھے۔ بے ڈھنگے پن سے بند وقیں اٹھائے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے ہم لوگ صرف یہ سوچ رہے تھے کہ جس وقت ہم گھر کے اندر داخل ہوں گے تو کیا گھر والے ہمیں اجنبی تو نہیں سمجھیں گے۔

موٹر پر کسی نے بہت سرگوشیوں والے انداز میں اپنے پاس کھڑے شخص سے کہا تھا ــــــ

"دیکھو میں نے اسی دن کتاب میں دکھایا تھا کہ جب چودھویں صدی......"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا........"

"آج تو بدلی بھی نہیں تھی........"

پھر ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں یوں داخل ہوئے جیسے نئی بستیوں میں آرہے ہوں جہاں کی زبان ہمارے لئے اجنبی ہو۔ جب بہت دیر کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے حواس میں آئے تو جو کچھ گزرا تھا سب کو بتایا لیکن وہ منظر بتاتے وقت مجھے پھر ایسا لگا جیسے میرے بدن کا گوشت گلنے ہی والا ہے اور ہڈیاں ٹکرا ٹکرا کر بجنے ہی والی ہیں۔ سب نے مجھے خاموش کر دیا تھا۔

دوسرے دن عید کی نماز پڑھتے وقت یوں محسوس ہوا جیسے کسی کی نماز جنازہ ادا کر رہے ہوں۔ پھیکی پھیکی مسکراہٹوں کے ساتھ لوگوں سے گلے مل کر ہم سب نے شریف چچا کو پورا واقعہ سنایا تھا۔ سب کچھ سن کر وہ چپ ہو گئے تھے۔ وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے تھے اور جب ان کی خاموشی بھی ڈرانی لگنے لگی تو غلام ماموں نے کہا تھا ــــــ

"شریف چچا! تم تو پرانے شکاری ہو۔ برسوں نہر پر شکار کھیل چکے ہو۔ تم تو مچھلی کا شکار بھی کھیلتے تھے۔ تم بتاؤ..... کیا شیشم والی پانتی میں کوئی ہے؟....."

شریف چچا نے خاموشی سے یہ سوال سن کر ہولے سے کہا تھا ــــــ

"صرف ایک دفعہ..... مجھے وہاں کچھ نظر آیا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب نورالدین کو لڑائی کی وجہ سے فوج کی نوکری چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ اس نے آنے کے دوسرے ہی دن مجھ سے کہا تھا کہ ابا! اب ہم لوگ یہیں کوئی کام کریں گے۔ اگر نہر کے درختوں کا ٹھیکہ لے لو تو آرا مشین لگا کر کام شروع کر دیا جائے۔ تو میں اور نورالدین دونوں نہر کے درخت دیکھنے گئے تھے۔ ہم لوگ جب شیشمیں دیکھ کر واپس آرہے تھے تو پل پر آکر نورالدین نے کہا تھا کہ اس پل سے لے کر دوسرے پل تک ساری شیشموں کا ٹھیکہ کتنے میں ملے گا کچھ اندازہ ہے ابا؟ تو میں نے اندازہ کرنے کے لئے جب مڑ کر شیشموں کی پانتی کی طرف دیکھا تو...... تو اس دن جو کچھ مجھے نظر آیا وہ بتاتے ہوئے مجھے آج بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔ میں نے آج تک نورالدین کو بھی نہیں بتایا لیکن مجھے نورالدین نے بتا دیا تھا۔ اور تمھیں یقین نہیں آئے گا

جو نورالدین نے دیکھا وہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کچھ اور دیکھا تھا——"

"یہی بات ہے چچا—— ہم لوگوں نے بھی الگ الگ چیزیں دیکھی تھیں..... بس حامد نہیں بتاتا کہ اس نے کیا دیکھا——"

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"وہ کہتا ہے اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس پر میں نے کہا کہ تمہیں نے تو سب سے پہلے اشارہ کیا تھا کہ ادھر نہر کے پار شیشم کے دو درختوں کے بیچ کچھ گھر جیسا بنا ہوا ہے۔ وہاں بھلا گھر کہاں سے آجائے گا تو اس پر وہ کہتا ہے کہ ہاں بس ایک گھر نظر آیا تھا۔ وہ اور کچھ نہیں بتاتا۔ ڈر گیا ہے۔ بالکل چپ ہو جاتا ہے۔ زیادہ پوچھو تو رونے لگتا ہے۔ لیکن..... شریف چچا.....؟"

شریف چچا نے پلکیں اوپر اٹھائیں۔ ان کا چہرہ زرد ہو گیا تھا——

"تم نے کیا دیکھا تھا چچا.....؟" میرے بجائے جمال بولے تھے——

"میں سمجھ رہا تھا تم یہی پوچھو گے۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ اگر تمہیں بتا دوں تو تم یقین کر لوگے...؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہے تھے۔

"تب مجھے میاں نے منع کر دیا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتاؤں لیکن اب بہت دن بیت چکے ہیں اور تمہیں بھی نہر پر کچھ نظر آیا ہے اس لئے آج بتا رہا ہوں.... لیکن کیسا عجیب لگتا ہے یہ سوچ کر کہ ہم نے الگ الگ منظر دیکھا تھا۔ سنو نورالدین نے دیکھا تھا کہ نہر کی پٹری پر یہاں سے وہاں تک تیل کے کنویں کھدے پڑے ہیں اور ان کنووں میں ایک ساتھ آگ لگ گئی ہے اور آگ کی لپٹیں اتنی اونچی ہیں جیسے آسمان سے زمین پر برس رہی ہوں اور ان آگ کے لپٹوں کے ساتھ جا بجا جلتے ہوئے لمبے لمبے عمامے فضا میں لہرا رہے ہیں اور یا حبیبی... یا حبیبی کی بے چین صدائیں چاروں طرف گونج رہی ہیں۔ چند لمحوں تک یہ منظر اس نے دیکھا اور جب میں نے نورالدین کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں مردے کی آنکھیں لگ رہی تھیں——"

شریف چچا سانس لینے کو رکے تھے اور پھر ہم سب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے تھے——

"تمہیں معلوم ہے میں نے کیا دیکھا تھا۔ میاں کے علاوہ آج پہلی بار سب کو بتا رہا ہوں۔ اس دن تمہاری چچی کو گذرے قریب ایک مہینہ بیت چکا تھا۔ مرنے سے پہلے مرحومہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ لاہور میں ان کے بھائی کو خط لکھ دوں کہ اب کی مرتبہ جب بزنس کے سلسلے میں ڈھاکہ جانا ہو تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ ململ کا ایک تھان ہندوستان بھیج دیں۔ بہت دن سے مہین کرتے نہیں پہنے ہیں جب میں نے تمہاری چچی کو بتایا کہ کچھ دن ہوئے ڈھاکہ پاکستان سے الگ ہو گیا ہے اور اب پاکستان والے وہاں نہیں جاتے تو یہ سن کر ہذیانی

انداز میں زور زور سے چلانے لگی تھیں۔ جب میں نے انھیں پوری صورت حال سمجھائی تو وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنسی تھیں اور پھر چپ ہو گئی تھیں۔ دوسرے دن سے ان کی کھانسی کے دورے تیز ہو گئے تھے۔ شام کو میرے پاس آکر میرے سینے پر سر رکھ کر چپکے چپکے بولی تھیں کہ یہ سوچ سوچ کر ہمیشہ خود کو خوش کر لیتی تھی کہ لاہور والے بھائی جان ڈھاکہ والے رشتہ داروں کے پاس جاکر ململ کے تھان سے کر کسی آتے جاتے کے ہاتھ ہمیں ہندوستان بھیج دیں گے تو ہم سفید اجلے کرتے پہن کر پڑوس کے پنڈت کی بیوی سے کہیں گے کہ بی پڑوسن ہمیں اچھے کپڑوں کی کیا کمی۔ ڈھاکہ اور لاہور کے عزیز سلامت جو ہمیں ململ خرید کر بھیج دیتے ہیں۔ لیکن.... جب کل تم نے بتایا کہ اب لاہور اور ڈھاکے میں رشتہ نہیں رہا ہے تو میں نے سوچا کہ ہمیں بازار سے کپڑے خرید لیں گے۔ تمھاری چچی نے پلنگ سے اٹھ کر مجھے جو کپڑے دکھائے وہ کھادی کے کرتے تھے۔ سفید، ہرے، نیلے اور گیروے رنگ کی کھادی —— اور یہ کرتے دکھا کر وہ پھر ہنسنے لگی تھیں۔ کچھ دن بعد وہ ایک رات گیروے رنگ کا کرتا پہن کر سوئیں۔ میں انھیں دوا پلا کر اپنے بستر پر آکر سو گیا۔ صبح فجر کے وقت میں نے انھیں جاکر جگایا تو وہ نہیں جاگیں ان کی آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں اور ململ کی طرح سفید تھیں۔ اور اب تم سنو کہ اس دن میں نے نہر پر کیا دیکھا تھا —— اس شام سورج غروب ہو رہا تھا کہ نورالدین کے کہنے پر میں نے نہر کی پٹری پر شیشموں کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ نہر کی پٹری پر تمھاری چچی کھڑی ہیں۔ وہ بالکل جوان ہیں جیسی اپنے گھر سے آئی تھیں۔ تمھاری چچی اوپر سے نیچے تک ململ کا تھان لپیٹے ہوئے ہیں اور مسکراتی ہوئی دونوں ہاتھوں سے اپنا لباس تھامے میری طرف چلی آرہی ہیں کہ اچانک نہر سے لمبے لمبے ناخنوں والے بڑے بڑے بہت سے ہاتھ باہر نکلے اور تمھاری چچی کے بدن سے کپڑے چھیننے لگے۔ وہ وحشت زدہ کھڑی دیکھتی رہیں۔ ان ہاتھوں نے ململ کا تھان اتار کر نہر کے دوسرے کنارے پر ڈال دیا اور تمھاری چچی بالکل بے لباس ہو گئیں۔ بے لباس کھڑے کھڑے انھوں نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور پھر زمین سے ایک کپڑا اٹھا کر اپنے بدن پر پہن لیا۔ وہ گیروے رنگ کا کرتا تھا۔ تمھاری چچی لمبا کرتا پہن کر ایک دم زور سے کھل کھلا کر ہنسیں اور پھر اس قدر مطمئن ہو گئیں کہ میں اس خوف اور تحیّر کے عالم میں بھی چونک پڑا۔ بس اسی وقت میں نے نورالدین کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ مردے جیسی نظر آرہی تھیں —"

شریف چچا جب خاموش ہوئے تو ہم اپنے دل کی دھڑکنیں واضح انداز میں سن رہے تھے۔

اسی وقت غلام ماموں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا تھا۔ سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا تھا، تھوڑی ٹھٹھکا تھا اور خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔

جمال نے دروازہ بند کیا تھا اور واپس آکر پوچھا تھا ——

"یہ کیا کھڑے ہے شریف چچا —— ؟"

"معلوم نہیں بیٹے۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ میاں سے پوچھا تو وہ خاموش ہو گئے تھے ـــــــــ"

"لیکن چچا ہم تو بچپن سے نہر پر شکار کھیل رہے ہیں۔ یہ خوف تو ہم سے ہمارا شوق بھی چھین لے گا کیا نہر پر کوئی بری روح آگئی ہے۔؟"

"کیا خبر۔۔۔۔ لیکن اب تم سب جاکر میاں سے کہو۔ وہی کچھ کریں گے ـــــــ"

شام کو ہم سب میاں کے حجرے میں حاضر ہوئے تھے۔ اگربتی کی خوشبو نے ماحول کو بوجھل بنا دیا تھا۔ میاں نے پوروں پر وظیفہ ختم کیا اور سفید پاکیزہ داڑھی سینے سے لگالی اور تھوڑی دیر کے بعد جب اپنی نرم آنکھیں کھولیں تھیں تو ہم سب نے اپنے آپ کو بہت محفوظ محسوس کیا تھا ـــــــ

تب میاں نے ٹھہری ہوئی آواز میں دھیمے سے کہا تھا ـــــــ

"صحابہ کے حلقے میں بیٹھے ہوئے سرورِ کائنات نے فرمایا تھا اے لوگو! جو مجھے معلوم ہے اگر تمھیں اس کی خبر ہو جائے تو کبھی ہنسنے کی ہمت بھی نہ کرو ـــــــ"

میاں نے یہ کہہ کر اپنے آنسو خشک کر کے پوچھا تھا ـــــــ

"تم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضورؐ کو کیا کیا معلوم تھا۔؟"

ہم سب خاموش رہے۔ وہ سوال کر کے جواب خود ہی دیتے تھے۔ ہم سب ان کے جواب کے منتظر تھے لیکن جب وہ خاموش رہے تو ہم سب بے چین ہوئے۔

"میاں! ۔۔۔۔ حضورؐ کو کیا کیا معلوم تھا؟ ـــــ" نجید بھیا نے ہمت کی تھی

میاں پھر بھی نہیں بولے تھے۔

اگر کا دھواں ہمارے سروں پر گاڑھا ہو رہا تھا اور خاموشی اس سے بھی زیادہ گاڑھی ہو چکی تھی۔

میاں آہستہ آہستہ رو رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے آنکھیں اٹھا کر مجید بھیا کو مخاطب کیا تھا ـــــ

"کیا نظام علی کا پوت ہے؟" ـــــ

"جی ہاں ۔۔۔۔ میں ہوں مجید ۔۔۔۔" مجید بھیا نے جواب دیا تھا۔

پھر میاں نے کہا تھا ـــــ

"مجھے بھی نہیں معلوم ہے کہ انھیں کیا کیا معلوم تھا لیکن ربِ علیم کی قسم انھیں ہر چیز معلوم تھی۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر سب کو ہر چیز معلوم ہو جائے تو کبھی کوئی ہنسنے کی ہمت بھی نہ کرے۔ اس خرابے کی ساری

خرابیاں ان پر روشن تھیں ۔ اس خرابے کے چاروں طرف جو کائنات ہے اس میں ہر جگہ دکھوں کے انبار لگے ہوئے ہیں ۔ ہم میں سے جو صاحب توفیق ہیں وہ دکھوں کے اس ڈھیر پہ بیٹھے دکھی نگاہوں سے دکھ کا اتنا بڑا تماشہ دیکھ رہے ہیں لیکن ہم دکھوں کی ماہیت سے انجان ہیں صرف صورت آشنا ہیں ۔ وہ ان سب کی ماہیت سے بھی واقف تھے تبھی تو کہا تھا کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ اگر سب لوگ جان لیں تو پھر کبھی کوئی نہ ہنسے ۔"

میاں کچھ دیر خاموش رہے تھے اور پھر بہت بھاری آواز میں کہا تھا ـــــ

"تم سب لوگ جان لو کہ اب تمھاری دنیا میں دکھ بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں ورنہ نہر پر تمھیں وہ منظر نظر نہ آتے ۔ عید کا چاند محنت اور بندگی کا انعام ہوتا ہے ۔ تمھاری محنت اور بندگی نامقبول ہوئی ورنہ چاند کیوں نہ دکھائی دیتا ۔ ہم سب کے روزے گزرے ہوئے کل کی شام کو زمین و آسمان کے درمیان معلق رہے ہوں گے اور دعا کرتے ہوں گے کہ اے خدا اشرف المخلوقات کو اس کا انعام دے ۔ انھیں چاند کا دیدار دے تو وہ صدقہ دیں اور ہم تیری بارگاہ میں مقبول ہوں ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا نے ہم میں سے کسی کو چاند کا دیدار نہیں دیا ۔ ہمارے روزے درمیان میں معلق ہیں ـــــ"

مجھے حجرے کے نیم تاریک ماحول میں بیٹھے بیٹھے نظر آیا جیسے صحرا میں اونٹوں کا طویل قافلہ چلا جا رہا ہو اور کسی بڑے دشمن کے نیزہ بردار سپاہیوں نے تیز اور لمبے نیزوں سے اونٹوں کی گردنوں کو چھید دیا ہو اور زخمی اونٹ بلبلا بلبلا کر چیخ چیخ کر تڑپ رہے ہوں ۔

اسی وقت میاں نے میری طرف نظر کر کے فرمایا تھا ۔

"شاہد! تمھیں کچھ کہنا ہے ؟"ـــــ

میری زبان کھلنے سے پہلے ہی غلام ماموں نے کہا تھا ـــــ

"میاں! مجھے سب کی طرف سے عرض کرنا ہے کہ ہم ہمیشہ سے نہر پر شکار کھیلتے ہیں اگر یہ خوف ہم پر مسلط رہا تو ہمارا شکار چھوٹ جائے گا ۔ اور ہم لوگوں کا شوق ہی کیا ہے ۔ کیا یہ بھی ۔ ۔ ۔ ۔ چھوڑ دیں ؟ بستی کے سارے لوگ آپ سے پوچھ چکے ہیں ۔ آپ انھیں یہ کیوں نہیں بتاتے کہ چاند کیوں نہیں نکلا ۔ آپ ہمیں یہ کیوں نہیں بتاتے کہ نہر پر ہمیں وہ منظر کیوں دکھائی دیئے ۔ میاں! اگر آپ بھی خاموش رہے تو پھر ہمیں اور کون بتلائے گا ؟ ہم لوگ کس کے پاس جائیں گے ؟ ۔"

غلام ماموں کے خاموش ہونے پر میاں نے تھوڑی دیر ان کی طرف دیکھا تھا اور پھر سب کو باری باری دیکھ کر آہستہ آہستہ بولے تھے ـــــ

"غلام! سارے دکھوں کا اکیلا وارث میں نہیں ہوں ۔ ساری امت کے حصے میں دکھ تقسیم کئے گئے

ہیں بلکہ سب بندوں کو حصہ ملا ہے۔ اپنے دکھوں کو خود اپنے آپ پہچانو ۔ جاؤ نہر پر جاؤ ۔ اسی جگہ بیٹھ کر اپنے اپنے منظر یاد کرو اور پھر سوچو کہ تمھیں وہ منظر کیوں دکھائی دیئے۔ میں اب کمزور ہو چلا ہوں ۔ مجھ پہ اتنا بار نہ ڈالو۔ کل ظہر کے بعد نہر پر جانا۔ اب تم لوگ جاؤ۔ رات زیادہ ہوگئی ہے ــــــ"

ہم سب نے میاں کے اجلے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے ــــــ

"اور سنو"ــ

ہم سب پلٹ پڑے تھے ــــــ

"کل اپنے ساتھ حامد کو بھی لے جانا۔ بس اب تم جاؤ خدا تم سب کو سکون دے ــــــ"

ہم لوگ جب حجرے سے نکلے تو آسمان صاف تھا اور ستارے بہت روشن تھے۔ ہم لوگوں کے لمبے لمبے سائے میاں کے حجرے سے دور ہو رہے تھے ۔ مڑ کر دیکھا تو سفید پوش میاں حجرے کے دروازے پر کھڑے ہمیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور اسی وقت اجنبی آسمان کے نیچے چلتے چلتے ہم سب نے شاید ایک ساتھ سوچا تھا کہ خدا جانے کل کیا ہوگا ــ ــ

دوسرے دن ظہر کے بعد ہم لوگ نہر کی طرف چل پڑے تھے۔ نہر کے پل پر کھڑے ہو کر میں نے سوچا کہ پرسوں اسی جگہ کھڑے ہو کر میں نے سوچا تھا کہ اونٹوں کے قافلے کے ساتھ رمضان اب رخصت ہونے ہی والے ہیں

عزیز بھائی نے پیچھے سے آکر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا ــــــ

"آج دن میں بھی ڈر لگ رہا ہے۔ کیا تمھیں بھی ڈر لگ رہا ہے ؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"یہ حامد کہیں زیادہ نہ ڈر جائے ۔" عزیز بھائی نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں ہم لوگ اسے بہلائے رکھیں گے ۔" جمال ہم لوگوں کے قریب آگئے تھے۔

اب میں نے نہر کے پل کے بالکل درمیان میں کھڑے ہو کر دور دور تک دیکھا۔ نہر کے چاروں طرف ایک سبز تصویر پھیلی ہوئی تھی جس میں کہیں کہیں ٹیالے دھبے نظر آرہے تھے کہ کچھ کھیت ابھی بونے سے رہ گئے تھے۔ گیہوں کے چھوٹے چھوٹے پودوں پر دھوپ نے چمک پیدا کر دی تھی۔ جہاں جہاں سایہ تھا وہاں کھیتوں کی سبزی گہری ہو گئی تھی اور کھیت بہت گنجان لگ رہے تھے ــــــ اور تھوڑی دیر بعد چھوٹے ٹیلے پر بیٹھے ہم چھ افراد نے محسوس کیا کہ آج ہم یہاں اپنے فیصلے کرنے آئے ہیں یہاں ہم لوگ یہ سوچنے آئے ہیں کہ ہماری زندگی میں وہ کون سی کمی آگئی ہے جس کی وجہ سے معمولات نے اپنی راستی چھوڑ دی ہے ۔

میاں نے کہا تھا کہ زمین پر پاؤں مارنے سے جو دھمک پیدا ہوتی ہے اس کے نہایت معمولی سے ارتعاش سے کبھی کائنات کا کوئی نہ کوئی عمل ضرور متاثر ہوتا ہے۔ ہر قدم اہم ہے۔

سردیوں کا سورج اوپر تھا اور نیچے ہم لوگ تھے تب غلام ماموں نے ٹیلے پر کھڑے ہو کر نہر کے پار اس جگہ کو غور سے دیکھا۔

شیشم کے دو بوڑھے درختوں کے درمیان کچھ بھی نہیں تھا جس سے خوف محسوس کیا جا سکے۔ سامنے نہر کے کنارے دور تک درختوں کا سلسلہ چلا گیا تھا اور ان میں سے کسی بلند شیشم کے اوپر سے بڑی فاختہ کی" یا حق تو" "یا دوست تو" کی مسلسل صدائیں اس کنارے پر بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں اور اب غلام ماموں نے سوچا کہ جو دن میں سوچو رات کو وہی خواب میں نظر آتا ہے پرسوں شام میں نے جو منظر دیکھا تھا وہ بھی کسی بھیانک سوچ کا نتیجہ رہا ہوگا شاید اسی لئے میاں نے ہم لوگوں کو نہر پر بھیجا ہے کہ ہم لوگ اپنا منظر یاد کریں اور اس منظر کی گانٹھ کا وہ سرا تلاش کریں جس سے ہماری پچھلی سوچیں جڑی ہوئی ہیں۔

"کیا میں بتاؤں جو میں نے دیکھا تھا —— " جمال نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں..... رکو —— پہلے خوب اطمینان سے سوچو کہ تم نے کیا دیکھا تھا پھر سوچو کہ تم نے وہ کیوں دیکھا۔ پھر بتانا ——"۔

"کیوں دیکھا"۔ جمال نے حیرت سے کہا۔ "کیا کوئی اپنے اختیار میں تھا یہ۔ آپ تو غلام ماموں بات کو اور بھی پیچیدہ بنا رہے ہیں —— "

تبھی غلام ماموں نے میاں کے لہجے میں ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا ——

"تم سب لوگ یہیں خاموش بیٹھے بیٹھے سوچو۔ میاں نے یہی کہا تھا۔ ان کی یہی ہدایت تھی کہ کوئی اپنا منظر نہ بتائے صرف حامد بتائے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا —— "

یہ کہہ کر غلام ماموں نے سر نیچے ڈال لیا۔

اور اب غلام ماموں نے سوچا کہ سامنے ان دونوں درختوں کے بیچ وہ کیسا دہشت ناک منظر تھا۔ اف..... کہیں سچ مچ ایسا ہو جائے تو کیا ہوگا۔ اماں نے کتنے دکھ سہہ کر مجھے پالا۔ کھجور کی گٹھلیوں کی چھالیا کھا کھا کر انھوں نے اپنے گردے میں پتھری پیدا کر لی لیکن میری پڑھائی کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ میں میٹرک کر کے ریلوے میں فائرمین سے ڈرائیور ہو گیا لیکن اماں کی زندگی کی گاڑی وہیں کی وہیں رہی۔ اماں ابا کتنے مزے سے غربت بھگت رہے ہیں اور میں ان سے سیکڑوں میل دور اپنے ساتھیوں میں "غلام ابا" کہہ کر پکارا جاتا ہوں، کالونی میں سب سے اچھا کھانا میرے یہاں پکتا ہے اور صرف میرے ہی گھر ٹیلی ویژن

ہے۔ اس دن شکارپور آتے وقت میں نے اماں سے کہا تھا اماں میں عید کے دوسرے ہی دن واپس چلا جاؤں گا۔ ٹیلی ویژن خراب پڑا ہے منو اور آپ کی بہو بور ہو رہے ہوں گے مجھے وہاں جا کر ٹیلی ویژن ٹھیک کرانا ہے۔

اماں یہ سن کر کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ بیٹا غلام تم اب اللہ رکھے پچاس برس کے ہو رہے ہو تم نے اس طویل عرصے میں ایک دن کبھی یہ نہیں پوچھا کہ اماں تم اور ابا میرے بغیر یہاں خود کو غیر محفوظ سمجھ کر تو زندگی نہیں گزارتے ہو اور یہ کہ اماں تمھارے پاندان میں اب بھی کھجور کی گٹھلیاں ہیں یا اب وہ بھی نہیں ہیں۔

اُف...... وہ منظر ــــ میں نے پرسوں اسی سامنے والے کنارے کی طرف حامد کے اشارہ کرنے پر دیکھا تو نظر آیا کہ شیشم کے دو درختوں کے درمیان ایک ریلوے اسٹیشن کا کمرہ ہے اور کمرے کے برابر ریل کی پٹری پر میں بہت تیزی سے انجن میں ریل گاڑی چلاتا چلا جا رہا ہوں۔ دونوں طرف مٹی اُڑ رہی ہے اور سامنے ریل کی پٹری پر اماں کھڑی ہے اور وہ چلا رہی ہے ــــ" غلام رک جاؤ، غلام رک جاؤ۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ تم ہم سے ملنے سال میں دو دفعہ بھی مت آیا کرو میں کبھی تم سے کچھ نہیں کہوں گی لیکن اپنی گاڑی سے مجھے کچلو تو مت ــــ" لیکن ...... میں نہیں رکا۔ میری گاڑی کا انجن میری ضعیف ماں کے بدن کے پرخچے اڑاتا ہوا تیزی سے نکل گیا اور ماں کے خون میں لتھڑے گوشت کی بو کو میں نے سونگھ کر محسوس کیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سرخ ڈھیر پٹریوں پر پڑا تھا جو آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا۔ تبھی میں نے اپنی ہڈیوں میں ٹھنڈی ہوا کی رگڑ محسوس کی اور اس منظر سے واپس آیا تو سب ساتھ والے خاموش اور خوف زدہ کھڑے تھے اور حامد بے ہوش ہو چکا تھا لیکن اس منظر میں میرا کیا قصور تھا؟ میں نے تو بریک پر ہاتھ رکھا تھا لیکن اس وقت مجھے یہ خیال آیا تھا کہ سامنے مجھے روکتی ہوئی یہ بوڑھی عورت وہی ہے جس نے اگر مجھے اپنی کوکھ سے پیدا نہ کیا ہوتا تو ساتویں کلاس میں میرے ساتھی کس لڑکے کی رفو کی ہوئی پتلون کا مذاق اڑاتے۔ میں اس خیال کے دھارے میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ جب ماں کے کٹے ہوئے بدن سے پھوٹتی ہوئی خون کی تیز مہک میری ناک میں آئی تب میں ہوش میں آیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ غلام ماموں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ہے اور چپ چاپ بیٹھے زمین تک رہے ہیں تبھی حامد نے میری طرف کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا جن کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا میں نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور غلام ماموں کو بہت قابل رحم محسوس کیا۔ خدا جانے انھوں نے کیا منظر دیکھا

تھا لیکن مجھے یقین ہے انھوں نے جو کچھ بھی دیکھا ہو گا اس میں ان کا قصور نہیں ہو گا کیوں کہ میں نے بھی جو کچھ دیکھا تھا اس میں میری کیا خطا تھی! میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں اس ڈوبتی ہوئی سرد شام کے اداس لمحوں میں سب کو بتا دوں کہ پرسوں سورج ڈوبنے کے بعد چاند نظر نہ آنے پر جب حامد نے نہر کے ادھر اشارہ کیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ نہر کی پٹری پر میری شبانہ بالکل برہنہ پڑی ہے اور کچھ عجیب الخلقت آدمی اس کے پاس کھڑے ہیں جن کے سر اور پنجے بھیڑیوں جیسے ہیں اور وہ باری باری شبانہ کے جسم کی عصمت دری کر رہے ہیں میں وہیں قریب میں کھڑا ہوں اور میرے سارے اعضا پتھر کے ہیں صرف آنکھیں ہیں جن سے میں دیکھتا ہوں کہ شبانہ ہر بھیڑیے کو مطمئن کرنے کے بعد میری طرف آنکھیں کھول کر ٹکر ٹکر دیکھتی ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں کہتی۔ مدد کے لئے بھی نہیں کہتی۔ اور پھر اگلا بھیڑیا آگے بڑھتا ہے اور تیز دانتوں اور پنجوں سے دل بھر کر شبانہ کو بھنبھوڑتا ہے اور دوسرے بھیڑیے کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے۔ اور پھر اگلا بھیڑیا آگے بڑھتا ہے اور پھر..... لیکن میں یہ منظر کیسے بتاؤں۔ یہاں اس نہر کی پٹری پر چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھا ہوا کوئی فرد تمھیں نہیں جانتا شبانہ! اور اب تو شاید میں تمھیں بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ تم مجھ سے پوچھو گی کہ چھ سال میں ہی تم مجھے بھول گئے؟ تم نے تو زندگی بھر یاد رکھنے کا وعدہ کیا تھا شاہد علی!

تو میں [illegible] جواب دوں گا شبانہ کہ چھ سال کی مدت یوں تو اتنی طویل نہیں ہوتی کہ تم سے بچھڑ کر تمھیں بھلایا جا سکے لیکن شاید تمھیں اس کا اندازہ نہ ہو کہ بے روزگاری کے دن برسوں سے زیادہ طویل ہوتے ہیں اور وہ بھی ایسی روزگاری جس کے ڈانڈے تمھاری جدائی سے ملتے ہوں۔ تمھیں شاید نہیں معلوم کہ ان طویل دنوں کے ساتھ کھردری تاریک راتیں بھی تو بندھی ہوئی ہیں جو اپنی سیاہی میں سب کچھ تاریک کر دیتی ہیں۔ ہاں..... ہاں۔ تمھارا روشن چہرہ اور چمکتی ہوئی محبوب آنکھیں بھی تاریک ہو جاتی ہیں۔ تمھارے چمکتے ہوئے چہرے پر میری مادی کلفتوں نے بہت موٹے موٹے پردے ڈال دیئے ہیں ـــــ اور دیکھو میری مجبوریوں اور محرومیوں نے اپنا انتقام لینے کے لئے میرے لاشعور کو کیسی الٹی پٹی پڑھائی ہے کہ میں تمھیں بھیڑیوں کے جنگل میں برہنہ اور اکیلا ڈال کر کھڑا ہوا تمھیں دیکھ رہا ہوں اور اپنے اعضا پتھر کے بنا لئے ہیں۔

حامد نے اٹھ کر میرے آنسو خشک کئے اور میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

میں نے دل ہی دل میں کہا ـــــ

کیا دیکھ رہا ہے پگلے۔ اب ان آنکھوں میں کیا دھرا ہے اب تو تو نے وہ بھی خشک کر دیئے ورنہ آنسو ہی دیکھ لیتا۔ لیکن میں حامد سے کچھ نہیں کہہ پایا۔ وہ مجھے اچانک اپنی عمر سے بہت بڑا نظر آیا جیسے بیٹھے بیٹھے ان لمحوں میں اس نے پاس بیٹھے ہم سب لوگوں کی عمر کا تھوڑا تھوڑا حصہ [illegible] مجھے معلوم نہیں کیوں

اس سے خوف محسوس ہوا۔ میں نے چاہا کہ اس کا ہاتھ چھوڑ دوں تاکہ وہ ان کمزور لمحوں میں میرے کانپتے ہوئے لمس سے کوئی نتیجہ نہ نکال لے۔ میں نے جب اس کا ہاتھ چھوڑنا چاہا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اس کا ہاتھ نہیں پکڑے تھا بلکہ وہ میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا اور عزیز بھائی اور مجید بھیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عزیز اور مجید نے سوچا کہ پرسوں نہر کی پٹری پر جب چاند نہیں نکلا تو ہم لوگ ڈر گئے تھے کہ اس سال معلوم نہیں کیا ہو ــــ پچھلے سال تو تیز اور گرم ہواؤں نے آم کی ساری فصل تباہ کر دی تھی اور اس سال سنا ہے وہاں لوگ لڑ رہے ہیں۔ ہندوستان سے وہاں کوئی چیز نہیں جا سکتی۔ آم تو پھر شوقیہ کھانے کی چیز ہے۔ لڑائی کے عالم میں بھلا ہمارے آم کون پوچھے گا اور کسی کو بھلا کیا خبر کہ آم کی فصل ہی ہمارے بچوں کو سال بھر روٹی دیتی ہے ــــ تو اس وقت حامد میاں نے اشارہ کر کے بتایا تھا کہ سامنے ان دو شیشموں کے بیچ ایک گھر سا بنا ہوا ہے۔

تو جب ہم نے دیکھا تو نظر آیا کہ ڈوبے ہوئے سورج کی زرد روشنی میں وہاں ایک گھر بنا ہے جس کے دروازے پر ہم کھڑے ہیں اور اس گھر کے چاروں طرف آم کے باغات ہیں اور ان آم کے باغوں میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے دھڑا دھڑ درخت جل رہے ہیں۔ پکے ہوئے آم آپ ہی آپ پھوٹ رہے ہیں اور ان میں سے انگارے نکل رہے ہیں۔ اور درختوں سے جلے ہوئے مردہ پرندے ٹپک رہے ہیں اور جلتی ہوئی فاختائیں اور کبوتر پھڑک پھڑک کر دم توڑ رہے ہیں۔

ہم میں سب سے زیادہ سمجھ دار جمال میاں تھے تو ہم نے انھیں بتانے کے لئے جب ان کی طرف دیکھا تو وہ خود آنکھیں پھاڑے شیشموں کے بیچ کچھ دیکھ رہے تھے۔ اور تبھی ہم نے دیکھا تھا کہ حامد میاں شاہد میاں کی کمر پکڑے بے ہوش ہو چکے ہیں۔

تب جمال نے خاموش بیٹھے پانچوں افراد کو باری باری دیکھ کر پھر سوچنا شروع کیا ــــ پرسوں دو شیشم کے درختوں کے بیچ اس کنارے پر نہر کی پٹری پر بنے گھر کی چھت پر اپنے آپ کو کھڑا دیکھ کر اس کنارے پر خود کو میں نے کتنا غیر محفوظ محسوس کیا تھا۔

اچانک غلام ماموں نے اس کنارے پر کچھ دیکھا اور کہا ــــ

"ارے دیکھو..... ہو سکتا ہے ان شیشموں کے درمیان دھوپ ڈھلتے وقت بڑے درختوں کا سایہ اس انداز سے پڑتا ہو کہ وہ جگہ ایک گھر کی طرح نظر آتی ہو۔ ابھی ابھی دھوپ ڈھلنے پر میں نے یہ محسوس کیا ہے۔ کیا تم لوگوں نے غور کیا؟" ــــ

ہم سب نے ان کا یہ جملہ سنا اور بہتی ہوئی نہر کو دیکھا اور سامنے ان شیشموں کو دیکھا اور ڈھلتے

ہوئے سورج کو دیکھا اور بہتی ہوئی نہر کی گمبھیر خاموشی کے اوپر سے واپس آتے ہوئے ہم نے شاید ایک ساتھ سوچا کہ سب دھوکہ ہے اور سب وہم ہے۔ لیکن یہ بہتی ہوئی نہر حقیقت ہے۔ اور ڈھلتا ہوا یہ سورج حقیقت ہے اور ہم بیٹھے ہوئے یہ سارے افراد حقیقت ہیں ——

جمال نے سوچا پرسوں حامد نے جیسے ہی اشارہ کیا تھا میں نے ادھر دیکھا تھا۔ میں اس نیم تاریک گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔ سامنے دور دور تک میدان تھا جس میں بے شمار قافلے خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ قافلے والوں کے کندھوں پر جلتی ہوئی مسجدیں رکھی تھیں جن کے مناروں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ جلتے ہوئے مناروں کو دیکھ کر قافلے والے اپنی پیشانیوں کے زخموں سے بہتے ہوئے لہو کو اپنے ہاتھوں سے روکتے، ایک لمحے کو رکتے، سرخ ہتھیلیوں کو دیکھتے اور پھر قدم بڑھا دیتے تھے۔ بڑے میدان کو پار کر کے قافلے والے آہستہ آہستہ نیلے سمندروں میں اتر رہے تھے اور بے آواز سکون کے ساتھ ڈوب رہے تھے۔ اور جو قافلہ سمندر کی جانب سے رخ موڑتا اور کوئی اور سمت اختیار کرتا تو اس قافلے میں بھگدڑ مچ جاتی۔ اصیل گھوڑے بدن سے بدن ملائے اگلے سموں کو اوپر بلند کرتے دم کو سیدھا کرتے اور سانپ کی طرح پھنکار پھنکار کر ایک دوسرے پر حملہ کر دیتے اور ان کے سموں سے آگ کی چنگاریاں نکلتیں۔ بلبلاتے ہوئے اونٹ بھاگتے اور ٹھوکریں کھا کر سر کے بل گرتے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے۔ وجیہہ سپاہی چلوں میں تیز جوڑتے اور کھڑے کھڑے بت بن جاتے۔ حسین اور طویل قامت عورتیں مشکیزوں میں پانی بھر کے لاتیں اور لاشوں کے منہ میں پانی ڈال ڈال کر ان لاشوں کی آنکھیں کھول کھول کر دیکھتیں اور ان آنکھوں میں لپٹی ہوئی موت کا نوحہ پڑھتیں اور ان جسموں کو یاد کرتیں جن کی قربت انہیں میسر تھی۔ اور پھر طویل گریہ کے بعد وہ اپنی چوڑیاں توڑتیں اور کلائیوں میں سیاہ کلاوے باندھ کر سفید چادر ڈال لیتیں جنہیں دوسرے قافلے کے سپاہی کھینچ کھینچ کر وحشیانہ قہقہے لگاتے۔ اور پھر خاموش قافلوں کا سفر شروع ہوتا جو اپنے شانوں پر جلتی ہوئی سفید مسجدیں اٹھائے رواں تھے اور گہرے سمندروں میں غرق ہونے کے لئے آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے اور جیسے ہی قافلہ سمندروں میں ڈوبنے سے انکار کرتا، اس قافلے کے گھوڑے سموں کو بلند کرتے، سانپ کی طرح پھنکارتے اور ایک دوسرے پر حملہ کر دیتے اور بلبلاتے ہوئے اونٹ ٹھوکریں کھا کر گرتے اور تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتے۔۔۔

جمال نے سوچا شکار پر آنے سے پہلے میاں نے پوچھا تھا ——

"میاں! عہد وسطیٰ کی تاریخ پڑھانا کس قدر مشکل کام ہے ——"

تو میاں نے آہستہ سے کہا تھا ——

"اس سے بھی زیادہ مشکل تاریخ ایک اور دور کی ہے ——"

"وہ کون سا دور ہے میاں ؟" ——

تو میاں نے میری طرف اتنی مایوس نظروں سے دیکھا تھا کہ مجھے لگا جیسے میں اپنا پڑھا لکھا سب بھول چکا ہوں۔

پھر میاں نے اپنے شانوں پہ بکھری ہوئی سفید کاکلوں میں انگلیاں ڈال کر انھیں الجھا لیا تھا، گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسے نیچے تک چاک کر دیا تھا اور آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر مجھ سے کہا تھا ——

"صبر کرو..... صبر کرو..... اور کم از کم ایمان کے ادنیٰ درجے سے کبھی گریز نہ کرو۔ اور شکر کرو کہ سارے دکھ سکھ تمھارے اپنے ہیں۔ تمھاری اپنی ملک۔ اب جاؤ۔ اور دیکھو..... گھبرایا مت کرو۔ لکھنؤ والے بھائی کو دیکھو دنیا جہان کی دردناک خبریں صبح و شام جمع کرتا ہے، انھیں پڑھتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ اور مجھے وہاں سے لکھتا ہے کہ اسے اب شب خون کا خطرہ نہیں رہا اس نے خیموں کو جلا کر صحرا روشن کر لیا ہے اور اس موج خون سے اپنا چہرہ گل نار کر لیا ہے جس سے کبھی دجلے کا پانی روشنی ہوتا ہے کبھی گنگا کا ——

اس نے مجھے یہ بھی لکھا ہے کہ جمال کو بتا دیجئے کہ جب بھی کہنہ محرابوں سے دھواں اٹھتا محسوس ہو تو خوابوں کا پھر ہرا روشن کرے۔ بس..... اب جاؤ تمھارے ساتھی شکار کے لئے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہاں سے نکل کر شکار کے لئے میں نہر پر آگیا تھا جہاں وہ منظر دیکھا ——

جمال سوچ کی دلدل سے آہستہ آہستہ اوپر ابھرا تو پانچوں ساتھی نیچے سر ڈالے خاموش بیٹھے تھے۔

جمال کو محسوس ہوا کہ سرد موسم کے ڈھلتے ہوئے دن کی شام کو، بہتی ہوئی نہر کے کنارے اس چھوٹے سے ٹیلے پر ہم سب لوگ صدیوں پرانے کھنڈر ہیں جو خود اپنے آپ کو اپنی داستان سنا رہے ہیں۔ ہر جگہ ایسے ہی کھنڈر بکھرے پڑے ہیں جہاں داستانیں سنائی جا رہی ہیں۔ پوری داستان یاد نہیں رہی ہے جو حصہ یاد آجاتا ہے وہیں سے قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اصل سرا ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں کھو گیا ہے۔

تبھی ایک کھنڈر نے اپنا سر سینے سے اٹھایا اور بولا ——

"میاں نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ آج نہر پر زیادہ دیر نہ کرنا —— اب حامد سے پوچھ لیں کہ اس نے پرسوں شیشم کے درختوں کے بیچ کیا دیکھا تھا ——"

غلام ماموں کی آواز سن کر جیسے ہم لوگ جاگ پڑے اور ہم سب کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم سب ایک ساتھ الگ ہوئے تھے اور برسوں کا سفر طے کر کے کوسوں کی مسافت کے بعد ابھی ابھی واپس آئے ہیں مجھے لگا جیسے اس پورے عرصے میں ہم لوگ ایک دوسرے سے بالکل اجنبی ہو گئے تھے اور سارے لوگ

ایک دوسرے سے الگ ہو کر علیٰحدہ علیٰحدہ آسیب زدہ اور خاموش جزیروں میں بیٹھے ہوئے اپنے سینے پر لکھی ہوئی وہ دھندلی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جس میں جزیرے سے باہر نکلنے کا راستہ لکھا تھا۔

دھوپ اب زرد ہو گئی تھی اور بہت دور کے کھیت دھند میں آہستہ آہستہ گم ہو رہے تھے۔ بڑی فاختہ خاموش ہو چکی تھی۔ نہر دھیمے دھیمے بہتی چلی جا رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح شام ہونے پر اور زیادہ گہری محسوس ہونے لگی تھی۔ اور سردیوں کی اس خاموش اور اجنبی شام میں ہم سب لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا وہ لڑکا ہم سب کو باری باری غور سے دیکھ رہا تھا۔

جس وقت اس نے اپنی زبان سے پہلا لفظ کہنا چاہا اس وقت میں نے ہی نہیں ہم سب نے محسوس کیا کہ وہ انجان لمحہ آگیا جس کا ہم سب کو انتظار تھا۔ ہم سب جواب اپنی واردات سے واقف تھے۔ ایک دوسرے سے خود کو منسلک بھی سمجھ رہے تھے اور جدا بھی۔ اس بے نام کیفیت میں معلوم نہیں کیوں ہم سب نے خود کو مجرم سا محسوس کیا۔

حامد نے تمام سہمے ہوئے چہرے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا تو غلام ماموں نے کہا ——

"آج میاں نے صبح ہی صبح اسے گھر سے بلا کر اس پر دعا دم کی اور اس سے پوچھا کہ اس نے کیا دیکھا تھا حامد نے جب اپنا دیکھا میاں کو سنایا تو وہ بہت روئے اور جب یہ ان کے رونے سے گھبرا کر خود بھی رونے لگا تو میاں نے اس کے آنسو پونچھ کر اس سے کہا تو ابھی بہت کم عمر ہے تو نے ابھی کھویا ہی کیا ہے کہ تجھے صبر کی تلقین کر سکوں بس اللہ تجھے توفیق دے کہ تو اپنے بڑوں کا قرض ادا کر سکے اور ان کے دکھ برداشت کر سکے۔ اللہ تجھے ہمت دے اور پر امید رکھے۔ پھر میاں نے حامد سے کہا کہ آج تو نہر پر سب کے ساتھ جائے گا۔ کوئی اپنا منظر نہیں بتائے گا میں غلام کو منع کر چکا ہوں۔ لیکن تجھے تو بتانا ہوگا۔ تجھے تو بتانا ہوگا میرے پوت ——"

اسی وقت ہوا کسی درخت کی ٹہنیوں سے الجھ کر نکلی اور ہم لوگوں کے سروں پر ناچنے لگی اور ہم نے خود کو بہت کمزور محسوس کیا۔

تبھی حامد نے دھیمے دھیمے کہنا شروع کیا۔

اور جب وہ اپنا منظر بیان کر کے خاموش ہوا ہم سب کی پتھرائی ہوئی ساکت پتلیاں اس کا چہرہ تک رہی تھیں اور وہ بے رحم نظروں سے ہماری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

غلام ماموں پسینے سے تر ہو گئے تھے۔ ہم لوگوں کی بھیگی ہوئی پیشانیوں کو دیکھ کر انھوں نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور بہت تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

" یہ پورا منظر بیان کر کے حامد نے میاں سے پوچھا تھا کہ یہ سب کس نے کیا ہے تو ...

تو میاں نے اسے بتا دیا کہ یہ کس کا کام ہے۔" یہ کہہ کر غلام ماموں نے اپنا سر نیچے ڈال لیا۔ ہم سب نے بھی خاموشی کے ساتھ اپنے سر جھکا لیئے کہ اور چارہ بھی کیا تھا۔

"شام ہو رہی ہے۔ گھر واپس چلو۔" غلام ماموں کی آواز بہت شکستہ تھی۔ اور واپسی میں ابھی قصبہ دور تھا کہ سورج ڈوبنے لگا۔ سڑک کے دونوں طرف کے درختوں نے راستے کو مزید دھندلا کر دیا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کے قریب قریب چل رہے تھے کہ اچانک کوئی سیار زور سے رویا اور ہمیں آسمان کے نچلے کنارے پہ شروع تاریخوں کا مہین اجنبی چاند نظر آیا اور اسی وقت ہم نے دیکھا کہ خلاف معمول آج حامد نے غلام ماموں سے بندوق لے کر اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ معاً ہمیں خیال آیا کہ حامد نے تو ابھی بندوق چلانا سیکھا ہی نہیں ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ہم سب کو ایسا اطمینان محسوس ہوا جیسے دل بھر کے رونے کے بعد ابھی ابھی خاموش ہوئے ہوں۔ ہم سب نے چور نگاہوں سے حامد کی طرف دیکھا جس نے تھوڑی ہی دیر پہلے نہر کی پٹری پر اپنا منظر بیان کرتے وقت کہا تھا۔

"پرسوں جب چاند نہیں دکھا اور جمال بھائی نے کہا کہ چاند تیسا تھا نہ بھی نظر آئے تو کیا فرق پڑے گا تو بس یہی سن کر مجھے امی کی بات یاد آئی کہ عید تو بچوں کے لئے ہوتی ہے اور چاند نکلتے ہی شروع ہو جاتی ہے تو میں نے سوچا کہ چاند ہی نہیں نکلا تو عید کیسے شروع ہو پائے گی۔ بس اسی وقت سامنے والے دو درختوں کے بیچ مجھے ایک گھر سا بنا ہوا دکھائی دیا اور اس گھر سے میں نے اپنے آپ کو نکلتے دیکھا۔ میری دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں اور کان بند تھے اور زبان کٹی ہوئی تھی۔ میں ٹھوکریں کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اتنے میں گھر کے دروازے سے ایک اور لڑکا باہر نکلا۔ یہ بھی ... یہ بھی میں ہی تھا۔ میری دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں، کان بند تھے اور زبان کٹی ہوئی تھی۔ میں پھر ٹھوکریں کھاتا ہوا آگے بڑھا کہ اور لڑکا باہر نکلا۔ اس بار معلوم ہے کون تھا؟ اس بار بھی میں ہی تھا اور میری دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں اور کان بند تھے اور زبان کٹی ہوئی تھی ...

اس گھر سے مسلسل میں ہی باہر نکل رہا تھا اور ٹھوکریں کھاتا ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

اسی وقت میں نے آپ سب کو جلدی سے دکھایا تھا کہ وہ سامنے کیا ہے، شیشم کے نیچے۔ آپ سب لوگ دیکھنے میں لگ گئے اور کسی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ سامنے اس گھر میں سے جو لڑکے باہر

آرہے ہیں ان کی صورت میری جیسی کیوں ہے اور میری آنکھیں کس نے پھوڑی ہیں میرے کان کس نے بند کئے ہیں میری زبان کس نے کاٹ ڈالی ہے ۔ لیکن اب ... میاں مجھے بتا چکے ہیں ۔"

چلتے میں حامد نے تیز نظروں سے ہم سب کو باری باری دیکھا جیسے کچھ پوچھنا چاہتا ہو لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ اسے جواب دے سکے ۔

ترجب قریب کے درختوں کی پرچھائیوں نے دور کے درختوں کی پرچھائیوں کو کاٹا اور اس عالم میں ہم لوگوں کے لمبے لمبے سائے ، دھندمیں ڈوبی نیم تاریک بستی میں داخل ہوئے تو ہم مجبور لوگوں نے بہت بے بسی کے ساتھ بے حد واضح طریقے سے محسوس کیا کہ اب ہم سب کے سب اس اناڑی بندوق والے کی رہنمائی میں پیچھے پیچھے چل رہے ہیں جس کی دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں ۔ □

غیاث الرحمٰن

۵۷، سی بلاک، راس مسعود ہال
علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

پیاسی کونپل

بہت رات گزر چکی تھی۔ لیکن ابھی تک پنکی سویا نہیں تھا۔ کل اس کا رزلٹ نکلنے والا تھا۔ اور پھر دو مہینے کی چھٹی۔ اور ان چھٹیوں میں بھی ہر سال کی طرح وہ اپنے چاچا کے یہاں شملہ جائیں گے۔ پچھلے سال پنکی نے اپنے چاچا کے بچوں سے دوستی کی تھی۔ رشمی، گڈو اور راقی کتنے اچھے دوست تھے وہ۔ پنکی کا جی چاہتا تھا کہ شملہ ہی رہ جائیں۔ لیکن اس کے ممی۔ ڈیڈی راضی نہ ہوئے تھے۔ ممی نے کہا تھا "وہ بیٹے اگلی گرمیوں میں ہم لوگ پھر یہیں آئیں گے"۔ لیکن پنکی بہت اداس ہو گیا تھا۔ اور پھر اس کو اگلی گرمیوں کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ایک سال کی طویل مدت کل ختم ہونے والی تھی۔ چھٹیوں کے دو مہینے پھر سے وہ اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ گزارے گا۔ یہی خوشی کا احساس پنکی کو سونے نہیں دیتا تھا ——— ڈیڈی اس کو چادر اڑھا کر اور کمرے میں نائٹ بلب جلا کر بہت دیر کی جا چکی تھی۔ شاید اب وہ خراٹے لے رہی ہوگی۔ ممی ڈیڈی ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔

پنکی نے چادر کو ایک طرف سرکا دیا۔ اور پلنگ پر کھڑا ہو کر الماریوں میں سجے ہوئے خوبصورت کھلونوں کو دیکھنے لگا۔ پنکی کو وہ کھلونے پسند نہ تھے۔ اس لئے کہ وہ بولتے نہیں تھے۔ اور نہ حرکت کرتے تھے۔ ان سینکڑوں کھلونوں میں پنکی کو بس کچھ ہی چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ ایک تو وہ بندر جس کی چابی بھر دو اور وہ بوتل سے گلاس میں شربت انڈیل انڈیل کر پیتا رہتا ہے۔ یا وہ چابی کا گوریلا جو ڈھول بجاتا رہتا ہے۔ چابی والی سب ہی چیزیں اسکو خوش کر دیتی تھیں۔ لیکن چابی ختم ہونے پر جب وہ حرکت بند کر دیتیں تو اس کو بڑا غصہ آتا۔ اس کا جی چاہتا کہ ان سب گونگے بہرے بے جان کھلونوں کو توڑ کر پھینک دے۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ایک مرتبہ اس نے ربڑ کی گڑیا کی گردن بلیڈ سے کاٹ دی تھی۔ تو ممی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا

"کل ہی چالیس روپئے کی گڑیا تمہارے لئے خریدی اور ایک ہی دن میں اس کو کاٹ کے پھینک دیا۔"

"ممی وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی۔"
"تم بیوقوف ہو پنکی، کھلونے کہیں بولتے ہیں؟"
"تو پھر مجھے ایسے کھلونے نہیں چاہئیں" ــــــــــــــ اور اس کے گال پر ایک چانٹا پڑا تھا۔

"خبردار، اب کبھی تم نے کسی کھلونے کو توڑا تو دیکھ لینا، تمہارے ڈیڈی بڑے شوق سے کھلونے خریدتے ہیں تمہارے لئے اور تم اس کی ذرا بھی قدر نہیں کرتے۔ آئندہ کوئی کھلونا مت توڑنا۔"

اور تب ہی سے پنکی سہما ہوا تھا، اس لئے اب تو وہ کسی کھلونے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ ہر سال اس کی سالگرہ پر بہت سے کھلونے اس کو تحفے میں ملتے اور سب ہی کمرے میں سجے ہوئے رکھے رہتے۔ پنکی نے ہاتھ بڑھا کر ایک ربڑ کی بڑی سی گڑیا اٹھالی۔ جو ریشمی رنگین لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ گڑیا بالکل سیتا آنٹی کی بچی کی طرح تھی۔ جو اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ لیکن ان کی بچی تو خوب ہاتھ پاؤں چلاتی رہتی ہے۔ منہ سے ہوں، ہاں بھی کرتی ہے۔ کبھی کبھی ہنس بھی دیتی ہے۔ اور کبھی خوب چلا چلا کر رونے لگتی ہے۔ اس کی یہ حرکتیں پنکی کو بہت اچھی لگتیں۔

"آنٹی یہ روتی کیوں ہے"؟ وہ پوچھتا۔
"جب اس کو بھوک لگتی ہے تو یہ رو رو کر دودھ مانگتی ہے۔"
"آنٹی تم نے اتنی پیاری سی گڑیا کہاں سے خریدی"؟
"یہ ہاسپٹل سے خریدی ہے۔"

"اچھا ــــــــــــ" پنکی نے حیرت ظاہر کی تھی "ہاسپٹل میں اتنے اچھے کھلونے ملتے ہیں؟ بازار کے تو بہت خراب ہوتے ہیں ــــــــ آنٹی آپ میرے ڈیڈی سے کہہ دیجئے ناکہ وہ بھی میرے لئے ہاسپٹل سے ایک ایسی ہی گڑیا لادیں۔" اور آنٹی ہنس کر کہتیں۔

"ہاں پنکی، اب جلد ہی تمہارے گھر بھی ایک ایسی ہی گڑیا آجائے گی۔"
"سچ ــــــ؟" پنکی نے خوش ہو کر پوچھا تھا۔

لیکن یہ ربڑ کی گڑیا کچھ بھی نہیں کرتی۔ آنٹی کی گڑیا کو تو چابی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اس نے آہستہ سے گڑیا کو اسی جگہ رکھ دیا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بندر اٹھایا۔ اور اس میں

پانی بھرنے لگا۔ بندر نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر بوتل سے شربت پینا شروع کر دیا۔ بنکی اس کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بندر پھر رک گیا۔ بنکی کو بڑا غصہ آیا۔ اور اس نے زور سے بندر کو نیچے پٹخ دیا۔ اسی وقت دیوار پر لگی ہوئی گھڑیال نے خوفناک آواز میں ٹن ٹن بجنا شروع کیا بنکی نے دیکھا گھڑی کی دونوں سوئیاں بارہ پر ایک ساتھ جمی ہوئی ہیں۔ بنکی کو بڑا عجیب سا لگنے لگا۔ کمرے میں رکھے ہوئے تمام کھلونے جیسے بنکی کو گھورنے لگے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی سینکڑوں آنکھیں کمرے کی مدھم روشنی میں بڑی بھیانک لگ رہی تھیں۔ جیسے ان آنکھوں میں اپنے ساتھی کی بے عزتی کے انتقام کی آگ دھک رہی ہے۔ بنکی مڑ مڑ کے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کو یوں محسوس ہوا گویا وہ تمام کھلونے بغیر حرکت کئے اس کو چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں۔ اس کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جلد ہی اس کو دبوچ لیں گے۔ وہ جھٹ سے پلنگ پر اوندھا گر گیا۔ مضبوطی سے آنکھیں بھینچ لیں اور آہستہ سے چادر کھینچ کر اپنے آپ کو اس میں چھپا لیا۔

روزانہ کی طرح آج بھی بہت سویرے ڈیزی نے بنکی کی چادر کھینچ لی اور اپنی کھرکھری مخصوص آواز میں بنکی کو جگانے لگی۔

"گیٹ اپ بنکی، دیکھو کتنا صبح ہو گیا۔ اسکول کا ٹائم ہو گیا۔ اور تم ابھی تک سوتا ہے۔"

صبح کا یہ وقت بنکی کو بہت برا لگتا جب ڈیزی اس کو جگانے آتی تھی۔ اس کو ڈیزی سے اس بات پر چڑھ ہو گئی تھی کہ وہ اس کو دیر تک سونے نہیں دیتی، جیسے ممی ڈیڈی سوتے رہتے ہیں۔

اور پھر آج تو وہ رات میں بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر سوتے رہنے کی کوشش کی۔ لیکن ڈیزی کی کرخت آواز سے ڈر کر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ڈیزی اپنے سرخی مائل سفید چہرے پر لگی ہوئی باریک باریک نیلی آنکھوں میں مسکرا رہی تھی۔ یہی مسکراہٹ بنکی کا سارا غصہ ختم کر دیتی تھی۔ پھر ایک ڈیزی ہی تو تھی جو اتنے بڑے مکان میں بنکی کے ساتھ کھیلتی تھی۔ اس کو کہانیاں سنایا کرتی، ممی ڈیڈی کو تو کبھی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اس کے ساتھ باتیں کریں۔ کھیلیں، بلکہ کبھی کبھی کئی دن بنکی کی ممی ڈیڈی سے ملاقات تک نہیں ہوتی تھی۔ بنکی بہت سویرے اٹھ کر اسکول چلا جاتا۔ تب ممی ڈیڈی سوتے ہی رہتے ہیں۔

دوپہر اسکول سے آنے کے بعد وہ اکیلا ہی کھیلتا ہی رہتا۔ یا ڈیزی سے کہانی سنتا۔ ڈیزی روزانہ اس کو ایک ہی کہانی سناتی تھی "لال پری کی جو سب پریوں کی دوست ہے۔ یہ کہانی اس کو بہت پسند تھی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد مسٹر راؤ اس کو پڑھانے آجاتے۔ اور بنکی کو زبردستی دو گھنٹے ان کی بے مزا باتیں سننی پڑتی۔ سبق یاد نہ ہونے پر کبھی کبھی ڈانٹ پھٹکار بھی پڑتی۔ اور پھر رات میں وہ انتظار کرتے کرتے سو جاتا۔ تب تک بھی اس کے ممی ڈیڈی گھر نہیں لوٹتے۔ مکان میں کوئی اس کا ہم عمر بھی نہیں۔ اس کی سالگرہ پر بھی زیادہ تر بڑے بڑے لوگ ہی آتے تھے۔ ہر شخص ایک بے جان تحفہ بنکی کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ اور اس کے ممی ڈیڈی سے باتوں میں مصروف ہو جاتا۔ اور بنکی کی آنکھیں نہ جانے کیا تلاش کرتی رہ جاتیں۔

"میں آج میں اسکول نہیں جاؤں گا۔" بنکی نے ضد کرنے کے انداز میں آنکھیں ملتے ہوئے ڈیزی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"واٹ ــــــ؟" ڈیزی کی آواز گونجی "سلی بوائے، آج تمہارا رزلٹ نکلے گا اور تم بولا اسکول نہیں جائے گا۔ کیوں نہیں جائے گا ــــــ؟" پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی "اُو سوئٹ بنکی! تم اسکول جاؤ۔ دیکھو اب تم بڑی کلاس میں آجائے گا۔ اب تک تو ایل کیجی میں پڑھتا تھا اور اب فرسٹ کلاس میں پڑھنا شروع کرے گا۔ یو نو ــــــ ہم نے گاڈ سے دعا کیا تھا تم ایگزام میں فرسٹ آئے گا۔ آئی ایم شیور ــــــ اور پھر تم جب اسکول سے آئے گا تو ہم تم کو ایک اسٹوری سنائے گا۔ وہی لال پری کا اسٹوری جو اوپر کو رہتا ہے۔ آسمان پر۔ او۔کے؟ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ ــــــ ڈرائیور آگیا ہے۔"

کہانی کی لالچ دے کر ڈیزی اس کو ہمیشہ منالیا کرتی تھی ــــــ بنکی دل نہ چاہنے کے باوجود پلنگ سے نیچے اتر گیا۔ دوسرے کمرے کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ اس کے ممی ڈیڈی ابھی تک سو رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں اپنی ممی کے سرہانے جاکر کھڑا ہو گیا۔ ممی کے ہونٹوں کی سرخی پھیلی ہوئی تھی کولر کی ہوا سے بال بکھر گئے تھے۔ ڈیڈی چادر اوڑھے خراٹے لے رہے تھے۔ بنکی نے آہستہ سے ممی کی پیشانی پر سر رکھ دیا۔ اور بالوں سے کھیلنے لگا۔ ممی نے کراہتے ہوئے کروٹ لی "اوہ بنکی! بیٹے سونے دو، ہم رات میں بہت جاگے ہیں۔" پھر زور سے "ڈیزی" کہہ کر پکارا۔ بنکی کو بہت برا لگا۔ ڈیزی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ وہاں سے چلا گیا۔

بنکی کا ذہن آج بہت بھاری بھاری سا تھا۔ آج اس کو اس بات کا بڑی شدت سے

احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ممی ڈیڈی اس سے محبت نہیں کرتے ۔ نہ کبھی اس کو اپنے ساتھ کہیں لے جاتے ہیں ۔ اور نہ ہی کبھی اس کے اسکول آتے ہیں ۔ جب کہ دوسرے بچوں کے ممی ڈیڈی اکثر اسکول آیا کرتے ہیں ۔ موہن کی ممی تو روزانہ ہی موہن کو اسکول سے لینے آتی ہے ۔ اس وقت پنکی بہت اداس ہو جاتا وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ موہن کی ممی میری ممی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا ۔ پنکی کو سب سے زیادہ نفرت مسٹر راؤ سے تھی ۔ جو اسے زبردستی دو گھنٹے اپنے پاس بیٹھا کر پڑھتے رہنے پر مجبور کرتے تھے ۔

اسکول میں تمام بچے آچکے تھے ۔ سارے بچے خوش خوش نظر آرہے تھے ۔ زیادہ تر بچے آج بغیر یونیفارم آئے تھے ۔ کہ آج کا دن سال کا آخری دن تھا ۔ آج سب کا رزلٹ ملنے والا تھا اور پھر دو مہینے کی چھٹیاں ـــــــ

اسکول میں پنکی کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا ۔ اس کی کلاس ٹیچر ابھی تک کلاس روم میں نہیں آئی تھی ۔ آفس میں کسی کام میں مصروف تھی ۔ پنکی کی آنکھوں میں نیند سما رہی تھی ۔ کہ وہ رات میں بہت کم سویا تھا ۔ ایک چپراسی کلاس روم کے موٹے موٹے شیشوں کی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے دوسرے چپراسی سے کہہ رہا تھا ۔

"یار مجھے آج اپنی سسرال جانا ہے ۔ کل ہی وہاں سے خط آیا کہ میرے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے ۔"

"ارے تو مٹھائی کب کھلاؤ گے ؟ پہلا لڑکا ہے" دوسرا چپراسی بولا ۔

"کھا لینا یار ـــــــ ان بچوں کا رزلٹ مل جائے تو میں بند کر کے جلدی سے بھاگوں گیارہ بجے گاڑی ہے ۔"

"اسی لئے تم نے پہلے ہی کھڑکیاں بند کر دیں ۔"

"ہاں ـــــ یار ـــــ پتہ نہیں ابھی کی کلاس ٹیچر آفس میں کیوں دیر لگا رہی ہیں دس بج گئے ۔"

پنکی کلاس میں سب سے آخری بینچ پر جا کے بیٹھ گیا ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک دو روز بعد وہ بھی اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ شملہ چلا جائے گا ۔ چھٹیوں کے دو مہینے کتنے مزے سے گزریں گے ۔ اس کی آنکھیں نیند کے غلبے سے خود ہی بند ہو رہی تھیں ۔ سب کی نگاہوں سے چھپ کر وہ بینچ پر ہی سو گیا ـــــــ

کلاس میں بچے شور مچا رہے تھے ۔ ٹیچر کے داخل ہوتے ہی سب خاموش ہو گئے ۔ ٹیچر جلدی

جلدی بچوں کے رول نمبر پکار پکار کر انھیں "رزلٹ کارڈ" دینے کے بعد جانے کی اجازت دیتی رہی۔

"نمبر TWENTY (20)

——— کوئی جواب نہیں۔

"ارے آج پنکی نہیں آیا۔ وہ فرسٹ آیا ہے۔

سب بچے جا چکے، ٹیچر کے باہر نکلتے ہی چپراسی نے پنکھوں کے سوئچ آف کر کے دروازہ دو مہینے کے لئے بند کر دیا۔

دوپہر کا وقت شروع مئی کا سورج پورے آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ایسے کیجی کلاس کا بند کمرہ بھٹی کی طرح دھکنے لگا۔ پسینے میں شرابور پنکی بڑبڑا کر اٹھا۔ بہت دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن جانی پہچانی دیواریں، کھڑکیاں، تصویریں، بلیک بورڈ اور خالی بینچ دیکھ کر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اس کا کلاس روم ہے۔ وہ بہت گھبرایا۔ پیاس کی شدت سے اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ اور خوف کی وجہ سے اس کی آواز گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اس نے چاہا کہ زور سے چیخنا شروع کر دے۔ لیکن اس کی گھٹی گھٹی سی آواز مضبوط چھت، دیواریں، اور کھڑکیوں کے موٹے موٹے بے اثر شیشوں سے ٹکرا کر اسی محدود فضا میں تحلیل ہو گئی۔

گھر پر ڈیزی کی پریشانی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈرائیور اسکول سے خالی کار لے کر واپس آ چکا تھا۔ ڈیزی نے پنکی کے ممی ڈیڈی کو اس کی گم شدگی کی اطلاع فون پر دیدی تھی۔ دونوں گھبرائے ہوئے گھر آ گئے تھے۔ تھانے میں رپورٹ بھی درج کر دی گئی۔ شہر کی گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں پنکی کی تلاش شروع ہو گئی۔ مقامی ریڈیو اسٹیشن سے گم شدگی کی خبر نشر بھی ہو گئی۔ تمام مقامی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے فائل میں یہ خبر بھی نوٹ کرا دی گئی۔

پنکی بھوک و پیاس سے نڈھال پسینے میں نہایا ہوا۔ بند دروازے کو اپنے کمزور ہاتھوں سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ روتے روتے اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے آواز ختم ہو چکی تھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ اور پنکی کا ننھا سا ذہن باہر نکلنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ جب بھوک حد سے زیادہ بڑھ گئی تو اس نے بلیک بورڈ کے آس پاس بکھرے ہوئے چاک کے ٹکڑے اور بھیگے ہوئے کاغذ چن چن کر کھانے شروع کر دیئے ——— زبان چھل سی گئی حلق سے آنتوں تک جلن ہونے لگی۔ پیاس کی شدت اور بڑھ گئی۔ گرمی سے پنکی پر ایک دیوانگی

کا دورہ پڑا اور اس نے گھٹی گھٹی آواز سے چلا چلا کر اپنے کپڑے نوچنے شروع کر دیئے۔ نڈھال ہو کر گر گیا اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمت کر کے پھر اٹھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے بہت اونچائی پر تھے۔ ان سے وہ باہر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کو ایک ترکیب سوجھی، ایک بینچ بڑی مشکل سے کھینچ کر دروازہ تک لایا۔ بینچ پر کھڑے ہو کر بھی وہ آسانی سے باہر نہ دیکھ سکا پنجوں کے بل اچک کر باہر دیکھنے لگا۔ اسکول کی باؤنڈری کے آہنی گیٹ میں بہت بڑا تالا پڑا ہوا تھا گیٹ کے سامنے بہت چوڑی سڑک کے اس پار ایک آئس کریم والا کھڑا ہے۔ بچے اس سے ٹھنڈے میٹھے برف کے رنگین ٹکڑے خرید رہے ہیں۔ اور خوشی سے چوستے جا رہے ہیں۔ بنکی کو یہ برف کے ٹکڑے بہت پسند تھے۔ ممی کے منع کرنے کے باوجود وہ چوری سے اسکول میں برف کے یہ ٹکڑے کھایا کرتا تھا۔ پیاس کی شدت اور بڑھ گئی۔ وہ دروازے کے شیشوں پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ ہاتھوں میں درد ہونے لگا تو اس نے شیشوں سے اپنا سر ٹکرانا شروع کر دیا۔ تمام پیشانی نیلی پڑ گئی۔ لیکن شیشوں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ شام ہونے لگی تھی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کے سائے لمبے لمبے ہو گئے ——— آئس کریم والا برف کا آخری ٹکڑا پاس کھڑے ہوئے ایک بھکاری بچے کے ہاتھ میں تھما کر جانے لگا۔ بنکی نے سوچا وہ بچہ کتنا اچھا ہے اگر میں بھی بھکاری ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

اچانک اس کی نظر ایک کار پر پڑی، نارنجی کار، یہ اس کے ڈیڈی کی تھی۔ امید کی ایک جھلک آنکھوں میں چمکی اور کار کی تیز رفتار کے ساتھ دور تک چلی گئی۔ اس نے دیکھا کار میں ڈیڈی کے ساتھ ممی بھی بیٹھی ہیں۔ اور وہ بے چین نگاہوں سے سڑک کے دونوں طرف نہ جانے کیا ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ اس نے پوری طاقت سے "ممی ممی" پکارنا چاہا۔ لیکن آواز اس کے منہ سے باہر بھی نہ نکل سکی۔ کار آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

ہر طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ سڑکوں پر بجلی کے بلب روشن ہو گئے۔ اندر کی تاریکی زیادہ بڑھ گئی۔ کمرے کے کسی کونے سے جھینگر کی خوفناک آواز نے اس کے بدن میں لرزا سا پیدا کر دیا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کو محسوس ہوا گویا تمام دیواروں پر وہی بے جان کھلونے رینگ رہے ہیں۔ اور ان کی بے شمار باریک باریک ڈراؤنی آنکھیں اس کو گھور رہی ہیں۔ اس نے آنکھیں کس کے بھینچ لی۔ کمزوری سے اس کو چکر آ گیا پاؤں ڈگمگائے جسمانی قوت جواب دے چکی تھی۔ سنبھلنے کی کوشش بھی کی لیکن سنبھل نہ سکا۔ اور بینچ

ے مضبوط فرش پر سر کے بل گر گیا۔ ماتھے سے خون بہنے لگا۔ اس کی آنکھیں ٹھٹھر گئیں۔ ہاتھ پاؤں تن گئے، دانتوں کے بیچ زبان پھنس کے رہ گئی، سوکھے ہوئے حلق میں گڑ گڑاہٹ سی ہونے لگی۔
"پانی ـــــــ پانی" وہ بے آواز پکار رہا تھا ـــــــ ٹھٹھری ہوئی نیم جان آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ چھت بیچ میں سے پھٹ گئی ہے۔ سارا کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔ جھلملاتے ہوئے تاروں کی ایک سیڑھی کمرے میں اتر آئی۔ اس سے چھم چھم کرتی لال پری بالکل سرخ ملائم لباس پہنے اتری۔ اور پنکی کی طرف مسکراتی ہوئی دیکھنے لگی۔ پنکی تکلیف کے باوجود اس کو دیکھ کر مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ پھر لال پری نے اپنے ہاتھ کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ پنکی نے جھپٹنا چاہا۔ لیکن اس کے ہاتھ اٹھ نہ سکے۔ پھر بڑے پیار سے لال پری نے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور اس کو گلاس کا شربت پلانے لگی۔ پنکی نے آج تک ایسا شربت نہیں پیا تھا۔ اتنا ٹھنڈا، تنا میٹھا۔ برف کے رنگین ٹکڑوں سے بھی زیادہ مزے دار ـــــــ اس کے پیتے ہی ساری بھوک پیاس مٹ گئی۔ اس کے جسم میں نئی توانائی آگئی۔ ساری تکلیفیں ایک دم دور ہو گئیں۔
"تم کتنی اچھی ہو لال پری، میری ممی بہت خراب ہیں۔" اس کو بات کرتے ہوئے ذرا بھی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ آواز بھی بالکل صاف تھی۔ "تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو، میں اب ممی ڈیڈی کے پاس ہیں جانا چاہتا۔ کبھی نہیں۔"
لال پری نے اس کو گود میں اٹھا لیا۔ محبت سے چوما۔ اور جھلملاتے ہوئے تاروں کی سیڑھی پر چڑھنے لی۔ پنکی اوپر اٹھتا ہوا دیکھ رہا تھا کہ اس کے ممی ڈیڈی کا گھر شہر کے بہت سے لوگوں سے بھرا ہے۔ سب لوگ خاموش ہیں۔ ممی کی آنکھیں روتے روتے لال ہو گئیں ہیں ـــــــ لوگ انہیں دلاسہ دے رہے ہیں۔ ڈیڈی ایک طرف ہچکیاں بھر رہی ہے ـــــــ اور سڑک پر لوکل اخبار بیچنے والا بلا رہا ہے۔
"ایک چھ سال کے کھوئے ہوئے بچے کو پانے پر ۲۰ ہزار روپئے نقد انعام ـــــــ آج کی تازہ خبر ـــــــ" ▢

خورشید احمد شمسی
اسحاق نیوز ایجنٹ، ریلوے روڈ
خانپور، ضلع رحیم یارخان (پاکستان)

ہمارا المیہ

ہم دونوں سہیلیاں لان میں بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں۔ ہمارے سامنے ٹیبل پر چائے کے برتنوں سے ذرا پرے اپنے ملک میں چھپنے والے تمام ادبی جرائد کے تازہ شمارے پڑے تھے اور ہماری نگاہیں ہر چسکی کے ساتھ ان رسائل کی طرف اٹھ جاتی تھیں جن میں سے کسی ایک کے سرورق پر بھی ہماری شبیہہ نہیں تھی۔ ہر رسالہ کا ٹائیٹل تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ تھا مگر ——— شاید اب ہم ادب کی مالائیں پروئے جانے والے سچے موتیوں کی حیثیت کھو چکی تھیں!

"ہماری یہ حیثیت بلکہ حق کس نے چھینا ہے اور کیوں چھینا ہے؟" میں نے خود کلامی کی صورت میں اپنے آپ سے سوال کیا۔ میری سہیلی چونک پڑی، جو عمر میں مجھ سے کم و بیش پانچ برس بڑی تھی۔

"کیسی حیثیت؟ کیسا حق؟ کس نے چھینا؟" اس نے مجھ سے دریافت کیا!

"اپنی کہی ہوئی بات بھول بیٹھی ہو؟ وہ بات جو آج سے پانچ برس پہلے تم ہی نے مجھ سے کہی تھی، جس کی اس وقت نہایت غیر محسوس طریقے سے ابتدا ہو رہی تھی۔ اس وقت تو تم نے اسے محسوس کر لیا مگر اب پانچ برس بعد ——— جب وہ تحریک اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے، تم فراموش کر بیٹھی ہو؟!" میں نے سوال کے جواب میں سوال کیا!

"نہیں! بھولی نہیں، در اصل میں بھی ان رسائل کے تجریدی شاہکار دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی البتہ ——— تمھارے بارے میں میں نے یہ سوچا تھا کہ تم کسی اور مسئلہ کے بارے میں بات کر رہی ہو! آج کے جدید افسانہ نگاروں نے تو ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح ادب سے نکال باہر کیا ہے! محبوبہ تو کجا ——— بیوی، بیٹی، بہن اور ماں کی صورت میں بھی کہیں ہمارا ذکر نہیں!" وہ بولی!

"اب صرف تجرید اور سیاست ان کے موضوعات ہیں، لیکن سیاست میں تو ہم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، پر اس صورت میں بھی ان لوگوں نے ہمیں اپنے لفظوں میں محفوظ نہیں کیا اور نہیں تو سیاست کے حوالہ سے ہی اس ناطہ ہمارا ذکر ہو جاتا کہ ہمارے ہمسایہ ملک کی سربراہ ایک عورت ہے

یہ خود تو سیاست دانوں کے ہاتھوں میں کھلونے بن چکے مگر ــــــ ہمیں تو یہ اہل قلم کھلونا بھی نہیں سمجھتے کہ اپنے دل بہلاوے کے لئے ہمارا ابھی دل رکھ لیتے!" میں نے کہا۔

"وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہم ان لوگوں کے دلوں کی دھڑکن تھیں۔ ہمارے نام سے ہی یہ اپنے افسانوں کی ابتدا کرتے تھے اور ہمارے نام پر ہی خاتمہ لیکن اب انھوں نے ایسا چکر چلایا ہے کہ ان رسائل کے قارئین کے ذہنوں سے بھی ہمارا نام مٹا دیا ہے، آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ، پانچ برس کے عرصے میں!" اس نے کہا! ذرا توقف کے بعد وہ پھر بولی!

"پانچ برس پہلے صرف تم نے ادب میں اس غیر معمولی تبدیلی کو محسوس کیا تھا اور مجھے احساس دلایا تھا مگر اب ــــ اب چادر میں لپٹی ہوئی ہر لڑکی اور چار دیواری میں رہنے والی ہر عورت پر اس ہولناک سازش کا انکشاف ہو چکا ہے اس کا خون کھول رہا ہے، دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں مگر ــــ" میں نے بات اس سے لیتے ہوئے کہا!

"مگر فلک کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ گو ان سے ہمارے ان جذبات کے اظہار کا قطعی کوئی تعلق نہیں! پھر بھی ہم ان بھڑکتے شعلوں کا دھواں تک نہیں اگل سکتیں، ہمارے سیاست دان سمجھیں گے کہ ہم نے وہ آگ بھڑکائی ہے جس میں نہ صرف چادر اور چار دیواری جل کر راکھ ہو جائے گی بلکہ ہر گھر ہر گلی، ہر محلہ، ہر بازار حتیٰ کے سارا ملک اس آگ کی لپیٹ میں آجائے گا اور سڑکیں خون کے دریا بن جائیں گی!"

"لیکن یہ ہمارا عورت کے ناطہ سے ذاتی معاملہ ہے، جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں" وہ سسکی لیتے ہوئے بولی۔

"واقعی نہیں! واقعی نہیں! مگر سیاست دان تعلق خود بخود قائم کر لیں گے! جس طرح کسی نوزائیدہ ملک سے قائم کر لیتے ہیں! یہ ان کا مشغلہ ہے" میں بولی۔

"ان کے مشغلہ کے احترام میں ہم ــــ ہماری پوری قوم کی عورت برادری اس آگ میں جلتے رہنے کا کرب اور خون کے گھونٹ پیتے رہنے کا دکھ ایسے روگ ہمیشہ پالتے رہنے کے لئے تیار نہیں میرا خیال ہے کہ اگر ہم سر مو بھی حرکت دے دیں تو تمام ملک کی لڑکیاں اور عورتیں ــــ چادر اور چار دیواری کو ایک طرف رکھ کر گلیوں اور بازاروں میں نکل آئیں گی، ملک کے ان افسانہ نگاروں کو یہ یاد دلانے کے لئے ہمارے بغیر ان کے افسانے تو مکمل ہو سکتے ہیں مگر یہ کائنات نامکمل ــــ اور 'تو اور' خود ان کی اپنی ذات کی تکمیل ممکن نہیں! پھر انھوں نے کیوں ہمیں قومی ادب سے دودھ کی مکھی کی طرح

نکال باہر کیا؟" اس کے لہجہ میں اپنی محرومی کے باعث انتقامی جوش نمایاں تھا!

"اس کام کے لئے موقع مناسب ہے تو یہی ہے کہ اکادمی ادبیات کے ہال میں کسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے پورے ملک کے دائیں بازو اور بائیں بازو کے افسانہ نگاروں کا مشترکہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے کل ۔۔۔ اگر ہم شہر بھر کی عورتیں اور ہماری لڑکیاں جلوس کی صورت میں اس عمارت تک پہنچ جائیں تو شاید وہ ہمیں ۔۔۔ ہماری حیثیت، ہمارا حق واپس دینے پر مجبور ہو جائیں جو انھوں نے اپنے ضمیر کی طرح چند سکّوں کے عوض سیاست کے ہاتھ بیچ دیا ہے!" میں بولی۔

"مگر جلوس ۔۔۔؟" وہ ہچکچائی۔

"ہاں ہاں جلوس ۔۔۔ یہاں کے اکادمی ادبیات کے ہال تک! ہم شور نہیں مچائیں گی، دنگا نہیں کریں گی، خاموشی سب سے بڑی زبان ہے!" میں بھی جوش میں آگئی تھی! میں نے چائے کی پیالی میز پر پٹختے ہوئے کہا۔

"مگر ہماری یہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش بھی کی جا سکتی ہے!" اس نے خدشہ ظاہر کیا!

"نہیں آفیسر تدبر کا مظاہرہ کریں گے! ۔۔۔ تم آدھے شہر کی عورتوں کو جگاؤ! آدھے شہر کی عورتوں کو میں بیدار کرتی ہوں!" میں نے کہا!

"ٹھیک ہے!" اس نے ہاں ملائی!

اتفاق رائے کے بعد ہم اپنے اپنے حصہ کا کام سرانجام دینے کے لئے چل نکلیں! ہمیں گھر گھر دستک نہیں دینی پڑی۔ صرف اذان ہی کافی رہی لیکن ۔۔۔

صبح کی اذان سے پہلے قبل از بیداری میں نے دیکھا کہ سارے شہر کی لڑکیاں اور عورتیں کوٹھی میں جمع ہیں۔ لان کمرے اور چھت کھچا کھچ بھرے تھے۔ ہزاروں کی تعداد تھی۔ خاموش جلوس بغیر بینرز اور کتبوں کے تیار کھڑا تھا سڑکوں پر نکلنے کے لئے ۔۔۔ اکادمی ادبیات کے ہال تک پہنچنے کے لئے ۔۔۔ مجھے اس کی قیادت کرنی تھی کیوں کہ یہ تحریک چلائی ہی میں نے تھی۔ چنانچہ میں جلوس کی قیادت کرتے ہوئے کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکلی ہی تھی کہ سامنے تیار کھڑے ٹوپی والوں نے گولی چلادی! میرا سینہ چھلنی ہو گیا اور میں ۔۔۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر اٹھ بیٹھی!

میری سہیلی نے دیکھا کہ گولی اس کے سینہ میں لگی ہے، اس اشتعال انگیزی پر جلوس بپھر گیا۔ لڑکیاں اور عورتیں خاموش جلوس کے خلاف اس کارروائی پر سیخ پا ہو گئیں جو حکومت کے خلاف نہیں تھا جو حکومت سے نہیں بلکہ افسانہ نگاروں سے اپنا حق مانگنے کے لئے نکالا گیا تھا، پھر کیا تھا؟

اس کی لاش اٹھائی گئی یہ اور بھی کام کی بات ہوئی تھی میٹنگ میں موجود افسانہ نگار ایک عورت یا ممکنہ طور پر زیادہ عورتوں کی قربانی دیکھ کر ہمیں ہماری حیثیت بلکہ ہمارا حق واپس دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ان کا ضمیر بیدار ہو جائے گا۔ وہ انگلیاں بھی کانوں میں دیں گے تو ہماری آہ و بکا اور گولیوں کی تڑ تڑ ان کے ذہنوں پر ہتھوڑے کی طرح لگے گی اور ــــ وہ پھر سے ہمارے بارے میں پہلے سے زیادہ شد و مد سے افسانے لکھیں گے۔ یہی ہم چاہتی ہیں!

اس نے یہ خواب دیکھا تھا اور میں نے وہ! ــــ چنانچہ وہ چاہتی کہ جلوس کی قیادت وہ کرے اور عورت برادری میں سرخرو ہو!

جب کہ میں چاہتی تھی کہ جلوس کی قیادت میں کروں اور اس کی کامیابی کا سہرا میرے سر ہو!

کوٹھی کا لان، کمرے اور چھت عورتوں سے بھری پڑی تھی۔ گیٹ پر ایک آدمی نمودار ہوا، اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹوپی سر پر رکھ لی۔ یہ "چھپ چھپا کی طلسماتی ٹوپی" تھی جسے پہن کر آدمی دوسروں کو نظر نہیں آتا وہ جلوس میں موجود دوسری لڑکیوں اور عورتوں کو نظر آئے بغیر ــــ میرے پاس آیا اور کہنے لگا!

"اس تحریک کی بانی تم ہو! لہذا جلوس کی قیادت پر تمھارا حق مقدم ہے!"

میں نے یہی الفاظ اپنی سہیلی سے کہے تو وہ بولی!

"تم سے پانچ برس پہلے میں نے اس کا خیال دیا تھا ــــ میں ہی بانی ہوں ــــ جلوس کی قیادت پر میرا حق مقدم ہے"

"ٹھیک ہے لیکن اس کی تجدید میں نے کی، میں نے ہی اس میں روح پھونکی!" میں نے اصرار کیا اور یوں ــــ تاریخ میں اپنا اپنا نام لکھوانے کے لئے ہم میں تلخ کلامی ہو گئی! ہم دونوں تلخ کلامی سے ایک قدم آگے بڑھیں تو ہمیں اپنے اپنے خواب مجسم نظر آنے لگے لیکن اس طرح کہ ٹوپی والوں کی گولیوں کے بجائے ایک دوسرے کے ہاتھوں خون ہو جائیں! ــــ دو عورتیں ایک دوسرے کا خون کر دیں، معاملہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا چنانچہ میں اس راستہ پر چل نکلی جو کوٹھی سے باہر جاتا تھا۔

وہ بھی میری ہی طرح اکیلی باہر نکل آئی۔ اسے میری شرکت کے بغیر نامکمل جلوس کی قیادت کرنا منظور نہ تھی۔ یہ غالباً اس کے ضمیر کی آواز تھی!

شہر بھر کی لڑکیاں اور عورتیں دیکھتی رہ گئیں کہ شاید کوئی اور لڑکی، کوئی اور عورت آگے آئے، مجمع کی آنکھیں راہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔

اس سے پہلے کہ اتنے طویل وقت میں کوئی لڑکی، کوئی عورت ہماری جگہ لینے آتی اور جلوس کوٹھی سے نکل کر اکادمی ادبیات کے ہال تک پہنچتا وہاں منعقد ہونے والا ــــ دائیں بازو اور بائیں بازو کے افسانہ نگاروں کا جلسہ ختم ہو گیا! □

علی حیدر ملک
کراچی، پاکستان

مختصر افسانہ اور نظریے کی بیخ

مختصر افسانہ ایک فن ہے اور نظریہ اس کی بیخ !
لیکن ٹھہریئے۔ مختصر افسانے کی باری تو بعد میں آتی ہے۔ پہلے تو اسی بات پر غور اور بحث کی ضرورت ہے کہ کیا کسی فن یا فنون لطیفہ کا مقصد نظریئے کا اظہار ہوتا ہے اور کیا یہ دونوں یعنی فن اور نظریہ لازم و ملزوم ہیں ؟ موجودہ دنیا میں تقریباً ہر جگہ ہر زبان میں جہاں کچھ ایسے فن کار نظر آئیں گے جنھوں نے اپنی نظریاتی بنیاد پر اصرار کیا ہے وہاں بے شمار ایسے فن کار بھی دکھائی دیں گے جن کے ہاں کسی نظریے کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں ہے۔ بظاہر اس سے معاملہ الجھتا نظر آتا ہے لیکن ذرا غور کیجئے تو کم سے کم یہ بات تو ثابت ہو ہی جاتی ہے کہ نظریہ فن کی سرشت میں شامل نہیں ہے اور یہ محض ایک اضافی چیز ہے ورنہ دوسری قسم کے فن کاروں کا سرے سے کہیں وجود نہ ہوتا۔

نظریہ کوئی بھی ہو اور کیسا بھی ہو مگر ہر نظریہ ساز یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے زندگی کی مکمل تشریح و تعبیر کر دی۔ مگر زندگی زبان حال سے ہر ایسے دعوے کو پیہم جھٹلاتی اور باطل قرار دیتی رہتی ہے کیونکہ زندگی تو بتوں کی مانند بلکہ اُن سے بھی زیادہ بہت سارے ایسے شیووں کی خالق و امین ہے جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ زندگی کی بوقلمونی اور بے کرانی کسی فارمولے میں قید نہیں ہو سکتی۔ ہر جامہ اس پر تنگ نظر آتا ہے۔

اب آئیے مختصر افسانے کی طرف۔ مختصر افسانہ ادب کی ایک صنف ہونے کے باوجود اپنی ماہیت اور تقاضوں کے اعتبار سے دیگر اصناف سے مختلف ہے۔ اس میں فنی طور پر جتنی بھی تبدیلیاں رونما ہو جائیں لیکن اس کی اس بنیادی صفت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی کہ یہ زندگی کا صرف ایک رخ پیش کرتا ہے۔ اس لئے افسانہ نگار کو زندگی کے ہر رخ، ہر رنگ کی تصویر کشی پر آمادہ اور قادر ہونا چاہئے۔ نظریئے کی عینک سے ایک طرف جہاں وہ کلر بلائنڈ ہو جاتا ہے وہاں

دوسری طرف جان لیوا یکسانیت کا بھی شکار ہوتا ہے۔ افسانہ اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس میں انسان کے ان اعمال اور زندگی کے ان مظاہر کا بھی احاطہ کیا جائے جو اپنی تفسیر یا جواز آپ ہی ہیں۔ ایک خدا پرست شخص کی خدا پرستی کے علاوہ اس کی زندگی میں در آنے والے لمحۂ کفر کو بھی موضوع بنایا جائے۔ ظالم کی زندگی کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی جائے جس میں وہ مظلوم نظر آتا ہے۔ سرمایہ دار کی مزدور دشمنی کے ساتھ مزدور کی مزدور دشمنی کو بھی بے نقاب کیا جائے۔ گویا افسانے کی صنف اپنی نوعیت کے لحاظ سے جزو کو پیش کرتی ہے اور ضروری نہیں کہ جزو ہمیشہ کل سے مطابقت ہی رکھتا ہو۔

نظریہ سازی اور نظریہ بازی رواں صدی کی دین ہے مگر ہمارے ادب میں اس کا غلغلہ بعض وجود کی بنا پر چوتھی دہائی میں بلند ہوا ـــــــ مگر پھر بہت جلد ہی اس کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

اردو افسانے کی تاریخ میں ہم نے دیکھا کہ منٹو، بیدی اور غلام عباس کو ابتدا میں خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا سبب ان کا نظریئے کی بجائے اپنی نظر پر اصرار تھا۔ مگر ذرا بیٹھی تو یہی لوگ جو نظریہ پسندوں کی نظر میں معتوب تھے اردو افسانے کی بلند ترین مینار قرار پائے۔ پریم چند اور کرشن چندر کی تمام خوبیوں کے باوجود جس چیز نے انھیں نقصان پہنچایا وہ یہی نظریہ بازی تھی۔ اگر یہ اپنے نظریئے پر اس قدر اصرار نہ کرتے تو یقیناً ان کا فن زیادہ بلند اور وسیع ہوتا۔ اب بھی دراصل ان کی عظمت کا دارومدار بیشتر ایسی کہانیوں پر ہے جن میں انھوں نے اپنے نظریات کو یا تو بھلا دیا ہے یا انھیں پس پشت ڈال دیا ہے۔

آج کل ہر طرف کومٹ منٹ کی اصطلاح سننے میں آ رہی ہے۔ جس کو دیکھو نئے لکھنے والوں پر الزام لگا رہا ہے کہ ان کی کوئی کومٹ منٹ نہیں ہے۔ ہائے واویلا کر رہا ہے کہ دیکھو یہ کیسے ادیب و شاعر ہیں جو کومٹ منٹ سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ کومٹ منٹ بھی دراصل نظریئے ہی کا شاخسانہ ہے۔ ہوا یہ کہ نظریئے کی اصطلاح جب ادب کے بازار میں پٹ گئی تو ایک ـــــ ذرا نرم اور نئی اصطلاح کے ذریعہ حصولِ مقصد کی کوشش از سرِ نو شروع کر دی گئی۔

نئی نسل کے لوگ جب اپنے نان کومیٹڈ ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب ـــــ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سیاسی نظریئے یا جماعت سے وابستہ نہیں ہیں۔ نئی نسل نے یہ موقف تاریخ کے مطالعے اور تلخ تجربات کی روشنی میں اختیار کیا ہے۔

کومٹ منٹ کا واسطہ دینے والوں کا یہ کہنا کہ کومٹ منٹ کا اطلاق صرف
یاست پر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر بات پر ہوتا ہے۔ کج فہمی کی دلیل ہے۔ اس
ت کو سمجھنے کے لئے ایک مثال پر غور کیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ فیض مساوات کے قائل ہیں جس
مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اقتصادی مساوات چاہتے ہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمام
نسانوں کو ہر معاملے میں مساوی سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کیا وہ شاعری میں بھی مساوات
کے اصول کے تحت غالب اور داغ کو ایک ہی صف کا شاعر قرار دیں گے ؟ ظاہر ہے کہ
یسا ممکن نہیں۔ مساوات کا تصور فیض کے ہاں ایک خاص شعبے تک محدود ہے۔ اسی طرح
ومٹ منٹ کا مفہوم بھی محدود ہے۔ بغیر سوچے سمجھے ہر جگہ اس کا استعمال اور مطالبہ کوئی
دانش مندانہ بات نہیں۔

اس ضمن میں سیاسی شعور کا سوال اٹھانے والے حضرات کو بھی یہ نکتہ پیش نظر رکھنا
چاہئے کہ سیاسی شعور اور چیز ہے اور سیاسی وابستگی اور چیز۔ اور نئے ادیبوں نے سیاسی شعور
ہی کی بنا پر اپنا ذہن کسی سیاسی نظریئے یا جماعت کے پاس گروی رکھنے سے انکار کیا ہے۔

یہاں تک تو گفتگو اصولی بنیاد پر ہو رہی تھی۔ اب آئیے دیکھیں کہ مختصر افسانے اور
نظریئے کے تعلق سے ہمارے افسانہ نگار کیا کہتے ہیں۔

سب سے پہلے انتظار حسین کو لیجئے۔ فرماتے ہیں ——

"حاصل کی پروا کرنے والے کہتے ہیں کہ صرف وہ عمل بامعنی ہے جس کا کچھ
حاصل ہو اور کہانی کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ لیکن میں اپنی بکھری ہوئی مٹی
کا اسیر ہوں۔ مجھے اس سے مفر نہیں ہے"۔

(فلیپ : شہر افسوس)

جوگندر پال اعلان کرتے ہیں کہ ——

میرے ان گنت نظریات ہیں تاہم میرا ادبی نظریہ ایک بھی نہیں۔
ادبی نظریوں سے ادیب تعصبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی زندہ افسانے
میں نظریئے افسانہ نگار کے نہیں اس کے کرداروں کے ہوتے ہیں"۔

(پس لفظ۔ رسائی)

محمد منشا یاد کا خیال ہے کہ ——

"ادب کتابوں کا مطالعہ۔ علم اور مشق سے بھی لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن تخلیقی ادب کے لئے ضروری ہے کہ وہ براہ راست زندگی کی کتاب کے مطالعہ کے نتیجہ میں پیدا ہو۔ اسے مخصوص نظریات کے گملوں کے بجائے زمین پر آزادانہ نشو ونما کا موقع ملے اور اس کی دیکھ بھال اور تراش خراش میں خون جگر شامل ہو"۔

(کچھ باتیں۔ بند مٹھی میں جگنو

تقی حسین خسرو کہتے ہیں کہ ــــــــ

"اب یہ کہنا شاید ضروری نہیں کہ میں نے افسانہ نگاری کسی تحریک سے متاثر ہو کر یا محض بطور فیشن اختیار نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں منصوبہ بندی کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے اور یہی "کوندے" کی وجہ تسمیہ بھی ہے"۔

(حرفِ آغاز۔ کوندے

اس طرح کے بے شمار اقتباسات اور بھی دیئے جا سکتے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے اس سلسلے کو یہیں ختم کر دیتا ہوں۔

اب ایک فطری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فن افسانہ کے عاملین جب نظریئے کے قایل نہیں ہیں تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو اس پر اصرار کرتے ہیں ؟ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں یہ وہ نیم ادیب، صحافی اور سیاسی کارکن ہوتے ہیں جو تخلیق کی فنی نوعیت اور جمالیاتی تقاضوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور اپنی گھسی پٹی سطحی باتوں میں زور اور وزن پیدا کرنے کے لئے مستقل نظریہ نظریہ کی ہانک لگاتے رہتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ لوگ اپنا اصل مدعا پوشیدہ رکھ کر بڑی دردمندی بلکہ رقت کے ساتھ زندگی اور معاشرے کی دہائی دینے لگتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ادیب یا افسانہ نگار کو معاشرے کا ایک باشعور فرد ہونے کے ناطے یہ چاہیئے کہ وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرے۔ انسانوں کے درمیان عدل مساوات اور اخوت کو فروغ دے وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں پیش پا افتادہ ہونے کے باوجود بہ صحیح ہیں لیکن کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ ادیبوں کے علاوہ بقیہ تمام لوگ ظلم کے حق میں ہیں وہ بے عدلی، عدم مساوات اور انسانوں کے درمیان عداوت کے پیرو ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں؟

بات یہ ہے کہ ادیب کے لئے جو صفات ضروری قرار دی جاتی ہیں وہ اصل میں ہر انسان، ہر صحیح الدماغ اور باشعور انسان کے لئے لازمی ہیں۔ اس کے لئے ادیب یا افسانہ نگار ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ افسانہ نگار بھی معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت میں دوسرے لوگوں کی طرح حق کا پرستار، ظلم کا مخالف اور امن کا خواہاں ہوتا ہے۔ افسانہ نگار ہونے کے ناطے اس پر کوئی اضافی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

افسر آذر نے لکھا ہے کہ ــــــ

"مجھے ظلم کی ہر شکل سے نفرت ہے خواہ وہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر قومی سطح پر یا عالمی سطح پر۔"

(شکائتیں ــــــ اجلا انسان میلی روحیں)

بلاشبہ ان الفاظ کے ذریعہ افسر آذر نے ایک باشعور فرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن کیا وہ لوگ جو نظریہ کی اہمیت کے قائل ہیں اس کی بنا پر اسے نظریاتی فن کار ماننے کو تیار ہوں گے؟ ــــــ ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ نظریئے سے مراد وہ ہمیشہ سیاسی نظریہ لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ افسر نے "شکائتیں" میں کسی سیاسی نظریئے کا نہیں اپنے ضمیر کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ ــــــ "کالن ولسن نے آؤٹ سائڈر میں فن کاروں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ خود کو کسی سے وابستہ نہ کریں بجز اپنے ضمیر کے۔"

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس ــــــ شمیم حنفی)

اور ضمیر دنیا کی ہر شے سے اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے۔

وہ ضمیر ہی کیا جو کسی نظریئے کا اسیر ہو؟ □

مُصیبت سے بچیے
خون کو صَاف کیجیے

خون صاف کرنے کی
قدرتی دوا

خون کی خرابی سے کیل مہاسے، پھوڑے پھنسیاں اور جلد کی دوسری تکلیفیں آپ کو پریشان کرتی ہیں، چہرے کے نکھار کو بگاڑتی ہیں۔ اِن سب شِکایتوں کو دُور کرنے کا کامیاب ذریعہ ہے صافی!

صَافی معدہ اور آنتوں کی اصلاح کرکے خون کو صَاف کرتی ہے اور خون کی صفائی ہی ان شکایتوں کا اصل علاج ہے۔ صَافی میں شامل ۲۴ جڑی بوٹیاں اور دوسرے اہم اجزا آپ کی جلد کو صاف، نرم اور خوب صورت بناتے ہیں۔

صافی بے فکر ہو کر استعمال کیجیے۔ اِس سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

SAFI

صَافی

ہمدرد

خون کو صَاف کرتی ہے۔ جِلد کو نِکھارتی ہے

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ (ادارہ)

اردو افسانہ ــــ روایت اور مسائل ● مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ

● مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ● صفحات ۷۴۳ ● قیمت ۷۵ روپے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اردو افسانہ سیمنار ۱۹۸۰ء میں پڑھے گئے مقالات نیز افسانے سے متعلق بعض دیگر مضامین کو یکجا کر کے پروفیسر نارنگ نے یہ ضخیم مجموعۂ مضامین مرتب کیا ہے اور اردو کے معروف اشاعتی ادارے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو اعلیٰ درجے کے کاغذ پر آفسیٹ سے شایع کر کے بڑی بلند ہمتی کا ثبوت دیا ہے۔ اس دیدہ زیب کتاب کی ترتیب و اشاعت کے لئے مرتب اور ناشر شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سال گزشتہ اردو افسانے پر سیمنار منعقد کر کے جامعہ ملیہ کے شعبۂ اردو نے وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ اس سیمنار سے اردو افسانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کو سمجھنے میں بہت مدد ملی ہے۔ ادب کا کارواں ہر آن آگے بڑھتا رہتا ہے اور ہر صنف ادب تغیر سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ ادب میں یہ تبدیلیاں بالعموم سست رفتار اور غیر محسوس ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ اتنی تیز رفتار اور ایسی نمایاں ہوتی ہیں کہ کسی صنفِ ادب کی شناخت کے سارے وسائل بیکار اور اسے پرکھنے کے تمام معیار ناقص ہو جاتے ہیں۔ پچھلی دہائیوں میں اردو افسانے کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔ انتظار حسین کے الفاظ میں "بزرگوں نے افسانہ لکھنے کے جو جو نسخے بتائے تھے (ہمارے نئے افسانہ نگاروں نے) ان سب کو طاق میں رکھا اور دوسری طرح کا افسانہ لکھنے کی کوششیں ہونے لگیں.... اس کے لکھنے کے جو ضابطے بنے تھے، ادب آداب طے ہوئے تھے وہ ملیامیٹ ہو گئے۔ نہ پلاٹ رہا، نہ سسپنس، نہ کلائمکس"۔ افسانہ جس حصار میں مقید تھا اسے توڑ ڈالنے کے بعد وہ بے حد وسیع، توانا اور لامحدود ہو گیا ہے۔ اب افسانے کے لئے نہ پلاٹ ضروری ہے نہ کردار، نہ وحدتِ تاثر اور نہ بعض کے نزدیک کہانی پن۔ اس لئے اب یہ سوال بار بار پوچھا جاتا ہے کہ آج افسانہ کسے کہا جائے۔ خاص طور پر یونی ورسٹی کے استاد کو اس سوال سے مفر

نہیں۔ جامعہ کا یہ سہ روزہ سیمنار گویا اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اس سیمنار میں ہند و پاک کے علاوہ بعض دوسرے ملکوں کے دانش ور، نقاد اور افسانہ نگار شریک ہوئے۔ اس میں صنفِ افسانہ سے متعلق تمام اہم مسائل زیرِ بحث آئے اور ان کے بارے میں نتیجہ خیز باتیں کہی گئیں۔

سیمنار میں اردو کے عہد ساز افسانہ نگاروں پر علیحدہ سے گفتگو ہوئی اور مقالات پیش کئے گئے۔ سیمنار کا پہلا اجلاس پریم چند کے لئے مخصوص کیا گیا تھا لیکن مرتب نے کتاب کے گوشۂ پریم چند کو زیادہ مکمل بنانے کے لئے پہلے لکھے گئے مضامین بھی شامل کر دیئے ہیں جن میں پروفیسر احتشام حسین کا مضمون "پریم چند کی ترقی پسندی" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسی طرح عہد ساز افسانہ نگاروں کے لئے کتاب میں جو سیکشن مخصوص کیا گیا ہے اس میں بھی کچھ پرانے اہم مضامین شامل ہیں مثلاً منٹو کے فن پر ممتاز شیریں کا مضمون جو غالباً عرصۂ دراز تک منٹو کو سمجھنے میں معاون رہے گا یا خود پروفیسر نارنگ کا مضمون "بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں" جو افسانے پر ان کی گہری نظر کا پتہ دیتا ہے۔ کتاب میں جہاں خلا رہ جانے کا اندیشہ تھا اسے پر کرنے کے لئے نارنگ صاحب نے خود قلم اٹھایا ہے۔ اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔

کتاب کے آخری ڈھائی سو صفحات نئے افسانے کی تفہیم و تجزیے کے لئے وقف ہیں اور حاصل کتاب ہیں۔ اس حصے میں وہ مقالات شامل ہیں جن میں افسانے کے ناقدین نے نئے افسانے سے متعلق پیچیدہ اہم مسائل پر بے باکانہ اظہار خیال کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا ہے کہ افسانے میں انحراف کے نقوش اتنے شدید اور اتنے گہرے نہیں ہیں جتنے شاعری میں۔ ان کے نزدیک اس کے اسباب یہ ہیں کہ اردو میں آج بھی شعر کی طرف توجہ زیادہ ہے افسانے کی طرف کم۔ دوسرے شاعری میں افسانے کی بہ نسبت زیادہ بہتر ذہن بڑی تعداد میں موجود ہیں اور تیسری بات یہ کہ افسانے کی زبان پر آج تک شعر کا جادو کام کر رہا ہے۔ شعر و افسانے کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ بات اکثر کہی گئی ہے کہ شاعری کی طرح افسانہ زمان و مکان سے کلیتاً آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے شاعری افسانے سے بلند تر ہے (حالانکہ شاعری کا بھی بیشتر حصہ زمان و مکاں کا اسیر ہے) بہرحال اس سلسلے میں "نیا افسانہ: روایت سے انحراف" میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ فکشن کتنا ہی تجریدی کیوں نہ ہو اس کو کہیں نہ کہیں زمین پر پیر ٹکانے ہی پڑتے ہیں اور کسی نہ کسی زمانے میں سانس لینی ہی پڑتی ہے۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ نثر اور شعر کے درمیان ایک اونچی دیوار حائل تھی تاہم بعض اصناف میں شعر و شاعری ایک دوسرے کی طرف بڑھتی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر یہ دونوں اس طرح آپس میں گتھ جاتی تھیں کہ ان کا علیحدہ کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اسی نقطۂ اتصال کو نارتھروپ فرائی نے CONTI-NUUM کا نام دیا ہے لیکن یہ خیال عام تھا کہ فکشن کا میدان خالص نثر ہے۔ افسانے کو شعر کی طرح ایک اکائی نہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے مواد و ہیئت کو ایک مکمل وحدت کے طور پر پرکھا جاتا تھا۔ لیکن جب افسانے میں منطقی رویے کا زور ٹوٹا اور استعارہ و علامت کا عمل دخل بڑھا تو وہ شعر کی حدوں میں داخل ہونے لگا۔

بلراج کومل نے شاعری اور فکشن کی ٹوٹتی ہوئی حد بندیوں کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ شعر نے سب سے بڑا حملہ فکشن پر یہ کیا ہے کہ منطقی اور قطعی رویے پر کاری ضرب پڑی ہے ... شعور اور وقت کا منطقی تسلسل درہم برہم ہو گیا ہے۔ اور استعارے کے در آنے سے فکشن کی حدیں منہدم ہو گئی ہیں۔
اسی موضوع پر اظہار رائے کرتے ہوئے محمود ہاشمی نے ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جو ذہن کو جھنجھوڑ ڈالتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ افسانے کو تخلیقی ادب کے دائرے میں کیوں شامل کیا جائے۔ وہ ادب یا لٹریچر یا آرٹ، شاعری، مصوری اور موسیقی کو مانتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "شاعری میں رمز، کنایہ، استعارہ، سمبل، امیج کو دخل ہے۔ اگر نثر میں یہ خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو ایسی نثر شاعری اور نثر کے درمیان ایک غیر فطری شے بن کے رہ جاتی ہے اور اگر یہ خوبیاں پیدا نہ ہوں تو ہم افسانے کو تخلیقی ادب کی حدود میں کیسے رکھ سکتے ہیں؟" پھر لکھتے ہیں "اب تک تو یہ ہوتا رہا ہے کہ بجائے شاعری کے ارتقا کے مطابق افسانے کے نہج بنانے کے ہم نے افسانوی نثر میں شعری فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو غیر فطری معلوم ہوتی ہے... ہمیں افسانے کے لئے ایسی زبان، اسلوب اور انداز اختیار کرنا چاہئے جس میں الفاظ معنی [illegible] کے پیکر کو چھوڑ کر اپنے پورے CHARACTERISTIC انداز سے صفحۂ قرطاس سے باہر نمودار ہوں اور ہمارا مقصد قصہ گوئی نہیں بلکہ محض تخلیق ہو جس میں ایک لطیف سی شعلگی ہوتی ہے۔ جہاں تعقل کا عمل SYMBOL کے بعد پیدا ہوتا ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہمارے افسانہ نگاروں میں سے کسی کو جیمس جوائس کی سی تڑپ میسر آجائے۔"
اس وقت کہانی کو جو سب سے اہم خطرہ درپیش ہے وہ کہانی سے کہانی پن کے اخراج کا ہے۔
یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ نئے افسانہ نگاروں نے جو لازوال کہانیاں تخلیق کی ہیں ان میں شاید کوئی بھی ایسی نہیں جس میں کہانی یا کہانی کی زیریں رو موجود نہ ہو خواہ وہ کہانی کتنی ہی نئی اور علامتی کیوں نہ ہو۔
پروفیسر نارنگ کہانی پن کے اخراج کو غیر افسانوی عمل بتاتے ہیں اور اسے قابل مذمت قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "ایک ایسے معاشرے میں جو پنچ تنترا اور کتھا سرت ساگر کی دھرتی سے تعلق رکھتا ہو اور جس کی ذہنی تشکیل میں الف لیلہ، طلسم ہوش ربا اور حکایات گلستاں کا بھی حصہ رہا ہو نیز جو زمانۂ قدیم سے قصے کہانی، حکایت اور داستان کا رسیا رہا ہو اور جس میں کہانی کی روایت کتھا اور حکایت سے جڑی ہوئی ہو۔ اس میں کہانی کتنی ہی نئی کیوں نہ ہو جائے وہ کہانی پن سے کلیتاً کیسے دامن چھڑا سکتی ہے؟" جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے کہ کہانی پن کے بغیر کہانی آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ وہ لکھتے ہیں "کردار اور واقعے کے باہم ردعمل کے نتیجے میں کہانی وجود میں آتی ہے لیکن کہانی کا کوئی مجرد وجود نہیں۔ طبیعیات کے باریک ترین ذرّوں کی طرح کہانی کو بھی صرف اسی وقت دیکھا جا سکتا ہے جب وہ حرکت میں ہوں۔ جب حرکت کہانی کے وجود کی شرط ٹھہری تو ظاہر ہے کہ کہانی پن سے مراد وہ صفت ہے جس کے ذریعے وہ آگے بڑھتی ہے۔"
زیر تبصرہ کتاب کے مرتب نئے افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد سے خاصے مایوس نظر آتے ہیں۔ انھیں گلہ ہے کہ نئے افسانے پر اوسط درجے کے ذہن کی یلغار ہے۔ علامتی اور تمثیلی کہانی بلا سوچے سمجھے

فیشن کے طور پر لکھی جا رہی ہے اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے اسے محض رواجاً اختیار کر لیا ہے۔ جو نئے افسانہ نگار فن کی آنچ سے محروم ہیں، جو فکر و احساس سے عاری ہیں اور جن میں نئے تجربوں کے فنی اظہار کی صلاحیت نہیں، انھیں پروفیسر نارنگ سیدھی سادی کہانیاں لکھنے کی صلاح دیتے ہیں کہ اب بھی اس میں بڑے امکانات پوشیدہ ہیں۔

غرض یہ کہ جامعہ کے اردو افسانہ سیمینار کو ہر لحاظ سے ایک یادگار سیمینار کہنا چاہیے۔ ہم ادارۂ الفاظ کی طرف سے اس اہم کارنامے پر پروفیسر نارنگ اور ان کے رفقاء و معاونین کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کو جامعہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کی مالی امداد کا اس سے بہتر مصرف ممکن نہ تھا۔ زیر تبصرہ کتاب کو اس سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور اتنی محنت اور کوشش سے اسے مکمل تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اب اس کتاب کی وجہ سے اردو افسانے کے مطالعہ میں سہولت ہو گئی ہے۔

کتاب کے ناشر اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے مالک جناب محمد مجتبیٰ خاں کی خوش ذوقی اور حوصلہ مندی کی داد دینی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود آرٹسٹ ہیں اور انھوں نے اپنی سلیقہ مندی سے اتنی ضخیم کتاب کو آرٹ کا ایسا شاندار نمونہ بنا کے پیش کیا ہے کہ اس زمانے میں اس سے بہتر اشاعت کا تصور ممکن نہیں۔ آج جب کہ بھدی کتابیں دن رات طبیعت کو بے مزہ کرتی رہتی ہیں اس کتاب کو دیکھ کر ایک عجیب مسرت آمیز حیرت سے دوچار ہونا پڑا اور کوئی آدھا گھنٹہ اس کے حسن ظاہری سے لطف اندوز ہونے اور اسے سراہنے میں صرف ہو گیا۔ مطالعے کے بعد اس معشوقِ خوش لباس کو اتنا ہی خوش قامت و خوب رو بھی پایا۔

—— نورالحسن نقوی

● میاں اطہر پرویز!

اگر تم یہ افسانہ نہ بھی نکالتے تو میرے لئے بڑی آسانی رہتی کہ اسے طاق پر رکھ دیتا جہاں مقدس الہامی کتابیں رکھ دی جاتی ہیں جنھیں کبھی کبھی ورائٹی کے لئے اتار کر چوم لیا جاتا ہے اور دوبارہ پھر طاق پر ——— کہ نہ الہامیات اپنی ناقص سمجھ میں آتی ہیں نہ آج کل کے تجریدی افسانے۔

مجھے کچھ تو "جنریشن گیپ" کا نعرہ خوفزدہ کر دیتا ہے اور کچھ اپنے گوش ہوش سے محرومی ڈرا رہی ہے کیوں کہ افسانہ پڑھنے کے لئے گوش ہوش لازماً درکار ہے اور ہم قدمائے کرام (بزعم خود شرفائے کرام) اس گوش ہوش سے محروم ڈیکلیئر کر دیئے گئے۔ کیا ہوا اگر ہم نے اس محرومی کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن کیا ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں ملتی اور اسے اس لئے نہیں بھگتنا پڑتا کہ وقت کا قانون اپنی برتری اور حاکمیت تسلیم کروا کر رہتا ہے۔ کہتے ہیں عدالت عالیہ میں اپیل کی جا سکتی ہے۔ مگر عدالت عالیہ ہے ہی کہاں؟ تمھیں اس کا ایڈریس معلوم ہو تو اطلاع بھجوا دینا۔

سچ سچ اطہر پرویز! آج کل میری کیفیت کافی دگرگوں ہو گئی ہے۔ افسانے کی پہلی سطر پڑھتے ہی لرز اٹھتا ہوں کہ کہیں یہ تجریدی نہ نکل آئے۔ لہٰذا ایسے افسانے پڑھتے وقت پہلے وحشت ہوتی تھی اب اکتاہٹ ہوتی ہے۔ یار لوگ طعنہ زن ہیں کہ تم فرسودہ اقدار کے ساتھ چمٹے رہنے والے "شرفا" ہو۔ آج کا فرد تو اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ تم تو اس سے اکتا ؤ گے۔ کیوں کہ وہ تمھاری ناقص فہم سے بالکل مختلف اور علیحدہ چیز ہے۔

اب اس ناقص فہم کا عالم ملاحظہ ہو جو کہتی تھی کہ آرٹ اور جذبے میں اگر کوئی واسطہ نہیں تو ہمارا بھی اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ تضیع اوقات ہی کرنی ہے تو کیا بازار میں مرلی اور ڈھولکی بجا کر تماشہ دکھانے اور میلی چادر بچھا کر اپنے آرٹ کا معاوضہ وصول کرنے والے کیا کم ہیں۔

ناقص فہم تو اب بھی آرٹ اور جذبے کے رشتے پر مرمٹتا ہے۔ اب بھی غزل کا پہلا مصرع اور افسانے کا پہلا اگر آپ کو پھڑکا نہیں دیتا، اگر آپ کے پورے وجود حسیات کو اپنی گرفت میں نہیں لے لیتا تو اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ کسی قصباتی لاری اڈے کے مٹ میلے بنچ پر بیٹھ کر چائے کا ایک کپ پی لیا جائے، دو چار منٹ کی تسکین تو مل ہی جائے گی کیوں کہ کپ بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور حلق کی پیاس بھی۔

تم نہیں مانوگے (مگر مان جاؤگے۔ کیوں کہ تم بھی قدما، اور شرفا کی ذیل میں آنے لگے ہو۔ کم ازکم تمہارے افسانہ نمبر کا بیشتر رجحان یہی غمازی کرتا ہے) کہ ایک مرتبہ میں نے سعادت حسن منٹو کا افسانہ پڑھنا شروع کیا تھا جس کا پہلا ہی فقرہ یوں تھا:

"وہ چھت پر یوں آئی جیسے کسی نے تاروں والا انار چھوڑ دیا ہو۔"

ہائے اطہر پرویز! اس پہلے ہی فقرے نے تو مجھے یوں جکڑ لیا کہ مجھے گرد وپیش کی سدھ بدھ نہ رہی۔ حالانکہ اس سے دو تین منٹ پہلے میری محبوبہ کا لفافہ ڈاک میں آیا تھا جسے میں نے لقمۂ لذیذ سمجھ کر ایک طرف رکھ دیا تھا کہ اسے لمحۂ فرصت میں چبا چبا کر پڑھوں گا، مگر منٹو کی اس کہانی نے لقمۂ عزیز کو بھی ازکار رفتہ بنا دیا کہ آرٹسٹ تو عشق وحسن دونوں پر راج کرتا ہے۔

بہرکیف میری طرز بجیڈی دیکھو کہ ایک تو "الفاظ" کا یہ افسانہ نمبر تم نے مرتب کیا تھا اور دوسرے تم نے ہنرمندی یہ کی کہ ٹائیٹل پیج پر پریم چند کا اسکیچ چھاپ دیا۔ پریم چند کی آڑ لینا زمانے کا چلن ہوگیا ہے۔ اپنے باطن کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے تذکرے کر کر کے خوش وخرم ہونے والے "علامتیے" بھی "کفن" کی حد تک تو اسے مانتے تھے۔ اس سے آگے بڑھنے کو اپنی ذہانت کی اہانت سمجھنے لگے۔ بلکہ بعض، کچھ اپنی حد سے بھی زیادہ بلند مرتبہ حضرات تو یہاں تک کہنے لگے: "ہنھ! پریم چند؛ نام تو سنا ہے اس کا کہ کوئی افسانہ نگار تھا، مگر افسانہ کیسے لکھا جاتا ہے، بیچارا اس سے ناآشنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے آپ کسی عبادت گاہ کا اخلاقی پرچارک سمجھ سکتے ہیں۔

خیر، پریم چند اور تم میری کمزوری نکلے اور مجھے افسانہ نمبر کو طاق پر رکھنے سے سرفراز نہ کرسکے۔ اور میں نے قرۃ العین حیدر سے لے کر کہ جس کا افسانہ پڑھ کر ہر آدمی اپنے آپ کو تاریخ وتمدن سے آگاہ سمجھنے لگتا ہے۔ جوگندر پال، جیلانی بانو، انتظار حسین اور غیاث احمد گدی سے ہوتے ہوئے سلام بن رزاق تک کے افسانے پڑھ ڈالے۔ اطلاعاً اور اجتہاداً عرض ہے کہ سلام بن رزاق کا افسانہ میں نے سب سے پہلے پڑھا کہ "خوں بہا" (افسانے کا نام) کی پرانی اصطلاح کو اس نے ایک جدید مفہوم یوں عطا کیا کہ کرب تخلیق تمہارے افسانہ نمبر میں اس سے زیادہ کوئی نہیں کرسکا ـــــ اور سب سے آخر میں دیویندر ستیارتھی کا افسانہ یا جو کچھ بھی وہ تھا، پڑھا۔ وہ تو تجریدیوں کا بھی گورو نکلا۔

آج کل ادبی رسائل میں "مکتوبات" کا رواج سا پڑ گیا ہے ("سا" پر زور دیجئے) ان مکتوبات کو نقارۂ خدا سمجھا جاتا ہے (خلق عام طور پر غائب ہوتی ہے) یہ مکتوبات مندرجہ ذیل تین چیزوں کا احاطہ کرتے ہیں:

۱۔ ایڈیٹر پر تحسین کے ڈونگرے، واہ جی واہ! واہ جی واہ!

۲۔ زبان کے شدید بحران میں بھی آپ پرچہ نکال رہے ہیں۔ سبحان تیری قدرت!

۳۔ انتہائی مصروف ہوں۔ مگر ایک کہانی، نظم، غزل ارسال کر رہا ہوں۔ (ان میں سے کوئی بھی چیز چھاپ کر اپنے خریداروں کی فہرست بڑھائیے۔)

اطہر پرویز میاں! مجھے بھی خطرہ ہے کہ تم میرے اس خط کو مکتوب اعلیٰ سمجھ کر کہیں شایع نہ کر دو۔ اس لیے مندرجہ بالا تینوں چیزوں سے گریز کرتا ہوں۔ صرف ایک فقرہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم نے اپنے افسانہ نمبر میں توازن رکھنے کی ہنرمندی دکھائی ہے۔ کئی کہانیاں تو باقاعدہ سمجھ میں آتی ہیں۔ کئی سمجھ اور ناسمجھی کے درمیان لٹک گئی ہیں اور کئی صاف صاف تجریدیت کی وفادارانہ کاوش سے لکھی گئی ہیں۔ لیکن ایسی کوئی کہانی دکھائی نہیں دی جیسی میں نے گزشتہ ہفتے اپنا تمسخر اڑانے کے لئے لکھی تھی۔ حالانکہ اپنے ملک میں ایسے دانش وروں کی کمی نہیں جو اس کہانی کی گہرائیوں اور علامتوں اور پیچیدگیوں اور کرب و عذاب میں سے دور حاضر کے خودساختہ مفہوم نکال کر دوسروں کو اکتائیں گے، خود خوش ہوں گے۔

فقط نمونہ کے طور پر میں اپنی اس کہانی کے ایک دو پیراگراف محض تمھاری تفنن طبع کے لئے:

____ وہ پھر اپنے ریزہ ریزہ اجڑتے مخملیں بیڈ روم کی کھڑکی اور اس کی درزوں کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں نہ کھڑکی تھی نہ درز تھی۔

اس نے ایک سرد آہ بھری جو عنابی پردوں کی لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی سرسراہٹوں میں یوں کھو گئی جیسے وہ کوئی حسین شہزادی روح بن کر اس آہنی دیو کے حلق میں اتر جائے جو جسم کی آنچوں کو دھیرے دھیرے پی جانے کا ذوق رکھتی ہو۔

پھر پردے اڑ کر اس کھڑکی کے راستے سے باہر نکل گئے، جو راستہ بھی نہیں فقط آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ سڑک پر جیپوں کی، موٹر کے ہارنوں کی، شعلے کے رخ پر بہتے ہوئے ان بے محابا انسانوں کی جو اپنی اذیتوں کو اور کرب کو جلانے کے لئے، آوازوں میں کھلتے پستے آگے بڑھے جا رہے تھے۔

اسے گھن آ گئی۔ سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے بستر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے انھیں اٹھا کر مسلا، مروڑا، کچلا اور پھر ان پردوں کے تعاقب میں پھینک دیا اور ایسا کرتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے سکون کا ایک گونگا سا لمحہ، اس کی نیم باز آنکھوں میں ایک کوہستانی جھرنے کی طرح ترل ترل کرنے لگا۔

نیم باز آنکھیں؟؟ مگر میرا چشمہ کہاں ہے؟ جو جھرنے کے ترل ترل پانی کی طرح بلوریں تھا، لینسنر رکھتا تھا۔

اچانک رات کا ماضی اس کی ٹوٹتی ہوئی زلفوں میں سے جھانکنے لگا۔

مگر وہ ایک رات کا ماضی نہیں تھا۔

وہ تو ماضیوں کی ایک غیر مختتم تاریخ تھی۔

اس کا ہر مسام جو قرمزی رنگ رکھتا تھا۔

اس تاریخ کی صدیوں تلے کراہ رہا تھا۔

وغیرہ وغیرہ .... (کہانی جاری ہے)

فکر تونسوی۔ نئی دہلی

● "الفاظ" کا افسانہ نمبر ملا۔ آپ نے اس قدر خوبصورت تحفہ بھجوایا ہے۔ طبیعت خوش ہو گئی۔

اور افسوس ہوا کہ آپ کی دعوت کے باوجود میں کیوں الفاظ کی محفل میں شامل نہ ہو سکا۔ وحید اختر کا مضمون مجھے ان کی صاف گوئی کی وجہ سے بہت پسند آیا۔ افسانے آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں۔ آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیتا ہوں، میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

بلراج کومل۔ نئی دہلی

● ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ خطوط بازی والے صفحات میں نظر نہ آؤں۔ لیکن آدمی اپنے عہد پر قائم کب رہتا ہے۔ یہ کمزوری حضرت آدم کے ذریعے حضرت حوا سے ہمیں مقدر ہوئی ہے۔ اس لئے کبھی کبھی میں بھی کفر توڑ دیا کرتا ہوں۔ سب سے پہلے اتنا معیاری، کم قیمت اور خوبصورت افسانہ نمبر نکالنے اور اس سے زیادہ گھر پھونک تماشا دیکھنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔

محترمہ عصمت چغتائی کا خط پڑھ کر مجھے جولائی ۱۹۶۸ء کا ادب لطیف لاہور کا شمارہ یاد آگیا جو میں نے لاہور ہی میں پڑھا تھا اور جس میں عصمت صاحبہ کا مضمون ہیروئن شایع ہوا تھا اور اب اس وقت میں نے اپنے سامنے شاعر بمبئی ۱۹۷۶ء کا تیسرا شمارہ نکال کر رکھ لیا ہے اور اس کے سرورق پر ان کی بڑی GRACEFUL تصویر ہے اور اداریے کے بعد ہی "گوشۂ عصمت چغتائی" شروع ہو جاتا ہے۔ ایک الیاس نے کارٹون بنایا ہے جو شگفتگی کے بجائے سنجیدگی کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے بعد سلمیٰ صدیقی صاحبہ کا خاکہ۔ یونس اگاسکر کا ان کے ساتھ انٹرویو اور ڈاکٹر زرینہ ثانی کا ان کے ناول "عجیب آدمی" کا مطالعہ شامل ہے۔ اس گوشہ کے آخر میں عصمت صاحبہ کی لکھی ہوئی کہانی "نئی دلہن" بھی شایع ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان مقالہ نگاروں کے بوجھ تلے دبے ہونے کے باوجود انھوں نے قلم نہیں توڑا۔ ہماری طرف سے اس سال کے مخدوم محی الدین ایوارڈ حاصل کرنے پر انھیں مبارکباد پیش کر دیں۔

ابن فرید۔ علی گڑھ

● الفاظ کا اتنا خوبصورت افسانہ نمبر شایع کرنے پر مبارکباد ـــــ اتنے ضخیم نمبر کی قیمت صرف چھے روپے ناقابل یقین ہے۔ آپ کو کہیں سے "رسالہ ایڈ" تو نہیں ملتی؟ اگر یہ درست نہیں تو آپ نے ۲۶۴ صفحات کے اس خصوصی نمبر کی قیمت چھے روپے کس طرح رکھی؟ پاکستان میں تو یہ ناقابل تصور ہے اور ہندوستان میں بھی یہ آسان نہیں اس لئے کہ وہاں بھی کاغذ، طباعت اور کتابت کافی مہنگی ہے۔ مجھے افسانہ نمبر پڑھنے کا بالکل موقع نہیں ملا۔ میں نے محض ورق گردانی کی ہے لیکن اس نمبر میں اپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی اور صدیقہ بیگم کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان لوگوں نے لکھنا تقریباً ترک کر دیا ہے۔ یہ آپ کا کارنامہ ہے کہ آپ نے ان کی تخلیقات حاصل کر لیں۔ مقالات بھی معیاری معلوم ہوتے ہیں۔

شہزاد منظر۔ کراچی

● افسانہ نمبر ملا۔ جی خوش ہو گیا۔ اتنا خوبصورت نمبر، اتنے سارے افسانے، اتنے اچھے اور اعلیٰ پائے کے مضامین اور قیمت صرف چھے روپے۔ یقین نہیں آتا۔ جانتے ہیں آپ کہ پٹنہ اور گیا میں یہ نمبر "ہاٹ کیک" کی طرح بک گیا اور بہت سے لوگ ہاتھ ملتے رہ گئے۔

قرۃ العین حیدر، شمیم صادقہ، سلام بن رزاق، شوکت حیات، احمد یوسف اور انور عنایت اللہ کے افسانے اردو کے اعلیٰ افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ سلام نے تو اتنا خوبصورت افسانہ لکھا ہے کہ سچ جانیے مجھے تو بہت رشک آیا۔ اسے میری طرف سے مبارکباد دیجئے۔ کہاں ہیں وہ لوگ جنھیں ۶۰ء کے بعد کے افسانہ نگار "میڈیوکر" نظر آتے ہیں۔ کیا ۶۰ء کے قبل کے افسانہ نگاروں کے یہاں ایسا TALENT ملتا ہے؟

عبدالصمد۔ پٹنہ

● الفاظ کا افسانہ نمبر جلد اول موصول ہوا۔ میری طرف سے اس اہم اور دلچسپ افسانہ نمبر کی ترتیب و اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ یقین ہے کہ اس کا دوسرا حصہ بھی اسی طرح وقیع اور اہم ہوگا۔

معین الدین عقیل۔ کراچی

● مجھے خوشی ہے کہ آپ نے افسانے پر توجہ کی ہے اور 'الفاظ' کا افسانہ نمبر نکالا ہے اور مزید نکالنے کا بھی ارادہ ہے۔ آپ نے اشک، دیوندر ستیارتھی، قرۃ العین حیدر سے لے کر فرخندہ لودھی اور طارق چھتاری تک ۲۸ افسانے شامل کئے ہیں۔ ایسے اچھے مجموعے کے لئے جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی کا ایک مجموعہ شاید بیس پچیس برس پہلے نکلا تھا۔ ان سے "بنت حوا" آپ نے خوب لکھوایا۔ آپ نے تبصرے محنت سے لکھے ہیں، یہ اس نمبر کا جاندار حصہ ہیں۔ وحید اختر کا "سخن گسترانہ بات" اور شہزاد منظر کا "اردو افسانہ پاکستان میں" پسند آئے۔ وحید اختر نے فکشن کی مجموعی صورت حال کا اچھا جائزہ لیا ہے، لیکن شاید انتظار حسین کی حالیہ کہانیاں انھوں نے نہیں پڑھیں ورنہ دوسروں کے غیر ذمہ دارانہ بیان کردہ اتنی آسانی سے نہ دہرا دیتے۔

گوپی چند نارنگ۔ نئی دہلی

● الفاظ کا افسانہ نمبر (جلد اول) پسند آیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس، وحید اختر اور عتیق اللہ کے مضامین فکر انگیز ہیں، بالخصوص، عتیق اللہ کا مضمون افسانے کی داخلی گہری ساخت، تو ادھر افسانے کے فن پر لکھے گئے مضامین میں ایک اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں جو سوال اٹھائے گئے ہیں ان پر بحث ہونی چاہئے۔

انتظار حسین کے فن کے بارے میں ہمارے دو چار نقادوں نے بڑے مغالطوں اور مبالغوں کو جنم دیا ہے اور ان کی فنی عظمت کی جو افواہیں پھیلائی ہیں عتیق اللہ کا مضمون ان کا قلع قمع کرتا ہے۔ انتظار حسین کے فن کے متعلق دوٹوک رائے کا اظہار غالباً پہلی بار اس مضمون میں ہوا ہے۔ انتظار حسین کا فن زر۔ سے بولا ہوا جھوٹ ہے جس کا کھوکھلا پن بھی اسی سے عیاں ہے۔ ان کے مطابق اردو افسانے کا زوال پریم چند سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ اردو افسانے کو زوال کی طرف لے جانے کی جو سعی انتظار حسین نے کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

۴۶۲ صفحات پر مشتمل اس نمبر کی اتنی کم قیمت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ روایت ٹوٹنے نہ پائے۔

صادق۔ نئی دہلی

● افسانہ نمبر "الفاظ" کا ٹائیٹل پسند آیا۔ افسانے کے شہنشاہ کی تصویر پہلی بار نظر سے گزری اور

"پریم چند کی یہ تصویر بہت پسند آئی۔ افسانہ نمبر میں بڑے ادیبوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سب افسانے خوبصورت ہیں کسی ایک کی تعریف کرنا دوسرے کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ تمام افسانے عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں اور یہ تحریریں ایک نئی فکر، نیا انداز اور نئی سوچ دیتی ہیں۔ اتنا اچھا نمبر نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

افسانہ نمبر جلد دوم کا بے چینی سے انتظار ہے۔ یقیناً وہ بھی جلد اول کی طرح بھرپور ہوگا۔

اقبال بانو۔ کراچی کینٹ

● الفاظ کا ہندو پاک افسانہ نمبر ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ افسانہ نمبر پر پریم چند کا اسکیچ دے کر آپ نے ہم سب کا بھلا کیا جو ان کی تحریروں سے تو شناسا تھے لیکن شخصیت سے نہیں۔ اچھا سلسلہ ہے۔ تنقیدی مضامین میں ڈاکٹر قمر رئیس کا پریم چند پر مضمون سب سے اچھا لگا۔ نقش اول پڑھ کر تو نقش ثانی کے پڑھنے کی خواہش شدید ہوگئی ہے۔ امید ہے کہ ارسال کرنا نہیں بھولیں گے۔

ہما حسن۔ فیصل آباد

● پرسوں شہر کے ایک نیوز اسٹال پر آپ کے رسالہ "الفاظ" کا افسانہ نمبر ملا۔ اس میں ہندو پاک کے نامور افسانہ نگاروں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے پرچے نے علی گڑھ کی ساکھ اور بڑھادی۔ ویسے بھی علی گڑھ ہم جنوبی ہندوالوں کو فاصلے کی دوری کے باوجود دل کے بہت قریب ہے۔ خدا ہمیشہ اس کو پر بہار رکھے۔

ایم۔ این۔ حق۔ میسور

● آپ کا بھیجا ہوا "الفاظ" کا افسانہ نمبر جلد اول ملا۔ بہت بہت شکریہ آپ کا اتنی اچھی چیز بھیجنے کا۔ یقیناً آپ کا اس پر فخر کرنا بجا ہے کہ اس میں انتہائی اعلیٰ معیاری افسانے اور افسانوں پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ بڑے عرصے بعد ایک معیاری چیز پڑھنے کو نصیب ہوئی ہے ورنہ ان برائی ڈائجسٹوں سے تو طبیعت عاجز آگئی تھی اور کوئی اچھی چیز پڑھنے کی تشنگی اور بڑھ گئی تھی۔ میری طرف سے پھر ایک بار آپ کی اتنی کوشش پر مبارکباد پیش ہے۔

متین عباس۔ سڈنی (آسٹریلیا)

● "الفاظ" کا راجندر سنگھ بیدی نمبر ملا۔ اسے پڑھ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ "افسانہ نمبر حصہ اول" سہام مرزا صاحب کی معرفت موصول ہوا۔ آپ کی عنایت کا بیحد شکریہ۔ بلاشبہ آپ کا پرچہ ادب میں گرانقدر اضافہ ہے۔ مضامین میں وحید اختر صاحب کی "سخن گسترانہ بات" خاص طور سے پسند آئی۔ امید ہے آیندہ بھی ہم ان کے علمی ذخیرے سے فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ افسانوں کا انتخاب بھی بہت اچھا ہے۔

فردوس حیدر۔ کورنگی روڈ۔ کراچی

● آج کے حالات میں آپ جیسے حضرات اردو کے رسالے شایع کرکے ایک بیش بہا خدمت انجام دے رہے ہیں اور اردو کو مرنے سے بچا رہے ہیں۔ یہ تو فقط اپنی زبان سے آپ کی محبت ہے کہ اس سنگ زمین میں بھی آبیاری کرتے جاتے ہیں۔

سید شہاب الدین۔ ممبر پارلیمنٹ۔ نئی دہلی
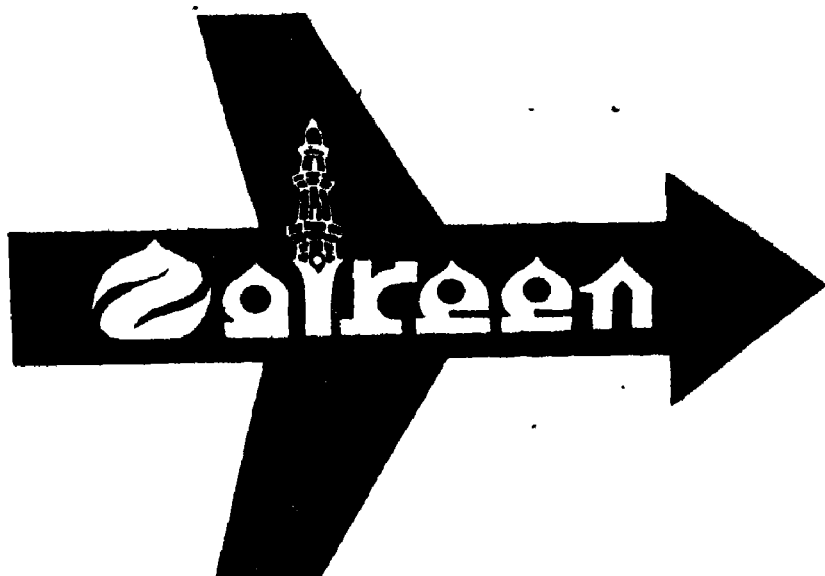
ہماری خاص خاص مطبوعات ایک نظر میں

اقبالیات

کلیات اقبال اردو (عکسی) صدی ایڈیشن — ۲۰/۰۰
فکر اقبال — خلیفہ عبد الحکیم — ۴۰/۰۰
اقبال بحیثیت شاعر — رفیع الدین ہاشمی — ۴۵/۰۰
اقبال کی اردو نثر — عبادت بریلوی — ۱۵/۰۰
اقبال فن اور فلسفہ — ڈاکٹر نور الحسن نقوی — ۷/۵۰
اقبال شاعر اور فلسفی — وقار عظیم — ۲۰/۰۰
اقبال معاصرین کی نظر میں — ۵۰/۰۰
تصورات اقبال — مولانا صلاح الدین احمد — ۱۵/۰۰
بانگ درا (عکسی) — علامہ اقبال — ۱۰/۰۰
بال جبریل (عکسی) — ۸/۰۰
ضرب کلیم (عکسی) — " — ۸/۰۰
ارمغان حجاز اردو (عکسی) — " — ۴/۰۰

غالبیات

دیوان غالب (عکسی) — ڈاکٹر نور الحسن نقوی — ۱۳/۰۰
غالب: تقلید اور اجتہاد — پروفیسر خورشید الاسلام — ۳۰/۰۰
غالب شخص اور شاعر — مجنوں گورکھپوری — ۱۵/۰۰
[illegible] غالب — ڈاکٹر سید عبد اللہ — ۲۰/۰۰
فلسفی غالب — احمد رضا — ۶/۰۰

حالیات

حالی [illegible] — پروفیسر ثریا حسین — ۱۵/۰۰
[illegible] — [illegible] مطالعہ
— ڈاکٹر [illegible] صدیقی — ۱۰

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] — ۶
[illegible] نامہ (عکسی) — " — ۷/۵۰
[illegible] سنگ (عکسی) — " — ۹

ڈراما

اردو ڈراما کا ارتقاء — عشرت رحمانی — ۴۰/۰۰
اردو ڈراما تاریخ و تنقید — " — ۲۰/۰۰
یونانی ڈراما — مترجم عتیق احمد صدیقی — ۳۰/۰۰

انار کلی — مقدمہ محمد حسن — ۹/۰۰
آغا حشر اور اردو ڈراما — انجمن آرا — ۳/۰۰

مثنوی

اردو مثنوی کا ارتقاء — عبد القادر سروری — ۶/۵۰
مثنوی گلزار نسیم — ظہیر احمد صدیقی — ۵/۰۰
مثنوی سحر البیان — " — ۵/۰۰
انتخاب مثنویات اردو — مغیث الدین فریدی — ۶/۰۰

افسانہ و ناول

اردو کے تیرہ افسانے — مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز — ۱۲/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے — " — ۱۲/۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے — " — ۱۲/۰۰
نمائندہ مختصر افسانے — محمد طاہر فاروقی — ۶/۰۰
نیا افسانہ — وقار عظیم — ۱۵/۰۰
داستان سے افسانے تک — " — ۲/۰۰
قرۃ العین حیدر کے چار ناولٹ — قرۃ العین حیدر — ۳۰/۰۰
روشنی کی رفتار — " — ۲۵/۰۰

سرسیدیات

سرسید اور ہندوستانی مسلمان — نور الحسن نقوی — ۲۰/۰۰
سرسید ایک تعارف — پروفیسر خلیق احمد نظامی — ۲/۰۰
سرسید اور علی گڑھ تحریک — " — ۳۵/۰۰
انتخاب مضامین سرسید — آل احمد سرور — ۶/۰۰

ادب و تنقید

[illegible] اور [illegible] — ظہیر احمد صدیقی — ۲۲/۰۰
[illegible] — ابن فرید — ۲۵/۰۰
[illegible] — ۲۰/۰۰
[illegible] ساسطا نامہ — شمیم حنفی — ۱۰/۰۰
[illegible] — ڈاکٹر فضل امام — ۱۲/۰۰
موازنہ انیس و دبیر — " — ۱۲/۰۰
شہرت کی خاطر — نظیر صدیقی — ۱۵/۰۰
تنقیدیں — پروفیسر خورشید الاسلام — ۳۰/۰۰
تناسب — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/۰۰
مضامین نو — خلیل الرحمٰن اعظمی — ۲۵/۰۰
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — " — ۴۰/۰۰
تنقیدی تناظر — ڈاکٹر قمر رئیس — ۲۰/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ	رشید حسن خاں	۲۵/۰۰
آخر مجم	عظیم الحق جنیدی	۲۰/۰۰
اردو ادب کی تاریخ	"	۱۰/۰۰
نثر، نظم اور شعر	ڈاکٹر منظر عباس نقوی	۷/۵۰
ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	۱۵/۰۰
اسلوب	سید عابد علی عابد	۲۰/۰۰
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	۱۸/۰۰
تنقید اور احتساب	"	۱۵/۰۰
اردو شاعری کا مزاج	"	۴۰/۰۰
تخلیقی عمل	"	۲۰/۰۰
انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری	۱۰/۰۰
ستارہ یا بادبان	"	۱۵/۰۰
آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۶/۰۰
بجنگ آمد	کرنل محمد خاں	۲۰/۰۰
غزل اور مطالعہ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	(زیر طبع)
شاعری اور شاعری کی تنقید	"	۲۵/۰۰
جدید شاعری	"	۲۵/۰۰
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۸/۰۰
حالی اور نیا تنقیدی شعور	"	۵/۰۰
امراؤ جان ادا	مرتبہ تمکین کاظمی	۱۲/۰۰
مجموعہ نظم حالی	ظہیر احمد صدیقی	۷/۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ از وحید قریشی	۱۲/۰۰
تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	۳/۵۰
باغ و بہار	سلیم اختر	۱۲/۰۰
متاع ادب	شرافت حسین مرزا	۳/۷۵
اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری	محمد زاہد	۱۵/۰۰
نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی	فرحت اللہ بیگ	۲/۵۰
منتخب ادبی خطوط	مغیث الدین فریدی	۱/۲۵
امراؤ جان ادا تنقید و تبصرہ	ابواللیث صدیقی	۳/۰۰
آب حیات کا تنقیدی تحقیقی مطالعہ	سید سجاد	۵/۰۰
باغ و بہار کا تنقیدی تحقیقی مطالعہ	"	[illegible]

قواعد و گرامر اور لغت

کتاب	مصنف	قیمت
اردو صرف	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۳/۵
اردو نحو		۲/۰۰
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم۔ اے شہید	۳/۰۰
فیروز اللغات جدید (عکسی)		۲۵/۰۰
فیروز اللغات جیبی (عکسی)		۸/۰۰

انشاء و خطوط نویسی

کتاب	مصنف	قیمت
گلدستہ مضامین و انشاء پردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۸/۰۰

کامرس

کتاب	مصنف	قیمت
ایڈوانسڈ اکاؤنٹس	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۲۵/۰۰
جدید طریقہ و تنظیم تجارت (بزنس میتھڈ اینڈ آرگنائزیشن)		۳۰/۰۰

سیاسیات

کتاب	مصنف	قیمت
دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن)	محمد ہاشم کدوائی	۲۰/۰۰
تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پالیٹکل تھاٹ)	"	(زیر طبع)
جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)	"	۱۵/۰۰
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس)	"	۱۵/۰۰
مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس)	"	۷/۵۰

تاریخ

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ و تہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری)	اے۔ اے۔ ہاشمی	۲۰/۰۰
اسلامی تاریخ	"	۵/۰۰

متفرق

کتاب	مصنف	قیمت
جدید تعلیمی مسائل (ایجوکیشنل پرابلمس)	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۱۲/۰۰
اصول تعلیم (پرنسپل آف ایجوکیشن)	"	۱۵/۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویئے (نیو آسپکٹس آف ایجوکیشنل سائیکلوجی)	مسرت زمانی، ابن فرید	۱۵/۰۰
رہبر صحت	مسرت زمانی	۷/۰۰
امور خانہ داری		۱۵/۰۰
بچوں کی تربیت		۸/۰۰
ہندوستان کا تہذیبی ورثہ	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۲/۲۵
عام معلومات	"	۶/۰۰
[illegible]	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۵/۰۰

فارسی

کتاب	مصنف	قیمت
نصاب فارسی	ڈاکٹر غلام سرور	۵/۰۰
سخن نو (حصہ اول)	"	۴/۰۰
سخن نو (حصہ دوم)	"	۳/۵۰
سخن نو (حصہ سوم)	"	۲/۷۵
گلہائے بہار	"	۲/۰۰
انتخاب غزلیات فیضی	ڈاکٹر محمد ابراہیم قاضی	۲/۰۰
قاآنی و قصیدہ نگاری او	ڈاکٹر نصیر احمد صدیقی	۷/۵۰

دینیات

کتاب	مصنف	قیمت
نصاب دینیات (حصہ اول)	ڈاکٹر اقبال حسن خاں	۶/۵۰
نصاب دینیات (حصہ دوم)	"	۴/۰۰

یہ کتابیں ہم سے طلب کریں

آنکھیں ترستیاں ہیں — پروفیسر جگن ناتھ آزاد — ۳۶/۰۰
اے پیارے لوگو — وارث علوی — ۴۰/۰۰
اداس شام کے آخری لمحے — کشمیری لال ذاکر — ۱۲/۰۰
اداسی کے پانچ روپ — کرشن موہن — ۲۰/۰۰
افکار عبدالحق — مرتبہ آمنہ صدیقی — ۲۵/۰۰
اندھیرے کے قیدی — کمار پاشی — ۱۰/۰۰
انتظار حسین کے ۱۷ افسانے — انتظار حسین — ۱۸/۰۰
آگ — جمنا داس اختر — ۵/۰۰
آواز کا جسم — مخمور سعیدی — ۱۰/۰۰
بادِ صبا — صوفی بانکوٹی مرحوم — ۱۵/۰۰
بسمل سعیدی: شخص اور شاعر — گوپال متل — ۱۸/۰۰
بادل گرجیں جمنا پار — سدرشن شرما — ۱۸/۰۰
بردہ فروش — جمنا داس اختر — ۵/۰۰
بھیگا ہوا کاغذ — ممتاز راشد — ۱۰/۰۰
پہلی کرن کا بوجھ — مغنی تبسم — ۱۲/۰۰
تیشۂ نظر — ابوالفیض سحر — ۸/۰۰
تین چہرے ایک سوال — کشمیری لال ذاکر — ۴/۵۰
تیسرا سفر — سلیمان خمار — ۱۵/۰۰
چند ادبی شخصیتیں — شاہد احمد دہلوی — ۳۰/۰۰
حساب رنگ — بانی — ۱۵/۰۰
حصار آب — حیات لکھنوی — ۱۰/۰۰
خرابہ — من موہن تلخ — ۱۰/۰
خواب تماشا — کمار پاشی — ۵/۰۰
دائروں کا سفر — شہاب ملت — ۱۵/۰۰
روشنی پھر روشنی ہے — بمل کرشن اشک — ۱۰/۰۰
رہ رو — کمار پاشی — ۱۰/۰۰
راجستھانی زبان و ادب۔ ایک تعارف — ڈاکٹر فضل امام — ۱۸/۰۰
سوکینڈل پاور کا بلب — منٹو — ۱۸/۰۰
سلمیٰ سے دل لگا کر — نیر واسطی — ۱۸/۰
شیرازۂ مژگاں — کرشن موہن — ۱۰/۰۰
صحرا میں اذان — گوپال متل — ۱۵/۰۰
کریاں والی — کشمیری لال ذاکر — ۴۰/۰۰
کلیات شاد عارفی — مرتبہ: مظفر حنفی — ۲۰/۰۰
کلیات اختر شیرانی — مرتبہ: گوپال متل — ۱۰/۰۰
کوئے ملامت — کرشن موہن — ۱۰/۰۰
کینسر وارڈ (مجلد) — الیگزنڈر سولزنٹسن — ۲۰/۰۰

گیان مارگ کی نظمیں — کرشن موہن — ۱۰/۰۰
گوپال متل۔ ایک مطالعہ — عبدالحکیم — ۱۵/۰۰
لاہور کا جو ذکر کیا — گوپال متل — ۱۰/۰۰
لال قلعہ — صفدر آہ — ۸/۰۰
لفظوں کا پیرہن — بدیع الزماں خاور — ۶/۰۰
قصہ قدیم و جدید — مرتبہ مخمور سعیدی — ۱۸/۰۰
منٹو: شخصیت اور فن — مرتبہ پریم گوپال متل — ۴۰/۰۰
مذہب اور سائنس — مولوی عبدالحق — ۱۱/۰۰
میراجی: شخصیت اور فن — کمار پاشی — ۴۰/۰۰
نیا اردو افسانہ: انتخاب — ” — ۱۸/۰۰
نئے عہد نامے کی سوغات — فیاض رفعت — ۱۰/
نام بہ نام — رضا نقوی واہی — ۶/۰۰
واپسی — آمنہ ابوالحسن — ۱۲/۰۰
ہندو مسلمان — بھگت رام شرما — ۲۰/۰۰
ساحر لدھیانوی۔ ایک مطالعہ — مخمور سعیدی — ۳۰/۰۰
ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ — ڈاکٹر صادق — ۴۰/۰۰
تیسرے درجے کا مسافر — وارث علوی — ۴۰/۰۰
اتر پردیش کے لوک گیت — اظہر علی فاروقی — ۲۹/۲۵
ہمایوں نامہ — گلبدن بیگم، مترجم رشاد حیدر مرزا — ۶/۲۵
وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں — زہرہ رضوی — ۸/۰۰
درس بلاغت — ۷/۰۰
اربسٹ بھگورے — سلامت اختر خاں — ۸/۴۰
دفتری انتظامیہ — پروفیسر محمد سعید — ۱۲/۰۰
اقبال اور سائنس — طاہر تونسوی — ۳۵/۰۰
اقبال معاصرین — ڈاکٹر سہیل بخاری — ۲۵/۰۰
اقبال احوال و افکار — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۳۰/۰۰
اقبال سب کے لئے — ڈاکٹر فرمان فتحپوری — ۶۰/۰۰
تمارگندم — ابن انشا — ۱۲/۵۰
اردو کی آخری کتاب — ” — ۱۰/۰۰
کوکھ جلی — راجندر سنگھ بیدی — ۱۳/۵۰
مطالعۂ غبار خاطر — عبدالقوی دسنوی — ۱۲/۰۰
بادل گرجیں جمنا پار — سدرشن شرما — ۱۸/۰۰
دھواں — سعادت حسن منٹو — ۱۲/۵۰
سرکنڈے — ” — ۱۵/۰۰
ٹھنڈا گوشت — ” — ۱۵/۰۰
پانچ افسانے اور انشائیہ — شاہ مقبول احمد — ۱۰/۰۰
[illegible] — فیروز عابد — ۱۵/۰

ضروری اعلان

ہمیں افسوس ہے کہ تقریباً تیس افسانے اور مضامین (افسانہ نمبر جلد دوم میں شامل نہ کیے جا سکے۔ افسانہ نمبر جلد اول کی اشاعت کے بعد بھی ہمارے کرم فرماؤں نے اپنے افسانے اور مقالے ارسال کیے۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان کے نقاد اور افسانہ نگار بھی برابر اپنی نگارشات ارسال کر رہے ہیں۔ (ہمارے قارئین کے لئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ "الفاظ" پاکستان میں بے حد مقبول ہے اور بڑی تعداد میں وہاں بھیجا جا رہا ہے) جی تو چاہتا تھا کہ ہم جلد سوم بھی شایع کرتے لیکن دوسری اصناف ادب کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔ اس لئے اب ہمارے اگلے شمارے عام نمبر ہوں گے جن میں ہم ان افسانوں کو شایع کرتے رہیں گے۔

ہمارا ارادہ ان تمام افسانوں اور مقالوں کو کتابی شکل میں شایع کرنے کا ہے اس لئے قارئین سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کا انتظار کریں۔ افسانہ نمبر جلد اول کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں اس نمبر کو دوبارہ شایع کرنا پڑا اور دوسرا ایڈیشن بھی ختم ہو گیا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ شمارہ بھی اسی شوق سے پڑھا جائے گا۔

مجلس ادارت

سائنٹفک طریقے
سے تیار کیا جانے والا
زود اثر
مسیحا
(سیرپ)
بطور حفظ ماتقدم و علاج استعمال کیا جاتا ہے
مسیحا استعمال
○ ملیریا ○ انفلوائنزا ○ موسمی بخار ○ پرسوت بخار
○ بخار ○ ورم طحال ○ ہلکی حرارت ○ ورم جگر
مقامی میڈیکل اسٹور و جنرل اسٹور سے طلب کریں۔
OEBA (INDIA) اوئیبا
جلال پور فیض آباد ۲۲۴۱۴۹ (یو۔پی)

جلد ۶ | ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۱ء | شمارہ ۵، ۶

زر سالانہ ــــ ۱۶ روپے
قیمت ــــ ۳۰ روپے

پرنٹر پبلشر ــــ اسدیار خاں
مطبوعہ ــــ اسرار کریمی پریس، الہ آباد
کتابت ــــ ز۔ رشید، الہ آباد

مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق پر : ابن انشا

پیشکش : دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ

اداریہ

اس اداریے کو سپردِ قلم کرتے وقت کچھ ایسا اندازہ ہو رہا ہے کہ اردو کے سر پر پچھلے پینتیس برس سے منڈلانے والا خطرہ شاید اب رخصت ہوا چاہتا ہے۔ اور کیوں نہ ہم پہلی ہی سطر میں یہ اعتراف کرلیں کہ اس میں کمال ہم اردو والوں کا نہیں بلکہ یہ اس زبان کی سخت جانی ہے کہ اس طویل مدت تک اس نے ناسازگار حالات کے آگے سپر نہ ڈالی۔ جس زبان کی ملک کے ہر گوشے تک رسائی ہو اور جس کی جڑیں کروڑوں عوام کے دل و دماغ میں پیوست ہوں اسے موت کی آغوش میں کون سلا سکتا ہے۔ لیکن یہ محض خوش ہونے اور بے فکر ہو کر بیٹھ جانے کا وقت نہیں۔ ان پینتیس برسوں کی ناانصافی نے ہماری زبان کو ایسا نقصان پہنچایا ہے کہ اس کی تلافی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس عرصے میں ایک ایسی نسل وجود میں آچکی ہے جس کا اپنی مادری زبان سے وہ تعلق باقی نہیں رہا جو ہونا چاہئے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسکولوں میں اردو نہ پڑھائی جائے گی تو وہ لوگ کہاں سے آئیں گے جو دفتروں میں اردو زبان میں درخواست پیش کرسکیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اردو ہندی ایک دوسرے کی حریف نہیں، معاون ہیں۔ اردو ہندی دونوں زبانوں کے وہ اہلِ قلم زیادہ مقبول ہوتے ہیں جنھیں دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو۔ یہ بات یہاں بے محل نظر آئے گی مگر اس لئے عرض کی گئی کہ بعض لوگ اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے گھبراتے ہیں۔ انھیں ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اردو پڑھنے سے ان کے بچوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اردو پر یہ وقت کیوں پڑا۔ اگر ہم اور ہماری حکومت ان اسباب کو دور کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو پھر اسی طرح پھلے پھولے۔ دراصل ۱۹۴۷ء سے پہلے اردو عام طور پر اسکول میں باقاعدہ ایک زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت انگریزی کو اولیت حاصل تھی۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ہندی اور اردو کا تھا۔ آزادی کے بعد انگریزی نے جب پیچھے ہٹنا شروع کیا تو ہندی نے اس کی جگہ لے لی۔ ہم اردو والوں کو ہندی کی اس حق شناسی سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن اردو کو اس مقام سے پیچھے دھکیل دیا گیا جہاں وہ آزادی سے پہلے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکولوں میں اردو تعلیم تقریباً ختم ہو گئی۔

ہم چاہتے ہیں کہ اردو کو کم از کم وہی جگہ مل جائے جو اسے آزادی سے پہلے حاصل تھی۔ ہندی والے اسے ہندی کی ایک شیلی سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو پھر یہ بات ماننا پڑے گی کہ یہ ایک بہت اہم شیلی ہے لہٰذا اس کی تدریس کا ہر اسکول، ہر کالج اور ہر یونیورسٹی میں باقاعدہ اور معقول انتظام کیا جائے۔ ادیبوں کو انعامات دینے، کانفرنسیں کرنے اور اردو کے دفاتر قائم کرنے سے زبان آگے نہیں بڑھے گی۔ اب وقت آگیا ہے کہ حکومت اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کرے اور اردو کی حیثیت بحال کرتے ہوئے اسے اسکول میں رائج کرے۔ اردو اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں

اضافہ ہوگا۔ اردو جاننے والوں کی نسل اب چالیس سے اوپر ہوگئی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو پھر نہ اردو پڑھنے والے رہیں گے نہ اردو میں ادیب ہوں گے۔ اردو کا معاملہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ جاپان اور جرمنی میں ہے اور یہ ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے گی۔ اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اردو ہندوستان کی ایک زبان ہے تو پھر اس کی تدریس کا بھی معقول انتظام ہونا چاہیے۔ اردو کے ساتھ انصاف کسی فرد یا جماعت کے ساتھ انصاف نہ ہوگا بلکہ ہندوستانی تہذیب کے ساتھ انصاف ہوگا۔

چنانچہ اس وقت جب اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان یا دوسری زبان (؟) کا درجہ ملنے والا ہے، یہ اور ضروری ہوگیا ہے کہ اردو کی درس و تدریس کا معقول بندوبست کیا جائے اور یہ غور کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہمارے بچے اردو پڑھ رہے ہیں یا نہیں اور ہمارے جو بچے اونچی جماعتوں میں پہنچ چکے ہیں اور اردو نہیں جانتے انھیں اردو سکھانے کا ہم نے کیا بندوبست کیا ہے۔

اردو کو ناقص چھپائی اور طباعت کی دشواریوں سے بھی نقصان پہنچا ہے۔ اس موقعے پر ہم اپنے قارئین کو ایک خوشخبری سنانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اردو طباعت کی دنیا میں یکم اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ایک انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ جن لوگوں نے یہ خبر سن لی وہ اسے سال گزشتہ کی وداعی سوغات سمجھیں اور جو یہ خبر آج سن رہے ہیں وہ اسے نئے سال کا تحفہ تصور فرمائیں۔ خیال تھا کہ اردو طباعت کی ترقی کا راز ٹائپ کے رواج میں مضمر ہے اور اس میں خط نسخ کو قبول کرنا اور خط نستعلیق سے ہاتھ دھونا پڑے گا مگر جناب احمد مرزا جمیل اور جناب مطلوب الحسن سید دو نوجوانوں کی سولہ برس کی محنت سے ایک ایسی مشین تیار ہوگئی ہے جس پر ستر آدمی بیک وقت ٹائپ کر سکتے ہیں اور بڑے سے بڑا اخبار خوبصورت نستعلیق میں صرف چند گھنٹوں میں چھپ کر تیار ہو جاتا ہے۔ اسے نوری نستعلیق کا نام دیا گیا ہے اور "جنگ" لاہور یکم اکتوبر سے اسی عظیم الشان مشین پر چھپ رہا ہے۔ ہند و پاک کا تو ذکر ہی کیا، بیشتر ترقی یافتہ ممالک کی زبانیں اس کمپیوٹری طباعت کو ابھی تک نہیں اپنا سکی ہیں اور اردو نے سیکڑوں ترقی یافتہ زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے موجدین اور جنگ کے منتظمین نیز اہل اردو کو اس کامیابی پر ادارۂ "الفاظ" کی جانب سے مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔

اتر پردیش سرکار کے بھی ہم شکر گزار ہیں کہ اس نے اردو کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے دوسری زبان کا درجہ دے دیا۔ اس سلسلے کی جو کارروائی باقی ہے امید ہے کہ وہ بھی بحسن و خوبی تکمیل کو پہنچے گی۔ حکومت بہار اس معاملے میں پہل کر چکی ہے۔ امید ہے کہ بعض دوسری ریاستیں بھی اس طرف جلد متوجہ ہوں گی اور اردو زبان کا مستقبل تابناک ہو جائے گا۔ بہر حال اب ہماری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں جن کا پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حکومت کی عنایتوں کے باوجود اردو کی قسمت نہ سنور سکے اور آنے والی نسلیں ہم پر یہ الزام لگائیں کہ ان بدنصیبوں کو ملا تو سب کچھ مگر ان کے دامن میں سما ہی نہ سکا۔

— مجلسِ ادارت

فیض احمد فیض

عشق اپنے قیدیوں کو پابہ جولاں لے چلا

دار کی رسیوں کے گلوبند
گردن میں پہنے ہوئے
گانے والے ہر اک روز گاتے رہے
ناچنے والے دھومیں مچاتے رہے
پائلیں بیڑیوں کی بجاتے رہے
ہم جو اس صف میں تھے اور نہ اس صف میں تھے
راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چپ چاپ آنسو بہاتے رہے
لوٹ کر آکے دیکھا کہ پھولوں کا رنگ
جو کبھی سرخ تھا زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
گلے میں کبھی طوق کا واہمہ
اور کبھی پاؤں میں لس زنجیر کا
اور پھر
ایک دن عشق آکر انھی کی طرح
رسن درگلو، پابجولاں ہمیں
اسی قافلے میں کشاں لے چلا

غزل

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
مقابل صف اعدا جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی
کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پس قتل عام ہوتی رہی
یہ برہمن کا کرم، وہ عطائے شیخ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی
جو کچھ بھی بن نہ پڑا فیض کٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی رہی

ابن انشا

نظمیں اور غزلیں

دل آشوب

یوں کہنے کو راہیں ملک وفا کی اجال گیا
اک دھند ملی جس راہ میں پیک خیال گیا
پھر چاند ہمیں کسی رات کی گود میں ڈال گیا

ہم شہر میں ٹھیریں ایسا تو جی کا روگ نہیں
اور بن بھی ہیں سونے ان میں بھی ہم سے لوگ نہیں
اور کوچے کو تیرے لوٹنے کا تو سوال گیا

ترے لطف و عطا کی دھوم سہی محفل محفل
اک شخص تھا انشا نام محبت میں کامل
یہ شخص یہاں پامال رہا پامال گیا

تری چاہ میں دیکھا ہم نے بحال خراب اسے
پر عشق و وفا کے یاد رہے آداب اسے
ترا نام و مقام جو پوچھا ہنس کر ٹال گیا

اک سال گیا، اک نیا ہے آنے کو
پر وقت کا بھی اب ہوش نہیں دیوانے کو
دل ہاتھ سے اس کے وحشی ہرن کی مثال گیا

ہم اہلِ وفا رنجور سہی مجبور نہیں
اور شہرِ وفا سے دشت جنوں کچھ دور نہیں
ہم خوش نہ سہی پر تیرے تو سر کا وبال گیا

اب حسن کے گڑھ اور شہر پناہیں سونی ہیں
وہ جو آشنا تھے ان سب کی نگاہیں سونی ہیں
پر تو جو گیا ہر بات کا جی سے ملال گیا

ابنِ انشا

○

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا
اس دل کے دریدہ دامن میں دیکھو تو سہی سوچو تو سہی
جس جھولی میں سو چھید ہوئے اس جھولی کا پھیلانا کیا
شب بیتی چاند بھی ڈوب چلا زنجیر پڑی دروازے میں
کیوں دیر گئے گھر آئے ہو سجنی سے کرو گے بہانا کیا؟
پھر ہجر کی لمبی رات میاں، سنجوگ کی تو یہی ایک گھڑی
جو دل میں ہے لب پر آنے دو، شرمانا کیا گھبرانا کیا
اس روز جو ان کو دیکھا اب خواب کا عالم لگتا ہے
اس روز جو ان سے بات ہوئی وہ بات بھی تھی افسانہ کیا
اس حسن کے سچے موتی کو ہم دیکھ سکیں پر چھو نہ سکیں
جسے دیکھ سکیں پر چھو نہ سکیں، وہ دولت کیا وہ خزانہ کیا
اس کو بھی جلا دکھتے ہوئے من، اک شعلہ لال بھبوکا بن
یوں آنسو بہہ جانا کیا؟ یوں ماٹی میں مل جانا کیا
جب شہر کے لوگ نہ رستہ دیں یوں بن میں نہ جا بسرام کرے
دیوانوں کی سی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا

○

مہکا کریں ترے جوڑے کی کلیاں
بنتی رہیں تری خوشبو کے جالے
جاگا کرے ترے جلوؤں کا جادو
سنولا گئے جب من کے اجالے
ہاتھوں کی مہندی، باہوں کے کنگن
ماتھے کی بندی، کانوں کے بالے
ابرو کا لہراؤ، ہونٹوں کی مسکان
تیرے کھلونے تیرے حوالے

ابنِ انشا

فرض کرو ہم اہلِ وفا ہوں، فرض کرو دیوانے ہوں
فرض کرو یہ دونوں باتیں جھوٹی ہوں افسانے ہوں
فرض کرو یہ جی کی بپتا جی سے جوڑ سنائی ہو
فرض کرو ابھی اور ہو اتنی، آدھی ہم نے چھپائی ہو
فرض کرو تمھیں خوش کرنے کے ڈھونڈے ہم نے بہانے ہوں
فرض کرو یہ نین تمھارے سچ مچ کے میخانے ہوں
فرض کرو یہ روگ ہو جھوٹا، جھوٹی پیت ہماری ہو
فرض کرو اس پیت کے روگ میں سانس بھی ہم پر بھاری ہو
فرض کرو یہ جوگ بجوگ کا ہم نے ڈھونگ رچایا ہو
فرض کرو بس یہی حقیقت، باقی سب کچھ مایا ہو

پھر وہی دشت

ایک تصویر تھی، کیا جانیے کس کی تصویر
نقش موہوم سے اور رنگ اڑا سا لوگو
ایک آواز تھی، کیا جانیے کس کی آواز
اس نے آواز کا رشتہ بھی نہ رکھا لوگو
بند آنکھیں ہوتی جاتی ہیں پساریں پاؤں
نیند سی نیند! ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو
ایک ہی شب ہے طویل، اتنی طویل
اپنے ایام میں امروز نہ فردا لوگو

(ڈاکٹر) سلیم اختر

اردو ادب کا جوگی ــــ ابنِ انشا

سیدھے من کو آن دبوچیں میٹھی باتیں سندر بول
میر، نظیر، کبیر اور انشا سارا ایک گھرانا ہو

ابن انشا نے "اس بستی کے اک کوچے میں" کے دیباچے میں اپنی نظموں اور غزلوں کو "ذاتی جوگ بجوگ کی دھوپ چھاؤں" قرار دیا تھا۔ یوں جوگ کو ابن انشا کی شعری تخلیقات کا بنیادی رنگ اور شعری کائنات کا بنیادی پتھر قرار دیا جاسکتا ہے لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ جوگ محض شاعری میں ہندی الفاظ لانے کا نام نہیں ہے بلکہ جوگ زندگی بسر کرنے کے رویئے کا نام ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ انداز زیست سے بڑھ کر شعور زیست ثابت ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد عرفان ذات کے لئے یہ منزل نما بھی بنتا ہے۔ دیکھا جائے تو درحقیقت اسی سے ابن انشا اور دیگر ہندی نما شاعروں میں امتیاز بھی کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جمیل الدین عالی سے لے کر تاج سعید تک کئی شعرا نے اپنے شعری اسلوب میں ہندی الفاظ و محاورات سے کام لیا (اور خوب لیا) لیکن اس کے باوجود وہ ابن انشا کی مانند جوگی نہیں کہلا سکتے۔ اس لئے کہ وہ جوگی نہیں تھے۔

آج جب کہ وطن عزیز کے دانشوروں میں صوفی بننے کا چلن "ان" ہے تو ایسے میں ابن انشا کا خود کو جوگی قرار دینا خوش آیند معلوم ہوتا ہے لیکن یہ جوگی ہندوؤں کا روایتی جوگی نہ تھا۔ یہ گیروے کپڑے پہن کر کھڑتالیں بجانے والا جوگی بھی نہیں اور نہ ہی یہ جوگ کے مسلمات کا اندھا پیرو ہے۔ دراصل ابن انشا لباس کا نہیں من کا جوگی تھا، جوگ بجوگ اس کا پیشہ نہ تھا بلکہ دنیا اور اس کے باسیوں کو دیکھنے پرکھنے اور انہیں سمجھنے کے لئے روشنی کا ایک زاویہ تھا۔ ایسا زاویہ جس کی روشنی میں بھگتی تحریک کی جوت شامل تھی۔

ابن انشا نے اگرچہ عام دنیا دار لوگوں جیسی عام نارمل زندگی بسر کی لیکن یہ اس کا ظاہری روپ ہوگا کیوں کہ شعر کا پردہ اٹھانے پر اندر سے بھگتی دور کا جوگی نکل آتا ہے۔ ایسا جوگی جو سور داس اور

کبیر کی جذباتی دنیا میں سانس لیتا ہے۔ جوگ کو اگر ایک نفسی واردات سمجھا جائے اور دروں بینی کا تجربہ تو پھر اس کا گیان ہر ایک کو ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے انگ بھبوت رچا کر جنگل میں دھونی رمانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ویسے جوگی بھی جب بستیوں سے منہ موڑ کر بنوں میں بسرام کرتے تھے تو یہ ترک دنیا محض ترک نہ تھی بلکہ جوگ کے تجربے کی گمبھیرتا کے گیان کے لئے ہوتی تھی۔ یقیناً جوگ کا یہ تجربہ اتنا شانت کر دینے والا ہوگا، اتنا مدھر ہوگا اور اتنا گمبھیر ہوگا کہ دنیا کی قیمت کی صورت میں یہ سودا سستا ثابت ہوتا ہوگا — کیا ابن انشا نے انسانوں کے جنگل، شور کے جنگل اور کٹھورپن کے اس جنگل میں اپنا من شانت کیا ؟ میرے خیال میں نہیں۔ اس لئے کہ ہر پگ پر دنیا کے دھوکے اور مایا موہ کا احساس کانٹے کی طرح چبھتا تھا شاید اسی لئے اس نے ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا:

اے جوگی اے درویش کوی — کیوں عمر گنوائے رمتا ہو
کیوں تن پر راکھ بھبوت ملے — تو گورکھ ناتھ کا چیلا ہو
یہ پورب پچھم کچھ بھی نہیں — یہ جوگ بجوگ بھی دھوکا ہو

جو تجھ سے جدا سب مایا ہے
یا اپنے کو گر پانا ہے

کیوں اور یہ جی کو رجھاتا ہے — یہ پیت کی ریت تو پھندا ہو
جو ہارا جان سے ہار گیا — جو جیتا وہ بھی رسوا ہو
دھونی نہ رما بسرام نہ کر — بس الکھ جگا کر چلتا ہو

تو اپنا رہ تو اپنا بن
تو انشا ہے تو انشا ہو

تو انشا ہے تو انشا ہو — اس مصرع میں گہرے معانی کی پرتیں ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا یہ جوگ بجوگ سبھی "تو انشا ہو" کے لئے تھا۔ "تو انشا ہو" عرفان کا وہ لمحہ ہے جب بیاکل من سکھ کا جھولنا جھولتا ہے اور نراش جیون میں آشا اور شا بن کر سکاتی ہے۔ مگر ابن انشا کا یہی المیہ تھا کہ وہ انشا ہونے کی منزل نہ پا سکا۔ جیون ڈور کا الجھا سرا نہ سلجھا سکا اور اسی لئے وہ اشانت تھا۔

ابن انشا نے ایک نظم "انشا جی ہے نام انہی کا" میں اپنے اداس سنسار اور اشانت جیون کی جو کویتا سنائی ہے وہ تنقیدی لحاظ سے بھی بے حد اہم ہے۔ اس میں ابن انشا نے سلطان باہو کے انداز پر "ہو" کی تکرار سے جہاں تال ایسا مدھر آہنگ پیدا کیا وہاں جوگ کا اپنا مخصوص فلسفہ بھی بیان کیا ہے:

جوگ بجوگ کی باتیں جھوٹی سب جی کا بہلانا ـــــ ہو!
پھر بھی ہم سے جاتے جاتے ایک غزل سن جانا ـــــ ہو!
ساری دنیا عقل کی بیری کون یہاں پہ سیانا ـــــ ہو!
ناحق نام دھریں سب ہم کو، دیوانا دیوانا ـــــ ہو!
نگری نگری لاکھ دوارے ہر دوارے پہ لاکھ سخی
لیکن جب ہم بھول چکے ہیں دامن کا پھیلانا ـــ ہو!
ایک ہی صورت ایک ہی چہرا بستی پربت جنگل پینٹھ
اور کسی کے اب کیا ہوں گے چھوڑ ہمیں بھٹکانا ـــ ہو!
ہم بھی جھوٹے تم بھی جھوٹے ایک اسی کا سچا نام
جس سے دیپک جلنا سیکھا، پروانا جل جانا ـــ ہو

ان اشعار میں "تو انشا ہو" کا جذبہ زیریں سطح پر لہریں مارتا ہے اور تلاش کا عمل دائرہ در دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ یہ دائرے دور دور تک پھیلتے جاتے ہیں لیکن "ہو" کی صوفیانہ پکار کی صورت میں اپنے مرکز سے پیوست بھی رہتے ہیں۔

اسی جذبہ نے ایک اور موقع پر یوں اظہار پایا:

جو نگری نگری بھٹکائے ایسا بھی نہ من میں کانٹا ہو
کیوں شہر تجا کیوں جوگ لیا کیوں وحشی ہو کیوں رسوا ہو
ہم جب دیکھیں بہروپ نیا ہم کیا جانیں تم کیا کیا ہو

"ہم کیا جانیں تم کیا کیا ہو" ـــــ واقعی ابن انشا بہت کچھ تھا۔

ابن انشا کی تخلیقی شخصیت کئی جہات کی حامل تھی۔ شاعر، مترجم، مزاح نگار، سفرنامہ نگار، کالم نگار، اور اس پر مستزاد اس کا اچھا انسان ہونا۔ یہ اضافی امر اس کی تخلیقات کے مقابلے میں شاید اتنا اہم محسوس نہ ہو لیکن اسے باقی کے مقابلے میں بلحاظ اہمیت کم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن انشا کی شخصیت کا یہ پہلو اس کی تخلیقات میں انسان دوستی کی صورت میں بالواسطہ طور پر اظہار پاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنویت نے جہاں اسے محبت کرنے والے دوستوں کا وسیع حلقہ دیا وہاں اس کے شعری مزاج کو اس تلخی اور جھنجھلاہٹ سے بھی پاک رکھا جو بسا اوقات مردم بیزار جدید شعرا کا ٹریڈ مارک محسوس ہوتی ہے۔

ابن انشا پیدائشی جوگی تھا مگر شاعری کا یہ جوگ اس کی تخلیقی ریاضت کا ثمر ہے اور وہ خاصے طویل راستے سے اس منزل تک پہنچتا ہے۔ پاکستان کی پہلی دہائی میں جو ترقی پسند شعرا منظر عام پر آئے ابن انشا ان میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ "چاند نگر" کی شاعری اسی دور کی یادگار ہے۔ اسی زمانے میں ابن انشا کی ایک طویل نظم "بغداد کی ایک رات" نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ اس نظم میں حرماں سے ایک سلگتی کیفیت کا تو احساس ہوتا ہے لیکن تلخ نوائی نہیں ملتی۔ نظم کی داخلی فضا میں جذباتی توازن سے فنی ہم آہنگی ملتی ہے اور احساسات کے مد و جزر کے ساتھ ساتھ الفاظ اور ان سے وابستہ تلازمات ڈوبتے اور ابھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ابن انشا کی یہ نظم بلاشبہ جدید شعری ادب میں ایک اہم ترین اضافہ قرار دی جا سکتی ہے۔

ابن انشا کی شعری کائنات میں بقول اس کے: —— پریم کا کاسہ روپ کی بھکشا، گیت غزل دوہے کبتائیں —— سب کچھ ملتا ہے اور یہی کچھ وہ دوسروں کو بھی دے سکتا تھا چنانچہ ایک شعر میں یوں کہا:

اور تو فیض نہیں کچھ مجھ سے اے بے حاصل لے بے مہر
انشا جی سے نظمیں، غزلیں، گیت کبت لکھواتی جا

ابن انشا نے ہر میڈیم میں اپنی تخلیقی شخصیت کا اظہار کیا تھا لیکن غزل سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت معلوم ہوتی ہے اور غزل بھی دوہا نما۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کی صرف ایک غزل:

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں اب جی کا لگانا کیا

پر لگا کر اڑ گئی اور بلاشبہ اسے بچے بچے نے گایا لیکن اس ایک مقبول ترین غزل کے ساتھ اس کی مقبول غزلوں کا ذخیرہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایسی ایسی بہت سی غزلیں ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ابن انشا نے جو نظمیں دوہے کے اسلوب میں لکھیں وہ غزل کی کو ملتا اور سندرتا لیے ہیں۔ وہی جذبہ کا رچاؤ اور وہی آس نراس کی جوالا جو کبھی بل کھا کر ابھرتی اور بھڑکتی ہے تو کبھی دب کر کمھلا جاتی ہے۔ ابن انشا نے ان غزلوں یا غزل نما نظموں میں اردو کی غالب شعری روایت سے انحراف کرتے ہوئے مفرد اسلوب کے برعکس ہندی کے سبک اور کومل الفاظ سے ان کا سنگھار کر کے ان کی سندرتا کو من موہنا نیا روپ دیا۔ اس لیے ابن انشا کی آواز الگ اور لہجہ منفرد تھا۔ اس حد تک کہ اگر انھیں دیوناگری لپی میں لکھ دیں تو یہ "ادھر" کی چیز بن جائیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

سانجھ سے اک مست کوی یوں گیت منوہر گاتا جائے
پل پل بڑھتے اندھکار میں دھیان کے دیپ جلاتا جائے
اک سم سم سے لاکھ جھروکے روشنی کے کھلواتا جائے
سارے جگ کا روپ سمیٹے جھولی پھر پھیلاتا جائے
اکتارے کا میگھ دوت تانوں کا مینہ برساتا جائے
چنچلتا، مسکان، مدھرتا کیا کیا پھول کھلاتا جائے
جانے کس بستی، کس پربت کس بن کو مدماتا جائے
قدموں کی پہچان مٹاتا راہوں کو الجھاتا جائے
جگ کے بھید اجاگر کرتا اپنے بھید چھپاتا جائے
گیتوں کی جوالا بھڑکاتا تن من کو پگھلاتا جائے
بیتی گھڑیوں کی یادوں کے تیروں سے برماتا جائے
بھٹکاتا، بہلاتا بے کل کرتا دھیر بندھاتا جائے

گذشتہ تیس برس کی شعری تاریخ کا جائزہ لینے پر الفاظ کے بارے میں کئی رویے نمایاں ہوتے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف وہ شعرا تھے جنھوں نے الفاظ کو سومنات کا بت جانا تو خود کو محمود غزنوی۔ چنانچہ نئی لسانی تشکیل کا گرز لے کر الفاظ پر پل پڑے اور توڑ موڑ کر انھیں ادھ مرا کر دیا۔ اس میں چونکا دینے کی سنسنی اور اس سے حاصل ہونے والی فوری شہرت تو تھی لیکن دائمی اہمیت کی حامل تخلیقات اور سنسنی خیز فلموں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ خواہ کتنے ہی کھڑکی توڑ ہفتے رش کیوں نہ لے لے۔ ایک دن اترنا اس کے مقدر میں ہوتا ہے۔ سو یہی ان شعرا کا انجام ہوا۔ دوسری طرف وہ شعرا تھے جو اردو میں نئے الفاظ کا آہنگ شامل کرنے کے تجربات کر رہے تھے۔ ان دو گروہوں سے ہٹ کر کچھ شعرا ایسے بھی تھے جو شاعری میں غالب کی مفرس اور اقبال کی معرب روایات سے ہٹ کر ہندی الفاظ کی صورت میں ایک نئے شعری آہنگ کی جستجو کر رہے تھے۔ اگرچہ گیت اور دوہے کی بنا پر اردو میں ہندی الفاظ مروج رہے ہیں لیکن غزل کو دوہا بنا دینے کا کامیاب تجربہ ابن انشا نے کیا۔ ابن انشا نے ہندی الفاظ محض اس لئے نہ استعمال کئے تھے کہ یہ نرم آہنگ اور صوتی اعتبار سے متحرک اور رواں دواں تھے۔ اس انداز پر دیگر شعرا نے بھی ہندی الفاظ کو برتا ہے لیکن ابن انشا اور ایسے دیگر شعرا میں اس بات سے فرق پیدا ہوتا ہے کہ وہ ابن انشا نہ تھے۔ نہ ان کے پاس ابن انشا کا طرز احساس تھا اور نہ ہی اس کا جوگ

بجوگ ! ابن انشا کی مانند اس کی شاعری کا مزاج بھی ایک جوگی جیسا ہے جوگی جو بستی بستی نگر نگر گھومتا ہے جس کا من شہر میں شانتی نہیں پاتا۔ جو پریم رس میں ڈوبے گیت تو سناتا ہے لیکن پریم ڈور میں بندھ کر بھی نہیں رہ سکتا۔ انشا جی جو اپنا ناتا میر کے بیت، کبیر کے کبت اور نظیر کے شعر سے جوڑتے۔

اس عشق کے درد کی کون دوا، مگر ایک وظیفہ، ایک دعا
پڑھو میر و کبیر کے بیت کبت، سنو شعر نظیر فقیر غنی[1]

میر و کبیر کے بیت کبت پڑھنے والے ابن انشا کا یہ بچہ کچھ یوں ہے :

انشا جی ہے نام انہی کا چاہو تو ان سے ملوائیں
ان کی روح دہکتا لاوا ہم تو ان کے پاس نہ جائیں
یہ جو لوگ بنوں میں پھرتے جوگی بیراگی کہلائیں
ان کے ہاتھ ادب سے چومیں ان کے آگے سیس نوائیں
نا یہ لال جٹائیں رکھیں نا یہ انگ بھبھوت رمائیں
نا یہ گیرو رنگ فقیری چولا پہن پہن اترائیں
بستی سے گزریں تو سارے پنگھٹ کی سندر بالائیں
ان کی پیاس بجھانے کو خود امڑ گھمڑ بادل بن جائیں
نگری نگری گھومنے والوں میں ان کی مشہور کتھائیں
ویسے بات کرو تو لاج کے مارے آنکھیں جھک جھک جائیں
نا ان کی گدڑی میں تانبا پیسہ نہ منکے مالائیں
پریم کا کاسہ روپ کی بھکشا گیت غزل دوہے کوتائیں

ابن انشا نے اپنے شعری مزاج میں جوگی کو ڈھال لیا کہ جوگی نے شعر کا چولا پہن لیا۔ اس میں امتیاز مشکل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ابن انشا کی عاشقانہ شخصیت کو اگر کسی ایک جذبہ کسی ایک رجحان یا کسی ایک لفظ سے واضح کرنا ہو تو وہ لفظ ہے جوگی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غزل میں جس طرح عاشق دیوانہ اور سودائی بنتا ہے ٹھیک اسی انداز پر ابن انشا کے یہاں جوگی آتا ہے۔ اس خیال کو اس امر سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ ابن انشا نے ایک تو جوگی کو ہندو کلچر کے روایتی تناظر سے الگ کر کے لیا اور

---

[1] ایک اور موقع پر یوں کہا:

شعر میں نظیر ٹھہرے، جوگ میں کبیر ٹھہرے

دوسرے جوگ بجوگ کے فلسفیانہ تصور سے بھی مخصوص شغف کا اظہار نہ کیا۔ چنانچہ اس انداز کے تمام اشعار میں ابن انشا نے جوگ کو عشق کی حرماں نصیبی، دل کی بے چینی اور فراق کی تلخی کے لئے استعمال کیا ہے۔ یوں ابن انشا کا جوگی اردو غزل کا روایتی سودائی بن جاتا ہے:

زش پہ بیٹھے اک جوگی نے عرش کے چاند پہ ہارا جی
شعر ہمارے سننے والو — رکھیو جان سے پیارا جی
ہر بستی ہر گھر پر چنچل چاند نے چہرا چمکایا
اس جوگی کے حصے میں پر گھور اندھیرا ہی آیا
متوالے نے سپنوں کے تاگوں کی چادر پھیلائی
اجیارا تو کیا ملتا — جگ نے ٹھہرایا سودائی
یاروں نے سو سو جتنوں سے سمجھایا ناکام ہوئے
جوگی جی دامن ہی دامن پھیلائے بدنام ہوئے
دور افق پر چندا پل بھر ٹھٹکا ہنس کر ڈوب گیا
انشا (ہاں وہ رمتا جوگی) دنیا سے محجوب گیا

جوگی ابن انشا کی جذباتی دنیا کی مرکزی علامت ہے۔ اس لئے ابن انشا انسان جوگی نہ ہو مگر ابن انشا شاعر یقیناً جوگی بن جاتا ہے اور جب جوگی اپنی بانی میں بات کرے گا تو وہی شبد لائے گا جو جوگ کی کویتا سنا سکتے ہوں، وہی کبت کہے گا جو جوگ بجوگ کا درپن بن سکتے ہوں۔ یوں دیکھیں تو ہندی الفاظ ابن انشا کی شعری ضرورت بن جاتے ہیں اور جذبہ کی جس کو ملتا اور سندرتا اور شیتلتا کی کتھا سنانا چاہتا تھا اس کے لئے مفرس اور معرب اسلوب کی ضرورت نہ تھی۔

ابن انشا نے ایک باعمل اور کامران زندگی بسر کی۔ ایک اہم ادارے کی کامیاب سربراہی کی۔ ایک مشہور اخبار میں مستقل کالم نگاری کی۔ کتابیں لکھیں اور جہاں نوردی کی۔ محاورۃً نہیں بلکہ سچ مچ کی جہاں نوردی۔ ابن انشا کی ایک کتاب ہے "ابن بطوطہ کے تعاقب میں"۔ اس عنوان میں خاصی کسر نفسی سے کام لیا گیا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی آگے آگے ابن انشا اور اس کے تعاقب میں مارکوپولو، ابن بطوطہ، ہین سانگ، رچرڈ برٹن، کولمبس اور نہ جانے کون کون نظر آتے ہیں۔ ابن انشا وہاں بھی گیا جو چڑھتے سورج کی دھرتی ہے اور وہاں بھی جہاں سورج گدلے پانی کی جھیل میں ڈوبتا نظر آتا ہے اور سامنے چند میل کے فاصلے پر نظر آنے والے ساحل پر نئے دن کی تاریخ،

تبدیل ہوتی نظر آتی ہے ـــــ یہ سب کیا تھا؟ یہ بھی ایک طرح کا جوگ تھا کہ مناظر کے تنوع میں دل کا درد نہ ڈوبا:

ہم نگری نگری گھومے تو جب نکلے تھے آوارہ ہو
وہ لندن ہو، وہ پیرس ہو، وہ [illegible]، وہ رُما ہو
وہ کابل ہو وہ بابل ہو وہ جاوا ہو وہ لنکا ہو
وہ ساحلِ سپین ورائن ہو یا ساحتِ نیل و دجلہ ہو
وہ چین کا دیش وشال کہیں یا پچھم دیس امریکہ ہو
وہ چوٹی فیوجی یاما کی یا ایلپس کا پربت اونچا ہو
وہ چیتیں گلابی لیڈن کی یا نیلا آب جنیوا ہو
دن استنبول کی گلیوں میں یا شب کی سیر براہا ہو
کچھ صورتیں تھیں کچھ مورتیں تھیں کچھ اور بھی شاید دیکھا ہو
جہاں نظریں ٹھہری ٹھٹکی ہوں جہاں دل کا کانٹا اٹکا ہو
پر ہم کو تو کچھ یاد نہیں کچھ کھویا ہو کچھ پایا ہو
ان باتوں میں ان گھاتوں میں سنجوگ کا کوئی لمحہ ہو
ہم اپنے جو خود آپ نہیں، پھر بولو کون ہمارا ہو
یوں سمجھو شہر سرائے میں شب بھر کے لئے کوئی اترا ہو
کوئی پردیسی کوئی سیلانی وہ جس کا دور ٹھکانا ہو
شام آئے سویرے کوچ کرے، جب دھندلا دھندلا رستہ ہو
جب دھرتی سوتی ہو
جب انبر پھیکا پھیکا ہو

پرانے وقتوں کے جوگی ان دیکھے بنوں میں من کا اک تارا بجاتے تھے۔ آج کے جوگی کے لئے بن نہیں رہے کیوں کہ توسیع شہر کے منصوبوں نے انھیں نگل لیا ہے۔ آج کے جوگی کا انسانوں کے جنگل میں بھٹکنا مقدر ہے اسی لئے وہ تو بعض اوقات گھر میں بن باس لیتا ہے۔ ابن انشا بھی عمر بھر اپنے مقدر کی تکمیل میں مصروف رہا۔ ملک ملک گھوم کر، ہنس کھیل کر، شگفتہ کالم لکھ کر اور ایک پریم رس میں ڈوبی کسک تامیں کہہ کر!

" بغداد کی ایک رات " سے لے کر " اس بستی کے اک کوچے میں " کی دوہا رنگ شاعری تک ابن انشا نے شعر میں جوگ بجوگ کے کئی روپ دکھائے ہیں اور وہ ہر روپ میں چھیلا اور من موہنا ہے۔ میں نے مضمون کی ابتدا میں ابن انشا کے مرد شریف ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا تو اس جوگ لینے میں بھی اس نے طبعی شرافت کا ثبوت دیا یعنی یہ نہیں کہ جوگ لیا اور سنگی ساتھیوں کو چھوڑ گیا بلکہ جوگی بن کر بھی اس نے اپنی فن کارانہ ذمہ داریوں کو نبھایا اور بڑے سلیقے سے نبھایا۔ یوں یہ جوگ لینا بھی اس کے فنی آدرش کا ایک حصہ بن جاتا ہے یہی نہیں بلکہ اس نے جوگی پن کی کیفیت سے شعروں کی مالا پرو کر ہم ایسوں کو بھی اس تجربہ کی سندرتا کے رس کا مزا چکھایا۔ ہم جو اتنے خوفزدہ ہیں کہ جوگ بھی نہیں لے سکتے۔

ابن انشا کا ایک شعر ہے :

پوچھو کھیل بنانے والے پوچھو کھیلنے والے سے
ہم کیا جانیں کس کی بازی ہم جو پتے باون ہیں

اور پھر ایک تاش کا یہ پتہ ڈال کے پتے کی طرح ٹوٹ گیا اور انجان ہواؤں میں بکھر گیا۔

پتہ کا پتا
ڈال سے ٹوٹا
جوگی کی جھولی میں اگر
اے جوگی تو کون ؟

پتہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اڑا ـــــ یوں پتہ کی مانند ٹوٹ کر اس رتے جوگی نے ایک اور روپ دھار لیا ایک نیا سوانگ رچا لیا اور کون جانے اب وہ پہلے سے زیادہ شانت ہو یا پھر پہلے سے بھی زیادہ جوگی۔

نا اپنے کو پتا جانے ، نا خود کو جوگی پہچانے
دونوں پیا ہے دونوں ہانپیں اک دوجے کی گردمیں کانپیں
دونوں اک دوجے میں سمائے ، کس سے پوچھیں کون بتائے
اے پتے تو کون ؟ اے جوگی تو کون ؟

ابنِ انشا

من چہ می سرائم.....!

میں نے چھے سال ہوئے اپنی شاعری کی کتاب چاند نگر کے دیباچے میں اپنی بات کو سہارا دینے کے لئے ایک دو نقلیں بیان کی تھیں۔ ان میں سے ایک نقل "ایڈ گر ایلن پو کی نظم ایلڈوریڈو یعنی شہر تمنا تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک بہادر جی دار نائٹ اونچی بنا دھوپ اور سایے سے بے پروا ایلڈوریڈو کی تلاش میں ایک مستانہ گیت گاتا گھوڑا اڑاتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن برسوں گزر گئے۔ زندگی کی شام آگئی، اسے روئے زمین پر کوئی خطہ ایسا نہ ملا جو اس کے شہر تمنا کی مثال ہو۔ آخر جب اس کی تاب تواں جواب دینے کو تھی اسے ایک بڈھا کھوسٹ یاتری ملا۔ جو سفر کی صعوبتوں سے گھل کر سایے سے سماں رہ گیا تھا۔ اس پیر فرتوت نے کہا۔ اگر تمہیں اس شہر جادو کی تلاش ہے تو چاند نگر کی پہاڑیوں کے ادھر سایوں کی وادی طویل میں قدم بڑھائے گھوڑا دوڑائے آگے ہی آگے بڑھے چلو۔" اس سے نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ شہر تمنا ملے نہ ملے۔ اس نائٹ کو سفر جاری رکھنے اور گھوڑا آگے بڑھانے کا بہانہ ضرور مل گیا۔ شاعر کو بھی ذہنی طور پر سندباد جہازی یا یولی سس ہونا چاہئے یعنی اس کے سامنے ایک نہ ایک چاند نگر ایک نہ ایک ایلڈوریڈو ہونا چاہئے۔ یہ منزلیں کوہِ ندا کی طرح مسافروں کو اپنی طرف بلاتی تو ہیں، واپس نہیں بھیجتیں۔ سمجھ دار لوگ کبھی ان منازل موہوم کا رخ نہیں کرتے۔ ہاں کچھ دیوانے ہیں کہ جادو کے شہروں کی جستجو میں جولاں و سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ نہ ہوتے تو انسان کی زندگی بڑی سپاٹ اور بے رنگ ہوتی۔"

لیکن میں اور میرے ہم عصروں نے جس دور میں ہوش کی آنکھ کھولی۔ جادو کے شہروں کا رواج اٹھ گیا تھا۔ اسپین کی لڑائی اور ہٹلر کی ترکتاز ہمارے بچپن کی باتیں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم بھی ہمارا شعور بیدار ہوتے ہوتے ختم ہو چلی تھی۔ ہندوستان میں بھی آزادی کی لڑائی لڑی جا رہی تھی۔ لیکن بڑی حد تک آئینی تھی۔ بمبئی کی طرف ہنگامے اٹھتے اور پٹاخے چھوٹتے لیکن بمبئی ہمارا مدار نہ تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی بیسویں صدی کی عینیت کی چار دیواری میں بیٹھے تلواریں مارتے

تھے۔ ہماری مثال ڈان کوئیگزاٹ کی سی تھی جو کتابوں کے سہارے زمانۂ شجاعت میں رہتے بستے تھے۔ خیر یوں بھی یہ طالب علمی کا کچا زمانہ تھا اور ابھی درسی اور فنی تعلیم کا جھمیلا بھی درمیان تھا۔ اس لئے معاملات عشق سے باہر قدم مشکل سے جاتا تھا۔ میری پرورش بھی ادب اور سیاست کے مرکزوں سے دور ہوئی۔ اس لئے بلوغ تک پہنچنے میں (اگر کبھی پہنچا) دیر لگی۔ ساحر لدھیانوی سے دوستی اور قرب تھا۔ ساحر کو میں نے دیکھا کہ شاعری کی سطح پر رہ کر بات کرتے تھے۔ لیکن فکر اتنی سلجھی ہوئی تھی کہ مباحثے کی نوبت نہ آتی تھی۔ میری فکر کی تہذیب میں ساحر کا بڑا حصّہ ہے۔ پھر بھی ہنگامی موضوعات پر میں نے کم ہی کچھ لکھا۔ "بغداد کی ایک رات" اس مجموعۂ افکار و تاثرات کا ادبی روپ تھی اور اس سے میری شہرت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ انھیں دنوں دور مشرق میں کھانڈے سے کھانڈا بج رہا تھا۔ چین کی ادبیات اور تاریخ میرا پرانا شوق ہے اور چین کی خانہ جنگی پر ہر طرح کا لٹریچر میں نے پڑھ رکھا تھا۔ شنگھائی غالباً میری سب سے جوشیلی نظم ہے۔ اس میں دھیمے پن کے بجائے میار زطلبی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے "چاندنگر" کے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ "میرا انکارانہ احساس کوریا کی لڑائی کے زمانے میں جاگا میں عامی کے طور پر مدت سے یہی کچھ سوچتا سمجھتا تھا لیکن جذبے میں ایسا تیکھا پن یا رچاؤ پیدا نہ ہوا تھا کہ شاعری میں ڈھل سکتا۔"

سارتر نے نازی غلبے کے خلاف جدوجہد کے دنوں میں جو لکھا تھا، اس کا ذکر بھی میرے دیباچے میں آیا۔ "ادیب جو اپنے زمانے اور اپنے ماحول کا باسی ہے۔ اس کی ہر آواز گردوپیش کی فضا میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ اور ہر خاموشی کا بھی ایک ردِعمل ہوتا ہے۔ فرانس میں کمیون کے بعد لوگوں پر جو ظلم ڈھائے گئے۔ ان کے لئے میں فلا بیر اور گانکور کو قصور وار ٹھہراتا ہوں۔ کیوں کہ انھوں نے ان کے روکنے کے لئے ایک حرف بھی تو نہیں لکھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کا کام نہیں تھا تو کیا تراں کیلا کا معاملہ والیٹر کے فرائض میں داخل تھا۔ کیا ڈریفس کی وکالت زولا پر فرض تھی؟ کیا کانگو کے مستبد حاکموں کے خلاف آواز بلند کرنے کی ذمہ داری آندرے ژید پر عاید ہوتی تھی۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے مخصوص حالات میں ایک بار رک کر سوچا کہ بحیثیت ادیب میری کیا ذمہ داری ہے۔ ہمارے ملک میں جرمنی قبضے نے ہمیں ہماری ذمہ داری سمجھا دی ہے۔"

پھر میرے سامنے گرم کی پریوں کی کہانیوں کا وہ ضدی بونا بھی تھا جو سر ہلا کر کہتا ہے۔ "انسانیت کا دھیلا بھر جوہر میرے نزدیک دنیا بھر کی دولت پر بھاری ہے"۔۔۔۔ در ہمہ جوانی چنانکہ افتد دانی۔ یہ دھیلا بھر جوہر، سارتر کی معاصر ذمہ داری کے ساتھ آمیز ہو کر بہت سی نظموں میں ڈھل گیا۔

"مضافات"، "امن کا آخری دن"، "افتاد"، "سرائے"، "کوہ جے کی لڑائی"، "کوریا کی خبریں" وغیرہ (آخر الذکر دونوں نظمیں چاندنگر میں شامل نہیں) ان کو میں اب بھی اپنی قابلِ ذکر نظمیں سمجھتا ہوں۔ اس دیباچے میں میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ "دکھ اور آسودگی، احتیاج و فراغت، جنگ اور امن، زندگی کے بنیادی مسائل میں سے ہیں۔ جو شخص ان سے اثر قبول نہیں کرتا وہ اپنے ساتھ، زمین زاد بھائیوں کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتا۔۔۔۔" "آج کے زمانے میں ذہنی یا جسمی بن باس ممکن نہیں۔ کسی پہاڑ کی کوئی گپھا ایسی نہیں جس تک زہریلی گیس یا تابناک راکھ نہ پہنچ سکتی ہو۔ برندا بن یا تپو بن ایسا نہیں کہ جس کے بطن میں فوجی طیاروں کا اڈہ نہ ہو۔ اس لئے ہمیں زندہ حقیقتوں سے پیچھا چھڑانے کے بجائے ان سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ نفسیاتی مغالطوں کا بیوپار کرنے والے مصنفوں کی طرح نہیں۔ کرم کے بونے کی طرح جس کے لئے ڈھیلا بھر انسانیت ساری دنیا کی دولت پر بھاری ہے۔ کسی خداوندکی ناکامی اور کامیابی کا معیار یہ نہیں کہ اس سے کسی ڈھلمل یقین انٹلکچول کی ذہنی تشفی ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس سے لاکھوں کروڑوں غیر انٹلکچول انسانوں کی زندگی میں مسرت اور شادابی کا گزر ہوا کہ نہیں۔"

یہ بات جو کل بھی سچ تھی۔ آج ہائڈروجن اور نائٹروجن بم اور خلائی مداروں اور چاندکی پروازوں کے زمانے میں اور زیادہ سچ ہے۔ کل بھی سچ ہو گی اگر اس کے ماننے نہ ماننے والے ایٹمی جنگ اور تابکاری کے سرطان سے محفوظ رہے تو؛

میں LOW BROW کہلانے میں مضائقہ نہیں سمجھتا اور سنجیدہ و فہمیدہ لوگ میری باتوں کو PLATITUDES ہی کہیں گے۔ لیکن ادب کی تجریدیت سے میری مفاہمت مشکل ہے۔ میں نے لکھا تھا۔ "مغرب کی ہم اور چاہے کتنی ہی باتیں اپنالیں، مغربی شعور کو نہیں اپنا سکتے۔ کیونکہ وہ صدیوں کی حاکمیت اور ہے۔ یورپ مادی اور سیاسی طاقت کے طور پر زوال پذیر ہے۔ اس لئے اس کے ادب میں تجریدیت اور اضمحلال کا عمل دخل شروع ہو گیا ہے، ایسے لوگ طبقاً ویدانتی اور تصوف پسند ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی خواہشِ مرگ اور اس قسم کی بے روح متصوفیت نے اس قسم کے ادوار میں ترقی کی تھی۔ یہی حال ان لوگوں کی کلبیت کا ہے لیکن مشرق کے کسی ملک کے ادب میں اس قسم کے انحطاطی اور انفعالی رجحانات یا تو خلقی کمزوریوں سے پیدا ہو سکتے ہیں یا مغربی ادب کی تقلید سے۔ وہ ایشیائی اور مشرقی روح کی کسی طرح نمائندگی نہیں کر سکتے۔"

ایک اور اہم بات جس کا بعض نقادوں نے حوالہ دیا۔ میری یہ گذارش تھی کہ "میں افتادِ طبع کے اعتبار سے بے شک رومانی بلکہ الف لیلوی واقع ہوا ہوں۔ لیکن ایک ایسی دنیا کا باسی ہوں جو شہزادوں کی دنیا سے مختلف ہے۔ تاہم

میرے ہاں ـــــ "اے میری جان انقلاب" کی طرح دریا کو کوزے میں کہیں بند نہیں کیا گیا۔ مجھے آنچل کو پرچم بنانے کی ادا پسند ہے۔ ہماری شاعری جذبات کے لحاظ سے سن بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔ اس میں اس قسم کی باتیں بچکانہ معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے عشق اور غیر عشق کے محاذوں پر الگ الگ لڑنا پسند کیا ہے۔"

آنچل کو پرچم بنانے سے اشارہ ایک شعر کی طرف تھا ؎

تیرے ماتھے پہ یہ رنگین آنچل خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

چونکہ یہ کلام ایک مشہور اور مقبول ترقی پسند شاعر کا ہے اس لئے کسی کا اس سے الگ راہ اختیار کرنا، بلکہ اس کو رد کرنا خوش عقیدہ لوگوں کو برا محسوس ہوا۔ اور یہ کہا گیا کہ صاحب عشق اور غیر عشق کے محاذ الگ الگ کیسے بن سکتے ہیں۔ میدان جنگ میں جاتے ہوئے محبوبہ کو کیسے پیچھے چھوڑا جا سکتا ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ آنچل اپنی جگہ ہے۔ پرچم اپنی جگہ۔ دونوں کو خلط ملط نہ کیجئے۔ کم از کم میں نے محبوبہ سے شاعری میں پیار کرتے وقت کوریا کی خندقوں کا کبھی نہیں سوچا۔ نہ الجزائر کی کانٹے دار باڑوں اور بارود کی بدبو میں محبوبہ کی زلفوں کو چومنے کی بات کی ہے۔ وہ مجاز کا احساس تھا اور اسے مبارک اس کے زمانے اور ماحول میں شاید وہی ٹھیک ہو۔ میرا احساس یہ اپنا احساس ہے۔ ترقی پسندی میں سکہ بندی کو میں نہیں مانتا۔ ایک سا چہرہ، ایک سے دندانے، ایک سے حروف ایک کو دوسرے سے الگ کرنا اور پہچاننا محال ہے۔

۱۹۵۵ء پر جب کہ میں نے یہ باتیں اپنی شاعری کے ناطے سے لکھیں تھیں۔ کچھ زیادہ برس نہیں گذرے۔ لیکن اتنے ہی میں بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ چاند نا قابل حصول منزلوں کا سمبل رہا ہے۔ لیکن اس اثنا میں زمین کے راکٹوں کی زد میں آچکا ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ زمین والے وہاں بستی بسالیں۔ اس سے انسان کی نظر میں وسعت ضرور آگئی ہے۔ لیکن انسانیت کے بنیادی مسئلے اپنی جگہ پر ہیں۔ احتیاج اور آزادی کا مسئلہ۔ ظلم اور جنگ کا مسئلہ۔ میری سوچ کی پہنچ قریب قریب وہی ہے جو کہ تھی لیکن یہ دیکھنے کی بات ہے کہ اب اس قسم کی نظمیں لکھنا میرے لئے ممکن نہیں۔ احساس کند ہو گیا ہے۔ یا مصلحتوں نے زنجیر کر لیا یا تن آسانی آگئی۔ انکار کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ تھوڑی تھوڑی کر کے سبھی چیزیں ہیں جنھیں میں شاید پختگی یا توازن کا نام دوں۔ چاند نگر کی شاعری کے بعد غالباً ایک نظم "کاسا بلنکا" جہاں اطلس کے دامن میں فرانسیسیوں کے ہاتھوں مراقشیوں کا خون بہا تھا۔ اور اس کے چند سال بعد الجزائر کے بارے میں (مغرب کی اذاں) ان دونوں میں

جذب صادق ہے اور تیکھا ہے اور دونوں نظمیں بجبرد خبریں دیکھنے کے بعد اعصاب کو پوچھ کر لکھی گئیں ہیں۔ لیکن ان دونوں نظموں کو چھوڑ کر ـــــ یا ایک آدھ اور ہوگی جو مجھے یاد نہیں ـــــ باقی شاعری آج کی ماتیما ہے جو کوئے دلدار میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی میرے پہلے پڑھنے والے مجھ سے توقع نہ کرتے تھے۔ لہٰذا میرے خیال میں یہ ہوا کہ پہلے پڑھنے والوں کا حلقہ سکڑتا گیا۔ ان کو میرا کلام مطمئن کرنے سے قاصر رہا۔ لیکن ایک دوسرا اتنا ہی بڑا یا اس سے زیادہ بڑا حلقہ پیدا ہوگیا جس کے لئے لٹک دار ہندی بحروں اور آسان لفظوں میں لکھی ہوئی یہ ماتیما بڑی لذت رکھتی تھی۔ سبھی کی اپنی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ میری کہانی ان کی کہانیوں کا ادبی روپ تھی۔ جذبے کی تہذیب کا مجھے موقعہ نہ ملا۔ جیسا بڑے شاعروں کے یہاں ہوتا ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں، جنھیں اس موقع پر بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔

اب رہا سرمایہ غزل اور وہ بدنام چیز جسے تقلید میر کہتے ہیں۔ ہاں میں مزاجاً میر کا حلقہ بگوش ہوں۔ لیکن تقلید کیا معنی؟ (مجھے رواں دواں بحروں میں غزل ہی نہیں نظم بھی) لکھنے میں آسانی معلوم ہوتی ہے اور میں لکھتا ہوں۔ اتفاق سے میر کے کلام کا ایک حصہ انھیں بحروں میں ہے اب نظموں میں ان بحروں کے استعمال کو بھی آپ تقلید ہی کہیں گے؟ غزل کا میں عاشق جانباز کبھی نہیں رہا۔ میں نے "چاندنگر" میں جو بات لکھی تھی وہ اب بھی میرا عقیدہ ہے کہ غزل سے حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شیفتگی اردو شاعری کی ترقی کے امکانات کو نقصان پہنچائے گی۔ بیس پچیس برس پہلے کی نسل نے اردو شاعری میں تجربے اور بغاوت کی جو شمعیں روشن کی تھیں وہ اس دور کے تن آسانوں نے احیائے غزل کا عذر مستی رکھ کے بجھا دی ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میری یہ تشویش ۱۹۵۵ء کے حساب سے ٹھیک تھی۔ اس کے بعد نظم گویوں کے قافلے آنے شروع ہوئے۔ جن میں ندرت، تازگی، اجتہاد، کلاسیکیت اور جدیدیت سبھی کے محمود عناصر شامل ہیں۔ ایک زمانے میں طویل نظم کہنے والوں میں میرا شمار ضرور ہوتا تھا۔ اب میدان ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو صحیح معنوں میں شاعری کے کینوس کو وسعت دے سکتے ہیں اور دے رہے ہیں۔ مجھے اپنے ان ہم عصروں پر فخر ہے۔ یہ لوگ اگر مغربی کلاسیکیت کے ایسے فدائی نہ ہوں اور اپنی دھرتی میں مضامین کاشت کریں۔ اور اپنے ہاں کا مزاج آہنگ اور زبان پیدا کرنے کی کوشش کریں تو روح عصر کو گرفت میں لے سکتے ہیں۔

میں نہیں جانتا مجھے اپنی شاعری کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت ہے اور اوپر جو کچھ کہا ہے۔ اس کی بھی کہاں تک ضرورت تھی۔ اگر مجھے فقط اپنی آج کل کی شاعری کے متعلق کچھ کہنا ہوتا

تو بڑی آسانی تھی کیوں کہ اوّل تو میں آج کل شاعری کرتا نہیں۔ جو ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن چونکہ میری شاعری کا معتدبہ حصہ "چاندنگر" کے دور کا ہے۔ اور یہاں مطلب میری تمام تر شاعری سے ہے۔ اس لئے وہ تعلیس اور فلسفے بیان کرنے پڑے جو اس مضمون کے ابتدا میں آگئے ہیں۔ مجھے نہ اِس عشق پر ندامت ہے نہ اُس عشق پر۔ نہ میں لیبلوں کی پروا کرتا ہوں میرا تو نظریہ فقط یہ ہے کہ جو کچھ سوچئے جو کچھ دیکھئے اسے اپنے مزاج کے آئینے میں جھلکا کر لکھئے۔ اپنی طرز پر جمے رہئے۔ "میاں آزاد ـــــ جواب نہ دیکھے گا کوئی کبھی تو دیکھے گا۔" ناقدری کا سارا الزام قارئین کی بے ذوقی یا بد ذوقی پہ نہ رکھئے۔ کہیں اپنا ہی قصور نہ نکل آئے۔ کوئے دلدار کی اقامت لئے دلوں نہ اختیار کیجئے کہ مجرب اور رقیب سبھی گدائے سرِراہ سمجھنے لگیں۔ گرد و پیش سے آنکھیں نہ موند لیجئے، کان نہ لپیٹئے۔ ہاں دیکھنے سننے کے بعد ان سے اعتنا کرنا نہ کرنا آپ کی خوشی ہے۔ اپنے ہم عصروں اور اپنے سے دس بیس برس بڑے لوگوں سے ایک بات مجھے اور کہنا ہے وہ یہ کہ آپ ادب میں تاجداری کا پٹہ لکھوا کے نہیں لائے۔ وہ خون گرم جو دس بیس برس آپ کی رگوں میں تھا اب نوجوان تر نسل کی رگوں میں ہے۔ آپ اپنا زور صرف کر چکے تو محفل کو آداب کیجئے اور تشریف رکھئے۔ نئے آنے والے قافلے کا راستہ نہ روکئے۔ ☐

ذوالفقار تابش

جوگ بجوگ

انشاجی میں بیک وقت ایک بے کل اور شانت روح تھی ۔ یہ مجھے پتہ نہیں کہ وہ بے کل زیادہ تھے یا شانت زیادہ تھے ۔ میں نے ان کے دونوں روپ دیکھے ہیں ۔ پھر بھی میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہے ۔

مثلاً میں نے انھیں کبھی کسی کا شکوہ کرتے نہیں سنا ۔ کبھی کسی کی شکایت کرتے نہیں دیکھا ۔ کسی کے خلاف گفتگو کرتے نہیں پایا ۔ وہ سب کچھ سن کر بڑی آسانی سے سہہ جاتے اور ہضم کر جاتے تھے ۔ بہت ہوا تو کہہ دیا ارے بھئی ایسا ہی ہے ۔"

یہ رویہ ایک بڑے صاحب ظرف ، بہت بڑے صاحب عرفان ، اور بہت بڑے شانت انسان ہی کا ہو سکتا ہے ۔ آج کے عہد میں جب کہ زبانیں تیغ صفت ہو گئی ہیں ۔ لفظ انگارے بن گئے ۔ قلم زہر اگلنے لگے ہیں ۔ ذہنوں میں نفرت ، حقارت اور حسد کے شعلے لپکنے لگے ہیں ۔ دلوں میں منافقت اور انا کا تعفن پرورش پا رہا ہے ۔ ایسے میں ایک شخص ہے جو کسی کا شکوہ ہی نہیں کرتا ۔ کسی کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا ۔ جو صرف سنتا ہے انتقام نہیں لیتا ۔ اس سے زیادہ شانت اور کون ہو سکتا ہے ۔

دوسری طرف ان کی بے کلی اور ان کی سیماب پائی دیکھو ۔ قریہ قریہ گھومنا ۔ آج یہاں ، کل وہاں ۔ ان کی شاعری ان کا جوگ بجوگ ۔ ان کی نظموں میں ایک دکھی روح کی پکار ، ان کی چال ڈھال کی بیقراری ، مزاج کا تلون ، کرسی پر بار بار پہلو بدلنے کی عادت ، جلدی جلدی لکھنا اور بہت لکھنا ۔ ان کے استعارے ، سارے ہی سفر کے استعارے ان کی لغت ساری ہی جوگیانہ ۔ ان کے شعر سارے ہی بانس سے کٹی ہوئی پوری کی پکار ۔

وہ عجیب آدمی تھا ۔ اسے رونے اور ہنسنے کی دونوں توفیقیں حاصل تھیں ۔ ورنہ ہم تو اب نہ ڈھنگ سے رو سکتے ہیں نہ ہنس سکتے ہیں ۔ نثر لکھنا تو ایسی کہ پھول کھلتے جائیں ۔ چراغ جلتے جائیں ۔ پھلجھڑیاں چھوٹتی جائیں ۔ مسکراہٹیں زیر لب ہنسی ـــــــ شعر لکھنا ایسا کہ روح کا سارا کرب سارا الم ، ساری پکار سمٹ کر لفظوں میں ڈھل جائے ۔

وہ کیسا شانت آدمی تھا
کیسا مطمئن انسان تھا

ایک چھوٹے سے ادارے کی ڈائرکٹری پر ایسی قناعت کہ یونیسکو کی ایک بہت بڑی ملازمت پر انکار کر دیا ـــــــــ پھر ایک بہت بڑے خود مختار ادارے کی چیئر مین شپ آفر ہوئی تو معذرت کر دی کہنے لگے۔

" مجھے بہت بڑے عہدے اور بہت زیادہ تنخواہ سے ڈر لگتا ہے۔ ان سے آدمی میں ہوس بڑھتی ہے۔ اور اگر ایک آدمی ہوس کو اپنے دل میں راہ دیدے تو اس کے بعد رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہے انسان اس سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ مجھے جتنی تنخواہ ملتی ہے اس میں میرا بڑا اچھا گزارہ ہو رہا ہے۔ زیادہ جنجال میں ہم نہیں پڑنا چاہتے۔

قناعت کا یہ مقام اچھے اچھوں کو بڑی ریاضت کے بعد ملتا ہے۔ اور وہ کیسا بے کل آدمی تھا۔ جو ایسے شعر لکھتا تھا۔

ہم جنگل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں
آج یہاں، کل اور نگر میں صبح کہاں اور شام کہاں
ہم سے بھی بیت کی بات کرو کچھ ہم سے بھی لوگو پیار کرو
تم تو پشیماں ہو بھی سکو گے ہم کو یہاں پر دوام کہاں

چاند سے پیار کرنے والے سدا کے روگی سدا کے جوگی، سدا کے دکھیارے مانے جاتے ہیں۔ انشاجی کے بدن کے غلاف کے نیچے ایک بے کل اور مضطرب اور شانت روح تھی ـــــ صاف شفاف، بے کدورت بے ریا۔

ابن انشا، ایک مست الست آدمی تھا۔ اس کے لئے اس نے کوئی ریاضت نہیں کی۔ دھونی نہیں رمائی۔ یہ اس کے اندر کی، اس کے باہر کی ساخت تھی جو بنانے والے نے بنائی ہی ایسی تھی۔ وہ ایک سادھو تھا۔ مست الست تھا۔ پیار تو اس نے سدا کیا اور سب سے کیا۔ لیکن دیوانوں سے اور عاشقوں سے اسے خاص نسبت تھی۔ ایڈگرایلن پو۔ رچرڈ برٹن۔ بھگت کبیر۔ میر تقی میر اور نظیر۔

پو کی دھندلکوں میں ڈوبی، اسراریت متحیر کر دینے والی طلسماتی دنیا۔ الف لیلوی۔ رفریت ہلکی ہلکی آنچ دیتی ہوئی وہ ملفیت ـــــ چاند نگر کے دیباچے کی ابتداء ہی پو کی ایک شعری حکایت سے

ہوتی ہے۔

" ایک بہادر نائٹ اونچی بنا، دھوپ اور سایے سے بے نیاز " ایلڈورڈیو "کی تلاش میں مستانہ گیت گاتا۔ گھوڑا دوڑاتا چلا جارہا ہے۔ لیکن برسوں گزر گئے۔ زندگی کی شام آگئی۔ اسے روئے زمین پر کوئی خطہ ایسا نہ ملا جو اس کے خوابوں کے شہر کا مثیل ہوتا۔ آخر جب اس کی تاب و تواں جواب دینے کو تھی اسے ایک بڈھا پھوس زائر ملا۔ جو سفر کی صعوبتوں سے گھل کر سائے کے سمان رہ گیا تھا۔ اس پیر فرتوت نے بھنوؤں کی جھالر ہٹاتے ہوئے کہا:۔

اگر تمہیں اس شہر جادو کی تلاش ہے تو چاند کی پہاڑیوں کے ادھر سایوں کی " وادئ طویل " میں قدم بڑھاتے، گھوڑا دوڑائے آگے ہی آگے بڑھتے چلو۔۔۔۔"

میں سوچتا ہوں کہ انشا کی بھی ایک ایلڈورڈیو " تھی۔ جس کی سمت اور مقام اسے معلوم نہیں تھا کسی کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔ انشا پو کے نائٹ کی طرح عمر بھر گھوڑا دوڑاتے مشرق و مغرب کی خاک چھانتا رہا۔ اور اب شاید اسے بھی کسی پیر فرتوت سے واسطہ پڑا۔ اور اس نے ان ہی بھنوؤں کی جھالر ہٹاتے ہوئے اسے چاند کی پہاڑیوں کی " وادئ طویل " کی سمت بھیج دیا ہے۔ لیکن اس کوہ ندا کی جانب مسافروں کو جاتے ہوئے تو سب نے دیکھا ہے لوٹتے کبھی نہیں دیکھا۔

پھر ابن انشا کو پو اتنا مرغوب تھا کہ اسے سارے کا سارا ترجمہ کر ڈالا۔ یوں پو کا اس نے ایک ایک لفظ اپنے اندر اتار لیا۔ جذب کر لیا۔ " اندھا کنواں " کے دیباچے کی آخری سطریں یہ ہیں۔

میں نے پو کو ہمیشہ اپنے گورو دیو کی حیثیت
دی ہے مجھے سکول کے زمانہ میں بھی پو کی
نظموں اور کہانیوں سے اتنا شغف تھا کہ
دوستوں نے میرا نام ایڈگر ایلن پو " رکھ دیا تھا۔

ایسا ہی پارہ صفت ایک رچرڈ برٹن تھا۔ آوارہ منش، آوارہ مزاج، آوارہ رو، بے چین، بے قرار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عاشق مزاج اور دیوانہ ــــــــــ اپنے بارے میں انشا کا کہنا ہے کہ " افتاد طبع کے اعتبار سے رومانی بلکہ الف لیلوی واقع ہوا ہوں ــــــــــ" برٹن سے اس کی دوستی الف لیلہ ہی کی وساطت سے ہوئی ہے۔ برٹن وہ پہلا آدمی ہے جس نے اول بار الف لیلہ کا تمام و کمال ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ کیا انشا جی اس کے دیوانے بلکہ عاشق تھے۔ برٹن انہیں اس لئے بھی

بہت بھایا کہ دونوں کی بہت سی خوبیاں اور خرابیاں مشترک تھیں ـــــ دونوں عشق پیشہ، دونوں آوارہ مزاج دونوں سیاح ـــــ دونوں غارت گر حسن ـــــ دونوں جوگی، دونوں قلندر مثالی، دونوں دشت نورد دونوں کے پیر آبلہ آبلہ اور خاک آلود ۔ دونوں کے دل جہر بان اور گریبان چاک چاک، ایک بار لندن سے آئے تو کہنے لگے ۔ "اس دفعہ میں نے برٹن کے کتب خانے تک رسائی حاصل کر لی ۔ اس ظالم کا کتب خانہ ایک عجائب خانہ ہے ۔ کیسے کیسے نوادرات اس میں جمع ہیں ۔ اس کی بیوی سے بھی ملاقات ہوئی ۔ جس عفیفہ نے برٹن کے سینکڑوں مسودات اور تحریروں کو جلا کر آگ تاپ لی تھی ۔ کہتے تھے میری بڑی آرزو ہے کہ برٹن پر کوئی بھرپور کام کر جاؤں ۔ چند سال پہلے انھوں نے برٹن پر ایک سلسلہ مضامین لکھا بھی جو اخبار جہاں میں چھپتا رہا ۔ اور بے حد مقبول ہوا ۔ معلوم نہیں وہ اپنی اس آرزو کو کہاں تک پورا کر سکے ۔

میں اگر تناسخ پر یقین رکھتا تو کہتا کہ ابن انشا اس جنم سے پہلے کبھی کبیر کے روپ میں پیدا ہوا کبھی میر کی صورت میں اور کبھی نظیر کی شکل میں ۔ ابن انشا کی شاعری میں دیکھیں ان تینوں بڑے اور عظیم شاعروں کے جوہر یکجا نظر آتے ہیں ـــــ بھگت کبیر کی بھگتی اور اس کا جوگ، اس کا گیان دھیان، موہ مایا اور اس کا چھل، بروان کی شانتی سب سے، ہر شے سے پیار کرنے اور اسے پیار دینے کا حوصلہ، اور اپنے چاروں اور کی پوری خبر ـــــ ہندی لفظوں کی آمیزش اور ان کا بڑے ہی سلیقے سے استعمال، شعروں کی ایسی نغمگی، اور موسیقیت دیتا ہے جو آج کی اردو شاعری میں مفقود ہوتی جا رہی ہے ۔

دوسری طرف اس کے ہاں عشق کی گہری، دلدوز اور دلگداز واردات ملتی ہے ۔ میر کے دھیمے، مدھم، سہج سہج بولتے، ہلکی ہلکی آنچ دیتے، چپکے چپکے سلگتے ہوئے ہوئے دھواں سا دیتے مسکایاں بھرتے ہوئے دکھی لہجے میں، وہ خوب صورت بحریں جو میر کو مرغوب ہیں ۔ انشا کو بھی اچھی لگتی ہیں ۔ عشق کرنے کا حوصلہ اور عشق کئے جانے کی توفیق جو میر کو حاصل ہے ۔ انشا کو بھی ارزانی ہوئی ہے ۔

نظیر کا گہرا سماجی شعور اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی قلندری زندگی کے ساتھ اس کی گہری محبت اور لگاؤ کے ساتھ نظیر کا یہ عرفان کہ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا ۔ جب لاد چلے گا بنجارا ـــــ ایسا شعور جو اس دنیا میں جینے کا صحیح ڈھنگ سکھاتا ہے ۔ اس میں رہ کر بھی اس کے چھل میں نہ آنے کی کاریگری جیسی نظیر کو آتی تھی ویسی انشا کو بھی آتی تھی ۔ یہ بابر بہ عیش کوش والی بات نہیں ۔ یہ تو زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرنے اور اسے برتنے اور چکھنے کے ساتھ اس کی محبت میں گرفتار نہ ہونے کا وہ قیمتی نسخہ ہے، جو آدمی کو صحیح مسرت اور اصل حقیقت سے آشنائی بخشتا ہے ۔ انشا کا دامن اس شعور کی دولت سے بھرا ہوا تھا ۔

انشا جی کو دوستی کے آداب خوب آتے تھے۔ کراچی کا احوال تو مجھے معلوم نہیں۔ لاہور آتے تو سب دوستوں سے ملتے ـــــ اپنے نئے پرانے سبھی یاروں کو فون کرتے۔ خیریت پوچھتے۔ ہوتا تو مل بیٹھتے۔

ہمارا دفتر بھی اتفاق سے ایسی جگہ تھا جہاں سبھی دوست آسانی سے آجا سکتے تھے۔ لندن سے ان کا جو آخری خط مجھے ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ اچھا ہوا تم نے دفتر بدل لیا۔ لیکن اب تم دور ہو گئے ہو۔ منٹگمری روڈ والی بات کچھ اور ہی تھی ـــــ ریواز گارڈن میں کشور ناہید سے ملاقات ہو جایا کرے گی۔ لیکن انتظار حسین نہیں آسکے گا۔ چلو خیر ہم خود چلے جایا کریں گے۔ دوستی کرنا اور نبھانا ان کی طبیعت کو راس تھا۔ وہ ناراض نہیں ہوتے تھے دوستوں سے تو کسی قیمت پر بھی نہیں۔ اپنی جان پر برداشت کر لینا انہیں خوب آتا تھا۔ لیکن ناراض ہونا نہیں۔

لاہور آتے تو پہلا فون اشفاق احمد یا کشور ناہید کو کرتے یہ دونوں اہل لاہور میں سے انہیں دل سے عزیز تھے۔ ان سے بات کر کے جیسے وہ ہشاش بشاش ہو جاتے۔ بعض چیزیں انہیں مرغوب تھیں۔ مثلاً فون کرنا گنے کا رس پینا۔ نمکین چائے۔ گپ لگانا ـــــ گرمیوں میں لاہور آتے تو گنے کے رس کا پورا جگ بھروا کر رکھ لیتے۔ اور پیتے رہتے۔ کہتے کراچی میں اتنا اچھا رس نہیں ملتا۔ اشفاق احمد اور ابن انشا کا ایک محبوب رس بیچنے والا ہے۔ کوپر روڈ اور منٹگمری روڈ کے سنگم پر چوک کے قریب کہتے ہیں وہ رس بیچنے والا رس کے آداب سے واقف ہے۔

سردیاں ہوتیں تو نمکین بادام والی چائے، کیتلی بھروا کر پاس رکھ لیتے۔ کام کرتے جاتے اور چائے چلتی رہتی کہتے ـــــ کراچی میں نمکین چائے مل تو جاتی ہے۔ مگر وہ بات کہاں جو اہل لاہور کے ہاتھوں میں ہے۔

اشفاق احمد کو عام طور پر فون کرتے تو کہتے۔

"ہاں بھئی اشفاق! میں آگیا ہوں۔ آج چینی کھانا کھلاؤ گے"

"نہیں بھئی بابا" اشفاق صاحب کہتے "تم بھی کبھی کھلا دیا کرو۔ انشا جی کہتے "نا جی۔ ساڈا تے اوہ حال اے۔ آؤ گے تے کیہہ لیاؤ گے جاؤ گے تو کیہہ دے کے جاؤ گے؟"

دونوں کے درمیان فقرے اچھلتے، قہقہے ابلتے اور آخر اشفاق احمد کو چینی کھانا کھلانا پڑتا۔

پچھلے برس ـــــ

ماسکو سے لاہور آئے۔ ان کے مزاج پر سکوت طاری تھا۔ مجھے کسی قدر تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا کچھ نہیں کہ میں ان کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ کبھی کسی سے دل کی بات نہیں کہتے تھے۔ میرا خیال ہے اس کرۂ ارض پر واحد ایک شخص ہے۔ جس سے ابن انشا ممکن ہے۔ دل کی بات کرتا۔ اندر کا بھید کھولتا ہو اور اس کا نام ہے قدرت اللہ شہاب۔ ایک روز کالم لکھتے لکھتے اچانک بولے۔

"تابش میرے گلے کی طرف دیکھو۔ تم نے کوئی بات محسوس کی ہے۔"

میں نے پہلی بار دھیان سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ گلے دونوں اطراف کی گلٹیاں پھولی ہوئی ہیں اور گلا جیسے نیچے کو لٹکا ہوا ہے۔

میرے استفسار پر بتایا کہ یہ "ہوجکن ڈیزیز" ہے اور یہ مجھے اچانک ہی ہو گئی ہے۔ پھر بتانے لگے کہ راشدی صاحب کو بھی یہی تکلیف ہو گئی ہے ان کا ایک آپریشن ماسکو میں ہو چکا ہے اور یہ کہ راشدی صاحب ہی نے ان کی توجہ اس طرف کرائی ہے۔ ورنہ وہ تو اس تکلیف کو بہت معمولی جان رہے تھے۔ لیکن راشدی صاحب نے بتایا تھا کہ یہ معمولی تکلیف ہے خاصی جان لیوا ــــــ پوچھنے لگے تمہاری ہومیوپیتھی اس باب میں کیا کہتی ہے۔ میں بتاتا رہا وہ سنتے رہے اور شاید نہ سنتے رہے۔

کہنے لگے یہ بیماری کینسر نہیں ہے۔ پر اس کی چھوٹی بہن ہے۔ اس سے کم موذی اور تکلیف دہ نہیں ہے۔ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ اس لئے ریئر بیماری ہے اس کا شافی علاج ابھی تک تو دریافت نہیں ہوا۔ تاہم کینسر کی طرح تابکار شعاعوں سے اسے کنٹرول کر لیتے ہیں ــــــ پھر یکدم انھیں احساس ہوا۔ حسب عادت، حسب دستور اپنا اضطراب، اپنی پریشانی واپس اپنے اندر انڈیل لی اور کسی دوسرے ہی موضوع پر بات کرنے لگے۔

اگلے روز میری اشفاق صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انشا جی کی کیفیت اور ان کا اضطراب بتایا انھوں نے اپنی عادت کے مطابق پہلے ناک کھجائی اور پھر کچھ دیر چپ رہے پھر کہا۔

"کل شام انشا گھر آیا تھا۔ وہ واقعی بڑا مضطرب لگ رہا تھا۔ کم از کم پہلے میں نے کبھی اسے اتنا مضطرب نہیں دیکھا۔ بانو نے بہت کہا کہ انشا جی کھانا کھا کے جانا پر وہ رکا نہیں۔ چلا گیا۔ کہتا تھا بہت کام کرنے ہیں اور چلا گیا۔"

اشفاق صاحب کچھ دیر چپ رہے۔ پھر بولے "تابش میرا خیال ہے انشا اپنی غزل

کے سائے تلے آگیا ہے"۔

میں نے ان سے اتفاق کیا ———— اس دن میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔

" اشفاق صاحب کہہ رہے تھے "۔ اس غزل نے پہلے امانت کو اپنے سائے کی لپیٹ میں لیا اب انشا ——— اس کی غزل کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مشہور ہو گئی۔ ایسا نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ پورے پاکستان میں یہ غزل گونج رہی ہے۔ چائے خانوں میں، ہوٹلوں میں، ٹیکسیوں میں سڑکوں پر گلیوں، ایک طوفان اٹھ کھڑا ہے۔

اختتامی اشعار کو بیچ کرو۔

یہ کوئی خیر کی بات نہیں۔ کوئی خیر کا کلمہ نہیں کیونکہ یہ ایک وظیفہ سا بن گیا ہے کوئی سفلی قسم کا عمل بن گیا ہے اور اس عمل کو مسلسل دہرایا جا رہا ہے پوری ہوا میں اس کا زہر سرایت کر گیا ہے۔

میں چپ رہا لیکن مجھے ایک ایک حرف سے اتفاق تھا ———— اس شہر لاہور میں جو چند دیوانے رہتے ہیں یوں ہی گنتی کے چند۔ ان میں ایک اشفاق احمد بھی ہے۔ جو ذرا الگ طرح سے سوچتا ہے۔ چیزوں کو مختلف انداز میں لیتا۔ بے لوگ یوں نہیں سوچتے۔ بلکہ یوں سوچنے والوں پر ہنستے ہیں ان پر ٹھٹھا کرتے ہیں۔

پر میں سوچ رہا تھا اشفاق صاحب ٹھیک کہتے ہیں کیوں کہ
لفظ بار بار دہرائے جانے سے طلسم بن جاتے ہیں۔ لفظ بار بار دہرائے
جانے سے سننے والا ہپناٹائز ہو جاتا ہے۔ لفظ بار بار دہرائے
جانے سے ان کی مخفی قوتیں انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہیں اور وہی
کچھ ہونے لگتا ہے جو کہا جا رہا ہوتا ہے۔ لفظ صرف
روشنائی کے چند نشان یا ہوا کی چند متحرک لہروں کا
نام نہیں لفظ تو زندہ اور متحرک قوت کا نام ہے

اس کی بڑی تاثیر ہے۔ اس کا بڑا اختیار ہے شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے بڑے کہا کرتے تھے۔ جو کہو سوچ سمجھ کر کہو۔ جب کرو، خیر کی بات کرو، پتا نہیں کب زبان سے نکلنے والے لفظ سچ ثابت ہو جائیں۔

لاہور میں اپنے آخری پھیرے میں انھوں نے اپنی سب سے چھوٹی بہن کی شادی رچائی

اور شاید اپنے آخری خاندانی فرض سے سبکدوش ہوئے۔ جو بچپن سے ان کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ والد کا سایہ جب اس کنبے کے سر پر سے اٹھا تھا تو انشا نے باپ بن کر سب بھائی بہنوں کو پالا پوسا ـــــ اور اس انداز سے آج انھیں باپ یاد نہیں انشا یاد ہیں ـــــ سب کو پڑھایا لکھایا۔ شادیاں کیں ـــــ روزگار پر لگایا۔ یہ چھوٹا سا اور معمولی کام نہیں تھا۔ اس فرض کی ادائیگی پر انشا نے اپنی جوانی کی بہت ساری خوشیاں قربان کیں۔

بہن کی شادی کے دوران انھوں نے لاہور میں بہت دن قیام کیا۔ شاید آٹھ دس روز ـــــ اتنے دن وہ لاہور میں پہلے کبھی نہیں رہے تھے۔ ماسکو سے واپسی کے بعد سے اب تک بہت سارے فیصلے ہو چکے تھے۔

مرض تشخیص ہو گیا تھا۔

گلے کا آپریشن ہو گیا تھا۔

تابکار شعاعوں سے علاج ہو گیا تھا۔

یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ مزید علاج کے لئے انھیں لندن جانا چاہیئے۔ اور اس سلسلے میں انہیں منسٹر کے عہدے پر ایک ملازمت بھی پاکستانی سفارت خانے میں مل گئی تھی۔

مجھے پتہ چلا تو یہ خبر مضطرب سا کر گئی۔

اشفاق صاحب سے بات ہوئی ـــــ میں نے کہا جناب یہ علاج میرے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے"

اشفاق صاحب بولے "میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے۔ میری بھی یہی رائے ہے کہ انشا کو یہیں رہنا چاہیئے۔ اپنے دوستوں میں، اپنے بھائیوں میں، اپنے بچوں میں اور یہیں علاج ہوتا رہے۔ یہی علاج کوئی دیسی۔ ہومیو پیتھی کوئی دوا۔ کوئی دعا۔ پر ـــــ اب فیصلہ ہو چکا ہے ـــــ سب تیاریاں ہو چکی ہیں ـــــ سب دوستوں کی اور سب عزیزوں کی یہی رائے ہے کہ انشا کو لندن جا کر علاج کروانا چاہیئے۔

اشفاق احمد کے لہجہ میں جو دکھ بول رہا تھا میں اس کو پورے طور پر ریسیو کر رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں بہت سی باتیں بول رہی تھیں۔

ان دنوں ہم ـــــ انشا صاحب اور میں سارا سارا دن لاہور کی لائبریریوں کی خاک چھانتے پھرتے کیٹلاگس اکٹھی کرتے ـــــ لائبریرینز سے ملتے۔ صلاحیں۔ مشورے۔ مشاورت انڈیا آفس لائبریری سے کچھ

لینا ہے۔ کیا لسنا چاہیئے۔ کہیں ڈیلی کیشن نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایک روز دفتر میں آتے ہی کہنے لگے۔

" تابش تم کبھی داتا دربار گئے ہو " میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی کہا ـــــــ آؤ چلیں "

میرے لئے یہ ایک عجوبہ بات تھی بلکہ چار درویشوں کی اس ٹولی میں ابن انشا واحد آدمی ہے۔ ـــــــ بھائی میں تمہارے تصوف وغیرہ کو نہ مانتا ہوں، نہ اس سے انکار کرتا ہوں۔ تم لوگوں کو اگر اس راہ سے کچھ ملتا ہے تو سبحان اللہ، لگے رہو اپنے کام پر ہم اس دریا میں دامن نہیں ڈبونا چاہتے۔ ہم لب ساحل ہی اچھے ہیں ـــــــ اشفاق صاحب اور کبھی کبھی مفتی صاحب سے ان کی چونچ ہو جاتی تھی۔ ہم لوگ تذکرہ غوثیہ کی ان حکایات پر جان دیتے ہیں۔ جن میں دانش اور حکمت کی باتیں ہیں۔ عجیب اسرار و رموز ہیں۔ انشا جی کو بھی یہ کتاب بڑی مرغوب تھی۔ بلکہ ان کی ایک طرح Bed side Book تھی لیکن وہ اس میں سے اپنے مطلب کی حکایات پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اور جی بھر کے ہنستے تھے۔ کہتے تھے تذکرہ غوثیہ میں بھی ایک دفتر بے معنی ہے۔ اور مجھے بے حد مرغوب ہے۔

انہوں نے تو رچرڈ برٹن کے بھی ایک دفتر بے معنی کا سراغ لگایا تھا۔ لیکن تلاش بسیار کے باوجود وہ مسودہ ان کے ہاتھ نہ لگا ورنہ برٹن کی ایک مزید اور نادر روزگار تحقیق دنیا کے سامنے آجاتی۔

لاہور میں ان کا آخری پھیرا ایسا تھا کہ جس میں مجھے یوں لگتا تھا جیسے کام سمیٹ رہے ہوں۔ جیسے بساط لپیٹ رہے ہوں۔ کچھ چیزوں کو جیسے الوداعی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ معاملات نمٹا رہے ہیں۔ بہن کی شادی کے مجھے کارڈ دیئے پتے لکھوائے اپنے سبھی دوستوں کے اور ان کا اصرار تھا کہ سب کو ضرور بلانا ہے اور سب کو ضرور لانا ہے۔ وہ اس بہانے سب سے ملنا چاہتے تھے ـــــــ غالباً آخری بار ان کے سارے انداز میں ایک گمبھیرتا آگئی تھی۔ عادت کے مطابق اظہار بھی نہیں کیا لیکن میرا گمان ہے کہ انہیں احساس ہو گیا تھا ان کا یہ سفر ان کے دوسرے سفروں سے مختلف ہوگا ان کے ہاتھوں کی جنبش اور قدموں کی حرکت تیز ہو گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے اضطراب کا پلڑا جھک لیکن توازن بگڑ رہا ہے۔

بہن کی شادی سے فراغت ہوئی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

فراغت ہوتے ہی کراچی سدھارے۔
پھر ایک روز خبر آئی، لندن پہنچ گئے۔
پھر پتا چلا علاج شروع ہو گیا ہے۔
پھر اطلاع ملی۔ دو آپریشن ہو چکے ہیں۔
پھر معلوم ہوا ڈاکٹروں نے تلی نکال دی ہے۔
پھر خبر ملی انشا جی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں ـــ اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہم نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

"جنگ" میں پھر سے کالم نظر آنے لگا۔ وہی شگفتگی، وہی کاٹ وہی طنز کی تیزی ـــ لہجے کی گھلاوٹ، چٹکی لینے کا وہی انداز، وہ تیکھا پن، وہی عاشقانہ ہٹ۔

یوسف کامران لندن سے لوٹا، اطلاع دی سب خیریت ہے۔

ایک روز خبر اڑی انشا جی واپس آ رہے ہیں۔ انہیں واپس بلا لیا گیا ہے پھر معلوم ہوا ابھی علاج کا ایک خاص مرحلہ باقی ہے اس کے بعد واپس آجائیں گے۔

ایک روز تشویش کے ساتھ دوستوں نے سنا کہ انشا ہسپتال میں بے ہوش ہیں۔

اخباروں میں دعائے صحت کی اپیل چھپی تو تشویش بڑھ گئی۔ اور بلاشبہ لوگوں نے دعائیں مانگیں۔

ملک کا طناز کالم نگار، بہترین مزاح نگار، خوب صورت شاعر، جس نے دنیا جہاں کا سفر کیا۔ اور پھر آخری سفر لندن کا کیا۔ لندن سے آگے وہ ایک ایسے سفر پر چلا گیا۔ جس کی نہ راہ کسی کو معلوم ہے نہ منزل رہے نام اللہ کا۔

حضرت بابا تاج الدین ناگپوری فرماتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت اور تخلیق کے اعتبار سے یا یہ کل ہے۔ انشا جی کے بارے میں میرا گمان ہے کہ وہ بھی ہماری تمہاری طرح یا یہ کل ضرور تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ مائل پرواز بھی ان کا سارا جوگ بجوگ اور سادھو پن اس کا ثبوت ہے۔ لیکن دنیاداری اور رعایا جال کی بہت ساری دوریوں نے ان کے وجود کو یوں جکڑ رکھا تھا کہ وہ پوری طرح اپنی فطرت کا اظہار نہ کر سکے۔ آجا کے شاعری ہی ایک ایسا ذریعہ تھی جس میں انہوں نے اپنی ساری بے کلی، اضطراب اور دکھ دالم کا اظہار کیا ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں انشا کے اشعار میں بہت کچھ ڈھونڈ سکتی ہیں۔

سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی مایا ہے
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے
جو تم نے کہا ہے فیض نے جو فرمایا ہے
سب مایا ہے

معلوم ہمیں سب قیس میاں کا قصہ بھی
سب ایک سے ہیں، یہ رانجھا بھی یہ انشا بھی
فرہاد بھی جو اک نہر سی کھود کے لایا ہے
سب مایا ہے

جس گوری پر ہم ایک غزل ہر شام لکھیں
تم جانتے ہو ہم کیونکر اس کا نام لکھیں
دل اس کی بھی چوکھٹ چوم کے واپس آیا ہے
سب مایا ہے

وہ لڑکی بھی جو چاند نگر کی رانی تھی
وہ جس کی الہڑ آنکھوں میں حیرانی تھی
آج اس نے بھی پیغام یہی بھجوایا ہے
سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک نام وفا کا لیتے ہیں
وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں
ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے
سب مایا ہے

مجھے تو بہت تعجب ہوتا ہے۔ ایسے شعر پڑھ کر میں جانتا ہوں کہ انشا جی بہت کچھ جانتے تھے۔ ہم سے بہت زیادہ جانتے تھے۔ دنیا کو، اپنے آپ کو، اپنے مرض کو پھر بھی کہتے تھے۔ سب مایا ہے۔ □

روشن نگینوی

انشاجی نے کوچ کیا

شہر کے لوگو! کیا تم کو معلوم ہے کچھ
انشاجی نے کوچ کیا!
شہرِ وفا سے کوچ کیا!
قریہ قریہ، کوچہ کوچہ، گلی گلی پھرنے والا
اپنی نگارش کی خوشبو سے روحوں کو مہکاتا تھا
اپنے کرب کو جس نے چھپایا ــــ جس نے زیست کی ہر راہ میں
وہ تھا مسیحا ــــ جس نے رستے زخموں کو مرہم بخشا!
ہمدردی کی جوت جگائی ــــ لفظوں کا پرچم بخشا!
وہ لفظوں کا سوداگر تھا ــــ لفظ انمول نگینے تھے
ملکِ سخن کا شہزادہ تھا ــــ اس کے پاس خزینے تھے
اپنا مال لٹا کر آخر، دیس سے خالی ہاتھ چلا
چلتے وقت اے شہر کے لوگو! اس کو تم سے شکوہ تھا
جس میں ہونا پید وفا، اس شہر میں جی کا لگانا کیا
اب صدیوں تک راہ تکو تم ــــ لیکن وہ تو روٹھ گیا
انشاجی نے کوچ کیا

مُصیبت سے بچیے
خون کو صَاف کیجیے

خون صاف کرنے کی
قدرتی دوا

خون کی خرابی سے کیل مہاسے، پھوڑے پھنسیاں اور جلد کی
دوسری تکلیفیں آپ کو پریشان کرتی ہیں، چہرے کے
نکھار کو بگاڑتی ہیں۔ اِن سب شکایتوں کو
دُور کرنے کا کامیاب ذریعہ ہے صافی!
صَافی معدہ اور آنتوں کی اصلاح کرکے خون کو صَاف
کرتی ہے اور خون کی صفائی ہی ان شکایتوں کا
اصل علاج ہے۔ صَافی میں شامل ۲۴ جڑی بوٹیاں
اور دوسرے اہم اجزا آپ کی جلد کو صاف، نرم اور
خوب صورت بناتے ہیں۔
صَافی بے فکر ہوکر استعمال کیجیے۔ اِس سے صحت پر
کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

صَافی

خون کو صَاف کرتی ہے۔ جِلد کو نکھارتی ہے

ہمدرد

نورالحسن نقوی

تین مزاح نگار

محمد خاں ـــ مشتاق یوسفی ـــ ابن انشا

موجودہ عہد میں طنز وظرافت نے خوب فروغ پایا ہے ۔ جن اہل قلم نے بطور خاص اس میدان کو اپنی جولاں گاہ بنایا ان سے قطع نظر افسانوی ادب اور شاعری کے جدید سرمایے میں جا بجا طنز کی کارفرمائی نظر آتی ہے کہیں نمایاں تو کہیں زیریں لہر کی شکل میں ۔ دراصل نئی نسل کا انسان اپنے بزرگوں سے کہیں زیادہ ذکی الحس اور زود رنج ہے ۔ اس کے اعصاب ایسے آلات سے لیس ہیں جو گرد و پیش کی فضا میں رونما ہونے والے مدھم سے مدھم ارتعاش کو بھی ریکارڈ کر لیتے ہیں ۔ ظلم کا خنجر کسی پر چلے تڑپ یہ اٹھتا ہے ۔ ناانصافی کہیں ہو مضطرب یہ ہو جاتا ہے ۔ ناہمواری کسی شخص میں ہو یا کسی چیز میں نہ اس کی نظر سے اوجھل رہ سکتی ہے نہ وہ اس پر بے مزہ ہوئے بغیر رہ سکتا ہے ۔ جب کبھی موقع ملتا ہے وہ ان زیادتیوں اور خرابیوں پر طنز کے وار کرتا ہے مگر بالعموم شائستہ لہجے اور ظرافت کے پردے میں ۔ جدید اردو فکشن کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، احمد ہمیش، بلراج مین را اور جدید تر فکشن نگار سبھی کی تحریریں طنز سے بھری ہوتی ہیں ۔

پاکستانی ادب میں طنز کے ساتھ ساتھ خالص مزاح بھی خوب پروان چڑھا ۔ یہ خالص مزاح اس انداز کا ہے جو انگریزی ادب سے مخصوص رہا ہے اور اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب مصنف کے گرد و پیش کی دنیا میں سکون و عافیت کا دور دورہ ہو، برائیاں اور ناانصافیاں کم ہوں ۔ جس زمانے کا ادب یہاں زیر بحث ہے اس زمانے میں پاکستانی عوام سیاسی آزادی سے نا آشنا رہے لیکن اسی کے سبب پاکستانی معاشرے نے بہت سی لعنتوں سے نجات پائی ۔ وہاں کے بیشتر ادیبوں نے سیاست سے کنارا کر کے دوسرے موضوعات پر قلم اٹھایا ۔ اکثر اہل قلم نے بیرونی ملکوں کے سفر کئے اور دیس سے زیادہ بدیس پر اپنی توجہ مرکوز کی اور اپنی تخلیقات کے لئے خام مواد وہیں سے حاصل کیا ۔ پچھلی دو دہائیوں میں وہاں بہت سے سفرنامے لکھے گئے ۔ ممکن ہے یہ ایک طرح کا فرار ہو ۔ بہرحال اس عرصے میں جو تخلیقی ادب وہاں وجود میں آیا

اس میں طنز سے زیادہ خالص مزاح نظر آتا ہے۔ یہ زندہ دل شگفتہ مزاج اور نفاست پسند ذہنوں کی تخلیق ہے جو نہ مصلح ہیں، نہ محتسب، نہ ناصح ہیں نہ واعظ۔ یہ زندگی کے ناظر ہیں مگر کائنات کی ہر شے کو ترچھی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس میں مضحک پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اس سے یہ خود بھی محظوظ ہوتے ہیں اور قاری کو بھی اس انبساط میں شریک کر لیتے ہیں۔ ان میں پہلا نام محمد خاں کا ہے جو کبھی کرنل محمد خاں تھے۔ مگر اب اس نام سے پکارے جانا پسند نہیں کرتے۔

محمد خاں اب سے کوئی پندرہ برس پہلے اپنی دل آویز تصنیف "بجنگ آمد" لبغل میں دبائے ادب کی محفل میں بڑے طمطراق سے داخل ہوئے اور پچھلے سال خود اپنے اعلان کے مطابق "بزم آرائیاں" پیش کر کے رخصت ہو گئے۔ ہمارے دیس میں "بجنگ آمد" کی پذیرائی ہوئی مگر دیر سے۔ ایک تو پاکستانی مطبوعات یہاں پہنچتی ہی مشکل سے ہیں۔ دوسرے کتاب اور مصنف دونوں کے نام ایسے کرخت اور اتنے غیر شاعرانہ تھے کہ کسی کو یہ گمان ہی نہ گزرا کہ اس میں لطف و انبساط کا بھی کوئی سامان ہو سکتا ہے لیکن آخر کار اسے وہ قبول عام حاصل ہوا جو کم کتابوں کو نصیب ہوتا ہے۔ "بجنگ آمد" کے تقریباً دس سال بعد "بسلامت روی" شایع ہوئی لیکن یہ منتظرین کی توقعات پر پوری نہ اتری۔ بجنگ آمد کو اس لئے بھی پسند کیا گیا کہ اس کا موضوع بہت اہم تھا۔ یہاں ہم عالمگیر جنگ کے واقعات ایک عینی شاہد کی زبان سے سنتے ہیں اور وہ بھی بے حد دلفریب انداز میں۔ "بسلامت روی" روئیداد سفر ہے۔ یہاں مصنف کے پاس کہنے کے لئے اتنی اہم بات نہیں جتنی پہلی کتاب میں تھی۔ یہاں حسنِ ادا ہی سب کچھ ہے اس لئے قاری کی تمام تر توجہ اسلوب پر رہتی ہے اور مصنف سے اس کے مطالبات بڑھ جاتے ہیں جو ظاہر ہے پورے نہیں ہو پاتے۔ "بزم آرائیاں" کی حیثیت باقیات کی ہے۔ اس میں نیا کم ہے اور پرانی کتابوں سے بچایا ہوا اندوختہ زیادہ۔

بجنگ آمد کے صفحات پر وہ تجربات بکھرے ہوئے ہیں جو مصنف کی طویل فوجی زندگی کا حاصل ہیں۔ محمد خاں نے تلوار ہاتھ سے رکھ کے قلم تو بعد میں اٹھایا لیکن شعر و ادب سے ان کا گہرا رشتہ کبھی کا استوار ہو چکا تھا اور ان کی ذات میں ایک مصنف و مزاح نگار یقیناً بہت پہلے سے خوابیدہ تھا جو زندگی کی ہر کجی اور ہر مضحکہ خیز صورت حال کو ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ یہ تجربات مدتوں پیرایۂ اظہار تلاش کرتے رہے ہوں گے اور حالی کے الفاظ میں شیرہ انگور کے اندر ہی پکتا رہا ہو گا کہ یہی سچا تخلیقی عمل ہے۔ باقی دونوں کتابوں میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں انہیں پوری طرح فنی تجربہ بننے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اور آخری بات یہ کہ محمد خاں کا اسلوب شعروں کے سہارے چلتا ہے۔ کسی نثر نگار کا مطالعہ اور حافظہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو یہ اسلوب بہت دور تک ساتھ نہیں دے سکتا۔ آخر وہ دن آہی جاتا

ہے جب شعروں کا خزانہ خالی ہونے لگتا ہے۔ دوسری میں تو نہیں البتہ تیسری کتاب میں مصنف کی تھکن کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

محمد خاں کی ظرافت نگاری کا سلسلہ شفیق الرحمٰن یا اور پیچھے ہٹ کر پطرس سے ملانا درست نہیں۔ نہ وہ شفیق الرحمٰن کی طرح لطیفے سنا کر ہنساتے ہیں اور نہ پطرس کی طرح ایسے مضحک واقعات بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ دن رات پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے مضحکہ خیز واقعات کو وہ ایسے لطیف پیرایے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور بس! بعض جگہ تو صرف ہلکا سا ذہنی انبساط اور دھیما سا سرور ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی مزاح نگاری کا سلسلہ غالب کی ظرافت سے مل جاتا ہے۔

محمد خاں مختلف فنی تدابیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ کبھی مزاحیہ صورتِ واقعہ (HUMOROUS SITUATION) سے کام لیتے ہیں، کبھی کوئی مضحکہ خیز کردار پیش کرتے ہیں، کہیں زندگی کی ناہمواریوں کو تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ کہیں متضاد اور غیر متناسب اشیا کو پہلو بہ پہلو رکھ کے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن ان کی ظرافت کا اصل سرچشمہ ہے حسنِ بیان اور یہیں ان کی انفرادیت پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا ادب کا مطالعہ بہت وسیع اور زبان پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ انھوں نے اپنی زبان آپ وضع کی ہے ــــ کہیں لفظ اور ترکیبیں تراش کر، کہیں کسی مانوس لفظ، ترکیب یا محاورے سے حسبِ منشا کام لے کر تو کہیں فوجی اصطلاح کو اپنے انداز میں استعمال کر کے۔ اساتذہ کے کلام سے انھوں نے اپنی نثر کو شگفتہ تر بنایا ہے۔ کہیں وہ بیچ بیچ میں شعر سنا دیتے ہیں، کہیں شعر سے الفاظ وتراکیب مستعار لیتے ہیں، کہیں مصرعے یا شعر کو جزوِ عبارت بنا دیتے ہیں۔ کبھی شعر یا مصرعے کی نثر بنا کے استعمال کرتے ہیں، کبھی شعر میں ردو بدل سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ اور اب کچھ مثالیں ــــ

* پانچویں روز اچانک ایک دریا نے ہمارا راستہ کاٹا۔ پل سے پار ہوئے تو ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئے۔ حدِ نگاہ تک ایک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ معاً ہماری نگاہ ایک پک نک کرتی ہوئی ٹولی پر پڑی۔ انھوں نے ہمارا کانوائے دیکھا تو ہماری طرف لپکیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، پوری سات دوشیزائیں! خدا جانے ان بنات النعش کے جی میں کیا آئی کہ دن دہاڑے عریاں ہو گئیں ــــ یعنی تقریباً عریاں! پیراکی کا لباس پہنے ہوئے تھیں اور ابھی بھیگی بھیگی دریا سے نکلی تھیں۔ ہم نے انھیں ایک نظر دیکھا اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی! ہمیں دیکھ کر تو انھیں کیا حاصل ہونا تھا، لیکن ہم سکتے میں آ گئے۔ ہمارا کارواں تو کیا گردشِ شام و سحر رک گئی۔ ساتوں کی ساتوں سرو قد، آہو چشم اور مرمریں بدن اس قدر

دل ربا جیسے غالب کی غزل۔ اسے دیکھو تو زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے، اسے دیکھو تو سرے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے اور وہ جو ذرا ہٹ کے مسکرا رہی تھی: چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے اور ہم کہ مدت ہوئی تھی یار کو مہماں کئے ہوئے، جگر لخت لخت سے دعوتِ مژگاں کرتے آگے بڑھے۔

* دلِ ناداں کو اس طرح کے سوال سوجھے کہ شرم کیا چیز ہے حیا کیا ہے (تحریف)
* ادھر ہم تھے کہ کبھی اپنے منہ کو اور کبھی ان کے گھر کو دیکھتے تھے۔

اور اب ملاحظہ ہوں دیگر فنی تدابیر کی کچھ مثالیں ـــــ

* صنعت تجنیس سے اکثر کام لیتے ہیں مثلاً: ایک امیدوار بیرا پہلے ہی سے انتظار میں بیٹھا تھا کہ آنے والا بے بیرا (گویا بیرا سے بے بہرہ) ہو تو شاملِ خدمت ہو جائے (یہاں غالب یاد آتے ہیں: "کانوں کا بہرا قسمت کا بے بہرہ" اور "میاں تمہارے دادا تو امین الدین خاں ہیں، میں تو تمہارا دلدادہ ہوں")
* عموماً قافیے کے استعمال سے عبارت کو دلکش بناتے ہیں: راشن کی فراوانی، پیسوں کی بیکرانی اور سب سے بڑھ کر آٹھ پہر کی حکمرانی؛ صحن گل و گلزار، ڈرائنگ روم سدا بہار مگر رہائشی کمرے خارزار اور کھانا زبون و خوار؛ دھوبی نے ہماری وردی کو اکڑایا، بیرے نے بٹنوں کو چمکایا، ہم نے سینے کو پھیلایا، ٹھوڑی کو اٹھایا، شکم کو پچکایا۔
* اکثر ایک حرف سے شروع ہونے والے الفاظ کو یکجا کر کے یعنی ALLITRATION سے کام لے کر صوتی تاثر پیدا کرتے ہیں: میس کی میز شیر، شکر، شہد اور شمپین سے لدی ہوئی تھی؛ یہ شاہوں کی شان کے شایاں ہے؛ شگفتگی، شائستگی، شیرینی۔
* ان مل بے جوڑ چیزوں کو جمع کر کے ظرافت پیدا کرتے ہیں: اللہ نے ہمیں افسری کی بجائے حسرت موہانی کی طرح درویشی عطا کی ہوتی اور ہم ایک لوٹا، خالی جیب، عالی ظرف اور اللہ کا نام لے کر منہ اندھیرے چل نکلتے؛ بستر اور امام ضامن کھولنا پڑا، نگار آئے، ناشتہ آیا، سگار آئے؛ آپ کے چہرے پر میر پور اور قمیص پر سالن کے آثار تھے؛ ہم کسٹم کے راستے کچھ عربی کچھ انگریزی کچھ سچ، کچھ جھوٹ بولتے ایئرپورٹ سے باہر نکلے۔
* مزاحیہ ترکیبیں وضع کرتے ہیں: نگہ بچہ ساز، نامولود بچے، شبہ آلود نگاہ۔

محمد خاں کی تحریر میں صرف رنگینیِ بیان ہی نہیں رعنائیِ خیال بھی موجود ہے۔ ان کی ظرافت

کبھی مضحکہ خیز خیال کا سہارا لیتی ہے، کبھی مضحک کردار کا تو کبھی پڑھنے والا صورتِ حال اور فضا سے محظوظ ہوتا ہے۔ محمد خاں کو مرقع نگاری میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کی تحریروں میں ایسی دلفریب شخصیتوں کی مکمل تصویریں نظر آتی ہیں جو اپنی ساری کمزوریوں کے ساتھ چاہے جانے کے قابل ہیں۔

___ مصر میں مقیم مصنف کے پچپن سالہ منہ بولے چچا جان جو نیک اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے بھتیجے کو اس شان سے خوش آمدید کہا کہ وہ چار حسیناؤں کے جھرمٹ میں تھے جن کے چہروں پر تبسم تھا مگر بدن پر کچھ نہ تھا۔

___ غصے میں اپنا ہیٹ چبانے والا پیٹرسن اور اسے منہ چڑانے والی بیباک ڈرائیور۔

___ کیپٹن مومن شاہ جو عمل پہلے کرتے اور سوچتے بعد میں تھے۔

___ بزم آرائیاں کا وہ پیارا سا چھوٹا چودھری جس کے بچپن کے واقعات پڑھنے والے کو اس سے قریب تر کر دیتے ہیں۔

___ ہسپتال کی وہ منہ زور اینگلو انڈین نرسیں جو صحت مندوں پر مہربان اور مریضوں پر نامہربان رہتی تھیں اور وہ خاص نرس جسے مصنف نے زخمی گورکھا سپاہیوں کو ڈیم فول کہتے سنا تو بلا اختیار ہسپتال سے نکال باہر کیا اور بعد میں خود برطرف ہوتے ہوتے بچا۔

محمد خاں کی تحریر میں کہیں ایسی صورتِ حال کا سامنا ہوتا ہے کہ پڑھنے والے پر مسکرانے کے ساتھ ساتھ کئی ملی جلی کیفیتیں گزر جاتی ہیں۔ مصنف کا بیرا شیر باز باتوں باتوں میں اطلاع دیتا ہے کہ اس کا ایک انگریز صاحب قبائلیوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا شناختی کارڈ اور دو کان واپس ملے تھے لیکن اپنے نئے صاحب کے اطمینان کے لئے اتنا اور اضافہ کرتا ہے کہ "تم فکر مت کرو۔ وہ مسلمان کا لاش خراب نہیں کرتے"۔ مصنف ریگستان کے اس حصے سے گزر کر جسے یہودیوں کی محنت نے گل و گلزار بنا دیا تھا، عربوں کے علاقے میں آنکلتا ہے۔ یہاں ریت اڑتی ہے۔ گدھے اور اونٹ کے ناہموار تعاون سے ہل چلایا جاتا ہے اور عرب بچے سگریٹ کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ اس موقع پر مصنف لکھتا ہے "ہم مسافروں کو پہلے تو دشت دیکھ کے گھر یاد آیا اور پھر سوچا کہ ہمارے عرب بھائیوں کا کیا بنے گا اور بنا یہ کہ چند ہی سال بعد فلسطین جغرافیے سے نکل کر تاریخ میں چلا گیا اور اس کی جگہ اسرائیل نے لے لی اور ہمارے عرب بھائی پناہ گزینوں کے کیمپ میں منتقل ہو گئے"۔

محمد خاں کے یہاں بعض جگہ ہنسانے کی شعوری کوشش بھی نظر آتی ہے بالخصوص دوسری اور تیسری کتاب میں۔ کہیں کہیں زبان میں پچی کاری (OVER-ORNAMENTATION) کی صورت بھی پیدا

ہوگئی ہے۔ مثلاً : "باہر نکلے تو دروازے پر مسز ش کھڑی انتظار کر رہی تھیں ــــ ارادۃً ! قریب ہی مس ش اپنے نوخیز نتھنے پھیلائے اور تیکھی تیوری چڑھائے کھڑی تھیں ــــ احتجاجاً ! اور جب روش پر چل نکلے تو مس ش پھرتی سے ہم دونوں کے درمیان چلنے لگیں ــــ احتیاطاً !" فن وجود میں تو کاوش سے ہی آتا ہے لیکن آمد اور آورد کے سلسلے میں حالی کی رائے آج بھی حرفِ آخر ہے کہ ہو تو آورد مگر اس پر آمد کا گمان گزرے۔

اسلوب صاحب نے لکھا ہے : "علمی مزاح ہمیں قہقہہ لگانے کی بجائے صرف تبسم زیرلبی کی دعوت دیتا ہے اور ذہن میں ایسی خوشگواری کے ساتھ نفوذ کرتا ہے جیسے نفشئی شعاعیں جسم کے مساموں میں داخل ہوتی ہیں"۔ محمد خاں کا مزاح اسی زمرے میں آتا ہے۔ انھوں نے کہیں لکھا ہے "ان تحریروں سے آپ کے چہرے پر نہ سہی آپ کے ذہن میں روشنی کی ایک کرن پھوٹ پڑے۔ ایک فرحت کی کرن ! اور یہ ہو جائے تو ہمیں اپنی پیٹھ تھپکانے کا حق ہوگا۔ اور اگر یہ کرن نہ پھوٹے تو آپ اپنی پیٹھ تھپکا لیں"۔ بظاہر اس معصوم اور بے ضرر سے جملے میں کیسی بے پناہ خود پرستی کارفرما ہے مگر جو مصنف اپنے قاری کو لطف و انبساط کی ایسی لازوال دولت بخشنے کی قدرت رکھتا ہو وہ اپنے فن پر جتنا بھی ناز کرے روا ہے۔ تسلیم کرنا پڑتا کہ اس نے کہیں ایسا موقع نہیں دیا کہ ہم اس کی تحریر سے لطف اندوز نہ ہوں اور اپنی پیٹھ تھپکا لیں۔

مزاح ملک شیک کا سا مزہ دینے لگے تو بے لطف اور بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ مٹھاس ہی کیا جس میں ذرا بھی ترشی نہ ہو۔ مٹھاس میں کھٹ مٹھی سی کیفیت ہونی چاہئے۔ کچھ شیرینی، کچھ ترشی کچھ تلخی ! جو زندگی کو اس کی ساری سفاکیوں کے ساتھ سہارتا ہے۔ وہ بہت حساس اور زود رنج ہو جاتا ہے۔ اپنی منشا کے خلاف ہونے والی ذرا سی بات اسے بدحظ کر دیتی ہے اور وہ ظرافت نگار ہے تو اس کی تحریریں میں صرف ہنسی ٹھٹھول نہیں طنز کے نشتر بھی چھپے ہوتے ہیں۔ مشتاق یوسفی ہمارے عہد کے ایسے ہی ظرافت نگار ہیں۔ اعلیٰ درجے کی ظرافت ہنسانے کے ساتھ ساتھ فکر کو بھی بیدار کرتی ہے۔ یوسفی کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والا پڑھتے پڑھتے سوچنے لگتا ہے اور ہنستے ہنستے اچانک چپ ہو جاتا ہے۔ اکثر اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

یوسفی کی ہر سطر مسکراہٹوں کا سامان تو مہیا کرتی ہی ہے لیکن بیچ بیچ میں دل کھول کر ہنسنے کے موقعے بھی آتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کا مزاح شائستہ ہونے کے باوجود شوخ رنگ ہے۔ اسی طرح ان کا طنز بھی زیادہ بھرپور اور زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ مگر ظرافت کی آمیزش اسے خوشگوار بنا دیتی

ہے۔ طنز کی اسی صفت کو یوسفی نے میٹھی مار کا نام دیا ہے۔ جو بقول ان کے شوخ آنکھ، پرکار عورت، اور دلیر کے وار کی طرح کبھی خالی نہیں جاتی۔

"چراغ تلے" اور "خاکم بدہن" کے بعد شایع ہونے والی "زرگزشت" کو یوسفی نے اپنی سوانح نوعمری کہا ہے۔ پہلی نظر میں یہ آپ بیتی کے سوا سبھی کچھ نظر آتی ہے۔ دوسری نظر میں یہ اینڈرسن کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی روئیداد معلوم ہوتی ہے کہ اسی سے کہانی شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔ بیچ بیچ میں کبھی یہ کردار جھتنار درخت کی طرح بار بار ابھرتا اور اپنے گرد و پیش پر چھا جاتا ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ "زرگزشت" زندگی کے کانٹوں بھرے راستے پر یوسفی کے اس لمبے سفر کی داستان ہے جس نے اس کے تلووں کو لہولہان کر دیا۔

"زرگزشت" کے بیشتر حصے میں یوسفی آپ تماشا ہیں اور آپ تماشائی۔ وہ اپنی شکل اس شریر آئینے میں دیکھتے ہیں جو چہرے کے خد و خال کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ پھر اپنی بگڑی ہوئی شکل کو دیکھ کر آپ قہقہے لگاتے ہیں۔ یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ ان کے قلم کا تیار کیا ہوا ایک سیلف پورٹریٹ دیکھئے۔ "ذہن پر زور ڈالا تو بعض مشاہیر کے جن چیدہ چیدہ اوصاف اور شباہتوں کا اپنی ذات میں جگمگاتا نظر آیا، کاش وہ نہ ہوتیں تو زندگی سنور جاتی شلاً نپولین کا قد، جولیس سیزر کا چٹیل سر، جینا لولو بریجیڈا کا وزن، سیموئل جانسن کی بینائی، ناک بالکل قلوپطرہ کی مانند کہ اگر ½ انچ بھی چھوٹی ہوتی تو اس دکھیا کا شمار بدصورتوں اور اپنا خوبصورتوں میں ہوتا۔" "زرگزشت" میں مصنف نے اپنے اس طرح کے کئی کارٹون پیش کئے ہیں۔

کتاب کے جن حصوں میں مصنف نے اپنے سفر زندگی کے واقعات بیان کئے ہیں اور اپنی آبلہ پائی کی حکایتیں سنائی ہیں۔ وہ سب سے جاندار اور پرکشش ہیں۔ انھیں پڑھتے پڑھتے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری مسکراہٹ اداسی میں بدل جاتی ہے۔ ایک جگہ یوسفی ان برے دنوں کا ذکر کرتے ہیں جب جیب خالی ہوتی تھی اور رات گئے لمبا سفر پیدل طے کر کے بہر حال گھر پہنچنا ہوتا تھا۔ اس میں چاہے آندھی آئے، چاہے مینہ آئے اور چاہے بس ہی کیوں نہ آ جائے۔ اس سے پہلے کہ ہمارے مسکراتے ہوئے ہونٹ واپس اپنی جگہ پہنچیں، ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اس کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں —

— بائی دی وے، میرے کوارٹر میں کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے۔ ہمارے حصے میں ایک کمرہ آیا ہے جس میں قالین بھی نہیں۔ WALL TO WALL بچے بچھے رہتے ہیں۔

——— اور یہ فقیر پُر تقصیر؟ اپنی اوقات کو نہیں بھولا تھا۔ کنڈوں کی آنچ پر پکتی ہانڈی میں
ڈوئی سے گھٹی ہوئی اُلد کی بے دھلی دال چٹخارے لے کر کھاتا تھا اور اپنے رب کا شکر ادا کرتا تھا۔
——— صبح اتنی تکان محسوس ہوتی گویا شام ہو یشقت سی مشقت! تھکن اور ایسی اٹوٹ تھکن
کہ ایک ایک مسام میں اتر جائے اور ہڈیوں تک کو چٹخادے۔ رواں رواں کراہنے لگتا۔ کبھی کبھی بے اختیار
جی چاہتا اب کے ایسے سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں۔

زر گزشت ایک آرٹ گیلری ہے جس میں بعض فل سائز تصویریں ہیں۔ کچھ مضحکہ خیز کریکیچر ہیں
اور چند کارٹون۔ ان میں سب سے مکمل تصویر اینڈرسن کی ہے جو جاندار سی نظر آتی ہے۔ یہ منہ پھٹ مے خوار
"دائمی طیش میں رہتا تھا۔ اس کا غصہ بالکل خالص ہوتا تھا یعنی بلا وجہ فون پہ بولتا تو تار جل اٹھتے
تھے۔ ہر لفظ کی تیوری پہ بل، ہر فقرے کی آستین چڑھی ہوئی۔ غبن اگر ڈھاکہ میں ہوا ہے تو ڈانٹ
کراچی کے کیشیئر پر پڑ رہی ہے۔ اس کے دفتر کے لوگ رجز پڑھتے ہوئے جاتے اور ہجو کہتے ہوئے
لوٹتے۔ بشیر احمد تو اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے لبریم کی ایک گولی کھا لیتے تھے۔ کہتے تھے
کہ لمحہ توہین و تذلیل سے پانچ منٹ پہلے ایک گولی کھالی جائے تو پھر طبیعت پر ڈانٹ کا ذرا اثر نہیں ہوتا۔
ذرا دیر بعد کمرے سے بے آبرو ہو کر نکلتے تو دوا اور کھاتے۔ ملازمت پیشہ آدمی اور کر بھی کیا سکتا ہے۔"
لیکن یہی باہر سے سخت اور بے رحم افسر اندر سے موم تھا۔ جس سے بد زبانی کر لیتا پھر بہانے بہانے
بلا کے اس کی دلجوئی کرتا۔

خان سیف الملوک خان کو زندگی نے کچھ بھی تو نہ دیا۔ پھر بھی وہ مطمئن و مسرور رہتے اور ایسی
خوشیاں بکھیرتے چلے گئے جو دوستوں کے دامن میں سما نہ سکیں۔ شیخی خورے کنجوس قرض لینے میں کبھی بخل
سے کام نہ لیتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ادھار سے اخوت اور مساوات بڑھتی ہے۔ آخر ایک دن غبن
کر کے فرار ہو گئے اور پھر پیر بن بیٹھے۔ ڈی سوزا فرصت کے اوقات میں اپنی بے وفا محبوبہ کو بیٹرسن
کوڈ (خفیہ زبان) میں تار لکھ لکھ کے پھاڑتے رہتے تھے۔ کوئی نزدیک جاتا تو تار کو ہاتھ سے
ڈھانک لیتے اور کہتے "کیا تمھارے ماں بہین نہیں ہے؟" پوری کتاب میں قابل نفریں کردار صرف
ایک ہے ——— یعسوب الحسن غوری۔ مصنف نے اس کی تعمیر میں صرف سیاہ رنگ سے کام لیا ہے۔
گویا یہ یوسفی کے مرزا ظاہر دار بیگ ہیں ——— انگریزوں کے آگے منہ سے بھاپ نہ نکالنے والے،
افسروں کے خوشامدی، ماتحتوں کے بدخواہ۔ اس بلا کے وہمی کہ ہر وقت خود کو بیمار سمجھتے۔ کوئی مزاج
پوچھتا تو کراہنے لگتے، غسل خانے کی اندر سے چٹخنی نہ لگاتے تھے میت نکالنے میں آسانی رہے۔ بختصریا

زر گزشت ایک نگار خانہ ہے۔

شخصی مصائب کے علاوہ دنیا اور دنیا کے کاروبار میں جہاں جہاں خرابیاں نظر آئی ہیں یوسفی نے ان سب کو بھی اپنے شدید طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کی مثالیں دیکھئے ــــ

ــــ دیکھا گیا ہے کہ بزنس میں لمبے سرمایے کے ساتھ بیچ سیکس کا انوسٹ منٹ کر دیا جائے تو پھر ملیں اور فیکٹریاں ہر سال بچے دیتی چلی جاتی ہیں۔

ــــ چھوٹے ملکوں کے موسم بھی تو اپنے نہیں ہوتے۔

ــــ جن ملزموں کو سزائے موت دی جاتی ہے جیل والے ان کی بڑی دیکھ ریکھ کرتے ہیں کہ کہیں زہر نہ کھالیں، بلیڈ سے شہ رگ نہ کاٹ لیں، دیوار سے سر نہ پھوڑلیں، نیکر سے پھانسی کا پھندا نہ بنالیں۔ چھینک بھی آجائے تو ترنت ڈاکٹر کو بلوایا جاتا ہے۔ غرض کہ ان کی جان کی پوری پوری حفاظت کی جاتی ہے تاکہ پھانسی دی جاسکے۔

یوسفی مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی ہیں۔ انھوں نے اسی مضمون میں ایم۔ اے کیا تھا۔ وہ زندگی کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی سوچ میں فلسفیوں کا سا انداز پایا جاتا ہے ــــ وہی کہیں سے کہیں پہنچ جانے کا انداز۔ اکثر ایسا ہوتا ہے بات میں بات نکالتے، راستہ بھٹکتے، موضوع سے بھٹکتے وہ کہیں دور جا پہنچتے ہیں۔ آخر کار خیالوں کے طلسم کو مخاطب کی آواز یا افسر کا سوال توڑ دیتا ہے اس سے ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اینڈرسن سوال کرتا ہے "آخر تم یہ پیشہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ کوئی معقول وجہ؟" اور یہ جواب تلاش کرتے ماضی کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ اینڈرسن کی تصویر ذرا دیر کے لئے فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے اور مصنف کا ماضی ورق ورق ہمارے سامنے کھلنے لگتا ہے۔ وہ اپنا سوال دہراتا ہے اور یوں ٹوٹی ہوئی ڈور پھر سے جڑ جاتی ہے۔ یہ ان کے اندر کا فلسفی ہی ہے جو ان سے ایسی عبارتیں لکھواتا ہے ــــ

ــــ قومیں جب اللہ کی زمین پر اترا اترا کے چلنے لگتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر خند سے شق ہو جاتی ہے اور تہذیبیں اس میں سما جاتی ہیں ــــ

ــــ دولت، سیاست، عورت اور عبادت کامل یکسوئی، مکمل خود گزاشتگی، سرتاپا سپردگی چاہتی ہیں ذرا دھیان بھٹکا اور منزل کھوٹی ہوئی۔ جب تک آدمی اپنے دل و دماغ سے ہر آرزو کو رخصت اور ہر آدرش کو ارپن کر کے خود کو ان کے لئے خالص نہ کرلے یہ چھلاوے کہیں ہاتھ آتے ہیں۔ پھر جب مسافر اپنے قافلے سے بچھڑ کر ان کی جستجو میں بہت دور اکیلا نکل جاتا ہے اور شام کا جھٹپٹا سا ہونے

لگتا ہے تو یکبارگی اسے احساس ہوتا ہے کہ منزل تو وہیں تھی جہاں اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اتنے میں سورج ڈوب جاتا ہے۔

جو بات عقل و منطق کے ذریعے ذہن میں داخل نہیں ہوئی وہ عقل و منطق سے کیسے نکالی جا سکتی ہے؟ تو ہم کے کارخانے کا دستور نرالا ہے۔ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔

یوسفی کا مشاہدہ تیز اور مطالعہ وسیع ہے۔ اپنے ادب کے علاوہ انگریزی اور فارسی ادب سے انھیں گہرا شغف رہا ہے۔ کئی مقامی بولیوں اور ملکی زبانوں پر انھیں عبور ہے۔ اکثر جگہ ان کا بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ زبان پر انھیں حاکمانہ قدرت حاصل ہے اور لفظ ان کے ہاتھ میں پہنچ کر موم بن جاتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں انھیں ڈھالیں۔ جس طرح چاہیں انھیں برتیں۔ وہ مزیدار ترکیبیں گڑھتے ہیں، محاوروں اور اساتذہ کے شعروں میں رد و بدل کر کے انھیں اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ مضحکہ خیز تشبیہیں وضع کرتے ہیں لیکن ان کی ظرافت صرف زبان اور بیان کی ظرافت نہیں۔ وہ اصلاً خیال سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور حسن بیان اس کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اس طرح خیال اور زبان ایک مکمل وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کی تحریر میں طنز اور ظرافت کی دوئی بھی مٹ جاتی ہے۔ اس مکمل وحدت کی مثال ملاحظہ ہو ــــــ قالب صاحب اپنا کوئی شعر سناتے ہیں۔ یہی شعر ایک ہفتہ پہلے اپنے نام سے مجیب صاحب اور ایک صدی پہلے غالب سنا چکے تھے۔ مصنف نے تخلیے میں توجہ دلائی تو قالب صاحب نے "کمال خندہ پیشانی سے اعتراف کر لیا کہ سرقہ میں توارد ہو گیا ہے۔"

یوسفی رائج ترکیبوں میں معمولی سی تبدیلی کر کے مزاح پیدا کرتے ہیں جیسے حبالۂ آوارگی دستور المحل، وقف علی الاغلاط، حفظ ما تفنن، ڈان کا عظیم الڈان مشاعرہ۔ یہی سلوک کہاوتوں اور محاوروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ دیکھیے غرض کہ جتنے منہ ان سے کہیں زیادہ باتیں، خدشہ خدشہ بہم شود خطرہ۔ شعروں اور مصرعوں میں اس طرح تحریف کرتے ہیں (آج کل کی خواتین کے چہرے جعلی ہوتے ہیں اس لئے) ہیں خواتین کچھ نظر آتی ہیں کچھ، یہی کچھ ہے قاری متاعِ فقیر؛ کی جس سے بات اس نے ہدایت ضرور کی؛ اور بیچارے مسلماں سے فقط وعدۂ سود؛ دامن کو اس کے آج ظریفانہ کھینچئے اور مجموعۂ اغلاط ہے دنیا مرے آگے۔ تشبیہیں انھیں اس طرح کی سوجھتی ہیں ـــــ بائیں ابرو بے ایمان دکاندار کے ترازو کی طرح مستقلاً اوپر چڑھی ہوئی، کراچی کی سردی بیوہ کی جوانی کی طرح ہوتی ہے۔ مختلف اور متضاد اشیا کو یوں یکجا کرتے ہیں ــــــ چالیس کے پیٹے میں آنے کے بعد دال

کٹائی، ہم عمروں کی صحبت اور آئینے سے پرہیز لازم ہے؛ بھیرویں اور خوشامد سدا سہاگن راگنیاں ہیں؛ سانپ بچھو اور بزرگ کاٹنے کو دوڑتے تھے؛ آم، کیلا اور شاعر ہندوستان سے اور لمٹھا جاپان سے آتا ہے؛ ایرکنڈیشنر، میز پر فنانشل ٹائمز، ایرانی قالین، سیاہ مرسڈیز کار، قلم چھوڑ ہڑتال، رشوت، ریڈ آسٹن کے سوٹ، مگرمچھ کی کھال کے بریف کیس اور اتنی ہی کھال رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ یوسفی نے قوافی کے التزام صوتی تاثر اور ان تمام فنی حربوں سے کام لیا ہے جن سے مزاح پیدا کیا جا سکتا ہے۔

مبالغے کے بغیر مزاح پر اثر اور طنز کارگر نہیں ہو سکتا بلکہ تشدید (INTENSIFICATION) کے بغیر خود ادب کا وجود میں آنا محال ہے۔ چنانچہ یوسفی جی بھر کے افسانہ طرازی کرتے ہیں اور جن رنگوں سے وہ کام لیتے ہیں ان کو حسب ضرورت ہلکا، گہرا اور تیز گہرا کر لیتے ہیں در اصل "گھٹانے بڑھانے سے ہی کہانی ادب بنتی ہے اور پتھر کو چھیلنے ہی سے مجسمہ وجود میں آتا ہے" (مجدغاں) اور یوسفی اس راز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنی تحریروں پہ خونِ جگر صرف کرتے ہیں اسی لئے ان کے ہاتھوں معجزہ فن وجود میں آتا ہے۔

ابن انشا شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ان کی نثر ایک خوش مزاج شگفتہ بیان انسان کی تحریر ہے جسے طنز و ظرافت کی آمیزش نے اور بھی پرکشش بنا دیا ہے۔ ان کی نثری تصانیف کا بڑا حصہ سفر ناموں پر مشتمل ہے۔ وہ دیس دیس نگر نگر گھومے تھے۔ انھوں نے جہاں جو کچھ دیکھا وہیں اسے قلم بند کر کے چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ اس طرح یہ سفرنامے تیار ہو گئے۔ گویا یہ اس رواں دواں مسافر کی قلم برداشتہ تحریریں ہیں جو جہانِ گزراں پہ بس ایک سطحی اچٹتی سی نظر ڈالتا آگے بڑھ جاتا ہے اور اپنی روئیداد سفر کو ہلکے پھلکے مزاح سے "خندہ آور" بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کی باریکیوں پر غور کرنے، اس میں مضحک پہلو تلاش کرنے اور پھر اسے فنی تکمیل کے ساتھ پیش کرنے کی اسے مہلت نہیں۔ اس لئے یہ سفرنامے ایک کالم نویس کی خوشگوار تحریر سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔

تخلیقی عمل کی تین منزلیں ہیں ـــــ انتخاب، تفضیم اور تشدید۔ فن کار اپنے تجربات میں سے ان کا انتخاب کر لیتا ہے جن کی وہ نئے سرے سے تشکیل کرنا چاہتا ہے یعنی سب سے پہلے وہ مواد کے غیر ضروری حصے کو رد کرتا ہے۔ یہ پہلا مشکل مرحلہ ہے۔ دوسری منزل تفضیم کی ہے۔ اسی کو اٹھانا کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اور آخر کار یہ مواد ضروری تشدید کے ساتھ فن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

ابن انشا کے ذہین ہونے میں شک نہیں، ان کے پیدائشی فن کار ہونے میں کلام نہیں مگر حالات نے موقع ہی نہ دیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لا سکیں۔ وہ ساری زندگی جلدی میں رہے۔ ذمہ داریاں بڑھی ہوئی تھیں، کام بہت تھے اور وقت کم۔

غرض ابن انشا ——— طنز و ظرافت نگار کا مطالعہ کرنا ہو تو ان کی ایک مختصر سی تصنیف اردو کی آخری کتاب پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ غالباً یہ بھی بہت عجلت میں لکھی گئی۔ یہاں طنز الگ نظر آتا ہے اور مزاح الگ۔ دونوں پوری طرح گھل مل نہیں پاتے۔ ظرافت میں ہلکا ہلکا طنز بھی ہو تو زیادہ بامعنی اور پر لطف ہو جاتی ہے اور طنز تو ظرافت کے بغیر محض پھبتی بلکہ دشنام بن کے رہ جاتا ہے ——— تلخ، ناگوار، بے اثر! ابن انشا کا مزاح عموماً علمی سطح سے گر جاتا ہے مثلاً ———

——— اکبر کے بعد جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ وہ اکبر کا بیٹا تھا اگر باپ ہوتا تو یقیناً اس سے پہلے تخت پر بیٹھتا۔

——— تاج محل نہ ہوتا تو تاج محل بیڑی بھی نہ ہوتی، تاج محل چپل بھی نہ ہوتی، تاج محل مکھن بھی نہ ہوتا۔

——— شاہ جہاں جہانگیر کا بیٹا اور اکبر کا پوتا تھا کسی معمار یا عمارتی ٹھیکیدار کا نور نظر نہ تھا۔ نہ کسی پی۔ ڈبلیو۔ ڈی والے کا مورث اعلیٰ تھا جیسا کہ لوگ اتنی ساری عمارتیں بنانے کی وجہ سے سمجھ لیتے ہیں۔

مشتاق یوسفی نے لکھا ہے "بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔" محمد خاں یہ قصہ سناتے ہیں کہ ظرافت کے اس عہد کو دورِ یوسفی کہا گیا تو خود یوسفی نے ابن انشا کا دور بتایا۔ اب اسے محبت، مروت، شرافت کچھ بھی نام دے لیجئے مگر اصلیت یہ نہیں۔ ابن انشا کی تحریروں میں لطافت و نفاست کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں مشاہدے کی وہ تیزی اور مطالعے کی وہ وسعت نہیں جو ان کے ہم عصروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی تحریروں میں کہیں ایسے صفحے دو صفحے بھی نظر نہیں آتے جہاں وہ محمد خاں یا یوسفی کے ہمسر دکھائی دیں۔ وجہ صاف ہے، وہ کاوش جو کسی تخلیق کو جاوداں بنا دیتی ہے ان کے یہاں ناپید ہے ہاں اس معاملے میں وہ منفرد ہیں کہ ان کی تحریروں میں طنز کا عنصر دوسرے ظرافت نگاروں کی نسبت زیادہ ہے لیکن فنی تکمیل کی کمی کے باعث اس کی دھار بھی کند ہو جاتی ہے۔ اگر زرگزشت اور بسلامت روی شایع نہ ہوئی ہوتیں تو یہ ظرافت کا محمد خانی عہد کہلاتا۔ □

احمد ندیم قاسمی

غزل

مرے سوال کا، یارب! کوئی جواب ملے
زمیں پہ کیوں مجھے اتنے فلک مآب ملے
یہ روزِ حشر ہے، لیکن مرے حساب سے قبل
مجھے خدا کی عنایات کا حساب ملے
وفورِ تشنہ لبی تھا کہ نقصِ دیدہ وری
مجھے تو جتنے سمندر ملے، سراب ملے
عظیم شہر حقیقت میں کتنا چھوٹا تھا
تمام قصر نشیں خانماں خراب ملے
کوئی بتا نہ سکا مجھ کو مدعائے حیات
جو گل کھلا تو کئی رازِ بے حجاب ملے
نہ میں طلسم کا ماہر، نہ مجتہد، نہ رسول
مگر مجھے سفرِ شب میں آفتاب ملے
اگر نہیں ہے خدا کا کوئی شریک ندیم
تو مجھ غریب کو بھی ہجر کا ثواب ملے

۱۹- دکشنا پورم، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

علی باقر

کھلاڑی

سلیم کو اس گھر میں رہتے ہوئے پورے دو دن ہو گئے تھے۔ اس کے نئے کمرے کی چھت ڈھلواں تھی، ایک دیوار بہت اونچی تھی اور دوسری بہت نیچی۔ بس ایک چھوٹی سی کھڑکی کی اس میں گنجائش تھی۔ سلیم زیادہ تر کرسی پر بیٹھا اس کھڑکی کے شیشوں سے جھانکتا رہتا اور گھرے سبز میدانوں سے اوپر اٹھتی ہوئی گلابی کہر کو دیکھتا رہتا، یہ گہری کہر بید لرزاں کی نازک شاخوں میں الجھی رہتی ——— سلیم خود بھی تو ایک سخت الجھن میں مبتلا تھا مگر اس کی الجھن کہر کی طرح لطیف نہیں تھی بلکہ ایک پانی میں بھیگے ہوئے کمبل کی طرح اس کے سارے وجود سے لپٹی جاتی تھی ——— سلیم جب کیمرج کی خوبصورت اور تاریخی یونیورسٹی میں پڑھنے کے لئے داخل ہوا تھا تو اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ہر الجھن سے آزاد رہے گا مگر نوجوانوں کے ارادے ریت کی دیوار کی طرح ہوتے ہیں۔ سلیم کو اس بات کا پوری طور پر احساس ہو گیا تھا۔

سلیم کو اپنے پروفیسر بہت اچھے لگتے تھے۔ نیلی آنکھوں کے قریب ان کی سفید جلد میں جھریاں پڑ گئی تھیں۔ فیصلہ کن انداز میں ہونٹوں کو بھینچ بھینچ کر باتیں کرنے سے ان کے ہونٹ پتلے پتلے ہو کر رہ گئے تھے۔ پروفیسر پارکر سے مل کر سلیم کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ خود ابھی تک کتنا جاہل تھا، کتنا ناواقف۔ کالج کے ہوسٹل میں جب سلیم نے پہلا سال گذار لیا تھا تب اسے پروفیسر پارکر نے اپنے گھر ایک کمرہ رہنے کے لئے دیا تھا۔ ان کا گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے لمبے سفید ہوتے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک دن پروفیسر پارکر نے سلیم سے کہا تھا "گھر کتابوں کی خوشبو سے بسا ہونا چاہیے"۔ سلیم کو جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ مسز پارکر تقریباً ہر موضوع پر اپنے شوہر سے اختلاف رائے رکھتی تھیں۔ سلیم نے بعد میں کئی بار اس بات پر غور کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کیسے محبت ہوئی ہوگی، کس طرح دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا ہوگا۔ مسز پارکر کی خوبصورتی نے شاید یہ فیصلہ پروفیسر پارکر کے لئے آسان کر دیا ہوگا پہلے دن جب سلیم مسز پارکر کے گھر ان سے ملا تھا تو وہ بہت نروس تھا۔ اس نے بے خیالی میں ہاتھ سرکایا تھا تو ایک چمچہ میز سے نیچے گر گیا تھا۔ اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو اس نے میز کے نیچے سے مسز پارکر کی سفید، چکنی اور سڈول پنڈلیاں دیکھی تھیں۔ وہ اٹھ رہا تھا تو سر کے لگنے سے کافی سے بھری پیالی میز پر الٹ گئی۔ مسز پارکر نے اپنا نیپکن میز پر بچھا دیا تھا تاکہ کافی اس میں جذب ہو جائے۔

"تم بہت زیادہ گھبرائے ہوئے لگتے ہو" وہ مسکرا رہی تھیں۔

"جی ہیں — جی مجھے سخت افسوس ہے کہ — جی دراصل ہوا یہ کہ کافی ....." سلیم نے کہنا چاہا مگر پھر اس نے مسکراتی ہوئی مسز پارکر کی آنکھوں میں دیکھا اور اسے لگا جیسے کسی نے نیلے رنگ کی دھلی ہوئی دور یشمی چادر دور دور تک پھیلا دی تھیں، اس آسمانی رنگ میں دھوپ کی ہلکی ہلکی تمازت بھی تھی۔ سلیم کو یہ دھوپ دیکھ کر یقین ہو گیا تھا کہ اب اسے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پروفیسر پارکر ٹھیک اسی وقت کسی سے فون پر بات کرنے کے لئے کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

سلیم جب انگلستان نیا نیا آیا تھا اسے اپنے اکیلے پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ جب میرٹھ میں اپنے گھر پر رہتا تھا تو گھنٹہ گھر کے پاس اپنے چھوٹے بھائی کو اسکول چھوڑنے جاتا، واپس لاتا، بہنوں کے اسکول کے کام میں مدد کرتا، ماں کے لئے بازار سے سودا سلف لاتا، رات کو اکثر باپ کے پیر دباتا۔ یہ سب چاہے جانے اور دوسروں کو چاہنے کے وسیلے تھے۔ اب یہ سب ختم ہو گئے تھے صرف چند خط رہ گئے اور کچھ تصویریں۔ سلیم کو اپنی کم عمری کے باعث یہ پتہ نہیں تھا کہ پانی، ہوا، غذا کی طرح محبت بھی تو ایک بنیادی ضرورت ہے۔ محبت نہ کرنے سے جسم میں ایک طرح کا درد سا ہونے لگتا ہے۔ جیسے سلیم کے ذہنی نشو ونما کا ذمہ یونیورسٹی نے پروفیسر پارکر کے سپرد کر رکھا تھا اسی طرح اس کے درد کا علاج مسز پارکر نے سنبھال لیا تھا اور یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوا کہ سلیم کو شعوری طور پر پتہ بھی نہ چلا اور اسے احساس بھی ہوا تو اپنی بہن کے مذاق میں لکھے ہوئے ایک جملہ سے کہ امید ہے انگلستان سے لوٹتے وقت وہ اپنے ساتھ ایک خوبصورت سی میم صاحب ضرور لائے گا۔ سلیم کو پہلی بار اپنی اور مسز پارکر کی دوستی کی نوعیت کا پوری طور پر احساس ہوا تھا۔ محبت کرنے والے شاید تھوڑے پر اکتفا نہیں کرتے اور انسان کو بہت خود غرض بنا دیتے ہیں۔ سلیم کو اپنی بڑھتی ہوئی خود غرضی کا اندازہ ہونے لگا تھا وہ مسز پارکر سے چوری چھپے ملنا اب کافی نہیں سمجھتا تھا۔ اسی لئے سلیم نے سوچا تھا کہ وہ پروفیسر پارکر کے گھر سے اٹھ کر کہیں اور چلا جائے گا۔ کسی اور گھر میں اسے کم از کم جذباتی سکون تو مل سکے گا۔

"میں اپنے لئے کہیں اور رہائش ڈھونڈنا چاہتا ہوں" سلیم نے پروفیسر پارکر سے ایک دن کالج میں کہا تھا۔

"کیوں؟" وہ بظاہر کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

"جی بس یونہی" سلیم اپنے جوتوں کو گھور رہا تھا۔ بھیگی ہوئی گھاس پر چلنے سے اس کے جوتوں پر پانی کے ننھے ننھے قطرے جمع ہو گئے تھے "دراصل میں سوچتا ہوں کہ جتنے دن اس ملک میں رہوں ہر طرح کے رشتوں سے آزاد رہوں" سلیم کو اپنی قوت اظہار پر کچھ خوشی سی ہوئی تھی۔

"تم یہ کیسے سمجھتے ہو" پروفیسر پارکر نے اپنی کتاب سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا "کہ انسانوں کے درمیان رہو اور کسی سے رشتہ قائم نہ کرو؟"

"لیکن رشتے اگر گہرے ہو جائیں تو الجھنیں پیدا کرتے ہیں" سلیم نے بحث کرنے کی کوشش کی "رفتار کم ہو جاتی ہے جیسے جہاز لنگر ڈال دیتے ہیں"

"تو کیا وہ جہاز جو لنگر نہیں ڈالتے اور لہروں پر تیرتے رہتے ہیں ان کا پانی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا؟" پروفیسر پارکر نے پوچھا۔ وہ سلیم کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں کے قریب جھریاں گہری ہو گئی تھیں۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" سلیم گفتگو کے اس رجحان سے پریشان ہونے لگا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ پروفیسر پارکر اسے خوشی سے اپنے گھر سے چلے جانے کی اجازت دے دیں گے۔

"میں جو کہنا چاہتا ہوں آسانی سے کہہ دیتا ہوں ـــــ یہ سلیقہ برسوں تم جیسے ذہین نوجوانوں کو پڑھانے کے بعد آگیا ہے" پروفیسر پارکر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا" سلیم نے قدرے عاجزی سے اعتراف کیا۔

"اب تم خود اپنے کو ہی لو" پروفیسر پارکر نے کرسی سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا "تم نے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ مجھے دیا ہے، گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر علمی باتیں کرتے ہو، کچھ سیکھتے ہو اور ایک اہم حصہ میری بیوی کو دیا ہے"

"تو آپ کو میرے اور مسز پارکر کے بارے میں معلوم ہے؟" سلیم نے پوچھا۔ وہ اپنی کرسی میں اور دھنس سا گیا تھا اس کے دماغ میں بجلیاں سی کوندنے لگی تھیں، اس کو لگا جیسے سارے جسم کا خون اس کے چہرے تک پہنچ گیا تھا۔

"ہاں" پروفیسر پارکر ابھی تک ٹہل رہے تھے۔ "پہلے ہی دن سے تمہارے اور مارگریٹ کے بارے میں معلوم ہے، اس دن سے جس دن تم نے مینر پر کافی چھلکائی تھی"

"مگر آپ نے ظاہر نہیں کیا۔ اب تو مجھے آپ کے گھر رہتے ایک برس ہو گیا ہے۔ کیا آپ مجھ سے ناراض نہیں؟" سلیم دل ہی دل میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ حاسد شوہر خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ سلیم نے سوچا تھا۔

"بلی اپنی آنکھیں بند کر کے دودھ پیتی ہے اور سمجھتی ہے کہ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا ہے مگر لوگ دیکھتے ہیں ـــــ اور تم اگر پہلے نوجوان ہوتے جس سے میری بیوی نے دوستی کی ہوتی تو شاید تم سے ناراض ہو جاتا ـــــ بلکہ جب پہلی بار ایسا ہوا تھا تو میں نے بہت غصہ کیا تھا ـــــ بالکل روایتی شوہروں کی طرح

—— اس سب کے علاوہ میں خود تمھیں بہت پسند کرتا ہوں۔ تم بہت ذہین ہو سلیم، بہت ہونہار، مجھے تم سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں، پروفیسر پارکر نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔

سلیم کو پروفیسر کی یہ محبت اور شفقت بڑی عجیب سی لگی۔ شاید ان کی ناراضگی کو برداشت کر لیتا مگر اپنی محبوبہ کے شوہر کی محبت کا جواب وہ کس طرح دے یہ سلیم کو بالکل نہیں معلوم تھا۔ لذتوں کے علاوہ محبت طرح طرح کے جذبات کا بھی انکشاف کرتی ہے۔ سلیم ان نئے انکشافات سے پریشان ہو رہا تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے"، سلیم نے بہت سنبھل سنبھل کر کہا "کہ آپ سے نفرت کرنے لگوں، پروفیسر پارکر۔"

"کروگے، کسی دن نفرت بھی کروگے"، پروفیسر پارکر نے جواب دیا۔ "مگر نفرت بھی تو ایک طرح کا رشتہ ہی ہے، کیا تم نفرت کرنے سے نہیں گھبراتے سلیم؟"

"کیا آپ اپنی بیوی سے خفا نہیں ہیں؟" سلیم نے ان سے سوال کیا۔

"مارگریٹ سے خفا ہوکر مجھے کیا ملے گا؟ —— ان کو کئی برس تک شکایت تھی کہ میں کتابوں کو ان پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ کتابیں گم کر دیا کرتی تھیں —— اب انھیں شکایت ہے کہ میں اپنے بعض شاگردوں کو بہت چاہتا ہوں"، پروفیسر پارکر جیسے خود سے باتیں کر رہے تھے۔

"تو اب مسز پارکر آپ کے شاگرد آپ سے چھین لیتی ہیں —— اور آپ سے اپنا حساب چکانے کے لئے انھوں نے میرے ساتھ دوستی کا ناٹک کھیلا ہے۔" سلیم کی آواز سے اس کے اندرونی درد اور کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ سلیم تو مسز پارکر کی توجہ پاکر خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب مرد سمجھنے لگا تھا۔ ایک خوبصورت عورت کی بے لوث محبت سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا نعمت ہو سکتی ہے مگر اسے اب معلوم ہوا تھا کہ وہ دوستی، وہ دلبری، وہ دلداری سب دھوکا تھے، جھوٹ تھے۔

"تو تم میرے بجائے خود اپنے سے نفرت کرنے کے موڈ میں آرہے ہو —— یہ بات ٹھیک نہیں —— تم کو اپنے اور مارگیٹ کے بارے میں جاننا ہے تو خود ان سے پوچھو۔ ان باتوں کو صاف طور پر کہہ ڈالنا ہی اچھا رہتا ہے"، پروفیسر پارکر نے کہا۔ وہ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ صاف گوئی کی تلقین کیا کرتے تھے۔

"اچھا تو آپ ہی صاف صاف بتلائیے کہ آپ کو خود ان سب ہنگاموں میں کیا آسودگی ملتی ہے؟" سلیم کا سوال پوچھنے کا انداز عام حالات میں گستاخانہ خیال کیا جا سکتا تھا۔

"ہر بار جب مارگیٹ کا کوئی معاشقہ ختم ہوتا ہے تو ان پر ندامت کی ایک پیاری سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور پھر کچھ دن ہمارے بہت پیار و محبت سے گزرتے ہیں۔ محبت کی یہ تجدید میری زندگی کو جیسے نئی توانائی بخشتی ہے"، پروفیسر پارکر کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے "میں اور مارگریٹ گھنٹوں کافی

قریب بہتے ہوئے سست رفتار دریا میں کشتی میں گھومتے ہیں، محبت میں سرشار نوجوان لڑکے لڑکیوں کی طرح۔"
اس گفتگو کے بعد سلیم گھر گیا۔ مسز پارکر اس وقت شاپنگ کے لئے گئی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ اور
ں بھائیوں کی تصویریں، اپنے کپڑے اور کتابیں لے کر اس بوڑھی لینڈ لیڈی کے گھر آ گیا تھا اور اپنے نئے کمرے کی
نی کھڑکی سے بید لرزاں کی شاخوں میں الجھتے ہوئے کہر کو دیکھا کرتا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب پروفیسر پارکر اور
ا کی بیوی کے آپسی کھیل میں شریک نہیں ہو گا۔ وہ الجھنوں سے آزاد رہے گا۔ میرٹھ کے لوگوں نے انگریزوں سے
وت کی بنیاد ڈالی تھی، محبت کی نہیں۔ وہ اب دل لگا کر پڑھے گا۔
سلیم کو اپنے نئے کمرے میں آئے ہوئے دوسرا ہی دن تھا جب اس کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے
ر تشی کے انداز میں، دستک دی تھی۔ وہ اس دستک سے اچھی طرح واقف تھا۔ دستک دینے والے اس گداز
ز کو وہ بے شمار مرتبہ پیار کر چکا تھا، اپنے رخساروں سے سہلا چکا تھا، اپنی پلکوں سے اسے گدگدا چکا تھا۔ دروازہ
ل کر مسز پارکر اندر آ گئی تھیں۔ ان کے نرم سنہرے بال سلک کے اس نیلے اسکارف کے نیچے چھپے ہوئے تھے جسے
ہم نے دلی میں اپنی بہن کے ساتھ خریدا تھا۔ مسز پارکر کو دیکھ کر سلیم نے سوچا تھا کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے۔ ان
ے بات نہ کرے۔
"کیا بات ہے پرنس؟" مسز پارکر نے سر سے اسکارف اتارتے ہوئے اپنے بالوں کا سونا جھٹکتے ہوئے کہا
۔ روز سلیم نے مسز پارکر کو شہزادہ سلیم اور انارکلی کے زوال عشق کی کہانی سنائی تھی اس دن سے اکیلے میں مسز پارکر
ے پرنس ہی پکارتی تھیں۔ وہ سلیم کے قریب آ گئی تھیں اور اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ سلیم کے رخسار سے چھوا دیئے۔
ہ پرنس تم نے آج شیو نہیں کیا اور کیا تم ہم لوگوں سے ناراض ہو گئے ہو: ہمارا گھر کیوں سونا کر دیا؟"
"آپ کو ہماری دوستی کے بارے میں پروفیسر پارکر سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔" مسز پارکر کے ٹھنڈے
وں سے اپنا چہرہ ہٹاتے ہوئے سلیم نے کافی سخت لہجے میں کہا۔
"تم جورج کی باتوں پر ذرہ برابر بھی توجہ نہ دو۔ جورج کو دوسروں کو ذہنی ایذا پہنچانے میں مزا آتا ہے۔"
؛ پھر سلیم سے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اگر سلیم ایک قدم اور پیچھے نہ ہٹتا تو وہ مسز پارکر کے جسم کی نرمی اپنے جسم سے
تے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔
"مگر آپ نے پروفیسر پارکر سے یہ سب کیوں کہا؟ یہ تو میرا اور آپ کا اپنا راز تھا" وہ کھلے ہوئے آسمان
ا طرح نیلی آنکھوں سے ابھی تک گھبراتا تھا حالانکہ اب اس کے اور آسمان کے درمیان گہری کہر آ گئی تھی۔ موسم بدل
لیا تھا۔
"جب شادی ہوئے بیس برس ہو جائیں تو شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت

نہیں پڑتی"۔ مسز پارکر نے جیسے اپنی بے گناہی کا اعتراف کیا۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھیں، ان کی آواز سنجیدہ تھی۔

"اگر یہی بات ہے تو آپ کے شوہر کو کیسے پتہ چلا کہ ہماری دوستی اس روز سے شروع ہو جاتی تھی جب میں نے آپ کی میز پر کافی چھلکائی تھی۔" سلیم کے لہجے میں غصہ تھا اور غصہ میں بھرا یہ نوجوان ہندوستانی مسز پارکر کو آج اور بھی زیادہ پیارا لگا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اپنے پرنس کو لپٹا لیا اور اس کے کان میں کہنے لگیں۔

"تمھیں اس غصہ میں شاید یقین نہ آئے کہ صرف تمھارے بارے میں میں نے کبھی جورج کو کچھ نہیں بتلایا ــــ تم مجھے بہت زیادہ عزیز ہو میرے نوجوان پرنس"۔ سلیم نے محسوس کیا کہ ان کی گرفت اور تنگ ہو گئی تھی۔ اس کے داہنے کان پر مسز پارکر نے آہستہ سے پیار کیا۔ ایسا پیار ہمیشہ سلیم کو تڑپا دیتا تھا۔

"مجھ سے پہلے اور کتنے نوجوان شہزادوں سے آپ کی دوستی رہی ہے؟" سلیم نے خود کو ان سے قدرے درشتی سے چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"اب تم جلاپے کی باتیں کرنے لگے ــــ جلن والہانہ محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ــــ جورج نے ایسی باتیں کرنا ایک عرصے سے چھوڑ دیا ہے ــــ کیا تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو، پرنس؟" دھوپ آسمان میں پھیلنے لگی تھی۔

"نہیں، نہیں، ہرگز نہیں"۔ سلیم نے کہا اور کمرے کی ڈھلواں چھت کی سفیدی کو دیکھنے لگا۔ "مجھے آپ سے محبت نہیں ہے۔ میں ان جذباتی الجھنوں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے اب کبھی نہیں ملنا چاہتا کبھی نہیں"۔ وہ چھت کی طرف دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں آنسو اترنے لگے تھے، اس کی پلکیں بھیگ چلی تھیں۔ اس نے پچھلے ایک برس میں ہزار بار سوچا تھا کہ وہ اپنی ساری زندگی مسز پارکر کے قریب رہ کر گذار سکتا ہے۔ اچھا ہوا یہ بات اس نے مسز پارکر سے کبھی نہیں کہی تھی۔ اسے تعجب ہوا کہ وہ ابھی تک مسز پارکر کو مارگریٹ کہہ کر نہیں بلاتا تھا۔

"تم گھر واپس چلو" مسز پارکر نے سلیم سے منانے والے انداز میں کہا۔

"نہیں"۔ سلیم نے دانت سختی سے بند کر لئے اور مٹھیاں جکڑ لیں۔ "آپ اپنے جورج کے پاس اکیلی واپس جائیے یا ان کے کسی اور شاگرد کو ڈھونڈ لیجئے۔ وہ پروفیسر ہیں ان کو شاگردوں کی کیا کمی؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تم ایسے خراب موڈ میں ہو"۔ مسز پارکر نے کرسی سے اپنا اسکارف اٹھا لیا۔ "میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں مگر میں تمھاری خوشامد نہیں کر سکتی"۔ ان کی نیلی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سلیم نے منہ پھیر لیا۔ مسز پارکر دروازہ آہستہ سے بند کر کے جا چکی تھیں۔

پھر کئی مہینے گذر گئے۔ سلیم جتنے دن کیمرج میں رہا مسز پارکر سے نہیں ملا۔ کالج کے راستہ میں یا اس

چھوٹے سے شہر کی کسی تنگ سڑک پر اسے مسز پارکر کی گہری نیلی کار یا اس ساخت اور رنگ کی کوئی بھی کار نظر آجاتی وہ منہ پھیر لیتا۔ پروفیسر پارکر سے کالج میں ملتا تو صرف پڑھائی کی باتیں کرتا۔ ان سے بھی سلیم کو کھنچاؤ سا محسوس ہوتا۔ پھر امتحان آگئے اور اس نے بڑے زور شور سے تیاری شروع کر دی۔ نتیجہ نکلنے کے بعد جب آخری بار وہ پروفیسر پارکر سے ملنے گیا تو وہ کہنے لگے "عموماً مارگریٹ کی کسی ادا سے دوستی کے ختم ہونے کا اندازہ مجھے خود بخود ہو جاتا تھا مگر اس بار مارگریٹ نے مجھ سے جھگڑا کیا کہ میں نے انھیں ان کے پرنس سے جدا کیا تھا ——— سلیم تم جانتے ہو میں نے ایسا نہیں کیا لیکن ان دنوں تم امتحان کی تیاری میں مصروف تھے میں تمھیں اپنے گھر بلا کر اپنی صفائی پیش کر کے تمھیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا ——— مارگریٹ گھنٹوں ہماری بلی کو گود میں اٹھائے کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر دیکھتی رہتیں"۔ پھر پروفیسر پارکر نے سلیم کو بڑی محبت سے دیکھا "تم بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے ہو، میں تمھاری کامیابی سے بہت خوش ہوں، مبارک ہو۔"

"شکریہ"۔ سلیم نے کہا "پروفیسر پارکر میں آپ کے دیئے ہوئے علم کو نہیں بھولوں گا بلکہ اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ میں اس تعلیم کو بھی نہیں بھولوں گا جو مجھے یہاں کیمبرج میں حاصل ہوئی ہے۔ میں جلد ہندوستان واپس جا رہا ہوں لیکن آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ کسی دن اگر مسز پارکر اپنی بڑی نیلی آنکھیں بند کئے آپ کو میرے نام سے پکاریں تو آپ برا نہ مانیئے گا"۔ یہ تکلیف دہ باتیں کہتے وقت سلیم کو پروفیسر پارکر کی پیشین گوئی یاد آگئی وہ ان کا احترام کرنے کے باوجود اپنے دل میں ان کے لئے نفرت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ دونوں بظاہر متضاد جذبات بہ یک وقت محسوس کئے جا سکتے ہیں اس بات کا اندازہ پہلے سلیم کو کبھی نہیں ہوا تھا۔

"مارگریٹ مجھے تمھارا نام لے کر پکاریں ایسا کبھی نہیں ہوگا"۔ پروفیسر پارکر نے اپنی فیصلہ کن آواز میں جواب دیا۔ "وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ اس کہر آلود شام کو تمھاری لینڈ لیڈی کے گھر سے لوٹ کر آنے کے بعد انھیں کئی دن امید رہی کہ تم لوٹ آؤ گے، فون کرو گے، خط لکھو گے ——— پھر ایک دن وہ گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ مجھے پتہ نہیں کہ مارگریٹ کہاں ہیں، ہر جگہ تو ڈھونڈ لیا" پروفیسر پارکر سلیم کو ٹوٹے ہوئے سے لگے۔ اچانک سلیم کو اپنے دل میں پروفیسر پارکر سے سخت ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑے باہر نکلی ہوئی دھوپ میں کالج کے صحن کو دیکھ رہے تھے۔ سلیم چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔ کالج کے پرانے گیٹ سے باہر جاتے ہوئے سلیم نے دیکھا کہ مسز پارکر کی کار ایک کونے میں کھڑی تھی اور اس پر دھول کچھ اس طرح جمی ہوئی تھی جیسے ایک لمبے عرصہ سے اس کار کو کسی نے استعمال نہ کیا ہو۔ سلیم نے آسمان کی طرف دیکھا جون کے آسمان کا اجلا، دھلا ہوا شفاف نیلا رنگ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سلیم نے سوچا کہ بعض رنگ دل میں دکھ کی کیسی گہری چمک سی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس آسمان سے اسے کہاں پناہ مل سکے گی؟ □

مظہرامام

کشمیر کی غزلیں

جاگتی آنکھیں لٹاتی ہیں زر و گوہر ابھی
شہر سے لوٹے نہیں خوابوں کے سوداگر ابھی

گر رہے ہیں زرد پتے پیڑ سے فالج کی طرح
باغ ہے گویا کسی بیمار کا بستر ابھی

قتل ہوتے جا رہے ہیں نیلے پیلے شوخ رنگ
پیش منظر بننے ہی والا ہے پس منظر ابھی

سانپ کاٹیں گے اسے اور زہر ہم تک آئے گا
یہ تماشا بھی دکھائے گا وہ بازیگر ابھی

دیکھ لو شاید بدل جائے کبھی موسم کا رنگ
اس طرح کھولو نہ اپنے درد کا دفتر ابھی

٭

یہ سراب جسم و جاں ہی تو اٹھالے جائے گی
زندگی مجھ سے خفا ہو گی تو کیا لے جائے گی

چشم و ابرو کے اشارے بے اثر ہو جائیں گے
سادگی ہونٹوں سے حرف مدعا لے جائے گی

بھول جائیں گے تجھے اک روز تیرے غم گسار
وقت کی گردش ترا غم بھی اڑا لے جائے گی

کیا پتہ تھا ایک دن تصویر بن جائیں گے ہم
خامشی چپکے سے آئے گی صدا لے جائے گی

آج بھی جلتے ہیں آنکھوں میں تصور کے چراغ
تم تو کہتے تھے کہ سب اندھی ہوا لے جائے گی

آشفتہ چنگیزی
ص۔ب۔ ۱۵۸۴ الریاض
سعودی عرب

غزل

آنگن میں چھوڑ آئے تھے جو غار دیکھ لیں
کس حال میں ہے ان دنوں گھربار دیکھ لیں
جب آگئے ہیں شہرِ طلسمات کے قریب
کیا چاہتی ہے نرگسِ بیمار دیکھ لیں
ہنسنا ہنسانا چھوٹے ہوئے مدتیں ہوئیں
بس تھوڑی دور رہ گئی دیوار دیکھ لیں
عرصے سے اس دیار کی کوئی خبر نہیں
مہلت ملے تو آج کا اخبار دیکھ لیں
مشکل ہے تیرا ساتھ نبھانا تمام عمر
بکنا ہے ناگزیر تو بازار دیکھ لیں
آشفتگی ہماری یہاں لائی بار بار
ہے کیا ضرور تجھ کو بھی ہر بار دیکھ لیں

پرچھائیاں پکڑنے والے

ڈائری کے یہ سادہ ورق
اور قلم چھین لو
آئینوں کی دوکانوں میں ہم
اپنے چہرے لئے
اک برہنہ جسم کے محتاج ہیں
سرِ بازار میں
ایک بھی چاہنے والا ایسا نہیں
جو ہمیں
زندگی کا سبب بخش دے
دھندے جگمگاتے ہوئے شہر کی بتیاں
سجدہ کرتی ہوئی کہکشاں
خوبصورت خداؤں کی پھرتی ہوئی ٹولیاں
ایسا لگتا ہے سب
ایک مدت سے پرچھائیوں کو پکڑنے میں مصروف
ہیں

عظمیٰ ناز

۲/۳۲ سی۔ او۔ ڈی۔
درگ روڈ، کراچی ۱۵

اک بُت کی رفاقت

سورج بالکل سامنے آگیا تھا اور تمام صحن تیز چمکیلی دھوپ سے بھر گیا تھا۔ کرنوں کی شدت اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے اس نے کسمسا کر دوسری طرف کروٹ لی۔ ایسا کرنے سے اس کی نیند ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ دھوپ کافی پھیل چکی تھی۔ اس سوئی کچھ جاگی سی فضا میں آنگن میں لگے بوڑھے پیڑ سے لے کر دیواروں کی منڈیر تک ہر چیز سوگوار اور اجڑی لگ رہی تھی۔

صحن کے اس پار برآمدے میں بچھے تخت پر اماں بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھیں۔ اماں کی تیز نگاہ بالکل سیدھ میں بیٹھی شانو کی طرف تھی۔ جو چولہے میں گیلی لکڑیاں مسلسل پھونک پھونک کر جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ جلنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔ اس میں قصوروار شانو ہی تھی۔ کل شام کی ہلکی سی بارش نے ان لکڑیوں کو اچھا خاصا بھگا ڈالا تھا اس کی طبیعت کچھ بھاری سی تھی۔ اور پھر کچھ نیند کا بھی ایسا غلبہ تھا کہ وہ سوتی رہی۔ اس بات پر اماں نے تو بیچاری شانو کی خوب خبر لی تھی۔ ہائے بیچاری شانو! اس کا دل کڑھ کر رہ گیا۔ کتنی بار سوچا تھا کہ اب کے بازار جا کر وہ مٹی کے تیل والا چولہا ضرور لائے گا۔ شانو کو کم از کم تھوڑا سا تو آرام نصیب ہو گا۔ مگر وہ چولہا لاتا بھی کہاں سے ـــــ یہ اماں تو گن گن کر میری ہتھیلی پر پیسے رکھتی۔ مہینے کی آخری ہفتے سے اماں پہلی تاریخ کا حساب انگلیوں پر لگانا شروع کر دیتیں۔ دن گنتے گنتے آخر وہ پہلی تاریخ آ ہی جاتی۔ اور پھر اسی دن وہ اس کی تمام جیبیں جھاڑ لیا کرتیں۔ اور وہ حسرت کی ایک نگاہ ڈال کر رہ جاتا ـــــ اس کی جب نئی نئی شادی ہوئی تھی وہ شانو کے لئے ایک بار اماں سے چوری چوری سنہری سونے جیسی چوڑیاں لایا تھا۔ شانو کی سونی کلائیاں بج اٹھی تھیں۔ تب ہی اماں اس کی پہلی جھنکار پر بھاگی آئی تھیں۔ اُفوہ! نئی دلہن کے سامنے کیسی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ ارے توبہ!

اس کے خیالوں کا سلسلہ یہیں پر ٹوٹ گیا۔ شانو لکڑیوں کے نہ جلنے پر سخت ناراض تھی پھونکنی سے زور زور سے ضرب لگا رہی تھی۔ اور کمبخت یہ لکڑیاں پھر بھی جل کے نہ دے رہی تھیں ـــــ اس

نے چادر کو پھر آہستگی سے اوپر تان لیا اور چاہا کہ وہ جو سوتا بنا ہوا ہے سچ مچ کا سو جائے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس لئے کہ اماں جو اتنی دیر سے غصہ ضبط کئے بیٹھی تھیں۔ ایک دم ہی برس پڑیں۔
ارے یہ ان بے جان چیزوں پر غصہ کیوں نکال رہی ہے تجھے میں نظر نہیں آتی ــــــ اٹھ مجھے مار۔
شانو نے دھوئیں سے سرخ ہوتی بھری بھری آنکھوں سے اماں کو دیکھا اور ٹھنک کر بولی۔
''اماں۔ تم تو خواہ مخواہ بات الجھاتی ہو۔''
''ہاں بھئی! قصور تو سارا میرا ہی ہے۔ ارے تجھ سے ایک پیالی چائے کیا مانگ لی۔ قیامت آگئی۔ آدھے گھنٹے سے تیرا تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ تو کیسے کیسے چھل دکھا رہی ہے۔ کبھی کوئی برتن پٹک رہی ہے۔ کبھی پھونکنی مار رہی ہے۔ اے! میں کوئی بچہ ہوں مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ سکھانے چلی ہے تو مجھے۔ ارے سب جانوں ہیں! یہ سارا غصہ کس بات کا ہے۔''
شانو کی سرخ آنکھوں کا دبا دبا دھواں دہک اٹھنے کو بے تاب تھا۔ وہ اب دبی دبی آواز میں اعلان کر رہی تھی۔
''آج کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ چائے تو روز ہی دیتی ہوں۔''
''تو کیا تیرا مطلب ہے ایک پیالی چائے بھی نہ پیوں۔''
''یہ میں نے کب کہا ہے اماں۔''
''ارے! تو اور کیسے کہے گی سبھی کچھ تو کہہ دیا تو نے ــــ طعنے بھی دیئے جا رہی ہے۔ غصہ بھی اتارے جا رہی ہے ــــ اے! میں کہتی ہوں۔ اور کیا کرتی تو میرے ساتھ۔ ایک مارنا ہی رہ گیا نا تو یہ حسرت بھی نکال لے۔ کہہ تو رہی ہوں۔ اٹھا پھونکنی اور مار مجھے!''
اماں کی کڑک دار آواز سن کر دیوار سے حشمت خالہ سر نکال کر پوچھنے لگیں۔
''اے کیا ہو گیا آج پھر! صبح ہی صبح جی کیوں خراب کر رہی ہے۔''
''کیا بتاؤں! میری تو تقدیر پھوٹ گئی ہے۔''
اماں پنکھا جھلاتی سٹر پٹر کرتی وہیں دیوار کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں حشمت خالہ نے جوان کا سوکھا منہ دیکھا تو مارے محبت کے پھر پوچھا۔
''کیا بات کیا ہوئی ــــ؟''
''کیا بات ہوتی۔ صبح ہی صبح نگوڑی عادت جو ہے چائے پینے کی۔ سو میری کمبختی کہ اس سے

مانگ بیٹھی۔ صبح سے لے کر یہ وقت آن پہنچا ہے۔"

اماں کی آواز بھرا گئی تو حشمت خالہ کا دل مارے جوش کے بھر گیا۔

"تو کیا چائے نہ دی اس نے۔"

"چائے تو نہ دی۔ ہاں! جوتے خوب ملے۔ کبھی ایک چیز کو پھینکتی ہے کبھی دوسری کو پٹختی ہے۔ اور کیسے مارے گی یہ جوتے۔"

اماں مسل مسل کے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ آنچل کے بار بار رگڑنے سے ان کی ناک سرخ ہو گئی تھی۔

"تو جی کاہے کو ہلکان کرتی ہے۔ آجا میری طرف۔ میں تجھے پلاؤں گی چائے۔"

اور جانے اماں نے کیا جواب دیا وہ سن نہ سکا اس لئے کہ اس کا دھیان شانو کی طرف تھا۔ مسلسل پھونکنے سے لکڑیاں سلگ اٹھی تھیں۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ شاید وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

دھوپ منڈیروں سے آنگن میں اتر آئی تھی۔ اب اس سے مزید لیٹا نہ جا رہا تھا۔ لیٹا تو وہ اس ڈر سے تھا کہ اٹھا تو اماں اس کو بھی نہ بخشیں گی۔ سو اس لئے وہ جھگڑا ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا ــــ لکڑیاں سلگیں تو چائے بھی بن گئی۔ اور جب شانو کے ہاتھ سے اماں نے چائے کا پیالہ لیا تو ایک چور سی نظر اس کے اترے اترے چہرے اور روئی روئی سی آنکھوں پر بھی ڈالی ــــ اب وہ بہت مطمئن نظر آرہی تھیں۔ طمانیت کے احساس سے چور رہو کر وہ حشمت خالہ سے دوسری باتوں میں لگ گئیں۔

اس نے سوچا تو بہت تھا کہ وہ اماں سے احتجاج ضرور کرے گا۔ اس لئے کہ سارا قصور اماں ہی کا ہوتا تھا۔ شانو بے چاری تو بلا وجہ ہی اماں کا نشانہ بنتی تھی۔ اسے شانو کی بے گناہی کا سو فیصد یقین تھا۔ مگر ــــ ان تمام باتوں کے باوجود وہ اماں سے دو ٹوک بات نہ کر سکا۔ وہ تھا بھی دبو قسم کا۔ وہ ذہنی لحاظ سے بھی بڑا سست آدمی تھا۔ کسی بات پر غور و فکر کرنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ جیسی گذر رہی ہے سو گذر رہی ہے ــــ اور سچی بات تو یہ تھی کہ اس کا غور و فکر کرنا بھی بے سود ہی ثابت ہوتا۔ کیوں کہ زندگی کی تمام فکروں کو اماں نے اس سے چھین رکھا تھا ــــ وہ کسی چیز میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی حیثیت ایک کٹھ پتلی کی سی تھی۔ جس کی ڈور اماں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا چلنا، پھرنا، ہنسنا، بولنا، سب ان کی مرضی سے ہوتا تھا۔

مگر ــــ! اب کچھ دنوں سے شانو کی دبی دبی سسکیاں اسے ہر دم بے چین رکھتی تھیں۔ اس نے کئی بار چاہا کہ اماں سے آرام و سکون کے ساتھ یہ گفتگو ہو ــــ مگر اپنی دبو فطرت کی وجہ سے وہ اتنی بڑی بات کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔

جب اس کی شادی کا معاملہ اٹھایا گیا تو بھی وہ کچھ کہہ نہ سکا تھا۔ اسے اس بات سے کبھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہاں اماں کو اس کے بیاہ کا شوق بہت تھا۔ وہ حشمت خالہ کے ساتھ سر پہ چادر ڈال کر گلیوں، کوچوں میں سارا سارا دن ماری پھرتیں۔ مگر اماں کو پھر بھی اپنے پسند کی لڑکی نہ ملی۔ برادری کی چند لڑکیاں اچھی بھی تھیں۔ شادی کے قابل بھی تھیں۔ مگر اماں کی نگاہ کو ان میں سے ایک بھی نہ بھاتی۔

"اے! رجو کی بیٹی ــــ وہ تو کٹنی ہے کٹنی۔"

"اے! وہ غفور کی لونڈیا ــــ وہ۔ وہ تو ایک بال نہ چھوڑے گی سر میں۔"

اب لوگ لاکھ کہتے۔ لڑکی کی تعریفیں کرتے۔ مگر اماں کو تو صرف اپنی پسند کی تلاش تھی ــــ اور آخر ــــ وہ تلاش کر ہی لائیں ــــ ان کو تو سیدھی سادی گائے جیسی لڑکی چاہئے تھی۔ سو وہ مل گئی۔ بیاہ کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی گرفت سخت کرنی شروع کر دی تھی۔ جانے کیا ضد تھی اماں کو۔ وصل کی گھڑیوں کا ایک ایک لمحہ چھیننے کی کوشش کرتیں۔ تنہائی کا کوئی لمحہ اسے میسر نہ آتا۔ اور وہ کوئی چرایا ہوا لمحے لاتا بھی کہاں سے۔ دو کمرے کا چھوٹا سا گھر، کچا صحن اور ایک چھوٹا سا برآمدہ جس کے ایک طرف باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ وہ تھکا ہارا کام سے لوٹتا تو اس کا بڑا جی چاہتا کہ شانو اس کے پاس رہے۔ مگر شانو کی جگہ ہمیشہ اماں موجود رہتیں۔ اور شانو! وہ تو گیلی لکڑیوں سے سر کھپاتی نظر آتی۔ ماں کی یہ احتیاط پسندی اور بندشیں اسے بہت بری لگتیں۔ مگر جی ہی جی میں وہ کڑھ کر رہ جاتا ــــ زبان ہلانے کی اسے کبھی ہمت نہ پڑی ــــ

کبھی کبھی وہ جلدی گھر آجاتا۔ اور اماں کی نظر بچا کر سیدھا باورچی خانے کی طرف لپکتا۔ مگر اماں آہٹ خوب پہچانتی تھیں۔ فوراً چارپائی سے اتر کر پنکھا ہلاتی اس کے سر پر آن پہنچتیں ــــ

"اے! باؤلا ہوا ہے کیا ــــ گرمی میں کیا کر رہا ہے یہاں تو۔ چل صحن میں آکر بیٹھ ــــ ادھر ذرا ہوا ہے۔"

اور وہ فوراً ہی سر جھکائے اماں کے حکم کی تعمیل میں مرے مرے قدموں سے باہر صحن میں آجاتا جہاں چارپائی بچھی ہوتی۔ اماں کے ساتھ اسے بھی بیٹھنا پڑتا۔ وہیں سے چپکے چپکے شانو پر نگاہ ڈال لیتا۔ اور پھر اس کا اترا اترا چہرہ دیکھ کر اماں پر سخت غصہ آتا۔ مگر یہ غصہ ماں کی ایک ہی آواز پر ہوا ہو جاتا۔

"کیا بات ہے تو چپ چپ کیوں ہے۔ جی تو اچھا ہے تیرا۔"

اور ماں کی تیز نگاہوں سے گڑبڑا کر وہ فوراً سر جھکا لیتا۔ ایک پھیکی اور بے جان ہنسی اس کے ہونٹوں

پہ آکر تھم جاتی ایسے میں ان کا دل چاہتا۔ کاش! کوئی سلیمانی ٹوپی ہوتی جسے پہن کر وہ ماں کی نظروں سے اڑن چھو ہو جائے۔ مگر یہ اماں بھی تو جادوگر سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ وہ سارا سارا دن شانو کو کام کاج میں الجھائے رکھتیں۔ بات کرنے کا موقع کیا خاک ملتا ——— اس کا دل ماں کی طرف سے بدظن ہونے لگتا۔

ہاں! رات اپنی نرم نرم بانہیں پھیلائے جب اس چھوٹے سے گھر میں پھیل جاتی تو وہ سکون کی ایک ٹھنڈی سانس لیتا۔ کیوں کہ اس وقت شانو اس کے پاس ہوتی۔ اس کا اترا ہوا مغموم چہرہ اس کے بہت قریب ہوتا۔ اسے اتنا اداس دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتا۔ اور شانو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔

ہر رات وہ اس سے وعدہ کرتا کہ اب اماں نے کوئی برا سلوک کیا تو وہ ان کو ضرور ٹوک دے گا۔ ان کی زیادتیوں کا احساس ضرور دلائے گا۔ شانو کے لئے یہ ذرا سی ہمدردی بہت تھی۔ وہ مطمئن ہو کر سارے دکھ بھول جاتی۔

مگر ——— پھر! جب صبح ہوتی تو ——— اماں کا سامنا ہوتے ہی رات کا وعدہ بھولنے لگتا۔ اور شانو شکوہ بھری نگاہ لئے برتن مانجھنے کے لئے صحن میں لگے نل کے پاس بیٹھ کر راکھ بھرے ہاتھوں سے زور زور سے برتن مانجھنے شروع کر دیتی۔

کل صبح کی بات ہے جب جھگڑا شروع ہوا تو وہ اماں کے پاس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ اسے خبر نہ تھی کہ بات کیسے شروع ہوئی ——— کس نے شروع کی ——— ماں کی گونج دار آواز سن کر جب اخبار سے نگاہ اٹھائی تو شانو آنکھوں میں آنسو لئے اسی کو دیکھ رہی تھی ——— اس نے سر کو جھکا لیا۔ اور جھگڑا ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا ——— مگر جھگڑا رکتا کیسے۔ اماں مسلسل شانو پر برس رہی تھیں۔

اور فساد کی جڑ وہی صبح کی چائے تھی۔ جس کی اماں کو نشے کی طرح عادت ہو گئی تھی ——— اور شانو کو بھی دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔ اماں اس چائے کا غم۔ بات بات پہ نکال رہی تھیں۔ ان کی زبان اگر ایک بار چل جائے تو دوبارہ رکنے کا نام نہیں لیتی ——— وہ صبح کی طرح سر جھکائے شانو کو دیکھ رہا تھا۔ جو چور نظروں سے اسی کی سمت دیکھ رہی تھی۔ آنسو مسلسل اس کے گالوں پہ بہہ رہے تھے۔ وہ اس کو سرد مہر اور بے حس پا کر گھٹنوں میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تب وہ گھبرا کر باہر جانے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اماں کی بڑبڑاہٹ جاری تھی ———

شام کو بھی بے مقصد وہ ادھر ادھر وقت گذارتا رہا۔ اسے گھر جاتے ہوئے سبکی کا احساس ہو رہا تھا۔ شانو کے روانی سے بہتے ہوئے آنسو جو دیکھ لئے تھے صبح۔ وہ اب تک دل پر اثر کئے ہوئے تھے۔ اس نے چلتے چلتے سوچا اور بالکل طے کر لیا کہ کل صبح ہی صبح وہ اماں سے دو ٹوک بات ضرور کرے گا ——— بھلا

ایسی بھی کیا سنگ دلی۔ شانو جب سے بیاہ کر اس گھر میں آئی ہے۔ اماں نے کبھی اس سے سیدھے منہ بات نہ کی
—— شانو کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح صدا برستی رہیں۔ ایک تو بیچاری سوتیلی ماں کے سلوک سے ادھ
موئی ہوگئی تھی۔ دوسرے اماں نے اس گھر میں لاکر کون سا سکھ دیا ہے۔ اب بہت ہو چکی اب شانو کو اس
کا حق ضرور دلاؤں گا۔ اب اسے رونے ہرگز نہ دوں گا۔

یہ سوچ کر وہ کافی حد تک پرسکون ہوگیا —— شبیر گل فروش اس کا پرانا یار تھا۔ وہیں رک کر اس
نے شانو کے لئے موٹے موٹے بیلے اور گلاب کے پھولوں کے گجرے بنوائے۔ اور اس کی لمبی چوٹی کے لئے
وینی بنوا کر اس کی دوکان سے اٹھ آیا۔ راستے میں ہی اس نے خوب اچھا سا نجی پان کا بیڑہ بنوایا۔ ایک
اپنے کلے میں دبا کر دوسرا شانو کے لئے رکھ کر گھر کی طرف چل پڑا —— رات کافی ہوگئی تھی۔ اور وہ چاہ بھی
یہی رہا تھا کہ رات کچھ اور سرک جائے۔ تاکہ اماں گہری نیند سو چکی ہوں۔ اور واقعی آج تو قسمت مہربان
تھی جو اماں گہری نیند سو رہی تھیں۔ شانو نے دروازہ کھول کر بیٹھ پھیلی تھی۔ آج وہ اس سے بہت خفا تھی
سنجیدگی سے ناراض تھی اس سے۔ اس نے شانو کے چھوٹے سے ہاتھ کو تھام لیا۔

"تو مجھ سے خفا ہے شانو —— ؟"

اور شانو صبح سے طوفان روکے بیٹھی تھی۔ ایک دم بہہ نکلا۔ وہ اسے تسلی دیتا رہا۔ دلاسے دیتا رہا
پیار سے بہلاتا رہا۔ مگر آج —— آج شانو بری طرح روئے جا رہی تھی۔ کسی طرح چپ ہونے کا نام نہ لے
رہی تھی۔

آخر اس کے آنسو تھم گئے۔
ہچکیاں رک گئیں ——
اس کے من کا دھندلا غبار مٹ گیا۔
اب وہ مسکرا رہی تھی۔

اس کے ہاتھ میں وہ گجرے باندھ رہا تھا۔ لمبی سی چوٹی میں وینی سجا کر وہ پھول کی طرح کھل اٹھی تھی
وہ اسے مسکراتا دیکھ کر خود بھی ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔

"اب تو ناراض نہیں ہے نا —— ؟"
"نہیں" شانو کی بھیگی ہوئی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔
"بس ایک شکایت ہے تجھ سے —— ؟"
"ابھی شکایت باقی ہے شانو —— ؟"

"ہاں! سچ میرے لئے تو کیوں نہ بولا؟"

"میں کیا بولتا شانو ——— تو ہی بتا؟" ——— اس نے مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔ شانو کی مسکراتی آنکھیں اس بزدلی پر بپھرنے کو تیار تھیں۔

"اور جو تونے وعدہ کیا تھا ——— وہ یاد ہے ——— ؟"

"ہاں! کیا تھا وعدہ۔ یاد ہے مجھے۔"

وہ بہت بے بسی سے بول رہا تھا اور شانو پھر بدگمان ہو رہی تھی۔

"پھر ——— ؟"

"پھر کیا! یہ سوچ کر چپ رہتا ہوں کہ جھگڑا اور بڑھ جائے گا۔"

"کبھی میرے بارے میں بھی سوچا ہے۔"

"سوچتا تو رہتا ہوں شانو۔"

"خاک سوچتے ہو۔" شانو نے تنک کر کہا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے الگ کر لیا۔ وہ بے چین ہو اٹھا۔

"میں سچ کہتا ہوں۔ اپنے رب کی قسم۔"

"اگر سچے ہوتے تو مجھے یوں تنہا چھوڑ کر چلے جاتے۔؟"

شانو کی آنکھیں پھر جل تھل ہونے لگیں۔ وہ اماں کی زیادتیاں گن گن کر اس کو بتا رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کا جی کڑھ رہا تھا۔ وہ ان آنسوؤں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ وہ اماں کی زیادتیوں پر احتجاج کرے گا۔ اب اس کا ارادہ پختہ ہو گیا۔ اس نے شانو کو بھرپور اطمینان دلایا تھا۔ وعدہ کیا تھا۔ شانو اس وقت ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ دن بھر کی کلفتیں اور پریشانیاں جیسے بھک سے اڑ گئی تھیں۔ شانو کا ہاتھ ایک بار پھر اس نے تھام لیا تھا۔

شانو کا جی چاہا۔

یہ ہاتھ! مخلص اور جفاکش ہاتھ۔ یونہی اس کے ہاتھوں کو تھامے رہیں۔ وہ اس وقت بہت سکون سے بیٹھی اس کی بے چینیاں اپنے دل میں سمیٹ رہی تھی

وہ تمام احوال شانو کو سنا رہا تھا۔ کہ آج اس نے سارا دن اس کے بارے میں سوچتے سوچتے گذارا تھا۔ آج وہ بے حد بے قرار تھا ——— شانو نے یہ سب کچھ سنا اور خوشیوں کے احساس سے چور چور وہ بادلوں میں اڑنے لگی۔ وہ سچ مچ بے حد ہلکی پھلکی ہو چکی تھی ——— پھر وہ سو گئی۔ آنے والی کل کے

سپنے دیکھتے دیکھتے ـــــ میٹھی اور پر سکون نیند۔

اس نے بھی دل میں اپنے عہد کو پھر دہرایا اور شانو کے چہرے کی جانب نگاہ ڈال کر آنکھیں موند لیں۔ اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اور جب صبح ہوئی۔

تو اس کے خوابوں کا نشہ ٹوٹنے لگا۔

اس کے ارادے ریت کی دیواروں کی طرح بہہ گئے۔

اماں کی کڑک دار آواز اور پھونکنی کو لکڑی پہ مارتی شانو کو دیکھ کر وہ چپکے سے سوتا بن گیا تھا شانو نے غصے سے اس کے کسمسائے وجود کو دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے جان بوجھ کر سوئے رہنے میں عافیت جانی ہے۔ وہ بن کے سویا ہوا ہے۔ اتنی دیر سے یہ احساس شانو کے لئے بڑا زخم تھا۔

"ڈرپوک کہیں کا ـــــ بزدل۔" شانو نے نفرت سے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا ـــــ اور عین اسی وقت اماں چلچلاتی دھوپ کی طرح اس کے سر پہ آکھڑی ہوئیں ـــــ اس کی سوچیں وہیں تھم گئیں۔

"اے! اٹھ نالائق تک سوتا رہے گا۔"

اسے مجبوراً اٹھنا پڑا۔ اماں کا سامنا ہوتے ہی اس کا سر جھک گیا۔ زبان تالو سے جا لگی۔ سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔ شانو کی طرف دیکھنے کی اس میں سکت نہ رہی۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے صحن میں لگے نلکے کے پاس آیا۔ جہاں شانو نے ڈھیروں برتن مانجھنے کے لئے رکھے تھے۔ اس نے وہیں سے باورچی خانے کی طرف دزدیدہ نظر ڈالی۔ شانو اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ غصے میں یونہی کھڑی اپنی سانسوں کو ہموار کرتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی چوٹی سے ربن کو نوچ کر الگ کیا بے دردی سے گجرے ہاتھوں سے نکالے۔ اور پھر نفرت اور غصے سے اس کی طرف پھینک دیئے۔ جو راکھ کے برتن سے ہوتے ہوئے اس کے پیروں میں آن گرے تھے ـــــ اس کا سر جھکتا چلا گیا ـــــ ☐

مشتاق شبنم

ایکتا ٹکسٹائلس انجنیئرز، متھوناتھ بھنجن

غزلیں

مرے بدن میں سرشاری سی کیا شے ہے
جلتی بجھتی چنگاری سی کیا شے ہے
نئے زمانے کی آہٹ پر چونک پڑوں
ذہن (نظر) میں بیداری سی کیا شے ہے
بات کرے تو اس کے منہ سے پھول جھڑیں
لیکن دل میں عیاری سی کیا شے ہے
کسی کے آگے جھکنے کا میں نام نہ لوں
میری ذات میں خودداری سی کیا شے ہے
جتنا سوچوں نئے نئے نکتے پاؤں
اس کی بات میں تہ داری سی کیا شے ہے
خون رلاتا منظر ہے اور چپ ہیں سب
یہ خوابیدہ بیداری سی کیا شے ہے
پاس جب آئے رگ رگ میں کلیاں چٹکیں
شبنمؔ اس میں دلداری سی کیا شے ہے

تری گلی سے لوٹ کے جانے والا میں
سارے جیون، پھر پچھتانے والا میں
ترے بدن کی پیاس جگانے والا میں
پیاس جگا کر پیاس بجھانے والا میں
مرا سفر جلتے صحراؤں کی جانب
تیری جانب کبھی نہ آنے والا میں
دور کھڑا اب لہروں کا منظر دیکھوں
بیچ بھنور میں ناؤ چلانے والا میں
کوئی شمسی قوت ہے میرے اندر
روزن روزن چاند لگانے والا میں
بیتے دن کی یاد دلا کر اس کو بھی
ساری ساری رات جگانے والا میں
وہ بھی آخر کیسے پائے میرا بھید
پل پل روپ بدل کر آنے والا میں

سلمیٰ صدیقی

بیت گئی ہے جیسی بیتی

سوچا تو یہی تھا کہ جو کچھ باقی بچا ہے وہ بھی بیت جائے تو آپ بیتی لکھوں۔ لیکن اس بارے میں مزید انتظار سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو کچھ کہنا ہے آج ہی کہہ لوں۔ کل کی "کل" کس کل بیٹھے کون جانے!

میری پیدائش میں میرا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کی اور آپ جیسے بہتوں کی پیدائش میں آپ کا اور بہتوں کا کوئی ارادہ اور مشورہ شامل نہیں تھا۔ مجھے اپنا پیدا ہونا کیسا لگا تھا یہ تو یاد نہیں۔ لیکن اتنا بار بار سنتے سنتے یاد رہ گیا ہے کہ میری پیدائش سے پہلے چونکہ میرے دو بھائیوں کی ولادت ہو چکی تھی اس لئے والدین اور اقربا کی خواہش یہی تھی کہ بیٹی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ میں پیدا ہو گئی۔ میری پیدائش سے دو ماہ قبل علی گڑھ میں کوئی وبا پھیل گئی تھی۔ اس سے بچنے اور بچانے کی خاطر ابا میاں (والد) نے اماں بی بی (والدہ) کو ان کے میکے بنارس بھیج دیا تھا۔ جہاں ۱۸ جون کی ایک نہایت گرم صبح میں پیدا ہو گئی۔ مجھے تو علم نہیں لیکن سنا ہے کہ میں بے حد خوبصورت پیدا ہوئی تھی۔ لیکن یہ صرف سنی سنائی بات ہے۔ اس لئے کہ جب سے میں نے آئینہ دیکھنا شروع کیا، مجھے ہمیشہ مایوس ہونا پڑا۔ میرا اور آئینے کا یہ جھگڑا اب تک جاری ہے۔ آئینے کی مستقل مزاجی اور صاف گوئی، مجھے اب دھمکاتی رہتی ہے۔ ممکن ہے میری شکل و صورت اتنی معمولی نہ رہی ہو جتنی میں سمجھتی ہوں۔ لیکن میرے اس وسوسے کے پیچھے میرا ایک complex ہے جسے ماہر نفسیات کے علاوہ میں خود بھی سمجھتی ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ میری والدہ بے حد حسین و جمیل خاتون ہیں۔ اپنے عہد میں واقعی وہ بے پناہ خوبصورت نظر آتی تھیں۔ ایک تو حسن خداداد اس پہ ان کا خوش لباسی اور جامہ زیبی اور اپنے زمانے کے فیشن کی مکمل نمائندگی، وہ جس محفل میں ہوتیں بلا شبہ چھا جاتیں۔ میں اور میری چھوٹی بہن عذرا جب ان کے ساتھ کہیں میلاد شریف یا دعوت میں جاتے تو خواتین ناک کے اوپر انگلی رکھ رکھ کر کہتی تھیں کہ "ہے ہے بچیاں ذرہ برابر بھی ماں پہ نہیں پڑی ہیں۔

عذرا پیدائشی طور پر شریفانہ مزاج رکھتی ہیں۔ اس اتنے بڑے "الزام" کو بڑی خوش اسلوبی سے درگذر کر دیتی تھیں۔ لیکن میں "علی گڑھ والیوں" کی اس "تہمت" پہ بڑا فیل مچاتی تھی۔ کچھ اور تو کر نہیں سکتی تھی

بس اماں بی بی سے جھگڑتی تھی۔ چونکہ آپ زیورات پہنتی ہیں۔ بندی لگاتی ہیں۔ بالوں میں افشاں چھڑکتی ہیں۔ اور خوبصورت بنارسی ساریاں پہنتی ہیں اسی لئے خوبصورت لگتی ہیں۔ اماں بی بی ہنس کے میری اول جلول باتوں کو ٹال دیا کرتی تھیں لیکن ایک بار ایک محفل سے واپسی پہ انھوں نے میری اچھی پٹائی کی۔ اور وارننگ دے دی کہ کبھی کسی دعوت میں مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گی۔

ابا میاں کو پتہ چلا تو انھوں نے اس سہ پہر مجھے اپنے کمرے میں بلایا تو میری دکھ بھری روداد بڑے غور سے سنتے رہے پھر مجھے ان الفاظ میں سمجھانے لگے۔ دیکھو بیٹی اصل قصہ یہ ہے کہ لوگ تم سے مذاق کرتے ہیں تمھاری ماں بالکل خوبصورت نہیں ہیں۔ بلکہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ اور تم بالکل مجھ پہ پڑی ہو۔ لو یہ پیڑا کھاؤ۔ سرور صاحب بدایوں سے لائے ہیں۔ اور ہاں جو بات میں نے تم سے کہی ہے کسی سے مت کہنا۔ اور اپنی ماں سے تو بالکل ہی مت کہنا، ورنہ تمھارے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی.....!"

اس بات کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ خود اعتمادی جو جانے کہاں چھپی ڈھکی بیٹھی تھی۔ کود کر آئی اور میں نے اپنی ماں کے حسن کو برداشت کرنا سیکھ لیا۔ اس سے زیادہ خوشی اور فخر مجھے اس بات پہ تھا کہ ابا میاں اور میرے درمیان کوئی مشترکہ راز ہے جو مجھے میرے دوسرے بھائی بہنوں سے ممتاز کرتا ہے۔

اس زمانے میں ہم لوگ یونیورسٹی کے مکان میں رہتے تھے۔ مکان یونیورسٹی کے مرکز میں تھا۔ ممتاز ہوسٹل سامنے تھا اور گھر سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پہ باب اسحٰق تھا۔ یونیورسٹی کے شعبے اور کلاس رومز تھے۔ باب اسحاق کے آہنی پھاٹک کے جنگلے پہ چڑھ کر بیٹھنا اس زمانے میں میرا اور میری دوسری دوستوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ سامنے کے میدان میں یونیورسٹی اسٹاف کے بچے کھیلتے تھے۔ میرے دونوں بڑے بھائی اقبال رشید اور احسان رشید اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں کرکٹ کھیلتے تھے۔ میں بھی ضد کرکے اصرار کرتی تھی۔ کہ مجھے بھی کھیل میں شامل کیا جائے۔ احسان بھائی کو یہ بات سخت ناپسند تھی اور وہ مجھے ڈانٹ پھٹکار کے اور کبھی کبھی پیار محبت سے سمجھا بجھا کے گھر کے اندر کھیلنے کا مشورہ دیتے۔ لیکن اقبال بھائی مجھے فیلڈنگ پہ معمور کر دیتے اور میں بہت خوش ہوتی تھی۔ کہ میں بھی کھیل میں شریک ہوں۔ لیکن ہوتا یہ کہ بھاگ بھاگ کے گیند اٹھانے میں میرا برا حال ہو جاتا۔ جب میری باری آتی تو سب لڑکے کہتے تم کل کھیلنا اور ہاں ذرا یہ گیند وکٹ اور بیٹ گھر پہنچا دو۔ مجھے اس دھاندلی پہ بہت غصہ آتا۔ اور میں وہیں میدان میں بیٹھ کے رونے لگتی۔ اس وقت مغرب کی نماز پڑھانے مولانا ابوبکر صاحب یونیورسٹی میں جاتے ہوتے وہ لمبی سی عبا پہنے ہوتے۔ مجھے روتے دیکھ کر وہ میری انگلی پکڑ کر مسجد لے جاتے وہاں حجرے سے کوئی مٹھائی نکال کر دیتے۔ اور میں ہنستی بولتی گھر آجاتی۔

ایک بار یونیورسٹی کے رجسٹرار عظمت الٰہی زبیری صاحب کی بیٹیوں راشدہ اور ناصرہ کے ساتھ میں
وکٹوریہ گیٹ کے اندر پہنچ گئی اور اونچی گھڑی" (کلاک ٹاور) تک پہنچنے کے لئے ہم تینوں سیڑھیوں پہ جانے کہاں تک
چڑھ گئے۔ نیچے دیکھا تو کرزن ہاسپٹل کی چھت نظر آرہی تھی اور یونیورسٹی باغ کا لمبا چوڑا، کرٹوا کسیلا مالی بالکل ایک
کھلونا نظر آرہا تھا۔ اتنی اونچائی سے دیکھنے کی عادت نہیں تھی۔ اور پھر جانے ہم کس طرح کلاک ٹاور کے کس حصے میں
بھول بھلیوں میں کھو گئے اور سوائے چیخ چیخ کے رونے کے نیچے اترنے کی سب تدبیریں اور ترکیبیں بھول گئے۔
اس وقت جانے کس کام سے کندن (گھنٹہ بجانے والا) اوپر آیا۔ اور ہم لوگوں کو ساتھ خیر و عافیت کے نیچے لے کے
اترا۔ اور گھر پہنچا آیا۔

میرے بچپن کے علی گڑھ (یونیورسٹی) کا ماحول بہت خوشگوار اور دلچسپ تھا۔ اور اس وقت ایسا ہی
محسوس ہوتا تھا گویا علی گڑھ کے باہر کچھ ہے ہی نہیں۔ بس جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے اور یہیں ہے۔ یونیورسٹی
اسٹاف کے خاندانوں میں اس قدر میل ملاپ تھا اور اس قدر سب ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک
رہتے تھے کہ کبھی خیال ہی نہیں ہوتا تھا۔ کہ ان رشتوں میں کوئی بھی خون کا رشتہ نہیں ہے۔ حالانکہ رشتہ صرف علی
گڑھ کا رشتہ تھا۔ لیکن کتنا عجیب و غریب رشتہ تھا وہ۔ اس کا احساس اب ہوتا ہے جب رشتے ناطے اپنائیت،
خلوص و مروت و محبت کے الفاظ صرف محاورے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

اس زمانے میں، میری اور میری عمر کے سب بچوں کی خوشیاں اور پریشانیاں یکساں اور محدود تھیں
خوشی، عید، بقرعید، شب برات، مشاعرے اور نمائش اور کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شادی، بیاہ، منگنی، سالگرہ
رت جگے، نذر نیاز اور اسی طرح کے دھوم دھڑکے کی ہوتی تھی۔ اور ہماری پریشانیاں اور مصائب کی حد اور
انتہا ہوتی تھی۔ سالانہ امتحانات کا قریب سے قریب تر ہونا۔ امتحانات گرمی کے موسم میں ہوتے تھے اور اس وقت
جب میں کیلنڈر دیکھنا اور سمجھنا بھی نہیں جانتی تھی۔ دن تاریخ اور ماہ کا حساب کتاب عام طور سے مختلف تقاریب
اور امتحان کی آمد سے لگایا کرتی تھی۔ یعنی جاڑے کی سردی شروع ہوتی تو سالانہ نمائش قریب ہوتی۔ اترتے جاڑے
یونین کے الیکشن کی دھوم دھام ہوتی۔ کھیتوں میں سرسوں اور جب گھروں میں سوئیٹ پی کے پھول کملانے لگتے
اور ہوسٹلوں میں رات گئے تک روشنیاں جاگتیں تو امتحانات نزدیک ہوتے چلچلاتی گرمی ہوتی تو جانے چیل انڈے
چھوڑتی تھی یا نہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا اور اسٹاف اپنے اپنے وطن یا پہاڑوں کی راہ لیتے تھے اور جب یہ سب کچھ نہیں
ہوتا تھا تو راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ یعنی ہوسٹلوں میں سہگل اور کانن بالا کے ریکارڈ بجتے تھے۔ شمشاد
مارکٹ کی چائے کی دکانوں میں جنھیں اس زمانے میں بڑے احترام سے "کافی ڈی پھس" اور جانے کس کس معزز
ناموں سے پکارا جاتا تھا، چائے پی جاتی تھی۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کا "شاہی باغ" تو ایک تھا۔ "یعنی سوئمنگ

باتھ"، جہاں سرسبز لان، میور پنکھ کے پودوں گلاب اور چمیلی کی کلیوں کی بہار کے علاوہ ایک COVERED سوئمنگ پول بھی تھا۔ (اب بھی ہے) اکثر طلبا روہاں کتابیں لے کر پہنچ جاتے تھے اور اوپر کے ریستوران میں جو علیم اللہ کا ریستوران کہلاتا تھا بیٹھ کے لیمونڈ پیتے اور آئس کریم کھاتے تھے۔ یونیورسٹی کے طلبا ر اور اسٹاف اور ملازمین کے خورد ونوش میں چند چیزیں مشترک تھیں۔ یعنی علی گڑھ کے بسکٹ جو اپنے حجم کے اعتبار سے انتہائی "کنبہ پرور" ہوتے تھے۔ اور نمک پارے اور" تتلیاں" (گھوڑے کی برفی)۔ اس زمانے میں علی گڑھ سے کچھ فاصلے پہ چھیرت کے گاؤں میں ایک انگریز (کیونٹر) نے بڑے پیمانے پہ ڈیری فارم کھول رکھا تھا۔ اور بڑے سائنٹیفک طریقے پہ دودھ اور مکھن کی سپلائی کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے سب گھروں اور ہوسٹلوں میں کیونٹر کا مکھن استعمال ہوتا تھا۔ کریم بھی اس کے ہاں سے آتی تھی۔ اور ہمیشہ ایک دن پہلے اس کا آرڈر کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں آئس کریم کا کیا درجہ تھا۔ آج کل کے بچے سنیں گے تو ہنسیں گے۔ کیوں کہ اب تو بڑے یا چھوٹے شہروں کے علاوہ گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں اور ہر موسم میں آئس کریم ملتی ہے۔ لیکن ہمارے بچپن میں علی گڑھ میں آئس کریم بہت اہم بڑا اہتمام مواقع پہ کھائی اور کھلائی جاتی تھی۔ ایک دن پہلے سے دودھ، بالائی اور برف کا انتظام کیا جاتا، محلے میں صرف دو چار ہی آئس کریم کے فریزر ہوتے جسے بہت ذوق وشوق سے آئس کریم کی مشین کہا جاتا تھا۔ اور اس کو جب لوگ ایک دوسرے کو عاریتاً دیتے تو اس کے استعمال کے بارے میں بڑی ہدایات دی جاتیں۔ لگتا جیسے لڑکی کو سسرال بھیجا جا رہا ہے۔ اور اس کی قسمت اور مستقبل کے بارے میں دعائیں اور پیشگوئیاں کی جا رہی ہیں۔

ابا میاں اس طرح کے لین دین کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا آئس کریم کی مشین، چائے کا سیٹ، قالین تھرمامیٹر، ہمیشہ گھر میں دو دو رکھے جاتے۔ ایک گھر کے استعمال کے لئے ہوتا۔ دوسرا ہمیشہ دوسروں کے گھر میں ہوتا۔

ایک واقعہ اگر آپ کو بتاؤں تو شاید مبالغہ لگے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ایک بار ابا میاں کے ایک بزرگ دوست جونپور سے علی گڑھ آئے۔ اس وقت ریڈیو صرف ہمارے گھر میں تھا۔ انھوں نے جو ریڈیو کو ہنستے بولتے گاتے روتے سنا تو بالکل مبہوت رہ گئے۔ کہنے لگے" معجزہ ہے صاحب معجزہ"۔ میز کے گرد چکر لگاتے تھے اور حیران ہو ہو کے میز پوش اٹھا اٹھا کے میز کے نیچے جھانکتے تھے اور جب پورے طور پر مطمئن ہو گئے۔ کہ ریڈیو کے اندر یا آس پاس کوئی چھپ کے نہیں بیٹھا ہے۔ تو سر ہلا ہلا کے کہتے تھے "کرشمہ ہے صاحب کرشمہ! بعد میں انتہائی حسرت سے بولے:

"بجلی تو اب ہمارے محلے میں بھی آگئی ہے۔ لیکن یہ بلبل ہزار داستان (ریڈیو) کہاں سے لائیں اور اگر گھر میں ہے" (بیوی اسے دیکھیں تو جانے حیرت و استعجاب سے ان کی کیا کیفیت ہو جائے"۔

اباں میاں نے ان بزرگ کی واپسی پہ وہ ریڈیو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ لائسنس بعد میں گیا۔ چند دن بعد بزرگ کا پوسٹ کارڈ آیا "گھر میں بہت ناراض ہیں کہ یہ شیطانی بکھیڑا کہاں سے اٹھالائے۔ گھر میں کنواری بیٹیاں اور جوان بہوئیں بیٹھی ہیں اور تمھیں یہ چونچلے سوجھے ہیں۔ سارا محلہ تھو تھو کر رہا ہے۔ کہ جلد یہ ابلیسی کاروبار بند ہو چنانچہ ہم نے اسے دیوان خانے میں چھپا کے رکھ دیا ہے کیا کریں ظلم ہے صاحب ظلم۔!!"

اسی زمانے میں آل احمد سرور صاحب کی شادی ہوئی۔ اور وہ بدایوں سے دلہن بیاہ کر علی گڑھ آئے۔ اور ہمارے گھر سے تھوڑا فاصلے پر انھوں نے مکان لیا۔ شادیاں تو اس سے پہلے بھی ہوتی تھیں اور دلہن بھی دیکھنے کو ملتی تھیں۔ لیکن سرور صاحب جب اپنی دلہن کو لے کر ہمارے گھر آئے تو میں دلہن کو دیکھ کر خوشی سے بے حال ہوگئی۔ اس سے پہلے جو دلہنیں میں نے دیکھی تھیں۔ وہ اپنے آپ میں کھوئی رہتی تھیں۔ اور بے حد شرماتی تھیں۔ گو شرما تو وہ بھی رہی تھیں۔ اور ایک گلابی رومال بار بار چہرے پر پھیرتی تھیں۔ لیکن بے حد ہنس مکھ اور خوش مزاج نظر آتی تھیں۔ میرے ساتھ پہلے ہی دن سے ان کا بہت اپنائیت کا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ اور میں دن میں گھر والوں کی نظر بچا کے ڈیوڑھی کے دروازے سے بار بار نکل کر "دلہن" دیکھنے سرور صاحب کے گھر پہنچ جایا کرتی تھی پہلے تو اماں بی بی نے یہ سمجھا کہ شاید میں بدایوں کے پیڑے کھانے یا گڑیا کے کپڑے سلوانے وہاں جاتی ہوں۔ لیکن ایک دن جب میں نے گھر آکے ابا میاں سے سیدھے سیدھے یہ سوال کیا کہ "ابا میاں۔ "نازنین کسے کہتے ہیں——" تو انھوں نے لکھتے لکھتے حیرت سے سر اٹھایا اور آہستہ سے کہا "خوبصورت عورت کو" لیکن اماں بی بی نے جنھیں بچوں کی کارکردگی کے اسرار و رموز جاننے کا بہت شوق تھا، تیوری پہ بل ڈال کے مجھ سے پوچھا:

"تم نے کہاں سنا یہ لفظ؟"

میں نے کہا "آج دوپہر سرور صاحب دلہن کے ہاتھ دیکھ کے کہہ رہے تھے کہ ہاتھوں میں مہدی لگائے ہے زاہدہ نازنین"

اماں بی بی نے پکاتے والی بڑی بی کی طرف دیکھا۔ بڑی بی نے بھی جوابی مسکراہٹ فرمائی۔ لیکن اس دن سے مجھ پہ یہ پابندی لگادی گئی کہ وقت بے وقت دلہن کے گھر نہ پہنچ پاؤں۔

اس زمانے میں گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شب و روز رہتا تھا۔ اور مجھے پتہ رہتا تھا کہ جب پاندان کے پاس بٹوہ رکھا ہوتا تو جگر مرادآبادی مقیم ہوتے—— ناشتے میں حلوے اور بالائی کا اہتمام ہوتا تو فراق گورکھپوری ٹھہرے ہوتے۔ دہلی کا حبشی حلوہ اور پستے بادام کی برفی رکھی ہوتی تو ذاکر صاحب آئے ہوتے۔ الٰہ آباد کے امرودوں سے بھرا ٹوکرہ برآمدے میں دیکھا جاتا تو اصغر گونڈوی کا قیام ہوتا۔ کیونکہ

مکھن کے ڈبے اور بسکٹ کے پیکٹ منگائے جاتے تو سید سلیمان ندوی رخصت ہونے والے ہوتے۔ پرہیزی کھانے پکتے تو ڈاکٹر عابد حسین آنے والے ہوتے۔ پرہیزی کھانے پکتے سیٹ نکالا جاتا تو خواجہ غلام السیدین یا اسد اللہ کاظمی آئے ہوتے۔ اور جب اماں بی بی اپنی پٹاری سے دھاگے کی پیچک بھیجتی تو ہمیں پتہ چل جاتا کہ مولانا حسرت موہانی آئے ہوں گے۔ اور اپنی عینک کی ٹوٹی ہوئی کمانی کو دھاگے سے باندھ رہے ہوں گے!! زنانے دروازے پہ کھڑے ہوکے پردے کے آڑ سے اماں بی بی سے بریانی، نرگسی کوفتے، شب دیگ، پائے اور شاہی ٹکڑے کی فرمائش کرتے اکثر حفیظ جالندھری پائے جاتے۔ باہر کے صحن میں دھوپ میں کرسیاں لگائی جاتیں اور صبح ناشتے کے بعد سے دوپہر کے کھانے تک ان شعراء و ادباء اور ان سے ملنے آنے والے طلباء اور ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا۔ چائے کوفی اور پان کا سلسلہ مستقل اور مسلسل رہتا۔ ہمارا پرانا ملازم سکندر (خدا کے فضل سے بقید حیات ہے) تمام مہمانوں کی عادات سے اس قدر واقف تھا کہ اکثر مہمان میزبانوں کے بجائے اپنی ہر ضرورت سکندر سے بتاتے تھے۔

پچھلے دنوں میں علی گڑھ گئی تو سکندر کو اسی طرح مصروف و مستعد دیکھا۔ ابّا میاں کی آخری وقت تک جیسی خدمت اور دیکھ بھال جس محنت سے سکندر نے ادا کی، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اب گھر وہ گھر نہیں رہ گیا ہے جس کی دیکھ بھال کے لئے سکندر کو تفویض کیا گیا تھا۔ لیکن سکندر کی سرگرمیاں، خدمات حفظ مراتب اور "اسٹوکریسی" جوں کی توں باقی ہے۔ کیا مجال کہ اس گھر کے روزمرہ میں کوئی فرق آجائے۔

سکندر اور اس جیسے دوسرے انسانوں ہی سے یہ زندگی عبارت ہے۔!! ہم نے جن ادیبوں، شاعروں اور سیاست دانوں کو اخباروں میں پڑھا ہے۔ یا ان کے بارے میں دوسروں سے سنا ہے۔ سکندر نے ان کی خدمت کی ہے۔ اور ان کی عادات و اطوار کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ "مستند" مانی جا سکتی ہے۔

ابا میاں کے پاس ان کے دوستوں اور ملاقاتیوں کے علاوہ ان کے شاگردوں کا بھی مجمع رہتا تھا۔ اس زمانے میں جو نوجوان طلباء گھر پہ آتے رہتے تھے ان میں شاہد لطیف، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، مجاز، جان نثار اختر، سید حامد اور مغیث احمد فریدی کے نام مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ دوسرے طلباء بھی آتے تھے لیکن ان کے نام مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہیں۔ دو چار طالب علم ایسے بھی ہوتے جو آئی سی ایس یا دوسرے مقابلے کی تیاری میں ابا میاں سے درس لیتے تھے۔ میرے بچپن اور لڑکپن میں شمالی ہندوستان خصوصاً والدین کی بڑی آرزو یہی ہوتی تھی کہ ان کی لڑکی کسی آئی سی ایس سے بیاہ جائے۔ علی گڑھ کے ماں باپ بھی یہی تمنا دل میں رکھتے تھے۔ لڑکیوں کو مکمل تعلیم یافتہ اسی وقت سمجھا جاتا تھا جب وہ لکھنؤ کے ازابلا تھابرن کالج (آئی ٹی کالج) میں پڑھ رہی ہو یا پڑھ چکی ہو۔ اگر آئی ٹی کالج کی نعمت سے محروم ہو تو کم سے کم ہوم سائنس کا ڈپلوما لیڈی اروِن کالج دہلی سے ضرور حاصل کرے۔ ان کالجوں سے نکلی ہوئی لڑکیاں آئی سی ایس افسروں کی بیویوں کے "منصب" تک

کیل کانٹے پہ پوری اترتی تھیں۔ باقی جو مسلم گرلز کالج (علی گڑھ) کرامت حسین مسلم گرلز کالج (لکھنؤ) میں تعلیم حاصل کرتی تھیں وہ اکثر ڈپٹی کلکٹر، نائب تحصیل دار، منصف یا مصنف کی زوجیت میں دی جاتی تھیں۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں شادیوں کے بازار میں بڑی گہما گہمی ہوئی۔ نوجوان لڑکے دھڑا دھڑ فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ اور لڑکوں کی ملازمت شادی کا سلسلہ ساتھ ساتھ چل نکلا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کی وردی اور لڑکی تقریباً ساتھ ساتھ ملنے لگی کبھی کبھی دلہن کو چند ماہ کے اندر ہی اندر سہاگن اور بیوہ بننا پڑتا تھا۔ لیکن پھر بھی ماں باپ کے لئے فوجی داماد کا بڑا PRESTIGE تھا۔ ہمارے خاندان میں عام طور سے آپس ہی میں شادی کرنے کا رواج تھا۔ اور رشتہ صرف سید اور صدیقی ہی کا قابل قبول تھا۔ میری ننھیال اور ددھیال والوں کی آپس میں قرابت تھی۔ ننھیال میں انتہائی کٹر سنی تھے سب۔ لیکن ددھیال میں (جو میر صاحبان کے نام سے مشہور تھی۔) تفضیلئے سنی تھے۔ ننھیال اور ددھیال والے شکل وصورت اور عادت وخصلت میں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ننھیال میں پشت ہا پشت سے پولیس کی ملازمت چلی آتی تھی۔ اور ددھیال میں علم وآگہی کا چلن تھا۔ ننھیال والے بے حد وجیہہ خوش شکل اور گورے چٹے تھے۔ اور فطرتاً ان کا رجحان ورزش، گھوڑ سواری، سیر وسیاحت، شکار اور درباری کی طرف تھا۔ اس کے برعکس ددھیال میں ذہانت، متانت علمیت اور ادبی رکھ رکھاؤ کی کارفرمائی تھی۔ جسمانی طور پر بھی فریقین میں بڑا فرق تھا۔ ددھیال والے قدرے سانولے اور دھان پان تھے شکل وصورت کے اس تضاد کے سلسلے میں اماں بی بی نے ایک بار کہا۔ "شادی کے بعد جب میں نے تمھارے ددھیال والوں کو دیکھا تو سمجھی راون کے دیس آگئی ہوں۔ کوئی ایک بھی ڈھنگ کی صورت نظر نہ آئی"۔ میرے پھوپی زاد بھائی (اب بہنوئی) جلال الدین احمد نے برجستگی سے کہا۔ "ممانی آپ صحیح فرماتی ہیں۔ لنکا والے سیتا ہی کو لاتے ہیں۔"

۱۹۳۶ء کا ایک ایسا واقعہ مجھے یاد ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔ قصہ خود میری ہی ذات سے وابستہ ہے۔ اور ہر چند میری بے وقوفی کا روشن ثبوت ہے۔ اور اسے سن کر کرشن جی نے مجھ سے کہا تھا کہ "تمھارا یہ واقعہ میں اپنی سوانح میں ضرور لکھوں گا۔" لیکن کرشن جی اپنی سوانح کا وہ باب نامکمل چھوڑ کے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس لئے اب یہ مجھے ہی لکھنا پڑھ رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک دن میں اسکول سے گھر لوٹی تو میں نے گھر میں ایک عجیب سی اداسی دیکھی ابا میاں اخبارات سے کوئی خبر اماں بی بی کو سنا رہے تھے۔ اور اماں بی بی چپ چاپ دل گرفتہ سی بیٹھی تھیں اماں بی بی کے پاس ان کی جرمن سہیلی ڈورا (بعد میں علامہ اقبال کے بچوں کی گورنس بنی، بیٹھی تھیں اور اماں بی بی ان کو ٹوٹی پھوٹی جرمن اور کچھ اشاروں کی مدد سے سمجھانے لگیں۔ وہ خاتون اپنی کچھ ٹوٹی اور کچھ

زیادہ ہی کھوئی اردو میں جواب دے رہی تھیں۔ باورچی خانے میں گئی تو خانساماں کو سکینہ بوا سے کچھ کہتے سنا۔ شام کو اماں بی بی کی ایک بے حد قریبی دوست (بیگم حکیم عبدالطیف) آئیں تو ان کو بھی اماں بی بی نے اطلاع دی یہ سب کچھ ایسی رازداری، سرگوشی اور مدھم سروں میں ہو رہا تھا کہ میری حس تجسس پہ مسلسل کوڑے برس رہے تھے۔ رات کو کھانے کے بعد سب لوگ ڈائننگ روم میں ریڈیو کے آس پاس جمع ہوئے اور ہمہ تن گوش ہو کے کچھ سننے لگے۔ خبریں یا جو کچھ بھی وہ تھا ختم ہوا تو مرد زیادہ خاموش اور سنجیدہ ہو گئے۔ لیکن اکثر خواتین سسکیاں بھر رہی تھیں۔ میں اپنے بستر میں گرم لحاف میں دبکی ہوئی تھی۔ لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ میں چپکے سے بستر سے نکلی اور سیدھی باورچی خانے میں گئی۔ وہاں سکینہ بوا چائے کے برتن دھوتی جا رہی تھیں اور خود کلامی میں مصروف تھیں۔ "ہے ہے۔ تختہ لوٹے نامراد کا، کم بخت طلاقن شہزادے کی جان کو آگئی اور کوئی نہ جڑا اقطامہ کو۔ بھولا بھالا شہزادہ دیکھ کے پھانس لیا۔ مال زادی نے۔"

میں نے کہا "سکینہ بوا... مجھے بھی بتاؤ۔ طلاقن کون ہوتی ہے۔ اور مال زادی کسے کہتے ہیں۔ اور شہزادے کو کیسے پھانس لیا اس نے؟"

بس ابھی کھلی بڑھیا طیش میں آگئی "لو اور سنو، یہ بات کنواریوں بالیوں کے پوچھنے کی ہیں۔ کل کو یہ بھی پوچھنا کہ بچہ کیسے جنتے ہیں۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن میرا پورا وجود تجسس کی بھٹی میں تپ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے انتہائی لجاجت سے کہا۔ "اللہ! سکینہ بوا اتنا بتا دو کہ ماجرا کیا ہے۔ پھر میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ کسی اور سے پوچھ لوں گی۔"

"اے ہوتا کیا... ولایت کا شہزادہ ہے نا... اے وہی اپنے بادشاہ جارج پنجم کا بڑا بیٹا۔ ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک، پڑھا، لکھا، عالم فاضل، پنج وقتہ نماز وہ پڑھے، مہینے بھر کے روزے وہ رکھے۔ انگریزی وہ بولے فر فر... باپ کی آنکھوں کا نور، ماں کی کلیجے کی ٹھنڈک، تخت و تاج کا وارث، ماں باپ نے کن کن ارمانوں سے پالا پوسا۔ اور اب جو وقت آیا کہ بیٹا ماں باپ کو کما کے کھلائے تو جانے کدھر سے یہ "یم تن" "کودپڑی۔ اے پوچھو تجھے بھرا پرا گھر بگاڑنے کو کس نے کہا تھا لڑکے کی عقل پہ پتھر پڑیں ہیں۔ جو شاہی خاندان کی کنواری بالی لڑکی چھوڑ کے اس موئی کے چکر میں پڑ گیا۔ میں تو جانوں نگوڑی نے جادو ٹونے کا چکر چلایا ہوگا....!"

روداد جان کے میں واپس اپنے لحاف میں دبک گئی۔ لیکن شہزادے کے بھول پن اور شاہی گھرانے کی مصیبت کا خیال مجھے سونے نہ دیتا تھا۔ میرا شہزادے کا تصور بڑا روایتی اور خوبصورت تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح انگلستان کے شاہی خاندان کا مسئلہ حل کروں۔ صبح اسکول گئی تو یہ بات میں نے اپنی سب دوستوں

کو بتائی۔ اس دن اشوک کمار اور نیلا چٹنس کی کوئی فلم شہر میں چل رہی تھی۔ لڑکیاں وہاں جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ لیکن میری ایک سہیلی نے نام جن کا نور جہاں تھا لیکن وہ نوری کہلاتی تھیں اس معاملے میں بہت دلچسپی لی۔ اور کنگ ریڈر کھول کر شہزادے کی تصویر بھی دکھائی۔ اور بہت سوچ سوچ کے اس نتیجے پر پہنچیں کہ اگر ہمارے اسکول کی کسی لڑکی سے شادی کرے تو شاہی خاندان کے تمام تر تفکرات دور ہو جائیں گے۔ میں نے کئی لڑکیوں کے نام لئے لیکن سات سالہ نوری کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی تھی۔ بالآخر انھوں نے بے حد شرما شرما کے خود اپنی خدمات پیش کر دیں اور یہ شرط بھی رکھ دی کہ کپڑے اور زیور بے حد خوبصورت اور بہت سارے ہونے چاہئیں۔"

میں نے جو نوری کو یوں شہزادہ ہتھیاتے دیکھا تو بپھر گئی۔ واہ بھئی واہ خوب۔ ہم نے تو شہزادہ ڈھونڈا اور نوری بیگم اس سے شادی کر لیں گی۔ یہ تو کھلی بے ایمانی ہے۔ بس صاحب میں بھاگم بھاگ گھر آئی، وہاں دیکھا کہ نوری کی امی اور میری اماں بی بی تخت پہ بیٹھی ہیں اور پاندان کھلا رکھا ہے۔ نوری اور میں بدحواس اور بے تحاشا بھاگتے ہوئے تخت پہ پہنچے اور نوری نے چلا کر کہا "شہزادے سے شادی میں کروں گی..." میں نے اس سے بھی زیادہ چیخ کر کہا "ہرگز نہیں۔ شہزادے کی شادی تو صرف مجھ سے ہوگی۔"

دونوں خواتین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لیکن ہم دونوں کو اس وقت کسی ماں باپ، اسکول یا سماج کی پرواہ نہیں تھی۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو کے لڑائی میں مصروف تھے۔

"شہزادے سے شادی میں کروں گی۔"

"نہیں شہزادے سے شادی میں کروں گی۔"

"میں"۔۔۔"نہیں میں" "نہیں میں"۔ کی تکرار چل رہی تھی۔ جب ڈراما زیادہ ہی ہو گیا تو دونوں "ماؤں" نے اپنی اپنی بیٹی کی اچھی دھنائی کی اور کانوں کو ہاتھ لگوا کے معافی منگوائی اور نوکر نوکرانیوں کو بلا کر یہ کہہ کہہ کر ڈانٹا گیا کہ "ان کمبختوں کے بچوں بچیوں سے بری بری باتیں سیکھ لیتے ہیں ہمارے پھول سے بچے!"

بچپن کی یادوں میں پہاڑوں کی یاد مجھے اب بھی تڑپاتی ہے۔ گرمی کی چھٹیوں میں عام طور سے ہم لوگ نینی تال جاتے تھے۔ الموڑہ، مسوری، شملہ، سولن، رانی کھیت اور بھوالی ان پہاڑوں میں شامل تھے جہاں ہم جاتے تھے۔ لیکن نینی تال ابا میاں کو بہت پسند تھا۔ اسی لئے زیادہ تر وہیں جاتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بچپن ہی کی نہیں، میرے بچپن کے بعد کی یادیں بھی نینی تال سے وابستہ ہیں۔ کرشن جی کا اور میرا بہترین اور خوبصورت ترین وقت نینی تال میں گذرا ہے۔ کرشن جی کشمیر، خصوصاً پونچھ پہ عاشق تھے۔ جہاں ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ اور ان کا بچپن اور نوجوانی کا بڑا حصہ وہاں گزرا تھا۔ وہ اور میں گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کے پونچھ اور

نینی تال کا موازنہ کرتے رہتے تھے۔ جانے کتنے ہی پھول پتیاں، جڑی بوٹیاں، پھل اور پتھر دکھا دکھا کے وہ بتاتے تھے کہ پونچھ میں بھی یہی سب کچھ تھا۔

۱۹۴۰ء میں میں چھٹی جماعت میں تھی تو پہلی بار عصمت چغتائی اور صفیہ اختر (مرحومہ بیگم جاں نثار اختر) کو دیکھا۔ دونوں اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے B.T. (B.ED) کر رہی تھیں۔ اور ہماری کلاسز لیتی تھیں۔

۴۱ء میں چھٹیوں کے بعد جب نینی تال سے ہم لوگ علی گڑھ آئے تو جگر مرادآبادی کے ہمراہ مجروح صاحب (مجروح سلطانپوری) بھی یونین کے کسی مشاعرے کے سلسلے میں گھر پہ مقیم تھے۔ مجروح صاحب کو مشاعرے میں بہت داد ملی۔ اور جب ان کی واپسی کا وقت آیا تو ابا میاں نے ان کو یہ کہہ کے روک لیا کہ "آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کے سب قایل ہیں اور میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کچھ وقت علی گڑھ میں گزاریں!!"

ابا میاں کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کے عشق میں ابتدا تا انتہا مبتلا رہے اور ان کا کہنا تھا کہ "جب کسی معقول آدمی سے ملتا ہوں تو فوراً ہی خیال آتا ہے کہ علی گڑھ کا ہوگا۔ پتہ چلتا ہے کہ ایسا ہی ہے تو خوشی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ یہ کمی بھی کیوں رہ گئی۔" چنانچہ مجروح صاحب چند سال علی گڑھ میں مقیم رہے پھر کسی مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی پہنچے تو فلمی دنیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے منسلک ہو گئے۔ اور اب تک بمبئی کی فلمی اور ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔

۴۲ء میں ذاکر صاحب علی گڑھ آئے۔ تو انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سوانح حیات "میری کہانی" (اردو) میں مجھے پڑھنے کو دی۔ اس وقت مجھے پڑھنے کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ گھر کی کتابیں پڑھ لیتی تو یونیورسٹی لائبریری سے کتابیں منگواتی۔ اس کے علاوہ آل احمد سرور صاحب کے گھر جا کے کتابیں اٹھا کے لاتی۔ اس وقت حجاب امتیاز علی کی کتابوں پہ دیوانی تھی۔ ان کے سارے مصنوعی کردار بہت خوبصورت اور جیتے جاگتے نظر آتے۔ سر ہارلی، ڈاکٹر گار، جشن رونائش، صیوتی، رومی اور کوہ الماس، کوہ فیروزا اور مصنوعی حرارت پہ پکے ہوئے انگور اور فرانسیسی دریچے کے باہر گرم ایشیائی رات میں بلبلوں کا نغمہ اور جانے کیا کیا پڑھتی رہتی تھیں۔

بڑے بھائی اقبال رشید جو فرسٹ ایر میں تھے ایک دن گھر آئے اور مجھے کوئی ادٹ پٹانگ کتاب پڑھتے دیکھا تو بہت خفا ہوئے۔ "پتہ نہیں کیا آئیں بائیں شائیں پڑھتی رہتی ہو۔ لو یہ کہانی پڑھو۔ اگر دماغ میں کچھ آئے تو۔" رسالہ انھوں نے میرے آگے ڈال دیا اور خود اماں بی بی کو بنگال کے قحط کے بارے میں کچھ پڑھ کے سنانے لگے۔ میں نے اس دن پہلی بار کرشن چندر کا نام جانا اور پہلی کہانی "ان داتا" پڑھی۔ کچھ عرصے بعد پھوپی زاد بھائی جلال الدین احمد نے "شکست" پڑھنے کو دی۔ پھر میری سہیلی تسنیم نے (نواب صاحب چھتاری کی بیٹی) "طلسم

خیال"، کہیں سے منگوا کے بھی۔ بس پھر تو یہ حالت تھی کہ جی چاہتا تھا کہ شب و روز صرف کرشن چندر کی کہانیاں پڑھتی رہوں، بعض نقادوں کا خیال ہے، کہ کرشن چندر بہت زیادہ لکھتے تھے لیکن کرشن جی کے پرستاروں سے کوئی پوچھے کہ ان کو تو محسوس ہوتا تھا کہ کرشن جی بہت کم ہی لکھتے ہیں۔ اس زمانے میں شمالی ہندوستان کے تقریباً ہزار دو داں گھر میں لڑکیاں بسم اللہ کے گنبد سے نکلی تھیں تو کرشن چندر پہ ایمان لے آتی تھیں۔

اس وقت جب ہم نے کارل مارکس اور لینن کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ کرشن چندر، سردار جعفری، عصمت، مخدوم، جاں نثار اختر، وامق اور مجاز اپنے کلام اور کہانی سے سوشلزم کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ اور ہمارے اذہان میں ایک نئے بہتر اور برتر نظامِ زندگی کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اس زمانے میں یعنی تقسیم ملک سے کچھ عرصے پہلے تک ترقی پسند مصنفین کی مقبولیت کا وہ عالم تھا جو یہاں بمبئی میں مقبول فلمی ستاروں کی آمد پہ یا کسی فلمی پریمیئر پہ ہوتا ہے۔ یعنی پرستاروں پہ بدحواسی اور ہیبت طاری ہوتی تھی۔ مشاعروں میں طلبا/طالبات دیوانوں کی طرح اُمڈتے تھے۔ شعر تو شعر ہے وہ تو خود ہی یاد ہو جاتا ہے۔ لیکن کرشن جی کی کہانیوں کے صفحوں کے صفحے پڑھنے والوں کو ازبر ہوتے تھے۔ "کسی نے سردار جعفری کو دیکھ لیا۔ کسی نے عصمت سے بات کر لی۔ کون کرشن چندر سے مل لیا۔ دنوں اس کا چرچا رہتا تھا۔

تقسیم کے انقلاب نے اور آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے جیسے ہندوستانی دانشوروں کے قلعے کو ڈائنامائیٹ سے اڑا دیا۔ ہر اچھے خوبصورت اور عظیم خیال کی دھجیاں بکھر گئیں۔ قومی یک جہتی کا شیرازہ بکھر گیا۔ بے شمار ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے ساتھ اردو زبان و ادب کا بھی جنازہ اٹھ گیا۔

کرشن جی سے میری پہلی ملاقات ۵۳ء میں دہلی میں مجاز نے کروائی تھی۔ اس کے بارے میں پہلے بھی کبھی لکھ چکی ہوں۔ "آج کل بھی "اپنی یادوں" میں اس کا ذکر تفصیل سے کر رہی ہوں۔ فی الحال اس تھوڑے لکھے کو بہت جانئے کہ ہماری شادی نینی تال میں ہوئی تھی۔ چند مشترکہ دوستوں کی موجودگی میں۔ چونکہ یہ عام شادی نہیں تھی اس لئے اس میں رکاوٹیں بھی قدم قدم پہ درپیش تھیں۔ عزیز و اقارب کے علاوہ مذہب اور سماج بھی اپنا اپنا رول بڑی خوش اسلوبی سے نباہ رہے تھے۔ کوئی کہتا "ایسا ہو گا تو ہندو مسلم فساد ہو جائے گا۔" کرشن جی کہتے ہندو مسلم فساد ہماری شادی سے پہلے بھی ہوئے ہیں اور بعد میں بھی ہوتے رہیں گے۔ ہمیں فسادات کے محرک یا موجد کا منصب نصیب نہیں ہو گا۔"

میں کہتی "دیکھ لینا ہمارے تمہارے رشتہ دار خودکشی کر لیں گے۔" کرشن جی جواب دیتے۔ "محبت کرنے والوں نے تو اکثر خودکشی کی ہے۔ لیکن نفرت کرنے والوں کو خودکشی کرتے میں نے نہیں دیکھا.... وہ تو جیتے ہیں اور جی جی کے نفرت کرتے ہیں۔"

میں کہتی" محبت کرنا کافی نہیں ہے کیا، آخر شادی ہی کیوں؟"
کرشن جی کہتے" صرف محبت کرنا کافی نہیں ہے۔ محبت میں سپردگی لازمی اور غیر مشروط ہونا چاہئے
اور چونکہ یہ شادی کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے شادی ضروری ہے۔"
میں نے کہا" شادی ہوگی کیسے؟"
کرشن جی نے کہا" جیسے شادی ہوتی ہے!"
میں کہتی" لیکن اماں بی بی تو نکاح کو ہی شادی مانتی ہیں۔"
کرشن جی کہتے" تو ہم بھی نکاح کو ہی شادی مان لیں گے۔"
"مگر یہ کیسے ہوگا؟"
"مگر یہ کیوں نہیں ہوگا...!"
بالآخر ایک دن ایک دوست رامپور سے ایک مولوی صاحب اور تین گواہوں کو لے کر نینی تال
آئے۔ اور بعد نماز عصر سوئس ہوٹل نینی تال میں وہ " واقعہ" ظہور پذیر ہوا جسے نکاح کہتے ہیں۔
نکاح سے پہلے مولوی صاحب نے پوچھا۔
"جناب کا نام"
جناب نے جواب دیا "کرشن چندر۔"
مولوی صاحب اور ان کے رفقا چونک گئے" جی! جی کیا فرمایا...؟"
حالات معلوم ہونے پر مولوی صاحب نے پوچھا۔
"کیا آپ نے اچھی طرح غور کر لیا ہے۔"
"آپ کے آنے سے پہلے یہی کر رہا تھا!"
"مشرف بہ اسلام ہونے کا قصد ہے۔ جناب کا نیک خیال ہے۔"
"زندگی بھر خیال بدلتا رہا ہے۔ آج نیک خیال کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"
"اسم شریف کیا تجویز فرماتے ہیں جناب؟"
کرشن جی نے میری طرف دیکھا۔ میں تو رو ہانسی ہو گئی۔
"کیوں اس نام میں برائی کیا ہے۔ آخر اتنا تو خوبصورت نام ہے۔ میں نے کہا۔
مولوی صاحب نے کہا" دیکھو بی بی امور شرعیہ میں قیل وقال کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اللہ کا نام

نے کے اس کارِ ثواب سے سبکدوش ہونا چاہیے۔"

ہائے ہائے کیسا قیامت کا وقت تھا وہ۔ میں تو یہ سوچ سوچ کے رونے لگی کہ ہمارے اچھے بھلے رشتے کو کارِ ثواب بنایا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔" اس میں کار ثواب کی کیا بات ہے۔"

"جی ؟ آپ کو ایک حج کا ثواب ملے گا بی بی۔"

اب تو میری حالت تباہ ہوگئی۔ میں دوسرے کمرے میں جا کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اِ جب رو دھوکے منہ پونچھ کے اور لپ اسٹک گہری کرکے باہر نکلی تو کرشن جی بیٹھے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ پتہ چلا کہ کرشن جی نے اپنا نام وقار ملک تجویز کیا ہے۔ میں پھر دوسرے کمرے میں آگئی۔ کرشن جی میرے پیچھے پیچھے آئے میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"یہ بھی کوئی نام ہوا آخر۔"

کرشن جی کھڑکی کے باہر دھندلائی ہوئی پہاڑیوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔" میں پونچھ میں چوتھی جماعت میں تھا تو میرے دو دوست تھے۔ ایک کا نام وقار تھا اور دوسرے کا ملک۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے پہلی بار غالب کا شعر اسی گھر میں سنا تھا۔ عید کی پہلی سوئیاں وہیں چکھی تھیں۔ شامی کباب اور بریانی کا ذائقہ وہیں جانا تھا۔ خاصدان سے پان کی گلوری وہیں اٹھائی تھی اور گھر آکے اپنی ماں جی سے جھگڑا تھا کہ ہمارے گھر میں عید کیوں نہیں منائی جاتی۔"

ارے ہاں۔ ایک بات تو بتانا ہی بھول گئی کہ جب ہم نے زندگی بھر ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تو ایک دن میں نے اماں بی بی کو کرشن جی کا ایک فوٹو دکھایا (اس وقت تک وہ کرشن جی سے نہیں ملیں تھیں) اور ان کی رائے مانگی۔ اماں بی بی کچھ دیر تک فوٹو کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہیں پھر بولیں۔" اچھے خاصے ہیں شکل سے معقول نظر آتے ہیں۔ ہندو تو قطعاً نہیں لگتے۔"

اسی زمانے میں کرشن جی نے میرا ایک فوٹو اپنی ماں جی کو دکھایا۔ اور کہا۔" یہی سلمٰی ہے۔ آپ کو کیسی لگتی ہے ؟" ماں جی نے عینک لگا کے تصویر کو خوب غور سے دیکھا۔ اور بولیں۔" ارے یہ ہے سلمٰی ! یہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ بالکل مسلمان نہیں لگتی۔!"

یہ بات اور اس طرح کی بہت ساری باتیں ہمارے درمیان اکثر لطف اور دلچسپی کا باعث بنتی تھیں۔ سترہ سال کے شب و روز میں اکثر ایسے مواقع آئے کہ ہم دونوں کے درمیان کتنی ہی بار چھوٹی بڑی باتوں پہ تکرار ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک ہی موضوع ایسا تھا جو کبھی ہمارے درمیان نہیں آتا تھا اور وہ تھا مذہب۔ کبھی احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے گھر میں مذہب کی بنا پہ کہیں کسی اختلاف کی گنجائش ہے

طاز مین تک اس سلسلے میں بہت محتاط رہتے تھے۔ہاں مکان لینے جاتے تو اکثر یہ مشکل در پیش آتی جب پتہ چلتا کہ کہیں کسی ہندو مالک مکان نے مسلمان کو اپنا مکان دینے سے انکار کر دیا یا کسی مسلمان کو اپنا مکان کسی ہندو کو دینے میں تامل ہے تو ایسے مواقع پر کرشن چندر جی کئی دن بے مزہ رہتے۔

عید کے دن بے حد خشوع و خضوع سے نئے کپڑے پہنتے، عطر لگاتے، پان پہ پان کھاتے اور ہر تھوڑی دیر کے بعد شیر قورمہ چکھ لیتے اور بار بار عید کے بہانے گلے لگنے اور لگانے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے۔

جب تک ہم دونوں ساتھ رہے، "ہمارے مذہب" کے بارے میں ہم سے کسی نے پوچھ تاچھ نہیں کی۔ اور میں سمجھتی ہوں یہی ایک صحیح اور مہذب طریقہ بھی ہے۔ لیکن کرشن جی کے بعد اس بارے میں مجھے اپنوں اور پرایوں نے طرح طرح سے عاجز کیا۔ طرح طرح کے بے مصرف اور احمقانہ سوالات کی بوچھار مجھ پہ ہوتی رہی۔ خصوصاً اس بات پہ بیشتر لوگ چیں بہ جبیں تھے کہ جب کرشن جی نے نکاح کیا تھا تو ان کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقے سے کیوں نہ کی گئی۔ ایک صاحب نے نکاح نامہ تک دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں اس طرح کی باتوں کا جواب دینا تو نہیں چاہتی تھی کہ میرے لئے یہ ذکر اور اس کی باتیں صرف ناخوشگوار ہی نہیں انتہائی اذیت ناک بھی ہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس بارے میں کچھ کہنے کا وقت اب آگیا ہے۔ اس لئے کہ جب تقریباً دو سال کی کرناک مدت نے زندگی کے پرانے اور بوجھل پہئے نے اور رکھ جیتے رہنے کی فرسودہ عادت نے کارزار حیات کے شب و روز میں گھل مل جانے پہ مجبور کر دیا ہے تو میں بھی دو چار لفظ اپنے اور اپنے کرشن جی کے بارے میں کہنا چاہتی ہوں۔ پہلی بات یہ کہ بنیادی اعتبار سے کرشن جی مکمل طور پر ایک مارکسسٹ تھے۔ وہ کسی مذہب اور کسی کے بھی خدا کو نہیں مانتے تھے۔ بلکہ اپنے عقیدے ہی کو سب کچھ مانتے تھے۔ آخری وقت تک ان کے عقیدے اور نظریئے میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ ان کے نزدیک دنیا کی سب سے قابل احترام مخلوق ایک ہی تھی۔ یعنی اشرف المخلوقات۔ انسانوں کا درجہ انھیں آسمانوں سے ہمیشہ برتر نظر آتا تھا۔

رہا میرا معاملہ تو میں چونکہ عورت ہوں اس لئے فطرتاً اور روایتاً بزدل ہوں۔ مذہب اور مذہبی امور سے مجھے لگاؤ سے زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے۔ (کسی خاص مذہب سے مطلب نہیں ہے) مجھے مذہب ورثے میں ملا، بغیر طلب، مشورے یا مطالبے میں ملا۔ میں نے اپنے مذہب کا یقین اور احترام بعض اچھے انسانوں کے قرب سے کیا اور اسی مذہب کو محترم اور محترم گردانتی ہوں۔ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے۔ اس حقیقت سے میں لاعلم ہوں۔ اس کی سزا و جزا کن اصولوں یا اعمال کے تحت ہوگی۔ اس سے بھی ناواقف ہوں۔ جو لوگ اس طرح کے امور خاص میں "سند" کا درجہ رکھتے

ہیں۔ یہ مسائل انھیں کے حل کرنے کے ہیں۔

"کسی عذاب ثواب، حساب کتاب، انعام عتاب اور سود و زیاں کے دائرے میں محصور نہیں ہوں۔ اور ایسا کرنے میں اور ایسا سوچنے میں بحیثیت ایک انسان کے حق بجانب بھی ہوں۔ جانے وہ دن کب آئے گا جب ہم بعض رشتوں کی عظمت اور منصب سے آگہی حاصل کریں گے۔ ایسا رشتہ جس پہ شرمندہ نہیں ہوا جاتا۔ فخر کیا جاتا ہے۔ ہمارا رشتہ تھا! اور وہ عقیدہ جسے دل سے مانا جاتا ہے وہ کرشن جی تھے۔ میں نے جنھیں بے دلیل مانا۔ اور بے دلیل چاہا۔

جو لوگ سزا و جزا کے حصار سے نکل جاتے ہیں وہ پہلے پتھر سے نہ تو ڈرتے ہیں اور نہ ڈراتے ہیں۔!! ☐

ش۔ نظام
کلاز اسٹریٹ، جودھ پور (راجستھان)

مہتاب حیدر نقوی

غزلیں

منظر کو کسی طرح بدلنے کی دعا دے
دے رات کی ٹھنڈک کو پگھلنے کی دعا دے
اے ساعتِ ویران کے بے خواب فرشتے
اب چیخ کو سینے سے نکلنے کی دعا دے
اب توڑ مکانوں کے تکلف سے تعلق
پژمردہ طبیعت کو بہلنے کی دعا دے
پتوں کو پرندوں کی پناہوں پہ لگا دے
پیڑوں کو یہاں پھولنے پھلنے کی دعا دے
پڑھ ایسا وظیفہ کہ یہ کہسار نہ اجڑیں
چشموں کو پہاڑوں سے ابلنے کی دعا دے
آفاق کی دیواروں کی آغوش کو وا کر
اب مطلع منحوس کو کھلنے کی دعا دے
ہم بھول ہی جائیں نہ کہیں شکل سحر کی
اس شب کو کسی طور سے ڈھلنے کی دعا دے

مٹھیوں میں ریت بھر لی ہے بتاؤں کس طرح
رات دن آبِ رواں سے منہ چھپاؤں کس طرح
رقص کرتے ہیں بگولے میرے تیرے درمیاں
ریت پر دریاؤں کا نقشہ بناؤں کس طرح
وہ، ادھر، اس پار کے منظر بلاتے ہیں مجھے
روشنی کے شہر سے پیچھا چھڑاؤں کس طرح
جب تمھارے شہر میں ہر شے خزاں آثار ہے
بے در و دیوار کا اک گھر بناؤں کس طرح
ہو گئی اب کے برس سر کی گراں باری بہت
تم ہی بتلاؤ کہ شانوں کو ہلاؤں کس طرح
یاد سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
پتلیوں میں تیرے چہرے کو چھپاؤں کس طرح

رئیس الحق

ورماہی القاظ
لاآفیسر، یونائیٹڈ بینک آف انڈیا
ریجنل آفس، ایس۔بی۔ ورقا روڈ
پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱

پرندے اڑ گئے فضاؤں میں

میں نے دیکھا کہ وہ سو گیا تھا۔

تو اس سے کیا ہوا۔ میں تو جاگا ہوا تھا۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا سمجھ رہا تھا اپنے پورے ہوش وحواس میں تھا۔

پھر ایسا کیوں ہو گیا۔ یہ اندھیر کیسے بپا ہو گیا۔ کیا صرف اس لئے کہ وہ سویا ہوا تھا نہیں نہیں ایسی بات نہیں وہ تو اکثر سویا ہی رہتا ہے۔ بلکہ ایسا کہا جا سکتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر سو جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ یا خاموش تماشائی کی طرح دیکھتا رہتا ہے۔

لیکن وہ تو کسی کی قید میں نہیں ہے۔ وہ تو آزاد ہے۔ پھر وہ کیوں سو جاتا ہے۔ پھر وہ کیوں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شاید اپنی جان کے خوف سے۔ یا شاید میری جان کے خوف سے وہ خاموش رہ جاتا ہے۔

رات بہت وحشتناک تھی۔ اس رات کی کالی سیاہیوں میں بہت سے آنسو اور چیخیں گھلی ہوئی تھیں۔ اس رات کے اندھیروں میں راستوں پر خون چھپا رہے تھے۔ اس رات کی کہانی لفظوں میں نہیں بیان کی جا سکتی۔ آنسوؤں اور آہوں میں کہی جا سکتی ہے۔ اس دردناک رات کی ہیبت ناکیوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

لیکن مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات بھی وہ بڑے مزے میں اپنی خواب گاہ میں سویا ہوا تھا۔ پھر کالی رات بیت جانے کے بعد جب فضا میں صبح کی جاں فزا ہواؤں کا مشرق کی جانب سے درود ہوا تو وہ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور مجھ سے کہا تھا" میں ذرا باہر جا رہا ہوں ۔"

میں نے فوراً پوچھا" کیوں بھلا ۔۔۔؟"

"ہم لوگوں کی ایک کانفرنس ہو رہی ہے اسی میں شرکت کرنے جا رہا ہوں ۔"

پھر وہ باہر نکلا اور رات کی ہیبت ناکیوں اور درندگیوں کو ناک پر رومال رکھ کر اپنے اندر

جذب ہونے سے روکا۔ چشم پوشی سے اپنی آنکھوں کو بچا تا وہ کافی دور تک نکل گیا۔ راستے میں جلے ادھ جلے مکانات انسانی لاشیں اور اس پر سناٹے کا عالم سبھوں کو نظر انداز کرتا ہوا وہ کانفرنس ہال میں پہنچ گیا۔

کانفرنس ہال میں بہت سے لوگ جمع تھے مگر کسی کے چہرے پر رونق نہیں تھی۔ جیسے معلوم ہو رہا ہو کہ مُردوں کی کانفرنس ہو رہی ہو۔ ہر ایک چہرے سے بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے ادھ جلی سگریٹ کو تیسری بار سلگایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ کیوں کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے پاس سگریٹ کا صرف ایک پیکٹ تھا۔ اور پتہ نہیں کب تک یوں ہی محبوس رہنا پڑے۔ دوکانیں بالکل بند پڑی تھیں پتہ نہیں کب کھلیں گی۔

میں اپنی بیوی اور بچوں کو محفوظ مقام پر لے کر چلا آیا تھا اور اسی لئے اطمینان کی بنسی بجا رہا تھا۔ صبح ہونے سے قبل ہی وہ واپس چلا آیا۔ میں نے پوچھا۔

"کانفرنس کیسی رہی ــــ"

"کانفرنس بہت شاندار رہی۔ ہماری برادری کے تقریباً سبھی لوگ وہاں موجود تھے۔ خوب دھواں دھار تقریریں ہوئیں ریزولیوشن پاس کئے گئے ــــ"

"بہت خوب۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے یہاں گٹ بندی نہیں ہے۔ مخالف گروپ نہیں ہیں ــــ"

"ضرور ہیں۔ وہ بھی کانفرنس میں موجود تھے۔ انہیں بھی تقریر کرنے کا اور اظہار خیال کا موقعہ دیا گیا۔ اور ان لوگوں نے بھی کھل کر ایسے مسائل پر روشنی ڈالی۔ نئی تجاویز پیش کیں۔"

"تم لوگوں کا موقف کیا تھا ــــ ؟"

"ہم لوگوں کی پالیسی تو وہی پرانی تھی۔ مگر اس پر عمل درآمد کے سلسلے میں بہت سی عملی مشکلات مائل تھیں۔ ہم لوگوں نے اپنے کام سے کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ ہم لوگوں نے ہمیشہ صحیح وقت پر صحیح مشورے دیئے لیکن تم نے ان مشوروں کو نہیں مانا۔ تم یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میرے مشورے بالکل صحیح ہیں۔ میں تمہیں صحیح راستے پر چلنے کی تلقین کر رہا ہوں مگر تم بے ہمتی کے شکار ہو گئے۔ ہم لوگ تمہیں صرف مشورے دے سکتے ہیں۔ ان پر عمل کرنا تمہارا فرض ہے۔ مگر تم لوگوں نے عملی زندگی سے اپنے آپ کو بالکل الگ کر لیا ہے ــــ"

میں اس کی تقریر سن کر کچھ جزبز سا ہو گیا۔ اس کا کہنا کچھ حد تک درست ہی تھا۔ یا شاید بالکل درست تھا۔ اب مجھ میں واقعی ہمت نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ اس لئے اس پر الزام لگانا کہ وہ سویا ہوا تھا غافل تھا بالکل غلط ہے۔ دراصل یہ الزام تو مجھ پر درست ثابت ہوتا ہے۔

"تو پھر تم لوگوں نے اس سلسلے میں کیا ریزولیوشن لیا۔؟"

"اس سلسلے میں دیکھا گیا کہ شرکا کانفرنس میں کافی اختلافات تھے۔ تقریروں کا سلسلہ جاری رہا مگر عام طور پر مقرروں کا جھکاؤ دوسری جانب تھا۔ یعنی حالات اب ایسے نازک مراحل میں داخل ہو چکے ہیں کہ ان میں سدھار کا خیال رکھنا لاحاصل ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ اپنی زبان بند رکھیں۔ مشورے دینا لاحاصل ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ خاموش رہا جائے۔ خاموش تماشائی بنے رہنے ہی میں عافیت ہے۔"

"تو گویا تمہاری کانفرنس میں اسی گروپ کی جیت ہوئی ـــــ"

"ہاں بالآخر یہی گروپ غالب رہا گرچہ اس کے مخالف یعنی کنزرویٹوز نے بھی کافی شور و غوغا مچایا مگر انھیں کامیابی نہیں ملی ـــــ"

شہر میں فوج کا گشت جاری تھا۔ کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔

میرے پاس صرف دو سگریٹ بچ رہے تھے۔ ایک ایک سگریٹ کو میں نے تین حصوں میں بانٹ کر رکھ لیا تھا اور ایک ایک ٹکڑے کو ایک بار سلگاتا تھا۔ مگر خدشہ تھا کہ سگریٹ کی کمی پڑ جائے گی۔ کیوں کہ یہ حالات کب تک رہیں گے کچھ کہنا دشوار تھا۔

اس رات کے بعد شہر دن میں بھی نہیں جاگا۔ اسی عالم میں دن بھی گزر گیا۔ اور پھر رات کی مہیب تنہائی اور اندھیرا پھیل گیا۔ دور سے عجیب عجیب سی آوازیں آتی ہوئی معلوم ہوتیں۔

"لیکن یہ کیسے ہو گیا۔ میں نے تو سنا تھا کہ سچائی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ انسانیت کا پرچم ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ درندگی اور حیوانیت کبھی پنپ نہیں سکتیں۔"

"ہاں یہ سب تم نے سنا ہوگا۔ مگر ان سب کو زندہ رکھنے کے لئے تمھیں ہی بہت کچھ کرنا تھا جو تم نہیں کر پائے ـــــ"

سورج مشرق سے طلوع ہو رہا تھا۔ خون آشام سورج۔ چاروں جانب آسمان سرخ ہو گیا تھا۔ فضا پر ایک سوگواری طاری تھی۔ باد صبا اپنی مست خرامیاں بھول چکا تھا۔

"مجھے نیند آرہی ہے ـــــ میں سونے چلا ـــــ" اس نے مجھ سے کہا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

"بھلا یہ کوئی سونے کا وقت ہے ـــــ صبح ہو رہی ہے۔ ابھی دنیا جاگے گی اور تم سونے چلے۔"

لیکن میں اسے سونے سے باز نہیں رکھ سکا اور وہ چند ہی لمحوں میں خراٹے لینے لگا۔ صبح کے

بعد سڑکوں پر جب دنیا جاگ جایا کرتی تھی ـــــ اس وقت تک آج سڑکیں تنہا اور اداس پڑی ہیں صرف فوجی جیپوں اور باوردی فوجیوں کی آوازیں سناٹے کو چیر رہی ہیں۔ میں نے سگریٹ کے ٹکڑے کو سلگایا اور بالکونی میں چلا آیا۔

سڑکوں پر ایک دو چہرے نظر آتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ ایک دو کاریں ڈرتی سہمتی گذر جاتیں۔ ایک کار چوراہے پر آکر رک گئی۔ اس میں سے چار پانچ نیتا قسم کے لوگ اتر کر نیچے آگئے۔ ان کے پیچھے دو فوجی جیپیں لگی تھیں۔

ان لوگوں نے چوراہے پر کھڑے ہو کر تقریریں شروع کر دیں اور تھوڑی ہی دیر میں سہمے سہمے لوگ اپنے گھروں سے رینگ رینگ کر دھیرے دھیرے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ لوگ ایک امن کمیٹی بنانا چاہتے تھے۔ ان کے ارادے نیک تھے اسی لئے بہت سے لوگ ان کے گرد سمٹتے چلے آئے تھے۔ اپنے گھروں سے نکل کر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے۔

میں نے سوچا کہ اسے جگا دوں اور ان تقریروں کا خلاصہ اسے بتا دوں اور اس سے کہوں کہ لوگ ان کے ارد گرد جمع ہو رہے ہیں۔

لیکن وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ رینگ رینگ کر دروازے سے باہر نکل رہا تھا اور مجمع کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ☐

حامد مجاز
۹۰۲۔ کاچی گوڑا، حیدرآباد

قلم کا مرثیہ

میں کیا لکھوں شکستگی
کہ پتہ پتہ ٹوٹ کر بکھر چکا
صریرِ غم سنا
افق افق سمٹتا خوف دیکھ لے
حریرِ دل اٹھا
شکستگی
رہینِ شام اب نہیں
عظمتوں کی خودکشی
خزاں رسیدہ چوبِ غم
خفتگانِ آرزو کو کھوجتی
ہری ہوئی
میں کیا لکھوں شکستگی
عشرتوں کی دھوپ میں
سسکتا کون رہ گیا !!

پرکاش تیواری
۱۴۱، سیکٹر ۱۲، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

غزل

مقدر پرستی کے شر پر کتر کر
سراپا عمل بن زمیں پر بکھر کر
قیودِ حصارِ انا سے گزر کر
نیا روپ پاتا ہے انسان مر کر
نہاں خانۂ روح کا جائزہ لے
کسی وقت اپنے ہی اندر اتر کر
دکھاتے ہیں آئینہ دوش و فردا
لباسِ حقیقت میں قصے سنور کر
پریشاں رہے عمر بھر جس کی خاطر
بنا دردِ نہاں وہ دل میں ٹھہر کر
میں خود سے بچھڑ کر ہوا اور ہی کچھ
نہ نکلا کوئی میرے اندر سے مر کر
سفر ذات کا سامنے اس طرح تھا
سمٹتے رہے اپنی آہٹ سے ڈر کر
لگا لو فریبوں کی پرکاش عینک
چمک جائے گی دل کی ہستی نکھر کر

فیروز عابد
بیت القاسم - ۳/۱۲-۱۸/۱ پیچلڈ
باگان لین، کلکتہ ۷۰۰۰۰۹

شناخت کا زہر

ان کی داڑھیاں ہوا میں لہرا رہی ہیں اور ان میں سے بہت سارے اپنے مچلتے بیٹوں اور پوتوں کی انگلیاں تھامے انھیں سمجھا رہے ہیں کہ وہ جال میں تڑپتی ہوئیں مچھلیوں کو ہاتھ نہ لگائیں کہ ان کا سارا جسم غلیظ ہوگیا ہے کہ وہ ان اجسام سے چھوکر گذری ہیں جو بھوت اور شیطانوں کے ہیں۔

"آؤ ہمارے کندھوں پر بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کہ وہ بھوت تمھیں کیسے لگ رہے ہیں۔

ان تمام لوگوں نے اپنے اپنے مستقبل کو اپنے اپنے کندھوں پر بٹھالیا ہے مگر بچے روپہلی چمکتی ہوئی مچھلیوں کو چھونا چاہتے ہیں اور انھیں ان مچھلیوں کو چھونے سے روکا جا رہا ہے کہ سامنے محافظ ڈیوٹی پر کھڑا ہے اور وہ مچھلیوں کو ایک جگہ ڈھیر کرواتا جا رہا ہے تاکہ ایک بھی مچھلی ادھر سے ادھر نہ ہوسکے۔

جتنی مچھلیا دریا سے نکالی جا چکی تھیں انھیں ایک جگہ جمع کیا جاتا رہا اور دوبارہ دریا میں جال ڈالنے کی سخت ممانعت کردی گئی۔ اس وقت تک کے لئے جب تک ایک بھی سر کٹا بھوت دریا کی سطح پر نظر آئے بچے اسی طرح اپنے اپنے مربّی و بزرگ کے کندھوں پر چڑھے مچل رہے ہیں، لوگ اسی طرح اپنے اپنے جال میں بھری بھری مچھلیوں کو زمین پر الٹ رہے ہیں ـــــ محافظ مچھلیوں کے نرغے میں گھرا لوگوں کی ہتھیلیوں کو تک رہا ہے ـــــ

عجیب سناٹا ہے، ڈرا دینے والا سناٹا مگر اس سناٹے میں صرف بڑے ہی مبتلا ہیں، بچے اسی طرح مچل رہے ہیں۔ انھیں بھوت اور شیطان کہہ کر ڈرایا جا رہا ہے مگر وہ اپنی ضد پر اسی طرح اڑے ہوئے ہیں جس طرح وہ ہر روز اڑے رہتے ہیں ـــــ اتنے میں ایک زوردار دھماکا ہوا سناٹا اور گہرا ہوگیا تمام لوگ جامد و ساکت ہوگئے کہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ سر کٹے بھوتوں کی بڑی کھیپ سطح آب پر دیکھی گئی ہے ـــــ لوگوں کی نگاہیں سطح آب پر جمی ہیں کہ اچانک انھوں نے دیکھا بے شمار سر کٹے بھوت تیرتے ہوئے بہتے ہوئے چلے آرہے ہیں ـــــ

لوگوں نے اپنے اپنے بچوں کو اپنے اپنے سینوں سے چپٹا لیا مگر بچوں نے ان کی چھاتیوں سے اپنے چہرے نکال

لئے اور ان کی نظریں بھی سر کٹے بھوتوں کے بہتے جسم سے چپک گئیں۔

"بابا یہ تو آدمی ہیں آدمی، بھوت تو نہیں ہیں ــــ تم بھوت کہہ رہے تھے۔"

"ہاں بیٹے یہ آدمی ہیں مگر اب بھوت ہیں کہ جن کے سر نہیں ہوتے وہ بھوت کہلاتے ہیں ــــ

سناٹا اور گہرا ہونے لگا، مچلتے بچے اب خاموش ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ سامنے بہت ساری جیپ گاڑیاں دریا کے ساحل پر جمع ہو رہی ہیں۔ بچے اب اپنے اپنے بزرگوں کے سینے سے چپکتے چلے جا رہے ہیں۔ داڑھیاں ہوا میں اسی طرح ہل رہی ہیں۔ مچھیروں کی جامد و ساکت آنکھیں جیپ گاڑیوں سے آئے ہوئے محافظوں کو دیکھے جا رہی تھیں۔ مچھلیوں کے ڈھیر پر بلیچنگ پاؤڈر کے بڑے بڑے بورے الٹ دیئے گئے ہیں ــــ

تمام محافظ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ سب کی نظریں مشرق کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ شاید انھیں کسی کا انتظار ہے ــــ

پھر مشرق کی طرف سے ایک جیپ آئی ــــ محافظ تتر بتر ہو گئے ہیں۔ بہاؤ کی طرف جال ڈال دیا گیا ــــ سر کٹے بھوت جالوں میں اسیر کئے جا رہے ہیں اور انھیں ساحلی مٹی پر پھینکا جا رہا ہے ــــ محافظ مستعدی سے کام میں لگے ہیں۔ سر کٹے بھوتوں کی تصویریں لی جا رہی ہیں ــــ

عجیب دم گھٹا دینے والا ہنگامہ ہے۔ مچھیرے اپنی ننگی ننگی چھاتیوں میں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو چھپائے ہیں بچوں کی نظریں کبھی بھوتوں کو تک رہی ہیں اور کبھی گیمکسین سے اٹی مچھلیوں کو ــــ

متحرک دم گھٹا دینے والا سناٹا، یہاں سے وہاں تک پورے ساحل کے قرب و جوار میں پھیلا ہوا ہے ــــ

"ساری لاشوں کی تصویریں لینا ہوں گی ــــ اتنی ڈھیر ساری لاشوں کی تصویر ہم کس طرح لیں اور اگر لیں بھی تو کیا فائدہ کہ ان سر کٹی لاشوں کی شناخت بغیر سر کے کیسے ممکن ہے کہ ابھی جو ہم نے کچھ لاشوں کی تصویریں پرنٹ کی ہیں سب ایک سی لگتی ہیں ــــ فوٹو گرافروں کی پریشانی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

سناٹا بدستور قائم ہے۔

مچھیرے اسی طرح اپنے سینوں میں آدھے سوئے۔ آدھے جاگے بچوں کو چمٹائے کھڑے ہیں۔

فوٹو گرافروں کی نگاہیں پریشاں پریشاں ہیں۔

"یہ سر کٹی لاشیں ہماری نہیں، دوسروں کی ہیں اور ہمیں ان دوسروں کو ان کی شناخت کے لئے تصویریں دینی ہیں اس لئے یہ تعداد میں سو ہوں یا ہزار ان کی تصویریں لینی ہیں۔ ہر لاش کو چت لٹا دیا اور پاؤں کے انگوٹھے سے کٹے گلے تک کی تصویر لی جائے ــــ یہی حکم ہمیں اوپر سے ملا ہے اور اسی طرح کی گذارش مغرب والوں نے اوپر والوں سے کی ہے ــــ" فوٹو گرافروں نے ایک سرد آہ کے ساتھ احکام سنے۔

سناٹا بھی مچھلیوں کی طرح زہریلا ہو گیا —— محافظوں کے چہروں پر عجیب و غریب خاموشی ہے ——
مچھیرے اپنے ہاتھوں میں اپنے اپنے مستقبل کو مضبوطی سے تھامے حیرت زدہ کھڑے ہیں۔

"کچھ لاشیں ابھی ایسی بھی نظر آئی ہیں جن کے اعضائے تناسل کاٹ دیئے گئے ہیں —— کیا ان کی بھی تصویر لی جائے —— کیا یہ ٹھیک ہو گا —— ؟" فوٹو گرافر پھر پریشان ہونے لگے۔

مگر وہ گھناؤنے سناٹے کے بیچ فوٹو گرافروں نے سنا" احکام کی پابندی ہمارے لئے بے انتہا ضروری ہے —— !"

فوٹو گرافروں کی نگاہیں مغربی افق پر جم سی گئی ہیں کہ وہاں کے شہر اور گاؤں کب تک جنگل بنے رہیں گے ——

مچھیرے اب تیز تیز قدموں کے ساتھ اپنے اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے ناریل اور سپاری کے درختوں کے پیچھے چھپتے چلے جا رہے ہیں کہ کہیں وہ بھی بھوت نہ بن جائیں —— ! ☐

اظہار مسرت
۱۴۴۴۰ رام گنج بازار، جے پور ۳۰۲۰۰۳

اختر بستوی
شعبۂ اردو، گورکھپور یونی ورسٹی
گورکھپور

غزلیں

اور کب تک ہم سہیں گھر کے مکینوں کا خلوص
جان لیوا ہوگیا ہے آستینوں کا خلوص

کوئی آسانی نہیں مشکل کشائے زندگی
کتنا میٹھا زہر ہے دیکھو مشینوں کا خلوص

اب یہاں سے اٹھ کے جائیں بھی تو جائیں یہ کہاں
تیرے در نے چاٹ ڈالا ہے جبینوں کا خلوص

وقت رخصت شبنمی آنکھوں کا منظر یاد ہے
نقش ہے دل پر تمہارے آبگینوں کا خلوص

ہوچکا شاید کتابوں میں ہی اب تو منتقل
آنکھ کا آب مروت اور سینوں کا خلوص

آسماں سے جب بھی رحمت ٹوٹ کر برسی کبھی
پھوٹ کر باہر نکل آیا زمینوں کا خلوص

مہر کی کرنوں نے اتنی مہربانی کی کہ اب
دل کو بھاتا ہی نہیں ہے مہ جبینوں کا خلوص

طعنۂ احباب۔ پیہم مفلسی۔ خودسر مزاج
راس آیا ہے ہمیں بس انہی تینوں کا خلوص

رشتے ہزار قسم کے رکھتا ہوں دوستو
پھر کیوں یہ سوچتا ہوں کہ تنہا ہوں دوستو

کچھ عصرِ نو کا فیض، کچھ اپنے مزاج کا
آسائشوں کی سیج پہ تڑپا ہوں دوستو

اک پیکرِ حقیقتِ روشن کا غم لئے
پرچھائیوں کے شہر میں پہنچا ہوں دوستو

پتھر کی چوٹ نے کبھی بخشی ہے تقویت
پھولوں کی ضرب سے کبھی ٹوٹا ہوں دوستو

اپنا مجھے سمجھ کے جو آیا مری طرف
اس کو خبر نہیں کہ میں کس کا ہوں دوستو

اختر یہ بات کہہ کے خیالوں میں کھو گیا:
جسموں کی آنچ سے کبھی ٹھنڈا ہوں دوستو

ڈاکٹر ایس۔ پی۔ سدھیش
شعبۂ ہندی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

لسانی فرقہ واریت اور ادیب

"لسانی فرقہ واریت" کی اصطلاح مبہم الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اس اصطلاح میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے مسئلے کو فرقہ واریت سے منسلک کیا جا رہا ہے۔ فرقہ واریت ایک مسئلہ ضرور ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا بدنما چہرہ دکھاتا ہے لیکن وہ بھی بنیادی طور پر ایک رجحان ہے جس کو زبان کے ساتھ منسلک کرنا سراسر غلط ہے۔ اس لئے کہ زبان کی فطرت میں فرقہ واریت نہیں ہوتی۔ کسی زبان کے بولنے والوں میں کچھ لوگ فرقہ پرست ہو سکتے ہیں اور ان کی تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ یقیناً ایسے لوگ زبان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ کوئی زبان، کسی فرقے، ذات، نسل اور طبقے کی میراث نہیں ہوتی۔ اس پر ان سب ہی لوگوں کا مادی حق ہوتا ہے جو اسے اپناتے ہیں۔ زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ کوئی ذات ــــــ جو لوگ کسی زبان کو کسی مذہب، ذات اور فرقے سے جوڑتے ہیں وہ اس کی ترقی کی رفتار میں روڑا اٹکاتے ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ہم "لسانی فرقہ واریت" پر نہیں بلکہ فرقہ واریت کے مسئلے پر غور کریں جو زبان کے دائرے کو ہی نہیں، زندگی کے مختلف اداروں کو بھی زہر آلود کر سکتی ہے۔

کسی طبقے یا افراد کی فرقہ پرستی، زبان کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ دوسرے طبقے یا افراد کے تمدن اور تہذیب اور نظریات کو ناقابلِ برداشت یا تنگ نظری یا کسی غرض مندی کے رویّے کے سبب سے پیدا ہوتی ہے اور اس ناقابلِ برداشت رویّے اور تنگ نظری کا خاص سبب اقتصادی ہوتا ہے۔ اِن رجحان اور رویّوں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے کبھی مذہب کی دہائی دی جاتی ہے اور کبھی ذات، نسل اور تہذیب کی ــــــ اور کبھی زبان کی ــــــ اس کی فرقہ پرستی کا بنیادی مسئلہ در اصل اقتصادی مسئلے سے منسلک ہے جو کبھی مذہبی رنگ اختیار کرتا ہے تو کبھی تہذیبی، کبھی سیاسی اور کبھی لسانی ــــــ

لہٰذا جب تک ہم فرقہ واریت کے مسئلے کا معروضی (OBJECTIVE) نقطۂ نظر سے تجزیہ نہیں کریں گے اور محض جذباتی پہلو پر ہی زور دیتے رہیں گے، تب تک اس کا حل نکالنا مشکل ہے۔ یعنی جب تک فرقہ پرستی کے بنیادی اسباب تلاش نہیں کیے جائیں گے، اس وقت تک اس کے برے نتائج ہمیں

زبان و ادب، سیاست اور تہذیب کے شعبوں میں بھگتنا ہی پڑیں گے۔

ہندی اور اردو، ہندی اور انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں کے مسئلے پر وقتاً فوقتاً بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ہندی اور اردو خاص طور پر شمالی ہند کی زبانیں ہیں اس لئے ان دونوں زبانوں کے درمیان فساد ایک موضوع بنا رہا ہے اور آج بھی کبھی کبھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اگر موجودہ صورتِ حال کا جامع تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ہندی اور اردو یا دوسری ہندوستانی زبانوں کے بیچ کا جھگڑا فرقہ پرستی سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن لسانی جھگڑے اکثر فرقہ پرستی کے روپ میں ہی پیش کیۓ جاتے رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہندی اور اردو یا ہندی یا انگریزی کے درمیان جھگڑا ہو یا بنگالی اور آسامی کے درمیان کوئی غلط فہمی ——— یہ جھگڑا بالخصوص اقتصادی اور سیاسی جھگڑا ہے اور بالعموم تہذیبی سوال ہے لیکن مفاد پرستوں نے اسے فرقہ واریت کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور اکثر وہ اپنے اِس مقصد میں کامیاب بھی رہے ہیں۔

ترقی کی ابتدائی منزل میں اردو کی شکل ہندی سے مختلف نہیں تھی۔ کھڑی بولی کا جو روپ دکن کی ریاستوں بیجاپور گولکنڈہ میں پہنچا اس کو وہاں کے مسلمان حکمرانوں نے اپنی ریاست کی سرکاری زبان بنایا اور ادبی زبان کی شکل میں بھی اس کی ترقی ہوئی۔ اس زبان کو دکنی یا دکھنی کہا گیا۔ دکنی زبان پر جس قدر ہندی کا حق ہے اس سے کم اردو کا نہیں۔ شمالی ہند میں یہی جو زبان بنی، ١٨ ویں صدی میں اس کا نام اردو پڑ جانے کے باوجود ١٩ ویں صدی کے نصف آخر تک اسے ہندی ہی کہا جاتا رہا۔ میرؔ اور غالبؔ نے اپنی زبان کو بغیر کسی جھجک کے "ہندی" ہی کہا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ایک زبان (جس کی بنیاد کھڑی بولی پر ہے) کے دو اسالیب کے اظہار کے باوجود وہ دونوں بہت الگ نہیں تھے، جب کہ ان کے دو نام ہندی اور اردو استعمال میں آچکے تھے۔ بنیادی طور پر ایک زبان کے ان دو اسالیب کے ذریعے ہندو اور مسلمان دونوں مساوی طور پر ادبی تخلیقات پیش کر رہے تھے اور کر رہے ہیں۔

آج کی ہندی اور اردو دو آزاد زبانیں ہیں۔ آج اردو کو ہندی کی شیلی (اسلوب) کہنا اور اس کے آزاد وجود سے انکار کرنا اِس کے ساتھ ناانصافی ہے۔ حالانکہ آج بھی ہندی اور اردو کے پاس کافی تعداد میں مشترک سرمایہ ہے۔ ہندی نہ صرف ہندوؤں کی اور اردو نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ دونوں زبانیں مساوی طور پر دونوں کی ہیں اور ان سب کی ہیں جنھوں نے دونوں کو اپنایا ہے۔ جو لوگ ہندی کو صرف ہندوؤں کی اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں وہ دونوں کے دشمن ہیں۔

کیا سبب ہے کہ ہندی اور اردو کے درمیان جھگڑا پیدا ہوا اور اسے فرقہ واریت کا رنگ دینے

ی کوشش کی گئیں ۔ اس کی بہت کچھ ذمہ داری انگریزوں پر ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جان گلکرسٹ کی نگرانی
یں ایک ہی زبان کے دو روپ یعنی ایک سنسکرت زبان اور دوسری فارسی، عربی زبان کے الفاظ سے
الگ الگ دو زبانوں کے دانستہ منصوبے تیار کئے گئے (۱۹ ویں صدی کی ابتدا میں) ـــــ اور پہلے
روپ کو ہندوؤں کے اور دوسرے روپ کو مسلمانوں کے سر تھوپ دیا گیا۔ بیشتر انگریز عالموں اور برطانوی
حاکموں نے ہندی اور اردو کا تعلق بالترتیب ہندو مذہب اور اسلام سے قایم کرنے کی بھرپور کوششیں
کیں ۔

علاوہ ازیں انگریز حاکموں نے اردو کی مزید ہمت افزائی کی اور ہندی کو نظرانداز کرکے ہندؤوں
اور مسلمانوں میں اور غیر مسلم اردو داں غیر ہندو ہندی داں لوگوں میں فرقہ واریت کا احساس پیدا کرنے،
بڑھانے اور اپنی خواہش کے مطابق فرقہ واریت کے جذبات کو ابھارنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس طرح
ایک لسانی طبقے کی فرقہ پرستی نے دوسرے لسانی طبقے کی فرقہ پرستی کو بڑھاوا دینے میں مدد دی ۔

فرقہ وارانہ فسادات کا جو سلسلہ ہندوستان میں شروع ہوا، اس کے سبب زبان کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ
سیاسی اور قومی مسائل بھی فرقہ واریت کے کلنک سے داغ دار ہوگئے۔ فرقہ وارانہ جھگڑے بیشتر اقتصادی مفادات
سے وابستہ ہوکر سیاسی مقاصد کے حصول کی بنا پر ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان جھگڑوں کا سبب خواہ مذہبی جنون
بنایا گیا ہو یا مختلف تہذیبی یا دوقومی نظریہ۔

بدنصیبی یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں بھی ہندی اور اردو کا جھگڑا کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود
ہے۔ اردو کا بھلا نہ پاکستان میں ہوا اور نہ آزاد ہند میں ـــــ اردو بنیادی طور پر پاکستان کی زبان نہیں ہے
لیکن اپنی جنم بھومی ہندوستان میں ہی اسے جلا وطن کیا گیا۔ اور یہ زبان بھی مذہب کی طرح سیاست کا مہرا بن گئی
آزاد ہندوستان کی سرکار کے لئے ہندی بھی سیاست کا ایک مہرہ بنی ہوئی ہے۔ ہندی کے نام پر انگریزی چلتی رہی
اور اب تک چل رہی ہے۔ یہاں اردو کی طرح ہندی بھی دکھیاری ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کا رونا بھی
نہیں سنا جاتا اور دوسری کا راگ انتخابی مہم کے جلسوں سے لے کر اقوام متحدہ کی مجلس اعلیٰ میں صرف گایا جاتا
ہے ـــــ

ایسے حالات میں غریب ایک ادیب کیا کرے؟ معاف کیجئے، میں نے ہندی کے ادیب کو غریب کہا۔
ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ زبان کے مسئلے کو، تمام ہندوستانی زبانوں کے مسئلے کو ـــــ فرقہ واریت کی دلدل سے
نکالا جائے۔ جب ایسا ہو جائے گا تو سیاست، زبان کو اپنا مہرہ نہ بنا سکے گی۔ لیکن یہ کیسے ہو؟ تو اس کا ایک قطعی
حل یہ ہے کہ ہندی کا تمام ادب اردو میں اور اردو کا تمام ادب ہندی میں ترجمہ کے ذریعے منتقل کرنے کا

ایک بڑا منصوبہ تیار کیا جائے۔ ادیب اس سلسلے میں پورا تعاون دے سکتے ہیں۔ ہندی اور اردو کی ادبی اکاڈمیاں، ادبی انجمنیں اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ہندی اور اردو کے شعبے اس منصوبے میں ہاتھ بٹائیں اور دیوناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں جو ادب شائع ہو اسے مساوی طور پر مختلف سطحوں کے درسی نصابوں میں شامل کیا جائے۔ اس طرح دیوناگری رسم خط اور فارسی رسم خط کا پڑھا جانا عملی طور پر دونوں کے لئے لازمی ہو جائے گا۔ رسم خط کی دقت جب تک دور نہیں کی جائے گی (دونوں کو عملی طور پر لازمی بنا کر) تب تک ہندی اور اردو ادب دو مختلف دنیائیں بنی رہیں گی اور ان کے پڑھنے پڑھانے والے ذہنی تنگ نظری کے شکار بنے رہیں گے اور ذہنی تنگ نظری کے ساتھ فرقہ واریت کے تیز رفتار جراثیم سے ٹکر نہیں لی جا سکتی۔ تعلیم کی مختلف سطحوں کے نصابوں میں دو ہندوستانی رسم خطوں (فارسی اور اردو) کی شمولیت متعصب ذہنیت کو صحت یاب بنانے میں کارآمد ثابت ہوگی۔ ہر ایک ہندی کا ادیب اگر اردو ادب اور کم سے کم ایک اور ہندوستانی زبان سے واقفیت حاصل کریں اور اسی طرح دوسری زبانوں کے ادیب بھی جان کاری بڑھائیں تو فرقہ واریت کے عناصر کی غلیظ سیاست کو شکست دینے میں مدد ملے گی۔ ہماری سرکاریں اور سیاسی رہنما اس سمت میں چاہے پہل نہ کریں لیکن ادیبوں کو اس سمت میں فوراً ہی عملی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ □

غزلیں

حیدر قریشی
مدیر اعلیٰ جدید ادب
نزد ہیڈ پوسٹ آفس، خانپور ضلع رحیم یار خان، پاکستان

یوں کسی کے ساتھ اپنا واسطہ رہ جائے گا
وہ چلا جائے گا لیکن خواب سا رہ جائے گا

دور تک گو دوریوں کا سلسلہ رہ جائے گا
خط اگر لکھتے رہو گے رابطہ رہ جائے گا

فاصلوں کا اس طرح نازل ہوا ہم پر عذاب
مل بھی جائیں گے تو کوئی فاصلہ رہ جائے گا

پاس آ کر پڑھ نہ پائے گا کتابِ دل کبھی
وہ تو بس شیلفوں سے مجھ کو جھانکتا رہ جائے گا

حبس گر یوں ہی رہا دنیائے حرف و صوت میں
پیار کا ہر لفظ اک دن بے صدا رہ جائے گا

قطعہ

میں تو اس کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاؤں گا
وہ بھی مجھ کو دیکھ کر کچھ سوچتا رہ جائے گا

دھڑکنوں کے معنی کھو جائیں گے اس کے سامنے
لب پہ آتے آتے حرفِ مدعا رہ جائے گا

گفتگو ہر چند ہو گی لمحۂ موجود کی
دل نہ جانے کن زمانوں میں گھرا رہ جائے گا

رت بدل جائے گی اس کے جگمگاتے جسم کی
میری رگ رگ میں مگر اک ذائقہ رہ جائے گا

فرحت نواز
معاون مدیرہ جدید ادب
205/c سیٹلائٹ ٹاؤن، رحیم یار خان، پاکستان

ایسے خوابوں کے عذابوں کو کہاں تک دیکھوں
تری یادوں کے جہنم میں جہاں تک دیکھوں

کیسے مانوں کہ تو دل میں کبھی جھانکا ہی نہیں
میں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

آگ تو پیار کی چنگی سے لگا آئی ہوں
اب یہ خواہش ہے کہ شعلوں کو وہاں تک دیکھوں

آئینہ دل کا کہاں لے کے میں جاؤں فرحتؔ
ہر سو پتھر نظر آتے ہیں جہاں تک دیکھوں

دو ماہی الفاظ

اعظم عرفان

مکان نمبر ۶۴-۱۱-۱۱، برلستیوار پیٹھ
رائچور۔ ۵۸۴۱۰۱ (کرناٹک)

آسمان والے

بادلوں کی دھند میں، وہ سب کے سب نظر نہ آنے والی روشنی کی لپیٹ میں گردن تلک اندھیرے کے حصار میں مقید تھے:

وہ چھ قیدی تھے۔ سب کے سب تنومند جوان۔ ان کی آنکھوں کی چمک سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا جرم سنگین ہوتے ہوئے بھی رنگین ہے۔ مجرموں کے بڑے کٹہرے میں کھڑے۔ ان کی نظریں کبھی گواہ کے کٹہرے میں کھڑی حسین ساحرہ کی جانب لپکتیں تو کبھی منصف کی جانب، جو نہایت فیصلہ کن انداز میں بیٹھا ان کے بیانات بغور سن رہا تھا۔

جج کے چاروں طرف اساطیری طرز کے مٹیالے ستونوں سے کرنیں سی پھوٹ رہی ہیں اور یہ روشن کرنیں، گردش کرتے ہوئے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جج کے چہرے کو منور کر جاتیں ——

جج کے پیچھے بت بنے جلّادوں کی تلواریں اندھیرے میں بھی روشن تھیں۔

گواہ کے کٹہرے میں کھڑی حسین ساحرہ کے نچلے دھڑ پر مکمل تاریکی کا قبضہ تھا —— بڑی بڑی آنکھیں شہوانیت سے لبریز تھیں۔ جامنی رنگ کے مسوڑھوں کے درمیان موتی جیسے دانت چمک چمک اٹھتے۔ نسوانیت کے علمبردار لانبے سیاہ گیسوؤں نے اس کے خدوخال پہ ایک پردہ سا ڈال رکھا تھا۔ پھر بھی ایک جیتی جاگتی قیامت تھی جو گواہ کے روپ میں کھڑی تھی۔

منصف کی گمبھیر آواز نے ماحول کے وقتی سکوت کو توڑا ——

" مدعی —— تمہارے مجرم حاضر ہیں —— " لڑکی کے یاقوتی لب وا ہوئے۔" اے انصاف پرور! اس نے پہلے آسمان پر مجھے ہوس بھری نظروں سے تاکا تھا۔"

پہلے آسمان کا مجرم اپنے دل پہ ہاتھ رکھے رکھے دوزانو ہو گیا۔ یہ اس کے جرم کا اقرار تھا —— چہرے سے علیٰحدہ ہو کر اس کی آنکھیں زمین پہ پڑی پڑی بھی اس حسین ساحرہ کو ہی تک رہی تھیں۔

"دوسرے آسمان کی پہلی دہلیز پر اس نے میرا نقاب سرکایا ــــ"

دوسرے آسمان کے مجرم نے بہ رضا اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ دونوں ہاتھ اب بھی ایک ساتھ زمین پر پڑے تھے، سیدھے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا رخ اس حسین ساحرہ کی جانب ہی تھا ــــ

آخر کار اسی طرح باترتیب چھ قیدی، جو آسمان کے رکھوالے تھے، اپنے اپنے مختلف اعضا گنوا چکے تو حسین مدعی کے لب و رخسار طمانیت سے مسکرا اٹھے ــــ

"مجھے میرا انصاف مل گیا اے انصاف پرور ــــ!" یہ کہہ کر اس نے اپنا نقاب چہرے سے مکمل سرکا دیا ــــ اجالے پھیلتے گئے ــــ سیاہ گیسو اب پشت پر سایہ فگن تھے۔ اسی لمحہ اک برق سی لہرائی ــــ پر وقار گمبھیر سی آواز نے کہا ــــ

"ٹھہرو ــــ!" منصف کی مدھم آواز میں اب کچھ زیادہ ہی گمبھیرتا آچلی تھی ــــ منصف اب نیچے تلے قدموں سے مجرموں کے کٹہرے میں آکر رک گیا ہے ــــ

اندھیرے نے اب منصف کو گردن تلک اپنے شکنجہ میں کس رکھا ہے۔

لڑکی اب مکمل بت میں تبدیل ہو چکی ہے۔

ساتویں آسمان کے منصف کے چہرے کے نقوش اور اعضا کی بناوٹ ہو بہو ان چھ مجرموں کی طرح ہے جن کو کہ سزا مل چکی ہے۔ کٹے ہوئے سیدھے ہاتھ کی شہادت والی انگلی اب سرنگوں ہو گئی ہے۔ □

دلکش اعظمی

K. A. KHAN
C/O BRIDGE & ROOF CO. (I) LTD.
G.N.F.C. , NARMADA NAGAR
BHARUCH 392015

جلتے بجھتے منظروں کے درمیاں وہ شخص تھا
جس کا چہرہ بولتا تھا بے زباں وہ شخص تھا

آج جو کشکول لے کر خاک کے محشر میں ہے
آج سے پہلے ذرا سوچو کہاں وہ شخص تھا

جو سراپا خاک کی پوشاک میں ملبوس تھا
درحقیقت شخصیت میں آسماں وہ شخص تھا

سامنے اس کے تھی اپنی ریزہ ریزہ زندگی
آشنا ہو کر بھی مجھ سے بدگماں وہ شخص تھا

زندگی جس کے وفا کی آج تک مقروض ہے
واقعی شاداب رت کا جسم و جاں وہ شخص تھا

سایۂ خورشید میں جب آ گیا باقی سفر
تب ہوا احساس دلکش سائباں وہ شخص تھا

ساحل سلطانپوری

اتنے روشن حرف لکھے جو اس کی انگلی چوموں
جی کرتا ہے ننھے طالب علم کی تختی چوموں

بارش کی بوندوں میں دیکھوں منظر سب شاداب
میں بھی ایک ہوا کا جھونکا پتی پتی چوموں

شاید میرے نام کا کوئی موتی بھی مل جائے
میں بہتی ندیا کا پانی سیپی سیپی چوموں

ماں کے تلووں سے پیشانی رگڑوں اور اترائوں
جس کے نیچے جنت ہے اس پاؤں کی مٹی چوموں

تیری زلفوں کی خوشبو کے خوابوں میں کھو جاؤں
آئینے کی آنکھ بچا کر تیری کنگھی چوموں

تو باہیں پھیلا دے گوری میں تجھ پہ چھا جاؤں
میں بھی نیل گگن کہلاؤں میں بھی دھرتی چوموں

شفیع جاوید

میری روٹیاں

"بھائی مجھے بھی ایک روٹی دے دو۔"

"چل آگے، بھاگ یہاں سے" کہتے ہوئے وہ جو روغنی روٹی اور مسالہ دار سالن کھا رہا تھا اس نے اپنی پلیٹوں کو اور نزدیک سرکا لیا۔

"بہت بھوک لگی ہے، بس ایک روٹی دے دو سیٹھ۔"

"دور ہو، ورنہ ماروں گا تجھے۔"

"سیٹھ بھائی کم سے کم آدھی روٹی دے دے پھر مار لینا، میں بڑا بھوکا ہوں۔"

"چلتا ہے یہاں سے یا بلاؤں پولیس کو"—— کھانے والے نے جلدی جلدی منہ چلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پولیس بھی بلا لو لیکن روٹی کا بس ایک ٹکڑا دے دو۔"

"حرام زدہ کہیں کا، مارتے مارتے بے حال کر دوں گا، سالے نے کھانا حرام کر دیا"—— کھانے والے نے حد درجہ بد مزہ ہو کر اپنی پیٹھ مانگنے والے کی طرف گھمائی۔

چند ہی منٹوں بعد اچانک کھانے والے کے سر پہ گھن گرج سی ہوئی "یہ ساری روٹیاں مجھے دے دو"—— اس نے گھوم کر دیکھا تو مانگنے والے کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں، ہونٹ بھینچ گئے تھے اور اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا تیز دھار والا کھلا ہوا چاقو چمک رہا تھا۔ کھانے والے کے منہ اور ہاتھ حیرانی کے ساتھ رک گئے۔ "میں نے تمھیں کہا نا کہ یہ ساری روٹیاں مجھے دے دو ——

کھانے والے کا حلق خشک ہو گیا اس نے آہستگی سے بے چوں و چرا ساری روٹیاں اور سالن کی پلیٹ چاقو والے آدمی کے حوالے کر دیا۔ پھر وہ وہیں بیٹھ گیا اور بڑی تیزی سے کھانے لگا۔ پہلے آدمی کے منہ کی رال خشک ہوتی گئی۔ جب وہ کھا کر سیر ہو گیا تو اس نے چاقو بند کر کے پرے پھینک دیا اور پہلے آدمی سے بولا "معاف کرنا بھوک نے مجھے بے حال کر رکھا تھا، میں نے تم سے بڑی بد اخلاقی کی اس کی معافی چاہتا ہوں۔" تب

پہلا آدمی گو یا بیہوشی سے جاگا اور اس نے دوسرے آدمی کو ایک زور دار طمانچہ مارا، وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے اپنی آنکھوں کا پانی پوچھنے لگا۔ پھر پہلے نے شور مچانا شروع کیا "پولیس، پولیس، دوڑو، دوڑو، لوگو مجھے اس نے لوٹ لیا" سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کئی لوگ بھی جو پہلے بھی وہاں تھے لیکن خوف سے دور ہٹے ہوئے تھے اب قریب آگئے اور ان میں جو سب سے موٹا تھا اور سونے کی زنجیر پہنے تھا اور بہت دیر سے اس ڈرامہ کو دور ہی سے دیکھ رہا تھا، پوچھا "اس نے اپنا چاقو کیا کیا۔" "پھینک دیا" ایک دو آوازیں آئیں تب اور زور دار لات اس کے پیٹ پر مارا، کچھ دیر پہلے اس نے چھین کر جو کچھ کھایا تھا۔ وہ سب اس کے منھ سے خون کے ساتھ باہر نکل آیا —— پھر سپاہی اسے پکڑ کر تھانے لے گیا، وہاں سے وہ عدالت لے جایا گیا اور منصف کے اجلاس پر حاضر کیا گیا۔

"تمھارا کوئی وکیل ہے؟"

"نہیں"

"تو کیا تم ہی بحث کروگے؟"

"بحث، نہیں میں صرف آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔"

"تم نے اس شخص کو کیوں لوٹا؟" —— "میں نے کیا لوٹا ہے" —— کچھ دیر اجلاس پر سناٹا رہا پھر وکیل نے اپنا گلا صاف کرکے کہا۔ "اس کی روٹیاں تم نے کیوں لوٹیں؟"

"اس لئے کہ میری روٹیاں اس کے پاس تھیں۔"

"تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمھاری روٹیاں اس کے پاس تھیں؟" وکیل زور سے بولا۔

"ثبوت۔ میرے پاس روٹیاں نہیں تھیں۔"

"یور آنر یہ کتنی بے بنیاد بات ہے، وہ روٹیاں تو اس آدمی کی تھیں جسے اس نے چھین لیا چاقو دکھاکر اور جان مارنے کی کوشش کرکے، مجرم کا یہ بیان سو فی صدی جھوٹ ہے کہ مدعا الیہ کی روٹیاں مدعی کے پاس تھیں۔

منصف نے مجرم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تمھیں کچھ اور کہنا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا۔"

"اگر میری روٹیاں اس کے پاس نہیں تھیں تو پھر وہ کہاں گئیں، کون لوٹ گیا انھیں؟"

"یہ تم اپنی تقدیر یا اپنے خدا سے پوچھو" —— وکیل نے چیخ کر میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے پوچھتا ہوں بتاؤ میری روٹیاں کہاں تھیں؟" —— وہ بھی اتنی ہی زور سے چیخ پڑا —— منصف نے زور سے کہا "آرڈر۔ آرڈر" —— پھر پورے اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ☐

● آپ نے دوماہی "الفاظ" کے افسانہ نمبر (جلد اوّل) سے نوازا۔ اس بے پایاں کرم فرمائی کے لئے سپاس گزار ہوں۔ ایسے وقیع نمبر کی دستیابی، زیارت اور اس کا مطالعہ میرے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ جزاک اللہ۔

آپ نے دورِ حاضر کے بیشتر اہم اور قابل ذکر افسانہ نگاروں کی تازہ ترین تخلیقات کو جمع کر دیا ہے۔ اسے ہم عصر افسانے کی ایک انتھالوجی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ حصّہ مقالات اور افسانوی مجموعوں پر تبصروں نے اس خاص شمارے کو حوالے کی چیز بنا دیا ہے۔ میری طرف سے اس کامیاب اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

ڈاکٹر وحید اختر صاحب کی باتیں واقعی "سخن گسترانہ" ہیں ـــــ خاص طور پر ناول کے بارے میں انھوں نے بڑی روا روی میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں اور ناول نگاروں کی فہرست ادھوری اور ناقص ہے۔ مثلاً یہ ایک انکشاف ہے کہ غلام عباس نے "گوندنی والا تکیہ" کے نام سے کوئی ناول بھی لکھا ہے۔ اسی طرح اس دریافت سے مجھ جیسے پاکستانی قارئین بے خبر ہیں کہ: "احمد ندیم قاسمی کے بھی ناول ہیں"۔ پھر وحید اختر صاحب کا "زرگذشت" کو ناول میں شمار کرنا، مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ تو ہو نہ ہو، اردو ناول کے ساتھ صریحاً زیادتی ہے۔ آخر اس دعوے کی وجہِ جواز کیا ہے؟ محض ایک جملے میں "زرگذست" کو ناول کہہ دینا تو کوئی بات نہ ہوئی۔

وحید اختر صاحب کا یہ شکوہ بجا نہیں کہ "علی پور کا ایلی" کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ناول کی کوئی تاریخ، کوئی تذکرہ ممتاز مفتی کے اس ناول کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں معلوم نہیں کیا صورت ہے، یہاں پاکستان میں تو ممتاز مفتی کی پہچان ان کا یہی ناول ہے یا پھر ان کا سفرنامۂ حج "لبیک" ـــــ رہی یہ بات کہ اس ناول کو کوئی ادبی انعام نہیں ملا تو کیا کوئی فن پارہ اپنی عظمت کے لئے ادبی انعاموں کا محتاج ہوتا ہے؟ وحید اختر صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ: "ادبی انعامات وہ کسی تجارتی ادارے کے ہوں یا حکومت کے یا اکیڈمیوں کے، ان کی سیاست اور ہی ہوتی ہے"، تو پھر یہ شکوہ کیوں کہ "علی پور کا ایلی" کو کوئی انعام نہیں ملا ـــــ؟ ان کی یہ بات بھی درست نہیں کہ پاکستانی انعام نواز کتاب کے حجم کو دیکھ کر انعام دیتے ہیں ـــ اگر ایسا ہوتا تو پھر یقیناً "علی پور کا ایلی" ہی انعام سے نوازا جاتا کیوں کہ حجم کے اعتبار سے یہ سب اردو ناولوں پر بھاری ہے ـــــ ادبی انعاموں میں اصلاً سیاست کارفرما ہے۔ اب یہاں تو یہ صورت ہے کہ بعض ثقہ ادیب اپنی کتابیں ادبی انعاموں کے لئے پیش کرنا باعثِ عار سمجھنے لگے ہیں چنانچہ ایک صاحب نے اپنے تنقیدی

مجموعے پر یہ جملہ لکھ دیا: "یہ کتاب رائٹرز گلڈ کے کسی انعام کے لیے پیش نہیں کی گئی۔"

آخر میں مجھے وحید اختر صاحب سے شکوہ ہے کہ انھوں نے اردو کے ایک بڑے ناول "خونِ جگر ہونے تک" (از فضل احمد کریم فضلی) کا ذکر تک نہیں کیا۔ دوسری جنگ عظیم اور مشرقی بنگال کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ ناول فن، تکنیک اور اپنے خوبصورت اسلوب کے اعتبار سے اردو کے عظیم ناولوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

رفیع الدین ہاشمی، لاہور

● "الفاظ" کا افسانہ نمبر ملے ہوئے کافی دن گزر گئے۔ معذرت خواہ ہوں کہ رسید بھیجنے میں اتنی تاخیر ہوگئی۔ افسانوں کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی یہ نمبر ایک اعلیٰ اور قابل قدر معیار پیش کرتا ہے۔ نئے پرانے ہر طرح کے افسانہ نگاروں نے متاثر کیا۔ البتہ زیادہ تر مضامین نہ صرف بیحد مختصر ہیں بلکہ غیر تجزیاتی، تاثراتی اور سطحی نوعیت کے حامل ہیں۔ بعض حضرات کے مضامین تو متعلقہ نقاد کی ذہنی اور فکری مجبوریوں کے ساتھ ساتھ سماجی اور پیشہ ورانہ مجبوریوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ !! کتھا سرت ساگر کا موضوع نیا ہے لیکن میرے نزدیک شمیم حنفی کے تنقیدی مزاج کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ایک طرف شواہد و دلائل کی مدد سے تجزیہ کرنے کے بجائے، محض اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کو بنیاد بنا کر موضوع کے متعلق موافق یا غیر موافق رائے کا اظہار کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور دوسری طرف خود چھان بین کرنے کے بجائے زیادہ تر ثانوی ذرائع پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ "کتھا سرت ساگر" پر ان کا پورا مضمون ان کے اسی رویّے کا غمّاز ہے۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں ان کہانیوں کا مفصل تعارف کرانے کے بجائے اہلِ اردو کی کم علمی اور لاعلمی کا جس طرح ماتم کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر مجھے تو بے ساختہ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد" یاد آگیا۔ فرماتے ہیں:

"عمر خیام اور کالی داس کی بات الگ، ٹیگور بھی ہم تک مغرب ہی کے راستے سے پہنچے اور وہ بھی اس وقت جب انھیں فٹز جیرالڈ، گیٹے اور ڈبلیو۔ بی۔ یے ٹس کی طرف سے سند مل گئی۔ ذہنی غلامی اور فکری پسماندگی کا طلسم بڑی مشکل سے ٹوٹتا ہے۔"

میں تو کہتا ہوں کہ یہ طلسم ٹوٹتا ہی نہیں۔ اگر ٹوٹ سکتا تو شمیم حنفی ٹیگور کے بارے میں لکھنے سے پہلے کم از کم یہ پتہ چلانے کی کوشش کرتے کہ آخر گیٹے، فٹز جیرالڈ اور یے ٹس وغیرہ نے ٹیگور کے متعلق لکھا کیا ہے؟ اس عمل میں انھیں یہ بات معلوم ہو جاتی کہ گیٹے کا انتقال ٹیگور کی پیدائش سے ۲۹ برس پہلے ہو چکا تھا اور جب فٹز جیرالڈ کا انتقال ہوا تو ٹیگور کی عمر صرف ۲۲ سال کی تھی نیز فٹز جیرالڈ سمیت مغرب میں لوگ ان کے نام سے قطعاً ناآشنا تھے۔ مغرب میں تو ٹیگور کے نام اور کام سے لوگ اس وقت آشنا ہوئے جب وہ ۱۹۱۲ء میں اپنی پچاسویں سالگرہ منانے کے بعد لندن گئے۔ پاؤنڈ اور یے ٹس وغیرہ سے ملاقات کی اور اپنی نظموں کا انگریزی ترجمہ دکھایا۔ اسی سال ان کی کتاب گیتانجلی یے ٹس کے پیش لفظ کے ساتھ شایع ہوئی۔ اس وقت تک ہندی اردو والے ٹیگور سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔

دوسرے مضامین میں ابن فرید کا مضمون بہتر ہے۔

فضیل جعفری، بمبئی
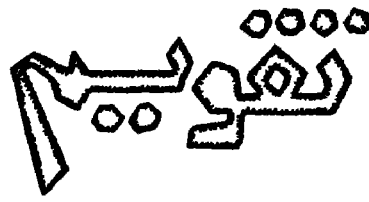
(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

منٹو کے نمائندہ افسانے • مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز • ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ • قیمت: ۱۶/۰۰، طلبا ایڈیشن ۱۲/۰۰

منٹو نے اپنی قبر کے لئے یہ کتبہ تجویز کیا تھا "یہاں دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار دفن ہے" اس میں شک نہیں کہ وہ اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار تھا۔ اسے افسانہ لکھنے کا سلیقہ آتا تھا اور معمولی سے معمولی واقعے کو افسانے کا روپ دے سکتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کاغذ پر صرف ایک لفظ لکھ دو۔ میں وہیں سے شروع کرکے کہانی سنا دوں گا۔ وقار عظیم نے کہا ہے کہ میز پر ماچس رکھ دو وہ اس پر کہانی لکھ دے گا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ میز کے نیچے سر ڈال کے اس ماچس کا دوسرا رخ دیکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس دوسرے رخ کی تلاش نے اسے فحش نگار کہلوایا اور اس پر مقدمے چلوائے لیکن اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اس کے فن کو جانچنے کی پوری کوشش نہیں کی گئی۔

ڈاکٹر اطہر پرویز نے بڑے غور و فکر اور بار بار مطالعہ کرنے کے بعد منٹو کے چودہ افسانے منتخب کئے ہیں جنہیں بجا طور پر منٹو کے نمائندہ افسانے کہا جاتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل ستائش ان کی وہ کوشش ہے جو کتاب کے شروع میں بطور مقدمہ شامل ہے جس میں انھوں نے منٹو کے فن کو سمجھنے اور پرکھنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر پرویز کا خیال درست ہے کہ افسانہ نگاری کے معین اصولوں سے منٹو کے فن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے خود اسی کی تحریروں کو ٹٹولنا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہی کیا ہے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔

انارکلی • امتیاز علی تاج، مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن • مکتبۂ الفاظ، علی گڑھ • قیمت: ۹/۰۰

مغرب میں ڈراما ادب کی سب سے مقبول صنف رہی ہے لیکن ہمارے ادب میں یہ زیادہ رواج نہ پاسکی جس کے غالباً دو اسباب ہیں۔ ایک تو اسٹیج کی کمی اور دوسرے ہماری تہذیب و معاشرت جو کھیل تماشوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتی تھی لیکن تاج کا انارکلی بے حد مقبول ہوا اور کم لوگ ہوں گے جنھوں نے

اسے بار بار پڑھا ہوگا۔ مغل سلطنت کا جاہ وجلال، حرم کا رومانی ماحول، شیریں اور جذباتی مکالمے، عام پسند موضوع اور ڈرامے کا یہ کمال کہ پڑھئے تو بلا اسٹیج کے سارا ڈراما سامنے کھیلا جاتا نظر آئے ـــــ یہ وہ چیزیں تھیں جنھوں نے اس کی مقبولیت میں کمی نہ آنے دی۔

زیرِ تبصرہ ایڈیشن صاف ستھرا اور اغلاط سے پاک ہے اور ڈاکٹر محمد حسن کے مقدمے نے اسے اور زیادہ وقیع بنا دیا ہے۔ اپنے مختصر سے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب نے انارکلی کا مکمل تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ اسے انارکلی کے المیہ سے زیادہ اکبر اعظم کا المیہ قرار دیتے ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ انارکلی سے پہلے اردو ڈراما میں دو اسلوب مروج تھے ـــــ اندرسبھائی اسلوب اور آغا حشر اسلوب ـــــ انارکلی نے ایک تیسرے اسلوب کی بنیاد رکھی اور اس اعتبار سے اردو کے ڈرامائی آرٹ کو ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز موڑ دیا۔

انارکلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اسٹیج کیا جانا اس لئے دشوار ہے کہ اس کے واسطے بڑا سازوسامان درکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آج کے اشاراتی اسٹیج پر انارکلی کا پیش کیا جانا دشوار نہیں بلکہ انھوں نے پٹیالہ میں دیکھا کہ انارکلی کی پیش کش میں مختلف پتھروں کے ٹکڑوں سے کس طرح علامتوں کا کام لیا گیا۔ بہرحال ان کے نزدیک چند کمزوریوں کے باوجود انارکلی اردو کا بہترین ڈراما ہے۔ اپنا مضمون ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "آج بھی انارکلی ایک جیتے جاگتے فن پارے کی حیثیت سے صرف پڑھنے والوں ہی کے لئے اسٹیج پر ڈراما دیکھنے اور اس سے لطف و انبساط حاصل کرنے والوں کو سرشار کرسکتی ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اس فن پارے کو محض ادبی شہ پارے ہی کی طرح پڑھا اور پرکھا نہ جائے بلکہ اسٹیج ہونے والے ڈرامے کے سبھی رموز و آداب کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔"

مختصر یہ کہ ڈاکٹر محمد حسن کے مقدمے کے ساتھ انارکلی کی اشاعت سے ایک اہم ضرورت پوری ہوگئی ہے۔

موازنۂ انیس و دبیر ● شبلی نعمانی، مقدمہ ڈاکٹر فضل امام ● مکتبۂ الفاظ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ● قیمت : ۱۲/۰۰

اس صدی کے آغاز میں شبلی کی ایک اہم تصنیف "موازنۂ انیس و دبیر" شایع ہوئی تھی اور اس سے ہمارے ادب میں باقاعدہ تقابلی مطالعے کا آغاز ہوا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کے خلاف مضامین اور کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس کے باوجود مرثیے کی تنقید اور انیس و دبیر کی تفہیم میں یہ کتاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بغیر نہ مرثیے کا مطالعہ آسان ہے نہ انیس و دبیر کا۔ مکتبہ الفاظ نے اس کتاب کو صحت کے ساتھ شایع کر کے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے اس پر مقدمہ تحریر کیا ہے اور موازنہ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

مقدمۂ شعر و شاعری ● الطاف حسین حالی، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی ● ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ● قیمت: ۱۲/۰۰

پروفیسر سرور نے مقدمۂ شعر و شاعری کو اردو شاعری کا پہلا منشور کہا ہے۔ ہمارے ادب میں تنقید کا باقاعدہ آغاز مقدمہ سے ہی ہوتا ہے اور بعض تنقید نگاروں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اردو تنقید آج تک اس مقام سے آگے نہیں بڑھ سکی جہاں تک حالی نے اسے پہنچا دیا تھا۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ اس کتاب کے بغیر اردو تنقید کے مطالعے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حالی نے مقدمہ لکھتے وقت مشرق و مغرب کی تنقید سے اس زمانے کی ساری دشواریوں کے باوجود استفادہ کیا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی محنت سے ان تمام ماخذ کی نشاندہی کی ہے اور اس سلسلے کے تمام امور پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر قریشی کے مضمون کے بغیر مقدمۂ شعر و شاعری کا مطالعہ ادھورا رہتا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے کافی وقت گزر جانے کے باوجود اس پر کوئی اہم اضافہ ابھی تک نہیں کیا جا سکا۔

اس کتاب کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کر کے ایجوکیشنل بک ہاؤس نے اردو ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

مثنوی سحر البیان ● میر حسن دہلوی، مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ● ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ● قیمت: ۵/۰۰

مثنوی سحر البیان نے مثنوی میر حسن اور قصۂ بدر منیر وغیرہ مختلف ناموں سے شہرت پائی اور اپنے خالق کو زندۂ جاوید کر دیا۔ محمد حسین آزاد نے اس مثنوی کے بارے میں لکھا تھا "زمانے نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعراء اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا" اور آگے چل کر ایک اور اہم بات کہی ہے "کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سناتی دیتی تھیں کہ جو کچھ اس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔ اپنے زمانۂ تصنیف سے لے کر یہ مثنوی آج تک مقبول رہی ہے اور تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے آج سے برسوں پہلے یعنی ۱۹۵۴ء میں اس مثنوی کو اپنے مقدمے کے ساتھ شایع کیا تھا لیکن کاتب کی لاپرواہی سے اس میں اتنی غلطیاں راہ پاگئیں کہ مرتب کو اس کی ترتیب سے برأت کا اظہار کرنا پڑا لیکن زیر نظر ایڈیشن اغلاط سے پاک ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے ایک کارآمد مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ مقدمہ طلبہ کی ضرورتوں کا خیال کر کے لکھا گیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت سحر البیان کی خصوصیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یقین ہے کہ اس سے طلبہ کو مثنوی کے مطالعے میں بڑی سہولت ہوگی۔

—— نور الحسن نقوی

آدمی نامہ ● مجتبیٰ حسین ● حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد ● قیمت: ۹/۰۰

خاکہ نگاری رفتہ رفتہ ہمارے ادب میں ایک صنف سخن کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس

کے لکھنے والوں میں افسانہ نگار بھی ہیں اور طنز نگار بھی ـــــ اور مولوی عبدالحق جیسے لوگ بھی جو اپنی مقدمہ نگاری کے لئے اتنے مشہور ہوئے کہ نیاز فتحپوری نے انھیں مقدمے باز کا خطاب دے دیا۔ الغرض فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی سے لے کر منٹو، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین سب ہی نے طبع آزمائی کی۔ آپ جناب سے بات کرنے والے محمد طفیل تو نقوش کو مرتب کرنے کے علاوہ صرف یہی کام کرتے تھے۔ انھوں نے ایک اک ملاقات کے بعد خاکے لکھ دیئے ہیں۔

خاکہ نگاری مشکل فن ہے۔ یہاں کمزوری کو طاقت اور بدصورتی کو حسن بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے ـــــ دوسروں کا نہیں کبھی کبھی اپنا مذاق اڑا کر دوسروں کو خوش کرنا اور ان کا اعتماد حاصل کرنا پڑتا ہے پھر اگر ممدوح بقید حیات ہو تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

"آدمی نامہ" مجتبیٰ حسین کے ۱۵ خاکوں کا مجموعہ ہے جس میں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں اور وہ بھی جو زندہ درگور ہیں۔ (میں موخرالذکر فقرے کی وضاحت نہیں کروں گا)

مجتبیٰ حسین مزاجاً مزاح نگار ہیں اور یہ خصوصیت کم مزاح نگاروں میں ہوتی ہے۔ وہ اپنے مزاح کے لئے واقعات و حادثات سے بھی کام لیتے ہیں اور زبان و بیان سے بھی ـــــ اور جب ان سے کام نہیں چلتا تو ان کی اپنی فطری صلاحیت اپنا دست تعاون بڑھاتی ہے۔

بلاشبہ مجتبیٰ حسین ہمارے صف اول کے فن کار ہیں۔ انھوں نے زندگی کے جن حقائق کو ان خاکوں کے ذریعے پیش کیا ہے وہ کہانیوں سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ میں کنہیا لال کپور کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ مجتبیٰ حسین کو خاکہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔ ان خاکوں میں مخدوم محی الدین، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، سجاد ظہیر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان تمام خاکوں میں لطائف بھی ہیں ـــــ جن کو پڑھ کر قہقہے لگانے کا جی چاہتا ہے بعض جگہ صرف مسکراہٹ لبوں پر کھیل جاتی ہے اور کبھی یہ مسکراہٹ ہونٹوں کے نیچے دب جاتی ہے ـــــ اور پھر اچانک ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ مخدوم کی فرمائش پر سعید بن محمد میر کے مصرعے کی گلاب کی پنکھڑی بنانے کے لئے تیار ہو گئے تھے لیکن مخدوم نے کہا کہ پنکھڑی اک گلاب کی تو پینٹ ہو گئی لیکن "سی" کو کیسے پینٹ کروگے جو اس مصرعے کی جان ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین نے اپنے اس خاکے میں "سی" کو بھی پینٹ کر دیا ہے۔

میں مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری پر کبھی فرصت سے لکھوں گا۔ اس وقت تو صرف یہ کہوں گا کہ یہ خاکے یوں تو ۱۹۳ صفحات پر مشتمل ہیں لیکن آپ کتنے بھی مصروف کیوں نہ ہوں ایک ہی نشست میں پڑھنے کی کوشش کریں گے۔ اور یہ احساس ہوگا کہ اس گرانی کے زمانے میں اس کی قیمت کتنی کم ہے۔

ـــــ اطہر پرویز

غالب کے معنوی اساتذہ

• ظفر ادیب • قصرِ اردو، ۱۴۹۸، اردو بازار، دلی ۱۱۰۰۰۶ • قیمت: ۳۰/۰۰

وقت کی تثلیث سے ماورا فن کار کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ ہر عہد کے متحرک ذہنوں

یوں نت نئے استفہامیہ نشان خلق کرتا ہے ـــــ خود اپنے فن کے بارے میں اور "زندگی" کے بارے میں۔

کلام غالب نے جناب ظفرادیب کے ذہن میں یہ سوال پیدا کیا ہے کہ وہ کون سے اسباب و عناصر تھے جن سے غالب کی تخلیقی شخصیت کا خمیر تیار ہوا تھا؟ ـــــ اس سوال کے مناسب جواب کے حصول کے لئے ظفر صاحب کو کتنی اوگھٹ وادیوں سے گزرنا پڑا ہے۔

کتاب کے اوّلین باب میں غالب کی شخصیت میں کارفرما آبائی اور ذاتی حصے کی نشان دہی کے بعد دیگر چھے ابواب میں ان تمام مقامات کے ماحول، تہذیب، تمدّن اور معاشرت کا علاحدہ علاحدہ مطالعہ کیا گیا ہے جہاں جہاں کی آب و ہوا سے غالب کو واسطہ پڑا تھا، یعنی آگرہ، دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، بنارس، باندہ اور رامپور۔ ہر مقام کے جائزے کے ساتھ ان شخصیات کے ذہن و فن کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے جو وہاں کے زمانۂ قیام میں غالب کے ذہن و دل پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوئی تھیں یعنی مولوی محمد معظم، شوکت بخاری، مرزا جلال اسیر، امیر خسرو، فضل حق خیرآبادی، آزردہ، ممنون، طالب، صائب، نظیری، عرفی، حزیں، قاآنی، ظہوری، کلیم، سعدی اور حافظ شیرازی ـــــ مصنف نے اپنے مطالعے اور تجزیے کے لئے دیگر ناقدین کے اظہار خیال پر اکتفا کرنے کے بجائے غالب کے فارسی و اردو کلام اور دیگر تحریروں کے ساتھ ان تمام شعراء کے از سر نو مطالعے کا جوکھم اٹھایا ہے جو ان کے نزدیک غالب کے معنوی اساتذہ کہے جا سکتے ہیں۔

ظفرادیب صاحب کی یہ نہایت متوازن اور پر وقار تصنیف غالب کے تعلق سے کچھ اشارے کرتی ہے اور ایک ایسے "تخلیقی مطالعۂ غالب" کی بنیاد رکھتی ہے جو اپنی ارفع شکل میں بتا سکے گا کہ غالب کی تخلیقی شخصیت نے اپنے قدما اور معاصرین کے کن تخلیقی عناصر کی آمیزش اور وحدت سے اپنی وسیع ترین اور وقیع ترین تخلیقی کائنات کی تشکیل کی تھی۔

ـــــ شمس الحق
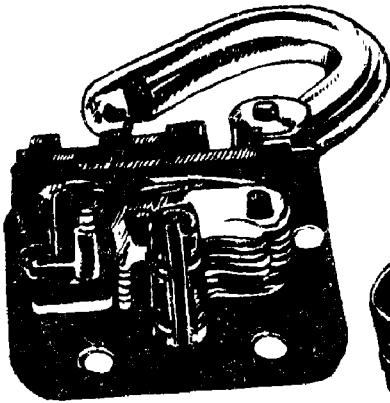
معیاری
تالے
کی
پہچان
صرف اپنی چابی سے کھلے
کسی اور چابی سے نہ کھل پائے
لنک تالوں کا
یہی ہے امتیاز
Link
Link LOCK
ANJUM
نروی لاکس
C 7 انڈسٹریل اسٹیٹ ۔ علی گڑھ

سائنٹفک طریقے
سے تیار کیا جانے والا
زود اثر
مسیحا
(سیرپ)
بطور حفظ ماتقدم و علاج استعمال کیا جاتا ہے
مسیحا استعمال
○ ملیریا ○ انفلوائنزا ○ موسمی بخار ○ پرسوت بخار
○ بخار ○ ورم طحال ○ ہلکی حرارت ○ ورم جگر
مقامی میڈیکل اسٹور و جنرل اسٹور سے طلب کریں۔
OEBA (INDIA) اوئیبا
جلال پور فیض آباد ۲۲۴۱۴۹ (یو۔پی)
Accession Number
Date